تحریک نئی دہلی

بھارتی معیشت میں وسیع پیمانے پر مزید ترقی کے روشن امکانات

بھارتی معیشت میں بڑی تیزی سے توسیع ہوئی ہے۔ بھارت نے نہ صرف سکّے کے پھیلاؤ پر قابو پالیا ہے بلکہ اس کا رُخ ہی موڑ دیا ہے اور قیمتوں میں ٹھہراؤ آگیا ہے۔

× اناج کی ۱۱ کروڑ 80 لاکھ ٹن کی پیداوار کا نیا ریکارڈ قائم ہوا ہے اور اس وقت ملک میں ایک کروڑ 80 لاکھ ٹن سے زیادہ اناج کا اسٹاک ہے۔

× مالی سال کے پہلے چھ مہینوں میں صنعتی شعبے میں بارہ فیصد کی شرح سے ترقی ہوئی جبکہ پچھلے سال کی اسی مدت میں یہ صرف تین فیصد تھی 77-1976ء میں پچھلے سال کے مقابلے میں دس فیصد زیادہ صنعتی پیداوار متوقع

× اپریل سے ستمبر 1976ء تک کے عرصے میں 1975ء کی اسی مدت کے مقابلے میں بجلی کی پیداوار 16.4 فیصد بڑھ

× اپریل سے اکتوبر 1976ء تک کے عرصے میں بھارتی برآمدات میں 33.9 فیصد کا قابلِ قدر اضافہ ہوا ہے اور اسی مدت میں درآمدات میں 9 فیصد تک کمی ہوئی ہے۔

× بیرونی ادائیگیوں کی پوزیشن میں نمایاں بہتری ہوئی ہے۔ غیر ملکی سکّے کا ریزرو حصول آزادی کے بعد پہلی بار 2500 کروڑ روپے سے بھی زیادہ ہوگیا ہے۔

× پبلک سیکٹر میں ترقی کی شرح تقریباً بارہ فیصد ہے۔

× روپے کی قوت خرید میں 17 سے 21 فیصد تک کا اضافہ ہوا ہے۔

یہ کامیابیاں اس بات کی مظہر ہیں کہ بھارت کی حکومت اور جنتا نے ترقی کے لیے اس وسیع اور سرگرم عمل ملک کے تمام تر وسائل کو بروئے کار لانے کا پختہ عزم کر رکھا ہے۔

76/919

گوپال مِتّل کی ادبی اور سیاسی یادداشتوں کی
حکایتِ لذیذ

لاہور کا جو ذکر کیا

(کچھ آپ بیتی، کچھ جگ بیتی)

غیر منقسم پنجاب کی کہانی —— گوپال مِتّل کی زبانی

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

قیمت: چھ روپے

گوپال مِتّل کا شعری مجموعہ

صحرا میں اذان

اُردو شاعری کی مستحکم اور معتبر آواز

آفسٹ کی چھپائی

اعلیٰ گیٹ اَپ

قیمت: چھ روپے

میزان

آزادی کے بعد کا سب سے اہم شعری انتخاب

۲۲۹ ممتاز شعرا، اور شاعرات کا منتخب کلام —
سوانحی اشاروں کے ساتھ۔

مرتبین: محمود سعیدی
پریم گوپال مِتّل

مضبوط جلد، خوشنما گیٹ اَپ، سائز ۲۲×۱۸، صفحات ۲۲۰

قیمت: بارہ روپے

نوبل انعام یافتہ ادیب
الیگزنڈر سولنسٹین
کا شہرۂ آفاق ناول

کینسر وارڈ

یہ کتاب پہلے چھوٹے سائز پیپر بیک میں، دو الگ الگ حصوں میں چھپی تھی۔ اس کی غیر معمولی مقبولیت کے پیشِ نظر اب اس کا ڈی لکس ایڈیشن شائع کیا گیا ہے جس میں دونوں حصے یکجا کر دیے گئے ہیں۔

ڈیمائی سائز، مضبوط جلد اور بہترین گیٹ اَپ کے ساتھ۔

قیمت: اٹھارہ روپے

نیشنل اکاڈمی۔ ۹ انصاری مارکیٹ۔ دریا گنج۔ دہلی

Accession Number 38509
Date 27.2.79

پنجاب اور آندھرا کی لائبریریوں کے لیے منظور شدہ

ماہنامہ تحریک

نئی دہلی

شمارہ ا جلد ۲۵

اپریل ۱۹۷۷ء

ادارۂ تحریر :
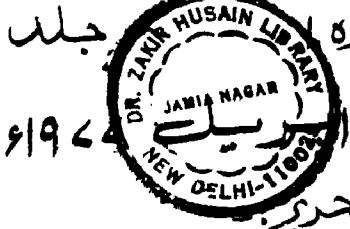
گوپال متل ☆ مخمور سعیدی

پریم گوپال متل

سالانہ قیمت : پندرہ روپے فی کاپی : ایک روپیہ ۲۵ پیسے

بیرونی ممالک سے

سالانہ : تین پونڈ فی کاپی : چھ شلنگ

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتا :

منیجر ماہنامہ تحریک ۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۲

پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر : گوپال متل

مطبع : نعمانی پریس دہلی

مقام اشاعت : ۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دلی ۲...

۱۴
۱۹۷۷-۷۸

DR. ZAKIR HUSAIN LIBRARY JAMIA NAGAR NEW DELHI-110025

مندرجات :

ہمارا نیا پن کوڈ نمبر

۱۱۰۰۰۲

ہے تحریک اور نیشنل اکادمی کو خط لکھتے ہوئے پتے میں یہ نمبر ضرور لکھیں

گوپال متّل | شاہی امام عبداللہ بخاری اور قوم پرست مسلمان

جمہوری سیاست میں گروہ بندی اور اختلافِ رائے دونوں ہی نہ صرف ناگزیر ہیں بلکہ قابلِ جواز بھی جو لوگ آپ کی جماعت کی ہمنوائی کریں انھیں آپ پسند کرتے ہیں اور جو لوگ مخالف جماعت کی حمایت کریں ان پر آپ نکتہ چینی کرتے ہیں۔ لیکن جس طرح کرکٹ میں دو مخالف ٹیمیں معیّن ضابطوں کے مطابق کھیلتی ہیں اسی طرح سیاست میں بھی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کا اظہار معیّن حدود ہی میں ہونا چاہیئے۔

امام صاحب نے کانگرس کی مخالفت اور جنتا پارٹی اور کانگرس فار ڈیموکریسی کی حمایت کی۔ اگر شری جگ جیون رام اور شری مرار جی ڈیسائی کی طرح امام صاحب کی روش بھی کانگرسیوں کو، خواہ وہ ہندو تھے یا مسلمان، ناگوار گزری تو یہ قابلِ فہم ہے۔ افسوس یہ ہے کہ کانگرسیوں، بالخصوص ان کانگرسیوں نے جو مسلمانوں میں اپنے آپ کو قوم پرستی کا اجارہ دار سمجھتے ہیں، جہاں شری جگ جیون رام اور شری مرار جی ڈیسائی کی دلیلوں کا جواب سیاسی دلیلوں سے دیا، وہاں امام صاحب کی مخالفت کے دوران انھوں نے کچھ ایسی باتیں کہیں جن کے مضمرات کافی خطرناک ہیں اور جن کی گروہی سیاست سے بلند ہو کر مذمت کی جانی چاہیے۔

اوّل تو یہی بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ قوم پرست مسلمان جو فرقہ پرستی کے شدید مخالف ہیں خود مسلمانوں کو قوم پرستوں اور غیر قوم پرستوں میں تقسیم کر کے ایک نئی گروہ بندی کی بنیاد کیوں ڈال رہے ہیں؟ جبکہ اپنے لیے قوم پرست کا لقب نہ مولانا آزاد نے استعمال کیا، نہ رفیع احمد قدوائی اور دوسرے مسلمان سیاسی اکابر نے۔

قومی یک جہتی تبھی ممکن ہے اگر ہندوستان کے مختلف مذہبی فرقے عمومی طور پر ایک دوسرے کے نزدیک آئیں۔ اس وقت تک غالی سیکولرسٹوں کی غلطی (فتورِ نیّت کا الزام لگانے کے ہم عادی نہیں) یہ رہی ہے کہ وہ مذہبی اقلیتوں کو اس غلط فہمی میں مبتلا کرتے رہے کہ ان کے واحد محافظ وہی ہیں اور اکثریتی طبقہ مجموعی طور پر ان کا مخالف ہے۔ امام صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اس روش کے خلاف آواز بلند کی اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو براہِ راست ایک دوسرے کے قریب لائے۔ امام صاحب سے نہ میں کبھی ملا ہوں اور نہ ان کی شخصیت سے واقف ہوں لیکن ان کا یہ کارنامہ ایک تاریخی کارنامہ ہے۔

امام صاحب پر سیکولر مسلمان ایک الزام یہ لگاتے ہیں کہ وہ جامع مسجد کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ اوّل تو یہ خلافِ واقعہ ہے کیونکہ امام صاحب نے بیشتر سیاسی تقریریں جامع مسجد کے اندر نہیں بلکہ سیاسی پلیٹ فارم ہی سے کی ہیں۔ دوسرے یہ بات کہ مساجد میں سیاسی امور پر غور و فکر مساجد کی بے حرمتی کے مترادف ہے، صرف سیکولر مسلمانوں کی لاعلمی ہی کو ظاہر کرتا ہے۔

کون نہیں جانتا کہ اسلام کے ابتدائی دور میں بیشتر سیاسی منصوبے خلفا نے مساجد ہی میں طے کیے لیکن اگر اسلام کے ابتدائی دور کی بات سیکولر مسلمانوں کو ناگوار گزرے تو یہ حضرات براہِ کرم یہ بتا دیں کہ تحریکِ آزادی کے دوران اور اس کے فوراً بعد جامع مسجد کے منبر سے سیاسی تقریریں ہوئی ہیں یا نہیں؟ کیا مولانا ابوالکلام آزاد نے جامع مسجد کے منبر سے سیاسی تقریریں نہیں کیں؟ مسلم اکابر کو چھوڑیے

کیا جامع مسجد میں ڈاکٹر راجندر پرشاد اور سوامی شردھانند کی تقریریں نہیں ہوئیں ؟ اپنی ان تقریروں میں انھوں نے فقہ کے مسائل بیان کیے تھے یا خالصتہً سیاسی امور پر روشنی ڈالی تھی ؟ اگر ان سب حضرات کے لیے جامع مسجد میں سیاسی امور پر تقریریں کرنا جائز تھا تو شاہی امام کو اس کے لیے نکتہ چینی کا ہدف کیوں بنایا جائے ؟

عجیب بات یہ ہے کہ جو لوگ آج کل شاہی امام صاحب کو مسجد میں سیاسی امور زیر بحث لانے کے لیے مورد عتاب ٹھہرا رہے ہیں، کل تک ان کا بھی یہ موقف نہ تھا۔ مساجد میں سیاست شجرِ ممنوعہ تبھی ٹھہرائی گئی جب امام صاحب نے برسر اقتدار پارٹی کی بجائے جنتا پارٹی اور کانگریس فار ڈیموکریسی کی حمایت میں آواز اٹھائی۔ مندرجۂ ذیل اقتباس مسلم قوم پرستوں کے بہت بڑے مرکز جامعہ ملیہ اسلامیہ کے جریدے "جامعہ" میں شائع شدہ ایک مضمون سے ہے :

"مسجد صرف عبادت کی جگہ ہی نہیں بلکہ کچھ اور بھی ہے۔ یہ زندگی گزارنے کا طریقہ پیش کرتی ہے۔ یہاں دن میں پانچ دفعہ آس پاس کے لوگ جمع ہوتے ہیں، اس سے ان میں ایک خاص قسم کی یگانگت پیدا ہوتی ہے مسجد میں ایک خاص بات یہ ہے کہ یہاں امیر غریب، چھوٹا بڑا، گورا کالا، بادشاہ اور فقیر صفوں میں کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہوتے ہیں۔ اس مساوات کا تصوّر بہت مشکل ہے۔

مسجد میں خطبہ ہوتا تھا، یہاں ملکی معاملات پر بحث اور مشورہ ہوتا تھا، مقدمے فیصل ہوتے اور آپس کے جھگڑے طے پاتے تھے۔ یہاں تعلیم بھی ہوتی تھی۔ غرضکہ مذہبی، سیاسی اور معاشرتی لحاظ سے مسجد کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ عبادت خانہ بھی ہے، دار الشوریٰ بھی، عدالت بھی ہے اور مدرسہ بھی اور بعض وقت مسافر کے لیے ٹھہرنے کا ٹھکانہ بھی بن جاتی ہے۔"

امام صاحب پر یہ اعتراض بھی درست نہیں کہ اپنی دینی حیثیت کے پیش نظر انھیں سرگرم سیاست میں حصّہ لینا نہیں چاہیے تھا۔ مولانا حسین احمد مدنی جن کی قومی خدمات کا راقم الحروف ہی نہیں بلکہ سارا ہندوستان مدّاح ہے بنیادی طور پر مذہبی رہنما تھے مفتی کفایت اللہ ہندوستان کے مفتیِ اعظم تھے جو سب سے بڑا مذہبی اعزاز ہے اس کے باوجود انھوں نے سرگرم سیاست میں حصّہ لیا۔ جمعیتہ العلماء ہند جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، دینی رہنماؤں کی ہی جماعت ہے۔ کچھ سال پہلے اس نے اپنے اس موقف کا اعلان کیا تھا کہ یہ عملی سیاست میں حصہ نہیں لے گی لیکن حالیہ الیکشن میں اس کے موجودہ ذمہ داروں نے باقاعدہ سیاسی مہم میں حصّہ لیا۔ پھر امام صاحب کو اس کا حق کیوں نہیں ؟

حقیقت یہ ہے کہ جتنا غیر فرقہ دارانہ ماحول اس الیکشن میں دیکھنے میں آیا اتنا اس سے پہلے کبھی نظر نہ آیا تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ چاندنی چوک کے پارلیمانی حلقے سے جہاں ہندو ووٹروں کی اکثریت ہے، پہلی بار ایک مسلمان امیدوار بھاری اکثریت سے کامیاب ہوا اور اس کی چناؤ مہم میں سابق جن سنگھیوں نے بھی سرگرم حصّہ لیا۔ یہ ماحول پیدا کرنے میں امام صاحب کا کافی حصّہ ہے۔ اگر سیکولرزم اور قوم پرستی کاروباری متاع نہیں اور ان کی حمایت کا مقصد صالح رجحانات کو فروغ دینا ہے تو امام صاحب نکتہ چینی کے نہیں، ستائش کے مستحق ہیں۔

▲▲

شعری تخلیقات

بلا طلب ارسال نہ کی جائیں

کمیونسٹ محاذی اداروں سے نمٹنے کی ضرورت

گوپال متل

ووٹ شماری سے ایک دن پہلے تک ماسکو کا ریڈیو اسٹیشن "بیس اینڈ پروگریس" اور "سوویٹ عوام کی آواز" دونوں ہی سننے والوں کو یہ یقین دلاتے رہے کہ جنتا پارٹی سے وابستہ یمینی عناصر خواہ کتنی ہی شعبدہ بازی دکھائیں وہ ہندوستانی مزدوروں، کسانوں، چھوٹے تاجروں اور دانشوروں کے اس عزم کو ضعف پہنچانے میں ناکام رہیں گے کہ وہ کانگریس کے حق میں ووٹ ڈالیں کیونکہ مسز اندرا گاندھی کی حکومت نے ڈسپلن کے نفاذ، قیمتوں میں اضافے کی روک تھام، زرعی اصلاحات، پیداوار میں اضافے اور رہن سہن کے معیار کو بلند کرنے کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ لیکن جیسے ہی مسز گاندھی کی پارٹی کو شکست ہوئی ماسکو کو یہ نظر آنے لگا کہ ان کی شکست کا باعث وہ غلطیاں اور زیادتیاں ہیں جو ایمرجنسی کے نفاذ کے بعد دو سال کے عرصے میں کی گئیں اور "ازویستیا" کو یہ بھی محسوس ہونے لگا کہ کانگریس کی شکست کا باعث یہ تھا کہ بیشتر ہندوستانی ریاستوں میں اس نے کیمونسٹ پارٹی آف انڈیا سے تعاون نہیں کیا۔

"ازویستیا" نے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا کہ اگر سی۔ پی۔ آئی۔ کا تعاون اتنا ہی اہم ہو سکتا تھا تو خود سی۔ پی۔ آئی۔ کا انجام بد کیوں ہوا اور وہ کانگریسی امیدوار بد انجام کیوں رہے جو سی پی آئی کی ہمیشہ دہائی دیتے تھے اور جن کے بارے میں ہندوستانی سیاست کے زیرک طالب علم تو یہاں تک کہتے تھے کہ وہ کیمونسٹ گھس بیٹھیے ہیں جو کانگریس کی صفوں میں نفوذ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

جمہوری انتخابات میں حکمران پارٹی کا ہار جانا کوئی انوکھی بات نہیں چرچل تو دوسری جنگ عظیم میں فتحیاب ہونے کے باوجود برطانوی انتخابات میں ہار گئے تھے سی۔ پی۔ آئی اور اس کے ہمسفروں کی شکست ایک جداگانہ حیثیت رکھتی ہے کیونکہ اس سوویٹ لابی کی شکست سوویٹ یونین کی پوری حکمت عملی کی شکست ہے جس کی تکمیل وہ اس لابی کے ذریعے کرنا چاہتی تھی۔

سوویٹ لابی چاہتی تھی کہ مسز گاندھی کی پارٹی کو نہ تو مکمل اکثریت حاصل ہو اور نہ یہ پوری طرح سے ہارے۔ یہ صرف چند سیٹوں سے باقی پارٹیوں کے مقابلے میں پیچھے رہ جائے اور برسر اقتدار آنے کے لیے کیمونسٹ پارٹی کا تعاون حاصل کرنے پر مجبور ہو جائے۔ یہ اسی حکمت عملی کے تحت تھا کہ کیمونسٹوں نے کچھ جگہوں پر کانگریس کا ساتھ دیا اور کچھ جگہوں پر اس کے مخالفوں کا۔ نعرہ یہ تھا کہ وہ سبھی ترقی پسندوں کی حمایت کرے گی اور کیمونسٹ لغت میں ترقی پسند کے معنی کیا ہوتے ہیں، یہ سبھی جانتے ہیں۔ یہ لفظ ہمسفر کا متبادل ہے۔

شری راجیشور راؤ دلی کے پریس کلب میں اپنی پارٹی کا موقف بیان کر رہے تھے تو ان سے ایک سوال یہ پوچھا گیا کہ ان کی پارٹی کے لائحۂ عمل کا فیصلہ ہندوستان میں ہوتا ہے یا روس میں؟ انھوں نے جب یہ کہا کہ سی پی آئی کی ساری پالیسیاں ہندوستان ہی میں تیار ہوتی ہیں تو میں نے انھیں ان کا یہ قول یاد دلایا کہ ہندوستانی کیمونسٹ پارٹی بین الاقوامی کیمونسٹ تحریک کا حصہ ہے اگر یہ قول واقعی ان کا ہے تو پہلے سوال کا جو جواب انھوں نے دیا ہے

وہ ناکافی ہے۔ شری راجیشور راؤ نے اس بات پر اظہارِ حیرت کیا کہ اس قسم کا سوال ایک ہندوستانی اٹھا رہا ہے پریس کلب کا ممبر ہونے کی حیثیت سے میں میزبان بھی تھا اور ویسے بھی بالعموم ایک شخص ایک ہی سوال پوچھتا ہے اس لیے میں خاموش ہو رہا لیکن جب شری راجیشور راؤ اس بات پر اظہارِ حیرت کر رہے تھے کہ کوئی ہندوستانی ان کی پارٹی کے خالصتاً ہندوستانی ہونے پر شک کرے تو اس سے کافی پہلے جنتا پارٹی کے صدر شری مرارجی ڈیسائی جو اب ہندوستان کے وزیر اعظم ہیں۔ یہ فرما چکے تھے کہ "کمیونسٹ پارٹی ہمارے درمیان ٹرائے کا گھوڑا ہے" اور مسز گاندھی بھی اس امر کو مشکوک ٹھہرا چکی تھیں کہ ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی اپنی پالیسیاں طے کرتے ہوئے ہندوستان کے مفادات کو پیشِ نظر رکھتی ہے۔

بہرحال جہاں تک سی۔پی۔آئی۔ کے ایک سیاسی پارٹی ہونے کا تعلق ہے، اس کا وجود اب چنداں اہم نہیں رہا لیکن اس کے معنی یہ ہرگز نہیں کہ ہندوستان اس خطرے سے آنکھیں موندلے کیونکہ کمیونسٹ پارٹی برف کے پہاڑ کی طرح اتنی سطحِ آب کے اوپر نہیں ہوتی جتنی سطحِ آب کے نیچے ہوتی ہے۔ کمیونسٹ نفوذ کی حکمتِ عملی اور محاذی ادارے قائم کرنے میں ماہر ہوتے ہیں۔ ان محاذی اداروں کے ممبر بظاہر کمیونسٹ پارٹی کے ممبر نہیں ہوتے لیکن کمیونسٹ پارٹی اور سوویٹ یونین کی پالیسیوں کو فروغ دینے میں یہ لوگ پارٹی کے باقاعدہ ممبروں سے کہیں زیادہ حصہ لیتے ہیں۔ یہ کوئی الزام نہیں، اس کا اعتراف خود کمیونسٹ نظریے کے ماہروں نے کیا ہے۔ جارجی ڈیمٹروف جو کسی زمانے میں کامنٹرن کے اعلیٰ سطح کے رکن تھے، ان کا کہنا ہے:

"ہمیں یہ بات بھولنا نہیں چاہیے کہ جو شخص ہماری طرف عمومی ہمدردانہ رویہ رکھتا ہے، اس کی قدر وقیمت ایک درجن جنگجو کمیونسٹوں سے زیادہ ہے یونیورسٹی کا ایک پروفیسر جو پارٹی کا ممبر بنے بغیر سوویٹ یونین کے مفادات کے لیے لڑتا ہے، وہ قدر وقیمت میں ایسے سو آدمیوں سے زیادہ ہے جو پارٹی کے باقاعدہ ممبر ہوں ایک ادیب جو پارٹی کا ممبر بنے بغیر سوویٹ یونین کا دفاع کرتا ہے، ایک ٹریڈ یونین لیڈر جو ہماری صفوں سے باہر ہے لیکن اس کے باوجود سوویٹ یونین کی بین الاقوامی پالیسی کا دفاع کرتا ہے، قدر وقیمت میں پارٹی کے ہزار ممبروں سے زیادہ ہے۔"

یہ آثار دکھائی دیتے ہیں کہ ہندوستانی قیادت کو کمیونسٹ خطرے کا احساس اب نسبتاً زیادہ ہے لیکن اس خطرے کا واقعی انسداد کرنے کے لیے یہ بات ہمیشہ پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ کمیونسٹ تہذیبی اداروں میں بھی درس گاہوں میں بھی اور سرکاری محکموں میں بھی متواتر نفوذ کرتے رہتے ہیں۔ ان لوگوں کا اخراج یا انھیں غیر موثر بنانا بہت ضروری ہے۔

نازش بک سنٹر کی پیشکش
گوپال متل
ایک مطالعہ
محمد عبدالحکیم کا مقالہ جو عثمانیہ یونیورسٹی کے ایم۔اے سال آخر کے لیے لکھا گیا۔
گوپال متل کی زندگی اور ان کے ادبی اور شعری کارناموں کا بھرپور جائزہ
قیمت: پندرہ روپے

اردو کے مسلم الثبوت استاد حضرت مائل دہلوی کا ابدا غزلیہ کلام
کلیاتِ مائل
مرتب:۔ مولوی احترام الدین احمد شاغل عثمانی مرحوم
قیمت:۔ تہتر روپے پچاس پیسے
نیشنل اکاڈمی سے طلب کریں

غزل

بسمل سعیدی

تمام نشۂ زعمِ وفا اُتار آیا
بساطِ ناز پہ بازیِ عشق ہار آیا

ہزار حشر کے دن جیسے قبر میں گزرے
کسی کی بزمِ طرب میں وہ شب گزار آیا

عجب فضائے فریبِ نشاط تھی کہ جہاں
نفس نفس مرے سینے میں سوگوار آیا

زہے تصوّرِ مرگ و خوشا خیالِ اجل
وہ ایک لحۂ عشرت کہ بار بار آیا

ہوا بھی روح میں پیوست کچھ مگر پھر بھی
ہنسی ہنسی میں بہت زہرِ غم اُتار آیا

ہزار طرزِ تغافل سے بے نیاز رہا
مگر فریبِ توجّہ پہ مجھ کو پیار آیا

ہنسی تو آئی بہت اجنبی تعلّق پر
مگر پھر اپنے تعلّق پر اشکبار آیا

جہاں جہاں بھی پتا چل سکا محبت کا
وہاں وہاں سے بھی آگے اُسے پکار آیا

دلِ تباہ میں دہلی کی یاد یوں آئی
کہ جیسے کوئی جنازہ سرِ مزار آیا

نہ چل پڑے مرے نقشِ قدم پر اور کوئی
مٹا کے اپنا ہر اک نقشِ رہگزار آیا

نہ لے گئی تھی توقّع نہ لائی مایوسی
امیدوار گیا میں نہ شرمسار آیا

کیا ہے عذرِ کرم یوں ستم ظریفوں نے
کرم، مزاج کو تیرے نہ سازگار آیا

بطورِ شکر کے شرمندۂ ستم تو رہا
مگر کرم پہ کسی کے نہ ہو کے بار آیا

یہ خارِ دامنِ دل میں گلوں سے اچھے ہیں
خدا کا شکر نہ منّت کشِ بہار آیا

جو آیا کوئی ملاقات کے لیے بسملؔ
تو جیسے فاتحہ پڑھنے سرِ مزار آیا

مسلم مسافر خانہ، جے پور

تین مختصر نظمیں

کرشن موہن

گھوڑے

میری بیوی نے اپنے تو سارے گھوڑے بیچ دیے ہیں
لیکن میرا ایک بھی گھوڑا بیچ نہ پائی
میں بھی اپنا کوئی گھوڑا بیچ نہ پایا
چین نہ آیا
میں نے پالے کتنے گھوڑے
من بھرمایا، تن الجھایا
میرے گھوڑے ہوئے نہ تھوڑے

کب یہ گھوڑے بیچ سکوں گا؟

اعتدال

ستار کے تار اگر کسے ہوں بہت زیادہ
تو اُس کا سنگیت روٹھ جائے
ستار کے تار اگر ہوں ڈھیلے
تو اُس کا سنگیت روٹھ جائے
کمال ہے اعتدال ہی میں
جمال ہے اعتدال ہی میں

وِگیان کی کھوج

کوئی شے بے وزن نہیں، ہے کرنوں کا بھی وزن
کتنی گہری ہے وگیان کی کھوج
پانچ مربع میل کے رقبے کی سورج کی کرنوں کا ہے بال برابر

سوالنامے پر اظہارِ خیال

۱۔ جدید ادب، قدیم ادب سے انحراف ہے یا اُس کی بنیادی اقدار کی بحالی ؟
۲۔ جدید ادب میں ہیئتی تبدیلیوں اور موضوعاتی تبدیلیوں کی تناسبی اہمیت کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے ؟
۳۔ تنہائی کا احساس صرف صنعتی پھیلاؤ کا ردِعمل ہے یا یہ ایک تخلیقی ذہن کا ایسا وصف ہے جس کا سماجی نظاموں سے محض نسبتی تعلق ہے؟
۴۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ہر ادب تبلیغ ہوتا ہے کہیں یہ لوگ تبلیغ اور ترسیل کو باہم خلط ملط تو نہیں کرتے ؟ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے ؟
۵۔ جدید ادب کو ایک مدت تک معتوب کرنے کے بعد، ترقی پسند ناقد اب اسے ترقی پسندی کی توسیع قرار دینے لگے ہیں۔ اس میں کسی نئے عرفان کو دخل ہے یا یہ پسپائی کا اعتراف ہے ؟
۶۔ کیا ملک و قوم کی تعمیرِ جدید میں ادب کوئی کردار ادا کر سکتا ہے ؟ جواب اثبات میں ہو تو اس سلسلے میں ادیبوں کو بھگتی تحریک اور صوفی مت کے شاعروں کی طرح ایک نفسیاتی ماحول تیار کرنا چاہیے یا چند مخصوص نعروں کو اپنی نگارشات میں جگہ دینا بھی ان کے لیے ضروری ہے ؟
۷۔ ادب کی تعریف بعض لوگوں نے یہ بھی کی ہے کہ یہ ناپسندیدہ جذبات کے پُرامن اخراج کا ایک ذریعہ ہے۔ اگر ایسا ہے تو اس ادب کو بھی سماجی فریضے کا حامل ماننا پڑے گا جسے بالعموم مریضانہ ادب کہا جاتا ہے۔ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے ؟

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن

صدر شعبۂ اردو، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر

۱۔ یہ سوال ——— دوسرے کئی اور سوالوں کی طرح اُردو ادب کی "نام نہاد ادبی تنقید" کے بنائے ہوئے غیر ادبی اور غیر جمالیاتی "اصولوں" سے پیدا ہوا ہے۔

کل ہم "ادب میں انقلاب اور بغاوت" اور "روایت سے بغاوت" سنتے سنتے پریشان تھے، آج قدیم ادب سے "انحراف" اور "روایت شکنی" اور "روایت سے گریز" کی باتیں سن کر پریشان ہیں۔

کلاسیکی روایات کے پُراسرار سفر سے ہم بے خبر رہے ہیں۔ آرٹ اور ادب کی جمالیاتی قدروں کی جہتوں سے ہم ناآشنا ہیں، ایسی صورت میں، فنونِ لطیفہ میں "انحراف" اور "بنیادی اقدار" کے مفاہیم کی وضاحت سے یہ سوال ہی بے معنی ہو کر رہ جائے گا

اگر کوئی یہ کہے کہ "انحراف" کا فنکارانہ عمل اپنی فطرت میں رومانی ہوتا ہے اور یہ آرٹ اور ادب کی تخلیق کا تقاضہ ہے تو اس سوال کا "انحراف" کہاں رہے گا ؟ دوسری طرف 'رومانیت' کی اصطلاح سے بھی اُلجھن ہوگی، اُردو کی نام نہاد ادبی تنقید نے رومانیت کی گردن میں کبھی تو رسّی ڈال دی ہے۔ ترقی پسندوں نے اپنی اکہری حقیقت نگاری کے چکر میں "رومانیت" کو مجہول سمجھا اور "جدیدیت کے علماء" نے اسے کل کا تماشا تصور کیا۔

انحراف، اقدار، اور رومانیت، وغیرہ کی اصطلاحوں کی تہہ دار معنویت سے جب ہم لوگوں کا ذہنی رشتہ قائم نہیں ہوتا اور ہم ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سنجیدگی سے سمجھنے اور اُن کی معنویت پر غور کرنے کی کوشش ہی کرنا نہیں چاہتے تو ایسی بحثیں بیکار ہیں۔ یوں، یہ سوال میرے نزدیک اُسی وقت چند لمحوں کے لیے باقی رہ سکتا ہے جب فنونِ لطیفہ کی جمالیاتی قدروں اور تخلیق کے پُراسرار عمل کے پیشِ نظر اسے رد کر دیا جائے۔ ایسے بہت سے سوالات آرٹ اور ادب کے معاملے میں گمرہی پھیلانے میں ہمیشہ مدد،

کرتے رہتے ہیں۔
اس سوال میں "انحراف" کا لفظ انتہائی محدود معانی میں استعمال ہوا ہے۔ "بحالی" کا لفظ بھی انتہائی معمولی اور کمزور ہے۔
نئی جمالیاتی قدروں کی تخلیق ہوتی ہے تو کلاسیکی روایات کی خوبصورت ترین لہروں کا تسلسل قائم رہتا ہے۔ تازہ اور نیا جمالیاتی احساس انسان کے پورے سفر کے تجربوں سے رشتہ قائم کر لیتا ہے۔ "بنیادی اقدار" سے آپ کا اشارہ کلاسیکیت کی روح کی طرف ہے اور قدیم ادب کی اعلیٰ جمالیاتی اقدار کی طرف ہے تو مجھے یہ کہنے دیجئے کہ ہر اچھی تخلیق میں اس کی روشنی موجود رہتی ہے اور نیا احساس، نئے رجحان سے اسے دوسری روشنیوں میں جذب کرتا رہتا ہے۔ نئے تجربے کی معنی خیزی، تجربوں کے تسلسل ہی سے ابھرتی ہے۔
جمالیاتی قدروں سے ہی آرٹ اور ادب کی پہچان ہوتی ہے۔ نئی جمالیاتی قدریں کسی نہ کسی سطح پر اہم ترین قدیم جمالیاتی قدروں سے رشتہ قائم کر لیتی ہیں، یہ بھی ہوتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی قدیم، غیر اہم جمالیاتی قدر سے رشتہ قائم ہو جائے اور نیا تجربہ اس پرانے تجربے کو بھی معانی خیز بنا دے ——— یہ سلسلہ جاری رہتا ہے، رجحان جتنا گہرا، بالیدہ اور متحرک ہوگا، جمالیاتی اقدار میں اتنا ہی تحرک پیدا ہوگا۔ کوئی بنیادی اقدار کی "بحالی" کے لیے منشیوں کی طرح قلم کھا کے کھول کر نہیں بیٹھتا، بعض اوقات اچھے فنکاروں کے شعوری انحراف (محدود معانی میں) کے باوجود رشتہ نہیں ٹوٹتا اور شعوری طور پر "بحالی" کی خواہش سے بھی بنیادی اقدار کی بحالی نہیں ہوتی معاملہ پُراسرار تخلیقی عمل کا ہے، ہر ادب کا اچھا جمالیاتی تجربہ اپنی جگہ خود اہم ہوگا اور ساتھ ہی کلاسیکیت کی روح کی روشنی سے باطنی طور پر رشتہ بھی رکھے گا۔
۲۔ جس بات (تبدیلیوں) کی طرف آپ کا اشارہ ہے اُس کے لیے اُس "وژن" کی ضرورت ہے جو سچائیوں کو اپنے باطن یا اپنی "سائیکی" کی سطح پر "نئی صورتوں" میں محسوس کرے اور پھر یہ "نئی صورتیں" تجربہ بھی ہوں اور ہیئت بھی۔
جدید ادب میں "موضوعاتی" اور "ہیئتی تبدیلیوں" کے متعلق آپ جو کچھ بھی فرمائیں، فنکارانہ تجربوں اور اُن کی صورتوں کو جذباتی کیفیتوں میں دیکھنے کو آنکھیں ترس رہی ہیں، جو فنکارانہ تجربے ہیں وہ اتنے کم ہیں اور ان میں بھی پرانی صورتوں میں سچائیوں کو محسوس کرنے کا رجحان اتنا گہرا ہے کہ یہی محسوس ہوتا ہے کہ جدید ادب میں ہیئتی تبدیلیوں اور موضوعاتی تبدیلیوں پر اس طرح گفتگو کرنے کا ابھی وقت نہیں آیا ہے۔
شعوری طور پر سوچنے کا یہ انداز ختم ہوتا ہی نظر نہیں آتا کہ "فلاں موضوع اور فلاں احساس پر نظم کہی جائے اور اس طرح کہی جائے" چھوٹی سی بات بھی اہم ہو سکتی ہے اور ہوتی ہے، معمولی سا احساس بھی آرٹ میں جلوہ بن سکتا ہے اور بنا ہے لیکن خالق کا ذہن ہی یہ کر سکتا ہے۔ چھوٹی سی بات، انتہائی معمولی سی بات یا سامنے کی کوئی بات تماشا بنے تو اسے دیکھنے کی فرصت نکل سکتی ہے لیکن البتہ یہ ہے کہ تماشا بھی نہیں ہوتا، چھوٹے سے غازی میاں لمبی سی دُم ——— یہ تخلیق نہیں ہے۔ تجربے کو ہیئت سے علیحدہ کر کے دیکھنے کی بات بھی "نام نہاد ادبی تنقید" کا کرم ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ہر دور کے نئے فنکارانہ تجربے بنیادی تجربوں سے ہی جنم لیتے رہتے ہیں اور بڑے فنکار صدیوں پرانے بنیادی تجربوں کو بھی اپنے عہد میں معانی خیز بنا دیتے ہیں اور اس طرح جمالیاتی تجربوں کا سفر جاری رہتا ہے تو آپ کیا کہیں گے؟ وہی تازہ تجربہ اہم ہوتا ہے جو بنیادی جبلتوں اور بنیادی تجربوں اور بنیادی احساس سے رشتہ قائم کر لیتا ہے، کسی نہ کسی اہم ترین سرچشمے سے معانی خیز تعلق پیدا کر لیتا ہے۔ موضوعاتی تبدیلی بظاہر جتنی نئی نظر آئے کوئی انقلابی تبدیلی نہیں

ہوتی ، آرٹ اور ادب میں سرمایہ داری کے بعد سوشلزم نہیں آتا ، سوشلزم کے تجربے بھی بنیادی تجربوں سے رشتہ قائم کرکے آرٹ اور ادب میں زندہ رہ سکتے ہیں ، بڑے فنکاروں کے جمالیاتی تجربوں سے ہر دور میں جمالیاتی لذت اور جمالیاتی آسودگی پاتے رہنے کی بڑی وجہ یہی ہے ۔

حسی سطح پر تخلیقی عمل میں جو آمیزشیں یا Synthesis ہوتی ہیں ان کی پہچان بہت مشکل ہوتی ہے ظاہر ہے اس عمل کو ہم اس طور پر نہیں پہچان سکتے کہ یہاں موضوع بدل گیا ہے اور یہاں ہیئت تبدیل ہوگئی ہے موضوع کی طرح ہیئت کی صورتوں کی بھی پہچان تجربوں کے تسلسل میں ہوگی کسی نئی صورت کو اظہار کا ذریعہ بناتے ہوئے کبھی فنکار کا ذہن کٹ کر الگ نہیں ہوجاتا ۔ اسلوب اور ہیئت کی مختلف نئی صورتوں کا مطالعہ ابھی تک خارجی طور پر ہوا ہے ، اپنی مٹی ، اپنے مزاج اور اپنے لوک گیتوں کے آہنگ اپنے گیتوں کے اُتار چڑھاؤ اور اپنے قدیم سرچشموں سے ان کے رشتوں پر نظر نہیں گئی ہے ۔

جن نئی صورتوں کو اردو کے فنکاروں نے قبول کیا ہے وہ صورتیں تجزیہ چاہتی ہیں ، جن نئی صورتوں کو قریب کرنے کے باوجود فنکار کے ذہن نے رد کردیا ہے وہ صورتیں بھی تجزیے کی محتاج ہیں ، نیا تجربہ انسان کے پورے تجربوں سے ایک باطنی رشتہ رکھتا ہے اور ایک نیا تجربہ اپنی اسی تہہ داری سے متاثر کرتا ہے ۔ نیا فنی تجربہ ، پچھلے جانے کتنے تجربوں سے حسی سطح پر رشتہ قائم کرلیتا ہے اور یہی آرٹ کا جادو ہے ۔ ادبی یا فنی تجربوں کا تسلسل ہی ادب یا فنونِ لطیفہ میں اہمیت رکھتا ہے ۔ جدید ادب میں ابھی بہت کم تجربے ، حاصل ہوئے ہیں ، اِن تجربوں کا تجزیہ کرنے والے خوشامد ، چاپلوسی ، سیاست اور ڈپلومیسی سے الگ ہوجائیں تو بہتر ہے ۔ اکثر تحریروں میں ، جو ادبی تنقید کے نام پر لکھی جاتی ہیں ، آپ نے دیکھا ہوگا کہ بات ترقی پسندوں کو برا بھلا کہنے سے شروع ہوتی ہے ، ان کے اصولوں کا مذاق اڑایا جاتا ہے اور المیہ یہ ہوتا ہے کہ ان تحریروں کے "خالق" خود ہی ان اصولوں کے مطابق تجزیہ کرنے لگتے ہیں جو ترقی پسندوں کو عزیز ہیں ۔ اگر یہ اصول اچھے نہیں ہیں ، ان میں لچک نہیں ہے .. .. تو انہیں اُٹھا کر پھینک دیجیے ، اپنے اصول بتائیے ، مغرب کے ڈراما نگاروں اور مختلف نظریوں کے مالک نقادوں کے اقتباسات سے بات نہیں بنتی ، تجزیاتی مطالعے کے وقت ذہن اُن ہی ترقی پسند اصولوں کے قریب ہوجاتا ہے جنھیں 'غیرادبی' اور بیکار کہا جاتا ہے ۔ جدید شاعری کی جمالیاتی قدریں کیا ہیں ؟ یہ بتاتے ہوئے جان نکلنے لگتی ہے ۔ صرف "ڈان کوئی ژوٹ" کی طرح اپنے رسالوں کے صفحات اور اپنی نام نہاد تنقیدی کتابوں میں تلوار بھانجتے رہتے ہیں ۔

میرے نزدیک ، میرے بھائی ، یہ سوال —— کم از کم پچاس سال قبل کیا گیا ہے اور یہ بات موجودہ تجربوں کے پیشِ نظر بھی کہہ رہا ہوں ۔

۴ ۔ تنہائی کا احساس ہو یا کوئی اور احساس ، جب تک فنکار کا احساس بن کر جمالیاتی تجربہ نہیں بنتا کوئی بات نہیں بنتی ۔

تنہائی کا احساس بلاشبہ اس دور کا ایک حاوی احساس ہے لیکن یہ احساس اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ خوف کا احساس یا کوئی بھی بنیادی احساس تنہائی کا احساس کوئی نیا احساس نہیں ہے ، تخلیقی ذہن سے اس کا رشتہ بہت قدیم ہے ۔

میرے نزدیک تنہائی کا احساس بھی اپنے اندر زندگی اور پوری کائنات اور پوری تاریخ کو لیے ہوئے ہوتا ہے اور متحرک تصورات .... اور متحرک پیکروں کو جنم دیتا رہتا ہے ۔ معاملہ تخلیقی ذہن کا ہے ۔

ذات کی تنہائی میں کائنات کے رموز و اسرار سے تخلیقی ذہن رشتہ قائم کر لیتا ہے۔ ہر اچھے خالق کے باطن میں ایک "شیو" ہوتا ہے اور ہر 'شیو' کے باطن میں پوری کائنات ہوتی ہے۔ باطن کے غار میں ڈوب کر بھی اپنے عہد کا گیان حاصل نہ ہو اور اس کی معنویت سمجھ میں نہ آئے اور تجربہ 'جلوہ' نہ بن جائے اور سطحی صورتوں پر نظر رہے تو اکہری حقیقت ہی سامنے آئے گی، سچائی کی تہہ دار کیفیتوں سے ذہن بھلا کیا رشتہ قائم کرے گا۔ اس قدیم تر احساس اور رجحان پر صنعتی پھیلاؤ کا شدید ردِ عمل ہوا ہے لہٰذا یہ رجحان تازہ اور معانی خیز تجربوں کو خلق کر سکتا ہے، علامت سازی اور پیکر تراشی کا عمل تنہائی میں بھی جاری رہتا ہے اور جب ایسا ہوتا ہے تو تنہائی صرف وہ تنہائی نہیں ہوتی جس کا سپاٹ اظہار اکثر ہوتا رہتا ہے۔ سچی بصیرت جب تنہائی کے احساس کو جلوہ بناتی ہے تو اس جلوے میں صرف کوئی اکہری ذات نہیں ہوتی، ٹوٹی ہوئی ذات بھی ذہن کو جانے کہاں لے جاتی ہے، ٹوٹ کر بکھرے ہوئے آئینے میں جانے کتنی صورتیں نظر آتی ہیں یہ ذات کائنات، زمانہ اور عہد اور پورے معاشرے کا آئینہ بن جاتی ہے۔ صنعتی پھیلاؤ نے واقعی فرد کو بڑا تنہا کر دیا ہے لیکن اس کی تنہائی صرف اس کی تنہائی نہیں رہتی، اس میں پورے معاشرے کے جانے کتنے پیکر متحرک ہوتے ہیں اور ان کی پہچان اچھے تخلیقی کارنامے میں ہو جاتی ہے۔

۴۔ وہ وقت کب آئے گا جب "تبلیغ" اور 'ترسیل' کے چکر سے نکل کر سنجیدگی سے فنونِ لطیفہ کو اپنے عہد کے مزاج اور ماضی کے بہتر تجربوں کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں گے؟

'ابلاغ' کے فنی، لسانی اور نفسیاتی پہلوؤں پر غور کرنے کے لیے ان اصطلاحوں سے کس طرح مدد مل سکتی ہے؟ بعض لوگ ایسا کہتے ہیں تو انھیں کہنے دیجیے، ہر دور میں 'تبلیغ' کی تبلیغ ہوتی رہی ہے، 'ترسیل' کی ترسیل میں جو ناکامی ہوئی ہے اسے بھی دیکھیے اور جس قدر جلد ممکن ہو ادب کے طالبِ علم کو دونوں کے چکر سے باہر نکالیے ورنہ افلاطون سے اب تک تبلیغ کی جو داستان سنائی جا چکی ہے پھر شروع ہو جائے گی اور بیدل، امیر خسرو، غالب، حافظ، سعدی، دوستوسکی، شکسپیئر سب مبلغ قرار پائیں گے، ترسیل کی بات آئے گی اور یورپ کے ڈراما نگاروں اور شاعروں کے اقتباسات پیش کیے جائیں گے۔ میرا مشورہ ہے کہ ادب میں ایسے سوالات ہرگز نہ اٹھایئے۔ تجربہ بڑا تلخ ہے تبلیغ، مذہب اور کسی حد تک سیاست کے ساتھ رہے تو یہ لفظ بھلا لگتا ہے اور ترسیل صحافت کے ساتھ رہے تو جچتا ہے۔

۵۔ جدید ادب میں عرفان اور بصیرت کو دیکھیے اور دروں بینی پر نظر رکھیے۔ ترقی پسند رجحان سے اردو ادب میں جو بہتر تخلیقات آئی ہیں ان کا تجزیہ کیجیے اور ادبی اور فنی قدروں کے تسلسل اور نئی سچائیوں کے ادراک اور بصیرت کو دیکھیے، روایات کے تسلسل کو پہچانیے، نئے احساس اور نئے لہجے پر غور فرمایئے۔ بعض ترقی پسند کیا کہتے ہیں اور ان میں کتنا خلوص ہے ان سے زیادہ اہم مسائل سامنے ہیں۔ جدید ادب کے تجربوں اور رجحانوں کا بہتر مطالعے سے بہتر تجزیہ کیا جائے، ادبی روایات کے پُراسرار سفر پر نظر رکھی جائے، ادب کے مطالعے کو عام تاریخ نویسوں کے فارمولوں سے الگ کر کے اس کی اہمیت پر غور کیا جائے کسی بھی عہد کا عرفان ماضی کے احساس کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا، اپنے عہد کا کرب کس میں کیسا ہے اور اس میں کتنی سچائی ہے، پہچان تو تخلیقات کے مطالعے سے ہوگی۔ اپنے عہد کا کرب پھیل کر تہذیب کے پھیلے ہوئے بیکراں کرب سے جاذب ہو کر المیہ کی جمالیاتی اقدار کو کس حد تک پیدا کر سکا ہے؟ میں ادب اور فنونِ لطیفہ میں "بغاوت" اور "روایت شکنی" کی گفتگو حیرت سے

سنتا ہوں۔ نئی تخلیقات کے موضوعات نوّے فیصد
پرانے ہیں، حیثیتِ ماضی بہت کم شعراء میں بیدار اور
متحرک ہے، جو رجحانات پیدا ہوئے ہیں اُن میں بہت
کم توجہ طلب بن سکے ہیں۔ نئے عرفان، نئی آگہی اور
نئے رجحانات کو حیثیتِ ماضی اور روایات سے الگ
دیکھنے والے اور ان رجحانات کو باغیانہ تصوّر کرنے
والے بھی نئی جمالیات کی تلاش وجستجو میں ٹھوکریں کھا
رہے ہیں۔ نئی شاعری اور نئے افسانوں کے
نام نہاد نقادوں کی پسپائی کا منظر زیادہ دردناک اور
المناک بنا ہوا ہے۔ ترقی پسندوں کو کب تک کوستے
رہیں گے۔ ترقی پسندوں سے تبادلۂ خیال کیجئے، ممکن
ہے وہ 'توسیع' کی ایسی تشریحیں کر سکیں جن سے کچھ اور
سچائیوں کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ جہاں تک معتوب کرنے
کا سوال ہے، ہر دور میں ایسا ہوا ہے، بعض لوگوں
نے ایک زمانے میں ترقی پسند خیالات کو پسند نہیں
کیا اور پھر ان کے تجربوں کے بعض پہلوؤں کو پسند
کرنے لگے، یہ تو ہوتا رہتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ اس موضوع پر ترقی پسندوں سے
تبادلۂ خیال کرنے کے لیے بہتر فضا بنانے کی ضرورت
ہے۔ بدنصیبی یہ ہے کہ ہم رسالے نکالتے ہیں تو اکثر ادب
کے ٹھیکیدار بن جاتے ہیں، اس بات کی فکر کھائے
جاتی ہے کہ جدید ادب میں اپنا کیا مقام ہے اپنی
تخلیقات پر مضامین لکھوائے جاتے ہیں اور دوسروں
کو برا بھلا کہا جاتا ہے۔ ہاتھ میں قلم ہوتا ہے اور
اپنا رسالہ ہوتا ہے، مہذب تبادلۂ خیال کی ضرورت
ہی محسوس نہیں ہوتی، جو جی چاہتا ہے لکھا جاتا ہے،
اور جس طرح جی چاہتا ہے لکھا جاتا ہے۔ مہذب تبادلۂ
خیال کے لیے بہتر ذہنی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔
ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ جدیدیت، ترقی پسندی کی
توسیع ہے، آیئے اس موضوع پر گفتگو کی جائے۔ جو
حضرات اس طرح سوچتے ہیں اُن سے کہیے کہ وہ
شریک ہوں، ان کے خیالات کی قدر کیجئے۔ اختلاف
اور اتفاق تو ادب کی دنیا کی تقدیر ہے، اسی سے
سوچ اور فکر آگے بڑھتی ہے دنیا کے کئی ملکوں میں مختلف
اور متضاد خیالات پیش کیے جا رہے ہیں، اختلاف اور
اتفاق دونوں موجود ہیں لیکن ٹھیکیداروں کا غرور
اور گالی گلوج کی وہ فضا تو نہیں ہے جو ہم پیدا کر لیتے
ہیں۔ 'توسیع' کی ایک سے زیادہ جہت ہے ضرورت
ہے کہ اس کی معنویت کو سمجھا جائے اور فنونِ لطیفہ کو دیکھنے
والی سچی نظر سے سچائیوں کو ٹٹولا جائے اور موجود ترقی
پسند نظریے کی اہمیت کو نظر انداز نہ کیا جائے۔

۶۔ بہت ہی پرانا اور فرسودہ سوال پھر زندہ ہو گیا ہے۔ یہ
تو سیاسی کرتب بازوں کے سوالات ہیں۔ ادب کا
کردار اس طرح سپاٹ خارجی نقطۂ نظر سے کبھی سمجھ میں آیا
ہے اور نہ آئے گا۔ فنونِ لطیفہ یا آرٹ کے طالب علم
کے لیے اس سوال میں کوئی کشش نہیں ہے، وہ بھگتی
شاعری اور صوفیانہ شاعری کی قدروں کو بھی اس طور پر
نہیں دیکھتا —— سیاست کے سائے میں تہذیبی
قدروں کو چلنے پر جب بھی مجبور کیا گیا ہے اس قسم کے
سوالات اُبھرے ہیں۔

"کرتا نہیں ہے!"

"کرنا نہیں چاہیئے!"

"بھلا کیوں کرے؟"

اس کی کوئی جہت اس طور پر آسودگی عطا کر دیتی ہے
تو اُنہیں خوش ہو جانا چاہیئے جو "تعمیرِ جدید" میں مصروف
ہیں، احساس اور جذبے کی روشنیوں اور ان کے رنگوں
سے تہذیبی قدریں منور اور رنگین ہو جاتی ہیں۔ یہ کیا کم
بڑی نعمت ہے کہ بعض لوگ تعمیری ادب کا ڈھونگ
رچائیں۔

۷۔ ادب کی یہی تشریح آپ کی توجہ کا مرکز کیوں بن گئی؟
ادب کا حسن تو یہ ہے کہ اس کی سیکڑوں تشریحیں
ہوئی ہیں اور ہوتی رہیں گی، تخلیقی عمل ایک پُراسرار

اور پیچیدہ عمل ہے جمالیاتی تجربوں کا معاملہ بھی پُراسرار ہے۔ ادب اور آرٹ سیدھی لکیر نہیں ہے صرف ایک تشریح اور وہ بھی ایسی تشریح، ادب کو نہیں سمجھا سکتی۔ ناپسندیدہ جذبات اور مریضانہ ادب کے متعلق کوئی ایک رائے نہیں ہو سکتی۔ زندگی کے تمام مظاہر اور انسان کے تمام جذبات موضوع بن سکتے ہیں، فنکار کی شخصیت بھی سپاٹ اور سیدھی نہیں ہوتی۔ وہ جس پتھر کو پسند کر لیتا ہے، اپنے "تجربے" کا حصّہ بنا لیتا ہے اسے مجسمہ اور پیکر بنا دیتا ہے۔ ہیرے کی طرح تراش دیتا ہے۔ ادب کی تخلیق کو "سماجی فریضہ" کہکر اسے ایسا درجہ کیوں دیجئے کہ وہ اپنا سارا حسن کھو بیٹھے، اس کی اپنی دُنیا کا ———— جو علامتوں کی دُنیا ہوتی ہے' احساس ہی گم ہو جائے۔ مریضانہ اور غیر مریضانہ یا صحت مند کی لکیر آپ کہاں سے کھینچنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟ اُردو کی ادبی تنقید کی اصطلاحوں اور ان کی محدود معنویت سے باہر نکل کر فنونِ لطیفہ اور ادب کے متعلق تازہ سوالوں کو اُبھاریئے۔ غور فرمایئے، اس سوال کی بنیاد بھی نام نہاد ادبی تنقید کی اصطلاحوں پر قائم ہے "ناپسندیدہ جذبات" "پرامن اخراج" "سماجی فریضہ"، "مریضانہ ادب" — ان میں سچائیوں کو سمجھانے کی کتنی صلاحیتیں ہیں؟ کتنی لچک ہے ان میں؟ ادب کا قاری آج تو ان سے بہت بلند ہو کر سوچ رہا ہے۔

نہیں۔ لہٰذا غرض یہ ہے کہ عصری تخلیقات کو جدید کہہ کر اس کے مقابلے میں کسی کو قدیم کہہ دینا، مسئلہ کو واضح نہ کرنے کی ایک انجان غلطی ہے۔ قلی دکنی سے پرکاش فکری تک (یہ دو نام بے ساختہ اس لیے یاد آ گئے کہ میں انہیں دونوں کے درمیانی عرصہ پر پھیلی ہوئی غزلوں کے اسلوب کا مطالعہ کر رہا ہوں) کا سفر کیجئے تو کیا کسی مقام پر محسوس ہو گا کہ ادب کی کوئی بنیادی قدر مرے سے مر گئی؟ کس مرحلہ پر ایک کا دوسرے میں پیوست ہونا، ضم ہو جانا، موت کا نہیں، نئی شکل میں زندہ رہنے کا پتہ دیتا ہے۔ ادب کے حد درجہ پیچیدہ سفر کی یہ نامحسوس تبدیلیاں دراصل اپنے Process کا ایک ضروری حصّہ ہیں۔ تداخل کا موسم یہاں ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ آپ انہیں جدید کہہ لیں۔ سمجھنے کے لیے کوئی اور نام دے دیں۔ کوئی مضائقہ نہیں صورتِ حال جب یہ ہو تو پھر انحراف کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا اس کام کے لیے بھی Demarcation line دینی ہو گی۔ جو ممکن نہیں۔

۲۔ جنگ دو ملکوں میں ہوتی ہے۔ قوموں کے درمیان ہوتی ہے۔ دو بھائیوں میں ہوتی ہے۔ جنگ اپنی ذات سے بھی ہوتی ہے۔ موضوع ہر جگہ جنگ ہے۔ لیکن اس کے ادبی اظہار میں جو ہیئت سامنے آئے گی وہ الگ الگ ہو گی۔ ظاہر ہے کہ موضوع کی بنیاد پر نہیں، موضوع کی وصفی تبدیلی کی بنیاد پر گزارش ہے کہ "موضوعاتی تبدیلیوں" کے ٹکڑے پر پھر سے دھیان دیجئے۔ اور اگر انہیں معنوں میں آپ نے اس کا استعمال کیا ہے تو عرض ہے کہ آج ہیئتی تبدیلیاں' موضوع کی وصفی تبدیلیوں کے مقابلے میں عدم توازن کا شکار ہیں۔

۳۔ جی ہاں، یہ ایک تخلیقی ذہن کا ایسا وصف ہے جس کا تعلق فنکار کے اپنے سماج سے محض نسبتی ہے۔ (صرف، صنعت وغیرہ کا کوئی چکر نہیں ہے۔ "بے صنعتی" بھی

منظر کاظمی

استاذ شعبۂ اردو، کریم سٹی کالج جمشید پور۔

۱۔ بحالی کے لیے اُجڑنا ضروری ہے۔ قدیم ادب کی وہ کون سی بنیادی اقدار ہیں جو تباہ و برباد ہو چکی ہوں یا اپنی اثر انگیزیاں سیٹ کر پس پردہ چلی گئی ہوں۔ جدید و قدیم کے درمیان واضح طور پر کوئی خطِ تقسیم کھینچنا آسان

اس کا توجیہ بن سکتی ہے۔ صنعتی پھیلاؤ سے قبل بھی دنیا میں احساسِ تنہائی کی بنیاد پر بڑے ادب کی تخلیق کی مثالیں موجود ہیں۔

۴۔ جو لوگ ہر ادب کو تبلیغ کہتے ہیں وہ یا تو اظہار اور تبلیغ میں فرق نہیں سمجھتے یا تبلیغ اور ترسیل کو یکساں مان کر گمراہیوں کو راہ دیتے ہیں۔ ادب صرف اظہار ہے۔ اظہار کیا ہے، اس سلسلہ میں دوسرا سوالنامہ شائع کیجئے تو مزے کی گفتگو ہو سکتی ہے۔

۵۔ ترقی پسندی، ادب نہیں ہے۔ ادب میں ایک مخصوص ارادہ کو داخل کرنے کا نام ہے (ارادے کی نیکی وغیرہ ایک الگ مسئلہ ہے) لیکن تخلیقی آرٹ کی سطح پر منصوبہ بند ارادے کی توسیع نہیں ہوتی۔ ہئیت و اسلوب کی تبدیلیاں (توسیع) ہو سکتی ہیں کہ یہ ادب کے ارتقائی سفر کی اٹل حقیقتیں ہیں۔

۶۔ ملک و قوم کی تعمیر (اس معنی میں کہ کھانا، کپڑا، گھر، تعلیم، ملازمت اور صحت وغیرہ) حکمراں طبقہ کے نظریے، مزاج اور طریقہ کار پر منحصر کرتی ہے۔ ادب کا اس سے کوئی راست تعلق نہیں۔ ویسے کسی قوم کے اجتماعی کردار کی تشکیل میں ادب کا ایک بالواسطہ رول ضرور رہا کرتا ہے۔

۷۔ جب کہیں پر کوئی چیز کم پڑتی ہو تو ادبی اظہار کا ایک ذریعہ بن جاتی ہے Lakness کے اس احساس کو غالباً کچھ لوگ "ناپسندیدہ جذبات" قرار دیتے ہیں۔ اور اس کے پُر امن اخراج کو ادب مانتے ہیں۔ پھر اس شعر کو کہاں لے جایئے گا۔

کیا لطفِ تن چھپا ہے مرے تنگ پوش کا
اُبلا پڑے ہے جامے سے اُس کا بدن تمام
(میر تقی میر)

بنیادی شے جذبہ ہے۔ لیکن اسے ادب میں منتقل ہونے کے لیے ایک اسلوب کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اور اسلوب کی بنیاد ہی کسی تخلیق کی آپ ادبی حیثیت متعین کرتے ہیں۔ کوئی ادب اگر مریضانہ ہے تو آپ اسے ادب کیسے کہتے ہیں؟ اس میں طرزِ بیان کی کجی موجود ہے۔ تبھی وہ مریضانہ ہے (ناپسندیدہ جذبات کی بنا پر نہیں)

"مجھے طبیہ کالج اور زنانہ کالج دونوں جگہ جانا تھا لیکن یہ سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ طبیہ کالج ہو کر زنانہ کالج جاؤں یا زنانہ کالج ہو کر طبیہ کالج جاؤں —"

(یادداشت کے سہارے اوپر کی یہ سطریں میں نے لکھ دی ہیں۔ ممکن ہے ایک آدھ لفظ کی گڑبڑ ہو گئی ہو) آپ ہی انصاف کیجئے، رشید احمد صدیقی کی بجائے کسی ایرے غیرے کے ہاتھوں یہ مرحلہ درپیش ہوتا تو کیا حشر ہوتا؟ کیسی درگت بنتی؟ آپ اُسے مریضانہ ادب کہتے ہیں میں اُسے طفلانہ اندازِ بیان کی وجہ سے ادب ہی نہیں کہتا۔

شوکت حیات

ڈاکٹر مہابیر بھون، مہندرو، پٹنہ

۱۔ میں اپنے طور پر صحیح ادب یا صحیح جدیدیت کی جو تخلیقی سمجھ داری رکھتا ہوں اسے "انامیت" کا نام دیتا ہوں (اور ۷۰ء سے اپنے افسانوں، رپورتاژ اور مضامین میں اس کا تذکرہ کر رہا ہوں) "انامیت" ہی وہ لفظ ہے جس کی معنوی وسعت اور ہمہ جہتی "صحیح جدیدیت" کی بے انت موجوں کو اپنی گرفت میں لے سکتی ہے —— لہٰذا اس سوالنامے کے جوابات میں "انامیت" یعنی "صحیح جدیدیت" کے حوالے سے دے رہا ہوں۔

لیکن اس سے پہلے کہ براہ راست سوال پر گفتگو ہو، یہ وضاحت ضروری ہے کہ عارضی اور اضطراری ابھرنے والی فیشن زدگی، لیبل زدگی، بیرونی نقالی، افراط تفریط، ادبی عیاشی، لفظی کرتب بازی اور غیر ضروری انتہا پسندی کی آئینہ داری کرتی ہوئی نام نہاد غلط جدیدیت

کے مقابلے میں صحیح جدیدیت یعنی "انامیت" کیا ہے؛
میرے خیال میں "انامیت" نام ہے داخلی کوائف میں عصری انفرادی حیثیت اور دائمی اقدار کی آمیزش سے باطنی اور وجدانی قوتوں کا بے باکانہ اظہار اور اس طرح ادب عالیہ کی تخلیق —
"انامیت" زندگی کے ساتھ صحیح، سچا، مخلص، شدید، حقیقی اور تہہ دار INVOLVEMENT ہے جہاں داخلیت اور خارجیت کی جدیدیت دراتی حد فاصل نہیں۔ انامیت جہاں ایک طرف سیاسی اور پارٹی بند مینی فیسٹو، خارجی و سماجی تابعداری، استحصال پسند روحانی ڈھونگ، شخصیت پرستی، اقتدار پرستی کی زنگ خوردہ زنجیروں کو توڑنے کا نام ہے وہاں دوسری طرف یہ بات بھی صاف ہے کہ انامیت کے زیر اثر وجود میں آنے والی تخلیق صحیح سیاسی، سماجی، روحانی، مادی، تہذیبی، اقتصادی، انفرادی، باطنی، وجدانی اور اجتماعی بصیرت کے لازوال اور آزادانہ تخلیقی اوصاف سے سرشار ہوتی ہے —— سیاسی تبلیغ اور خارجی احکام کی تابعداری اور سیاسی بصیرت اور خارجی آگہی میں فرق سمجھنا "انامیت" کے صحیح ادراک کے لیے ضروری ہے۔
مختصر یہ کہ صحیح جدیدیت یا انامیت جمود، پابندی، حصار بندی، ازم، مینی فیسٹو، فارمولا اور غلامی کی کال کوٹھری سے نکل کر کھلی فضا میں سانس لینے کا نام ہے۔ زندگی کی اصلیت سے براہ راست ہمکناری کا عرفان ہے۔ فنکار کی تخلیقی آزادی کی بحالی انامیت کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انامیت یا صحیح جدید ادب میں بنیادی اہمیت انفرادی حیثیت اور دائمی اقدار کی ہے، جو خارج سے بے خبر نہیں، سماج کی گہری، دائمی اور متغیر حقیقت، متنوع بصیرت، معنویت اور بے معنویت اور کرب لاحاصل سے ناآشنا نہیں بلکہ ان کا شدید عرفان رکھتی ہے۔ صحیح احتجاج اور سرکشی اس کے مزاج کا ناگزیر وصف ہے۔ اس کی تخلیقی انفرادیت اور آزادی سیاسی تبلیغ کا آلہ کار بن کر کسی ازم، نظریے یا خارجی فارمولے کی وکالت، بادشاہت یا حمایت نہیں کرتی۔ یہ دلالی انامیت کو کسی بھی حقیقت پر منظور نہیں۔

اب سوال کی طرف آیئے۔ مذکورہ بالا بیان کی روشنی میں صحیح جدید ادب نہ صرف قدیم ادب سے انحراف ہے۔ اور نہ صرف اس کی بنیادی اقدار کی بحالی —— صرف انحراف ہی انحراف یا اعتراف ہی اعتراف صحیح ادب میں کوئی چیز نہیں ہوتی۔ صحیح جدید ادب نہ صرف انحراف بلکہ اعتراف، اجتہاد اور اعتقاد کی جو مکھی چال چلتی ہوئی بیکراں تخلیقی لہروں کا نام ہے۔ سچ پوچھیے تو صحیح جدید ادب بیک وقت قدیم ادب سے انحراف اور اس کی چند بنیادی اقدار (جنھیں میں دائمی اقدار سمجھتا ہوں) کی بحالی ہے۔ لیکن اس بحالی میں مثبت ترمیم و تنسیخ، اعتراف و انحراف اور ردّ و قبول کا عمل جاری ہے۔ کیوں کہ کائنات کی تمام اشیاء دائمی اور متحرک ہونے کے ساتھ ساتھ مائل بہ ارتقاء اور تبدل پذیر ہیں۔

اس طرح صحیح جدید ادب نہ صرف قدیم ادب بلکہ اب تک کے تمام ادبی رجحانات اور میلانات کے MINUS POINTS سے انحراف اور PLUS POITS کے اعتراف کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کے ان لمحوں میں جن میں فنکار کی ذات ملوث اور لہولہان ہے۔ فنکار کی انفرادی، باطنی، شعوری اور وجدانی بصیرت کی وہ ہم آمیزی ہے جو صدیوں پیچھے اور صدیوں آگے دیکھنے کا گہرا اور صحیح ذہن رکھتی ہے —— یہ ایک خاص بات ہے کہ انامیت کی موجودہ دائمی تخلیقی سمجھداری ہر عہد میں تخلیقی حدت کی صحیح نشاندہی میں لازوال اور بے انت کیلوری میٹر کا کام کرے گی۔

ایک زمانے تک ادب کی بنیادی اقدار پر تفریح اور اسٹیبلشمنٹ کی تحسین و تنظیم، سیاسی تبلیغ کی تابعداری شخصیت و اقتدار پسندی کی اشتہار بازی اور نعرہ بازی جیسی لعنتوں کا تسلط تھا —— ظاہر ہے اس طرح کے مائنس پوائنٹس کے نام "انامیت" کھلا ہوا احتجاج ہی نہیں بلکہ

انقلاب ہے۔

۲۔ میں ذاتی طور پر موضوعاتی اور ہیئتی تبدیلی کی وحدانیت
کا عقیدہ رکھتا ہوں۔ صرف موضوعاتی تبدیلی یا صرف
ہیئتی تبدیلی سے ادبی اور تخلیقی سطح پر چھوٹی بات کو بڑی
بات میں تبدیل کرنا ممکن نہیں۔ میرا تو ایمان ہے کہ دونوں
کے اندر جو ناگزیر وحدانی رشتہ ہے اسے الگ کر کے
دیکھنے کا امکان تخلیق کی ماہیت اور معنویت کو مشتبہ
بنا دیتا ہے۔ بڑا اور صحیح ادب وہی ہے جس میں دونوں
کا بہترین اور ناگزیر امتزاج ہو۔ یوں بھی ہم ذرا غور سے
دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ تخلیقی ہیئت کے بغیر موضوعاتی تبدیلی
صحافت سے آگے نہیں بڑھتی اور موضوعاتی تبدیلی سے الگ صرف
ہیئت کا تجربہ VACCUM کی طرح بے اثر ہو کر رہ
جاتا ہے۔ اگر فنکار کا شعور، تحت الشعور، لاشعور تخلیقی طور
پر بالیدہ ہو اور اس کی زندگی اس کے تجربوں اور مشاہدوں
میں تپ رہی ہو، موضوعاتی تبدیلی اپنا متبدل فارم خود
لے کر آتی ہے —— میں نے اپنے چند افسانوں میں
ایک دو تجربے اس طرح کے ضرور کیے ہیں جن میں بظاہر
ہیئتی تبدیلی نمایاں نظر آتی ہے اور موضوعاتی تبدیلی پس
پشت جا پڑتی ہے: —— کیفیت سیریز کی کہانیاں
"شگاف، دراڑ، خلا، ہوا" (آہنگ)، "لا" (شب خون)
"اننت کا اننت" (توازن)، "بریکٹوں کے درمیان
ایک دائرہ" (نشانات) وغیرہ —— لیکن یہ حقیقی
صورت حال نہیں۔ خارجی اثرات اور مشروط مصلحتوں
سے اوپر اٹھ کر نہ سوچنے کی وجہ سے ان کہانیوں پر اس
طرح کے الزامات لگائے گئے۔ سچ یہ ہے کہ وہاں دونوں
تبدیلیوں کے درمیان ناگزیر وحدانی رشتہ قائم ہے۔

۳۔ صنعتی پھیلاؤ نے انسان کو تنہا بنایا ضرور ہے لیکن فنکار
کے یہاں صرف یہی ایک تنہائی جو تمام حساس انسانوں
میں مشترک ہے، اس کے تخلیقی کرب اور انفرادیت
کا سبب نہیں بنتی۔ بلاشبہ صحیح تخلیقی فنکار اپنے صحیح تخلیقی
لمحوں میں ازل سے تنہا رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا ——
یہ صحیح ہے کہ صنعتی پھیلاؤ، سیاسی بدعنوانیاں، تمام نام نہاد
نجات دہندگان کا کھوکھلاپن، ازموں کی آڑ میں انسانوں
کا خون چوسنے کی جدید خونخوار تہذیب، مذہبوں کی باہمی
ریشہ دوانی اور ایک دوسرے کی تکذیب، صحیح آدمی کی
بے بضاعتی اور احساس لاحاصلی، خودسری، مطلق العنانی،
فرقہ واریت، تخریب پسندی، معاشی، اقتصادی، سماجی
ابعاد، ذہنی غلامی و پسماندگی اور دیگر تمام غیر انسانی وحشیانہ
لعنتوں نے ہمیں نوچ نوچ کر انسان تک نہیں رہنے دیا
ہے۔ ذات ریزہ ریزہ ہو گئی ہے۔ ہمیں اس بھری پری
دنیا میں اکیلا اور تنہا بنا دیا ہے۔ کانوں کے پردے پھاڑتے
ہوئے شور و ہنگامہ کے درمیان مہیب سناٹا بھر دیا
ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ تنہائی تخلیقی ذہن کا بنیادی وصف
ہے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ آج کے دور کے صنعتی پھیلاؤ
کی لعنتوں اور مذکورہ بالا صعوبتوں نے آج کے فنکار کی
بنیادی تخلیقی تنہائی کو شدید اور ہیبت ناک بنا دیا ہے
جیسے ہم جیتے جی عذاب قبر میں مبتلا ہوں اور ہماری ہڈیاں
چٹخ رہی ہوں —— پہلے کے ادیبوں کی تنہائی
ایک حد تک بڑی معصوم اور بے ضرر تھی۔ میرے خیال
سے ان کا سماج اور ذات کی تلخ حقیقتوں سے کوئی گہرا
تعلق بھی نہیں تھا جب کہ آج کے صحیح فنکار اس
ہیبت ناک تنہائی کو نہ صرف جھیلتے ہیں بلکہ تخلیقی سطح
پر اس کے اسباب و محرکات کے خلاف احتجاج بھی
کرتے ہیں۔

۴۔ صحیح تخلیقی ادب "تبلیغ"، جیسی سیاسی اور ترسیل جیسی
سطحی اصطلاح سے بلند اور عمیق ہوتا ہے۔ تخلیقی سطح پر
ایک تخلیق ایک ذہن سے دوسرے ذہن میں جس طرح
منتقل ہوتی ہے اس کے طریقہ کار اور دائرہ اثر میں
تبلیغ اور ترسیل جیسی نام نہاد ترکیبوں کے مقابلے میں
زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ تخلیقی ادب اس طرح
ذہنوں میں جڑ پکڑتا ہے کہ اس کی انگنت شاخیں سینہ بہ
سینہ، نسل در نسل، صدیوں سے صدیوں تک اپنی

سبز و شاداب پتیوں اور پھلوں کی بہاریں دکھاتی ہیں۔
یہ عمل خود کار، فطری، ہمہ جہت اور تہہ دار ہوتا
ہے اور تشکیک و ابہام یہاں ترسیل کے نئے نئے
معنوی دروازے کھولتے ہیں۔ جب کہ تبلیغ اور
ترسیل کے اصطلاحی مفاہیم بہت ہی محدود، غیر
تخلیقی اور اکہرے ہوتے ہیں ——— میرا تو خیال
ہے کہ اس طرح کی ٹرمینالوجی تخلیق کے معنوی امکانات
کو محدود کرتی ہے۔

۵۔ ترقی پسندوں کے یہاں بھی دو مکاتب فکر ہیں۔
ایک وہ جو اسے ترقی پسندی کی توسیع قرار دیتا ہے
اور دوسرا وہ جو اسے ترقی پسندی کا رد عمل گردانتا
ہے۔ خود نام نہاد جدید حضرات میں بھی دو گروہ
موجود ہیں۔

اب جہاں تک انامیت (یعنی صحیح جدیدیت) کی
بات ہے، میرا ذاتی خیال وہی ہے (سوال نمبر ۱ کا
جواب) کہ اس میں اب تک کے تمام صحیح ادبی اثاثے کی
تمام پلس پوائنٹس کا ذخیرہ شامل ہے اور تمام مائنس پوائنٹس
کی علتوں سے یہ پاک ہے۔ اس کے علاوہ اس کے
اپنے ذاتی اوصاف بھی ہیں۔

۶۔ ادب دراصل احساس و مفہوم کی تخلیقی دنیا ہے اور
تخلیقی دنیا ہی صحیح معنوں میں تعمیری دنیا ہوتی ہے۔ ہر
صحیح فن پارہ شعوری کوشش کے بغیر بالواسطہ طور پر اپنے
آپ میں ایک نئے اور صحیح معاشرہ، ایک نئی کائنات اور
ذات کی گوناگوں پیچیدگیوں کی دریافت نو کا وسیلہ بنتا
ہے۔ صحیح اور اعلیٰ اقدار کی جستجو، انسان دوستی کا مظاہرہ،
مکاریوں اور سفاکیوں کے خلاف احتجاج ——— یہ
دنیا کی کون سی صحیح تخلیق نے نہیں کیا۔ شرط ہے سچی، مخلص
اور باشعور تخلیقی بصیرت اور عرفان و آگہی کی۔

صحیح فنکار گرد و پیش کے ماحول سے بے خبر نہیں رہتا۔
اپنی داخلیت اور گرد و پیش کے ماحول سے شدید، سچا اور
ایماندارانہ تعلق اس کے تخلیقی وجدان کا ناگزیر حصہ ہوتا
ہے ——— لیکن ایک بات ذہن نشین رہے
کہ صحیح فنکار کبھی ESTABLISHMENT کا پرچارک
نہیں رہا۔ نعروں کی اہمیت سیاسی اور شاہانِ وقت کے
بھانڈوں کے یہاں ہوگی، فنکاروں کے یہاں نہیں۔
فنکار کا منصب شاہانِ وقت اور دیگر دنیاوی بلند قامتوں
سے کہیں بلند ہوتا ہے ——— کئی پیڑھیوں سے گزرنے
کے بعد ہم نے بادشاہوں، جاگیرداروں، زمینداروں اور
اب وزراء اور اسٹیب لشمنٹ کے دیگر کلیدی کل پرزوں
کی غلامی اور نعرہ بازی سے اپنے اظہار کے سب سے قیمتی
وسیلوں "الفاظ" کو آزاد کیا ہے۔ ہمارے "الفاظ"
کی غیر مشروط وفاداری اور وابستگی (بلکہ اسے وفاداری
اور وابستگی کے بجائے INVOLVEMENT کہا جائے
تو زیادہ بہتر ہے) ہمارے صحیح تخلیقی لمحوں سے ہے۔ بس۔
دیگر تمام باتیں غیر ادبی مکاریوں کی دلیل ہیں۔

صحیح فنکار کی انسان دوستی نام نہاد آئیڈیلزم، نعرہ بازی
رومانویت اور دیگر سطحی اور طے شدہ خصلتوں سے پاک
ہوتی ہیں۔ عذاب آگہی جھیلتے ہوئے وہ ان گھناؤنے
ہاتھوں کو خوب اچھی طرح پہچانتا ہے جو اپنے ملک اور
قوم ہی نہیں تمام عالمی انسانی برادری کا چہرہ مسخ کرنے کے
در پے ہوتے ہیں۔ خیر و شر کی داخلی اور خارجی جنگ کا احوال
بیان کرتے ہوئے وہ پوری ایمانداری کے ساتھ خیر کی پے بہ پے
شکست، اپنے لہولہان ہونے کی صعوبت، اقدار کی بے
وقعتی، زندگی کی لاحاصلی اور بے معنویت اور اپنی بے بضاعتی
کا اعتراف کر کے ملک اور قوم ہی نہیں پوری انسانی برادری
کے سامنے اپنی تخلیقی صداقت پسندی اور مخلص ہوشمندی کے
عرفان کا اظہار کرتا ہے۔

اگر تخلیق صحیح ہو۔ زندگی کے صحیح عرفان اور آج کے عہد
کی بے معنویت کی صحیح شناخت کے ساتھ اس الٹتی ہوئی
دنیا کو سیدھا کرنے کی احتجاجی حرارت بھی اس میں رواں دواں
ہو تو شعوری طور پر صوفی مت کے شاعروں کی طرح نفسیاتی
ماحول بنانے کی کیا ضرورت؟ یہ تو ایک ناگزیر عمل ہے

جو لاشعوری اور بالواسطہ طور پر جانے انجانے تمام صحیح فنکاروں
کے یہاں جاری و ساری ہے۔ انہیں اپنی اپنی انفرادیت
کے ساتھ ایک دوسرے کے قریب لا رہا ہے۔ انفرادیت
کے ان دریاؤں سے ملی جلی انفرادیتوں کے نفسیاتی ماحول کے
ایک بڑے سمندر کی تشکیل کا کام تو خود بخود جاری ہے —
جب جب اظہار نے وقار کو نہیں چھوڑا ہے، مصلحتوں سے
سمجھوتہ نہیں کیا ہے، یہ کام جاری رہا ہے —— اس
لیے ادیبوں کو پوری ایمانداری اور صداقت کے ساتھ صحیح
ادب کی تخلیق کے سوا اور کچھ کرنے کی فی الحال کوئی "ضرورت"
ہی نہیں —— باقی کام تخلیقات کی تخلیقی چنگاریاں
از خود کر لیتی ہیں۔

۷۔ ادب کی تعریف کے سلسلے میں ناپسندیدہ جذبات کے
پرامن اخراج کی غیر ادبی تخصیص اور حصار بندی نہیں
کی جا سکتی۔ صحیح ادب میں جذبات سے زیادہ اہمیت
حسیت کی ہوتی ہے اور اس کی پیش کش خواہ وہ پسندیدہ
ہو یا ناپسندیدہ، اگر تخلیقی صداقتوں اور داخلی کوائف کی
روشن آگ میں تپ کر ہوتی ہے تو آپ تو جانتے ہیں
کہ آگ "تطہیر" کا کام کرتی ہے۔ مختصر یہ کہ مریضانہ ادب
وغیرہ جیسی اصطلاح سیاسی کرتب بازی اور ذہنی دیوالیہ پن
کے سوا اور کچھ نہیں۔

لاہور کا جو ذکر کیا

غیر منقسم پنجاب کی کہانی گوپال متل کی زبانی
ذکر اکس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
دوسرا ایڈیشن —— قیمت: دس روپے

کرشن موہن کی شاعری کا نیا رنگ

گیان مارگ کی نظمیں

دوسرا ایڈیشن جو آفسیٹ کے طریقے سے چھاپا گیا ہے
قیمت —— دس روپے

رُو بہ رُو

کمار پاشی کی غزلیں
قیمت: دس روپے

نگاہِ شوق

دھرم سروپ کا متصوفانہ کلام
قیمت: دس روپے

ارمغان بہار

اے سی۔ بہار کا تازہ مجموعۂ کلام
قیمت: دس روپے۔

یادوں کے سائے

ممتاز میرزا کی منتخب غزلیں
قیمت: بیس روپے

برگ سبز

آزاد نوحی کی حمد، نعت اور منقبت کے علاوہ کلاسیکل
انداز کی غزلیں اور قومی نظمیں۔ قیمت: دس روپے

حسابِ رنگ

بانی کا تازہ مجموعۂ کلام
قیمت: پندرہ روپے

سازِ رگِ جاں

کرشن مراری کی غزلیں، نظمیں، قطعات اور دوہے
قیمت: دس روپے

آذان

شباب للت کا تازہ مجموعۂ کلام۔ قیمت: چھ روپے

غزلیں

ضیا فتح آبادی

اس کا ستارا اب ہے یقیناً زوال میں
انسان بٹ گیا ہے جنوب و شمال میں

اُڑنے کا نام لیتا نہیں پھر وہ عمر بھر
طائر جو آ پھنسے کوئی اس مایا جال میں

اب اُن سے کیا اُمید کہ آیا بھی ہے کبھی
دامن جواب کا مرے دستِ سوال میں

جو خود ہی لوٹ جاتی ہے رکھدی ہے کس لیے
ایسی کڑی بھی سلسلۂ ماہ و سال میں

اُلجھا رہے گا یہ دلِ ناداں اسی طرح
کب تک غمِ فراق و نشاطِ وصال میں

جب پوچھتا ہوں کیا ہے کلامِ جگر گداز
کرتے ہیں پیش شعر مِراہی مثال میں

اُس رند پر نثار خم و جام اے ضیاؔ
دیکھے شکستِ توبہ جو شیشے کے بال میں

▲▲

○ 21/5 - ال راجوری گارڈن، نئی دلّی

عروج زیدی

کس کی آنکھوں سے جمالِ فتنہ ساماں دیکھیے
زندگی کی دھڑکنوں کو پا بہ جولاں دیکھیے

اس نظر سے دامنِ صبحِ گلستاں دیکھیے
پھول کے اوراق میں اسرارِ عرفاں دیکھیے

عقل گم، اوسان گم، احساس گم، ادراک گم
دیکھیے اب یہ مآلِ دیدِ جاناں دیکھیے

عالمِ صورت میں ہے یہ جانِ حُسنِ کائنات
ایک مُشتِ خاک کی شانِ نمایاں دیکھیے

خانقاہیں سونی سونی، مے کدے آباد ہیں
آج کی دُنیا میں رنگِ دین و ایماں دیکھیے

ایک قطرہ، موج، سرکش موج، موجِ تہہ نشیں
میرے ان الفاظ میں تاریخِ انساں دیکھیے

ماتمِ تاریکیٔ شامِ الم کب تک عروجؔ!
آسماں پر آپ فطرت کا چراغاں دیکھیے

▲▲

○ گھیر سیف الدین خاں، رامپور

مختار ہاشمی (مرحوم)

بے وفا لمحوں سے کچھ لوگ خفا ہیں کتنے
ان میں شائستۂ تہذیبِ وفا ہیں کتنے

کس سے منہ موڑیے کس کس کی پرستش کیجے
اِس خرابے میں خدا جانے خدا ہیں کتنے

زندگی دیکھ ہی لے گی کبھی وقت آنے پر
ہم بھی بیگانۂ احساسِ فنا ہیں کتنے

آ گئی جوش میں رحمت تو نہ دیکھے گی کبھی
آپ آلودۂ عصیان و خطا ہیں کتنے

آزمائش کی کڑی دھوپ کے حاصل یارب
اب یہاں صاحبِ تسلیم و رضا ہیں کتنے

قبلِ زحمت یہ مسیحا سے کوئی تو پوچھے
تیرے بیماروں میں محتاجِ شفا ہیں کتنے

▲▲

○ مرسلہ، جلد یک شہبازی، ترکمان گیٹ، علی گڑھ

نظمیں

احتشام اختر

ہم سے مت پوچھو

کھلے نیلے آکاش کے بارے میں
ہم سے مت پوچھو
ہم نے آسمان نہیں دیکھا
ہم نے تا حدِ نظر
صرف دھند دیکھی ہے
کھلے مناظر کی شادابی
ہم سے مت پوچھو
ہم نے ماحول پر سے
صرف برف جمی دیکھی ہے
سرد برفیلے ماحول میں
روشنی اور گرمی کی باتیں نہ کرو
اپنی آنکھوں کے اب سارے چراغ
گل کر دو
کہ ان سے دل کی برف نہیں پگھلے گی
صدیاں گزر گئیں
ہمیں آسمان دیکھے ہوئے
اب سورج کبھی نہیں نکلے گا
اب آسمان کبھی دکھائی نہیں دے گا
کھلے نیلے آکاش کے بارے میں
ہم سے مت پوچھو
ہم نے آسمان نہیں دیکھا

حمید سہروردی

سفر کیوں عزیز ہے!

سفر کیوں عزیز ہے
اب وہاں کون ہے
ڈھول ہے نہ ریت ہے
دھواں ہے نہ آگ ہے
سراب ہی سراب ہے
راستے میں آبلہ پا
منزلیں کہر کہر
تو — پھر کیوں اُدھر کمر باندھ کر چلیں
سفر کے جسم پر بہیں بہا سے ہی بہا سے
رات سیاہ سنگ ہے
گنڈے اور تعویذ وہم کی اضافتیں
سگریٹ کی ایک چنگاری
کلمہ کی انگلی میں
راکھ بن کے رہ گئی
صابن کی ٹکیہ کو رُخ پہ پھیر لے ذرا
اپنے دائیں بازو پر امام ضامن باندھ لے
سفر کے گرد آگ ہے
سارے ہتھیاروں سے لیس
سفر پر کمر باندھ لے
کھجور کے درختوں سے
آ رہی ہے یہ صدا
سفر ہی عزیز ہے

○ شعبۂ اردو گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج، کوئٹہ
○ شعبۂ اردو، نوگن کالج، بہیڑ

سانپ کی لاش

سلیم تمنّائی

پہلا منظر

اسٹیج کا پردہ دھیرے دھیرے اُٹھتا ہے۔ راجا دُشنت تخت پر براجمان ہے، دائیں بائیں دو خوبصورت کنیزیں پنکھا جھل رہی ہیں، راجا کے سامنے دو قطاروں میں درباری زرق برق لباسوں میں ملبوس بیٹھے ہیں۔ ایک جانب مہا پنڈت کوکا شاستری رونق افروز ہیں۔ راجا دُشنت نے وزیر کے کان میں کچھ کہا اور وزیر نے تالی بجائی۔ تالی کی آواز کے ساتھ رم جھم رم جھم باجتے حسین قدم آگے بڑھنے لگے۔ حسین وجمیل سڈول منیکا راجا کے سامنے آئی دونوں ہاتھ جوڑ کر سلام کیا۔ پھر گلاب کی پنکھڑیوں سے نازک لال لال ہونٹوں پر شریر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے مہا پنڈت کوکا شاستری کو سر سے پیر تک گھور کر دیکھا اور اپنی باجتی پائل کے ساتھ راجا دُشنت کی طرف مڑ کر ایک ادائے دلربائی سے ہونہہ! کہہ، چٹکی بجا، شہادت کی انگلی مہا پنڈت شاستری کی طرف اٹھا کر مسکرا دی جواب میں راجا دُشنت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھِلتی نظر آتی ہے۔

منیکا:- راجن! اجازت دیجیے کہ میرے بے چین قدم سکون پا سکیں اور میری پائل بھی۔

راجا نے مسکرا کر اپنی انگلی ہوا میں لہرائی اور منیکا کے حسین بے چین قدم ناچنے لگے۔ کولھے مٹکنے اور ہاتھ سانپ کی طرح لہرانے لگے۔ خوبصورت آنکھیں اور حسین لب نہ جانے کیا کچھ کہہ رہے تھے۔

آخر سارے گھنگھرو اپنی انفرادیت کھو کر ایک آواز میں تبدیل ہو گئے۔ یہ رقص کا نقطۂ عروج تھا اب راجا نے پھر شہادت کی انگلی ہوا میں لہرائی اور منیکا تڑپ کر راجا کے قدموں میں جا گری، پھر سنبھل کر اٹھی۔

منیکا:- (راجا سے) راجن! —— ناچ سے پہلے میں نے جو جھلک پنڈت کوکا شاستری میں دیکھی تھی، زندگی کی..... (مسکرا کر) زندگی کی جھلک... اب اس میں کمی نظر آ رہی ہے۔ دشمن کو حقیر سمجھنا بے وقوفی ہے۔

راجا:- تم نے ہر پنڈت سے لوہا لیا ہے لیکن مہا پنڈت کوکا شاستری سے جیت نہ سکو گی۔

منیکا:- یہ آپ کا خیال ہے نا راجن؟

راجا:- ہاں! ہمارا خیال ہے مینو!

منیکا:- اچھا؟ (ایک ادائے دل ربائی سے پنڈت کی طرف دیکھ کر) لیکن گستاخی معاف راجن! اکثر خیال خیال ہی ہوتا ہے۔ لیکن مہا پنڈت کوکا شاستری کا کیا خیال ہے؟...... ہا ہا ہا۔

کوکا پنڈت:- (غصّے میں) منیکا!

منیکا:- میرے گلے میں گھنگھرو بج اٹھے اور آپ آگ ہو گئے؟ پنڈت جی! میں بائیں پسلی ہوں، آدم کو جیتنے والی۔ وشوامتر کو تپ سنگھاسن سے اتارنا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے اپنا۔ راجا دشنت کی انگشتری کب

دودھ پیر مکان عید گاہ۔ بیسور۔

تک مچھلی کے پیٹ میں رہے گی سرکار؟ ......
میں مینکا ہوں۔ اور اس کی بیٹی شکنتلا بھی۔
راجا:۔ (مسکرا کر) اچھا؟
مینکا:۔ {پنڈت کی طرف ناگن کی طرح مڑکر} آپ کا دست
من متھ کہاں ہے پنڈت جی!
کوکا پنڈت:۔ {سینے کو بڑے فخر سے پھلا کر} میں نے اُسے
قتل کر دیا ہے۔
مینکا:۔ اچھا؟ {طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ} آپ کی تیسری
آنکھ نظر نہیں آتی شنکر جی؟ کہیں تانڈو کے ہاتھوں
دھرتی کے ساتھ ساتھ آپ کی تیسری آنکھ کا بھی ناش
نہ ہو گیا ہو......
{مسکرا کر سرگوشی کے لہجے میں} میرے سوال کا
کوئی جواب بن نہیں پڑ رہا ہے نا؟
{ایک چھوٹے ٹھگنے قد کا خوب صورت مگر اندھا
آدمی تیر کمان سنبھالے مینکا رانی! مینکا رانی! کہتا
ہوا داخل ہوتا ہے}
مینکا:۔ {بڑھ کر اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے} پیارے کام دیو!
پیاسی کب سے راہ دیکھ رہی ہے!
کام دیو:۔ {اس کے چہرے کو ٹٹولتے اور اس کے خوبصورت
لبوں پر شہادت کی اُنگلی رکھتے ہوئے} ندیا تو تم
ہی ہو۔
مینکا:۔ نہیں کام دیو پیارے، تم کنواں ہو اور یہ
سارا جگت پیاسا۔
کام دیو:۔ مینکا رانی! کوئی کہتا ہے کہ میں ایسا کنواں ہوں
جو خود چل کر پیاسے کے پاس آتا ہے۔
مینکا:۔ {مسکرا کر} کام دیو پیارے! ترکش میں تیر تمہارے
ہی پاس ہوتے ہیں۔ شکاری کو شکار ڈھونڈنا ہی
پڑتا ہے مگر یہاں شکار خود سر کے بل چل کر تمہارے
قدموں میں آتا ہے، اور تیر کھا، شکاری کو اُلٹے دعائیں
دے، درد کی لذت سے آشنا، زخم کو سینے سے
لگائے لوٹتا ہے۔

کام دیو:۔ سب غلط، سب غلط! شیطان اور ملک الموت
ناحق بدنام ہیں۔ یہ ہتھیار ہیں۔ ان کے پیچھے ہاتھ
کسی اور کے ہی ہیں۔
مینکا:۔ بڑے بھولے ہو کام دیو! بڑے ہی بھولے،
خدانخواستہ تمہاری اندھی آنکھوں میں جوت ہوتی
تو نہ جانے کتنی روشن آنکھوں کی روشنی چھین لیتے تم۔
{مسکرا کر} خوب فائدہ اٹھاتے ہو اپنی ان اندھی
آنکھوں سے۔ ریاض کے ہاتھوں سے تاک کر نشانہ
لگایا اور شکار کی آہ پر بڑے بھولے پن سے کہا،
کون تھا؟ {مسکرا کر} لیکن میرے یار۔ یہ بتاؤ
کہ تیر سیدھا دل میں کیوں جا لگتا ہے، کہدو
کہ میں کیا جانوں۔
کام دیو:۔ {بڑے بھولے پن سے} ہاں میں کیا جانوں!
راجا دشنت:۔ مینکا! تم سے ہمارے ننھے دوست کام دیو
جیت نہ سکیں گے۔
کام دیو:۔ ناری کو زبردستی کوئی جیت نہیں سکتا۔ یہ میرے
جنم جنم کا تجربہ ہے۔
مینکا:۔ مینکا ہار نہیں جانتی، لیکن شکنتلا بے چاری! ہائے،
وہ ہمیشہ ہاری ہے {راجا کی طرف مسکرا کر دیکھتے
ہوئے} کسی کے گلے کا ہار بننے کے لیے۔
کوکا پنڈت:۔ {دائیں ہاتھ کی مٹھی بھینچتے ہوئے} مینکا
ہارے گی۔
مینکا:۔ {اپنی مسکراہٹ بکھیر کر} اچھا پنڈت جی؟
آپ اس مجلس رقص و رنگ میں حاضر و ناظر ہیں
اور کمال یہ کہ منہ میں زبان بھی رکھتے ہیں؟ پنڈت
جی! کیا میں کام دیو سے سفارش کر دوں کہ آپ
کے سینے میں بھی تیر تراز و کر دے۔
کام دیو:۔ {بچوں کی بھولی مسکراہٹ سے} پھر تو وہ سارے
منتر بھول جائیں گے۔
مینکا:۔ ارے یہ کیا کیا؟ بھری بزم میں راز کی بات
کہہ دی؟

{ یکایک ایک رنگین تیر کام دیو کی کمان سے نکل کر پنڈت کو جا لگتا ہے }

کوکا پنڈت :۔ { چیخ کر } ہائے ! کم بخت گستاخ۔ تو نے مجھ سے بھی گستاخی کی ؟

کام دیو :۔ میں گستاخی نہیں پیار ہوں۔ کسی دل کی دھڑکن ہوں تو کسی کا چین۔ میں کسی ایک خطے کا باسی نہیں۔ ساری دنیا میری اپنی ہے۔ میں ہوں تو امن اماں ہے ورنہ تباہی ہی تباہی۔ کیا تمہارے سینے میں تیر پیوست ہو گیا ؟ بھگوان کی مرضی۔ اس میں میرا کوئی دخل نہیں۔

منیکا :۔ پیارے ! تیر تو مار ہی دیا۔ اب تمہاری تسلیوں سے پنڈت بہلنے والے نہیں، کون جانے کہ درد کی لذت پنڈت کو انسان بنا دے۔ کیوں پنڈت جی ؟

کوکا پنڈت :۔ چپ رہو۔

کام دیو :۔ غنیمت ہے منیکا تمہیں نہیں لگا۔

منیکا :۔ { مسکرا کر راجا کی طرف دیکھ کر } کون جانے، تم تو اندھے ہو ہی۔ گھائل کرنا اور ان جان بن جانا تمہاری عادت ہے۔

کام دیو :۔ خدا نہ کرے کہ تمہیں تیر لگے، کیونکہ تم کوکنے والی کوئل اور چہکنے والی بلبل ہو، تم سے نغمہ چھن جائے گا اور کسی کے تصور کی رواں دواں خوبصورت کشتی دروا اسامنی کے شباب سمندر میں ڈوب جائے گی یا کم سے کم شکنتلا کی انگوٹھی مچھلی ضرور نگل لے گی۔

منیکا :۔ میرے عزیز میرے دوست ! نہ کسی سادھو کی بد دعا نہ کسی پنڈت کے منتر کسی کشتی کو ڈبو سکتے ہیں میں عورت ہوں جو گناہ میں نہیں درد میں لذت پاتی ہے اور جس کے دو روپ ہیں۔ منیکا اور شکنتلا، ناگن اور پیار، ہے نا مہا پنڈت کوکا شاستری جی ؟ آپ راجا دشنت ہیں یا دُروا اسامنی۔ آپ کا روپ کون سا ہے بھلا ؟

کوکا پنڈت :۔ { شعلے کی طرح بھڑک کر } یاد رکھو منیکا جیت میری کنیز اور میرا مقدر ہے، میں کام دیو کے تیر سے گھائل ضرور ہوں لیکن مروں گا نہیں۔

منیکا :۔ { مسکرا کر } کسی پر مر کر امر ہو جاؤ پنڈت۔ ارے جسے مرنا نہ آئے وہ جینے کا مزہ کیا جانے ...... ہا ہا ہا ہا ...... ہا ہا ہا ہا۔ پنڈت جی ! آپ پر رحم آتا ہے۔ میری مانو اور مجھ سے مر کر جینا سیکھ لو۔ گرو دکشنا بھی معاف۔

کوکا پنڈت :۔ { آگ ادر انگارہ ہو کر } میرا مشاہدہ، تجربہ اور میرا علم تجھے ضرور مات دے گا تو میرے چرنوں میں ہو گی۔

منیکا :۔ میں اور آپ کے قدموں میں ؟ ہا ہا ہا ہا ..... ہا ہا ہا ہا۔ یہ تو بتاؤ میرے وشوامتر اپنے خون کی پہچان سے انکار تو نہ کرو گے ؟

کوکا پنڈت :۔ { بُرا سا منہ بنا کر } ہُنھ !

منیکا :۔ { راجا سے } مہاراج ! اب اپنی منیکا کو بھی اجازت دیجیے۔ { منیکا نے گردن جھکا کر دونوں خوبصورت ہاتھ جوڑے اور زمین پر دایاں پاؤں مارا تو پائل بج اُٹھی } مہا پنڈت کوکا شاستری جی کا، سارا نشہ، سارا گیان اور دیا بھسم نہ کر دوں تو آپ کی منیکا نہیں راجن !

کام دیو :۔ { منیکا کو پکڑنے کی کوشش کرتے ہوئے } ایسا نہ کرو، ایسا نہ کرو۔ دمینتی، پنوں، ہیر، لیلیٰ اور شیریں کی لاج رکھ لو۔ انہیں رسوا نہ کرو، وہ تجھے رسوا کر دیں گی۔

راجا دشنت :۔ { مسکرا کر } یہ شیطان نہیں مانے گی کام دیو۔

کام دیو :۔ تریا ہٹ راجن، تریا ہٹ۔

منیکا :۔ میں اس وقت شیطان نہیں ناگن ہوں راجن ! اور کام دیو مہاراج، لاج اس کی رکھی جاتی ہے جو بزدل نہ ہو۔ وہ سب کی سب کایر تھیں۔

بزدلی کو تقدیر اور حیا کے پردوں میں چھپانے
والوں کو مرنے کا حق ہے جینے کا نہیں۔ ہرگز نہیں
کام دیو:۔ (منیکا کا ہاتھ ٹٹول کر پکڑتے ہوئے) میں داغدار
اجالا نہیں چاہتا۔
منیکا:۔ گال پر تل اور ماہ ومحو[1] کا ملن، بدنما نہیں سمجھا جاتا۔
صرف نظر کا پھیر ہے۔ کام دیو۔ زخم تو ہر صورت میں لگیں
گے۔ چاہے سینے پر ہوں، چاہے پیٹھ پر۔ چاہے
مرد کے لگیں یا عورت کے۔
(منیکا کام دیو کے ہاتھ چوم کر نکل جاتی ہے)
دربار حیران اور راجا دشنت خاموش۔ کام دیو
کی انگلی ہونٹوں پر، کوکا پنڈت کا چہرہ سرخ انگارہ
ہے اور اسٹیج کا پردہ، محو حیرت تماشائیوں اور ان
کے بیچ حائل ہوجاتا ہے۔

دوسرا منظر

مہا پنڈت کوکا شاستری کی کٹیا۔ ہرن کے چمڑے
پر پنڈت دھیان مگن ہے۔ بائیں جانب سے ہنستا
مسکراتا، ہاتھ میں پھول لیے، کبھی اسے سونگھتا،
کبھی چومتا، ستیہ ہردے داخل ہوتا ہے۔
کوکا پنڈت:۔ (آنکھیں کھول کر) کون ہے؟ ستیہ ہردے؟
ستیہ ہردے:۔ ہاں مہاراج! آپ نے بڑی مشکل سے
اپنے منتر کے جاپ سے مجھ پر قابو پایا تھا۔ اب ایسا
محسوس ہوتا ہے کہ آپ بھی کسی کی مٹھی میں ہیں۔
کوکا پنڈت:۔ غلط۔
ستیہ ہردے:۔ کیا یہ غلط ہے مہاراج کہ آپ کا جسم درد
کی لذت سے پہلی بار آشنا ہوا ہے۔ اگر ایک ترکی
سے آپ ہار گئے تو کتنی رسوائی ہوگی۔ بہتر ہے اسے
کچھ دے دلا کر راضی کر لو۔
کوکا پنڈت:۔ لیکن اس میں میری رسوائی ہے۔ میرے

علم اور گیان نے میرے بزرگوں کے نام کو دھندلایا
نہیں روشن کیا ہے۔ سرکار دربار میں اونچا استھان
دیا ہے۔ پنڈت کوکا شاستری نرتکی سے کیسے سمجھوتا
کرے۔
ستیہ ہردے:۔ مہا پنڈت! میں مانتا ہوں کہ آپ، اپنے
بزرگوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے انہیں کی
طرح چار ذاتوں میں، چار ذاتوں پر اپنے علم اور
گیان کا جھنڈا لہرائے اپنا سر اٹھائے اس ہیرے
اگلنے والی دھرتی پر آسمان کی طرح چھائے
ہوئے ہو۔
کوکا پنڈت:۔ یہ میرا حق ہے۔
ستیہ ہردے:۔ میں تو اتنا جانوں کہ دھرتی اپنی گود میں پھول
پھل اور اشرفیاں لیے ایک ایسا برتن ہے جس
پر آسمان چمکدار سرپوش بنا مسکرا رہا ہے۔ دھرتی
سیدھی سادھی گائے ہے شاید عقل سے بھی عاری۔
مہان پنڈت اپنے صنم کدے کے پرانے بتوں کے
ساتھ عقل کی لاٹھی سے سادہ لوح دھرتی کو ہانکنے
لیے جا رہا ہے۔
کوکا پنڈت:۔ تمہاری باتوں سے دشمنی کی بو آتی ہے۔
ستیہ ہردے:۔ آزادی کی طلب میں اگر دشمنی کی بو شامل ہو
جائے تو عجب کیا ہے، اور پنڈت! ہر کمال کو
زوال ہے۔ کیا عجب ہماری ترقی کا نقطۂ عروج،
زوال کی ابتدا بن جائے۔
کوکا پنڈت:۔ تم مجھ میں عیب نکالنے لگے ہو۔
ستیہ ہردے:۔ تم میں اعتماد کی کمی دیکھ رہا ہوں۔
کوکا پنڈت:۔ غلط!
ستیہ ہردے:۔ فکر کھائے جا رہی ہے تو سوئے ہوئے اعتماد
کو جگانے کی کوشش کر رہے ہو، جیسے جنگل میں قوت
مدافعت کھو دینے والا بوڑھا شیر ٹھونگ مارنے
والے کوے کو ڈرائے۔
کوکا پنڈت:۔ ستیہ! میں نے اعتماد کے ہاتھوں کام دیو کا

[1] چاند کا کالا دھبہ۔

تیر دل سے نکال پھینکا ہے۔

ستیہ ہردے:۔ (طنز سے) مہا پنڈت میں گواہ ہوں کہ تم نے کبھی من متھ کا خون کیا تھا۔ لیکن یہ اگلے وقتوں کی باتیں ہیں۔

کوکا پنڈت:۔ (غصے میں اٹھ کر) میں ہار نہیں سکتا۔

ستیہ ہردے:۔ پنڈت! تم اپنے خیال میں اپنے راستے کی ہر رکاوٹ کو جوتی کی نوک سمجھ کر، اپنے علم اور گیان کے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر ایک شیطانی قوت کے ساتھ آگے بڑھنا چاہتے ہو۔ مگر دشمن باہر سے ریشم اندر سے لوہا ہے۔

کوکا پنڈت:۔ ناری منش کی دشمن ہے۔

ستیہ ہردے:۔ چھی چھی! وہ آدم کی دوست ہے، منش کی پسلی۔ خدا کے بعد وہی اس سے قریب ہے۔ پنڈت تم نے ماں کو گالی دے دی۔ تم کیسے پنڈت ہو؟

(پنڈت آگ بگولہ ہو زمین پر دایاں پاؤں مار کر باہر نکل جاتا ہے)

ستیہ ہردے:۔ (مسکرا کر) چلو تماشہ دیکھیں۔ پنڈت کی رسوائی کا۔

(ایک جانب سے نکل جاتا ہے اور پردہ اسٹیج کو ڈھک لیتا ہے)

تیسرا منظر

ہرا بھرا جنگل، جنگلی پھول پھل کہیں کہیں نظر آ رہے ہیں۔ ایک طرف مٹیالے رنگ کی بڑی سی سانپ کی بانبی نظر آ رہی ہے۔ یک لخت نقارہ بج اٹھتا ہے اور ساتھ ہی کسی کے سرپٹ دوڑنے کی آواز آتی ہے۔ ایک رقاص جنگلی بھینسے کے لباس میں ہنکارتا ہوا آتا ہے اور کھر نما پاؤں سے زمین کریدتا اور مٹی اڑاتا ہے۔ پھر تانڈو ناچ ناچتا ہوا پوری طاقت سے بانبی پر حملہ کرتا ہے لیکن بری طرح گر پڑتا ہے۔ نقارہ زور زور سے بجتا ہے اور وہ لڑکھڑا کر اٹھتا، لنگڑاتا ہوا ایک جانب سے نکل جاتا ہے۔ نقارے کی آواز دم توڑ دیتی ہے اور بین کی مدھر آواز گونجتی ہے۔ پھر شہنائی چیختی ہے ایک لنگوٹ کسے سادھو کے پیچھے پیچھے ایک حسین عورت بچے کو اٹھائے داخل ہوتی ہے، سادھو ہاتھ سے اس بچے کو اپنانے یا اپنا خون ماننے سے انکار کرتا، تیز تیز قدم اٹھاتا دوسری جانب سے نکل جاتا ہے۔ عورت بچے کو پھولوں پر لٹا کر چلی جاتی ہے۔ اتنے میں ایک جانب سے ایک سادھو، دوسری طرف سے مور کے روپ میں ایک رقاص داخل ہوتا ہے۔ رقاص ننھی سی جان کو گود میں اٹھا کر چونچ نما شیشی سے شہد چکھاتا ہے، سادھو آگے بڑھ کر دونوں ہاتھ بڑھا دیتا ہے تو رقاص اس کے پیار بھرے ہاتھوں میں بچہ سونپ باہر نکل جاتا ہے۔ سادھو، منی کو گلے سے لگائے ایک طرف سے باہر چلا جاتا ہے۔ فضا خاموش ہے لیکن ایک لمحے کے بعد ستار کے تار جھنجھنا اٹھتے ہیں اور ایک رقاص راجکمار کی شکل وصورت میں تیر کمان لگائے بنسری بجاتا داخل ہوتا ہے۔ بنسری کی سریلی آواز پر گھنگھرو بج اٹھتے ہیں۔ جنگل کی راجکماری کے تھرکتے، تڑپتے بے چین قدم اسے بنسری سے قریب کر دیتے ہیں۔ پیچھے پیچھے ہرنوٹا بھی چوکڑیاں بھرتا داخل ہوتا ہے۔ پھولوں کی بیلیں اس سے لپٹ لپٹ جاتی ہیں پھول برساتی ہیں آس پاس سے سکھیوں کے نقرئی قہقہے گونجتے ہیں۔ راجکماری ناچتے ناچتے راجکمار کے قدموں میں جا گرتی ہے۔ وہ اسے پیار سے اٹھا کر اس کی انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی پہناتا ہوا اسے آغوش میں بھر، ساتھ لیے نکل جاتا ہے۔ راجکماری کی سہیلی داخل ہوتی ہے۔

سہیلی:۔ (ہرنوٹے کو گود میں اٹھا اور پیار کر) لاج نہیں آتی جو اس کے ساتھ جانا چاہتا ہے۔ وہ گئی ہاتھ سے، ہاہاہاہا...... راجکمار کے ہاتھ لگ گئی.... ہاہاہاہا...... ہاہاہاہا۔

{باہر چلی جاتی ہے}

ہوا زور زور سے چلتی ہے، پھول پتّے بکھر جاتے ہیں۔ اتنے میں ایک طرف سے ایک سفید ناگ کے بھیس میں ایک رقّاص دھیرے دھیرے مانو رینگتے رینگتے چلا آتا ہے، پھنکارتا ہے۔ بانبی سے ایک روپہلی ناگن کی شکل میں ایک نرتکی منہ پر نقاب ڈالے نکلتی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سفید ناگ زمین پر لوٹنے لگتا ہے، تڑپنے لگتا ہے۔

سفید ناگ :۔ {اپنے آپ سے} من متھ تم نے پھر جنم لے لیا ہے۔ تم میرے دوست ہو مگر میں تمہیں مار دوں گا۔

{ناگ کی سفید کھال یکایک اتر گئی۔ اب وہ بھیانک کالا ناگ ہے}

روپہلی ناگن :۔ آ گئے نا اپنے اصلی روپ میں۔ دنیا کو دھوکا دینے چلے تھے۔

ناگ :۔ نہیں کینچلی اتاری ہے۔ اب مجھ میں پھرتی اور تیزی آ گئی ہے۔

ناگن :۔ تیزی آ گئی ہے یا من متھ تنکے کی طرح بہائے جا رہا ہے؟ شنکر بھگوان کی تیسری آنکھ کیوں بند ہے۔

ناگن باہر نکلی۔ بادل گرجا۔ بجلی کڑکی۔ آندھی سی آ گئی۔ ناگ آگے بڑھا۔ دونوں کے سر ٹکرائے۔ اور تانڈو ناچ شروع ہو گیا۔ ڈمرو کی آواز تیز ہوئی۔ دونوں بڑی تیزی سے ایک دوسرے کو مات دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ اب زمین پر دونوں لوٹنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ناگ کی رفتار میں فرق آنے لگا۔ جیسے کوئی باکسر گیارہویں راؤنڈ میں تھک کر گرا چاہتا ہو۔ مانو کسی کے ہاتھ سے چھناکے سے گری ہوئی دھات کی پتلی طشتری کی گونج آہستہ آہستہ دم توڑ رہی ہو۔ اب تیز رفتار ناگن اسے بار بار بانبی کی طرف کھینچتی نظر آئی۔ آخر ناگن نے مکڑی کی طرح ناگ کا سر دبوچ لیا۔ ناگ بڑی بے بسی سے اپنے جسم کو زمین پر پٹک رہا تھا۔ پھر وہ حرکت سے بے نیاز نظر آیا۔ ناگن اسے گھسیٹ کر باہر لے گئی، پھر دیوانہ وار فخر سے سینہ پھلائے لوٹ کر ناچنے لگی۔ تن من سے بے نیاز، اس کے قدم اس کے بس میں نہیں تھے، ساتھ ساتھ قہقہوں کی برسات ہونے لگی۔ اس عالمِ دیوانگی میں کام دیو اور راجا دشنت داخل ہوتے ہیں۔

کام دیو :۔ {سرگوشی کے لہجے میں} مہاراج! یہ منیکا کی آواز ہے۔

راجا دشنت :۔ {گھبرائے ہوئے} ہاں کام دیو۔ اس آواز میں پائل کی چھم چھم بھی ہے۔

{ناگن چپکے سے غائب ہو گئی، پھر پیچھے سے آ کر راجا کے قدموں سے لپٹ گئی}

راجا دشنت :۔ {دبی زبان میں خوف سے سہمے ہوئے} کام...... دیو...... و...... و۔

کام دیو :۔ مہاراج! ...... مہاراج!

ناگن :۔ سرکار! نرم و گداز بانہیں ناگن کی نہیں ہو سکتیں۔

{ناگن نقاب الٹ دیتی ہے}

راجا دشنت :۔ {حیرت و استعجاب میں} تم ......؟

ناگن :۔ لیکن ...... میں وہ نہیں۔ وہ، وہ تھی اور میں، میں ہوں، داسی شکنتلا۔

کام دیو :۔ منیکا کہاں ہے؟ تمہاری آواز....

ناگن :۔ شکنتلا نے اسی کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔

کام دیو :۔ لیکن وہ کہاں ہے؟

ناگن :۔ اس نے دروا سامنی ناگ کا سر کچل دیا ہے۔ مجھے جنم دے کر جہاں سے آئی تھی وہیں لوٹ گئی اور.... {مسکرا کر} وہ دیکھو...... سانپ کی لاش!

{راجا نے دیکھا کہ مہا پنڈت کو کا شاستری سسکتے بلکتے بچے کی طرح داخل ہوا، ہچکیوں کے بیچ ہلکی سی آہیں بھرتے ہوئے سانپ کی لاش کو کندھے پر ڈالا اور چپکے سے باہر چلا گیا}

کام دیو کا ہاتھ ترکش پر تھا۔ راجا نے ناگن رقاصہ کو گلے لگا لیا۔

نظمیں

خلیل تنویر

احساس

جدھر بھی دیکھو ــــــــ
روشنیوں کو گھیرے ہوئے
دھند لاہٹوں کا پردہ ہے
کہاں سے چلے تھے ؟
کدھر جا رہے ہیں ؟
کچھ پتہ نہیں چلتا
صرف اِک احساس زندہ ہے
اِک سفر ہے
اور تیزی سے بلندیوں کو ــــــــ
پار کرتے چلے جا رہے ہیں !
پر کسی چیز پر کوئی اختیار نہیں
ایک عجیب بے قراری ہے
انتظار ہے
آخر اس بے قراری کا سبب کون ہے

مشکور جاوید

ریت کی بارش میں

چلو آؤ ـ ہم تم ــــــــ
موسموں سے دوستی کرلیں
جنگلوں میں اُترتی ہوئی شام کو
اپنی جیبوں میں بھر لیں
ریت کی بارشوں میں جھگڑتے ہوئے
راکھ کے بادلوں کو اُچھالیں
کبھی یوں ہو تم بھی ــــــــ
میرے نام کو دھوپ کی کشتیوں میں بٹھا کر
ہواؤں سے باتیں کرنے لگو
اور پرانے کیلنڈر پہ ہنسنے لگو
کبھی ایسا بھی ہو
سانپ لکھتے رہیں شہر کی داستاں
لوہے کی مچھلیاں آسمان سے ٹپکتی رہیں
اور سروں سے نکلتے ہوئے خون کو آنکھ پیتی رہے
میرے دوست میری بات مانو زرا ــــــــ
چلو آؤ ہم تم ــــــــ
موسموں سے دوستی کر ریل کی پٹڑیوں سے گزرنے لگیں
پھر خلاؤں میں چیخوں کا سیلاب ہو
پھر خلاؤں میں چیخوں کا سیلاب ہو

گورنمنٹ میوزیم، ڈونگر پور، راجستھان
بچھو گھاٹی، اودے پور۔

نظمیں

انوار رضوی

دوپہر کے بعد

سکوت کی آنچ میں پگھل کر
نوید سنتے ہیں بھورے بادل

نگاہ کی گرمیوں میں رقصاں ہیں
کالی راتوں کے پیلے سائے
فلک کی چادر پھسل رہی ہے
جمود پر تین حرف بھیجو

جہالتوں کے بدن میں سوراخ ہیں
تو کیا ہے
رطوبتوں کو لباس دیدو

ہوا کے بازو میں دم کہاں ہے

نظر اٹھاؤ
تو سرمئی میں سفید ڈورے
جگر کی کاوشِ نگار خانہ
لہو کی حدت کو سبز کہہ دو
کھنڈر کے دل سے نکال لاؤ
برستے بادل

سکوت کی آنچ میں پگھل کر
نوید سنتے ہیں بھورے بادل

▲▲

صفدر

وہ لمحے

وہ لمحے جب
نیا بازار، مسجد، ہوٹلوں میں منتظر احباب خوش گفتار
سوچوں سے نکل جائیں
مری محبوب کی اجلی جواں باہوں کے حلقے تک پگھل جائیں
ہمکتے ننھے بچے کی کشش کے دائرے ٹوٹیں
کڑی بے رحم ظالم زندگی کے وار ٹل جائیں
ہواؤں سے سبک ہو کر
مکانوں سے مناروں سے اٹھوں اوپر
گلابی نیلے بھورے بادلوں کی وسعتیں ناپیں مرے شہپر
تھکا سورج مرے سائے میں تھوڑی دیر سستائے
مرے افکار کی کرنیں پڑیں صحرا سمندر پر

درختوں سبزہ زاروں جانداروں تک بکھر کر سانس لیتا ہوں
وہ لمحے جس گھڑی میں شعر کہتا ہوں۔

▲▲

○ ترقی اُردو بورڈ ویسٹ بلاک ۸، آر کے پورم، نئی دہلی　○ اُردو ہائی اسکول، بروڈ ضلع امراؤتی (ایم۔ ایس)

غزلیں

حیات لکھنوی

ذوقِ منزل نہ رہا، وقتِ سفر ایسا بھی
حادثہ ایک سرِ راہ گزر ایسا بھی

ریگِ صحرا میں کہیں پھول کھلا کرتے ہیں
فیض ہے آبلہ پائی کے مگر ایسا بھی

بوئے گل جس کے تعاقب میں پھرا کرتی ہے
کوئی ہے دربدر و خاک بسر ایسا بھی

کر لیا عالمِ امکاں کا احاطہ میں نے
تھا کبھی زاویۂ فکر و نظر ایسا بھی

نذرِ اربابِ جنوں ہے کبھی محروم نہ ہو
بارشِ سنگ سے مل جائے ہنر ایسا بھی

مجھ کو طوفاں کے تھپیڑوں ہی میں ملتا ہے سکوں
خود مری ذات میں رہتا ہے بھنور ایسا بھی

اپنے چہرے کی حقیقت نظر آئے جس میں
ایک آئینہ بنا آئینہ گر ایسا بھی

دوسرے لوگ مجھے میرا پتہ دیتے ہیں
بھول جاتا ہوں میں خود اپنا ہی گھر ایسا بھی

جنبشِ برگ و ثمر میں نہیں آوازِ حیات
ہے فضاؤں میں سمایا کوئی ڈر ایسا بھی

▲▲

عبد اللہ کمال

سُلگ رہا ہے کوئی شخص کیوں عبث مجھ میں
بجھے گا کیسے ابھی شعلۂ نفس مجھ میں

عجیب درد سا جاگا ہے بائیں پسلی میں
عجب شرارِ طلب سا ہے پیش و پس مجھ میں

میں شاخ شاخ سے لپٹوں شجر شجر چوموں
پنپ رہی ہے عجب لذتِ ہوس مجھ میں

نہ کوئی نقشِ یقیں ہے، نہ کوئی عکسِ گماں
دھواں دھواں ہے ابھی سے نیا برس مجھ میں

نہ زیست کی کوئی ہلچل، نہ موت ہی کی فغاں
ہے کہر کہر سا اک شہرِ بے جرس مجھ میں

بس اک پرندہ سا پر پھڑپھڑا کے چیختا ہے
بہت اداس ہے اب موسمِ قفس مجھ میں

کبھی تو گزرے ادھر سے کبھی تند موجِ ہوا
ہے جمع کتنے ہی موسم کا خار و خس مجھ میں

▲▲

فاروق شفق

پیلی رت کے ہاتھ میں پتا ہرا دیتے رہو
اپنے ہونے کا یہاں کچھ کچھ پتا دیتے رہو

انگلیوں کا بوجھ رکھ دو منزلوں کی آنکھ پر
جاگتے ہے گا ہے خواہشوں کو یہ سزا دیتے رہو

قریۂ جاں میں کسی دن پھول کھل بھی آئیں گے
آندھیوں کو اس طرف سے راستا دیتے رہو

ہو گئے گم سرمئی ٹیلوں میں صبحوں کے سفیر
اب سنو اپنی صدا خود ہی صدا دیتے رہو

جم نہ جائے راکھ تنہائی کی برگِ سبز پر
اس نواحِ خوف کو رنگِ نوا دیتے رہو

▲▲

غزلیں

حسن رضا

سنگِ نصیحت سر پر برسے
بھاگا میں باتوں کے ڈر سے

گھر میں اجیالا برسے
میرا آنگن نور کو ترسے

رستے رستے آم لگا کر
ہم ہی رس کی بوند کو ترسے

ایڑی تک ہم خون میں تر ہیں
ایسے موسم گزرے سر سے

کاش رتنا صاحب آجائیں
بدلیں گے ہم عیب ہنر سے

▲▲

اشہر ہاشمی

پہچان زینے زینے کی طے کر کے آئے ہیں
ہم لے کے اپنے ہاتھوں میں آئینے آئے ہیں

جو گھاٹ پر کھڑے ہوں انہیں کیا پتہ کہ ہم
پانی میں نیچے نیچے کہاں بہتے آئے ہیں

کاغذ پہ اس نے بھیجا ہے ہونٹوں کا ذائقہ
ملفوف ہو کے میرے لیے بوسے آئے ہیں

چڑھتے اترتے زینے دفاتر کے اور ہیں
دن اپنے ایک شہر میں یوں کٹتے آئے ہیں

لوٹ آئی ہو نہ پھر سے نئے رابطوں کی رت
اشہر بلاوے کوئے تعلق سے آئے ہیں

▲▲

نور قاضی پوری

صبح امید سے ہر شام بہل جاتی ہے
صبحِ امید مگر شام میں ڈھل جاتی ہے

ایک اک گام پہ بل کھانا سنبھلنا چلنا
ہائے کس ناز سے لیلائے غزل جاتی ہے

پیکرِ سرد بھی پتھر بھی ہے دنیا لیکن
گرمیِ سوزِ نفس ہو تو پگھل جاتی ہے

ہم کہ پروردہ انوار ہیں اپنے دل میں
شمعِ امیدِ سحر شام سے جل جاتی ہے

نور وہ کشتۂ بیدادِ مقدر ہم ہیں
جن سے کتراتی ہوئی موت نکل جاتی ہے

▲▲

○ قاضی پورہ۔ کھنڈوا ایم۔پی　○ ۳۱۔ روشن گولڈن لین۔ ہوڑہ ۱۱۱۰۱　○ محکمہ جنگلات۔ بھوپال

شطرنج، پرندے اور انقلاب

مومن مشتاق صدیقی

جنگل بہت گھنا تھا، ہوا چاروں سمت سائیں سائیں کر رہی تھی۔ دن تھا لیکن اُجالا غائب تھا اور دھوپ کہیں کہرے میں منہ ڈھانپے سو رہی تھی، بادل زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے اور ایسے میں شاہی قلعے کو لوگوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا اور عجیب عجیب نعرے لگا رہے تھے لگتا تھا سب پہ ایک ساتھ ہسٹریا کا دورہ پڑ گیا ہے لیکن ایسا کچھ بھی نہ تھا بلکہ عوام نے بغاوت کر دی تھی اور شاہی قلعے کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا قلعے کے اندر اور باہر وفادار، آزمودہ کار اور بے باک وردیاں بالکل چوکس تھیں اور تیر چلّوں پر چڑھے تھے اور نیزوں کی چمکتی ہوئی انیاں انسانی خون کا ذائقہ چکھنے کے لیے بے قرار تھیں اور ان گنت گولیاں انسانی جسم میں پیوست ہونے کے لیے بندوقوں کی نالیوں میں دم سادھے بیٹھی تھیں تمام نشانے بے خطا تھے اور تیر پرکار ـــــ قلعہ ایک چھوٹی سی چٹان پر تھا جس پر شکستگی کی کہانی تحریر تھی۔

اور ایسے میں بادشاہ حجرے کے حصار میں محفوظ اپنے محل میں آرام سے شطرنج کھیل رہا تھا اور بساط دیوانِ خاص کے پورے فرش پر سفید اور کالے سنگِ مرمر کے روپ میں بچھی تھی اور شطرنج کے مہروں کی جگہ کنیزیں اور غلام ـــــ وزیر، ہاتھی، اونٹ اور پیادے کا روپ لیے کھڑے تھے ـــــ ان کے پیر شطرنج کی بساط پر کھڑے کھڑے سُن ہو گئے تھے آنکھیں بادشاہ کو دیکھتے دیکھتے پتھرا سی گئی تھیں بادشاہ کی مرضی کے بغیر کوئی اپنی جگہ سے نہیں ہٹ سکتا تھا لیکن جب چال بدلتی اور بادشاہ ایک ہلکا سا اشارہ کرتا تو مہرے خود بخود اپنی جگہ بدل دیتے ـــــ وزیر چپ چاپ ادب سے ہاتھ باندھے بادشاہ کے پاس کھڑا تھا اور سوچ رہا تھا کہ بادشاہ کو اس واقعہ کی اطلاع کس طرح دے۔

"ظلِ الٰہی" بہت دیر کے بعد وزیر کے منہ سے یہ دو لفظ نکلے۔

"ہوں" بادشاہ کا سر بدستور جھکا رہا۔

"حضور جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں؟"

"اجازت ہے" اب کی بار بادشاہ نے ذرا زور سے کہا اور وزیر کی رگوں میں چیونٹیاں رینگنے لگیں۔

"عالی جاہ ـــــ رعایا نے بغاوت کر دی ہے" وزیر بہ مشکل یہ جملہ کہہ سکا۔

"تو اس میں پریشان ہونے کی کون سی بات ہے وزیراعظم۔ آخر ہماری فوج کس لیے ہے؟" بادشاہ نے انتہائی سکون سے جواب دیا۔

"صاحبِ عالم۔ رعایا نے بغاوت کر دی ہے اور شاہی قلعہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے، صرف آپ کے حکم کی دیر ہے"

یہ سن کر پہلی بار بادشاہ نے سر اٹھایا لیکن وہ وزیر کو نہیں بلکہ سامنے دیوار پر لگی ایک بہت بڑی تصویر کو دیکھنے لگا۔ ایک دُبلا پتلا گورا آدمی دو انتہائی جی دار طاقتور اور تندرست بیلوں پر سوار تھا اور انھیں متواتر چابک مار رہا تھا اور بیل چابک کی مار پر سر جھکائے تیزی سے دوڑے

۲۹۸/۱۹ مونج مینشن سیکنڈ فلور ۔ ایل۔ بی۔ ایس۔ مارگ۔ کرلا، بمبئی ـ ۷۰

چلے جا رہے تھے کشمیری مصور کے قلم کا شاہکار یہ تصویر بالکل زندہ تھی اور اسے دیکھنے کے بعد یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ابھی تصویر کا پورا منظر فریم سے نکل کر باہر آ جائے گا ——— تصویر دیکھنے کے بعد بادشاہ نے بیگم کو مسکرا کر دیکھا اور ایک چال چلی ——— "شہ مات" ——— بیگم کا بادشاہ چاروں خانے چت تھا۔ بیگم کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

قلعے کے چاروں طرف دو ٹانگوں کی عقل اُگ آئی تھی، چاروں طرف انسانوں کا سیلاب تھا۔ بادشاہ فصیل پر آ کر عقاب کی طرح کھڑا ہو گیا ——— تھوڑی دیر کے لیے صدائیں تھم گئیں ——— مہیب سناٹا بولنے لگا ——— اور فضا باادب باملاحظہ ہو گئی۔ ایسے میں گھوڑوں کا ہنہنانا بہت برا لگتا تھا ——— لیکن کچھ دیر کے بعد لوگ پھر چیخنے اور چلّانے لگے اتنے سارے لوگوں کو دیکھ کر بادشاہ کی پیشانی پر سوچ اُبل پڑی اور ایک لمحہ کے لیے تو بادشاہ بھی کانپ کر رہ گیا ——— اتنے سارے لوگ ——— اس نے دل میں سوچا اگر صرف پیش قدمی کرتے ہوئے بھی آئیں تو محل کے سارے لوگ ان کے قدموں تلے کچل کر رہ جائیں ——— اچھا ہے کہ لوگ صرف چلّا رہے ہیں اگر ان لوگوں نے .... سوچتے سوچتے بادشاہ سامنے دیکھنے لگا ——— دور نیلے ساگر میں لہریں کم کم اٹھ رہی تھیں۔ اور قلعہ بہت مضبوط تھا اور فصیل بہت اونچی تھی ———

سپہ سالار بادشاہ کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا ——— دیکھو یہ تمام لوگ بہرکیف ہماری رعایا ہیں اور ہم نہیں چاہتے کہ ان کا خون بلا وجہ بہے اس لیے توپچی کو ہدایت کر دو کہ وہ گولہ اندازی اس طرح کرے کہ توپ کے گولے ان کے اوپر سے ہوتے ہوئے ساگر میں جا گریں تیروں کا رُخ بھی آسمان کی طرف ہو البتہ جب میں اپنا بایاں ہاتھ بلند کر دوں تبھی ان لوگوں پر گولیاں چلائی جائیں ——— سپہ سالار نے سر تسلیم خم کیا اور تیزی سے واپس مڑ گیا تھوڑی دیر

بعد توپ چھوٹنے کی بڑی بھیانک آواز آئی ——— یہ آوازیں چٹانوں سے ٹکرائیں اور بازگشت نے پل بھر میں کہیں سے کہیں پہنچا دیا ——— صرف ایک لمحے کی خامشی اور اس کے بعد بہت سارے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دی اور شہر کے سارے آزاد پرندے جھنڈ کے جھنڈ آسمان کی بلندیوں میں منڈلانے لگے ——— ٹھیک اسی وقت بے شمار تیروں نے آسمان کو ڈھک لیا اور آسمان کا سینہ چھلنی ہو گیا ان گنت پرندے زخمی ہو ہو کر لوگوں پر گرنے اور انہیں لہولہان کرنے لگے۔ تیر لگے پھڑپھڑاتے ہوئے خون آلود پرندوں کو دیکھ دیکھ کر مجمع خاموش ہو گیا تڑپتے اور مرتے ہوئے پرندوں کا خونیں منظر بڑھتا ہی گیا عوام آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے لوگ بھاگنے لگے۔ ٹھیک اسی وقت بادشاہ نے سرگوشی کے عالم میں اپنا بایاں ہاتھ اٹھایا ——— اور ——— دھوئیں کی دیوار میں لوگ اوجھل ہو گئے۔

تھوڑی دیر بعد وہاں کچھ اس طرح کا سکون طاری ہو گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا صرف گزرے ہوئے لوگوں کے کچھ نشانات ادھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔

قلم اور کاغذ

کدال

ہتھوڑا

اونچی ہلز کے بہت سارے چپل، سینڈل اور جوتے ———

اور ہوائیں بین کر رہی تھیں۔

شجر سو گئے تھے۔

اور اطراف کے پہاڑوں پر ظلمات چھانے لگی تھی۔

بادشاہ قلعے کی فصیل پر اب بھی موجود تھا اور سامنے ان لوگوں کی لاشیں جمع تھیں جو اس ہنگامے میں کام آئے تھے۔ مشرقی سرے پر چند لاشیں رکھی ہوئی تھیں" اور مغرب کی طرف لاشوں کا ایک ڈھیر سا تھا۔

"عالی جاہ ——— جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض

کردوں ؟" وزیر نے ادب سے پوچھا۔
"اجازت ہے۔"
"ظلِ الٰہی کیا کوئی خاص منادی کرادی جائے۔"
وزیر نے جیسے سرگوشی کی۔
"کیوں ۔؟" بادشاہ کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔
"صاحبِ عالم ——— تاکہ کہیں پھر کوئی بغاوت
...." بادشاہ نے وزیر کی بات کاٹ دی
اور انتہائی سکون سے کہا۔
"وزیرِ اعظم تم ان لاشوں کو دیکھ رہے ہو ؟"
"جی حضور ——" وزیر نے ادب سے جواب دیا۔
"اِن میں تمہیں کوئی فرق نظر نہیں آتا ؟"
"حضور مجھے تو ان میں کوئی خاص فرق نظر نہیں
آتا سب بے جان۔ ایک طرح کے ہیں" ——— بادشاہ
نے اشارے سے وزیر کو اپنے اور قریب بلایا اور کہا۔

"یہ دیکھو چند لاشیں۔ خون ان کے سینوں سے اُبل
کر جم گیا ہے۔ اور وہ دیکھو لاشوں کا انبار خون ان کی پشت
سے پانی کی طرح بہا ہے۔ کچھ سمجھ میں آیا ؟"
"حضور کچھ کچھ تو سمجھ میں آ رہا ہے لیکن آپ کی پوری
بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔" وزیر نے ڈرتے ڈرتے
انتہائی بے بسی کے عالم میں کہا۔
"تم نہیں سمجھ گے وزیر اعظم تم نہیں سمجھو گے۔ اس
لیے کہ تم رعایا سے دور رہو۔ بہت دور حالانکہ تمہیں
رعایا کے قریب رہنا چاہیے۔ اور ہم بدولت اس بات
کو جانتے ہیں کیونکہ ہم رعایا سے دل کی دھڑکن کی طرح
قریب ہیں ۔"
"منادی کرانے کی قطعی ضرورت نہیں ۔
انقلاب آنے میں ابھی بہت دیر ہے ۔
چلو آؤ شطرنج کھیلیں ...... ۔"

ننگا آدمی

ایّوب جوہر

ساجو نے غصہ بھری نگاہوں سے اپنی آٹھ سالہ بیٹی رانو کی طرف دیکھا جو مسلسل پنکھا جھلے جانے کے باوجود اب تک بستر پر کروٹیں لے رہی تھی۔

"رات کے بارہ بج گئے۔ سب بچے سوگئے مگر یہ کم بخت ......" وہ پنکھا جھلتے ہوئے زیرِ لب بُدبُدایا اور پلٹ کر اپنی بیوی زلیخا کی جانب دیکھنے لگا جو فرش پر بچھی چٹائی پر لیٹی ہوئی اُسے معنی خیز نظروں سے گھور رہی تھی۔

"بتی بجھا دوں؟" ——— اُس نے اپنی بیوی کی جانب کھسکتے ہوئے دھیرے سے سرگوشی کے انداز میں کہا "نہیں، وہ سوئی نہیں ہے۔" اس کی بیوی نے رانو کی طرف اشارہ کیا۔

"کم بخت" اُس نے پنکھا جھلتے ہوئے ایک بار پھر رانو کی طرف غصے سے دیکھا لیکن یہ سوچ کر قدرے مطمئن ہو گیا کہ آج زلیخا کے لہجے میں ٹال مٹول نہیں ہے بلکہ رضامندی کے ساتھ انتظار کی وہ تڑپ بھی شامل ہے جس سے وہ خود گزر رہا ہے آج وہ تنہا مضطرب نہیں ہے بلکہ وہ چنگاری بھی چیخ رہی ہے جو سلگنے کا چلن ہی بھول گئی ہے۔ اُس نے ایک بار پھر زلیخا کی طرف دیکھا اور سوچنے لگا۔ یہ عورتیں بھی عجیب ہیں جہاں دو چار بچے جنے اور ریٹائرمنٹ کا لیبل خود پر چپاں کر لیا۔ نا بابا نا کی گردان شروع ہو گئی۔ ابھی کل کی ہی بات ہے وہ ذرا قریب ہی ہوا تھا کہ انتہائی سرد مہری سے اس نے جھڑک دیا تھا تمہیں شرم نہیں آتی بچے سوئے نہیں ہیں اور ....

لیکن آج زلیخا کا لہجہ وہ نہیں تھا۔ اور شاید اس کی وجہ بھی تھی، پورا مہینہ گزر چکا تھا اور کیا مجال کہ زلیخا نے اپنے جسم پر اُسے ہاتھ رکھنے تک کی اجازت دی ہو کبھی سر میں درد، کبھی بچوں کے جاگنے کا بہانہ اور کبھی نیند کا حیلہ، غرض ٹالنے کے اُس کے سو راستے تھے۔ لیکن آج وہ خود جال میں پھنس گئی تھی اور یہ اس سے محض چوک ہو گئی تھی۔ صبح اس کے دفتر جاتے وقت اگر وہ ساجو سے کٹھل لانے کی فرمائش نہ کرتی تو وعدہ ایفائی کے جھمیلے میں آج بھی نہ پڑتی۔ مگر کٹھل کی فرمائش نے بالآخر اس جھنجھٹ میں اُسے گھسیٹ ہی لیا تھا۔ یا ممکن ہے اُسے یہ بھی خیال آیا ہو آخر کب تک ٹالتی رہے گی۔ مرد ذات کا کیا بھروسہ۔ اگر ہاتھ سے نکل گیا تو؟ ——— بہر حال کوئی بات ضرور تھی ورنہ چوکی پر سونے والی فرش پر بچھی چٹائی پر بلا وجہ تو نہیں لیٹی ہوئی تھی لیکن ایک خیال ساجو کو اب بھی بے چین کیے ہوئے تھا کہ رانو کے سوتے سوتے اگر وہ بھی سو گئی تو اُسے جگانا محال ہی ہوگا۔ اور اس خیال سے ایک بار پھر وہ جھنجھلا گیا۔ اُس نے سوچا، رانو کو اُٹھا کر اس کی دادی کو دے آئے جو باہر کے برآمدے میں پڑی اب تک کھوں کھاں کر رہی ہے۔ لیکن ماں کیا سوچے گی؟ اور پھر وہاں جگہ ہی کتنی ہے ڈھائی فٹ چھ فٹ کے تنگ سے برآمدے میں ماں کے لیے ہی جگہ ناکافی ہے ——— مگر یہ سب انہی نے تو کیا ہے۔ ساجو کا ذہن ایک بار پھر گدلا گیا اور وہ سوچنے لگا۔ یہ سب کچھ ماں کا ہی کیا دھرا ہے۔ اُس نے

روپیوں کے لالچ میں ایک ایک کمرہ کرائے پر اٹھا دیا اور
تو اور اپنے سونے کا کمرہ بھی نہیں رکھا اُسے بھی کرائے پر دے
ڈالا جہاں نہ وہ خود ہی آرام سے سوتی تھی بلکہ تمام بچے بھی
اس کے سینے سے لگ کر سوتے تھے۔ اور اب تنگ سے
برآمدے میں پڑی سڑ گل رہی ہے اور ساتھ ہماری
بھی پریشانی کا سبب بنی ہوئی ہے، بارش ہو تو پریشانی،
طوفان اور جھکڑ چلیں تو مصیبت، نہ خود چین سے مرنا چاہتی
ہے نہ ہمیں سکھ سے جیتا دیکھنا چاہتی ہے۔ ماں کے بارے
میں وہ انتہائی بیزاری سے سوچنے لگا۔ لیکن پھر اس کے
خیالات نے پلٹا کھایا۔ آخر ماں کرتی بھی کیا؟ اس کی معمولی
تنخواہ آخر اس آسمان چھوتی مہنگائی کے زمانے میں کیا
وقعت رکھتی ہے۔ ہفتہ بھر کے اخراجات کی بھی تو متحمل
نہیں۔ ماں نے جو کچھ کیا ہے ہماری بھلائی کے لیے تو کیا ہے
ورنہ وہ کب چاہتی تھی کہ اپنا مکان کرایہ داروں کے کوڑے
کرکٹ سے بھر لیا جائے۔ وہ تو کرایہ دار کے ذکر سے ہی چڑتی
تھی۔ اُسے خیال آیا ایک بار اُس کے بابا نے اپنے ایک جگری
دوست کے لیے اس کی ماں سے سفارش کی تھی کہ بے چارہ گھر
کے لیے بڑا پریشان ہے کیوں نہ اُسے اپنے مکان کا ایک کمرہ
کرائے پر دے دیا جائے آخر یوں بھی تو کئی کمرے خالی پڑے
ہوئے ہیں۔ اس پر اس کی ماں نے تقریباً بپھرتے ہوئے اکھڑتے
ہوئے کہا تھا۔ تمہیں شرم نہیں آتی کہ اپنا مکان کرائے پر
اٹھانے کے لیے کہہ رہے ہو کیا ہم اب اتنے گرے پڑے
ہو گئے ہیں جو کرایہ وصول کر کے کھائیں پئیں۔ اگر تمہیں
اپنے دوست سے اتنی ہی ہمدردی ہے تو ایک کمرہ کیا
میں دو کمرے دے سکتی ہوں لیکن کرایہ کی بات ہرگز
نہیں ہوگی۔ اور پھر یہی ہوا تھا۔ اس کے بابا کے دوست
رحمٰن میاں تقریباً ڈھائی سال تک مکان میں رہے۔
لیکن کیا مجال کہ اُس کی ماں نے ذرا سی بیزاری کا بھی
مظاہرہ کیا ہو اور آج وہی ماں ہے۔ پہلی تاریخ سے اگر
دو تاریخ ہو جائے تو وہ کرایہ وصولنے کے لیے کرایہ داروں
پر چڑھ دوڑتی ہے۔ کتنی بدل گئی ہے وہ ——

مگر وہ تنہا تو نہیں بدلی۔ زمانہ ہی بدل چکا ہے۔ اُس
نے پھر سوچا۔ صرف چند سال پہلے وہ کتنے خوش حال تھے
پندرہ بیس سال کا عرصہ کون سا بڑا عرصہ ہوتا ہے۔ لیکن
اس عرصے میں کتنا بڑا انقلاب آکر گزر چکا ہے۔ ہر شئے
اپنی اصل شکل و شباہت سے محروم ہو گئی ہے۔ کون کہہ
سکتا ہے کہ میر پور کا یہ علاقہ جہاں لوگوں کا ایک سمندر
ٹھاٹھیں مار رہا ہے محض چند کسانوں اور زمینداروں کا
مسکن تھا۔ لہلہاتے ہوئے کھیت۔ گنگناتی ہوئی پگڈنڈیاں
پانا پتوں سے ڈھکے ہوئے چھوٹے بڑے تالاب۔ پانی
پر تیرتے ہوئے کنول کے ہنستے کھلکھلاتے پھول۔ تالاب
اور ندی پر نہاتی ہوئی ناریاں، بھیگی بھیگی ساریوں میں لپٹے ہوئے
شاداب بدن۔ جھومتے ہوئے درختوں کے ٹھنڈے سائے
جہاں محبتیں پروان چڑھتی تھیں اور دلوں کے معاملے طے ہوتے
تھے سچ سب خواب ہی تو ہو گئے ہیں۔ اُس نے بڑے دکھ
سے اپنے حسین ماضی کے بارے میں سوچا۔ بچپن کے بچھڑے
ہوئے وہ خوبصورت لمحے بھی اُسے یاد آئے جب وہ سارا
دن کسی کمرے میں گھس کر لڑکیوں کے ساتھ دولہا دلہن
کا کھیل کھیلتا رہتا تھا اور کوئی بھولے سے بھی کمرے کے
اندر جھانکنے نہیں آتا تھا کہ کمرے میں بچے کیا کر رہے ہیں،
لیکن بُرا ہو زمانے کا۔ حالات نے وہ کروٹ لی کہ
سارا شیرازہ ہی بکھر کر رہ گیا۔ دیش میں ترقیاتی منصوبوں
کی وبا کچھ اس طرح پھیلی کہ دیکھتے ہی دیکھتے کھیت کھلیان
تالاب ندی نالے اور ہرے بھرے جنگل۔ سڑکوں عمارتوں
اور کھیل کے میدانوں میں تبدیل ہو گئے۔ سرکار نے ترقی
کے نام پر نہ صرف ہرے بھرے گاؤں کا حسن ہی لوٹ
لیا بلکہ کسانوں اور زمینداروں سے اُن کا سب کچھ چھین
کر انہیں تقریباً موت کے دہانے تک پہنچا دیا تھا۔
اور ان بدنصیبوں میں اس کا خاندان بھی شامل تھا۔
سرکار کی طرف سے زمین کے عوض دی ہوئی رقم
اس کے بابا کی زندگی میں ہی ختم ہو گئی تھی۔ اُس نے ہوش
سنبھالا تو صرف چند کمروں کا ایک مکان ہی اس کا کل اثاثہ

تھا اور ڈھائی سو روپے کی نوکری۔ چار بچے، ماں، بیوی اور وہ خود، پوری سات جانوں کی کفالت کا بوجھ اس کی حقیر آمدنی کہاں تک سہار سکتی تھی۔ یہ تو اس کی ماں کی دوراندیشی تھی کہ خالی کمروں کے کرایہ پر اٹھ جانے کے بعد ایک اچھی خاصی رقم حاصل ہو رہی تھی ورنہ گھر چلانا اس کے بس کی بات ہرگز نہ تھی۔

"اب کیا ساری رات پنکھا ہی جھلتے رہو گے، بتی بجھاتے کیوں نہیں؟۔۔۔"

اس کی بیوی نے متوجہ کیا تو اُسے احساس ہوا کہ رانو تو کب کی سو چکی ہے اور وہ خواہ مخواہ اُسے اب تک پنکھا جھل رہا ہے پنکھا ایک طرف اچھالتے ہوئے اس نے مسکرا کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور پھر دھیرے سے لائٹ آف کر کے اس کی بغل میں لیٹ گیا۔ لیکن ابھی وہ اپنی بیوی کے جسم کے نشیب و فراز کو ٹٹول ہی رہا تھا کہ اچانک۔ اُسے احساس ہوا کہ سوتے پڑے بچوں میں کوئی کسمسایا ہے۔ وہ اٹھ کر فوراً سوئچ کی طرف بڑھا۔ لیکن یہ محض اس کا شک ہی تھا۔ بجلی کی تیز روشنی میں اُس نے تمام بچوں کو گہری نیند میں ڈوبا ہوا پایا۔ اپنے اس واہمے پر وہ خود ہی مسکرا اٹھا اور بتی دوسری بار آف کر کے اپنی بیوی کی بغل میں لیٹ گیا۔ سکنڈ، منٹ۔۔۔۔ پھر کئی منٹ گزر گئے۔ لیکن وہ طغیانی نہیں اُمڈ سکی جس کی اس کی بیوی متوقع تھی۔ وہ خود اپنی بجھی بجھی کیفیت پر ششدر تھا۔ آخر اُسے یہ کیا ہو گیا ہے۔ چند لمحے پہلے کتنی شدت، اور۔

"کیا ہوا تمہیں، طبیعت نہیں چاہ رہی ہے تو سوتے کیوں نہیں۔۔"

زلیخا نے اُسے ٹوکا ہی نہیں بلکہ اُسے یوں محسوس ہوا کہ اُس نے ڈنک مار دیا ہے۔ وہ سوچنے لگا۔ آخر خواہ مخواہ اُلجھنے سے کیا فائدہ۔ تمام بچے بے خبر سو چکے ہیں اور میں اب تک اُن کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ بچوں کا خیال اپنے ذہن سے جھٹکتے ہوئے وہ پھر اپنی بیوی کی جانب متوجہ ہوا۔

——— اور آدھے گھنٹے بعد جب وہ بیوی سے جدا ہوا تو پسینے میں شرابور تھا۔ اس نے چند لمحوں بعد سوچا غسل ابھی کر لینا ہی بہتر ہے شاید صبح وقت پر آنکھ نہ کھلے۔ یوں گرمی بھی شدت کی ہے غسل کرنے کے بعد سکون سے سو سکوں گا۔ یہ خیال آتے ہی وہ تولیہ کی طرف لپکا اور صابن ڈھونڈنے لگا۔ لیکن صابن کا کیس اُسے کہیں نظر نہ آیا بیوی نے جہاں جہاں بتایا وہ تمام جگہیں دیکھ ڈالیں کمرے کا کونہ کونہ چھان مارا لیکن صابن نہ ملا۔ وہ بیزار ہو کر بڑبڑانے لگا۔

"گھر کا سارا انتظام ہی ناقص ہے کوئی چیز اپنی جگہ پر ملتی ہی نہیں۔"

"بابا، صابن الماری کی دراز میں ہے۔"

سوتی پڑی رانو نے اچانک اٹھ کر جب صابن سے متعلق ساجد کو بتایا تو اُسے گھبراہٹ نہیں ہوئی صرف اتنا احساس ہوا کہ کمر سے لپٹی ہوئی لنگی اچانک کمر چھوڑ کر فرش پر بچھ گئی ہے اور وہ اپنی بچی کے سامنے الف ننگا کھڑا ہوا ہے۔

▲▲

عروج زیدی
کے
خیال افروز قطعات
شمعِ فروزاں
قیمت ——— پانچ روپے
امیر قزلباش کے شعری مجموعے
بازگشت　قیمت چھ روپے
افکار　قیمت دس روپے
نیشنل اکاڈمی سے طلب کریں

غزلیں

اعجاز تابش

اپنا سمٹ گیا ہے پرایا سمٹ گیا
سر پہ چڑھی ہے دھوپ تو سایا سمٹ گیا

عہدِ شکستہ، سوزِ وفا، دردِ آرزو
آنسو کی ایک بوند میں کیا کیا سمٹ گیا

گو منزلِ حیات بہت دور تھی مگر
دیکھا جو میرا شوق تو رستہ سمٹ گیا

اب تیرے شہر میں مجھے اپنا کہے گا کون
جب مجھ کو دیکھ کر ترا چہرہ سمٹ گیا

پھولوں کا حال دیکھ کے فصلِ بہار میں
خاروں کے بیچ دیکھیے غنچہ سمٹ گیا

تابش تمہارے کوزۂ اشعار میں نہیں
لگتا ہے جیسے فکر کا دریا سمٹ گیا

●●

شفیق طاہری

خواہش کے دائروں میں گرفتار ہو گیا
میں خود ہی اپنی راہ کی دیوار ہو گیا

ویسے بھی اس کی بات بڑی پیچدار تھی
جب چپ ہوا تو اور پُراسرار ہو گیا

میرے یہاں کہاں سے چلے آ رہے ہیں آپ
یہ کس طرف سے چاند نمودار ہو گیا

ابھرا بھی رات چاند مگر اتفاق سے
شبنم کی وادیوں میں گرفتار ہو گیا

لیجے شفیق خلیل کے آنے کی دیر ہے
نمرود کا الاؤ تو تیار ہو گیا

●●

انور حسین

یہ اسی کا ظرف ہے اظہارِ غم کرتا نہیں
بدگمانی ہو گئی ہو گی مگر کہتا نہیں

روبرو ہم بھی سنا دیتے حدیثِ دل مگر
مدتیں گزریں کسی سے سامنا ہوتا نہیں

جاں بچاؤ گے کہاں راہِ طلب تو ایک ہے
سوئے مقتل دیکھ لو اس کے سوا رستا نہیں

جس خرابے میں رہا وہ مبتلائے دردِ جہاں
اس گلی میں بھی گئے اس کا پتہ ملتا نہیں

آسماں بے آب ہے اور خشک ہے دریائے غم
آج انور سے کہو کیا بات ہے روتا نہیں

●●

○ مینگری بازار ۔ ناگور ۔ راجستھان ○ میراں پور کٹرہ ۔ محلہ نادر شاہ خاں ○ پوسٹ بکس ۲۳۳۱۵ صفات ۔ کویت

تنویر اختر رومانی | نظمیں

فطرت

خوشی کیا ہے ؟

محض کسی غم کے ٹلنے کا

احساس نہیں ہے

اور اچانک سب کچھ پا لینے کا

شکھ بھی نہیں ہے

وہ تو فطرت ہے ہماری

جیسے وقت کا زہریلا ناگ

کبھی کبھی

ڈرا دیا کرتا ہے

ڈس لیا کرتا ہے

[رابرٹ فراسٹ کی انگریزی نظم]

دیوانگی

یہ رات !

ندی کنارے چٹانوں کے سائے میں

تم میرے قریب ہو

نہ جانے کون سی

ان ہونی انجانی بات ہونی ہے

جس کے لیے

میرا دل دھڑک رہا ہے

اس وقت

کوئی ستارہ بھی ٹوٹے

تو شاید دیوانوں کی مانند

میں دونوں ہاتھ پھیلا کر

اس کے تعاقب میں

دوڑ جاؤں

[لینگ سٹن ہوزلیں کی فرانسیسی نظم]

آزاد نگر روڈ نمبر ۱۰ - مان گو - جمشید پور - ۸۳۱۰۱۲ (بہار)

اشعار

اظہار عابد

سُرخ و سفید رنگ تماشا عجیب سا
رکھتا ہوں آسمان سے رشتہ عجیب سا

نکلا ہوں سیرِ دشتِ تمنا کو جب کبھی
بکھرا ہے سر پہ دُھوپ کا سایہ عجیب سا

شاید چمک اُٹھے مرے خوابوں کا آئینہ
آتا ہے اُس طرف سے بُلاوا عجیب سا

پیتا ہے روز و شب جو مرے جسم کا لہو
لگتا ہے آئینے میں وہ چہرہ عجیب سا

●

قافلے برف کے بنتے نہیں سورج کے حریف
نم ہواؤں سے نہ گھبرا کھلے میدان میں آ

سانپ سُو نگھے ہوئے موسم کو بھی دے گرمیٔ لمس
شعلۂ خاک و نوا شہرِ زمستان میں آ

▲▲

خالد بدایونی

دُور تک پھیلا ہوا فکر کا بن اپنا ہے
اور تو کچھ بھی نہیں صرف سخن اپنا ہے

سب اُٹھائے ہوئے ملتے ہیں جنازے اپنے
سر سے باندھا ہوا ہر اک نے کفن اپنا ہے

سب کے سب ہم سے گریزاں ہیں ہوا کی مانند
اپنے اشعار ہی اپنے ہیں نہ فن اپنا ہے

دوست بن بن کے دغا دیتے ہیں دشمن خالد
شرم آتی ہے کہ یہ شہرِ وطن اپنا ہے

●

ہوائے گرم کو برسوں تلک بادِ صبا جانا
کرن کو تیرگی سمجھے اندھیروں کو ضیا جانا

تری یادیں جو میرے دل پہ چھائیں تھیں انھیں میں نے
سُلگتے دشت پہ ٹھہری ہوئی کوئی گھٹا جانا

اُٹھی اک موج دریا اور بہا کر لے گئی خالد
ہمارا نام جب بھی اس نے ساحل پر لکھا جانا

▲▲

خوشتر مکرانوی

فردا کے سیہ غار کی چٹان گرا کر
ماضی کے مکیں چاند کی وادی میں بسیں گے

●

زیست بوسیدہ مکانوں میں رہے گی کب تک
ہم نئے لوگ سکھائیں اسے اپنے آداب

کون پھیلائے گا پھر اپنے صدف کا آنچل
کچی پلکوں کی منڈیروں سے بہے گا تیزاب

●

چاند کا جسم پگھلتا ہے سیاہی بن کر
عزمِ خورشید ستاروں سے نمودار ہوا

میرا مرنا ہی نہیں اس کی رہائی خوشتر
روح کا دیوتا جسموں میں گرفتار ہوا

●

کل خدا کا بھی وہ مخالف تھا
آج انساں کو پوجتا ہے وہ

مجھ سے صدیوں خفا رہا تو کیا
اپنے سے بھی جدا رہا ہے وہ

اپنی صورت سے مختلف خوشتر
ابنِ آدم کو دیکھتا ہے وہ

▲▲

○ ۱۰/۱۴۰۵، احاطہ گوپال، کرنیل گنج، کانپور ۲۰ ○ ایڈیٹر "نام و نشان"، اردو ماہنامہ، روشن محل، بدایوں ○ نور بلخی منزل مکرانہ (راجستھان)

کرشن چندر نہیں رہے

۸ مارچ کو بمبئی میں کرشن چندر کا انتقال ہوگیا۔ وہ دل کے مریض تھے اور اس سے پہلے بھی ان پر دل کے کئی دورے پڑ چکے تھے۔ ان کی موت سے اردو ادب کو واقعی نقصان پہنچا ہے۔ وہ بلا شبہ اردو کے مقبول ترین افسانہ نگاروں میں تھے اور بہت اچھی نثر لکھتے تھے۔ ان کے عروج کا زمانہ قریب قریب وہی تھا جو راجندر سنگھ بیدی اور منٹو کے عروج کا زمانہ تھا لیکن ان تینوں کے مزاج اور رویوں میں کافی فرق تھا۔ راجندر سنگھ بیدی اگرچہ شہرت میں کسی سے پیچھے نہیں تھے لیکن انھوں نے نسبتہً بہت کم لکھا۔ منٹو اور کرشن چندر دونوں بسیار نویس تھے لیکن بسیار نویسی ہی ان کے درمیان واحد قدر مشترک تھی دونوں کی شخصیتوں میں کافی فرق تھا۔ منٹو نے شروع شروع میں اشتراکی ادیب پارٹی کے زیر اثر انقلابی ہونے کا دعویٰ کیا لیکن اس دعوے سے وہ جلد ہی دستکش ہوگئے اور خالص افسانہ نگار بن گئے۔ مقصدی ادب پر سے ان کا ایمان اٹھ گیا۔ ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے وہ انسانی قلب میں جھانکتے تھے اور وہاں انھیں بھلائی برائی جو کچھ نظر آتا تھا بے تکلفی سے لکھ دیتے تھے۔ غالباً برائی ہی زیادہ نظر آئی ہوگی جس کا ردعمل ان کی بسیار نوشی تھی جو ان کی قبل از وقت موت کا بھی باعث بنی۔

کرشن چندر سوچی سمجھی سکیم کے تحت لکھتے تھے۔ ان کے بیشتر افسانوں کا پلاٹ ان کا دل نہیں بلکہ ذہن تیار کرتا تھا لیکن ان کا انداز نگارش اتنا دلکش تھا کہ ان کی اکثر تحریریں تخلیقی ادب کا درجہ حاصل کر لیتی تھیں۔

یہ ان کا کمال تھا کہ انقلابی اور اشتراکی ادیب ہونے کے باوجود برسراقتدار حکومتوں کے ساتھ ان کا نباہ ہوتا رہا۔ انگریزوں کے عہد میں انھیں سرکاری نوکری میسر رہی اور کانگریسی حکومت جس کا تختہ الٹنے کا وہ پرچار کرتے رہے، اس سے بھی وہ فیضیاب ہوتے رہے۔ ایسے پرچوں کے ساتھ بھی ان کے تعلقات خوشگوار ہی رہے جو خالصتہً تجارتی تھے۔ ان سب رویوں کو ایک ساتھ نباہ دینا بجائے خود ایک طرح کی فن کاری تھی۔ بہر حال اس کے جواز میں بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک پیشہ ور ادیب کے لیے جن کا واحد ذریعۂ معاش اس کا قلم ہو، اس قسم کے سمجھوتے ناگزیر ہو جاتے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ اردو ادب کو ان کی ذات سے فائدہ ہی پہنچا اور ان کی موت پر اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والا ہر شخص غم محسوس کرے گا۔

راقم الحروف کے ساتھ ان کے ذاتی مراسم بھی تھے جن میں نظریاتی اختلافات کی وجہ سے کبھی فرق نہیں آیا۔ اس لیے ان کی موت میرے لیے ذاتی صدمہ بھی ہے۔ خدا ان پر اپنی رحمت کی ارزانی کرے اور ان کے پس ماندگان کو صبر کی توفیق دے۔

—— گوپال مِتّل

تبصرے

نئی حسیت اور عصری اردو شاعری

مصنف ڈاکٹر حامدی کاشمیری

قیمت :- بارہ روپے

تنقید — بڑی ذمہ داری کا فن ہے۔ مگر تخلیقی فنون کی طرح اسے مقصود بالذات نہیں کہا جا سکتا۔ تخلیق فنکار ایک خاص قسم کی ذہنی زندگی جیتا ہے۔ اس کی تخلیق آپ اپنا جواز اور آپ اپنا مقصد ہوتی ہے۔ اس کے برعکس تنقید — جس کا سرچشمہ تخلیق اور تخلیق کے خارجی انسلاکی عوامل ہوتے ہیں۔ بہ یک وقت فنکار اور فنکار سے زیادہ فنی تخلیق اور دوسری طرف تخلیق کے اس قاری کے تئیں جوابدہ ہوتی ہے جو تخلیق کا بھی قاری ہے اور تنقید کا بھی۔ تنقید میں یک طرفہ طمانیت کی تحصیل کی جستجو کوئی معنی نہیں رکھتی۔ وہ تنقید جو بہ یک وقت ان ہر دو جہات کو ملحوظ رکھتی ہے۔ اسے کم ہی خطروں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ ڈاکٹر حامدی کاشمیری نے اپنی تنقید میں ان ہر دو جہات کو ذہن میں رکھا ہے۔ اور انھوں نے جس موضوع کو پیش نظر رکھا ہے وہ بھی نسبتاً چیلنجنگ اور خطرناک ہے۔ عصری مسائل عصری فکری نظامات ادبی اقدار اور مختلف تنقیدی نظریات پر خاصا لکھا جا چکا ہے اور لکھا جا رہا ہے۔ مگر بیشتر نقاد نظریاتی گروہی اور شخصی تعصبات کی بنا پر مجموعی منظر نامے پر تو مبہم و محفوظ اظہار خیال کر جاتے ہیں مگر انفرادی سطح پر شعرا کے فن کا محاکمہ کم ہی نے کیا ہے، حامدی صاحب کا میدان جدید اور جدید ادب ہے انھوں نے اپنی تنقیدی تحقیقی کتاب جدید اردو نظم اور یورپی اثرات میں بھی نشاۃ الثانیہ سے ۱۹۴۷ء اور اس کے بعد تک کے جدید اردو نظم کے طویل سفر کے مختلف مراحل و مقامات کا احاطہ کیا تھا اور مغربی ادب' اور اس سے وابستہ تحریکات و رجحانات اور ان تحریکات و رجحانات کے اردو نظم پر اثرات پر بڑی سوجھ بوجھ کے ساتھ تنقیدی نگاہ ڈالی تھی۔ زیر نظر کتاب جس کا نام "نئی حسیت اور عصری اردو شاعری" ہے ان کی تنقیدی کتابوں میں تازہ ترین ہے۔ جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے حامدی صاحب نے عصری اردو شاعری کی ان مثالوں کو اپنا موضوع بنایا ہے جن میں نئی حسیت کی کارفرمائی ملتی ہے۔ میرے نزدیک عصری کے بجائے جدید کے توصیفی سابقے سے کیفیت کی توضیح نسبتاً مناسب انداز میں ہو سکتی تھی۔ کیونکہ عصری کا اطلاق نشور واحدی، غلام ربانی تاباں اور حسن نعیم وغیرہ ایسے شعرا پر بھی ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ تمام عصری شعرا اس مخصوص نئی حسیت کے اظہار میں یکساں نہیں اور نہ ہی تمام عصری شعرا سے ہم یہ توقع کر سکتے ہیں کہ ان میں نئی حسیت اپنی پوری قوت کے ساتھ جلوہ گر ہو کیونکہ نئی حسیت، نئی آگہی کے مترادف ہے۔ اور یہ آگہی جدید تبدیل شدہ حقائق کے تنوع اور ایک بالکل ہی مختلف عوامل کا تاریخی اور تہذیبی پس منظر رکھتی ہے۔ اسٹیفن اسپنڈر نے کہا تھا کہ جدید فن وہ ہے جس میں فنکار اپنے محاورے اور اپنی ہیئت میں بے مثال جدید صورتِ حال کی باخبری کا اظہار کرتا ہے وہ عصری اور جدید کے فرق کو خاصی اہمیت دیتا ہے کہ ٹینی سن، رسکن اور کارلائل یا ان کے بعد ایچ جی ویلز، آرنلڈ بینیٹ اور برنارڈ شا وغیرہ اپنے عہد کی سائنسی، اقتصادی، اور صنعتی تبدیلیوں سے واقف ضرور تھے مگر یہ

لوگ اس کرب سے نہیں گزرے جو عہد کا داخلی و روحانی تجربہ ہے۔ اس معنی میں وہ ایک پراگندہ اور دھند میں لپٹے ہوئے منظر و پس منظر کے تہہ نشین اسرار و رموز اور باطنی انتشار کے اسباب و عوامل سے بے خبر ہی رہے۔ ان کے یہاں اپنے عصر اور اس کے مسائل کا خارجی ادراک تھا جب کہ جدید شعراء نے اپنے تجربی اور حواسی حوالوں کے ذریعے تمام منظر نامے کے خارجی اور داخلی ہر دو پہلوؤں کے تہہ در تہہ حقائق کا عرفان حاصل کرنے کی کوشش کی اور اپنے ردّ ہائے عمل کی بنیاد پر اپنے تجربات کا اظہار کیا۔ عصری شاعری میں یہ امتیازی وصف محض جدید شعراء کے یہاں ہی دیکھا جاسکتا ہے۔ حامدی صاحب نے بڑی دراکی سے انہی شعرا کو منتخب کیا ہے جو صحیح معنی میں معاصرین کے ایک بے پایاں ہجوم میں جدید بھی ہیں اور جن میں اپنے لغوی اور اصطلاحی معنوں میں نئی حسیت کا بھرپور تخلیقی اظہار و اقرار ملتا ہے۔

'نئی حسیت اور عصری اردو شاعری' تین ابواب میں منقسم ہے۔ پہلے باب کا عنوان 'موج نگاہ' ہے۔ دوسرا 'سرحدِ ادراک' اور تیسرا 'دیدۂ بے خواب'۔ پہلا باب تقریباً بیس صفحات کو محیط ہے۔ جس میں اس بات پر زور دیا ہے کہ "ہمارے عہد میں تخلیقی ادب کے پس پردہ جو عصری شعور کارفرما ہے اس کا احاطہ کیا جائے اور خالص ادبی اصولوں کے تحت اس کی تعیینِ قدر کی جائے"۔

ایک دوسری جگہ وہ لکھتے ہیں: "سوال یہ ہے کہ شاعر اپنے دور کے آئے دن وقوع پذیر ہونے والے سماجی یا سیاسی حالات سے کیا تعلق رکھتا ہے؟ شاعر بلا شبہ بے حد حساس ہوتا ہے اور ان حالات سے شدید طور پر متاثر ہوتا ہے۔ لیکن صحافت نگاروں یا سیاسی رہبروں کے خلاف ان حالات کے فوری ردّ عمل کا اظہار اس کے دائرۂ عمل سے خارج ہے"۔

ان دونوں بیانات سے حامدی کاشمیری کے اندازِ نظر کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ انھوں نے پہلے باب میں ادب اور خصوصاً جدید ادب کے بدلے ہوئے محاورے، ہیئتی نظام اور تخلیقی عوامل اور ان کے نفسیاتی اسباب کا احاطہ کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا ہے کہ جدید تخلیقی شہ پاروں کو ان کی آزاد، خود مختار اور خود مکتفی حیثیت کے طور پر قبول کر کے ہی تنقید اپنا صحیح کردار ادا کرسکتی ہے۔

حامدی صاحب نے پہلے باب میں جو اصول قائم کیے ہیں انہیں بنیادوں پر 'دیدۂ بے خواب' کے تحت تیسرے باب میں جدید شعراء کے فکر و فن پر مفصل اور مبسوط بحث کی ہے۔ دوسرے باب میں 'سرحدِ ادراک' کے تحت بیسویں صدی کے تہذیبی، نفسیاتی، سائنسی اور فکری معائر و مقدرات کا سیر حاصل تجزیہ کیا ہے اور عالمی پس منظر کے ساتھ ہندوستانی نشاۃ الثانیہ، جدید تہذیبی و صنعتی تاریخ اور مسائل وغیرہ کو زیر بحث لائے ہیں مگر حامدی صاحب نے ان امور پر صرف اس حد تک ہی روشنی ڈالی ہے جتنی ضروری تھی۔ خلطِ مبحث یا، حشو و زوائد کو انھوں نے راہ نہیں دی ہے۔

تیسرے باب سے ان کے اس ذہن کا صاف پتہ چلتا ہے جو کہ اپنی سوچ، فکر اور رویے میں قطعی طور پر واضح تعینات کا حامل ہے۔ یہ باب 'دیدۂ بے خواب' کے تحت دو سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔ اسی باب میں جدید شعراء کی ان نظموں اور غزلوں کا محاکمہ کیا گیا ہے جن میں کسی نہ کسی سطح پر نئی حسیت تہہ نشین ہے۔ حامدی صاحب نے یہاں بھی شعری تقدیر کو کسی قطعی اصول کے تحت نہیں جانچا ہے بلکہ تخلیق اور تخلیق کی من حیث المجموع شکل کو مرکزی حیثیت دی ہے۔ اسی باعث ان کی تنقید میں شروع سے آخر تک ایک فعال رو جاری و ساری ہے۔ اس ذیل میں تہذیب و ثقافت، لسانیات، نفسیات، اساطیری انسلاک، استعارے، علامت اور پیکر کی جدلیاتی قدر و قیمت، جدید تشکیک، بحران، دہشت اور خوف کی محیطِ کل فضا، عصری زندگی کا کھوکھلا پن، بے معنویت، احساس عدمیت، معنوی کثیر الجہتی شہر کا

علامیہ اور بے عقیدگی وبے چہرگی، وغیرہ امور ومسائل زیر بحث آتے ہیں مگر طے شدہ طور پر ان کا اطلاق نہیں کیا گیا ہے بلکہ ان فنی وفکری تجربات وعوامل کے اصل ماخذ وہی جدید شعری تخلیقات ہیں جن کا تعلق ۱۹۵۰ء کے بعد سے ہے ۔ یہ صاف نظر آتا ہے کہ حامدی صاحب اپنی تنقید میں عمومی تنقید کی مخصوص اصطلاحات کو منطبق کرنے کے بجائے تنقید میں تخلیق کی صحیح شناخت کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ حامدی صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس اَن چھوئے موضوع پر اتنی مبسوط اور جامع کتاب تصنیف کر کے غور وفکر کی نئی راہیں وا کیں ۔

——— عتیق اللہ

جملوں کی بنیاد

مصنف :۔ کمار پاشی

قیمت :۔ ۷ روپے

ناشر :۔ پی۔ کے پبلیکیشنز پرتاپ اسٹریٹ، گولا مارکیٹ دریا گنج دہلی

'جملوں کی بنیاد' کمار پاشی کے سات مختصر ڈراموں کا مجموعہ ہے ہر ڈرامہ صرف ایک منظر پر مشتمل ہے ۔ ان ڈراموں کے مختصر تعارف میں جسے کمار پاشی نے "آئینہ نما" سے موسوم کیا ہے وہ کہتے ہیں :۔

"زندگی کے اس عظیم ڈرامے میں ہم سب ہمہ وقت اداکاری کرتے ہیں .... اگر ہم تنہائی کے چند لمحوں میں خود میں ذرا سی بھی دلیری پیدا کریں تو ہم پر کھلے گا کہ ہم خاصے منجھے ہوئے اداکار ہیں۔ اتنے کہ ہم خود پر بھی یہ ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتے کہ ہم ہمہ وقت اداکاری کرتے ہیں، فطری عمل نہیں کرتے"...... اور :۔

"زندگی کے بے آغاز وبے انجام ڈرامے میں یک بابی ڈراموں کا مصرف اتنا ہے کہ ہم اپنے اصلی خد وخال کو ایک نظر دیکھ لیں ۔ طویل ڈرامے کے چند مناظر میں آئینے کے سامنے لے آیا ہوں۔"

اور اس میں شک نہیں کہ ان مختصر ڈراموں میں زندگی کے متعدد بظاہر معمولی اور گمنام گوشوں کی کہیں دھندلی اور کہیں شفاف جھلکیاں ہیں۔ ان خاکوں کی سچائی اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ کمار پاشی نے ان تصویروں کو ایک خوبصورت فریم میں جڑ کر انہیں جاذب نظر بنانے کی کوشش نہیں کی۔ ان کی نقاب کشائی کے عمل میں مشاہدے کی تیزی کے ساتھ بیک وقت دکھ اور بے رحمی کی آمیزش ہے۔ جس نے ان ڈراموں میں ایک پریشان کن اور چونکا دینے والی کیفیت پیدا کر دی ہے ۔ ان ڈراموں کے بیشتر کردار مشینی دور کے آدھے ادھورے انسان ہیں۔ جن کی زندگی بے جہتی کا شکار ہے ان کے جذبات اور تاثرات میں دھندلاپن، ردِ عمل میں سطحیت اور آپسی رشتوں میں کھوکھلاپن ہے ۔ اور اکثر ان کے کل کے کھلونے یا چلتے پھرتے مبہم سائے ہونے کا دھوکا ہوتا ہے ۔

پاشی کے ڈراموں کی ایک اور نمایاں خصوصیت ان کی سادگی اور بے ساختگی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے گرد وپیش کے عام مناظر اور معمولی واقعات کو من وعن پیش کر دیا ہے اور انہیں فن کے قالب میں ڈھالنے کی شعوری کوشش نہیں کی ۔ ان کے بعض ڈرامے تو ڈرامائی فورم کی بندشوں اور ابتدا، ارتقا اور انتہا کی قید سے بھی آزاد معلوم ہوتے ہیں۔ اور ایک قسم کا ڈرامائی رپورتاژ ہونے کا تاثر چھوڑتے ہیں۔ ان جھلکیوں کی سچائی سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔ لیکن یہ سچائی اس قسم کی فنی اکائی میں نہیں ڈھل سکی ہے جو اپنی حدود سے گزر کر کسی گہری اور بنیادی حقیقت کی نشاندہی کر سکے اپنے بیشتر ڈراموں میں پاشی نے جس قسم کی حقیقت نگاری کا سہارا لیا ہے اسے SLICE OF LIFE REALISM کہا جا سکتا ہے ۔ جسے انیسویں صدی میں ایمیل زولا اور اس کے ساتھیوں نے فروغ دیا تھا اور جس کا نصب العین زندگی کے کسی محدود گوشے کو اپنی تمام تفصیلات اور خصوصیات کے ساتھ بے نقاب کرنا تھا۔

"تھکے مارے" اور "کمپلینٹ" کے علاوہ "چور" اور "اینٹی کیٹ"، بھی ڈرامائی حقیقت نگاری کی مثالیں ہیں۔ اس گروپ کا سب سے کمزور ڈرامہ "چور" ہے جس میں ایک

روایتی پلاٹ اور افسانوی کلیشوں (CLICHES) کا سہارا
لیا گیا ہے اور سب سے کامیاب ڈرامہ "ایٹی کیٹ" ہے
جس میں ہاشمی ذاتی تجربے اور مشاہدے کو ایک فنی
اکائی میں ڈھالنے میں کامیاب رہے ہیں۔ اس ڈرامے
کا نقطۂ عروج اگنی ہوتری کی آمد ہے۔ اس وقت اگنی
ہوتری کی خاموشی ایک ڈرامائی تکلم ہے جو جذبہ اور
کیفیت کے اظہار کی قوت رکھتی ہے اور نروان اور
اس کے دوستوں کے روایتی فقرے ایک پرشور گونگا پن
جو ہر قسم کے اظہار سے قاصر ہے۔ یہ ڈرامہ ایک ایسا آئینہ ہے
جس سے آنکھ ملانے کے لیے ہاشمی کے الفاظ میں دلیری
اور بے شرمی ناگزیر ہے۔

اس مجموعے کے باقی تین ڈرامے یعنی "اندھیرے کے
قیدی"، "بو" اور "جملوں کی بنیاد" موضوع کے اعتبار سے
زیادہ پیچیدہ ہیں۔ جن میں ہاشمی نے صرف ماحول کی عکاسی
پر اکتفا نہیں کی بلکہ انسان کے وجودی تجربے کو پیش کرنے کی
کوشش کی ہے۔ ان ڈراموں میں وہ حقیقت نگاری
سے علامتی طریقۂ کار کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے نظر آتے
ہیں۔ ان تینوں ڈراموں میں سب سے کامیاب اور پراثر
ڈراما "اندھیرے کے قیدی" اور سب سے کمزور ڈراما "بو"
ہے "بو" کسی حد تک ایڈورڈ آلبی کے ڈرامے DELICATE
BALANCE کی یاد دلاتا ہے جس کے کردار ایک نامعلوم
خوف سے دوچار ہوتے ہیں جو نہ صرف ان کے وجودی تجربے
کا استعارہ ہے بلکہ ان کے آپسی رشتوں، اقدار اور نفسیاتی
پیچیدگیوں کے اظہار کا وسیلہ بن جاتا ہے، اس کے برخلاف
ہاشمی "بو" میں علامتی معنویت پیدا کرنے میں ناکام رہے ہیں۔
اور یہ واقعہ کسی گہرے اور پیچیدہ معنی کی نشاندہی کرنے کے
بجائے ایک ہندی پرچارک دیش بھگت گری دھر اور
ایک انقلابی کارکن زبیری کی نوک جھونک پر ختم ہو جاتا
ہے۔ ڈرامے میں انقلابی نقطۂ نظر پر چوٹیں اور فقرہ بازی
فنی طور پر خارج از آہنگ ہیں۔

اس کے برعکس "اندھیرے کے قیدی" ایک کامیاب
ڈرامہ ہے جس کے مختلف عناصر علامتی معنویت کے حامل
معلوم ہوتے ہیں۔ سونو کے مکان کا اندرونی حصہ جو اندھیرے
میں لپٹا ہوا ہے۔ روشندان کا ٹوٹا کانچ، اور دوسرے
روشندان میں اٹکی ہوئی ایک پھٹی پتنگ۔ تاریک مکان
کے اندر چمگادڑوں کے چلّانے کی صدائیں یہ سب تفصیلات
حقیقی ہونے کے ساتھ ساتھ علامتی بھی ہیں اور معنی کی ترسیل
میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ ڈرامے کی مرکزی علامت
سونو کا جاں بلب باپ ہے جس نے اس کی ماں کی معصومیت
لوٹی اور اب سونو اور اس کی محبوبہ کے آپسی تعلقات
میں سدِّراہ ہے۔ اس بوڑھے کی موت، جو اس وقت
تاریک مکان کے اندر دم توڑ رہا ہے۔ سونو کی خوشی اور
نارمل زندگی کے لیے ناگزیر ہے اور سونو اپنے دوست
نندی سے (جو سونو ہی کی شخصیت کا ایک پہلو معلوم ہوتا
ہے) التجا کرتا ہے کہ وہ بوڑھے کا گلا دبا دے۔ لیکن اس کا
مارنا آسان نہیں کیونکہ:-

"وہ ہر جگہ موجود ہے ..... وہ ہر دیوار میں ہے
..... ہر چیز میں ہے۔ وہ مرا ہوا بھی ہے اور زندہ بھی...
دراصل وہ گہرے عذاب میں ہے ..... وہ ٹوٹ پھوٹ
کر شاید گھر کی ایک ایک اینٹ میں سما گیا ہے ....
ایک ایک اینٹ میں اس کی مردہ آنکھیں کھب گئی ہیں"
اور اس سے نجات پانے کے لیے:

"گھر کی ایک ایک اینٹ کو گرانا ہوگا..... ایک
ایک اینٹ کو جلا دینا ہوگا۔ اور اس کے لیے سونو، بینا
اور نندی کو انتظار کرنا ہوگا"

یہ بوڑھا باپ کون ہے؟ — کیا ہے؟ — کیا یہ سونو
کا ماضی ہے جس سے چھٹکارا ممکن نہیں؟ اس کی شخصیت کا وہ
بیمار پہلو ہے جو اس کی ہر خوشی میں زہر گھولتا رہتا ہے؟ یا یہ
ایک بوسیدہ اور سڑا ہوا انتظام ہے جس کی تخریب ہی میں ایک
نئی تعمیر کا راز پنہاں ہے؟ یا پھر یہ زندگی کی کوئی ایسی تاریک
اور پیچیدہ قوت ہے جس کی گرفت سے نکلنا آسان نہیں؟ یہ
اور اسی قسم کے دوسرے سوال ذہن میں پیدا ہو سکتے ہیں۔

اور اس طرح یہ علامت پیچیدہ معنی کی ترسیل میں معاون ثابت ہوتی ہے اور ڈرامے میں ایک گہرا تاثر پیدا کرتی ہے باقی ڈراموں کے مقابلے میں "دو جملوں کی بنیاد" کا کینوس زیادہ بڑا ہے۔ اور اس ڈرامے میں کمار پاشی نے کچھ بنیادی سوال اٹھانے کی کوشش کی ہے، لیکن اس کوشش میں وہ بڑی حد تک ناکام رہے ہیں۔ ٹیکنیک اور موضوع کے اعتبار سے اس ڈرامے پر ابسرڈ ڈرامے (ABSURD DRAMA) کا اثر نمایاں ہے۔ اور اس میں کہیں کہیں بیکٹ اور الونیسکو کے ڈراموں کی بازگشت بھی سنائی دیتی ہے لیکن اسے پڑھنے کے بعد یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ابسرڈ ڈراما سے پاشی کی واقفیت سطحی اور سرسری ہے اور کچا۔ انھوں نے اس کی ظاہری خصوصیات کو اپنایا ہے لیکن وہ اس کی فلسفیانہ بصیرت اور وژن کو اپنے فن میں نہیں سمو سکے ہیں۔ پاشی کے دوسرے ڈراموں کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اپنی حدود کے اندر رہ کر فنی تجربے کیے ہیں لیکن یہاں انھوں نے اپنی فکری اور تجرباتی حدود سے باہر نکل کر ایک ایسی مملکت میں داخل ہونے کی کوشش کی ہے جو ان کے لیے کم و بیش اجنبی ہے۔ یہ ایک نیک فال بھی ہو سکتی ہے اور فنی کمزوری بھی۔ جس کا فیصلہ ان کے آئندہ ڈرامے ہی کر سکتے ہیں۔

بحیثیت مجموعی پاشی کے ڈراموں کی خوبیوں کا سرچشمہ ان کے مشاہدے کی توانائی اور شدت احساس ہے۔ اور ان کی کمزوریوں کی وجہ ان کی اسٹیج اور تھیٹر سے واقفیت کی کمی ہے۔ جس کے باعث انھوں نے ڈرامے کے بعض عناصر کو نظر انداز کیا ہے یا ان پر کم توجہ دی ہے۔ اور ڈرامے کے متعدد فنی وسائل کے تخلیقی استعمال سے قاصر رہے ہیں۔ انھوں نے مکالمہ نگاری پر کافی توجہ دی ہے اور ان کے بعض ڈراموں مثلاً "اندھیرے کے قیدی" "کمپلینٹ" اور "اینٹی کیٹ" کے مکالمے کافی جاندار ہیں۔ لیکن ڈرامے کے دوسرے عناصر مثلاً پس منظر —— کردار کی نقل و حرکت، وضع قطع، لباس، لہجہ ان چیزوں پر انھوں نے زیادہ توجہ نہیں دی ہے —اسی طرح اسٹیج اور ڈراما کے دوسرے بصری اور سماعی فنی وسائل مثلاً روشنی۔ اندھیرا۔ آوازیں۔ موسیقی۔ خاموشی۔ حرکت۔ رنگ اور TEMPO وغیرہ کا تخلیقی استعمال ان کے ہاں بہت کم ہے۔ ان کے ڈراموں میں ایک آدھ جگہ خاموشی کا موثر استعمال ہے لیکن بیشتر وہ اس کے ڈرامائی استعمال سے کتراتے ہیں۔ مثلاً ان کے ڈرامے "اینٹی کیٹ" کے آخر میں اگنی ہوتری کی واپسی کے بعد

"ایک منٹ کمرے میں مکمل خاموشی رہتی ہے۔ سب ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں —— حیرت خوشی اور استعجاب کے موڈ میں"

یہاں پرشور اور بے معنی ہنگاموں کے درمیان یہ مکمل خاموشی ایک شدید ڈرامائی لمحہ بن کر پیچیدہ تاثرات کو جنم دے سکتی تھی۔ لیکن خاموشی کی اس وضاحت نے (حیرت خوشی اور استعجاب کے موڈ میں) اس کی ڈرامائی معنویت چھین لی ہے۔

ان خامیوں کے باوصف کمار پاشی کے ڈراموں کی قابلِ قدر خصوصیات سے انکار نہیں کیا جا سکتا جن کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے۔ ان ڈراموں کو ایک ہونہار ادیب کی ابتدائی کاوشوں کی حیثیت سے دیکھا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ اور اس اعتبار سے یہ ڈرامے جاذبِ توجہ اور قابلِ قدر ہیں۔ اور کچھ ایسے امکانات کی نشاندہی کرتے ہیں جن کے پیش نظر اس مجموعے کے قاری پاشی کے اگلے ڈرامائی مجموعے کے منتظر رہیں گے۔

—— زاہدہ زیدی

سخاروف نے کہا
نوبل انعام یافتہ سائنسداں
الیگزنڈر ڈی سخاروف کی تقریریں اور بیانات
قیمت : سات روپے

خبر نامہ

● کرشن موہن کے ہاں ۲۶ فروری کی شام کو ایک ادبی محفل منعقد ہوئی جس کا مقصد دیوندر ستیارتھی کو حکومتِ ہند کی طرف سے پدم شری کے اعزاز سے نوازے جانے کے سلسلہ میں تہنیت پیش کرنا تھا۔ اس ادبی نشست میں دیوندر ستیارتھی اور کرشن موہن کے علاوہ تقریباً اکیس نئے و پرانے لکھنے والوں نے شرکت کی۔ پروفیسر جے دیو سیٹھی، جوگندر پال، بانی، کرشن مراری، اقبال عمر، صغیر احمد صوفی، رام پرکاش راہی، اندر سروپ دت ناداں، بلراج ورما، اندر جیت گاندھی اور مجتبیٰ حسین کے علاوہ پنجابی کے ادیب جان گوبند پوری اور گلزار سنگھ بندھو نے بھی محفل کی رونق بڑھائی۔ سبھی حضرات نے مہمانِ خصوصی دیوندر ستیارتھی کو مبارکباد پیش کی۔ ستیارتھی صاحب کی ادبی خدمات، خصوصاً ملک کے طول و عرض میں بنجاروں کی طرح سالہا سال تک گھوم گھوم کر لوک گیتوں کو فراہم کر کے قوم کی ایک بڑی تہذیبی پونجی کو ایک جگہ محفوظ کر دینے کی اُن کی کوششوں کو خلوص و احترام سے سراہا گیا۔

ستیارتھی نے اپنی کہانی جس کا نام انھوں نے ابھی تک طے نہیں کیا، حاضرین کو پڑھ کر سنائی۔ کہانی جو ستیارتھی نے اپنے منفرد انداز میں لکھی ہے کافی پسند کی گئی۔ کچھ سجھاؤ بھی پیش کیے گئے جو انھوں نے بخوشی قبول فرمائے۔

ستیارتھی کا سب سے بڑا وصف جس کا تفصیلی تجزیہ انوار رضوی کے مضمون میں کیا گیا (یہ مضمون اُن کی خلاف توقع غیر حاضری میں مجتبیٰ حسین نے پڑھ کر سنایا۔ اور بہت پسند کیا گیا) یہی ہے کہ ستیارتھی اپنی بزرگی تجربے علم اور انفرادیت کے باوجود ماضی و حال کے ادیبوں میں انھیں میں سا ایک ہو کر شامل رہتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اُن کے اسی امتیازی وصف نے انھیں آج تک ایسا تندرست و توانا بنائے رکھا ہے۔

ستیارتھی کی کہانی اور انوار رضوی کے مضمون کے بعد شاعری کا دور شروع ہوا۔ دستور کے مطابق یہ سلسلہ صاحبِ خانہ ہی سے شروع ہوا۔ اُن کی غزلوں پر خوب داد ملی۔

کرشن موہن کے بعد صغیر احمد صوفی نے اپنا کلام سنایا۔ اُن کے بعد اقبال عمر، کرشن مراری، رام پرکاش راہی۔ اندر سروپ دت ناداں اور بانی نے اپنا اپنا کلام سنایا جس پر اہلِ محفل نے تحسین و آفرین کی۔

بعد ازاں اہلِ محفل کی خورد و نوش سے تواضع کی گئی۔ یہ ایک حسین شام تھی، جو بہت دنوں تک یاد رہے گی۔

بلراج ورما

● ۲۵ مارچ کی شام کو کرشن موہن صاحب کے مکان پر ایک اور یادگار ادبی محفل کا انعقاد عمل میں آیا۔ یہ محفل حفیظ جالندھری صاحب کے اعزاز میں منعقد ہوئی جو اِن دنوں دلّی آئے ہوئے ہیں۔ محفل مختصر تھی لیکن حفیظ صاحب کی شرکت نے جو برسوں بعد اپنے ہندوستانی دوستوں اور مداحوں کے درمیان خود کو موجود پا کر بہت خوش تھے، شگفتگی اور سرشاری کی ایک ایسی فضا پیدا کر دی تھی جو کم ہی محفلوں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔

کرشن موہن نے حفیظ صاحب اور دوسرے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ ہم میں سے کئی لوگ حفیظ صاحب

کے نام اور کلام سے اپنی طالب علمی کے زمانے سے نہ صرف واقف بلکہ مانوس ہیں اور ان کی شاعری ہماری ادبی یادداشت کا ایسا حصہ بن چکی ہے جسے ہم کبھی بھلانا چاہیں گے نہ بھلا سکتے ہیں۔ کرشن موہن کے بعد ان کے ایما پر مخمور سعیدی نے نشست کی باضابطہ کارروائی کا آغاز کرتے ہوئے صدارت کے لیے گوپال متل صاحب کا نام پیش کیا جس کی سبھی نے تائید کی۔ متل صاحب نے کہا کہ حفیظ صاحب سے میرے نیازمندانہ تعلقات بہت پرانے ہیں۔ لاہور میں جب میری ادبی زندگی کا آغاز ہوا، تو حفیظ صاحب ایک مشہور و مستند شاعر کا مرتبہ حاصل کر چکے تھے لیکن یہ ان کا کرم تھا کہ انھوں نے مجھے اپنے حلقے کے قریبی لوگوں میں شامل کر لیا اور یہ حقیقت ہے کہ ان صحبتوں سے مجھے بہت کچھ حاصل ہوا۔ ایک مسلم الثبوت شاعر کے علاوہ ایک مشفق دوست کی حیثیت سے بھی میرے دل میں ان کا بہت احترام ہے اور مجھے جب بھی ان کا خیال آجاتا ہے میں خود کو دل کی گہرائیوں سے ان کا احسان مند محسوس کرتا ہوں۔

شعر خوانی کا آغاز مخمور سعیدی نے اپنی ایک غزل کے کچھ اشعار سے کیا، پھر راج نرائن راز، باقی، کرشن مراری، کرشن موہن، گوپال متل اور بسمل سعیدی صاحب نے کلام سنایا۔ دوسرے شعرا کے علاوہ حفیظ صاحب بھی بہت محظوظ ہوئے، بعض اشعار مکرر سہ کرر پڑھوائے اور فرمایا کہ جہاں سے میں آرہا ہوں وہاں اب ایسے اچھے اشعار سننے کو کان ترسنے لگے ہیں۔ آخر میں حفیظ صاحب سے کلام سنانے کی درخواست کی گئی۔ حفیظ صاحب بہت اچھے موڈ میں تھے، سننے والوں کے اشتیاق کا اندازہ کرتے ہوئے جو ان کی مسلسل فرمائش سے ظاہر تھا، انھوں نے اپنی مسحور کن آواز میں یکے بعد دیگرے کئی غزلیں سنائیں اور یہ سلسلہ جب اپنی مشہور و مقبول نظم " ابھی تو میں جوان ہوں" پر ختم کیا تو محفل کیف اثر کے نقطۂ عروج پر تھی۔

شعرا کے علاوہ سامعین میں جوگندر پال صاحب، شہباز حسین صاحب، ظفر پیامی صاحب، بلراج ورما صاحب، نوین جگی صاحب اور پریم گوپال متل کے نام بھی شامل تھے۔ محفل کا اختتام ایک پرتکلف ضیافت پر ہوا جو مسز کرشن موہن کی مہمان نوازی اور سلیقہ مندی کی مظہر تھی۔

——— پریم گوپال متل

ساحر ہوشیاری کو صدمہ

ادبی حلقوں میں یہ خبر افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ پچھلے دنوں دلی کے ایک نرسنگ ہوم میں جناب ساحر ہوشیارپوری کی والدۂ محترمہ کا انتقال ہو گیا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر اسی سال سے متجاوز تھی۔ ہم ساحر صاحب اور ان کے خاندان کے دوسرے افراد کے غم میں شریک ہیں۔

——— ادارہ

جدید شاعری میں فکری توازن کی ایک نقش مثال
مخمور سعیدی کے شعری مجموعے
آواز کا جسم ——— قیمت:- دس روپے
سب رنگ ——— قیمت:- پانچ روپے
سیہ بر سفید ——— قیمت:- چھ روپے
گفتنی ——— قیمت:- چار روپے
نیشنل اکاڈمی، دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

پنجاب اور آندھرا کی لائبریریوں کے لیے منظور شدہ

ماہنامہ تحریک
نئی دہلی

جلد: ۲۵ شمارہ: ۲

مئی ۱۹۷۷ء

ادارۂ تحریر:

گوپال متّل ○ مخمور سعیدی

پریم گوپال متّل

سالانہ قیمت: پندرہ روپے، فی کاپی: ایک روپیہ ۲۵ پیسے

بیرونی ممالک سے

سالانہ: تین پونڈ فی کاپی: چھ شلنگ

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتا:

منیجر ماہنامہ تحریک، ۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر:

گوپال متّل

مطبع: نعمانی پریس، دہلی

مقامِ اشاعت: ۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دلی ۱۱۰۰۰۲

Dr. Zakir Husain Library, Jamia Nagar, New Delhi-110025

مندرجات:

اپنی رقم دوگنی کیجیے

۱۰۰ روپے
صرف سات سال میں
۲۰۰ روپے
بن جاتے ہیں

نیشنل سیونگز سرٹیفکیٹ
(پانچواں اجراء)
کے ذریعے

دیگر فوائد:

- سود ٹیکس سے مستثنیٰ
(سال میں 3000 روپے کی رقم تک)

- دولت ٹیکس سے چھوٹ
(1.5 لاکھ روپے کی رقم تک)

مزید معلومات کے لیے براہ مہربانی کسی منظور شدہ ایجنٹ یا ڈاکگھر سے رابطہ قائم کیجیے

قومی ــــ بچت ــــ ادارہ

DAVP 76/927

گاندھی جی کے اساسی تصوّرات

گوپال متّل

یہ بات بڑی ہی خوشگوار ہے کہ جنتا پارٹی اور کانگرس فار ڈیموکریسی کے رہنماؤں نے عنانِ اقتدار سنبھالنے سے پہلے ۲۴ مارچ کو گاندھی جی کی سمادھی پر جاکر ان کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کا حلف لیا۔ اگر وہ واقعی ایسا کرسکیں تو یہ ہندوستان کی بہت بڑی خوش نصیبی ہوگی۔ گزشتہ چند برسوں میں ہندوستان میں جو ماحول رہا ہے اس کے پیش نظر یہ بہت ضروری ہے کہ گاندھی جی کے بنیادی عقائد کو ان کے حقیقی رنگ میں پھر سے پیش کیا جائے۔

گاندھی جی کی حقیقی دلچسپی فرد کی شخصیت کی آزادی اور اس کی نشو و نما سے تھی اور یہ ان کے ستیہ گرہ کا بنیادی جز تھا۔ انھوں نے اپنے معتقدین کو یہ واضح طور پر ہدایت کی تھی کہ ان میں سے کسی کو بھی ان کا مشورہ اس وقت تک نہیں ماننا چاہیے جب تک "اسے ان کا دماغ اور دل قبول نہ کرے[1]"۔

ایک اور جگہ انھوں نے لکھا تھا:

"جس طرح میں اپنی آزادی کی قدر کرتا ہوں اسی طرح دوسروں کی آزادی کی بھی۔ میں کسی ایک شخص کو بھی اپنا ساتھ دینے پر آمادہ کرنا نہیں چاہتا، اگر میری بات کو اس کی عقل قبول نہ کرتی ہو[2]"

وہ خود کو اپنی قوم کا واحد نجات دہندہ نہیں سمجھتے تھے:

"میں اپنا مشن یہ نہیں سمجھتا کہ ایک مہم جو سورما کی طرح ہر جگہ گھومتا پھروں اور لوگوں کو مشکلات سے نجات دلاؤں۔ میرا کام تو لوگوں کو یہ بتانا ہے کہ وہ اپنی مشکلات خود کس طرح حل کرسکتے ہیں[3]"

ان کے طریقِ کار میں اولیت ریاست کو نہیں بلکہ فرد کو حاصل تھی۔ انھوں نے دوٹوک لہجے میں کہا تھا کہ "سوراج کی طرف پہلا قدم فرد ہی اٹھاتا ہے اس عظیم صداقت کا کہ جیسا فرد ویسی دنیا، اطلاق یہاں بھی ہوگا اور دوسری ہر جگہ بھی[4]"

اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ ان کے طریق کار اور کمیونسٹوں یا سوشلسٹوں کے طریق کار میں کیا فرق ہے، انھوں نے کہا تھا:

"وہ کہتے ہیں کہ جب انھیں ریاست پر کنٹرول حاصل ہو جائے گا تو وہ مساوات نافذ کردیں گے۔ میرے طریق کار کے مطابق ریاست کا کام عوام کی خواہشات کو عملی جامہ پہنانا ہے، انھیں اپنی خواہشات کو عملی جامہ پہنانے پر مجبور کرنا نہیں ہے[5]"

گاندھی جی نے اپنے تصورِ ریاست کی توضیح بڑے ہی غیر مبہم لفظوں میں کی ہے:

"...... حقیقی سوراج اس طرح نہیں آئے گا کہ چند افراد اقتدار پر قبضہ کرلیں۔ یہ تو تب آئے گا جب سب لوگوں میں یہ صلاحیت پیدا ہو جائے گی کہ وہ اقتدار کے غلط استعمال کی مزاحمت کرسکیں۔ دوسرے لفظوں میں سوراج کا مقصد عوام کو یہ تربیت دینا ہے کہ وہ اقتدار کو کنٹرول کرسکیں اور

---

۱ - ہریجن - ۱۵ر جولائی ۱۹۳۹ء

۲ - ینگ انڈیا - ۱۵ر جولائی ۱۹۳۹ء

۳ ہریجن - ۲۸ر جون ۱۹۴۲ء

۴ مہاتما گاندھی کی تقریریں اور تحریریں - چوتھا ایڈیشن، صفحہ ۴۰۹

۵ ہریجن میں پیارے لال کا مضمون - ۳۱ر مارچ ۱۹۴۶ء

صحیح راستے پر چلا سکیں[1]"

طبقاتی جنگ کے تصور کو جو سائنٹیفک سوشلزم کا سنگِ بنیاد ہے، گاندھی جی تسلیم نہیں کرتے تھے اور نہ اس بات کو مانتے تھے کہ ان کے عقائد اور سائنٹیفک سوشلزم یعنی کمیونزم میں کسی قسم کی مفاہمت ممکن ہے۔ گاندھی جی کے مستند شارحین بھی دونوں نظریوں میں مفاہمت کے امکان سے انکار کرتے ہیں۔ شری ونوبا بھاوے نے دو ٹوک لفظوں میں کہا ہے کہ "ان دونوں نظریوں میں مفاہمت ممکن نہیں" اور یہ کہ ان میں جو اختلافات ہیں وہ "بنیادی" ہیں۔ خود گاندھی جی نے گجرات ودیاپیٹھ کے طالب علموں سے بولشوزم کے مسئلے پر بات کرتے ہوئے اپنے ردِ عمل کا واضح لفظوں میں اظہار کیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ "بولشوزم صرف یہی نہیں کر تشدد کے استعمال کو جائز سمجھتا ہے بلکہ وہ نجی جائداد کو ختم کرنے اور مشترکہ ملکیت کو قائم رکھنے کے لیے تشدد کے آزادانہ استعمال کی حمایت بھی کرتا ہے"۔ گاندھی جی کا خیال تھا کہ "تشدد کی بنیاد پر کوئی بھی پائدار چیز قائم نہیں کی جاسکتی"۔ کمیونسٹ نظریے کے ہندوستانی مقلدین یعنی کمیونسٹوں کے متعلق بھی ان کی رائے میں کوئی ابہام نہیں تھا۔ آزادی سے کچھ ہی پہلے انھوں نے صوبہ کانگرس کمیٹیوں کے پردھانوں اور سیکریٹریوں کی میٹنگ میں سوالوں کے جواب دیتے ہوئے کہا تھا:

"کمیونسٹوں کا مسئلہ کسی قدر مختلف نوعیت کا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے شرارت اور گڑبڑ کو اپنا پیشہ بنالیا ہے۔ ان میں میرے دوست بھی ہیں لیکن وہ جائز اور ناجائز، سچ اور جھوٹ میں کوئی امتیاز نہیں کرتے۔ وہ اس الزام سے انکار کرتے ہیں لیکن ان کے افعال اس کی تائید کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ ہندوستان کے مقابلے میں روس ہی کو اپنا روحانی وطن خیال کرتے ہیں۔ میں ایک بیرونی طاقت کی اس ماتحتی کو قبول نہیں کرسکتا[2]"

[1] ینگ انڈیا۔ ۲۹ جنوری ۱۹۲۵ء

[2] مہاتما، مصنفہ تنڈلکر، جلد ہفتم، صفحات ۲۶۱، ۲۶۲۔

اردو کے مسلم الثبوت استاد شاعر
مرزا محمد تقی مائل دہلوی کا پورا غزلیہ کلام

کلیاتِ مائل

مرتب: مولوی احترام الدین احمد شاغل عثمانی
ناشر: راجستھان ساہتیہ اکاڈمی
قیمت: تہتر روپے پچاس پیسے

نازش بک سنٹر کی تازہ پیش کش

گوپال متل ——— ایک مطالعہ

محمد عبدالحکیم کا تحقیقی اور تنقیدی مقالہ جو عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کے ایم۔اے۔ سالِ آخر کے لیے لکھا گیا۔
گوپال متل کی زندگی اور ان کے ادبی اور شعری کارناموں کا بھرپور جائزہ ——— آخر میں گوپال متل کی نثری اور شعری نگارشات کا انتخاب بھی شامل ہے۔ قیمت پندرہ روپے

بسمل سعیدی
شخص اور شاعر

بسمل سعیدی کے فکر و فن پر دستاویزی اہمیت کی حامل کتاب۔ ممتاز اہلِ قلم کے مضامین کا مجموعہ۔ آخر میں بسمل صاحب کا انٹرویو بھی دیا گیا ہے جو ہماری تاریخِ ادب کے بہت سے مخفی گوشوں کو سامنے لاتا ہے۔ قیمت: اٹھارہ روپے۔
نیشنل اکاڈمی ۹/۲ انصاری مارکیٹ نئی دہلی

حفیظ جالندھری | پنجاب میں شراب کی قانوناً مناہی پر

(نہ پینے والے حفیظ نے لکھا)

پیارے مِتّل جی!

جن دنوں میں ڈائریکٹر جنرل آف مورالز آرمڈ فورسز تھا۔ فوج کا ایک اکاؤنٹنٹ جنرل خود شرابی تھا۔ لیکن مسجدوں میں وعظ کرتا تھا شراب کے خلاف۔ ایک مسجد اس کے دفتر کے باہر تھی۔ لیکن اپنے کلرکوں سے اور ماتحت افسروں سے زبردستی ہزار ہا روپیہ حکماً چندہ لے کر دفتر کے احاطے میں مسجد بنوانے کے لیے ایک بڑا مشاعرہ منعقد کیا۔ خود صدارت فرمائی۔ مجھکو خاص طور پہ حاضر ہونے کی استدعا مجھ سے بلند مرتبے کے افسر سے کی۔ لہٰذا ہزار ہا سامعین کے سامنے مجھے یہ نظم سنانی پڑی۔ (حفیظ)

شکستِ شیشہ و ساغر کا رنج کیا ساقی
مئے سخن تو بہر حال ہے ابھی باقی

نہیں شراب تو ذکرِ شراب ہونے دے
کسی طرح دلِ زاہد کباب ہونے دے

زمینِ شعر میں بھٹّی نکال اے ساقی
مشاعرے ہی کو بوتل میں ڈھال اے ساقی

نئے شگوفے ہیں رنگِ سخن کی تصویریں
مشاعروں سے ہیں اب مسجدوں کی تعمیریں

جنابِ شیخ کے ارشاد پر عمل ہی سہی
اگر شراب نہیں ہے۔ تو اک غزل ہی سہی

غزل

مشاعرہ ہو تو سب شیخ و شباب پیتے ہیں
دہانِ گوش سے جامِ شراب پیتے ہیں

نچوڑ کر رگِ مزدور جام بھر بھر کر
بہت سے لوگ برائے ثواب پیتے ہیں

سُنا ہے وادیِ پنجاب سے اُدھر کچھ لوگ
خدا کے فضل سے اب تک شراب پیتے ہیں

وہ جن کا محتسبوں سے مِلا ہے "قارورہ"
وہ بے نیازِ غمِ احتساب پیتے ہیں

چڑھی ہوئی ہے اُنہیں اقتدار کی مستی
کچھ ایسی شکل ہے جیسے شراب پیتے ہیں

چھپا چھپا کے رکھی تھی جناب کی خاطر
مرا خیال یہی تھا — جناب پیتے ہیں

یہ دور وہ ہے کہ رِندانِ اہلِ ظرف حفیظ
لہو کے گھونٹ بچشمِ پُر آب پیتے ہیں

معرفت ظفر پیامی، سی ۷، نظام الدین ایسٹ، نئی دِلّی

غزل

کرشن موہن

عشق جب جاں نثار کرتا ہے
حسن کچھ اور بھی نکھرتا ہے
چند روزہ حیات کی خاطر
آدمی بار بار مرتا ہے
سوچتی ہی رہے خرد جس کو
عشق وہ کام کر گزرتا ہے
اتنی وحشت بسی ہے دنیا میں
آدمی آدمی سے ڈرتا ہے
دل ہے دریائے فکر کا غوّاص
یہ تو پاتال تک اترتا ہے
ڈھونڈ لاتا ہے گوہرِ معنی
سوچ میں ڈوب کر ابھرتا ہے
شکوۂ روزگار کرنے سے
کیا مقدر کبھی سنورتا ہے
فطرتِ سادہ کار میں انساں
فطنت و فن سے رنگ بھرتا ہے
حُسنِ ظاہر اُسے نہیں بھاتا
حُسنِ باطن پہ دل سے مرتا ہے
کرشن موہن ہے ایک مردِ غنی
بے نیازانہ زیست کرتا ہے

سوالنامے پر اظہارِ خیال

۱۔ جدید ادب قدیم ادب سے انحراف ہے یا اُس کی بنیادی اقدار کی بحالی ؟
۲۔ جدید ادب میں ہیئتی تبدیلیوں اور موضوعاتی تبدیلیوں کی تناسبی اہمیت کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے ؟
۳۔ تنہائی کا احساس صرف صنعتی پھیلاؤ کا ردّ عمل ہے یا یہ ایک تخلیقی ذہن کا ایسا وصف ہے جس کا سماجی نظاموں سے محض نسبتی تعلق ہے ؟
۴۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ہر ادب تبلیغ ہوتا ہے کہیں یہ لوگ تبلیغ اور ترسیل کو باہم خلط ملط تو نہیں کرتے ؟ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے ؟
۵۔ جدید ادب کو ایک مدت تک معتوب کرنے کے بعد، ترقی پسند ناقد اب اسے ترقی پسندی کی توسیع قرار دینے لگے ہیں۔ اس میں کسی نئے عرفان کو دخل ہے یا یہ پسپائی کا اعتراف ہے ؟
۶۔ کیا ملک و قوم کی تعمیر جدید میں ادب کوئی کردار ادا کر سکتا ہے ؟ جواب اثبات میں ہو تو اس سلسلے میں ادیبوں کو بھگتی تحریک اور صوفی مت کے شاعروں کی طرح ایک نفسیاتی ماحول تیار کرنا چاہیے یا چند مخصوص نعروں کو اپنی نگارشات میں جگہ دینا بھی ان کے لیے ضروری ہے ؟
۷۔ ادب کی تعریف بعض لوگوں نے یہ بھی کی ہے کہ یہ ناپسندیدہ جذبات کے پُر امن اخراج کا ایک ذریعہ ہے۔ اگر ایسا ہے تو اس ادب کو بھی سماجی فریضے کا حامل ماننا پڑے گا جسے بالعموم مریضانہ ادب کہا جاتا ہے۔ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے ؟

شمس الرحمٰن فاروقی

ڈائرکٹر پوسٹل سروسز، لکھنؤ۔

۱۔ جدید ادب ماضی قریب کے ادب (تمام ادب نہیں لیکن تقریباً تمام ادب) سے انحراف لیکن قدیم ادب (یعنی وہ ادب جس کا تصور ہمارے بڑے شعراء سے وابستہ ہے) کی بنیادی اقدار کی بحالی ہے۔ اس کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ ماضی قریب کے ادب کا بڑا حصہ غیر ادبی لٹریچر کے زمرے میں آتا ہے کیوں کہ اس میں تجربہ و احساس سے زیادہ خیال (اور وہ بھی ایک مخصوص طرح کے خیال) کے اظہار پر زور دیا گیا ہے۔ لہٰذا اس کو صرف اسی معنی میں ادب کہہ سکتے ہیں جس میں قانون یا طب کی کتابوں کو ادب کہا جاتا ہے (قانونی ادب، طبی ادب، اس موضوع پر کیا کیا لٹریچر موجود ہے۔ یعنی کیا لکھا گیا ہے۔) تحریر اسی وقت ادب کے زمرے میں آتی ہے جب اس میں مذکورہ خیالات ادبی حیثیت سے اہم ہوں، یعنی بذات خود اہم ہوں۔ ان کی اہمیت ثابت کرنے کے لیے کسی فلسفے یا نظریے کا سہارا لینے کی ضرورت نہ پڑے۔ ہمارے یہاں شعر اور پھر نثری ادب دونوں کی اصلی روایتیں اس نظریے کا استحکام کرتی ہیں کہ ادب لوگوں کو زندگی کے بارے میں باخبر تر تو بناتا ہے لیکن انہیں کسی مخصوص نظریۂ فکر و حیات کا پابند بن جانے کی ترغیب نہیں دیتا۔ ادب کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ وہ اس میں بیان کردہ خیالات کی وجہ سے نہیں، بلکہ ان کے باوجود اہم اور خوب صورت ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں ماضی قریب میں اس بات کو بھلا دیا گیا اور یہ سمجھا گیا کہ ادب

اسی وقت اہم اور خوب صورت ہے جب ہم اس میں
بیان کردہ نظریات و خیالات کو بھی اہم، خوب صورت،
صحیح یا صحت مند سمجھیں۔ جدید ادب اس خیال کو باطل
سمجھتا ہے اس لیے وہ ماضی قریب کے ادب سے یقیناً
منحرف ہے۔ لیکن ہمارا قدیم سرمایہ جس میں ادب کے
صحیح تفاعل کا پورا شعور ملتا ہے ہماری بیش قیمت
ترین میراث ہے۔ قدیم اقدار کی بحالی کا مطلب یہ
نہیں ہے کہ تجربے کی راہیں مسدود کر دی جائیں۔ اکثر
تو تجربے کے ہی ذریعہ قدیم اقدار دوبارہ بحال ہوتے ہیں۔
اقبال کی مثال سامنے ہے۔

۲۔ چونکہ ہیئت اور موضوع الگ الگ وجود نہیں رکھتے۔
(بقول بریڈلی نظم کی صنف نثر نہیں بلکہ نظم کا موضوع ہے،
کیوں کہ وہ نظم کے باہر ہے) اس لیے میں ہیئتی اور موضوعاتی
تبدیلیوں میں کوئی تناسب نہیں دیکھتا ہیں سمجھتا ہوں کہ
ایک ہے تو دوسری بھی ہے۔

۳۔ تنہائی کا احساس تخلیقی ذہن کا وصف ہے جو لوگ تنہائی
کے احساس کو ایک فرضی، مصنوعی اور خارج سے حاصل
شدہ ایک تصور سمجھتے ہیں ان کو چاہیے کہ بہت دور نہ
جا کر صرف حافظ و رومی کا مطالعہ فرمائیں۔ مغربی ادیبوں
کے نام لوں گا تو بعض لوگ کہیں گے فاروقی صاحب
کی نگاہ سمندر پار پہلے نہیں رکی۔ اور فارسی ادب کا
حوالہ دوں گا تو بھی بعض لوگ کہیں گے کہ ہوگا، ہم تو
ہندوستانی ہیں۔ اس لیے حافظ و رومی پڑھنے کا مشورہ
واپس لیتے ہوئے میں تنہائی کے احساس کے منکرین سے
عرض کروں گا کہ وہ سنسکرت، تامل اور بنگالی شاعری
ہی پڑھ ڈالیں۔ ورنہ کبیر کو ہی دیکھ لیں۔ تخلیقی ذہن
اگر خود کو تنہا نہ محسوس کرے تو اظہار پر مائل کیسے ہو؟ اظہار
کی بے چینی ہوتی ہی اس لیے ہے کہ تخلیقی ذہن بعض ایسی
باتیں دیکھتا ہے جو دوسروں کو نہیں نظر آتیں اور بعض باتوں
کو اس طرح دیکھتا ہے جس طرح دوسرے انھیں نہیں دیکھ
پاتے۔ نظر اور طرز نگاہ کی یہی انفرادیت تخلیقی ذہن کا

اکیلاپن ہے۔ خواجہ صاحب بہ بانگ دہل کہتے ہیں۔
"میں جزیرہ نہیں ہوں"۔ لیکن اگر ایسا تھا تو اپنی سوانح
حیات کیوں لکھی؟ یہ کہنا کافی تھا میرے سوانح وہی ہیں
جو ہماشما کے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ جدید عہد میں جب
انسان ایک دوسرے سے کچھ اور کٹ گئے ہیں زندگی بدتر
ہو گئی ہے اور وقت کے قیمتی ہونے کا احساس زیادہ
مستحکم ہو گیا ہے، تنہائی کا احساس بھی بڑھ گیا ہے۔
رسل و رسائل کے وسائل جتنے ترقی یافتہ ہوں گے،
تنہائی کا تجربہ اتنا ہی شدید ہوگا، یہ انسان کا المیہ ہے
نظیری احمد آباد میں بیٹھا ہوا گلستان نیشاپور سے ایک
خزاں ہی کی تمنا کرتا تھا لیکن آج عادل منصوری ایک
ہی شہر میں رہتا ہوا دوسرے شخص سے خود کو دور محسوس
کرتا ہے۔ سماجی حالات ادب پر اس طرح اثر انداز
ہوتے ہیں ؎

نظیری: اے صبا از گل امید نشانے بہ من آر
از گلستان نیشاپور خزانے بہ من آر

عادل منصوری: کہنے کو ایک شہر میں اپنا مکان تھا
نفرت کا ریگ زار مگر درمیان تھا

تنہائی کا احساس ایک فطری تجربہ ہے۔ معلوم نہیں
لوگ اس کو گالی کے طور پر کیوں استعمال کرتے ہیں۔
سی جبلی اور فطری ضرورتیں ہوتی ہیں۔ ان پر
نہ وہ فخر کرتا ہے نہ انھیں نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔
میری ناک میں سرسراہٹ ہوتی ہے تو جی چاہتا ہے کہ
چھینکوں، بلکہ اس سے پہلے کہ شعوری طور پر چھینک کا
ارادہ کروں، اعصاب کے ذریعہ دماغ کو خبر ہوتی ہے
اور دماغ احکامات جاری کرتا ہے کہ چھینک آئے۔
اس پورے عمل میں فطری قوانین کی کارفرمائی ہے۔
اس پر شرمندہ ہونے، ناراض ہونے، خوش ہونے
یا بغلیں بجانے کی ضرورت نہیں۔ وہ لوگ بھی بے وقوف
ہیں جو اپنے احساس تنہائی کا ڈھنڈورا یوں پیٹتے ہیں
گویا تنہائی نہیں ان کے دروازے پر ہاتھی جھومتا ہے

اور وہ لوگ بھی بے وقوف ہیں جو تنہائی کے احساس
سے یوں بدکتے ہیں گویا وہ جذام یا کاربنکل ہو۔
سردار جعفری بھی خود کو تنہا محسوس کرتے ہیں ورنہ وہ
کیوں کہتے کہ رات خوب صورت ہے، نیند کیوں
نہیں آتی؟ یہ تو تخلیقی ذہن کا مقدر ہے، اس سے
شرمانا کیسا؟

۴- ادب تبلیغ ہوتا ہے، یہ نظریہ ویسا ہی ہے جیسے کوئی کہے
گھوڑدوڑ کے گھوڑے کو تانگے میں بھی جوت سکتے ہیں
یقیناً جوت سکتے ہیں لیکن اس میں گھوڑے، تانگے،
تانگے والے اور مسافر سب کا ستیاناس ہوگا۔ ادب کو
تبلیغ کہنے والے (خدا معلوم وہ کون لوگ ہیں) ترسیل
کے معاملات سے باخبر ہی نہیں ہو سکتے اس لیے یہ فرض
کرنا کہ وہ تبلیغ و ترسیل کو خلط ملط کرتے ہیں، درست
نہیں ہے۔

۵- ترقی پسندی کی توسیع اور جدید ادب! ترقی پسند
نظریۂ ادب کسی قسم کی توسیع قبول ہی نہیں کر سکتا۔
جو لوگ نئے ادب کو ترقی پسند ادب کی توسیع بتاتے
ہیں وہ ترقی پسند افکار سے ناواقف ہیں۔

۶- ملک و قوم کی تعمیر نو میں ادب کا وہی رول ہے جو اس
ذہنی آب و ہوا کا ہے جو مختلف افکار و تصورات سے
باخبر ہوئے بغیر ہی دنیا میں آپ سے آپ پیدا ہو جاتی
ہے یعنی آپ کا خیال بالکل درست ہے کہ ادب
کا تفاعل یہ ہے کہ وہ نفسیاتی ماحول تیار کرتا ہے،
یہ نہیں کہ وہ پلیٹ فارم سے تقریر کرتا ہے۔

۷- بعض لوگوں نے نہیں، ارسطو نے، ادب کی نہیں بلکہ
المیہ کی تعریف میں یہ کہا ہے کہ المیہ ناپسندیدہ نہیں،
بلکہ ترحم اور خوف کے جذبات کا اخراج کر دیتا ہے۔
اس وضاحت کی روشنی میں آپ کے سوال کی ضرورت
نہیں رہ جاتی۔ میں ادب کے ذریعہ کسی سماجی فریضے
کی ادائگی کا قائل ہی نہیں ہوں۔ اور اگر آپ ارسطو
کی تعریف کو تمام ادب پر منطبق کرنے کی کوشش کریں
گے تو آپ بھی ایک طرح کا ترقی پسند نظریہ خلق کریں
گے، یعنی وہ نظریہ جو ادیب کے قلم اور
صفائی مزدور کی جھاڑو کو یکساں مقام دیتا ہے۔
ادب کو اس قسم کے اعتذار کی ضرورت ہی نہیں۔
ادب تخلیق کرنا بھی ایک سماجی کام ہے لیکن یہ ضروری
نہیں کہ اس سماجی کام کو فلاح و بہبود، دارڈ رکس
اور انجمن عقد بیوگان کی قسم کا ہی سماجی کام قرار
دیا جائے۔

سید فضل المتین

شرقی دروازہ درگاہ شریف، اجمیر

۱- جدید ادب، قدیم ادب کی نہ اندھی تقلید ہے نہ
اندھا انحراف —— جدید ادب نے دو انتہاؤں کے
اندھیرے میں اپنی آنکھ سے اپنی راہ تلاش کی ہے۔ اب
اگر جدید ادب کے راستہ پہ قدیم ادب کی بنیادی اقدار
ٹھہرا ہی ہیں تو اس کے لیے جدید ادب کو مورد الزام
نہیں ٹھہرایا جا سکتا، بلکہ یہ صورت حال تو جدید ادب
کی ہوشمندی اور صحت مندی کا ثبوت فراہم
کرتی ہے۔

۲- موضوع اور ہئیت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔
موضوع کے تقاضے ہئیت کو جنم دیتے ہیں اور جدید
ادب کے نئے موضوعات کے سبب جو نئی ہئیتی تبدیلیاں
واقع ہوئی ہیں وہ لازمی تھیں۔ یہ تبدیلیاں ادب
کے سرمایہ میں اضافے کا سبب ہوئی ہیں۔ کار آمد
ہیں، مفید ہیں اور چراغ سے چراغ جلتا ہے کے
مصداق یہ تبدیلیاں اور بھی تبدیلیوں کا پیش
خیمہ ہیں۔

۳- تنہائی کا احساس انسان کا مقدر ہے۔ یہ المیہ
اس کے جبلّی احساس کا جزو لاینفک ہے۔ تنہائی
کے احساس کا اگر سماجی نظاموں سے کوئی تعلق پیدا

کرنے کی کوشش بھی کی جائے تو وہ محض نسبتی اور
وقتی تعلق ہوگا۔ وسیع کائنات میں انسان کی ذات
ازازل تا ابد تنہا ہے۔ تنہائی کی تعریف آسان نہیں ہے
یہ مستقل اور مفصل بحث کا موضوع ہے۔

۴۔ ہر ادب تبلیغ نہیں ہوتا تبلیغی ادب بہ آسانی پہچان
لیا جاتا ہے تبلیغ اور ترسیل کے علیحدہ اوصاف ہیں۔
ان کو خلط ملط کرنے کی بات وہی کرسکتے ہیں جن
پر ان اوصاف کے معانی منکشف نہ ہوں۔

۵۔ جدید ادب کو معتوب کرنے کے بعد، ترقی پسند ناقد
اب اسے ترقی پسندی کی توسیع قرار دے رہے
ہیں تو یہ صورتِ حال، ایک واضح حقیقت کی بنا
پر، یقیناً ان کی پسپائی کا اعتراف ہے۔ حقائق پر پردہ
نہیں ڈالا جاسکتا۔ فریب کی مستقل برقراری مشکل
ہوتی ہے۔ ترقی پسند ادیب جس نظام کے تابع
فرمان ہیں، وہ نظام ہمیشہ مصلحت پسندی کو اہمیت
دیتا آیا ہے۔ وہ کبھی کبھی متحدہ محاذ کو ضروری خیال
کرتا ہے۔ کوئی اس کا ہم نوا ہو نہ ہو وہ وقتی طور
پر کسی کی ہم نوائی کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ جدید ادب
کو معتوب قرار دے کر آج اسے ترقی پسند ادب کی
توسیع مان لینا وہی صورت ہے جو اس نظام کا تقاضہ
ہے جس کی تابعداری ترقی پسند ادب کا بنیادی
مقصد ہے۔

۶۔ ملک و قوم کی تعمیر نو میں جدید ادب اپنا مثبت کردار
ادا کر رہا ہے بھگتی تحریک اور صوفی مت کے شاعر اپنے
معاشرہ کے ترجمان ہو کر حال کو قال بنا چکے ہیں۔ نعرہ
بازی ان کا مسلک ہرگز نہ تھی قول و فعل کے تضاد اور
فرق سے وہ ناآشنا تھے۔ ان کا ظاہر بہر صورت ان کے
باطن کا ترجمان ہوتا تھا، ان کی تخلیقات کو صرف ایک
نفسیاتی ماحول تیار کرنے سے تعبیر کرنا فہم رسا کا اعجاز
نہیں عجز ہے۔ ذات اور کائنات کے تعلق کو جس
بہتر طریقہ سے انھوں نے ظاہر کیا ہے اور تنہائی کے احساس
کی انفرادیت کو جس طرح انھوں نے ظاہر کیا ہے وہ صرف
ان کا حق تھا آج ہم اس حق کے وارث ضرور ہیں۔ لیکن ابھی
اپنا استحقاق ثابت نہیں کرسکے ہیں۔

۷۔ ادب کی یہ تعریف کہ یہ ناپسندیدہ جذبات کے پرامن
اخراج کا ایک ذریعہ ہے۔ اگر مان لی جائے تو مریضانہ
ادب کو بھی سماجی فریضے کا حامل ماننا ضروری ہوگا۔

شاہد میر

گورنمنٹ کالج، بانسواڑا۔

۱۔ جدید اور قدیم ادب کو الگ الگ خانوں میں رکھنا
میرے نزدیک نہ صرف مشکل امر ہے بلکہ کافی حد تک
غیر فطری بھی مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اشعار دو
مختلف زمانوں" کے ہوتے ہوئے بھی DICTION
کے اعتبار سے حد درجہ مماثلت رکھتے ہیں ؎

جنوں پسند مجھے چھاؤں ہے ببولوں کی
عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی
(ناسخ)

وہ اک شجر کہ جس پہ نہ کانٹا نہ پھول ہے
سائے میں اس کے بیٹھ کے رونا فضول ہے
(شہریار)

میری نظر میں "جدید ادب" ادب کی بنیادی قدروں کی بحالی کا ہی نام
ہے۔ اگر جدید ادب منحرف ہے تو صرف کھوکھلی نعرے بازی کا!

۲۔ جدید ادب میں جس قدر ہیئتی تبدیلیاں آج تک رونما ہوئی
ہیں (آزاد غزل، آزاد نظم، نثری نظم اور نثری غزل وغیرہ)
وہ عوام میں شرفِ قبولیت نہیں پاسکی ہیں۔ در اصل
شاعری بنیادی طور سے ترنم سے پڑھنے یا گائے جانے
کی چیز بھی ہے۔ ظاہر ہے شاعری میں عروضی ردّ و بدل
کرتے وقت بہ قول ڈاکٹر عنوان چشتی "ہماری قومی موسیقی"
کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ "آزاد غزل" اور "آزاد نظم"
کے تجربے ہماری ہندوستانی موسیقی کو پسِ پشت ڈال
کر کیے گئے ہیں ان اصناف کو "تال" میں نہیں گایا جاسکتا

یہی وجہ ہے کہ مظہر امام کی آزاد غزل کے مقابلے میں شمیم جے پوری کی کلاسیکی انداز کی غزلیں عوام میں زیادہ مقبول ہیں۔ بہر حال ادب کا نارم چاہے نہ بدلے مگر موضوعاتی تبدیلیاں ہونا لازمی ہے۔ "نئی غزل" نے اس سلسلے میں کافی امکانات روشن کیے ہیں۔

۳۔ صنعتی پھیلاؤ نے انسانی مصروفیات میں اضافے کیے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ایک شہر ایک بستی میں ہوتے ہوئے بھی لوگ ایک دوسرے سے نہیں مل پاتے۔ لہٰذا جدید ادب میں تنہائی کا ذکر "صورتِ حال" کے عین مطابق ہے۔

۴۔ ادب ملک و قوم کی تعمیرِ جدید میں اپنا رول ادا کر سکتا ہے اور وہ اس طرح کہ اپنے قاری کو اپنے "ہونے" کا احساس دلائے اپنے وجود اپنی ذات کی گہرائیوں میں اترنے کی دعوت دے اپنے حالات کا آئینہ دکھائے وغیرہ۔ اس کے برعکس اگر ادب سے نعرے بازی یا اصطلاح سازی" کا کام لیا گیا تو مجھے ڈر ہے کہ آج کا عام آدمی کہیں جھنجھلا کر یہ نہ کہہ دے ؎

تجھے اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

معصوم نظر

لال پورہ، ڈونگر پور، راجستھان

۱۔ ہر نئے زمانے کے اپنے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ ہر نیا زمانہ نئے مسائل لے کر آتا ہے۔ جدید ادب بھی جدید زمانے کی عکاسی کرتا ہے۔ جدید ادب قدیم ادب سے استفادہ بھی کرتا ہے اور انحراف بھی کرتا ہے۔

۲۔ میں ایسا مانتا ہوں کہ جدید ادب میں موضوعاتی تبدیلیاں کے نتیجے ہی میں ہیئتی تبدیلیاں بھی آئی ہیں۔ ہیئت کی تبدیلی بجائے خود کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔

۳۔ تنہائی کا احساس بنیادی طور پر ایک حساس ذہن کا وصف ہے۔ آدمی بھیڑ میں بھی تنہائی محسوس کر سکتا ہے۔ اور کبھی تنہائی میں بھی وہ اپنے آپ کو تنہا محسوس نہیں کرتا۔ کیونکہ آدمی خود ایک محشرِ خیال ہوتا ہے!

۴۔ فنکار اپنی بات کو دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہے۔ فن ایک آئینہ ہے۔ فنکار اپنے مختلف SITUATION کا اظہار اپنی IMAGES کے ذریعہ پیش کرتا ہے۔ ادب کو تبلیغ کا آرگن نہیں بنایا جا سکتا۔

۵۔ جدید ادب ترقی پسندی کی توسیع نہیں بلکہ ایک ردِ عمل تھا، ترقی پسندوں نے ادب کو کچھ غیر ادبی خطوط پر لے جانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن جدید ادب نے ان غیر ادبی معیاروں سے انحراف کیا۔ کیونکہ جدید ادب نے اپنے دور کو متاثر اور متوجہ کیا ہے، اس لیے اب ترقی پسند ادیب اپنی پسپائی کو چھپانے کے لیے کہتے ہیں کہ جدید ادب ترقی پسند ادب کی توسیع ہے جب کہ ترقی پسند گروپ کے کئی اچھے پائے کے لوگ جدید ادب کے اس موڑ تک آ گئے ہیں یعنی ان لوگوں نے ترقی پسند ادب کا چولا اتار پھینکا ہے۔

۶۔ ادب کا کام انسان کے خیالات و احساسات کا سفرنامہ لکھنا ہوتا ہے۔ میں نہیں مانتا کہ ادب ملک کی تعمیرِ جدید میں کوئی کردار ادا کر سکتا ہے۔ ادب فرد کے اندر کی دنیا میں تبدیلی لا سکتا ہے نہ کہ اس کے باہر کی دنیا میں کوئی تعمیری کام کر سکتا ہے۔

۷۔ ادب انسان کے ناپسندیدہ جذبات کو ایک شائستگی عطا کرتا ہے۔ ادب میں سب سے اہم بات رد یہ کی ہے کہ فنکار کا رد یہ کیا ہے۔

شعری تخلیقات

بلا طلب ارسال نہ کی جائیں

نظمیں

نارش پرتاپگڑھی

احساس

دُور تک خود اپنی سانس
دُور تک سانسوں کی باس
دُور تک ہے ٹوٹ کر بکھری ہوئی
اک سہانی چھانو پا جانے کی آس
دُور تک ہے دوپہر
جلتی ہوئی

اک پرندے کی طرح اُڑتا ہوا
بے ارادہ، بے سبب
لگا ہے اِدھر لگا ہے اُدھر مڑتا ہوا
میں خود اپنی سانس ہی کی چلچلاتی دھوپ میں
سرگرمِ کار
سینہ فگار
جیب و دامن تار تار
جا بجا بنتے بگڑتے سے نقوش
ذہن میں مٹتا اُبھرتا اک خیال
دُور تک ہے بے یقینی اور مایوسی کا جال
اور میں
زخمی پرندے کی طرح ٹکرا رہا ہوں دیر سے
گاہے اِدھر گاہے اُدھر
دُور تک ہے دوپہر

▲▲

دوراہا

ہار اشکوں کے پرولوں کہ نہیں
آرزو، شوق، یقیں — کچھ بھی نہیں
سنگِ در، سجدہ جبیں — کچھ بھی نہیں

ہوش کچھ اور بھی کھولوں کہ نہیں
میرا پیمانہ مگر ٹوٹ گیا
ایک اک تارِ نظر ٹوٹ گیا

نیند نزدیک ہے سو لوں کہ نہیں
نیند نزدیک ہے سو لوں کہ نہیں

▲▲

غزل

بانی

صد فردوسِ محبت زار ستمبر آ
اے رنگوں کے موسم، منظر منظر آ

آدھے ادھورے لمس نہ میرے ہاتھ پہ رکھ
کبھی سپرد بدن سا مجھے میسّر آ

کب تک پھیلائے گا دھند مرے خوں میں
جھوٹی سچی نوا میں ڈھل کر لب پر آ

بادل دے آکاش کو، فصل زمیں کو دے
بادِ امکاں، حشرِ بشارت بن کر آ

مجھے پتہ تھا، اک دن لوٹ کے آئے گا تو
کیوں دہلیز پہ رک سا گیا ہے: اندر آ

اے پیہم پرواز پرندے، دم لے لے
نہیں اترنا آنگن میں تو چھت پر آ

اس نے عجب کچھ پیار سے اب کے لکھا بانیؔ
بہت دنوں پھر گھوم لیا: واپس گھر آ

▲▲

۴۸/۲ راجندر نگر، نئی دہلی

غزلیں

جون ایلیا

کیا ہوئے آشفتہ کاراں، کیا ہوئے
یادِ یاراں یار! یاراں کیا ہوئے

اب تو اپنوں میں سے کوئی بھی نہیں
وہ پریشاں روزگاراں کیا ہوئے

زخم مہکاتی تھی جن کی موجِ رنگ
وہ بدن رنگیں بہاراں کیا ہوئے

کیا ہوئے صورت نگاراں خواب کے
خواب کے صورت نگاراں کیا ہوئے

اے نگارِ آرزو کی چشمِ مست
تیرے سنی میگساراں کیا ہوئے

اس کی دُزدیدہ نگہ سے پوچھ تو
وہ ترے مژگاں شماراں کیا ہوئے

اے بہارِ انتظارِ فصلِ گل
وہ گریباں تارتاراں کیا ہوئے

سو رہا ہے شام ہی سے شہرِ دل
شہر کے شب زندہ داراں کیا ہوئے

ہے دیارِ دل میں تنہا اُس کی یاد
یار کے بے یادگاراں کیا ہوئے

▲▲

مظفر حنفی

سوندھی سوندھی سی مہکار آنے لگی
ہل چلا تو زمیں کِھلکھلانے لگی

پوچھتا ہوں کہ کیا کہہ رہی تھی ہوا
چاندنی رات باتیں بنانے لگی

مُہر بر لب ہیں ہم کیا بتائیں تمہیں
خون کی بُوند تھی، جگمگانے لگی

آمدِ صبح میں اور کیا دیر ہے
اب چراغوں کی لَو ٹمٹمانے لگی

قریۂ جاں میں ہی ہر طرف روشنی
درد کہتا ہے محنت ٹھکانے لگی

اس طرح یاد آنے سے کیا فائدہ
جیسے ناگن کہیں سرسرانے لگی

آؤ لنگر اُٹھائیں مظفر میاں
بادباں کو ہوا گدگدانے لگی

▲▲

شیو کمار ورما

بے چین اگر نہیں تھا تو آرام بھی نہ ت
وہ حالِ دل تھا جس کا کوئی نام بھی ن

صدیوں طویل رات کی کوئی سحر نہ تھ
کوئی چراغ گھر میں سرِ شام بھی نہ تھ

تیرا خیال ساتھ رہا، تو نہیں تو کیـ
میں کامیاب جو نہیں، ناکام بھی نہ تھ

جانے کو کتنی بار گیا اُس کے در پہ میں
سوچا تو مجھ کو اُس سے کوئی کام بھی نہ تھ

پلکوں پہ اک چراغ بھی روشن نہیں کی
کیا تجھ کو پاسِ گردشِ ایّام بھی نہ تھ

دریا سوائے گردِ سفر کچھ نہیں ملا
رستے میں بیٹھ رہنے کا الزام بھی نہ تھا

▲▲

★ معرفت روزنامہ جنگ۔ کراچی
★ جامعہ کالج، جامعہ نگر، نئی دلی
★ ۱۸۰/۱۱ کوچہ لمبان، امرتسر

سمٹی ہوئی زمین

شفق

منظر بڑا بھیانک تھا۔

کمرے کی دیواروں میں اس طرح شگاف پڑا تھا جیسے کسی آرٹسٹ نے آڑی ترچھی لکیریں کھینچ دی ہوں، چھت غائب تھی جس کے ٹکڑے ادھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے، گرد اور دھوئیں کا مینار کمرے سے بلند ہو کر اتنی تیزی سے اوپر جا رہا تھا جیسے کسی کو کہانی سُنانے کی جلدی ہو کچھ روحیں اس گرد اور دھوئیں کے اندر چھپ کر خلائے لبسیط میں گم ہو جانا چاہتی ہوں کہ دنیا والوں کی نظریں اُن پر نہ پڑ سکیں، گرد اور دھواں کا کچھ صاف ہوا تو دو کچلی ہوئی لاشیں زمین پر بکھری ہوئی تھیں ان کے اندر سے اب تک خون اُبل رہا تھا اور زمین پر بہہ کر چھت کے ملبے میں جذب ہو رہا تھا، ایک کا چہرہ جھلس کر سیاہ ہو گیا تھا دوسرے کے سر پر چھت کا ایک ٹکڑا ایسے گرا تھا کہ وہ خربوزے کی طرح بکھر گیا تھا۔

ایک آدمی جس کی دونوں ٹانگیں گھٹنوں سے اور بایاں ہاتھ کہنی سے غائب تھا زمین پر پڑا ہوا تڑپ رہا تھا مگر اس کا چہرہ محفوظ تھا جس پر شدید کرب کی لہریں تھیں اور اس کی حلق سے گھٹی گھٹی چیخیں نکل رہی تھیں جنھیں روکنے کے لیے اس نے زبان دانتوں میں دبا رکھی تھی، کھلی ہوئی آنکھیں آسمان پر مرکوز تھیں اُن میں بے شمار سوالیہ نشان تھے دھوئیں کا حصار تھا جو نظروں کی حرکت کے ساتھ گردش کر رہا تھا۔ اُس کی داہنے ہاتھ کی مُٹھی بھنچی ہوئی تھی جس میں گوشت کا ایک ٹکڑا تھا۔

دو آدمی دیوار سے ٹیک لگائے بے حس و حرکت بیٹھے تھے۔ اُن کے سر کے بال جُھلسے ہوئے تھے اور سر جلی ہوئی گھاس کے میدان کی طرح سپاٹ ہو گیا تھا۔ اُن کے چہروں پر بے شمار سیاہ آبلے پڑے ہوئے تھے اُن کی آنکھیں کھُلی ہوئی تھیں مگر لگتا تھا بینائی زائل ہو گئی ہے کیونکہ اُن میں بڑی ویرانی تھی۔

پھر زخمی کے دانتوں سے زبان چھوٹ گئی اور دونوں اس طرح ہڑبڑا کر کھڑے ہو گئے جیسے گہری نیند سے جاگے ہوں، انھوں نے ایک بار پھر کمرے کا جائزہ لیا، لاشوں پر سے پھسلتی ہوئی نظریں زخمی آدمی پر رُک گئیں اور ان میں تشویش کے سائے لہرانے لگے۔

اب کیا ہوگا؟

دوسرا منہ سے کچھ نہیں بولا صرف اپنے نمکین ہونٹ پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ مگر اس کی نظریں زخمی پر لگی رہیں، جس نے پھر زبان دانتوں سے اس طرح دبائی تھی کہ مُنہ سے خون کی بوندیں ٹپکنے لگی تھیں۔

کیا سوچ رہے ہو، صبح ہونے والی ہے اگر جلد کچھ کیا نہ گیا تو . . .

تم جو کہو، دوسرے نے اس طرح گردن سہلائی جیسے کوئی اندیکھا پھندا اُسے کس رہا ہو، میرے خدا یہ چند منٹ پہلے ہم سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے اور اب . . . یہ لاشیں، یہ زخمی اور گردن کی طرف بڑھتا ہوا پھندا۔

دھماکے کی آواز دُور تک گئی ہوگی، پہچانی گئی ہوگی اور جیپوں کے انجن جاگنے لگے ہوں گے، پہلا بڑبڑایا۔ اس سے پہلے کہ وہ یہاں پہنچیں بھاگ چلو . . . لاشیں تو چھوڑی جا سکتی ہیں مگر یہ زخمی، یہ مکان اور چہروں کی شناخت . . .

بھاگ کر نہیں جا سکتے۔ راہیں مسدود ہو چکی ہیں ہم چاروں طرف سے گھر چکے ہیں اس سے پہلے کہ وہ یہاں پہنچیں سب کچھ ہٹا دو صاف کر دو، لاشیں ٹھکانے لگا دی جائیں۔ اگر لاشیں دھوتے

کبیر گنج ——— سہسرام ——— (بہار)

ہوئے پکڑے گئے تو؟

اور زخمی لاشوں کے ساتھ پکڑے گئے تو؟

تم ٹھیک کہتے ہو پہلے نے جلے ہوئے چہرے پر ہاتھ پھیرا، میرا دماغ ماؤف ہو گیا ہے، رسک تو لینا ہی پڑے گا، لیکن ہماری غیر موجودگی میں وہ زخمی تک پہنچ گئے تو؟

دو لاشیں اور ایک زخمی، نہ ایک ساتھ لے جایا جا سکتا ہے نہ چھوڑا جا سکتا ہے۔ لے جائیں تو کیسے، چھوڑیں تو کس کو اور لے جائیں تو کہاں کہ دُور دور تک کوئی مکان نہیں۔ اُن کے چہرے تھک گئے تو زخمی نے آسمان سے نظریں پھیر کر اُن کی طرف دیکھا اور دانتوں سے زبان چھوڑ دی۔

میری بات سنو، مجھے قتل کر دو۔

قتل... وہ دونوں لرز گئے، نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ ہم یہ نہیں کر سکتے، ہم تمھیں جس طرح لائے تھے اس طرح واپس نہیں لے جا سکتے اسی کا افسوس ہے۔

بے وقوفی مت کرو، جو ہونا تھا وہ ہو گیا، اب جو ہے اس کی حفاظت کی ایک ہی صورت ہے کہ مجھے قتل کر کے بھاگ جاؤ، اگر میں اُن کے ہاتھ آ گیا تو وہ زبان کھلوانے کا ہنر جانتے ہیں۔ مگر لاشیں بے زبان ہوتی ہیں۔ تم محفوظ رہو گے۔

پہلے آدمی نے کواڑ کھول کر اِدھر اُدھر جھانکا، صبح دھیرے دھیرے اُتر رہی تھی۔ سناٹا پرندوں کے شور سے مجروح ہونے لگا تھا، دُور سڑک پر ایک دُھندلا سایہ رینگ رہا تھا وہ اتنی دُور تھا کہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ آ رہا ہے یا جا رہا ہے۔

کہیں اُس نے سب کچھ دیکھا نہ ہو اور اب انھیں اطلاع دینے جا رہا ہو۔ اس نے جلدی سے کواڑ بند کر لیا اور دوسرے آدمی کو صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے کہا... سڑک آباد ہونے والی ہے اس سے پہلے ہم لاشیں کہیں چھپا سکتے ہیں۔ زخمی کو یہیں چھوڑ دو اگر واپسی میں حالات موافق رہے تو... ورنہ اب جو قسمت میں ہو گا وہ ہو گا۔

میری بات سنو کہ میرے باپ کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا، زخمی انھیں لاش اُٹھاتے دیکھ کر جلدی جلدی کہنے لگا، اُس نے بھی یہی کہا تھا جو میں کہہ رہا ہوں اور اس کی خواہش پوری کی گئی تھی اس لیے کچھ نہیں ہو سکا کہ چشم دید آنکھیں سو گئی تھیں۔

وہ دونوں اپنے کاندھوں پر لاشیں اٹھائے ہوئے رک گئے، اُسے غور سے دیکھا، آنکھوں آنکھوں میں کچھ باتیں ہوئیں، اُن کے قدم ڈگمگائے پھر سنبھل گئے اور زخمی کی حسرت بھری نظریں اُنھیں دروازے سے باہر جاتے دیکھتی رہیں۔

یہ بھی چلے گئے اب کیا ہو گا؟ اُس نے پیروں کی طرف دیکھا، میں اب کبھی کھڑا نہ ہو سکوں گا، دھرتی کا لمس محسوس نہ کر سکوں گا، اُس نے کراہتے ہوئے سوچا، بیوی کے ناتواں کاندھے پر ایک اور گٹھری، لوگ دیکھنے آئیں گے، پوچھنے آئیں گے اور بار بار دہرائی جانے والی من گھڑت کہانی، بس ایکسیڈنٹ، بجھتی ہوئی چولھے کی آگ اور چہروں پر نقاہت کی زردی، کھٹکھٹائی جانے والی کنڈیوں کا شور اور شرمندگی سے جھکی ہوئی نظریں، ضد کرتے ہوئے بچے اور تھپک تھپک کر سلاتی ہوئی ماں، بدن پر جھولتے ہوئے چیتھڑوں کی بدبو، صدیوں کی مسافت طے کر کے گزرتے ہوئے لمحوں کی کہانیاں، خود کشیاں، چہرے پر گری ہوئی اُداس نظریں اور سسک سسک کر گزرتی ہوئی طویل رات...

قدموں کی کھڑکھڑاہٹ سے وہ وحشت زدہ ہو گیا۔ کون آ رہا ہے، اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی، اُس نے اپنی نظریں دروازے پر جما دیں، شاید انھیں خبر ہو گئی ہے اور وہ ہوشیاری سے کمرے کے گرد گھیرا ڈال رہے ہیں، جب اُن کا گھیرا تنگ ہو جائے گا تو وہ اس دروازے سے اندر کا منظر دیکھیں گے، گری ہوئی چھت، دراڑیں پڑی ہوئی دیواریں جلے ہوئے بارود کی بُو، زمین پر بہا ہوا خون، گوشت کے لوتھڑے اور جب اُن کی نظریں مجھ پر پڑیں گی تو اُن کی آنکھوں میں شکاری کتیوں جیسی چمک جاگے گی، اُن کے چہرے دمکنے لگیں گے اور وہ دانت پیستے ہوئے میری طرف بڑھیں گے، میری تلاشی لیں گے، تصویریں لیں گے اور پھر ٹھوکریں اور گالیاں، ہونٹ کھولو کہانیاں سناؤ، تصویریں دکھاؤ، اذیتیں، منت، گڑگڑی... پھر منظر بدلے گا، پھر نظریں بدلیں گی، پھر چہرے بدلیں گے اور تب آخری ٹھوکر کے ساتھ میں کسی تنگ و تاریک کوٹھری میں جا گروں گا۔ تم نے ایسا کیوں کیا؟ تصویریں پوچھیں گی، تمھیں کچھ کہنے کی ضرورت کیا تھی، پھر اخباروں میں خبریں آئیں گی اور بیوی کی آنکھیں دروازے پر لگی رہیں گی، بچے ضد کرتے رہیں گے وہ تسلی دیتی رہے گی۔

تمھارے پاپا آئیں گے تو ڈھیر سی مٹھائیاں لائیں گے، کھلونے،

ٹافیاں اور کپڑے ... انتظار اور انتظار۔

اُس نے زبان دانتوں میں دبا رکھی تھی کہ کہیں کراہنے کی آوازیں انھیں متوجہ نہ کرلیں - خون بہتا جارہا ہے کاش کے اُن کے آنے سے پہلے سارا خون بہہ جائے اور میں اس اذیت سے نجات پا جاؤں جو مقدر بن چکی ہے۔

محتاط قدموں کی آوازیں کمرے کی طرف بڑھنے لگیں تو اُس کے دل کی دھڑکن اتنی تیز ہوگئی کہ درد کا احساس بھی زائل ہوگیا، وہ آرہے ہیں، سنگینیں اُٹھائے ہوئے، شعلے برساتے ہوئے، دانت پیستے ہوئے وہ ٹھوکریں لگائیں گے گالیاں دیں گے اور لہولہان جسم کو اذیتیں سہنی پڑیں گی۔ آہٹیں دروازے کے پاس رُک گئیں پھر اُن دونوں کا جھلسا ہوا چہرہ نظر آیا جس پر خوف کے گہرے سائے تھے اور وہ گھبرائی ہوئی نظروں سے چڑھتے سورج کو دیکھ رہے تھے۔

سڑکوں پر آمدورفت شروع ہوگئی ہے - ہم تمھیں کسی محفوظ جگہ پر کیسے لے جائیں، پہلا پریشان لہجے میں دھیرے سے بولا، اور یہاں چھوڑ بھی نہیں سکتے کہ وہ بس آنے ہی والے ہیں، اگر یہ جگہ سنسان نہ ہوتی تو اب تک ...

وہ آرہے ہیں، دوسرا سڑک کی طرف اشارہ کررہا تھا، اب کیا ہوگا؟

بس ایک ہی صورت ہے مجھے قتل کردو، وہ گڑگڑایا، تم بھی بچ جاؤ گے اور میں بھی، میرے اندر اتنی طاقت نہیں کہ میں زبان بند رکھ سکوں گا پھر...

ٹھیک ہے۔ دوسرا تھوک نگل کر بولا، میں باہر رہتا ہوں کہ مجھ سے دیکھا نہ جائے گا تم دل پر وار کرکے باہر نکل آنا کہ اُن کے پہنچتے پہنچتے...

زخمی نے اطمینان کی سانس لے کر سورج کی طرف دیکھا - میں تجھے آخری بار دیکھ لوں، تیری حدت محسوس کرلوں پھر میں سارے دکھوں سے آزاد ہوجاؤں گا، نہ کسی کا خون میری گردن پر ہوگا نہ کوئی الزام...

پہلا آدمی خنجر لے کر اُس کی طرف بڑھا تو اُس نے مسکرا کر آنکھیں بند کرلیں اور دل کے مقام پر انگلی رکھ دی کہ خنجر بار بار نہ چلے، مگر آنکھیں بند کرتے ہی اُسے اپنی بیوی نظر آئی، بچے نظر آئے، اُن کی آوازیں سنائی دیں، اُن کی خواہشیں یاد آئیں اور وہ چھ ماہ کا معصوم بچہ جو اُسے دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑتا ہے، آج سب ختم ہورہا ہے - اب وہ کسی کو نہیں دیکھ سکے گا کسی کی آواز نہیں سُنے گا، منتظر بیوی کی بھی نہیں، معصوم بچوں کی بھی نہیں، وہ اپنے پاپا کی راہ دیکھتے رہیں گے اور ماں اُنھیں تسلیاں دیتی رہے گی تمھارے پاپا آئیں گے تو...

اُس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں، خنجر اُس کے دل کی طرف جھک رہا تھا - قدموں کی آوازیں قریب آگئی تھیں۔

دوسرے ہی لمحے اُس کا ہاتھ اُٹھا اور خنجر بردار کلائی اس کی گرفت میں تھی۔

OO

گنج گرانمایہ، بقیہ ص ۲۳

ہمارا اردو تنقید میں کام، جب تک اردو زبان باقی ہے، ہوتا رہے گا لیکن ایک کام ایسا ہے جو اب نہ کیا گیا تو پھر کبھی نہ ہو پائے گا، وہ کام ہے ان کی نثر کے تانے بانے سے تلمیحات کی گرہیں نکال کر ان کو سلجھانا - یہ کام کسی ایک آدمی کے کرنے کا نہیں، اس کے لیے ایک بورڈ بنانا ہوگا۔ اس کے اراکین میں ایک صاحب ایسے ہونے چاہئیں جن کا علی گڑھ سے گہرا اور دیرینہ تعلق ہو اور جو نثر رشید کے مقامی رنگ کی طرف نہ صرف اشارے کرسکیں بلکہ اس کی قدم بہ قدم وضاحت بھی — جنھوں نے اُسی ماحول میں سانس لی ہو جو رشید صاحب کی تخلیقات کا ماحول ہے، اور جو رشید صاحب کے حلقۂ احباب سے بھی واقف ہوں۔ دوسرے رُکن اس بورڈ کے ایک ایسے صاحب ہوں جو بیسویں صدی کے سیاسی واردات و تفصیلات سے واقفیت رکھتے ہوں۔ اور تیسرے رُکن جن کی نظر اردو اور فارسی ادب پر گہری ہو۔ اچھا ہو اگر ان ارکانِ ثلاثہ میں سے ایک صاحب کو یوپی کی کچہریوں اور عدالتوں اور دیہات کا بھی کچھ تجربہ ہو۔ پہلے یہ افراد فرداً فرداً کام کریں اور پھر بورڈ کی شکل میں تلمیحات کی تینوں فرہنگوں کو نظرثانی کے بعد اذنِ اجرا عطا کریں۔

گنجِ گرانمایہ

سید حامد

لیجیے رشید صاحب بھی ان گنج ہائے گراں مایہ میں شامل ہوگئے
جن کے متعلق میر تقی میر کو خاک سے باز پرس کی آرزو تھی۔
کسی مزاح نگار نے مزاح برائے مزاح سے اس حد تک
پرہیز نہ کیا ہوگا جتنا رشید صاحب نے اور نہ کہیں ظرافت
اور متانت، شوخی اور معنویت اس طرح شیر و شکر ہوئی ہوں
گی۔ شروع کے مضامین میں ظرافت بہ ظاہر سنجیدگی پر غالب
نظر آتی تھی لیکن اسے بھی ایک قسم کی نظر بندی سمجھیے۔ اس
دور میں بھی شوخی معنویت کے رُخ کا نقاب تھی۔ آگے
بڑھتے جائیے تو شوخی کے نقوش کم ہوتے جاتے ہیں،
اور آخر ایام میں ان کی نثر تمام حکمت ہوگئی تھی۔ لیکن آخر
تک شگفتگی کی جھلکیاں ملتی چلی گئیں، تحریر اور تقریر
میں۔ کوئی سال بھر کی بات ہے علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی
ایشن دہلی کا ایک وفد علی گڑھ گیا، اس نیت سے کہ
مقابلہ کے امتحانات کے لیے وہاں کے طلبہ کو ترغیب دلائے
اور یونیورسٹی کے ارباب اختیار اور اساتذہ سے اس بارہ
میں گفتگو کرے۔ وفد میں یوسف صدیقی، جنرل شاہنواز خاں،
محمد شفیع قریشی اور ضیا الرحمٰن انصاری صاحبان شامل تھے۔
کچھ ساتھیوں کے ساتھ میں رشید صاحب کی خدمت
میں حاضر ہوا۔ ان سے میری یہ آخری ملاقات تھی۔ سردیوں
کا زمانہ تھا، عمر، آلام، ضعف اور موسم کے تحت رشید صاحب
سنولائے ہوئے، کمھلائے ہوئے نظر آرہے تھے لیکن
آنکھوں میں ذہانت کی چمک برقرار تھی۔ یوسف صدیقی صاحب
بوجہ علالت پیرول پر چھوٹ کر آئے تھے۔ وہ رشید صاحب
کے ہمعصر تھے۔ رشید صاحب "ریڈینس" (Radiance)
کے متعلق دریافت کرنے لگے۔ اس کے بند ہونے کا انھیں
دُکھ تھا۔ یوسف صاحب نے متبسم ہو کر فرمایا "آپ نے
کہا نہیں 'ریڈینس' کو بند نہ کیجیے ہمیں کر دیجیے"۔ افسوس
کہ اب ان دونوں بزرگوں میں سے کوئی نہیں رہا۔ آپ
نے دیکھا رشید صاحب نے ایک ایسے وقت میں بھی
جب وہ ضعیف اور مضمحل ہو چکے تھے اور جب ایک
ضعیف برگزیدہ معاصر زنداں سے نکل کر علالت کے
باوجود ان سے ملنے گیا تھا، شگفتگی اور چھیڑ چھاڑ سے گریز
نہیں کیا۔ اس شگفتگی کی تہہ میں وہ دُکھ تھا جو انھیں
'ریڈینس' کے بند کیے جانے پر ہوا تھا۔ علی گڑھ کے
ان بزرگوں میں کیسی بے تکلفی تھی اور ایک دوسرے پر
کتنا اعتماد۔ اس چھوٹے سے فقرہ سے یہ اندازہ بھی لگ
سکتا ہے کہ رشید صاحب کے تبسم کے پس پردہ نشاط
ہی نہیں حزن بھی تھا۔ یہ صحیح ہے کہ انھوں نے بالقصد
قلم اصلاح کی نیت سے نہیں اٹھایا۔ دُنیا کے ہنگاموں
کو دور سے دیکھنے کے باوجود وہ اس کے غموں اور خوشیوں
میں شریک تھے۔ اس انمل بے جوڑ دنیا پر وہ متبسم بھی
ہوتے تھے اور متردد بھی۔ لگے ہاتھوں وہ اس طبقہ
کی پردہ دری بھی کر جاتے تھے جسے انھوں نے گھاگھ کا
خطاب دیا تھا، اور جس کے فائدہ اور تعارف کے لیے انھوں
نے ایک نیا علم 'گھاگیات' کے نام سے جاری کیا تھا لیکن
رشید صاحب کا لہجہ خواہ وہ زبان سے کام لے رہے ہوں

خواہ قلم سے ہمیشہ دھیما اور شایستہ ہوتا تھا۔ اس میں نہ دلخراشی تھی نہ سمع خراشی۔ ایسا لگتا ہے کہ گھاگھوں کی پردہ دری کرتے ہوئے بھی وہ ان کے ہنر کو اس اندازِ نیم ستایش سے دیکھتے تھے جیسے کبھی شیکسپیئر نے اپنی تخلیق 'ایاگو' (Iago) کی طرف دیکھا ہوگا۔

اگر ضمیر واحد متکلم کو استعمال کرنے کی آپ اجازت دیں تو میں عرض کردوں کہ رشید صاحب سے میری نیاز مندی پر اب چالیس سال بیت چکے ہیں۔ چند ماہ گزرے میں نے آفتاب ہال کی میگزین کے لیے ایک مضمون اپنے ایامِ علی گڑھ کے متعلق لکھا تھا۔ رشید صاحب کی تصویر اس کے آئینہ میں دیکھیے:

"علی گڑھ کا نام لیتے ہی رشید صاحب کی متموّل شخصیت اپنے سارے فسوں کے ساتھ نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ رشید صاحب بجائے خود ایک ادارہ ہیں، ایک انجمن ہیں، ایک جہان ہیں۔ وہ اس تمدن، اس شایستگی، اس شوخی و شگفتگی، ان روایات، ان حوصلہ مندیوں اور ... اس یگانگت کا مرقع ہیں علی گڑھ جس سے عبارت ہے۔ علی گڑھ کی محبت ان کے رگ و پے میں سمائی ہوئی ہے۔ وہ علی گڑھ کی صالح روایات کے حامل اور ترجمان ہیں۔ اس بحث میں نہ پڑیے کہ فنکار بڑا ہوتا ہے یا اس کی تخلیقات۔ رشید صاحب کی فکر انگیز ظرافت اُردو ادب کا گرانقدر سرمایہ ہے لیکن خود ان کی شخصیت کا تموّل پوری طرح ان کی تصانیف میں منعکس نہ ہو پایا۔ شگفتگی کا یہ عالم کہ بات کرتے ہیں تو منہ سے پھول جھڑتے ہیں، نظر اتنی ژرف کہ محاسن و مطالب تک ایک پل میں پہونچ جائیے۔ انسانیت ان کا مذہب ہے۔ شایستگی ان کا مقدر اور شگفتگی ان کی شناخت۔ شوخی اور فکر، درد مندی اور ظرافت۔ دلگدازی اور خوش طبعی۔ ان کی شخصیت اور ان کی زبان و قلم نے اجتماعِ اضداد کو شعار بنا لیا ہے۔ ان کی شگفتگی انسانیت کے اس درد کی غمّاز ہے جو ان کی متاعِ حیات ہے۔ ان کی فلسفیانہ فراست دُنیا کو بازیچۂ اطفال سے زیادہ نہیں سمجھتی لیکن اس بازیچہ سے وہ نہ برگشتہ ہیں نہ بے نیاز بلکہ تجربہ کا نچوڑ اور عمر کا سرمایہ اس بازیچۂ اطفال کی تزئین اور تہذیب پر صرف کرنے کے لیے تیار ہیں۔ ان کے دھیمے لہجہ میں بلا کا زور ہے اور ان کے لطیف طنز کی ہلکی سے ہلکی سطح کے نیچے جذبات و مفاہیم کا ایک دریا موجزن ہے۔

"رشید صاحب حُسن کے پرستار ہیں۔ زندگی کے ہر شعبہ میں انھوں نے حُسن کا انتخاب کیا ہے۔ ان کا گھر چمن زار ہے، گل و گلزار کی کثرت سے مینو سواد۔ جہاں کہیں سے گلاب کی کسی نئی قسم کی اِطّلاع آئی انھوں نے اسے اپنے چمن کی زینت بنانے کے لیے جتن کیے۔ ان کی تحریر و تقریر میں، ان کے نقطۂ نظر میں جو شگفتگی ہم دیکھتے ہیں، کیا عجب کہ ایک حد تک وہ انھی گلابوں کی دین ہو۔ وہی حُسن، وہی اہتمام، وہی رنگارنگی، وہی خوشبو — ڈاکٹر ضیاء الدین جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، آپ کو وقت نہیں دینا چاہتے تھے تو آپ کو پہچاننے سے انکار کر دیتے تھے، رشید صاحب خانہ نشین ہو جاتے تھے اس انداز سے کہ دستک کی صدا ان تک نہیں پہونچ سکتی تھی۔ اگر وہ یہ حربہ استعمال نہ کرتے شاید ایک لمحہ انھیں پڑھنے لکھنے اور غور و فکر کے لیے نہ ملتا......

میں ۱۹۲۸ء سے ان کا ذکر سنتا چلا آرہا تھا بھائی جان علی گڑھ سے چھٹیوں میں گھر آتے تو پروفیسر حبیب کا ذکر کرتے یا رشید احمد صدیقی کا۔ انھوں نے دیوانِ غالب رشید صاحب سے پڑھا تھا اور کہیں کہیں رشید صاحب کے بتائے ہوئے معنی بھی لکھ رکھے تھے۔ اس نسخہ کو میں حرزِ جاں بنائے ہوئے ہوں۔ یہ وہی ایڈیشن ہے جو رشید صاحب کے رفیق اور مرشد، ذاکر صاحب نے جرمنی میں چھپوایا تھا۔ پارٹ وَن میں دو ایک بار رشید صاحب پڑھانے آگئے، تو ہماری عید ہو گئی۔ مقابلہ کی تیاری کی تو مضامین ان کو دکھانا شروع کیے۔ اور یونیورسٹی سے نکل آیا تو کبھی کبھی خط و کتابت کا بہانہ ڈھونڈ نکالا۔ ڈیپارٹمنٹ میں نہ ملیں تو

لائبریری میں نظر آئیں گے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ بھی مُرشد، کی طرح کاوش سے کسی کتاب کا مطالعہ نہیں کرتے تھے بلکہ مصنفین سے شاہانہ انداز سے خراج وصول کیا کرتے۔ کتاب کی ورق گردانی کی اور جو کچھ اس میں لائقِ التفات یا قابلِ قدر نظر آیا اخذ کر لیا۔"

یادوں پر مبنی یہ مضمون ابھی چھ مہینے ہوئے لکھا تھا اور دو ماہ ہوئے چھپا تھا۔ اس اثنا میں وہ ذہین مسکراتا ہوا چہرہ ہمیشہ کے لیے آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ لیکن خوبروئی کی تہمت آپ رشید صاحب پر نہیں لگا سکتے تھے۔ چہرہ اور گفتگو کی پُرسکون ذہانت کو چھوڑ دیجئے تو ان کی شکل صورت، وضع قطع میں کوئی بات ایسی نہ تھی جو نگاہوں کو اپنی طرف کھینچتی۔ رشید صاحب کے مکان کا مردانہ حصّہ (یہ ذکر ہے آج سے چالیس سال پہلے کا) ایک خس پوش برآمدہ پر مشتمل تھا جس میں مونڈھے پڑے رہتے تھے۔ لیکن مکان کا اندرونی حصّہ گل و گلزار تھا۔ کچھ اسی نوع کا تعلق خود رشید صاحب کے ظاہر و باطن میں تھا۔

رشید احمد صدیقی کے اسلوب نگارش کے تفصیلی ذکر کو ایک دوسری صحبت درکار ہوگی۔ انھیں شروع میں اُردو نثر کا سب سے بڑا مزاح نگار تسلیم کیا گیا اور آخر میں حکیم نقاد اور دانشور۔ ایک عرصہ سے ہم انھیں ان اہلِ قلم کا جو بہ قیدِ حیات ہیں سرِ فہرست سمجھتے چلے آئے تھے۔ گویا رشید صاحب کی عظمت بہ حیثیت ایک نقاد اور مفکر اور مزاح نگار کے ایک ایسی بنیادی حقیقت ہے جسے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان پر ابھی تک جو کچھ لکھا گیا ہے وہ ادب میں ان کے مقام کی نسبت سے بہت کم ہے۔ میں اس مختصر صحبت میں ان کے اسلوبِ نگارش کی طرف چند اشارے کروں گا۔ ان میں سے ہر اشارہ ایک مستقل مضمون بن سکتا ہے۔

پہلا وصف، جس سے نگاہ ٹکراتی ہے، رشید صاحب نے بھان متی سے چند روز کے لیے قرض لیا تھا لیکن کبھی نہ لوٹایا! یعنی وہ کہیں کی اینٹ اور کہیں کا روڑا لے کر رشتہ جوڑا کرتے ہیں۔ اَنمل بے جوڑ چیزوں میں وجہِ شبہ ڈھونڈتے ہوئے ان کا قلم زندگی کے بنیادی حقائق کو بے نقاب کرتا ہے۔ مثلاً:

"حماقت یا بعض امراض کے صرف دورے ہوا کرتے ہیں، جن کی کم و بیش مقررہ میعادیں ہوتی ہیں جیسے ٹائیفائڈ یا کونسل اور اسمبلی کی میعادیں۔ اس دوران میں وہ سب کچھ کر گزرتا ہے، شادی کر لیتا ہے۔ قرض ادا کر دیتا ہے، تقریریں کرنے لگتا ہے ...."

دوسرا وصف جس سے نگاہ کبھی نہیں ٹکراتی سطور اور بین السطور کا تناسب ہے۔ سطور جو کچھ کہتی ہیں، بین السطور اس سے کہیں زیادہ ... مثال کے طور پر، "وکیل صاحب"[1] کا قلمی چہرہ دیکھئے:

"ایک مُدت گزری کبھی جبّہ کا رنگ سیاہ تھا لیکن امتدادِ زمانہ اور وکیل صاحب کے بیش رووں کی سرپرستی سے اس کی رنگت ان بالوں کی سی ہو گئی تھی جن پر ایک عرصہ سے خضاب نہ لگایا گیا ہو۔ پچھلے دامن کی گوٹ علیحدہ ہو کر نیم بیضاوی شکل میں ان کی "بے گناہی" پر خندۂ دنداں نما ادا کیے ہوئے تھی۔ اس دامن کی شہادت کے اسباب ابھی بالکل پردۂ خفا میں مستور ہیں۔ کچھ لوگ اپنا اشتباہ ظاہر کرتے ہیں کہ جبّے کو یہ سعادت ایک مؤکل کی درازدستی سے حاصل ہوئی تھی جس نے نذرانہ اور فیس کے معاملہ کو کچھ غیر مطمئن طریق سے سمجھا تھا اور جبّہ پہننے والے نے یہ دیکھا کہ دست بہ دست کی نوبت آیا چاہتی ہے تو پسپا ہونا شروع کیا۔ مؤکل دامنگیر ہوا۔ اِدھر وکیل نے زور لگایا، نزلہ بر ضعیف دامن کے سر گیا۔"

"پیش رووں کی سرپرستی" کی چھوٹی سی ترکیب نے نہ صرف وکیل صاحب کی ہیئت کذائی کو مجسّم کر دیا بلکہ تصور کی نگاہوں پر اس حقیقت کو بھی روشن کر دیا کہ وکیل صاحب مفلوک الحال وکیلوں کے فرسودہ سلسلہ

---

[1] مضامینِ رشید

کی تازہ ترین کڑی تھے۔

اسی اقتباس میں تین اور وصف گتھے ہوئے ہیں۔ ایک تلمیح دوسرے محاکات، تیسرے محاورہ۔ رشید صاحب کے مضامین مشاہدہ کے تانے اور تلمیح کے بانے سے بنے ہوئے ہیں۔ یہ تلمیح کبھی شعر و ادب سے ہوتی ہے، خصوصاً غالب و اقبال سے، کبھی علی گڑھ کی روایات اور روزمرہ سے، کبھی واقعات و حالات حاضرہ سے، کبھی رسوم و رواج سے، کبھی کسی ضرب المثل سے۔ اقتباسِ بالا میں ایک تلمیح کا ردئے سخن غالب کے اس شعر کی طرف ہے۔

نگہِ بیش ہے سزا فریادیِ بیدادِ دلبر کی
مبادا خندۂ دنداں نما ہو صبح محشر کی

دوسری تلمیح کا تعلق یوسف اور زلیخا کی داستان سے ہے۔ 'دراز دستی' میں غالب کے شعر:

دھول دھپّا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایکدن

کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اور محاکات کی مثال وہ محاربہ ہے جو 'بہ ہزیمت وکیل اور آمادۂ پیکار مؤکل' کے درمیان ہوا ہوگا۔ ناظر کی نگاہ کے سامنے دو نقشے آ گئے ایک دامانِ یوسف، دوسرے چغۂ وکیل کی شہادت کا۔ پہلی شہادت کی محرک محبت تھی اور دوسری کی عداوت۔ ذہن اس پُرلطف تضاد کی طرف بھی جاتا ہے جو عامل اور وکیل کے مؤکلین کے درمیان رونما ہو سکتا ہے۔ ایک سراپا اطاعت دوسرا مجسّم درپئے آزار۔

اس بامحاورہ زبان میں کسی ایک ٹکڑے کو منتخب کیوں کیجیے۔ صرف عبارت کے خاتمہ پر نظر ڈالیے 'دامن کے سرگئی' اس تشبیہ پر غور کیجیے جو محاکات کی خدمت پر مامور رہے یعنی چغہ کی رنگت ان بالوں کی سی ہو گئی تھی جن پر ایک عرصہ سے خضاب نہ لگایا گیا ہو۔ خندۂ دنداں نما کا استعارہ بھی توجہ کا طالب ہے۔ محاکات بغیر مشاہدہ کے ناممکن ہے۔ چند سطروں کی مسافت طے کیجیے مشاہدہ کی مثالیں مل جائیں گی۔ رشید احمد صدیقی کے محبوب مشاغل مشاہدہ مطالعہ اور مراقبہ ہیں۔ ان کی نثر میں مشاہدہ نے محاکات کا روپ اختیار کیا، مطالعہ نے تلمیح کا اور مراقبہ نے فکر پرور و دلکش مزاح کا۔

اساتذہ کی غزلوں کی طرح ہمارے ظرافت نگار کی نثر میں مفاہیم تہ در تہ ہیں۔ آپ سطح پر سے گزر جائیے تو بھی لطف اندوز ہوئیے، سطح کے نیچے چھپے ہوئے خزانہ کی کھوج لگائیے تو لطف دوبالا ہو جائے گا اور مہم جوئی کا مزا بھی آئے گا۔ رشید احمد صدیقی کی نثر اشاروں، کنایوں، تشبیہوں، استعاروں اور تلمیحوں سے متموّل ہے۔ ناظرین بقدرِ ظرف و بہ مقدار علم فایدہ اٹھاتے ہیں۔ ان کے مضامین سیاسی، علمی اور واقعاتی اشارات و تلمیحات کے روح افزا اور 'زعفران زار و کاک تیل' سے عبارت ہیں۔ مفاہیم کی تہوں پر نظر ڈالیے تو ادبیاتِ عالم کے ایک مشہور طنز نگار کی طرف نگاہ جاتی ہے جس کا نام سوئیفٹ تھا۔ اس کی مشہور کتاب 'گلیور کا سفرنامہ'، رشید احمد صدیقی کی نثر سے بھی کہیں زیادہ پُرفریب ہے۔ بچّوں کے لیے وہ نشکر ہے اور بڑوں کے لیے خنظل۔ بچّے جسے ایک بے حد دلکش کہانی سمجھتے ہیں بالغ نظر کو اس میں بنی آدم کی تلخ ترین ہجو سنائی دیتی ہے، اور اسے جھوٹ کہہ کر ٹالا بھی نہیں جا سکتا۔ سوئیفٹ کے برعکس، رشید احمد صدیقی کے طنز میں تلخی نام کو نہیں اور نیش ہے نہ حقارت نہ نفرت۔ ہمارا مزاح نگار انسان سے محبت کرتا ہے۔ اس کی بے شمار کمزوریوں اور عیوب کے باوجود، بلکہ ایک حد تک ان کے باعث ۔ لیکن بہ حیثیت نثر نگار کے سوئیفٹ کا پلّہ بہت بھاری ہے۔ اس کی نثر کے دروبست روانی اور بے ساختگی اور شستگی اور جزالت کے سامنے رشید احمد صدیقی کی نثر میں جھول اور الجھاؤ نظر آتا ہے۔ لیکن یہی حشر ادبیات عالم کے بیشتر نثر نگاروں کا ہوگا جنھیں سوئیفٹ کے بالمقابل کھڑا کیا کیا جائے۔ البتہ سعدی شیرازی کی نثر مذکورہ صفات میں سوئیفٹ کی نثر پر فائق ہے۔

بات کہاں سے کہاں پہونچ گئی۔ رشید احمد صدیقی

(باقی صفحہ ۱۹۰ پر)

غـــزلیں

مصوّر سبزواری ★

تو پھول ہے خوشبو کے ذخیروں نے کہا تھا
رانجھا آسے ہر گاؤں کی ہیروں نے کہا تھا

وہ رنگ سرِ دشتِ دُعا اب بھی کھڑا ہے
آسیب جسے سارے فقیروں نے کہا تھا

یاد آگیا جب ڈوب گئی نبضِ سفر بھی
کچھ اور ہی ہاتھوں کی لکیروں نے کہا تھا

ہم جس کے تعاقب میں ہوئے گردِ مسافت
وہ خواب تو ان دیکھے جزیروں نے کہا تھا

زخموں کی قطاریں پسِ پردہ بھی ملیں گی
پردے سے نکلتے ہوئے تیروں نے کہا تھا

احساس نہ ہو ہم کو مصوّر یہ الگ بات
آشوبِ سفر بھی تو سفیروں نے کہا تھا

▲▲

پرکاش فکری ★

سبھی سفینوں کو طوفاں ڈبو گئے ہوں گے
ہوائے دشت کو بادل بھگو گئے ہوں گے

سروں نواز اندھیروں میں ڈوبتے چہرے
سنہری آس کی چوکھٹ پہ سو گئے ہوں گے

جو روشنی کے جزیروں کو ڈھونڈنے نکلے
سمندروں کی سیاہی میں کھو گئے ہوں گے

سلونے رنگ جو موسم کے ساتھ آئے تھے
سہانے خواب دلوں میں سمو گئے ہوں گے

وہ پھول جن سے لپٹنے کو مر مٹے فکری
تمہاری روح میں نشتر چبھو گئے ہوں گے

▲▲

ممتاز راشد ★

خونِ احساس کو موجوں کی روانی سمجھے
اشکِ بے رنگ تھے وہ تم جنھیں پانی سمجھے

کون کرتا ہے خرابوں میں دفینوں کی تلاش
کس کو فرصت ہے جو زخموں کے معانی سمجھے

کیسے مٹ جاتی ہے آنکھوں سے وفا کی تحریر
آج اُڑتے ہوئے رنگوں کی زبانی سمجھے

جب بھی دیکھا ہے اُسے ہم نے نئے زخم ملے
کون اُس شخص کی تصویر پرانی سمجھے

آنچ تھی اپنے سلگتے ہوئے غم کی راشد
لوگ جس کو ہنرِ شعلہ بیانی سمجھے

▲▲

★ نوح، ضلع گڑگانو، ہریانہ　★ ڈورنڈہ، درزی محلّہ، رانچی ۸۳۴۰۰۲　★ درگاہ اسٹریٹ، ماہم، بمبئی۔

غزلیں

کرشن مراری

گلشن میں جلوہ ریز ہے کلیوں کی دلبری
شعلوں میں ڈھل رہی ہے ستاروں کی نغمگی

یہ زندگی ہجومِ حوادث میں ہے پلی
اک سوچ نوچتی ہے دل و جاں کو ہر گھڑی

شاید یہی دعا ہے یہی میری بندگی
ہونٹوں پہ تیرا نام ہے آنکھوں میں ہے نمی

ہم اجنبی سمجھتے رہے جس کو عمر بھر
اندر براجمان ہے ساجن وہ آج بھی

ناچے کرن کرن ہے تو مچلے نفس نفس
کلیوں کے شوخ رخ پہ ضیا ایک شبنمی

چہرہ کتاب سا ترا پڑھتا رہوں مدام
پھیلی ورق ورق پہ ہے دھوپ روپ کی

عقیل شاداب

کچی مٹی سے جیسی باس آئے
ایسی خوشبو تمہارے پاس آئے

ہو بہو جب تمہاری جیسی ہو
زندگی کیوں کسی کو راس آئے

اس کے آنے کی کیفیت مت پوچھ
جیسے پیاسے کے پاس پیاس آئے

اس بدن کی کتاب میں اکثر
میری قربت کے اقتباس آئے

خوشیاں چننے چلے تھے دیوانے
تجھ سے ملکر اداس اداس آئے

دریا بہتا رہا مگر شاداب
دو کنارے نہ پاس پاس آئے

ظفر غوری

کئی نکات پہ اس سے کچھ اختلاف رہا
یہ دل کا آئینہ ہر زنگِ غم سے صاف رہا

گئے دنوں کے فسانے رقم تھے چہروں پر
خلوصِ دل میں تبسم بھرا شگاف رہا

وہ گرمیوں میں خنک چاندنی کی چادر تھی
ٹھٹھرتی رت میں میں اس کے لیے لحاف رہا

بہت ہے یہ بھی وہ اردو تو بول لیتی ہے
بلا سے، اب بھی غلط اس کا شین قاف رہا

مری شکست پہ اس نے بھی توڑ دی تلوار
اسے بھی عظمتِ دشمن کا اعتراف رہا

اگے ہوئے تھے ظفر کیکٹس سے سینوں میں
ادا ادا پہ مگر مخملیں غلاف رہا

: ۴ سی۔ اروِن روڈ۔ نئی دہلی ★ برج راج پورہ۔ کوٹا۔ ۶ ★ ۲۴۴۔ اعظم بلڈنگ، سرائے کالیتھاں، کوٹا، راجستھان

اختر بستوی — نظمیں

اب کہاں جائیں

صنعتی شہروں میں تھی پہلے ہی پژمردہ حیات
آگئیں قصبوں میں بھی اب زیست کی ویرانیاں
اب یہاں بھی زندگی عاری ہوئی جذبات سے
کھوکھلے چہروں کی ہیں بے جان سی پرچھائیاں
رفتہ رفتہ ہوگا دیہاتوں کا عالم بھی یہی
اُن میں بھی گونجے گی بس بے کیف سانسوں کی صدا
میرے جیسے لوگ پائیں اب کہاں ایسا مقام
چھوڑ دے پیچھا جہاں یہ عہدِ حاضر کی ادا

▲▲

مفہوم نہیں کچھ

شہر شہر نگری نگری میں
کوچے کوچے گلی گلی میں
باہر باہر خاموشی سی
اندر اندر سرگوشی سی
دہن دہن گفتار کی خواہش
زباں زباں اظہار کی کوشش
بات ہے کیا، معلوم نہیں کچھ
لفظ تو ہیں، مفہوم نہیں کچھ

▲▲

علم کی نگری

سو گیا کل پڑھتے پڑھتے اک کتاب
ناگہاں دیکھا انوکھا سا، یہ خواب
ایک قبرستان میں ہوں میں کھڑا
جس میں وحشت ہے نہ ویرانی ذرا
ہر طرف قبریں ہی قبریں ہیں مگر
زندگی کا ہمہمہ ہے جوش پر
میں نے سوچا: "یہ جگہ ہے کون سی؟"
کوئی بولا: "ہے یہ نگری علم کی"

▲▲

روشن محل گاندھی نگر۔ بستی (یو۔پی)

نظمیں

ماہر منصور

بازیافت

اندھیری رات میں
جس نے مجھے گھر سے نکالا تھا
اُسی کی کھوج میں مصروف ہوں
لیکن
مجھے بے چہرگی کی وہ سدائے شب نہیں ملتی
کہیں پھر میں نہ کھو جاؤں !!

نجم عثمانی

زندگی

ہوا ہے سخت مخالف
فضا ہے دشمنِ جاں
بچھے ہیں راہ میں کانٹے
کڑی ہے دھوپ بہت
نہ راہبر کوئی آگے
نہ کارواں پیچھے
ردائے زخم بدن پر ہے
دل میں عزمِ سفر

جبّار جمیل

اکیلے پن کا ایک مشورہ

زندگی کی رہگذر
کس قدر طویل ہے
وقتِ منصفِ ازل
سو رہا ہے جو ابھی
جانے جاگ جائے کب
اور ہماری قسمتوں
کا کوئی فیصلہ کرے
اس سے پہلے کیوں نہ ہم
خود ہی فیصلہ کریں

تم بھی زخم خوردہ ہو
میں بھی ریزہ ریزہ ہوں

محمد امین

اپنا گریبان

مسلکِ سرزنش پہ قائم ہو
اور لعنت کے ٹھیکیدار بھی ہو
اے مرے دوست ایک بات سنو
اپنے اندر کبھی جھانک کر دیکھو
گر کبھی تم نے یہ کیا ہوتا
اک لفنگا تو کم ہوا ہوتا

★ نزد مسجد دلبر یا نگر، ٹمکور، ۵۷۲۱۰۱ - ★ معرفت سید ابوالقاسم سی۔ ایم۔ پی۔ ایف - آفس۔ دھنباد۔ بہار ★ معرفت روزنامہ "سلامتی" مومن پورہ، بی بی مسجد، گلبرگہ (کرناٹک) ★ اُردو ڈپارٹمنٹ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ،

سانپ اور انسان

شام بارک پوری

اندھیری اور خاموش رات تھی۔ رات کا سناٹا بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ نر سانپ نے اپنی بیوی اور بچوں سے کہا "دن کے وقت میں ایک مینڈک کھا رہا تھا کہ وہ حلق میں پھنس گیا بڑی مشکل سے نگل سکا اسے ——— ابھی تک گلے میں درد ہو رہا ہے۔ اور طبیعت عجیب سی ہو رہی ہے"——— پھر ذرا رک کر بولا "مگر آج اس گھر میں دھما چوکڑی کیوں مچ رہی ہے۔ شور و غل کے درمیان ہمیں نیند کیوں کر آئے گی؟"

مادہ سانپ نے جو کنڈلی مارے بیٹھی تھی، بچوں کو سلانے کے لیے سینے سے لگا لیا اور کہنے لگی۔ "آج میں نے بہت آدمیوں کو اس گھر میں آتے جاتے دیکھا ہے۔"

چھوٹی لڑکی دُم ہلا کر بولی۔ "ہاں! بہت سے چھوٹے چھوٹے بھی آئے ہیں۔ ایک لڑکی بہت ہی حسین ہے جیسی کہ میں ہوں۔"

نر سانپ نے کچھ سوچ کر جواب دیا "سنا ہے انسان کی ذات اچھی نہیں ہوتی۔ میرے والد کہا کرتے تھے کہ ان پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ اُن کی نظر ہم پر نہ پڑے تو اچھا ہے۔"

مادہ سانپ اونگھ رہی تھی۔ اس کا جواب سن کر غصے میں کہنے لگی۔ "تمھیں تو انسانوں سے خواہ مخواہ کا بغض ہے۔ کیا انسان اچھے نہیں ہوتے؟ آخر ان میں کیا خرابی ہے؟ کچھ دن ہوئے ایک نوکرانی اپنی پوتی کے ساتھ اس صندوق پر آ بیٹھی جس میں ہم لوگ رہتے ہیں۔ اس نے ہمیں کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچائی۔ یہ صندوق کتنے دنوں سے اس برآمدے میں لاپروائی سے پڑا ہوا ہے۔ کوئی اسے چھوتا تک نہیں۔"

بڑا لڑکا لہراتا ہوا اُٹھا۔ وہ چتکبرا تھا اور لمبن کم از کم چار انگل ضرور چوڑا تھا۔ وہ ہنسا اور کہنے لگا "ماں! تم بہت بھولی ہو۔ تم کیا جانو انسانوں کی بُرائی کو۔ دراصل جب تم رات گئے گھر میں داخل ہوتی ہو تو وہ سوئے ہوتے ہیں اور صبح کو جب باہر نکلتی ہو تب بھی وہ سوئے رہتے ہیں۔ تم نے نہیں دیکھا کہ ان میں ہمیشہ ان بن رہتی ہے۔ ایک انسان دوسرے انسان کا دشمن ہوتا ہے۔ وہ کسی کو قتل کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ مقتول قصوروار ہو یا نہ ہوا۔"

سانپ کی بڑی لڑکی چپ سادھے بیٹھی تھی، وہ بھی بولی۔ "بھائی جان نے جو کہا ہے ٹھیک ہی کہا ہے ماں! انسان میں لالچ کا جذبہ بہت ہے۔ ہم لوگ دو چار بار شہر گئے ہیں۔ وہاں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ایک آدمی نے دوسرے آدمی کو بلاوجہ جان سے مار دیا۔ اور باقی تمام آدمی یہ تماشا کھڑے دیکھتے رہے۔ میں نے سُنا ہے ایک انسان دوسرے انسان کو دُکھ پہنچا کر خوش ہوتا ہے۔ اپنے فائدے کے لیے دوسرے کو نقصان پہنچانے کے درپے رہتا ہے۔ خود اچھا کھاتا ہے اچھا پہنتا ہے اور اس کے آس پاس کے لوگ بھوکوں مرتے ہیں۔ مگر ہم میں تو ایسا رواج نہیں۔ ہم جتنا چاہتے ہیں جنگل میں کھا لیتے ہیں، ہمیں روکنے والا کوئی نہیں، ہم میں کوئی طبقاتی اُونچ نیچ نہیں ہے ماں!"

مادہ کنڈلی مارتی ہوئی بولی "تم سب کچھ بھی کہو مگر مجھے اُن پر بھروسہ ہے۔ ان کا اتنا بڑا جسم ہے مگر ہم لوگوں کی طرح اُن میں زہر نہیں ہے!"

"اس گھر میں آدمی بھرے پڑے ہیں، اگر ہم لوگ اُن کو ڈس لیں تو اُن کی کیا حالت ہو گی؟" لڑکے نے کہا "اس وقت وہ لوگ

تریپورہ لین ——— ڈھاکہ ——— بنگلہ دیش

بے خبر سو رہے ہوں گے آؤ ہم چلیں اور کسی کو ڈس لیں۔"

باپ نے اس کا راستہ روک کر کہا "چھی... چھی... چھی... تمھارے دل میں اس گندے خیال نے کیوں کر جنم لیا۔ جب تک تمھیں کوئی ستائے نہیں۔ تم کسی کو کیوں ڈسنے لگے۔ کسی کو خواہ مخواہ نقصان نہیں پہنچانا چاہیے۔"

بڑا لڑکا بولا "مگر باپو! یہ تو بڑی ظالم قوم ہے۔ خود اپنی نسل کی ہی دشمن ہے۔ کیا پتہ کب ہم پہ وار کر دیں!"

باپ لڑکے کے خیالات سے حیران رہ گیا۔ اس نے کہا "وقت خود ظالموں سے بدلہ لے گا، ہمیں اس کی فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

مادہ سانپ تنگ ہو رہی تھی۔ جھنجھلا کر بولی "رات زیادہ ہوگئی ہے، اب سو جانا چاہیے۔ دیکھو بیٹا! غصہ میں کسی کو مت ڈسنا۔ وہ لوگ بھی یہیں رہتے ہیں اور ہم لوگ بھی ——— لڑائی جھگڑا کرنے سے کیا فائدہ؟"

پھر وہ سب بہت جلد بے خبر سو گئے۔

سانپوں کا یہ خاندان علی الصبح اٹھ بیٹھا۔ باپ بڑے اور ہوشیار لڑکوں کو ساتھ لے کر باہر چلا گیا۔ اُن کی ماں تین چھوٹے چھوٹے بچّوں اور انڈوں کو سینے سے لگائے وہیں بیٹھی رہی۔ اس کے دماغ میں نئے نئے خیالات آنے لگے "یہ انڈا کب پھوٹے گا اور بچّے کب چلنے پھرنے لگیں گے؟ انسان کتنے اچھے ہوتے ہیں۔ وہ ماں کو چھوڑ کر کھیلتے کودتے پھرتے ہیں لیکن ہمارے بچّے ہر وقت ماں، ماں، کرتے ہمارے پاس گھسے رہتے ہیں۔ کوئی ایسی ترکیب ہو کہ میں ان سے الگ رہ سکوں۔"

سوچتے سوچتے وہ سر نیچے کر کے بچّوں کو چاٹنے لگی۔ رات کو اچھی طرح سو نہ سکی تھی، اس لیے اونگھتے اونگھتے سو گئی۔ کھٹ کھٹ کی آواز سن کر وہ جاگ پڑی۔ اور اپنا پھن اُٹھا کر ڈھکن کی طرف تکنے لگی ——— ایک آدمی صندوق کا ڈھکن تھوڑا سا اُٹھا کر اندر دیکھ رہا تھا۔ جیسے ہی اس کی نظر سانپ پر پڑی، صندوق کا ڈھکن اسی طرح چھوڑ کر چلّاتا ہوا دوڑا۔ اس کی آواز سن کر بہت سے آدمی جمع ہو گئے۔ جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ صندوق کے اندر سانپ ہے تو انھوں نے ہاتھوں میں ڈنڈے لے کر صندوق کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔

انھیں ڈنڈے لیے دیکھ کر مادہ کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اس نے جلدی جلدی اپنے بچّوں کو اپنے پیچھے چھپا لیا اور پھن اُٹھا کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔ اس کا پھن کم از کم دس انگل چوڑا تھا۔ وہ بار بار زبان نکال کر صندوق کے اندر جھومنے لگی۔

صندوق کا پیندہ تھوڑا سا ٹوٹا ہوا تھا۔ لیکن وہ سوچ رہی تھی کہ اپنے بچّوں کو چھوڑ کر کیسے بھاگ جائے۔ ایک ماں اپنے بچّوں کو موت کے منہ میں اکیلا کیسے چھوڑ سکے گی۔ پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اور اپنی زبان میں آدمیوں سے مخاطب ہو کر بولی "اے لوگو! ہمیں مت مارو۔ ہم نے تمھارا کیا بگاڑا ہے۔ تم اشرف المخلوقات ہو۔ اپنے اشرف اور افضل ہونے کا ثبوت دو۔ ہمیں مت ستاؤ۔

آدمیوں نے صندوق کا ڈھکن دُور سے پکڑ کر کھینچا ہی تھا کہ وہ ٹوٹ کر مادہ کے سر پر گرا۔ اسے گہری چوٹ آئی۔ درد کی شدت سے بے تاب ہو کر اپنا سر صندوق کی دیوار پر پٹخنے لگی، بچّے ڈر کر اور بھی پیٹ کے اندر سما گئے۔

وہ خوف اور کسی قدر حیرت کے ساتھ اپنی چمکیلی آنکھوں سے آدمیوں کو گھورنے لگی اور اپنی زبان میں بولی "تم لوگ آج مجھے بڑی آسانی سے مار سکتے ہو۔ تم سمجھتے ہو کہ سانپ کو مار کر فاتحِ اعظم کہلاؤ گے! لیکن شاید تم یہ نہیں جانتے کہ آج میں بچّوں کے پیار کی وجہ سے مجبور ہوں، ورنہ میں کبھی کی، اس سوراخ کے راستے رفو چکر ہو چکی ہوتی یا تمھیں ڈس کر جہنّم رسید کر دیتی۔ اگر میں ایک بار پھر کر باہر نکل کھڑی ہوؤں تو ہے تم میں کوئی ماں کا لال کہ میرے مقابل ٹھہر جائے؟"

کھٹا کھٹ! کھٹا کھٹ!

مادہ کے سر پر ڈنڈوں کی بارش شروع ہو گئی۔ اس کے سر سے خون بہنے لگا اور بدن اینٹھنے لگا اور اس نے تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔ اور دُنیا میں ماں کے پیار کا نشان پھر بلند ہو گیا!!

سانپ کے پانچ ہاتھ لمبے جسم کو کھینچ کر صندوق سے باہر نکالا گیا۔ بچّے کلبلا کر اُٹھے اور اپنی زبان میں چیخ چیخ کر کہنے لگے "ماں! ماں! ہم اب کیسے زندہ رہیں گے ماں!

وہ صندوق میں کلبلا رہے تھے کہ اُن کا بھی وہی حشر ہوا جو اُن کی ماں کا ہوا تھا۔

دُور فضا میں شیطان انسان کی جہالت پر قہقہہ مار کر ہنس رہا تھا اور انسان خوش تھا!

رات کے وقت جب نر سانپ اپنے لڑکوں کے ساتھ واپس آیا تو اپنے صندوق نما گھر کو وہاں نہیں پایا۔ لڑکے چیخیں مار مار کر رونے لگے۔

"ماں! ماں!"

سانپ کا بڑا لڑکا روتا ہوا بولا "ظالم انسان نے ضرور ہماری ماں اور بھائی بہنوں کو مار ڈالا ہے۔ یہ انسان کے بھیس میں شیطان ہے۔ ظاہر میں شریف باطن میں خونخوار۔"

صندوق کو توڑ پھوڑ کر ایک کنارے پھینک دیا گیا تھا۔ اچانک سانپ کے بڑے لڑکے نے اُسے دیکھ لیا، اس نے اشارے سے اپنے باپ کو صندوق دکھایا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

باپ بھی دخورِ الم آنکھوں میں آنسو بھر لایا پھر غیظ و غضب سے پھن اُٹھائے ہوئے دُم کے بل کھڑا ہو گیا۔ جذبۂ انتقام سے اُس کا مدّ تمّا اُٹھا تھا۔ وہ پھنکار کر اپنے لڑکوں سے کہنے لگا "دیکھی تم نے انسان کے کرتوت ہ کتنے ظالم ہیں یہ؟ ہمارا چھوٹا سا خاندان کیسی ہنسی خوشی اور آرام سے زندگی گزار رہا تھا مگر انھوں نے ہمیں برباد کر دیا۔ ان کے کتنے ہی چھوٹے چھوٹے بچے میرے سامنے سے گزر جاتے تھے مگر میں اُنھیں نہیں ڈستا تھا۔ وہ معصوم اور بے قصور تھے ——— مگر اب تم لوگ انسان کی طرف دوستی کی نگاہ سے نہ دیکھنا۔ کل رات تمھاری ماں نے تمھیں آدمیوں کو ڈسنے سے روکا تھا تو دیکھا اُسے اس کا کیا پھل ملا؟ تم لوگ اب اور کہیں جا کر رہ سکتے ہو لیکن میں یہیں رہوں گا۔ اور دیکھوں گا کہ انھیں رُلا سکتا ہوں یا نہیں!" یہ کہہ کر وہ غیظ و غضب میں اپنا پھن زمین پر مارنے لگا۔

وہ ایک ہفتہ تک وہیں رہا مگر کوئی موقع اس کے ہاتھ نہ لگا۔ دو چھوٹے چھوٹے بچے زد میں آئے تھے مگر ان کا اس معاملے سے کیا واسطہ تھا؟ وہ معصوم بچے کسی کو ستانا کیا جانتے تھے جو وہ انھیں ڈستا۔ وہ دوسرے کے بچوں کو کیوں ڈسے؟ جبکہ اس کے بھی بچے تھے۔

ایک شام بارش ہوئی!

آسمان خوشنما نظر آ رہا تھا۔ فضا میں موسیقی گھلی ہوئی تھی۔ پانی کے ننھے ننھے قطرے سبز گھاس پر موتی کی مانند چمک رہے تھے۔ پودے ہوا کے جھونکوں سے جھوم رہے تھے، پھول مسکرا رہے تھے۔ ہر طرف خوشبو بکھری ہوئی تھی۔ وہ سبز سبز گھاس پر رینگتا ہوا، تالاب کے کنارے آ پہونچا۔ ایک پھول کی خوشبو سے وہ جھوم اُٹھا۔ بیوی کے مرنے کے بعد وہ بہت غمگین رہا کرتا تھا لیکن آج خوش نظر آ رہا تھا۔

وہ پودے کے قریب جا بیٹھا۔ پھول کی خوشبو سے اس کا دماغ معطر ہو رہا تھا اور وہ اپنے دل میں سکون محسوس کرنے لگا تھا، اس نے سوچا۔ قدرت نے بھی اس دُنیا میں کیا کیا چیزیں پیدا کی ہیں! ہماری چند روزہ زندگی ہے پھر ہم دوسروں کو کیوں ستائیں؟ اب میں کسی سے انتقام نہیں لوں گا، جو مر گئے سو مر گئے، وہ مرنے کے بعد آرام ہی سے ہوں گے اور پھر مجھے بھی تو کسی نہ کسی دن وہاں جانا ہے!!

اچانک اُسے پھول کے پودے کے قریب دو انسانی پاؤں نظر آئے اور اس کی آنکھوں میں عجیب قسم کی چمک نمودار ہوئی مگر پھر آپ ہی آپ غائب ہو گئی۔ وہ اپنے پھن کو جھٹک کر بُڑبُڑایا۔ "نہیں میں اب کسی کو نہیں ڈسوں گا۔"

ایک آدمی اپنے خیالوں میں مست تالاب کے گھاٹ پر جا کر بیٹھ گیا اور جیب سے بنسری نکال کر بجانے لگا۔ بنسری کی تان فضا میں بکھر گئی۔ ایک مدھر سی لے اُبھر رہی تھی جس میں پھولوں کی مہک کا سرور تھا۔ اس کی کیف آگیں ہم آہنگی فضاؤں میں مسحور کن ارتعاش پیدا کر رہی تھی وہ شخص بنسری بجانے میں ایسا کھو گیا کہ اُسے تن من کا بھی ہوش نہ رہا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ بنسری کے سُروں کی نرم نرم لہریں اُسے آگے ڈھکیل رہی ہوں اور وہ اس کی مدھر لے میں کھو کر آسمان پر بادلوں میں تیر رہا ہو۔

سانپ بنسری کی سریلی آواز سے مست ہو گیا۔ اُس کی کھنک سارے جسم سے ٹکرا رہی تھی ذہن میں جیسے نغمے گونج رہے تھے، اُسی لمحے ایک خواہش اُس کے دل میں اُبھری کہ یہ نغمہ ابدی ہو جائے یہ موسیقی غیر فانی بن جائے اور وہ ایک نہ ختم ہونے والی مسرّت میں کھو جائے۔

وہ شخص بنسری بجاتے بجاتے یکایک رُک گیا، اس کی سانس

پھول گئی تھی، اور وہ ہانپنے لگا تھا۔

سانپ بنسری کے سُروں سے ایسا مدہوش ہوگیا تھا کہ یوں اچانک اس کی لَے بند ہوجانے سے اس کے دل و دماغ میں ہیجان برپا ہوگیا۔ ایک انجانی نفرت کا سیلاب اس کے دل میں اُمنڈ آیا۔ اور اس سیلاب کو روکنا اُس کے بس میں نہ رہا۔ اتنے زبردست ہیجان کا مقابلہ بھلا کون کرسکتا ہے؟ بیوی اور بچوں کے انتقام کا خیال اس کے ذہن میں پھر سے عود کر آیا اور وہ بنسری بجانے والے کو ڈسنے کے لیے آگے بڑھا۔

وہ شخص جو سانپ کی موجودگی سے بے خبر تھا، سانپ کی پھنکار سُن کر کانپ گیا۔ اُسے موت سر پہ ناچتی ہوئی محسوس ہوئی۔ بھاگنے کا راستہ نہ پاکر وہ خوف زدہ آواز میں مدد کے لیے چلّانے لگا۔ اُس کی آواز سُن کر آس پاس کے لوگ ڈنڈے لے کر دوڑ پڑے اور ڈنڈے مار مار کر سانپ کا سر کچل دیا۔

سانپ چوٹ کھا کر تڑپ اُٹھا۔ درد کی شدت سے اُس کی آنکھوں سے گرم گرم آنسو ٹپکنے لگے —— نفرت کے آنسو... اس کا جسم بچے کی طرح کانپنے لگا۔ لوگ سانپ کو مرتا دیکھ کر خوشی سے تالیاں بجانے لگے۔ ایک آدمی گھر سے مٹی کا تیل لے آیا، پھر اس پر تیل چھڑک کر آگ لگا دی گئی۔

سانپ آہستہ آہستہ جل رہا تھا اور دھوئیں کی ایک لمبی لکیر فضا پہ لہرا رہی تھی۔

○○

حسابِ رنگ
بانی کا تازہ مجموعۂ کلام
قیمت : پندرہ روپے

سازِ رگِ جاں
کرشن مُرادی کی غزلیں، نظمیں قطعات اور دوہے
قیمت : دس روپے

اُڑان
شباب للت کا تازہ مجموعۂ کلام
قیمت : چھ روپے

گیان مارگ کی نظمیں
دُوسرا ایڈیشن جو آفسیٹ کے طریقے سے چھاپا گیا ہے
قیمت : دس روپے

رُوبرو
کمار پاشی کی غزلیں۔
قیمت : دس روپے۔

لاہور کا جو ذکر کیا
غیر منقسم پنجاب کی کہانی گوپال متّل کی زبانی
ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
دوسرا ایڈیشن : قیمت : دس روپے

نگاہِ شوق
دھرم سروپ کا متصوفانہ کلام
قیمت : دس روپے

ارمغانِ بہار
اے۔ سی۔ بہار کا تازہ مجموعۂ کلام
قیمت : دس روپے

یادوں کے سائے
ممتاز میرزا کی منتخب غزلیں۔ قیمت : بیس روپے

برگِ سبز
آزاد نومی کی حمد، نعت اور منقبت کے علاوہ کلاسیکل انداز کی غزلیں اور قومی نظمیں۔ قیمت : دس روپے۔

ستیہ پرکاش　|　سماجی جرائم اور کمیونزم

بھیک منگی، چوری چکاری، ڈکیتی، خویش پروری اور کام سے گریز ایسی برائیاں ہیں جو کمیونسٹوں کے نزدیک سرمایہ دارانہ نظام کا نتیجہ ہیں۔ ان کے پروپیگنڈے کے مطابق جیسے ہی یہ نظام ختم ہوکر کمیونسٹ نظام قائم ہوجائے گا، یہ سماجی بُرائیاں بھی ختم ہوجائیں گی۔ لیکن حقائق اس خوش آئند مفروضے کی تردید کرتے ہیں۔

اس امر کی نشان دہی ایک سے زائد بار کی جاچکی ہے کہ کمیونزم کے پورے نظامِ جبر کے نفاذ کے باوجود سوویٹ روس میں ان برائیوں کا خاتمہ نہیں ہوا، چینی کمیونسٹ اس کی یہ تاویل پیش کرتے ہیں کہ اس کا باعث یہ ہے کہ سوویٹ یونین مارکس اور لینن کے عقیدوں سے منحرف ہوگئی ہے۔ اس دلیل میں وزن تبھی ہوتا اگر خود کمیونسٹ چین میں اس قسم کی برائیاں موجود نہ ہوتیں۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ چین میں بھی یہ سماجی بُرائیاں پوری شدت سے موجود ہیں اور اس کا اعتراف خود چینی اخباروں اور اس کے ریڈیو اسٹیشنوں کو کرنا پڑا ہے۔ ان اطلاعات کے مطابق چین کے مختلف حصوں میں بھیک منگی اور دوسری سماج دشمن سرگرمیاں جاری ہیں۔ لوٹ مار کے واقعات ان خطوں میں بھی ہوئے ہیں جو پچھلے دنوں زلزلے کا شکار ہوئے تھے۔ جیسے کیانگ اور چینگ چاؤ صوبوں میں بینکوں پر مسلح ڈاکے ڈالے گئے۔ روزنامہ "چے کیانگ" کی ۲۰ راگست ۱۹۷۶ء کی اشاعت کے مطابق بینک کی ایک ڈکیتی میں بینک منیجر ہلاک ہوگیا ہانگ چاؤ ریڈیو کے ۱۳ ردسمبر ۷۶ء کے نشریے کے مطابق ۱۲ رنومبر سے ۶ ردسمبر ۱۹۷۶ء تک چے کیانگ صوبائی کمیونسٹ پارٹی کی اسٹینڈنگ کمیٹی کی جو میٹنگ ہوئی اس میں یہ پُرزور مطالبہ کیا گیا کہ "غبن کرنے والوں، دھوکے بازوں، قاتلوں، آگ لگانے والوں اور بدقماش لوگوں کی دوسری ٹولیوں کے خلاف جن سے امنِ عامہ کو شدید نقصان پہنچتا ہے، سخت کارروائی کی جائے۔" اسٹینڈنگ کمیٹی کی قرارداد میں یہ مطالبہ بھی کیا گیا کہ "جو لوگ دوسروں کو زدوکوب کرتے ہیں، انھیں لوٹتے ہیں، چوری چکاری یا منافع اندوزی کرتے ہیں یا اس پر بضد ہیں کہ وہ وہی کام کریں گے جو اُن کو پسند ہو، ان کی بھی مزاحمت کی جانی چاہیے۔"

موجودہ حکومت کا الزام یہ ہے کہ نوجوان مجرمانہ راستوں پر اس لیے گامزن ہوگئے تھے کہ وہ ماوزی تنگ کی بیوہ چیانگ چنگ اور اس کے تین ساتھیوں سے متاثر تھے لیکن موجودہ حکومت نوجوانوں کو زبردستی دیہات میں بھیجنے کی پالیسی پر بدستور بضد ہے جو نوجوانوں میں خاص طور پر نامقبول ہے۔

جو نوجوان دیہات میں بھیجے جاتے ہیں اور ناجائز طور پر وہاں سے بھاگ آتے ہیں شہروں میں بیشتر چھوٹے موٹے جرائم انھی سے سرزد ہوتے ہیں۔ ان کا نام چونکہ دیہات میں درج رجسٹر ہوتا ہے اس لیے شہروں میں وہ کسی ملازمت کے لیے درخواست نہیں دے سکتے۔ اب ان کے لیے یہی باقی رہ جاتا ہے کہ وہ چوری چکاری ڈکیتی یا جسم فروشی پر گزارہ کریں۔ روزنامہ کوانگ منگ کی ۲ رستمبر ۱۹۷۶ء کی اشاعت کے مطابق دیہات سے ناجائز طور پر باہر آنے والے نوجوانوں کے ایک گروپ نے پہلے ایک گاڑی چرائی پھر اس میں ایک عورت کو اغوا کرکے لے گئے جسے انھوں نے لوٹا بھی اور اس کی آبروریزی بھی کی۔

ایسا نہیں کہ اس قسم کے نوجوانوں کی تعداد قلیل ہو "ریڈ فلیگ" کے ۱۹۷۵ء کے چھٹے شمارے کے مطابق "یہ سمجھنا غلط ہے کہ صرف معدودے چند نوجوان ہی دیہات میں بسنے کی بجائے پرانے سماج کے باقیات سے گمراہ ہوکر آسائش کوشی اور راحت پسندی کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں اور ہر ڈھنگ سے روپیہ کمانے کے درپے ہیں یا بڑے

لوگوں کی صحبت میں پڑکر گمراہی اور جرائم کی راہ پر گامزن ہو گئے ہیں۔" پیپلز ڈیلی" نے یہ بھی کہا ہے کہ بعض حالتوں میں والدین بھی نوجوانوں کی گمراہی کا باعث ہوتے ہیں اور دیہات سے فرار اور روپوشی میں ان کی مدد کرتے ہیں۔

بددیانتی کے خلاف چین میں کئی مہمیں چلائی گئی ہیں لیکن بددیانتی اپنی جگہ قائم ہے۔ بعض مجرم سرکاری افسر ہوتے ہیں جو اپنے عہدے کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ رشوت ستانی کا اعتراف سرکاری طور پر کیا جا چکا ہے۔ ۶/اکتوبر ۱۹۷۶ء کے نشریے میں لانگ چاؤ ریڈیو نے اعتراف کیا کہ بددیانت سرکاری کارکن سٹے بازی بھی کرتے ہیں، رشوت بھی لیتے ہیں اور چوری بھی کرتے ہیں، نقل مکانی کی درخواستیں قبول کرنے والے افسر ڈیڑھ ہزار سے دو ہزار یوآن (چینی سکہ) تک وصول کر لیتے ہیں۔ ریاستی جائداد کے ناجائز استعمال اور فنڈوں کے غبن کے واقعات کا بھی اعتراف کیا جاتا ہے۔ ان کے مرتکب بالعموم بڑے افسر ہوتے ہیں۔ ایک ایجنسی کی رپورٹ کے مطابق عمارتی لکڑی کے ریاستی کارخانے کے لیڈروں نے لانگ چاؤ کے ایک تاجر کے ساتھ ساز باز کر کے چار لاکھ یوآن کی رقم کمائی جو ایک لاکھ پونڈ سے زیادہ ہے۔ ہوا یوں کہ انھوں نے اپنے مزدوروں کے لیے سستے کوٹ خریدے لیکن بہ مہنگے کوٹوں کا لیا اور اس کے مطابق ادائیگی کردی۔

اس قسم کی شکایات عام ہیں کہ سرکاری افسر اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے دوسرے بچوں کی طرح اپنے بچوں کو دیہات نہیں جانے دیتے اور یونیورسٹی میں داخل کرا دیتے ہیں۔ اگر یہ افسر کسی سے خفا ہو جائیں تو اسے کڑی سزا بھی دیتے ہیں۔ ۱۹۷۶ء کے وسط میں دیواری پوسٹروں میں یہ انکشاف کیا گیا تھا کہ شین سی صوبے کے ایک نوجوان کو ۱۹۷۵ء میں زنا بالجبر کے الزام میں بیس سال قید کی سزا دی گئی۔ لڑکی کے باپ نے اس پر دباؤ ڈالا کہ وہ اپنے چاہنے والے پر زنا بالجبر کا الزام لگائے۔ صوبائی انقلابی کمیٹی میں اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے اس نے سیکورٹی بیورو سے اس نوجوان کو سزا بھی دلوا دی۔ دعویٰ یہ کیا گیا تھا کہ اسے سزا کا حکم فیکٹری کے مزدوروں کی موجودگی میں عوام سے مشورہ کر کے دیا گیا ہے لیکن پوسٹروں میں انکشاف کیا گیا کہ اس قسم کا کوئی مشورہ نہیں کیا گیا تھا۔

OO

یہ کوئی معمولی شربت نہیں
یہ رُوح افزا ہے
پھلوں کے رس اور جسم کو تازگی پہنچانے والی
خود جڑی بوٹیوں سے مرکب شربت روح افزا جسم کو
ٹھنڈک پہنچاتا ہے، گرمی کی خشکی کو دور کرتا ہے اور آپ کو
ایسی تازگی دیتا ہے جو کسی عام شربت سے نہیں مل سکتی۔
شربت رُوح افزا
موسم کا خاص شربت جو گرمی کا مقابلہ کرتا ہے۔
ہمدرد

غزلیں

خالد رحیم

بکھرے ہوئے وجود کا منظر خرید لو
طوفاں کی زد میں آیا ہوا گھر خرید لو

مخلص بنو خلوص کی قیمت ادا کرو
آنکھوں سے آنسوؤں کا سمندر خرید لو

بازارِ رنگ و بو سے گزرتے ہوئے کبھی
مسلی ہوئی کلی کا مقدر خرید لو

دیکھو بدن کو بیچ کے اپنے لہو کا رنگ
اپنے سروں کے واسطے پتھر خرید لو

خواہش کی موج خشک میں بہتے ہو کس لیے
دنیا ہے خواہشوں کا سمندر خرید لو

کہتے ہیں لوگ یہ بھی اجالوں کا شہر ہے
سایہ ملے جو قد کے برابر خرید لو

خالد نہ ہوگا وقت کے زخموں کا اندمال
ممکن جو ہو تو درد کی چادر خرید لو

▲▲

یوسف جمال

حادثے اب نہیں اجسام میں ہونے والے
قرض سانسوں کا چکا بھی چکے سونے والے

چہرے مانگے کے اگا تو لیے لیکن اک روز
اپنے چہروں کے لیے روئیں گے رونے والے

کتنی راتوں کے سمندر میں ہوئے غرق آخر
جھیل میں چاندنی کی جسم بھگونے والے

زندگی آگ کا دریا ہے، یہ مانا لیکن
کس قدر شاد ہیں کشتی کو ڈبونے والے

لے کے بیٹھے رہے مالاؤں کی دوکان جمالؔ
فکر کی ڈور میں لفظوں کو پرونے والے

▲▲

اشعر ہاشمی

بدلتے موسم کی آہٹیں ہیں
چہار سو بوکھلاہٹیں ہیں

وہ غصے میں ہو کہ ڈر رہا ہو
بدن پہ تو کپکپاہٹیں ہیں

ملایا تھا ہاتھ اس سے اک دن
ابھی تلک جھنجھناہٹیں ہیں

تمہیں ترستے تھے مل گئے تو
عجیب سی ہچکچاہٹیں ہیں

کوئی نیا خواب جاگتا ہے
پھر آنکھوں میں کسمساہٹیں ہیں

▲▲

★ سپنا اسٹور بخشی بازار ۔ کٹک ★ راج گانگ پور ۷۷۰۰۱۷ (اڑیسہ) ★ ۳۱ ۔ روشن گولیدار لین ۔ ہوڑہ ۱

غزلیں

زبیدہ بیگم شمع

مبارک اے دردِ دل مبارک کوئی ترا چارہ گر نہیں ہے
نظر ہے اُن کی ترا مداوا سو ہم پہ اُن کی نظر نہیں ہے

جو پیاس آنکھوں کی بڑھ رہی ہے تو آرزوئیں مچل رہی ہیں
عروج پر دھڑکنیں ہیں دل کی رسائی ممکن مگر نہیں ہے

نیاز مندوں کو واسطہ ہے تسلیِ ذوقِ بندگی سے
جبیں سلامت ہزار در ہیں تمہارا ہی ایک در نہیں ہے

ترے خیالوں میں کھو گئے ہم نجات پائی غمِ جہاں سے
ترے جہاں سے حسین و دلکش کوئی جہانِ دگر نہیں ہے

قدم قدم پر خیال تیرا، نظر نظر میں تلاش تیری
نفس نفس میں پکار تیری، مگر تجھے کچھ خبر نہیں ہے

میں رو کے راتیں گزارتی ہوں میں جل کے راتیں گزارتی ہوں
میں شمعِ گریاں میں شمعِ سوزاں مرے غموں کی سحر نہیں ہے

▲▲

مسعودہ حیات

گھر سے جو شخص بھی نکلے وہ سنبھل کر نکلے
جانے کس موڑ پہ کس ہاتھ میں خنجر نکلے

یوں تو خوش رنگ ہیں ہر سمت مری دیواریں
کوئی تو تازہ ہواؤں کے لیے در نکلے

گھر گیا ہو جو فصیلوں کو اٹھا کر خود ہی
کیسے اب اپنے حصاروں سے وہ باہر نکلے

رہبرو! تم نے تو منزل کا پتا بھی نہ دیا
تم سے بہتر تو مری راہ کے پتھر نکلے

اس سے پہلے تو نہ دیکھے تھے یہ اندازِ دگر
وقت آیا تو عجب آپ کے تیور نکلے

تم سے چھوڑی نہ گئی راہِ وفا پھر بھی حیاتؔ
کتنے بیدرد ملے کتنے ستمگر نکلے

▲▲

مشتاق وارثی ایم۔اے

میں صاف گو تھا مصلحتیں جانتا نہ تھا
ماحول میں اسی لیے شاید ڈھلا نہ تھا

دینا تھا دوسروں کو جو روحانیت کا درس
دل کے معاملات میں خود بھی کھرا نہ تھا

بھرتا میں نور کیسے اندھیری گپھاؤں میں
خود میرے ہی شعور کا سورج اُگا نہ تھا

قابض ہے شہر میں وہ ہر اک انجمن پہ آج
کل تک تو اس کو کوئی بھی پہچانتا نہ تھا

کیوں پڑ گئی دراڑ سی آخر دلوں کے بیچ
مشتاقؔ ہم میں کوئی بھی جبکہ بُرا نہ تھا

▲▲

★ معرفت نعیم احمد، چوڑی والان، دہلی ★ بازار چتلی قبر، دہلی ★ B-1X/6 شیروانی گیٹ مالیر کوٹلہ ۱۴۸۰۲۳

نظمیں

خاطر حافظی

اِس شہر میں جیتے ہوئے
مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے
جیسے میں کسی تنگ سی گپھا میں آپہونچا ہوں
آنے اور جانے کے سارے راستے
جیسے بند سے ہو گئے ہیں

چاروں طرف پہاڑ ہیں، سر بہ فلک پہاڑ ــــــ
جن کی چوٹیاں ابابیل کے پروں کی طرح
سروں پہ سایہ فگن ہیں۔
اور جنگل کے گھنے بازوؤں کی طرح
پھیلی ہوئی گلیاں ــــــ
جو گھوم پھر کر ایک ہی مرکز پر آملتی ہیں۔
وہی شکست خوردہ بیمار چہرے
جن کی اداس سے لٹکی ہوئی زبانیں
اپنے دامنوں کو پسارے
ہر آنے جانے والے کی
راہ تکا کرتی ہیں۔
چھوٹے چھوٹے رستوراں اور
کافی ہاؤسوں میں

جمی ہوئی بھیڑ،
روزانہ اخبار کے کسی بے معنی موضوع کا
پوسٹ مارٹم کرتی ہوئی،
اپنی دن بھر کی تکان اور اعصاب کو
ایک کپ چائے / کافی میں
ڈبو دینا چاہتی ہے
اور میں خود
اِس بے معنویت کا شکار
اپنے خوابوں کو لیے
کہیں دُور، بہت دُور بھاگ جانا چاہتا ہوں

★ محلہ شاہ معروف ۔ گورکھپور ۔ یوپی

شری دھر شنوارے

ــــــ

بدیع الزماں خاور

ڈھلتی ہوئی دھوپ

جن کو اب تک کِھل کے ہونا چاہیے تھا پھول سا
اب بھی ہے سمٹا ہوا ان تجربوں کا دائرہ
ہو رہی ہے روز بارش تین برسوں سے، مگر
اِک ذرا بھی سبزہ اُگ پایا نہیں ہے سنگ پر
گھا رہا ہوں ــــــ جا بہ جا اُبھرے پھپھولوں کا فریب
جل کے بھی خوشبو اگر بتی نے پھیلائی نہیں

پاؤں کے نیچے کی مٹی میں چھپی جھنکار تک
پایلوں سے اُٹھ کے چھونے لگتی ہے آکاش کو
طائروں کے ننھے بچے بھی، ہر دل کو تول کر
ڈھونڈ لیتے ہیں کئی پوشیدہ سمتوں کے نشاں ....

مجھ کو یہ ڈر ہے، اگر نِکلا میرا رستا غلط
مَیں نہ منزل پر کسی صورت پہنچنے پاؤں گا
خواہشِ منزل میں خود ہی ہو کے گم رہ جاؤں گا

یہ تھکن سے چُور مٹی میں اَٹے جسموں کی باسی کونپلیں
ــــــ اور یہ تنہائی ان کو روندتی قدموں تلے!
دُھوپ ڈھلتی جائے گی اب دیکھتے ہی دیکھتے
دیپ بھی تیار میں شاید نہ کرنے پاؤں گا
پھر مری جانب یہ بجلی کی طرح بڑھتی ہوئی
شام آئے گی، تو اس کی آرتی کے واسطے
انجلی بھر پھول مَیں بے بس، کہاں سے لاؤں گا؟؟ (مراٹھی نظم)

★ ڈ ستمکر کوارٹرز ۔ منڈن گھاٹ روڈ ۔ پی ۔ او ۔ داپولی ۱۲، ۱۵ م، رتناگری ایم ایس

حقیقت سے افسانہ تک

بملے متر
ایس۔ ایم۔ حیات

میری اس عادت سے سبھی واقف ہیں کہ لکھتے لکھتے جب دماغ گرم ہو جاتا ہے میں قلم رکھ کر شارعِ عام پر نکل پڑتا ہوں۔ جس سڑک پر بے حد ہجوم ہو اُس پر گھومنے سے میرا دماغ ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ راستہ میں جتنی بھیڑ ہو اتنا ہی اچھا ہے۔ اُس بھیڑ میں مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں سمندر کے کسی غیر آباد کنارے پر گھوم رہا ہوں۔ جو لوگ گوشۂ تنہائی یا دماغی سکون کی تلاش میں پہاڑوں کی بلندیوں پر چلے جاتے ہیں وہ اس حقیقت سے ناآشنا ہیں کہ غیر آباد اور ویران جگہ انسان کی صحت پر شدت سے اثر انداز ہوتی ہے۔ پُرسکون اور ویران جگہ پر انسان اپنے بارے میں سوچ کر اور پریشان ہوتا ہے کسی نے کہا ہے: کثیر آبادی کا شہر ایک دہشت انگیز مقام ہوتا ہے جہاں احساسِ تنہائی اپنی تمام تر شدت کے ساتھ کارفرما نظر آتا ہے اس لیے جب سرِ شام سڑک کی بھیڑ بھاڑ میں اکیلا گھومنے لگتا ہوں اور لوگوں کی سادہ روی دیکھتا ہوں تو مجھے ایک خاص لطف سا محسوس ہوتا ہے۔ اُس وقت بہت دیر کے لیے اپنے آپ کو اپنے دُکھ درد کو بھول جاتا ہوں میں محسوس کرنے لگتا ہوں کہ میں دُنیا کے اِس کھیل کا ایک اداکار نہیں، تماشائی ہوں۔ خود کو تماشائی قرار دینے میں جو ذہنی سکون ملتا ہے اُس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ میرے اپنے ذاتی مسائل بھی اُس وقت میرے اپنے مسائل نہیں رہتے۔ میرا دُکھ بھی اُس وقت میرا دُکھ نہیں رہتا۔ اگر ایک ہی جملے میں اس کیفیت کو بیان کروں تو کہوں گا۔ اس وقت میں سبھی کا ہوتا ہوں اور سبھی میرے ہوتے ہیں، پھر بھی میں اکیلا رہتا ہوں! ہاں! تو ان فلسفیانہ باتوں کو چھوڑیے۔ میں فلسفی ہوں اور نہ شاعر —— ایک سیدھا سا انسان ہوں۔ میں نے سیدھے سادے ہی انسان کے رُوپ میں اِس دھرتی پر جنم لیا ہے اور سادہ ہی انسان کے روپ میں اس دُنیا سے چلا جاؤں گا۔ اس اندازِ فکر میں غیر ذمّہ داری اور فرض سے مُنہ موڑ لینے کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے جس کا احساس میرے لیے باعثِ مسرّت ہوتا ہے۔

ایک دن شام کے وقت گھومتے گھومتے ایک جگہ کافی ہجوم دیکھ کر میں ٹھٹک گیا۔ وہ کسی شاہراہ کا ایک موڑ تھا۔ سامنے ہی تھانہ بھی تھا۔ مجھے خیال ہوا ضرور کوئی حادثہ رونما ہوا ہے۔ ایک آدمی کو گھیرے کھڑے سبھی لوگ مضطرب اور مشتعل نظر آ رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُسے سب نے پکڑ رکھا ہے اور اسے مار رہے ہیں۔ پتہ نہیں اُس کا جرم کیا تھا۔ بیچارہ اپنی صفائی میں یہ کہنے کی کوشش کرتا رہا کہ وہ بے قصور ہے۔ لیکن اس کی سُنتا کون؟ اس کے قریب ہی ایک بیش قیمت کار کھڑی تھی۔ مجمع میں سے کسی نے بآوازِ بلند کہا ——

"دیکھتے کیا ہو آگ لگا دو اس کار کو!"

میں سوچنے لگا۔ یہ مشتعل لوگ کہیں سچ مچ ہی اس کار کو آگ نہ لگا دیں! لیکن انھوں نے ایسا نہ کیا۔ اُن میں کچھ روشن خیال بھی تھے انھوں نے کہا۔ "نہیں، نہیں، قانون کو ہاتھوں میں لینا مناسب نہیں۔ جب پولیس موجود ہے تو معاملہ اُسے سونپ دیا جائے۔"

پولیس کا ایک سپاہی پاس ہی کھڑا تھا۔ اُس نے اُس شخص کو پکڑ لیا اور پوچھا ——

"بول ڈرائیور کہاں بھاگ گیا؟"

رونی سی صورت بنا کر اُس غریب آدمی نے کہا —— "میں کچھ نہیں جانتا۔ مجھے چھوڑ دیجیے!"

"چھوڑیے گا نہیں اسے۔ اس کی اچھی طرح سے مرمت ہونی چاہیے!"

جن لوگوں نے مرمت کی تجویز پیش کی تھی وہ پہلے ہی سے اپنی حد تک اس مظلوم کی کافی مرمت کر چکے تھے۔ ایک نے اُس کے بال مٹھی میں کس رکھے تھے۔ دوسرے نے اس کی گردن دبوچ رکھی تھی کسی نے اس کا گلا پکڑ رکھا تھا تو کسی نے اُس کی قمیض کھینچ کر پھاڑ دی تھی۔ میں نے بھی اُچک کر دیکھا اس شامت کے مارے کی حالت قابلِ رحم تھی۔ اس کا گریبان تار تار تھا۔ اُس کی ناک اور مُنہ سے خون بہہ رہا تھا۔ پھر بھی اس کے ساتھ کسی کو ہمدردی نہ تھی۔ پولیس کا سپاہی اُسے مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا۔ مشتعل ہجوم کی لاتوں، گھونسوں اور تھپڑوں سے اُسے بچانے کی اس نے کوشش نہیں کی تھی۔ پاس ہی کھڑے کسی آدمی نے پوچھا "اس نے کیا کیا ہے؟"

دوسرے نے جواب دیا "اس نے گاڑی سے ایک آدمی کا ایکسیڈنٹ کر دیا ہے۔"

"شاید یہ گاڑی کا ڈرائیور ہے!" میں نے سوچا۔

"نہیں" اس آدمی نے جواب دیا۔ "نہیں جناب یہ ڈرائیور نہیں جو گاڑی چلا رہا تھا وہ تو فرار ہو گیا۔ وہ پکڑا جاتا تو ہم لوگ اُس کی جان لے لیتے!"

"تو یہ کیا آدمی اس گاڑی کا مالک ہے؟"

"نہیں، مالک کا چہرہ کیا ایسا ہوتا ہے؟ دیکھ نہیں رہے ہو کتنی قیمتی گاڑی ہے! یہ آدمی ڈرائیور کی بغل میں بیٹھا ہوا تھا۔ شاید، ڈرائیور کا دوست ہے۔"

"تو پھر سب لوگ اِسے کیوں مار رہے ہو؟ اس کا کیا قصور ہے؟" میں نے پوچھا۔

چاروں طرف کھڑے لوگوں نے مجھے خشمگیں نظروں سے دیکھا جیسے میری سچی بات کسی کو بھی پسند نہ آئی ہو۔

ایک نوجوان کہنے لگا۔ "مسٹر! اسی لیے تو آج کل بہت سے ایکسیڈنٹ ہوتے رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو معقول سزا ملنی چاہیے ورنہ یہ اسی طرح لوگوں کی جانیں لیتے رہیں گے!"

پولیس کے سپاہی نے خشمگیں آنکھوں سے دیکھتے ہوئے درشت لہجے میں کہا۔ "بول! ڈرائیور کہاں ہے؟ اس کا گھر کہاں ہے؟"

لوگوں کے نرغے میں گھرے اُس آدمی نے کہا۔ "میں کچھ نہیں جانتا۔ جو آدمی گاڑی چلا رہا تھا اُس سے میری صرف جان پہچان ہے۔ اُس کا مکان اور پتہ مجھے نہیں معلوم۔"

"تجھے کچھ بھی نہیں معلوم! بہت بھولا بنتا ہے؟ تھانے چل تیری عقل ٹھکانے لگ جائے گی!" سپاہی نے اُس کی پیٹھ پر ایک دھول جمائی۔

میں چُپ کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ سوچ رہا تھا۔ دنیا کا یہ کیسا انصاف ہے۔ جُرم کوئی اور کرے، سزا کسی اور کو ملے! میں نے ایک بار پھر سوچا کہ ان لوگوں سے کیوں نہ پوچھوں آپ لوگ رام کے جرم کی سزا شیام کو کیوں دے رہے ہیں، لیکن خیال ہوا۔ نقار خانے میں طوطی کی کون سُنے گا۔ میں نے دیکھا پولیس کا سپاہی بھی لوگوں ہی کی طرف داری کر رہا ہے۔ وہ بھی چاہتا ہے کہ اس آدمی کو سزا ملے۔ جرم ثابت ہو یا نہ ہو پھر بھی وہ ایک بے قصور کو سزا دے رہا ہے! شاید یہی اس کے منصب سے وابستہ احساسِ برتری کی تسکین کی صورت ہے۔

مجمع جتنا آگ پر تیل چھڑک رہا تھا سپاہی اتنا ہی مشتعل ہوتا جا رہا تھا۔ اُسی وقت کسی بڑے آدمی نے وہاں اپنی گاڑی رُکوائی۔ گاڑی سے اُترتے ہی وہ بولا۔ "ارے یہ گاڑی تو مسٹر داس گپت کی ہے!"

مسٹر داس گپت! بات میرے کانوں میں بھی پڑی۔ صرف میرے ہی کانوں میں کیوں سارے لوگوں کے کانوں میں پڑی۔ بات پولیس کے سپاہی کے کان میں بھی پڑی۔ اُس نے پوچھا — "کون داس گپت؟"

"ارے بھئی! یہ گاڑی منسٹر کی ہے! شری کاشی کانت داس گپت ہوم منسٹر کی! یہ گاڑی یہاں کیسے؟ ڈرائیور کہاں گیا؟"

اب سپاہی کی سمجھ میں بات آئی۔ اُس کے چہرے پر خوف، ادب اور احترام کے جذبات نمودار ہوئے۔ بولا "یہ ہوم منسٹر صاحب کی گاڑی ہے تو پہلے ہی کیوں نہیں بتایا آپ نے؟ میں بھی تو اتنی دیر سے یہی کہہ رہا ہوں کہ یہ ڈرائیور کی غلطی نہیں ہے!"

جو لوگ اتنی دیر سے اُس بے قصور آدمی کی مرمت کرنے کے لیے مشتعل ہو رہے تھے وہ بھی سہم گئے۔ سپاہی نے بھیڑ کی طرف دیکھ کر

ڈانٹا۔ "تم لوگ الٹی سیدھی کیوں بک رہے ہو؟ بھاگو یہاں سے!"

لوگ ششدر رہ گئے۔ سپاہی کی ڈانٹ کھا کر کچھ لوگ تو وہاں سے کھسک گئے لیکن ان میں کچھ نڈر اور بیباک بھی تھے۔ وہ ایک ساتھ بول اٹھے ——— "یہ ہوم منسٹر کی گاڑی ہے تو کیا ہم ان کی گاڑی یوں ہی چھوڑ دیں؟ بلاؤ انھیں یہاں! ابھی ہم لوگ انھیں ہوم منسٹری کا مزہ چکھاتے ہیں!"

اب سپاہی کو صورتِ حال کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے ذرا گرم ہونا پڑا۔ شاید وہ بھی ڈر گیا تھا۔ اُس نے اپنی کمر سے وِسل نکال کر زور سے بجا دی۔ اس کے ساتھ ہی تھانے سے کئی کانسٹیبل لاٹھی گھماتے ہوئے دوڑے آئے۔ اُن کی کمروں میں ریوالور لگی ہوئی تھی۔

"کیا ہوا ہے یہاں؟"

مشتعل ہجوم کو قابو سے باہر ہوتے دیکھ کر پولیس کو لاٹھی چلانی پڑی ——— پتہ نہیں کہاں سے اینٹ پتھر اور سوڈا واٹر کی بوتلیں پولیس پر برسنے لگیں۔ جو جدھر بھاگ سکا بھاگنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سڑک کی بتیاں بجھنے لگیں۔ چاروں طرف آنسو گیس چھوٹنے کی آواز اور دھوئیں سے بھری فضا تھی۔ دم بھر میں وہ جگہ جیسے میدانِ جنگ بن گئی۔

میں بھی وہاں زیادہ دیر کھڑا نہ رہ سکا۔ چُپ چاپ وہاں سے نکل کر دوسرے محلّے کی طرف چلا گیا جو بالکل پُر امن تھا۔ وہ گاڑی کہاں گئی اور اس آدمی کا کیا ہوا، پتہ نہیں۔

ایسے حادثے تو کلکتہ جیسے بڑے شہر کے لیے بالکل عام اور روز مرّہ کی باتیں ہیں۔ اس حادثہ کو لے کر کہانی کیا لکھی جاتی ——— لیکن کہانی بن گئی۔ یہ معمولی سا حادثہ دوسرے دن صبح کو کہانی بن گیا!

دوسرے دن صبح کے اخبار میں خبر شائع ہوئی ———

"پچھلی شام کو کچھ شر پسند عناصر نے مراری پوکر تھانے پر حملہ کر دیا جس کی وجہ سے پولیس کو اُن پر گولی چلانی پڑی" ———

حادثہ کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے آگے لکھا تھا ——— "اُن شر پسند عناصر کو شک تھا کہ ہوم منسٹر شری کاشی کانت داس گپت کی کار میں بم ہیں اور اِس شک پر اُنھوں نے اُس کار کو زبردستی روک لیا تھا۔ گاڑی کی تلاشی لینے کے بعد جب اُس میں کچھ نہ ملا تو مشتعل ہجوم نے گاڑی کو آگ لگا دینا چاہا۔ صورتِ حال پر قابو پانے کے لیے پولیس کو مجبوراً مشتعل ہجوم پر گولی چلانی پڑی۔ ہوم منسٹر شری کاشی کانت داس گپت کسی کانفرنس میں شرکت کے لیے دلّی گئے ہوئے ہیں۔ اُنھیں اِس حادثہ کی اطلاع بذریعہ ٹرنک کال دے دی گئی ہے۔ ہوم منسٹری کے عملے کے ایک فرد کے بتلانے پر تین افراد کی گرفتاری عمل میں آئی ہے۔ ابھی تک کسی کے زخمی ہونے کی خبر موصول نہیں ہوئی ہے۔ تفتیش جاری ہے۔"

(بنگلہ کہانی)

○○

جدید اُردو ادب کے لیے

سال میں چار بار

سطور

مدیر: رزاق ارشد — ترتیب و تہذیب: کمار پاشی — دوسرا شمارہ مئی ۷۰ء میں چھپ رہا ہے

پتہ: سطور پرکاشن، ۳۳۷۱ دہلی گیٹ، نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۲۔

تبصرے

دھوپ اور چاندنی (شعری مجموعہ)

مصنف: ضیا فتح آبادی۔ ناشر: ڈیونڈر کے۔سونی، لندن
ہندوستان میں ملنے کا پتا: جے ۵/۲۱ راجوری گارڈن۔ نئی دلّی۔
قیمت: پچیس روپے۔

جناب ضیا فتح آبادی دبستانِ سیماب کے معروف شاعر ہیں اور سیماب صاحب کے ان شاگردوں میں ہیں جنھیں استاد کا فیضِ تربیت واقعی حاصل رہا ہے۔ ان کے کلام کے کئی مجموعے چھپ کر منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ زیرِ نظر مجموعہ ان کی تازہ غزلوں پر مشتمل ہے اور اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اسے فوٹو آفسٹ کے ذریعے خود ان کی تحریر میں شائع کیا گیا ہے۔ مجموعے کا مطالعہ کرتے ہوئے جگہ جگہ اچھے اشعار پر نظر رکتی ہے۔ ان کے کلام سے اُردو غزل کے مستند اور مانوس اسالیب کا خوگر قاری تو لطف اندوز ہوگا ہی لیکن ان کا دامن ایسے اشعار سے بھی خالی نہیں جو نئے ذہن کے لیے بھی کشش کے حامل ہوں:

چھیڑتی ہے نرم پتّوں کو ہوا
نغمگی ہی نغمگی ہے ہر طرف

در و دیوارِ قفس پر ہیں لہو کے چھینٹے
مرغِ پربستہ کو شوقِ چمن آرائی تھا

اِک دن تو صبح آئے گی اس کو پھلانگ کر
دیوارِ بن کے بیچ میں کب سے کھڑی ہے رات

اشک پلکوں سے گرا یوں جیسے
خشک ٹہنی سے گلِ تر ٹوٹا

ہر طرف شور کی دیوار دکھائی دے ہے
میری آواز بھی کب مجھ کو سنائی دے ہے

بعض الفاظ کے املا میں ضیا صاحب کو تسامح ہوا ہے مثلاً "پاؤ" کو انھوں نے ہر جگہ "پانوں" لکھا ہے۔ ضیا صاحب کا خط صاف بھی ہے اور خوشنما بھی۔

مخمور سعیدی

امیراللہ تسلیم، حیات اور شاعری

مصنف: ڈاکٹر فضل امام، تقسیم کار: ناشرین الہ آباد، قیمت: بیس روپے

ڈاکٹر فضلِ امام گورکھپور یونیورسٹی کے فارغ التحصیل ہیں اور آج کل راجستھان یونیورسٹی میں اُردو کے استاد کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں "امیراللہ تسلیم۔ حیات اور شاعری" ان کا وہ مقالہ ہے جس پر گورکھپور یونیورسٹی نے انھیں ڈاکٹر آف لٹریچر کی سند تفویض کی ہے۔

"امیراللہ تسلیم۔ حیات اور شاعری" کے حرفِ آغاز سے پتہ چلتا ہے کہ اصلاً یہ مقالہ بہت ضخیم تھا چند ابواب جن میں سے ایک تلامذۂ تسلیم سے متعلق تھا، کتاب میں شامل نہیں کیے گئے ہیں۔ لیکن اس کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کام بھی ایسا نہیں ہے جسے پردۂ خفا میں رہنے دیا جائے۔ اِس لیے میرا مشورہ یہ ہے کہ تسلیم کے عہد اور ان کے تلامذہ سے متعلق حصّہ کو الگ کتابی شکل میں ضرور شائع کیا جائے۔

موجودہ صورت میں کتاب "امیراللہ تسلیم - حیات اور شاعری" پانچ ابواب اور ایک ضمیمہ پر مشتمل ہے۔ حرفِ آغاز میں مصنف نے سلیقہ کے ساتھ ہر باب کا تعارف کرادیا ہے۔ مقالے کی منظوری اور اشاعت کے درمیان وقفہ اتنا کم ہے کہ مصنف کو ظاہراً نظرِثانی کا موقع نہیں مل سکا ہوگا۔ دورانِ مطالعہ بعض باتیں ایسی سامنے آئیں جن کی طرف توجہ مناسب ہے۔

تسلیم اپنی والدہ کے قول کے مطابق غازی الدین حیدر کے پہلے سنہ جلوس میں پیدا ہوئے تھے۔ غازی الدین حیدر عیدالضحیٰ ۱۲۳۴ھ کے دوسرے دن ۹ اکتوبر ۱۸۱۹ء کو تخت نشین ہوئے اس کے محض گیارہ دن بعد ۲۰ اکتوبر کو نیا قمری سال اور پورے تین ماہ بعد نیا عیسوی سال یعنی ۱۸۲۰ء شروع ہوگیا۔ اس لیے میرا قیاس ہے کہ تسلیم کا سالِ ولادت ۱۲۳۵ھ مطابق ۲۰-۱۸۱۹ء کو سمجھنا چاہیے۔ جب کہ ڈاکٹر فضل امام نے ۱۸۱۹ء برآمد کیا ہے۔ اسمٰعیل پانی پتی اور لالہ سری رام نے ۱۸۲۰ء میں تسلیم کی پیدائش لکھی ہے۔ میرے خیال میں اس سے اختلاف کی ضرورت نہیں۔ صفحہ ۱۲ پر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے حوالے سے جو واقعہ نقل کیا گیا ہے اس کو تمام جزئیات کے ساتھ تسلیم کرنے میں مجھے تامل ہے۔

کتاب میں جگہ جگہ ایسے نشانات ملتے ہیں جن سے مصنف کی خوبیِ استعداد، اس کی خوداعتمادی اور جرأتِ اظہار کا اندازہ ہوتا ہے مثال کے طور پر صفحہ ۹۶ پر پروفیسر مجنوں گورکھپوری جیسے مقتدر اور مستند ناقد کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے اپنے نظریے کی تائید میں ڈاکٹر فضل امام نے جو دلایل پیش کیے ہیں ان سے نہ صرف مطالعہ کی وسعت کا پتا چلتا ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کو اپنے نتائجِ فکر پر اعتماد ہے۔ یہ اعتماد اور جرأت بہت اہم ہے۔

کتاب کا اصل موضوع تسلیم کی حیات اور شاعری ہے مصنف نے تسلیم کی بعض نایاب تصانیف کا سراغ لگایا ہے اور ان کے حالات بہت محنت اور عرق ریزی کے ساتھ جمع کیے ہیں ——— لیکن کتاب میں متعدد ایسی بحثیں بھی آئی ہیں جو ادبیاتِ اُردو کی تاریخ سے متعلق ہیں مثلاً دہلی اور لکھنؤ کے دبستانوں کی بحث، مومن اور ان کے سلسلے کے شعرا کی خدمات کا جائزہ، رام پور کی شعری اور ادبی محفلوں کا محاکمہ وغیرہ، یا اُردو غزل اور اُردو مثنوی وغیرہ کے ارتقا سے متعلق مجمل لیکن مُدلّل نتائج فکر و تحقیق ——— ان بحثوں کی وجہ سے کتاب کی وقعت اور اہمیت میں قابلِ قدر اضافہ ہوگیا ہے۔ بالخصوص "دبستانِ مومن" اور اہلِ رام پور کی خدمات کا جس طرح تجزیہ کیا گیا ہے وہ بہت قابلِ توجہ ہے۔

——— ڈاکٹر محمد انصار اللہ

'بازگشت' سے 'انکار' تک

امیر آغا قزلباش نئی نسل کے ان شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے بہت ہی مختصر مدت میں اپنے لیے اُردو ادب میں ایک مقام حاصل کرلیا ہے۔ ان کی شاعری میں جدید ذہن کی عکاسی ملتی ہے۔ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں لیکن اس قدیم درخت پر بھی انھوں نے نئے پھول پیدا کیے ہیں۔ وہ غزل کے روایتی تصور کے پابند نہیں ہیں۔ وہ 'بادہ و ساغر' کے پردے میں بھی اپنی بات کہتے ہیں اور واضح اشارے بھی کرتے ہیں۔

امیر قزلباش نے زندگی کو قریب سے دیکھا ہے اور خود اپنے انداز سے ہر کیفیت کو محسوس کیا ہے۔ وہ زندگی کے مشاہدے میں کسی مخصوص نظریے کو ساتھ نہیں رکھتے۔ وہ جس چیز کو بھی دیکھتے ہیں۔ اسے اپنی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اپنے تاثر کا اظہار کرتے وقت وہ روایتی انداز استعمال کرنے کے قایل نہیں بلکہ نہایت خلوص کے ساتھ اپنے تاثر کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ سننے والا چونک پڑتا ہے اور پھر جب آہستہ آہستہ اس کا ذہن شاعر کی بات کو قبول کرتا ہے تو اسے ایک ناقابل بیان سی مسرت محسوس

ہوتی ہے۔

امیر قزلباش نے (شاید) زندگی کی تلخیوں کا بار بار سامنا کیا ہے۔ زندگی کی محرومیاں اور مایوسیاں ابدی حقیقتیں ہیں جن سے فرار ممکن نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ کچھ لوگ محض شکوہ کرتے ہیں اور کچھ لوگ ان محرومیوں کے درمیان سے گزر کر اپنی راہ الگ بنا لیتے ہیں۔ حوصلہ مندی سے وہ خارزار کو گلزار اور پتھر کو شیشہ بنانے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ یہی جذبہ امیر قزلباش کی شاعری میں بھی نظر آتا ہے۔ امیر قزلباش محرومی سے متاثر ضرور ہوتے ہیں لیکن اسے ایک نئے انداز میں اتنی خوبصورتی سے پیش کرتے ہیں کہ اس کا بوجھ نہ صرف ہلکا ہو جاتا ہے بلکہ زندگی ایک نئے روپ میں جلوہ گر نظر آنے لگتی ہے۔

قدم زمین میں دھنسنے لگے تو کیا یارو
قریب ہونے لگا ایک آسماں مجھ سے

ہوتا ہے کوئی عزم شکستہ تو کہیں سے
آتی ہے اک آواز کہ ہاں میں ہی خدا ہوں

امیر قزلباش کے یہاں محرومی کا احساس موجود ہے اور بعض اوقات یہ بہت بڑھ جاتا ہے۔ اس کے باوجود وہ دل شکستہ نہیں ہوتے بلکہ غم کو ایک نئے سانچے میں ڈھال کر ایک نئی صورت بنانے کی کوشش کرتے ہیں ؎

اب وہ صبح ہوتے ہی دھوپ اوڑھ لیتا ہے
منتظر نہیں شاید اب کوئی شجر اس کا

وہ ایک جگہ کھڑے ہو کر غم و آلام کا نوحہ کرنا نہیں چاہتے بلکہ حرکت اور عمل میں یقین رکھتے ہیں۔ ناکامیوں کے باوجود آگے بڑھنا چاہتے ہیں چاہے کوئی ان کے ساتھ چلے یا نہ چلے۔ تاریکی، طوفان، بادِ مخالف کوئی ان کے عزم کو متزلزل نہیں کر سکتا ؎

ابھی تو راہ میں روشن ہوں اے ہوائے شب
میں بجھ گیا تو تجھے کامیاب لکھوں گا

نہیں تھا کوئی مسافر نواز رستے میں
میں اپنے سائے میں ٹھہرا اگر شجر نہ ملے

امیر قزلباش کی مایوسی جب حد سے بڑھ جاتی ہے تو وہ اور بھی اثر انگیز بن جاتی ہے۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں ؎

وہی زرد شاخیں ہیں پھر رد برد کوئی پھول جن پر کھلا تک نہیں
درختوں کے یہ سلسلے دور تک مگر کوئی پتا ہرا تک نہیں

مری نیکیاں خون میں تر بتر ہیں حرفِ صداقت مگر دربدر
میں صدیوں سے اس طرح مصلوب ہوں کہ ساتھ جیسے خدا تک نہیں

آج گھبرا کے میں پھر گھر سے نکل آیا ہوں
آج پھر راس نہ آئی مجھے قربت میری

سنا ہے اب بھی مرے ہاتھ کی لکیروں میں
نجومیوں کو مقدر دکھائی دیتا ہے

ڈوبتے سورج پہ جو گزری مگر
شام کا منظر سنہرا ہو گیا

یقیں نہ آئے تو اک بار پوچھ کر دیکھو
جو ہنس رہا ہے وہ زخموں سے چور نکلے گا

باقی کے اس قول سے میں اتفاق کرتا ہوں کہ امیر قزلباش نئی غزل کو آگے لے جا رہا ہے اور اس کی شاعری میں ایک مکمل کردار کی شخصیت کا عکس ملتا ہے اور بلاشبہ امیر قزلباش نے اپنے پہلے مجموعے "بازگشت" کی اشاعت سے "انکار" کی اشاعت تک کے مختصر وقفے میں ذہنی ارتقا کی کئی منزلیں طے کر لی ہیں اور یقیناً خوب سے خوب تر کی تلاش میں ان کا سفر مسلسل جاری ہے۔

ناشر: نازش بک سنٹر، ترکمان گیٹ، دہلی،
قیمت: دس روپے،

——— انور کمال حسینی

سیر المصنفین (جلد اول)

مولفہ: مولوی محمد یحییٰ تنہا۔ ناشر: اشاعت ادب میرٹھ
ضخامت: ۲۹۵ صفحات۔ قیمت: ۱۵ روپے

مولوی محمد یحییٰ تنہا اس لحاظ سے اُردو کے اہم تذکرہ نگاروں میں ہیں کہ ۱۹۲۴ء میں انھوں نے اُردو نثر نگاروں کا پہلا تذکرہ "سیر المصنفین" کے نام سے مرتب کرکے تذکرہ نگاری کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ اور بعد کے تذکرہ نگاروں کے لیے ایک مثال قائم کی۔

دو حصوں پر مشتمل تنہا کا یہ تذکرہ اردو نثر نگاری کے تین ادوار کا احاطہ کرتا ہے۔ پہلا دور ۱۷۹۸ء سے ۱۸۳۶ء تک، دوسرا ۱۸۳۶ء سے ۱۸۵۷ء تک اور تیسرا ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک محیط ہے۔ جلد اول میں دو ادوار کے حالات تو آگئے ہیں مگر تیسرے دور کا احوال اس لیے شائع نہ ہوسکا کہ تنہا صاحب اس دور کے مصنفین کا صحیح مقام اور مرتبہ متعین نہ کرسکے۔ ساتھ ہی انھیں یہ بھی خیال تھا کہ اُن کی صاف گوئی سے کوئی دل برداشتہ نہ ہو۔

تنہا علی گڑھ تحریک کے موئیدوں میں تھے۔ انھوں نے اپنی نثر میں سرسید کے طرز بیان کی برجستگی، حالی کے اسلوب کی سادگی، شبلی کے طرز ادا کی شگفتگی اور مولوی محمد حسین آزاد کی نثر کی تازگی سے اکتساب فیض کیا ہے اور ان سب کے امتزاج سے ایک نیا طرز نکالنے کی کوشش کی ہے۔

یہ تذکرہ ابتدا ہی سے اہل علم و ادب کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا لیکن برسوں سے کمیاب بلکہ نایاب تھا۔ اس کے مولف کے حالات بھی پردۂ خفا میں تھے۔ ڈاکٹر امیر اللہ شاہین مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اسے ازسرنو مرتب کرکے شائع کیا اور اس پر ایک فاضلانہ مقدمے کا اضافہ بھی کیا۔ انھوں نے بہت سی دقتوں اور مشکلات کا سامنا کرکے تنہا کے حالات فراہم کیے جو ترک وطن کرکے پاکستان چلے گئے تھے۔ اس دُرِ نایاب کو منظر عام پر لانے کے لیے شاہین صاحب کو جن صبر آزما حالات سے دو چار ہونا پڑا ان کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ زیر نظر ایڈیشن میں کتابت کے مختلف نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں اور اُردو نشر و اشاعت کی دشواریوں کی طرف توجہ مبذول کراتے ہیں۔ کتاب میں کم و بیش پانچ کاتبوں کے قلم کا کمال نظر آتا ہے۔ کتابت کی غلطیاں بھی جھلک دکھاتی ہیں۔ تنہا کے جو حالات شاہین صاحب نے فراہم کیے ہیں وہ مستند ہیں مگر ان پر اضافے کی گنجائش محسوس کی جاسکتی ہے اور یہ کام نئے محققین کا ہوگا۔ شاہین صاحب نے ایک اہم کتاب کو دستبرد زمانہ اور ابنائے زمانہ کی تساہل پسندی کی نذر ہوجانے سے بچالیا اور اپنے مقدمے اور حواشی سے اس کی اہمیت بھی کچھ اور بڑھادی ہے۔

—— سید اختر الاسلام

پتھر کا شہزادہ

مصنفہ: صغرا مہدی۔ تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دلّی۔ دِلّی بمبئی۔ قیمت: چار روپے۔

صغرا مہدی اُردو کی نئی افسانہ نگار ہیں مگر ان کے جو افسانے اس کتاب میں شامل ہیں انھیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ پچھلے چند برس میں اُردو افسانے میں جو فنی تبدیلیاں آئی ہیں، ان سے یا تو وہ بے خبر ہیں یا اُن کی طرف سے انھوں نے مکمل بے نیازی برتی ہے۔ دونوں میں سے جو بھی صورت ہو قابل شکایت ہے۔ پھر روایتی افسانوی لوازم بھی وہ پوری طرح فراہم نہیں کرسکی ہیں مثلاً پلاٹ کا چست تانا بانا، کردار سازی، حالات و واقعات کی ایسی عکاسی جو پیش کی جانے والی صورتِ حال کو اس کے پورے تحرک کے ساتھ سامنے لائے یا چونکا دینے والا کلائمکس۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ ان افسانوں کو دلچسپی سے پڑھا نہ جاسکے۔ سلیس با محاورہ زبان اور اندازِ بیان کی سادگی اور بے ساختگی کا لطف لینے کے لیے کوئی اس

کتاب کو پڑھنا چاہے تو اسے مایوسی نہ ہوگی۔

——— رزاق ارشد

پرتو جمہور

مصنف: رشی پٹیالوی۔ ضخامت: ۹۶ صفحات، قیمت: آٹھ روپے۔ ملنے کا پتا: بیسویں صدی پبلیکیشنز دریا گنج دہلی

یہ جناب رشی پٹیالوی کی قومی اور وطنی نظموں کا وہ مجموعہ ہے جس پر محکمۂ السنہ پنجاب نے شاعر کو انعام سے نوازا ہے ان نظموں میں رشی صاحب نے ہمارے مذہبی اور قومی رہنماؤں، آزادیٔ وطن کے مجاہدوں اور اصلاح پسند دانشوروں کے پیغام کو اپنی زبان میں پیش کیا ہے اور رام، نانک، تلسی داس، گرو تیغ بہادر، امیر خسرو، مہاتما گاندھی جواہر لال نہرو، بھگت سنگھ، ٹیگور وغیرہ کی تعلیمات کو اپنے ہم وطنوں کے ذہن نشین کرانا چاہا ہے۔ جنھوں نے اتحاد، یگانگت یک جہتی اور باہمی میل ملاپ جیسی عظیم اقدار کے احیاء اور ان کی تبلیغ و اشاعت کے لیے اپنی زندگیاں وقف کردی تھیں یہ سبھی نظمیں فکر و عمل کی دعوت دیتی ہیں اور شاعرانہ محاسن کی بھی سامل ہیں۔

——— سید اختر الاسلام

نیا سویرا

مصنف: ریاضت علی شائق ایم اے۔ صفحات ۱۱۲، قیمت: پانچ روپے۔ ناشر: اردو مرکز، ۱۶۹۹ حویلی حسام الدین حیدر، بلیماران دلی۔

شائق معلم ہونے کے ساتھ ساتھ دلی یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر بھی ہیں اور شعر و شاعری میں بھی درک رکھتے ہیں۔ یہ ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے جس میں نظمیں، غزلیں اور قطعات شامل ہیں۔ انتساب ڈاکٹر قمر رئیس صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے نام ہے۔ ڈاکٹر جاوید وششٹ، مہدی نظمی اور ڈاکٹر عنوان چشتی کی حوصلہ افزا رائیں بھی شامل کتاب ہیں۔

مجموعہ میں ۳۲ نظمیں اور ۹ غزلیں شامل ہیں جن میں سے بیشتر حب الوطنی، مذہبی رواداری، قومی اتحاد و یگانگت اور ترقیاتی منصوبہ بندی جیسے موضوعات کو پیش کرتی ہیں کتاب کا سرورق، گیٹ اپ اور طباعت عمدہ ہیں قیمت بھی مناسب ہے۔

——— سید اختر الاسلام

شمع ہر رنگ میں .....

مصنف و ناشر: ایم باگاریڈی بی اے۔ ایل ایل بی صفحات ۱۲۸، قیمت: تین روپے۔ پتہ درج نہیں۔

اس کتاب میں ایم باگاریڈی صاحب کے ۱۴ سیاسی، ادبی اور طنزیہ مضامین شامل ہیں جن کا انتساب تعلقہ ظہیر آباد کے عوام کے نام ہے۔

آصف پاشاہ (وزیر قانون و مجالس آندھرا پردیش) کے پیش لفظ میں مصنف کا مختصر سا تعارف ملتا ہے اور پتا چلتا ہے کہ شری ریڈی اردو کے ایک پرانے اور بے لوث خادم ہیں۔ اردو کے لیے ان کی ذہنی اور جذباتی وابستگی کا یہ عالم ہے کہ اردو کو شری ریڈی نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا ہے حالانکہ یہ اُن کی مادری زبان نہیں ہے۔ اس کی تصدیق شری ریڈی کے خطبۂ صدارت "تحفظ اردو کانفرنس آندھرا پردیش" سے ہوتی ہے۔ اس خطبہ نما مضمون میں شری ریڈی نے بڑی معقولیت، سنجیدگی اور راستدلال کے ساتھ اُردو کا مقدمہ پیش کیا ہے۔ آندھرا پردیش میں اردو کے فروغ کے لیے جو مساعی کی گئیں ان کی جھلکیاں ان کے دوسرے مضامین میں بھی ملتی ہیں۔

شری ریڈی کے چار طنزیہ مضامین — بھکاریوں کی کل ہند کانفرنس، خدا بندے سے خود پوچھے، گدھے کی تاریخ اور رسما دھی بھی شاملِ کتاب ہیں۔ ان چاروں مضامین میں طنز و مزاح کے تیر و نشتر چھپے ہوئے ہیں جن کی تیزی، پڑھنے والا محسوس کیے بغیر نہیں رہتا۔

——— سید اختر الاسلام

بچوں کی چھ نئی کتابیں

۱۔ حاتم طائی کا قصہ۔ مرتب ڈاکٹر نورالحسن نقوی۔ قیمت ۵۰ - ۶
۲۔ چار درویش کا قصہ۔ " " " قیمت ۲۵ - ۳
۳۔ للی پٹ کا سفر۔ مرتب اطہر مترجم۔ ندیم قیمت ۱۰ - ۲
۴۔ اچھی چڑیا۔ مصنف شفیع الدین نیر قیمت ۰۰ - ۳
۵۔ بچوں کی نظمیں۔ مصنف جگن ناتھ آزاد قیمت ۰۰ - ۲
۶۔ ادب کسے کہتے ہیں۔ مصنف اطہر پرویز قیمت ۸۵ - ۱

یہ چھؤں کتابیں ترقی اردو بورڈ (مرکزی وزارتِ تعلیم و سماجی بہبود، ویسٹ بلاک ۸، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی) نے حال ہی میں شائع کی ہیں۔ اول الذکر دو کتابیں بالترتیب سید حیدر بخش حیدری کی "آرائش محفل" اور میر امن کی "باغ و بہار" کی تلخیصوں پر مبنی ہیں۔ ان قصوں کی تلخیص کرتے ہوئے نقوی صاحب نے ان کی زبان کو بھی آسان بنانے کی کوشش کی ہے تاکہ بچے ان کا مطالعہ استاد کی مدد کے بغیر کر سکیں اور مشکل الفاظ یا آج کے ماحول میں نامانوس محاورے اور کہاوتیں وغیرہ قصے کی دلچسپی میں رکاوٹ نہ بنیں۔ ابتدا میں نقوی صاحب نے اصل کتابوں کا مختصر تعارف بھی کرا دیا ہے اور یہ سفارش کی ہے کہ علمی استعداد میں اضافے کے ساتھ آگے چل کر ان سے براہ راست شناسائی پیدا کی جائے تو اچھا ہے کہ یہ ہمارے ادبی سفر کے اہم سنگ میل ہیں۔

"للی پٹ کا سفر" سوئفٹ کی مشہور کتاب "گلیور کا سفر نامہ" سے ماخوذ ہے۔ ایک قسم جو کی دلچسپ داستان جو کبھی بالشتیوں کی سرزمین پر جا نکلتا ہے، کبھی دیو نما انسانوں کی دھرتی پر اور اس طرح انسان کی نفسیات اور اس کی جبلی بوالعجبیوں کے مختلف مظاہر سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔

شفیع الدین نیر بچوں کے مقبول شاعر ہیں۔ "اچھی چڑیا" میں ان کی چھ طویل نظمیں شامل ہیں۔ ہر نظم ایک سبق آموز کہانی سناتی ہے۔ آخری دو نظمیں ایک سے دس تک کی جمع تفریق کو بچوں کے ذہن نشین کرانے کے خیال سے لکھی گئی ہیں، انداز یہاں بھی وہی کہانی کہنے کا ہے۔ جگن ناتھ آزاد صاحب نے ہندوستان کے قدرتی مناظر، یہاں کے تہواروں اور بعض روایتی کرداروں کی تصویریں اپنی نظموں میں پیش کی ہیں۔ یہ تصویریں ان رنگوں سے مزین ہیں جو بچوں کو بھلے معلوم ہوں اور ان کے دلوں میں کھب جائیں۔

"ادب کسے کہتے ہیں" میں اطہر پرویز صاحب نے کوشش کی ہے کہ ایسی زبان اور ایسے انداز میں ادب کی ایک عمومی تعریف پیش کر دیں جسے سمجھنا بچوں کے لیے بھی مشکل نہ ہو۔ انھوں نے جو کچھ کہا ہے مثالوں سے اس کی وضاحت کرتے گئے ہیں۔

چھؤں کتابیں آفسٹ پر چھپی ہیں۔ "اچھی چڑیا" کو چھوڑ کر سب کی کتابت اور طباعت خوشنما ہے لیکن کتابت کی غلطیاں سب میں مشترک ہیں۔ اس معاملے میں مزید توجہ کی ضرورت تھی۔ بصورت موجودہ یہ احتمال ہے کہ بعض الفاظ کا غلط تلفظ یا املا بچوں کے ذہن پر نقش ہو جائے۔ بعض جگہ ایسے جملے بھی نظر آتے ہیں جو لکھنے والے کی بے استطاعتی یا کم از کم بے پروائی کو ظاہر کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ دو جملے دیکھیے:

"یہ قسم کھانے کا عجیب طریقہ تھا یعنی دایاں پیر بائیں ہاتھ میں سیدھے ہاتھ بیچ کی انگلی کو سر کے بیچوں بیچ رکھ کر اور انگوٹھے کو کان کی لو پر رکھ کر یہ قسم دلوائی گئی۔"

(للی پٹ کا سفر، صفحہ ۱۲)

"اسی طرح جب آپ جو کچھ لکھنا چاہتے ہیں اس کو اگر آپ نے اپنے دماغ میں اچھی طرح تیار کر لیا ہے تو پھر اسے ضرور سب کے سامنے پیش کیجیے۔"

(ادب کسے کہتے ہیں۔ صفحہ ۳۰)

تحریر کا یہ نمونہ ان بچوں پر کیا اثر ڈالے گا جو ابھی زبان سیکھ رہے ہیں جبکہ تھوڑی سی توجہ سے ان جملوں کا بے ڈھنگا پن دور ہو سکتا تھا۔

—— محمود سعیدی

بزمِ احباب

★ آپ نے سوالنامے کا کالم بہت اچھا شروع کیا ہے میں نے بھی ان سوالوں کے کچھ جوابات تیار کیے ہیں۔ جنھیں آپ کی خدمت میں بھیج رہی ہوں۔ اگر آپ میرے ان خیالات کو کسی قابل سمجھیں تو ان کو منظرِ عام پر لادیجیے گا۔

۱۔ جدید ادب قدیم ادب سے کھلا انحراف ہے

۲۔ جدید ادب میں موضوعاتی تبدیلیوں سے زیادہ ہیئتی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔

۳۔ تنہائی کا احساس صنعتی پھیلاؤ کا ردِ عمل نہیں ہے بلکہ یہ تخلیقی ذہن کا ایک ایسا وصف ہے جس کا سماجی نظاموں سے محض نسبتی تعلق ہے۔ اور پھر یہ احساسِ تنہائی تو تخلیقی ذہنوں کو اس وقت بھی تھا جب یہ صنعتی پھیلاؤ نہیں تھا۔

۴۔ لوگوں کا یہ کہنا کہ ہر ادب تبلیغ ہوتا ہے بالکل غلط ہے۔ میرے خیال میں یہ لوگ تبلیغ اور ترسیل کو باہم خلط ملط کر رہے ہیں۔

۵۔ ترقی پسند ناقدین کا اب یہ کہنا کہ جدید ادب ترقی پسندی کی توسیع ہے اس میں کسی پسپائی کو دخل نہیں ہے بلکہ یہ نئے عرفان کی کارفرمائی ہے۔ کسی کی صلاحیتوں کو تسلیم کرنا اس کی اچھی باتوں کو ماننا یا اس کے اعلیٰ خیال و فکر کی تائید کرنا کسی طرح کی پسپائی کی علامت نہیں ہے بلکہ یہ فراخ دلی اور روشن خیالی کا ثبوت ہے۔

۶۔ ملک و قوم کی تعمیرِ جدید میں ادب بہت بڑا کردار ادا کر سکتا ہے۔ اور اس کے لیے انھیں بھگتی تحریک اور صوفی مت کے شاعروں کی طرح ایک نفسیانی ماحول تیار کرنا ہوگا۔ محض چند مخصوص نعروں کو نگارشات میں جگہ دے دینا ہی کافی نہیں ہوگا۔

۷۔ ادب کی یہ تعریف غلط ہے کہ ادب ناپسندیدہ جذبات کے پرامن اخراج کا ایک ذریعہ ہے۔ ادب کے چند ٹکڑے ناپسندیدہ جذبات کے پرامن اخراج کا ذریعہ ہو سکتے ہیں۔ لیکن سارا کا سارا ادب ناپسندیدہ جذبات کے پرامن اخراج کا ایک ذریعہ ہے۔ یہ کہنا اور سوچنا درست نہیں ہے۔

——— شہلا نگار شمسی

۴۴۔ ایم۔ سی۔ پی۔ ڈبلو۔ پی۔ ایم۔ سی۔ ایچ۔ پٹنہ۔ ۴

★ تحریک کے پچھلے دو شمارے نظر سے گزرے۔ آپ کا سوالنامہ اور اس کے بصیرت افروز جوابات نظر نواز ہوئے۔ پتہ نہیں اس محفلِ دانشوراں میں شمولیت ممکن بھی ہے یا۔۔۔ بہر حال جوابات حاضر ہیں یہ کسی قابل ہوں تو اپنی بزم میں گوارا کریں۔

۱۔ جدید ادب قدیم ادب سے انحراف نہیں۔ جدید ادب بنیادی قدروں کا حامل ہے غالب نے "صریرِ خامہ" کو "نوائے سروش" کہا ہے۔ نوائے سروش یا وجدان ایک ہی چیز ہے۔ گویا ادب کا بنیادی معیار وجدانی ہوتا ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ جب کبھی ادب نے اس راہ سے بھٹکنے کی کوشش کی ہے اپنے معیار سے گر گیا ہے۔ لیکن ادب صرف وجدانی ہونے سے ہی عظیم نہیں بن جاتا بلکہ اس میں فنکار کی شخصیت کی جھلک بھی ناگزیر ہوتی ہے۔

؎ انگلیاں فگار اپنی خامہ خوں چکاں اپنا

جب نوائے سروش بن کر خوں چکاں صریرِ خامہ بن کر صفحۂ قرطاس پر بکھرتی ہے تو معیاری ادب وجود میں آتا ہے۔ وجدان اور شعور کی یہی دلکش کیفیت جدید ادب میں بیش از بیش ملتی ہے۔ لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جدید ادب قدیم ادب کی تائید اور توسیع و ترجیح ہے۔

۲۔ جدید ادب کئی بے پناہ ہیئتی تبدیلیاں گراں گزرتی ہیں۔ ہیئتی تبدیلیوں اور موضوعاتی تبدیلیوں میں تناسب نہیں رہا ہے۔ ہیئتی تبدیلی ایک ابتلا بن چکی ہے۔ نظیر اکبرآبادی کی موضوعاتی اور ہیئتی دونوں تبدیلیاں اسے عظمت بخشتی ہیں۔ اقبال کے موضوعات نظیر سے زیادہ وسیع اور ہمہ گیر تھے مگر یہ اسی ڈگر پر نظر آتے ہیں جس کا تعین نظیر سے ہی ہو چکا تھا اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ کوئی نئی راہ تلاش کرنا معیوب ہے۔ بلکہ تناسب کا برقرار رکھنا ضروری ہے۔

۳۔ تخلیقی عمل کے وقت تخلیق کار ایک ایسی دنیا آباد کر لیتا ہے جہاں وہ بالکل ہی تنہا ہوتا ہے وہی تنہائی اسے عام لوگوں سے ممیز و ممتاز بھی کرتی ہے۔ خالق میر بھی تنہا تھا اقبال بھی —— اور خالق احمد ندیم قاسمی بھی ہیں —— لہٰذا زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ صنعتی پھیلاؤ نے احساسِ تنہائی میں شدت پیدا کر دی ہے۔

۴۔ ادب، اعلیٰ اخلاقی قدروں کی بڑی نازک اور لطیف تبلیغ ہے یہاں نعرہ بازی یا اشتہار بازی نہیں ہوتی بلکہ تبسم ریز جمالیات ہوتی ہے ترقی پسند اصطلاح میں تبلیغ اپنے بھونڈے پن اور سطحیت کی وجہ سے ادب سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتی۔ اور ترسیل؟ —— یہ بالکل الگ چیز ہے۔ ترسیل کی ذمہ داری فنکار اور قاری دونوں پر عائد ہوتی ہے۔

۵۔ جدید ادب ترقی پسند ادب کا ردِعمل ہے۔ جدید ادب کو ترقی پسند ادب کی توسیع قرار دینا احساسِ شکست کا نتیجہ ہے۔ ترقی پسندوں کو اب حقیقت مان لینی چاہیے اور نئی ادبی شاہراہ کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔

۶۔ اعلیٰ ادب عالمِ انسانیت کی فلاح و بہبود کا داعی ہوتا ہے۔ لیکن ادب یہ کام انتہائی غیر محسوس طور پر کرتا ہے۔ لیکن جب قوم تیزی کے ساتھ تباہی کی طرف بڑھ رہی ہو تو ادب کو بھی فعال ہو کر انسانی اقدار کی بحالی کے لیے کوشاں ہونا چاہیے۔ لیکن اشتراکی نظریہ ادب کی جو تعریف پیش کرتا ہے وہ بہرحال ناقابلِ قبول ہے۔

۷۔ ناپسندیدہ جذبات کیا ہیں؟ کون سے جذبات پسندیدہ ہوتے ہیں کون سے ناپسندیدہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ ادبی معیار سے کہی گئی بات کبھی بھی مریضانہ نہیں ہوتی اور نہ کبھی ادب ہی مریضانہ ہوتا ہے، ادب ادب ہوتا ہے اور بس۔

—— خورشید احمد خاں، شعبۂ اردو، میرزا غالب کالج، گیا

★ "تحریک" بابت ماہ اپریل موصول ہوا حسنِ اتفاق سے آج فرصت کا دن تھا شروع تا آخر پڑھ گیا منظومات میں بسمل سعیدی، انوار رضوی اور افسانوں میں "شطرنج، پرندے اور انقلاب" کو اچھا افسانہ کہا جا سکتا ہے "ننگا آدمی" بالکل بے لباس ہو گیا ہے۔ ہاں سوال نامے پر اظہارِ خیال کے تحت ڈاکٹر شکیل الرحمٰن نے کھل کر بحث کی ہے یوں تو اسے حاصلِ تحریک ہی کہوں گا۔ ڈاکٹر صاحب کو کافی عرصہ کے بعد دیکھا ہے۔ شوکت حیات صاحب نے بھی دلچسپ بحث کی ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ دیگر مشمولات محض بکواس نظر آئے۔

—— اعجاز اعظمی باتوسم، جالان بیٹالی۔ پورٹ ڈکسن، ملائشیا

★ تحریک مارچ ۷۷ء کا شمارہ موصول ہوا۔ سوالنامے پر اظہار خیال میں اب یکسانیت آنے لگی ہے۔ اس لیے میرا خیال ہے یہ سلسلہ بند کردیا جائے اور اس کی جگہ ایسے سوالات اٹھائے جائیں جو ادبی رسالوں کے فروغ و اشاعت میں معاون ثابت ہوں ـــ زیر نظر شمارہ کی تمام منظوم تخلیقات اعلیٰ معیار کی ہیں تبصرے بھی پسند آئے۔ افسانوی حصّہ میں سب سے اخیر میں پڑھتا ہوں، جب میز پر پڑھنے کے لیے کوئی اور چیز نہ ہو۔

ـــــ شان بھارتی، اجوا۔ دھنباد

★ سوالنامے کے جواب میں کم و بیش ایک جیسی رائیں آئیں گی۔ مجھے یہ سلسلہ بے سود لگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا آپ رائے شماری کروا رہے ہیں۔ مگر کچھ ذہنوں کو پڑھنے کا موقع ملے گا۔ ڈاکٹر قمر رئیس ایسے بھولے بھالے لگے گویا ابجد پڑھ رہے ہوں۔ وہاب دانش اکنی پر تول رہے ہیں دیکھیے یہ پنچھی کہاں بیٹھتا ہے۔

سچ پوچھیے تو مجھے بس ان دو حضرات کے خطوط پڑھ کر بڑا مزا آیا۔ قارئین کی تفریح کے لیے اس قسم کے حضرات کو بھی چھاپتے رہیے۔

ـــــ صفدر، اردو ہائی سکول، وارُد، ضلع امراؤتی

عروج زیدی کے خیال افروز قطعات
شمع فروزاں
قیمت: پانچ روپے

امیر قزلباش کے شعری مجموعے
بازگشت قیمت: چھ روپے
انکار قیمت: دس روپے
نیشنل اکاڈمی سے طلب کریں

خبرنامہ (بقیہ ص ۵)

صاحب نے فرمائی۔ بسمل صاحب نے کہا کہ "میری صحت اب اس کی اجازت نہیں دیتی کہ میں اس طرح کہیں آجا سکوں لیکن ایک تو وہ محبت جو علیم اختر مرحوم کے بچوں کے لیے میرے دل میں ہے اور دوسرے وہ تعلقِ خاطر جو خاندانِ سیماب کے ساتھ مجھے ہمیشہ رہا ہے، یہی دو چیزیں مجھے یہاں کھینچ لائیں۔" افتخار امام صاحب نے کہا کہ بسمل صاحب جیسے بزرگ اور محترم شاعر کے علاوہ جو دوسرے حضرات اس بزم میں شریک ہیں، ان کی یہاں موجودگی میرے لیے فخر اور مسرت دونوں کا موجب ہے اور میں اسے اپنی انتہائی عزت افزائی پر محمول کرتا ہوں۔ جناب افتخار امام اور بسمل سعیدی صاحب کے علاوہ جن شاعروں نے اس نشست میں اپنا کلام سنایا ان میں مخمور سعیدی، محسن زیدی، امیر قزلباش، عزیز وارثی، عظیم اختر، واجد سحری اور شہزاد اختر شامل تھے۔

دو ادبی حادثے

پچھلے دنوں اُردو دو اہم شخصیتوں سے محروم ہوگئی اور پروفیسر اختر اورینوی اور جناب صدرالدین فضا ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے۔ پروفیسر اختر اورینوی ایک ناقد کی حیثیت سے زیادہ شہرت رکھتے تھے لیکن انھوں نے افسانے بھی لکھے ہیں اور شاعری بھی کی ہے ان کے کلام کا ایک مجموعہ "انجمنِ آرزو" کے نام سے چند برس پہلے شائع ہوا تھا۔ صدرالدین فضا صاحب پٹنہ یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر تھے اور خوشگو شاعروں میں شمار ہوتے تھے۔ ہم مرحومین کے غم میں پوری اردو دنیا کے شریک ہیں اور خدا سے ان کی مغفرت کے خواستگار۔

خبرنامہ

● ۷ اپریل ۷۷ء کی شام کو ادبی سنگم فرید آباد (ہریانہ) کی طرف سے گولف کلب کے لان میں "گوپال متل کے ساتھ ایک شام" منائی گئی۔ تقریب کی صدارت جناب بال کرشن شرما بیتاب ایڈمنسٹریٹر ایف سی۔ اے۔ نے کی اور اس میں پاکستان سے آئے ہوئے مشہور و مقبول شاعر حفیظ جالندھری صاحب کے علاوہ جن شعرا نے شرکت کی ان کے اسمائے گرامی ہیں: کرشن موہن، حسن نعیم، شہاب جعفری، راج نرائن راز، باقی، مخمور سعیدی، کمار پاشی، چندر پرکاش شاد، حیات لکھنوی، امیر قزلباش، کرشن مراری، جوہر ادیب اور میزبان شعرا خموش سرحدی، بال کرشن بیتاب، اوم پرکاش لاغر، اوم کرشن راحت، انجم زیدی، کاشش رومانی، تارا سنگھ کومل اور محترمہ شیلی فرید آبادی۔

دلی سے جانے والے مہمانوں میں ظفر پیامی، شاہد پرویز، پریم گوپال متل اور کرشن گوپال متل بھی تھے۔

ادبی سنگم کے جنرل سیکرٹری ہربنس لال ساہنی نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ یہ پہلا موقع ہے جب فرید آباد میں اتنے نامور شاعر اور ادیب جمع ہوئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ آج کے مہمانِ خصوصی گوپال متل نہ صرف خود ایک اہم شاعر اور ادیب ہیں بلکہ انھوں نے اپنے رسالے کے ذریعے لکھنے والوں کی ایک پوری نسل کی تربیت بھی کی ہے۔ ان کے ساتھ ہی اردو شاعری کی عہد آفریں شخصیت اور پاکستان کے قومی شاعر حفیظ جالندھری بھی ہمارے درمیان موجود ہیں۔ دنیا میں جہاں جہاں اردو جاننے والے موجود ہیں وہاں حفیظ صاحب کے نام اور کلام کی بھی دھوم ہے۔

ساہنی صاحب کی خیر مقدمی تقریر کے بعد صدرِ جلسہ بال کرشن شرما بیتاب صاحب، ادبی سنگم کے عہدیداروں اور دوسرے ادب دوست حضرات نے گوپال متل صاحب اور حفیظ جالندھری صاحب کو ہار پہنائے۔ حفیظ صاحب کو گوپال متل صاحب نے بھی ہار پہنایا اور کہا کہ حفیظ صاحب نے اس وقت میری قدر افزائی کی جب مجھے کوئی نہیں جانتا تھا۔ اگر میں ادب میں کچھ کر سکا ہوں تو اس میں حفیظ صاحب اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر مرحوم کی حوصلہ افزائیوں کا بڑا دخل ہے۔ حفیظ صاحب نے متل صاحب کو محبت سے گلے لگاتے ہوئے کہا کہ "گوپال متل میرے لیے آج بھی وہی ہیں جو لاہور انار کلی، میرے دفتر میں مجھ سے ملنے آئے تھے۔ یہ اوّلیں ملاقات جسے چالیس سال سے اوپر ہونے کو آئے ہمارے اٹوٹ مخلصانہ مراسم کی ابتدا تھی۔ ان کی سادہ، باوقار اور بے باک شخصیت کا جو تاثر میرے قلب و دماغ پر ثبت ہوا تھا وہ آج بھی قائم ہے۔ ان کی شعر و شاعری ہو یا انشا پردازی میری نظر میں ہمیشہ قابلِ تحسین رہی۔ متل صداقت کے دوست ہیں۔ ان کے مشاہدے اور تجربے کے تاثرات نثر میں ہوں یا شعر کی صورت اختیار کریں، بے لوث خدمتِ انسانیت ہیں"۔

مشاعرے کی نظامت کے فرائض مخمور سعیدی نے انجام دیے۔ مشاعرہ رات دو بجے تک جاری رہا اور سبھی شعرا نے اپنا بہترین کلام سنا کر سامعین سے خوب خوب داد حاصل کی۔ حفیظ صاحب کو ایک بار مشاعرے کے درمیان میں اور ایک بار مشاعرے کے آخر میں کلام سنانے

کی زحمت دی گئی ۔ دونوں بار سامعین کے اصرار پر انھوں نے کئی کئی چیزیں سنائیں ۔
ادبی سنگم کے صدر کے ۔ کے ۔ بہل صاحب کی طرف سے شعرا اور سامعین کے شکریے پر یہ خوشگوار محفل اختتام کو پہنچی ۔

● ۱۰ اپریل ۷۷ء گورنمنٹ کالج نابھہ کی سالانہ تقریب میں آزاد گلاٹی کے نئے شعری مجموعے "دشتِ صدا" کا اجرا پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ کی وائس چانسلر مسز آئی ۔ کے سندھو نے کیا ۔ اس موقع پر پروفیسر گوردیجن سنگھ نے کہا کہ اس کالج کو آزاد گلاٹی کی ذات پر ناز ہے ۔ انھوں نے کہا کہ یوں تو آزاد صاحب انگریزی ، ہندی اور پنجابی میں بھی لکھتے ہیں ، لیکن اُردو خصوصاً اردو شاعری ، اُن کا پہلا عشق ہے اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں نے ہندو پاک کے مشہور ناقدوں کو متوجہ کیا ہے ۔ وہ نئی غزل کے نمائندہ شعراء میں سے ہیں اور "دشتِ صدا" جس کی اشاعت کے لیے پنجاب سرکار کے محکمہ السنہ نے دو ہزار روپے دیئے ہیں اور جسے اتر پردیش اُردو اکاڈمی لکھنؤ نے حال ہی میں پانچ صد روپیہ کا انعام بھی دیا ہے ، اُن کے شعری سفر کا ایک موڑ ہے — منزل نہیں ۔
مسز سندھو نے آزاد گلاٹی کو "دشتِ صدا" کی اشاعت پر مبارک باد دیتے ہوئے فرمایا کہ اُردو ایک لطیف زبان ہے اور اس کی اَن گنت خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں پنجاب کے تہذیب و تمدن سے متعلق بھی کئی شہ پارے ہیں ۔ انھوں نے اس بات پر دُکھ کا اظہار کیا کہ یہ زبان پنجاب کی درسگاہوں سے لگ بھگ غائب ہو چکی ہے ۔ انھوں نے فرمایا کہ اسے بہر حال زندہ رکھنا ہے تاکہ آنے والی نسلیں اس کے ادبی اور ثقافتی سرمایہ سے محروم نہ رہ جائیں ۔
آزاد گلاٹی نے کہا کہ اس کالج اور نابھہ کے ماحول سے ان کی شعری صلاحیتوں نے جِلا پائی ہے اور ان سے وابستگی اُن کی زندگی کا بیش بہا سرمایہ ہے ۔ انھوں نے پرنسپل صاحب ، اور ہم کار ساتھیوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ان کے فیض و کرم ہی سے انھیں ایسی فضا میسر ہوئی ہے جس میں وہ تخلیقی کام کر سکے ہیں ۔

● ۲۹ مارچ کو بزمِ سیماب دہلی کے صدر ضیا فتح آبادی صاحب کے مکان پر بزم کی ایک خصوصی نشست ہوئی جس میں اولاً حضرات رشید احمد صدیقی ، کرشن چندر اور طالب باغ پتی کی وفات پر اظہار رنج کیا گیا اور شرکا نے دو منٹ خاموش کھڑے ہو کر مرحومین کی روحوں کو خراجِ عقیدت پیش کیا ۔ زاں بعد گوپی ناتھ امن صاحب کے حکومتِ ہند کی طرف سے پدم بھوشن کے اعزاز سے نوازے جانے پر اور جناب اعجاز صدیقی کو مہاراشٹر اُردو اکاڈمی کی طرف سے ، ڈاکٹر یوسف حسین خاں اور جناب عرش ملسیانی کو دلی ایڈمنسٹریشن کی طرف سے ، جناب دیوندر ستیارتھی اور جناب ساحر لدھیانوی کو پنجاب سرکار کی طرف سے اور بزم کے سیکریٹری رادھا کرشن سہگل کو اتر پردیش اردو اکاڈمی کی طرف سے انعام و اعزاز دیے جانے پر مبارکباد بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا ۔
آخر میں ایک غیر طرحی مشاعرہ ہوا جس میں مہمان شعرا تاباں ضیائی اور اثر شفائی کے علاوہ ضیا فتح آبادی ، راج نرائن راز ، رام پرکاش راہی ، سرشار ہوشیار پوری ، بلراج حیرت ، ستیہ نند جاوا ، اوم پرکاش بجاج ، رادھا کرشن سہگل اور دیگر کئی حضرات نے اپنا کلام سنایا ۔

● جناب اعجاز صدیقی کے صاحبزادے اور اردو کے نوجوان شاعر افتخار امام صدیقی ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے دلی آئے تو انھیں خوش آمدید کہنے کے لیے ۲۵ مارچ کو جناب عظیم اختر نے اپنے مکان پر ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا ۔ جنابِ افتخار امام صدیقی کی دلی میں یہ پہلی آمد تھی ۔ نشست کی صدارت سہیل سعیدی
باقی صفحہ ۳

گوپال مِتّل کی دو مشہور و مقبول تصانیف
لاہور کا جو ذکر کیا
ادبی اور سیاسی یادداشتوں کی حکایتِ لذیذ
غیر منقسم پنجاب کی کہانی ——— گوپال مِتّل کی زبانی
وکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
دوسرا ایڈیشن ——— قیمت . دس روپے
صحرا میں اذان
شعری مجموعہ
اُردو شاعری کی مستحکم اور معتبر آواز
آفسیٹ کی خوشنما طباعت
قیمت : آٹھ روپے
کرشن موہن کے شعری مجموعے جو خواص و عوام میں یکساں مقبول ہیں
شیرازۂ مژگاں ○ گیان مارگ کی نظمیں ○ کوئے ملامت
قیمت : دس روپے
قیمت : دس روپے
قیمت : دس روپے
مخمور سعیدی کے شعری مجموعے، جدید شاعری میں فکری توازن کی ایک روشن مثال
آواز کا جسم
قیمت : دس روپے
سب رنگ
قیمت : پانچ روپے
سیہ بر سفید
قیمت : چھ روپے
گفتنی
قیمت : چار روپے
نیشنل اکاڈمی، ۲/۹ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

پنجاب اور آندھرا کی لائبریریوں کے لیے منظور شدہ

ماہنامہ تحریک نئی دہلی

DR. ZAKIR HUSAIN LIBRARY JAMIA NAGAR NEW DELHI

جلد : ۲۵ شمارہ
جولائی ۱۹۷۶ء

ادارۂ تحریر:

گوپال متل ☆ مخمور سعیدی

پریم گوپال متل

سالانہ قیمت: پندرہ روپے، فی کاپی: ایک روپیہ ۲۵ پیسے

بیرونی ممالک سے

سالانہ: دو پونڈ (بحری ڈاک سے) فی کاپی: چار شلنگ

خط وکتابت اور ترسیل زر کا پتا:

منیجر ماہنامہ تحریک، ۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر:

گوپال متل

مطبع: نعمانی پریس دہلی

مقام اشاعت: ۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

مندرجات:

سوالنامے پر اظہارِ خیال کا سلسلہ اس شمارے سے ختم کیا جا رہا ہے۔ اگلے شمارے میں گوپال متل شائع شدہ جوابات پر اپنے خیالات پیش کریں گے۔

گوپال متل — شری راجیشور راؤ اور اُن کے مشیرانِ اعزازی

ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر شری راجیشور راؤ کے اس واضح اعلان کے باوجود کہ "ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی ایک بین الاقوامی تحریک کا جزو لاینفک ہے" بعض غیر کمیونسٹ لیڈر اور سیاسی مبصر سی۔ پی۔ آئی۔ کو یہ مشورہ دینے پر بضد ہیں کہ مغربی کمیونسٹ پارٹیوں کی طرح وہ بھی مخلصانہ طور پر پارلیمانی نظام کو مان لے اور ماسکو کی ماتحتی سے آزاد ہو جائے۔

سی۔ پی۔ آئی۔ کے یہ اعزازی مشیر اپنا مشورہ دیتے وقت یہ بات بھول جاتے ہیں کہ ماسکو اور مشرقی یورپ کی کمیونسٹ پارٹیوں کے نزدیک مغربی کمیونسٹ پارٹیوں کی روش ناقابل قبول ہے۔ اس نظر سے دیکھا جائے تو سی۔ پی۔ آئی۔ کا رویّہ ناقابلِ فہم نہیں رہتا۔

چیکوسلواکیہ کی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے ایجی ٹیشن اور پروپیگنڈے کے شعبے کے افسرِ اعلیٰ واصل بجادا نے پارٹی کے اخبار "روڈے پراوو" کی ۱۲ نومبر ۱۹۷۶ء کی اشاعت میں غیر مبہم انداز میں لکھا تھا کہ سوشلزم کو سوویٹ یونین سے جو انقلابی قوتوں کے کیمپ کا افسرِ اعلیٰ ہے اور عالمی سوشلزم کی تقدیر کا مالک ہے، کسی طرح بھی الگ نہیں کیا جا سکتا۔ بجادا نے ان کمیونسٹوں پر کڑی تنقید کی تھی جو بین الاقوامی پرولتاریہ کے تصورات کو فرسودہ قرار دے کر ان کی مخالفت کرتے ہیں۔ اس کے نزدیک عالمی انقلابی عمل کو صرف خود مختار قومی انقلابوں کا مجموعہ سمجھنا اور اسے سوویٹ یونین سے وابستہ نہ رکھنا کمیونسٹ وحدت کو کمزور کرنا ہے جس کا نتیجہ ترمیم پسندی اور انحراف کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد مغربی کمیونسٹ رجحان پر کئی مقتدر حضرات کی طرف سے حملے ہوئے۔ بورس پونوماریو سوویٹ کمیونسٹ پارٹی کا سیکریٹری اور پولٹ بیورو کا امیدوار ممبر ہے۔ سوویٹ جریدے "کوموسٹ" کے ۱۹۷۶ء کے سترھویں شمارے میں اس نے واضح طور پر کہا ہے کہ کمیونسٹوں کے لیے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ اصلاح کیشانہ اور سوشل ڈیموکریٹک تصورات کو اپنا لیں۔ اس کے نزدیک مارکسسٹوں اور لیننسٹوں کا یہ یقین ہے کہ سرمایہ داری کے موجودہ کرائسس نے اس حقیقت کو اور بھی واضح کر دیا ہے کہ بورژوا نظام کی خامیاں چھوٹی موٹی تبدیلیوں سے دور نہیں ہو سکتیں۔

میڈرڈ کی میٹنگ سے ذرا پہلے یکم مارچ کو "پراودا" نے بڑے شدّ و مد سے لکھا کہ یہ سمجھنا سادہ لوحی ہے کہ محنت کش طبقے کی انتخابی فتح ایک ایسی ریاست کو وجود میں لا سکتی ہے جو اس طبقے کے مقاصد کی تکمیل کرے کیونکہ حقیقی طاقت تو ان کے ہاتھ ہی میں رہے گی جو اقتصادی نظام کی چوٹی پر ہیں یا ریاستی نظام پر جن کا قبضہ ہے۔ یہ سب بورژوا طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ محنت کش طبقے کو کامیابی تبھی حاصل ہو سکتی ہے جب پارلیمنٹ کی سرشت کو بدل کر اسے مزدوروں کے مفادات کا مظہر بنا دیا جائے۔ تاریخ نے ثابت کر دیا ہے کہ بورژوا ریاست اور بورژوا جمہوریت کی حدود میں رہ کر سوشلزم کا حصول ناممکن ہے۔

شری راجیشور راؤ کے لیے جو سی۔ پی۔ آئی۔ کو بین الاقوامی کمیونسٹ تحریک کا جزو لاینفک سمجھتے ہیں،

یہ ناممکن ہے کہ ان ہدایات کو نظرانداز کرکے اپنے
ہندوستانی مشیروں کی بات مان لیں۔ شری راجیشور
راؤ کا موقف لینن کے بھی موقف کے مطابق ہے جسے
سبھی کمیونسٹ واجب التعظیم سمجھتے ہیں۔ لینن نے دو ٹوک
لکھا ہے:-

"کمیونسٹوں کے نزدیک کوئی پارلیمنٹ کسی
بھی محنت کش طبقے کی حالت میں اصلاح کی
جدوجہد کا میدان نہیں ہو سکتی۔ سوال صرف
یہ ہے کہ بورژوا ریاست کے اداروں کو خود
اسی کی تخریب کے لیے استعمال کیا جائے۔"

یہ بات بھی محلِ نظر ہے کہ مغربی ممالک کے کمیونسٹ
ان دنوں جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ واقعی خلوصِ دل سے
کہہ رہے ہیں یا وہ اسی حکمتِ عملی سے کام لے رہے ہیں
جسے چیکوسلواکیہ، پولینڈ اور ہنگری کے کمیونسٹوں نے
اس صدی کے چوتھے دہے میں اپنایا تھا۔ ان ملکوں کے
کمیونسٹ ان دنوں اسی قسم کے نعرے بلند کر رہے
تھے جو آج کل مغربی ملکوں کے کمیونسٹ بلند کر رہے
ہیں اور یہ نعرے انھوں نے اس شدومد سے بلند
کیے تھے کہ صرف دانشور ہی نہیں بلکہ خود امریکہ کے صدر
روزویلٹ بھی دھوکا کھا گئے تھے۔ نتیجہ سب کو معلوم ہے کہ
مشرقی یورپ کے ممالک اپنی آزادی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

چیکوسلواکیہ کی کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر کلیمنٹ
گوٹیوالڈ نے مئی ۱۹۴۵ء میں کہا تھا: "کمیونسٹ پارٹی کو یہ
بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ہم ایک قومی اور جمہوری
انقلاب کی راہ پر گامزن ہیں" اور پولینڈ کی کمیونسٹ
پارٹی کے سکریٹری ولاڈیسلاو گومولکا نے ۱۹۴۶ء
میں کہا تھا: "پولینڈ میں پاپولر جمہوریت، پرولتاریہ
کی ڈکٹیٹرشپ نہیں۔ ہماری جمہوریت سوویٹ جمہوریت
سے مختلف ہے" اور اسی برس ہنگری کی کمیونسٹ
پارٹی کے سکریٹری متیاس راکوسی نے کہا تھا: "گزشتہ
۲۵ برس میں دنیا کی کمیونسٹ پارٹیوں نے یہ سبق سیکھ
لیا ہے کہ سوشلزم کی منزل تک پہنچنے کی مختلف راہیں
ہیں۔ اگر ہم خود اپنی راہ اختیار نہیں کریں گے تو سوشلزم
کی تکمیل نہیں کر سکیں گے۔ اپنی راہ ہمیں اپنے ملک کے
مخصوص ماحول کو پیشِ نظر رکھ کر متعین کرنی چاہیے۔ اپنا سبق
ہمیں اچھی طرح یاد ہے۔ اگر ہم ہنگری میں جمہوریت کو تقویت پہنچا رہے
ہیں تو یہ کسی خفیہ مقصد یا خاص حکمتِ عملی کے تحت نہیں
بلکہ ایسا ہم کمیونزم میں اپنے گہرے وشواس کی بنا پر
کر رہے ہیں۔"

یورپ کے وہ جمہوری اور سوشلسٹ حلقے جنھیں
سیاست کا براہِ راست تجربہ ہے، اب مغربی کمیونسٹوں
کے خوشنما نعروں سے دھوکا کھانے کے لیے تیار نہیں۔
مثال کے طور پر برطانیہ کی فیبین پارٹی نے، جس نے
سوشلسٹ تصورات کے فروغ میں اہم حصہ لیا ہے،
حال ہی میں "یورپ میں سوشلسٹ ڈیموکریسی" کے نام
سے ایک کتابچہ شائع کیا ہے جس کے مصنف انتھونی
کراس لینڈ ہیں۔ وہ اس پمفلٹ میں لکھتے ہیں: "یہ
باور کرنا انتہائی غلط ہے کہ اٹلی کے کمیونسٹ باقی ملکوں
کے کمیونسٹوں سے بنیادی طور پر مختلف ہیں۔ اٹلی کے
جمہوری، چاہے وہ یساری ہوں، چاہے یمینی، ایک
تباہ کن غلطی کے مرتکب ہوں گے اگر انھوں نے یہ باور
کر لیا کہ کمیونسٹ جس تاریخی مفاہمت کی تجویز پیش کر رہے
ہیں۔ اسے وہ عملی جامہ بھی پہنائیں گے۔ یہ تصور کرنا غلط
ہے کہ اٹلی کی کمیونسٹ پارٹی برسرِ اقتدار آگئی تو وہ جمہوری
اصولوں کا تحفظ کرے گی۔ اٹلی میں ایسے کمیونسٹ دورِ حکومت
کا تصور ناممکن ہے جس میں شہری آزادیاں اور پریس کی آزادی
بتدریج ختم نہ ہو جائے۔ میں یہ تصور نہیں کر سکتا کہ ایک مارکسسٹ
پارٹی جمہوری طریقوں سے برسرِ اقتدار آجائے تو وہ اپنی طاقت
کو پھر سے آزمانے کے لیے دوبارہ کبھی انتخاب کرائے گی۔ اس قسم کا تصور
پرولتاری ڈکٹیٹرشپ کے مارکسی فلسفے کے منافی ہی نہ ہوگا بلکہ کمیونسٹ
نقطۂ نظر سے خالص احمقانہ اقدام بھی ہوگا، اور کمیونسٹوں کو آپ
جو چاہیں کہہ لیں وہ احمق ہرگز نہیں ہیں۔"

ستیہ پرکاش | ہندوستان کے بارے میں سوویٹ یونین کے غلط اندازے

کمیونسٹوں کا دعویٰ ہے کہ مارکسزم/لینن ازم ایک ایسا نظریہ ہے جو صرف حالیہ سیاست ہی نہیں بلکہ آئندہ پیش آنے والے حوادث کی تشریح و تعبیر میں بھی مکمل رہنمائی کر سکتا ہے۔ لیکن اس نظریے پر مکمل عبور حاصل ہونے کے باوجود سوویٹ رہنما ہندوستان کے معاملے میں زبردست دھوکا کھا گئے۔

مسز گاندھی کی حکومت کے ساتھ روابط کی بنا پر انھوں نے ہندوستان میں ایمرجنسی کی پوری حمایت کی۔ روسیوں نے اپوزیشن لیڈروں کی گرفتاری کی صرف حمایت ہی نہیں کی بلکہ انھیں فاشسٹوں اور وطن دشمنوں کا نام بھی دیا۔ دسمبر ۱۹۷۵ء میں پٹنہ کے مقام پر جو بین الاقوامی اینٹی فاشسٹ کانفرنس ہوئی اس میں سوویٹ روس اور مشرقی یوروپ کے کمیونسٹ ممالک نے سرگرم حصہ لیا۔ ۱۴ جنوری ۱۹۷۶ء کے "نیو ایج" کے مطابق جو کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کا سرکاری آرگن ہے، ان غیر ملکی ڈیلی گیٹوں نے ایک اعلان نامہ جاری کیا جس میں یہ الزام لگایا گیا تھا کہ "ہندوستان کی یمینی رجعت پسند فاشسٹ طاقتیں جن سنگھ کی رہنمائی میں ہندوستان کی خود مختاری اور قومی آزادی کو خطرے میں ڈال رہی ہیں۔"

اپوزیشن لیڈروں پر سوویٹ حملے انتخابی مہم کے آخری مرحلے تک جاری رہے۔ ریڈیو پیس اینڈ پروگریس نے ۱ مارچ ۱۹۷۷ء کو جنتا پارٹی کے لیڈروں کی یہ کہہ کر مذمت کی کہ وہ سامراج کے ایجنٹ ہیں۔ سی۔ پی۔ آئی کے ماہر نظریہ موہت سین نے اپنی ایک تقریر میں جو "ورلڈ مارکسسٹ ریویو" میں شائع ہوئی ہے ہندوستان میں جمہوری رائے عامہ پر پابندی کو "لوڈ ڈاؤن" (؟) الزام قرار دیا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ جب سی۔ پی۔ آئی کا پبلشنگ ہاؤس اپنے پرچے بدستور شائع کر رہا ہے تو جن سنگھ کے پبلشنگ ہاؤس کو بند کر دینے کو غیر جمہوری اقدام کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟

کانگریس کی شکست تک سوویٹ یونین ہندوستان میں شہری آزادیوں پر پابندی کی حمایت کرتا رہا۔ جون ۱۹۷۶ء کے "سوویٹ ریویو" میں شائع شدہ موہت سین کے ایک مضمون کے مطابق "جب ایمرجنسی کے اعلان سے خطروں کی روک تھام کے لیے احتیاطی کارروائی کی گئی تو ایک بار پھر ہم نے محسوس کیا کہ سوویٹ یونین اور دوسری سامراج دشمن طاقتیں ہمارے ساتھ ہیں۔" موہت سین کے نزدیک یہ وحدت "بے بہا تھی جس کی بدولت ہمیں فتح حاصل ہوئی۔ اس سے مناسب سماجی تبدیلیوں کے لیے داخلی جمہوری قوتوں کو بھی بڑھاوا ملا اور سامراج دشمنی کو بھی۔" ریڈیو پیس اینڈ پروگریس نے ۸ مارچ کو حکمراں کانگریس کی اہم سماجی اور اقتصادی کامیابیوں کا ذکر کیا اور اس سلسلے میں آئین میں جو ترمیمات کی گئی تھیں ان کا خاص طور پر ذکر کیا۔

ظاہر ہے کہ حکمراں کانگریس پارٹی کی حمایت اور اپوزیشن لیڈروں کے خلاف دشنام طرازی سوویٹ لیڈروں نے اس بصیرت کی بنا پر ہی کی ہوگی جو انھیں مارکسزم/لینن ازم کے نظریے سے حاصل ہوئی۔ اب اس کو کیا کیا جائے کہ اس بصیرت کی بنا پر انھوں نے جو نتائج اخذ کیے تھے وہ غلط ثابت ہوئے اور کانگریس کے بجائے [illegible] آنے کی بجائے جنتا پارٹی برسر اقتدار آ گئی۔ جس کے بیشتر لیڈروں کو انھوں نے فاشسٹ اور سامراج کے

ایجنٹ قرار دیا تھا۔ اسے حالات کی ستم ظریفی ہی سمجھیے کہ ۲۵ اپریل سے ۲۷ اپریل ۱۹۷۷ء تک جب سوویٹ وزیر خارجہ گرومیکو نے ہندوستان کا دورہ کیا تو ان کے میزبان وہی اٹل بہاری واجپئی تھے جو پہلے فاشسٹوں اور سامراجی ایجنٹوں کی فہرست میں شامل تھے۔ اس ملاقات کا مقصد جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا ماضی کی تلخیوں کو کم کرنا تھا۔ لیکن جیسا کہ مدراس کے مشہور اخبار "ہندو" نے اپنی ۲۷ اپریل کی اشاعت میں لکھا تھا۔ سوویٹ روس ہندوستانی سیاست میں جانبداری کا جو ننگا کھیل کھیلتا رہا ہے اسے بھلانے کے لیے اسے بہت کچھ کرنا پڑے گا۔ بہر حال سوویٹ روس بطور تلافی کچھ ہی کرے، ہندوستان کی موجودہ حکومت کو یہ یقین دلانے میں کامیاب نہ ہوسکے گا کہ صرف سوویٹ روس اور مشرقی یورپ کے کیمونسٹ ممالک ہی اس کے دوست ہیں۔ ہندوستان کے قائمقام صدر نے پارلیمنٹ میں برملا اعلان کیا ہے کہ یہ ملک اب "حقیقی ناوابستگی" کی پالیسی پر عمل پیرا ہوگا۔ وزیر اعظم شری مرارجی ڈیسائی کا کہنا ہے کہ ہندوستان سبھی ملکوں کے ساتھ مساوات کی بنیادوں پر دوستی کی راہ اختیار کرے گا اور کسی ملک کی طرف اس کا خصوصی جھکاؤ نہ ہوگا۔

●●

لاہور کا جو ذکر کیا
غیر منقسم پنجاب کی کہانی گوپال متل کی زبانی
دوسرا ایڈیشن ——— قیمت: دس روپے

گیان مارگ کی نظمیں
کرشن موہن کی شاعری کا نیا انگ
دوسرا ایڈیشن جو آفسیٹ کے طریقے سے چھاپا گیا ہے
قیمت: دس روپے

حساب رنگ
بانی کی فکر انگیز غزلیں اور نظمیں
قیمت: پندرہ روپے

خوشبو کا خواب
پریم واربرٹنی کی خوبصورت اور خوب سیرت شاعری
قیمت: پندرہ روپے

رُو بہ رُو
کمار پاشی کا غزلیہ کلام۔
قیمت: دس روپے

اُڑان
شباب للت کی شاعرانہ فکر کی نئی پرواز
قیمت: چھ روپے

یادوں کے سائے
ممتاز میرزا کی منتخب غزلیں
قیمت: بیس روپے

سازِ رگِ جاں
کرشن مُراری کی غزلیں، نظمیں، قطعات اور دوہے
قیمت: دس روپے

نئے عہد نامے کی سوغات
فیاض رفعت کے منتخب افسانے
قیمت: دس روپے

سخاروف نے کہا
نوبل انعام یافتہ سائنسداں الیگزنڈر ڈی سخاروف کی تقریریں اور بیانات۔
قیمت: سات روپے

نیشنل اکاڈمی، ۹ انصاری مارکیٹ، دریا گنج نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲

حفیظ جالندھری | غزل

یہ آذر دور ہے۔ اب آذر کچھ نہ فرمائے
مگر حفیظ کو یہ بات کون سمجھائے

پری رخوں کی زباں سے کلام سن کے مرا
بہت سے لوگ مری شکل دیکھنے آئے

وفا کے جوش نے ہر اک نفس کیا مدہوش
قدم قدم پہ مجھے دوست ہوش میں لائے

بہشت میں بھی ملا ہے مجھے عذابِ شدید
یہاں بھی مولوی صاحب ہیں میرے ہمسائے

یہ جس کا نام مقدر ہے۔ جبر ہے دراصل
حفیظ اس پہ بجز صبر کیا کیا جائے

حفیظ جالندھری
۲۱ [illegible]

[illegible]

غزل

کرشن موہن

یاس و غم میں اے مِلن کی آس کے آنسو چمک
عقل کی ظلمت میں اے احساس کے جگنو چمک

دل رہینِ یاس ہے، محسوس ہوتی ہیں اداس
چاندنی، شوخی، حیا، شبنم، ادا، خوشبو چمک

پھیکی پھیکی، بے مزہ، بے نور سی ہے زندگی
عشق کی شوخی دمک اے حسن کے جادو چمک

اپنی چنچلتا سے میرے پیار کو چمکا گئی
تیرے البیلے، نشیلے روپ کی دلجو چمک

ہار کر تدبیر نے تقدیر سے کہہ ہی دیا
مان بھی جائیں تو چمکی ہوں بہت، اب تو چمک

زندگی میں ہو کبھی تو کوئی ہنگامہ بپا
جذبۂ آوارہ و شوخِ دلِ یکسو چمک

ایسے چمکاتا ہے قلبِ زار کو تیرا خیال
جیسے دشتِ تیرہ کو دے دیدۂ آہو چمک

چیرنا ہے بے حسی کی گہری ظلمت کو تجھے
اور ابھی اس طور سے اے دشنۂ ابرو چمک

تیرے تیور زیورِ احساس ہیں، الماس ہیں
یاد کے گہرے ہیں سوز و کاوشِ پہلو چمک

اے فسونِ راز، جلوت ساز اے خلوت نواز
پیار کی آواز، پائے ناز کے گھنگھرو چمک

کرشن موہن کے دکھی من پر اندھیرا چھا گیا
روپ کی دھوپ، اے برہ کے درد کی دارو چمک

▲▲

صفدر | وشکرولی ولاتکفرون

آسماں پر گرم سورج کے بھیانک قہقہے
دوڑتی تھیں زہر لہریں سانس گھل کر کون لے
آگ کے دریا رواں سب شاہراہیں راستے
جل رہی تھیں دھوپ کی بارش میں ساری کھیتیاں
سر اٹھائے زرد رُو سوکھی نکیلی جھاڑیاں
اور اِن کے درمیاں
ناچتی تھیں بے حیا کم ظرف ننگی ڈائنیں
چیخ بد روحیں سنیں کیا ؛ طے کیا چپکے رہیں
بے زبانی کی وساطت سے کہیں
جوڑ کر دستِ سوال :
اے خدائے ذو الجلال !
ختم تجھ پر ہر کمال
ساعتیں پھیلا رہی ہیں موت کی نیندوں کا جال
جاگتی جیتی مگر اک تیری ذات
روز روشن ہو کہ رات
اِک فقط تجھ کو ثبات
کون دے گا ماسوا تیرے نجات !
ابر بن کر سایہ کر دے
سبز کر دے کھیتیاں
آ ——! ہماری سوچ میں آ
تو ہمارے ہاتھ ہو جا ! تو زباں !
خالقِ ارض و سما !

●

نرم مٹی کی ردا سر سے ہٹائے
دیکھتی ہیں کونپلیں پلکیں اُٹھائے
اب کسانوں کا تصور جھومتا ہے بالیاں
مُسکرا، آنکھیں ملا، شرمائے ہیں گھر والیاں
سج رہی ہیں تھالیاں
بج رہی ہیں تالیاں
ہنس رہی ہیں گا رہی ہیں سالیاں
اب دُعائیں ہو گئی ہیں میٹھی میٹھی گالیاں

آسماں پر اے خدا تیرا جلال
اور زمیں میری ہوئی گہوارۂ امن و اماں
پاک بد روحوں سے ہے میرا جہاں

▲▲

اُردو ہائی اسکول، لبرڈ ۔ ۴۴۴۴۹۰۱ ضلع امراوتی (ایم ۔ ایس)

سوالنامے پر اظہارِ خیال

۱۔ جدید ادب، قدیم ادب سے انحراف ہے یا اُس کی بنیادی اقدار کی بحالی؟

۲۔ جدید ادب میں ہیئتی تبدیلیوں اور موضوعاتی تبدیلیوں کی تناسبی اہمیت کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

۳۔ تنہائی کا احساس صرف صنعتی پھیلاؤ کا ردِ عمل ہے یا یہ ایک تخلیقی ذہن کا ایسا وصف ہے جس کا سماجی نظاموں سے محض نسبتی تعلق ہے؟

۴۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ہر ادب تبلیغ ہوتا ہے کہیں یہ لوگ تبلیغ اور ترسیل کو باہم خلط ملط تو نہیں کرتے؟ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

۵۔ جدید ادب کو ایک مدت تک معتوب کرنے کے بعد ترقی پسند ناقد اب اسے ترقی پسندی کی توسیع قرار دینے لگے ہیں۔ اس میں کسی نئے عرفان کو دخل ہے یا یہ پسپائی کا اعتراف ہے؟

۶۔ کیا ملک و قوم کی تعمیرِ جدید میں ادب کوئی کردار ادا کر سکتا ہے؟ جواب اثبات میں ہو تو اس سلسلے میں ادیبوں کو بھگتی تحریک اور صوفی مت کے شاعروں کی طرح ایک نفسیاتی ماحول تیار کرنا چاہیے یا چند مخصوص نعروں کو اپنی نگارشات میں جگہ دینا بھی ان کے لیے ضروری ہے؟

۷۔ ادب کی تعریف بعض لوگوں نے یہ بھی کی ہے کہ یہ ناپسندیدہ جذبات کے پُرامن اخراج کا ایک ذریعہ ہے۔ اگر ایسا ہے تو اس ادب کو بھی سماجی غرض نے کا حامل ماننا پڑے گا جسے بالعموم مریضانہ ادب کہا جاتا ہے۔ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟

وارث علوی

سید دائرہ، استوڑیا، احمد آباد

آپ کے پیہم اصرار پر سوال نامے پر اظہارِ خیال کر رہا ہوں ورنہ ایمان کی بات یہ ہے کہ ایم اے کرنے کے بعد طے کیا تھا کہ اب صرف نکیرین کے سوالوں کے جواب دیں گے۔ پتہ نہیں تھا کہ نکیرین بھی مِتّل اور مخمور کے روپ میں نازل ہو سکتے ہیں۔ میں سوالناموں سے احتراز کرتا ہوں تو اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ادبی اور فنی مسائل کے دو ٹوک جواب نہیں ہوتے۔ دو ٹوک جواب پھر ایسے سوالات پیدا کرتے ہیں جن کا جواب دو سو صفحہ کے مضمون ہی میں دیا جا سکتا ہے۔ بات گھوم پھر کر وہیں آن پڑتی ہے کہ کونسی چیز اہم ہے؟ — سوال کا قطعی جواب یا سوال کا ناقدانہ اور عالمانہ تفحص؟

آپ کا پہلا سوال ہے جدید ادب قدیم ادب سے انحراف ہے یا اس کی بنیادی اقدار کی بحالی! میرا خیال ہے انحراف شاعر قدیم ادب سے نہیں کرتا، اس کا انحراف اپنے فوری پیشروؤں کے خلاف ہوتا ہے۔ فنکار جب محسوس کرتا ہے کہ اس کے پیشرو جو کچھ لکھ چکے ہیں یا جس انداز سے اس کے بلوغت کے زمانے تک لکھتے رہے ہیں، وہ اس کے منفرد احساس اور تجربہ کے بیان کے لیے بہت کارگر ثابت نہیں ہو رہا تو وہ انحراف اور اجتہاد سے کام لے کر اپنا راستہ الگ بناتا ہے۔ انحراف اس معنی میں حالاتِ حاضرہ کا ردِ عمل اور اس کا جواب بھی ہوتا ہے۔ جو نیا رنگِ سخن یا تخلیقی طریقۂ کار فنکار ایجاد کرتا ہے وہ اپنے فوری پیشروؤں کے رنگِ سخن کی توسیع بھی ہو سکتا ہے، قدیم اساتذہ کے رنگِ سخن کی بازآفرینی بھی اور اس قدر نیا اور انوکھا بھی کہ بالکل اجنبی، تنہا اور لامرکز معلوم ہو اور اسے فنکارانہ روایت کی روشنی میں سمجھا تک نہ جا سکے۔ ایلیٹ نے ٹھیک

کہا ہے کہ بڑا فنکار کم سے کم تصرف کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ تبدیلی پیدا کرتا ہے، اس کی بہترین مثال ہمارے یہاں اقبال، راشد اور فیض ہیں۔ وہ بڑی آسانی سے مرکزی شعری روایت کا حصہ بن گئے ہیں۔ چونکہ دنیا میں کوئی چیز بالکل نئی نہیں ہوتی اس لیے بظاہر بالکل نئے اور انوکھے تجربات بھی روایت میں اپنا سراغ رکھتے ہیں۔ کانکریٹ شاعری کو لیجیے۔ نظم پڑھنے کی نہیں دیکھنے کی چیز ہے۔ یعنی ڈرائنگ روم میں گلدان کے پاس نظم بھی تراشیدہ یا ناتراشیدہ کندے کی طرح سجی ہوئی ہے۔ آپ اسے دیکھیے، آنکھوں آنکھوں میں معنی سمجھیے اور جمالیاتی حظ اٹھائیے۔ تجربہ نیا ہے لیکن اتنا بھی نیا نہیں کہ قدیم ادب میں اس کا سراغ نہ ملے۔ پہلے ایسی نظمیں لکھی جاتی تھیں کہ مثلاً مصرعوں کی ترتیب اڑتے کبوتر کے دو پر، یا ALTAR یا صراحی یا جام کی شکل بناتی تھی۔ جدید غزل ایک معنی میں غزل کے آرائشی اسلوب سے زبردست انحراف ہے۔ لیکن اگر آپ رنگِ ناسخ اور رنگِ جرأت اور رنگِ غالب کی توسیع کہنا پسند نہ کریں تو اس کا VULGARIZATION کہہ لیجیے۔ کہنے کا مطلب یہ کہ انحراف کس کے خلاف ہے اور باز آفرینی کونسے رنگ و آہنگ کی ہے، اور توسیع میں نقل کا عنصر کتنا اور اجتہاد کا کتنا ہے۔ اور انکل تجربہ میں عجزِ تخیّل کی کمی کو شعبدہ بازی سے پورا کرنے کی کوشش کتنی ہے۔ یہ ایسے مسائل ہیں جنہیں نظری مباحث کے ذریعہ سلجھایا نہیں جا سکتا۔ ادب کو عملی تنقید کی لیبارٹری میں گھسیٹنا پڑے گا اور تجزیہ اور تحلیل کے ذریعہ ثابت کرنا پڑے گا کہ فنکار آڑی ترچھی لکیریں اس لیے بنا رہا ہے کہ سیدھی لکیر بنانے پر قادر نہیں، اور بے معنی شاعری کو آرٹ اس لیے کہہ رہا ہے کہ وہ بے معنی، معنی دار، مبہم اور NON-SENSE شاعری کے نازک فرق کو سمجھ نہیں پا رہا۔

اور پھر سوچیے کہ قدیم ادب عقائد، اقدار اور اصولوں کی کوئی جامد اکائی نہیں۔ بلکہ تخلیق کا ایک عمل مسلسل ہے۔ قبول و استرداد، عمل اور ردِ عمل، روایت اور بغاوت، نیا توازن بگڑتے کھونے، اور پھر نیا توازن پیدا کرنے کی ایک مسلسل کشمکش کے ذریعہ قدیم و جدید نظریۂ شعر کی تشکیل ہوئی ہے۔ قدیم ادب رزمیہ اور المیہ بھی رہا ہے، اخلاقی اور تعلیمی بھی، سیاسی اور مقصدی بھی رہا ہے اور سیکولر اور مذہبی بھی۔ کون سے اقدار کی ہم بحالی کر رہے ہیں؟ فارسی کی صوفیانہ شاعری نہ ادب برائے ادب ہے نہ ادب برائے زندگی بلکہ ادب برائے تصوف ہے اور تصوف برائے شعر گفتن خوب است۔ کیا شاعری کی صوفیانہ روایت کی باز آفرینی ممکن ہے؟ حضرت امجد حیدر آبادی اور حضرت آسی کا کلام بتا سکے گا کہ روایت کو از سرِ نو زندہ کرنے میں فرسودگی اور ایپش یا افتادگی کے کون سے خطرات لاحق ہوتے ہیں۔ ایلیٹ کی شاعری نے دورِ جدید میں مذہبی شاعری کے نئے امکانات پیدا کیے ہیں۔ لیکن ڈانٹے اور میٹا فیزیکل شاعروں کے اثرات کے باوجود ایلیٹ کا طریقۂ کار بالکل نیا ہے۔ عمیق حنفی نے صلصلۃ الجرس کے ذریعہ ایک لا مذہب دور میں اپنے مذہبی احساس کو سنبھالنے کی کوشش کی ہے۔ یہ نظم جو مجھے ذاتی طور پر بہت پسند ہے قدیم مذہبی اور صوفیانہ شاعری کی کونسی روایت کی باز آفرینی ہے؟۔ ادبی تاریخ کی سب سے بڑی بغاوت رومانی بغاوت ہے لیکن کیا رومانیت ادب کا آخری طاقتور رجحان تھا؟۔ کیا رومانیت وکٹورین عہد میں منجمد نہیں ہو گئی؟ ایلیٹ نے اسی لجلجی رومانیت کے خلاف بغاوت کی اور میٹا فیزیکل شاعروں کے کڑے دانشورانہ اسلوب اور فکر و جذبہ کی اکائی کو اپنا کر ایک نئی کلاسیکیت کی بنیاد رکھی؟ لیکن کیا ایلیٹ واقعی کلاسیکی ہے یا یوں کہیے کہ محض کلاسیکی ہے؟۔ کیا فرانسیسی علامت پسندوں کے اثرات کے ذریعہ اس کے یہاں رومانی رویئے عود کر نہیں آئے؟ اس میں شک نہیں کہ ہیوم اور پاؤنڈ کا امیجزم رومانیت سے برگشتہ خاطر تھا، لیکن کیا امیجسٹ شاعری کے نمونے ورڈزورتھ اور کیٹس کی یاد دلاتے ہیں یا نو کلاسیکی پوپ اور ڈرائیڈن کی؟۔ شعری پیکر ٹھوس بنا لیکن کیا رومانیوں کی حسّی شاعری ٹھوس نہیں ہے؟ کہنے کا مطلب یہ کہ ردِ عمل بھی محض صاف ستھرا اور چوکھا ردِ عمل نہیں ہوتا۔ افسانوں کی دنیا کی بات لیجیے۔ منٹو کی حقیقت نگاری پریم چند کی آدرش وادی اور کرشن چندر

کی رومانی حقیقت نگاری کا ردِ عمل ہے اور اس سے ایک قدم آگے ہے۔ منٹو کے یہاں نہ تو داستانوں کی اقدار کی باز آفرینی ہے نہ نذیر احمد کے مقصدی اور تعلیمی طریقۂ کار کی۔ یہ صحیح اور درست اجتہاد ہے کہ اپنے اور دوسروں کے لیے تخلیق کے نئے امکانات پیدا کرتا ہے۔ کرشن چندر کی مقصدیت بالآخر انہیں مصورِ غم کے قریب کر دیتی ہے۔ جب ضرورت تھی تب کرشن چندر نے اجتہاد نہیں کیا اور اپنے رومانی اسلوب کو ایک نیا موڑ نہیں دیا۔ اگر وہ پیچھے مڑ کر دیکھتے کہ مقصدیت اور جذباتیت نے مصورِ غم کے ادب سے کیا سلوک کیا ہے، اور ادبِ لطیف کے انشائیوں کی کیا حدود ہیں تو وہ رک جاتے اور اپنے اسلوب اور طریقۂ کار کے بہترین عناصر کو لے کر ایک نئی حقیقت نگاری کی داغ بیل ڈالتے اور شاید ہرمن ہیس، آندرے ژید، ژاں ژیونو، سٹائن بک، انتھونی پاویل، لارنس ڈرل، ولیم گولڈنگ، اور نیوبائی کی طرح غنائی اور تمثیلی ناول، یا غنائی حقیقت نگاری کے اسلوب کی داغ بیل ڈالتے۔ فنکار کے لیے تخلیقِ فن کے وقت جتنا غیر شعوری ہونا ضروری ہے اتنا ہی اپنے فن کے متعلق اسے باشعور ہونا بھی ضروری ہے۔ فن اور احساس کے مقامات ہوتے ہیں۔ منزل نہیں ہوتی۔ تخلیقی توانائی کی ضمانت احساس کا سفرِ مسلسل ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ واماندگیٔ شوق پناہیں تراشتی ہے، لیکن پناہیں تراشنے کا عمل شوق کے سفر کی نشانی ہے۔ یہ کام بھی نہ ہوا تو شوق واماندہ نہیں ہوتا مر جاتا ہے۔ بڑا فنکار مقامات میں قید نہیں۔ معمولی فنکار ترقی پسند یا جدید فنکار کے طور پر پیدا ہوتا ہے اور ترقی پسند اور جدید فنکار کے طور پر ہی جہاں بحق ہوتا ہے۔ فن کی دنیا میں ایسی ثابت قدمی احساس کو محدود کرتی ہے۔ بڑا فنکار احساس کی زیادہ سے زیادہ سطحوں کو متاثر کرتا ہے اور تراشیدم، پرستیدم، شکستم کے عملِ مسلسل سے گزرتا ہے۔ پریم چند اور منٹو دونوں بڑے افسانہ نگار ہیں کہ کفن ہتک کے ساتھ ہاتھ ملاتا نظر آتا ہے، دونوں کے یہاں قدیم کی باز آفرینی نہیں بلکہ نئی جولانگاہوں کی تلاش ہے۔ پریم چند اور منٹو دونوں کا طریقۂ کار تخلیق کے زیادہ سے زیادہ امکانات پیدا کرتا ہے،

کیونکہ کسی ایک اسلوب، ایک تکنک، ایک MANNERISM کا شکار نہیں وہ ہر موضوع کو اپنی گرفت میں لے سکتا ہے۔ یہ طریقۂ کار شیکسپیر، بالزاک، ٹالسٹائی، چیخوف، اور ڈکنس کا ہے۔ ایک معنی میں دیکھئے تو جدید فنکار کا تخیل اُن فضاؤں میں پرواز ہی نہیں کر رہا جہاں دھنک کے سات رنگ ٹوٹتے ہیں اور . . . . ہمہ رنگ زندگی اپنی تمام پہلو داری کے ساتھ اپنے جلوے بکھیرتی ہے۔ بیکیٹ سب کچھ ہی لیکن شکسپیر اور ٹالسٹائی کے مقابلہ میں کتنا محدود ہے۔ شکسپیر ایک حکایت لے کر کنگ لیئر تخلیق کرتا ہے۔ انتظار حسین جاتک کتھا کی حکایت لے کر ایک جدید دلچسپ اور معنی خیز حکایت تخلیق کرتے ہیں، لیکن حکایت کا یہ آرٹ شیکسپیر کے ڈرامے کی مانند فکشن کے آرٹ کی توسیع نہیں تحدید ہے، کیونکہ فکشن نے حکایت، کہانی، رزمیہ، داستان، رومان، اور ناول کی جن ارتقائی منزلوں کو طے کیا ہے، اُن سے صرفِ نظر کر کے انتظار حسین ابتدائی اور غیر سوفسطائی خاکہ کی بازیافت کرتے ہیں۔ توسیع جائسی کی یولیسز ہے، تھامس مان کی یوسف کی کہانی ہے۔ انوئی کا انتی گونی ہے، شا کا سینٹ جان ہے، سارتر کا FLIES ہے، ژید کا تھیسیس ہے۔ کہنے کا مطلب یہ کہ فنکار قدیم ہی نہیں بلکہ قدیم ترین اسالیب سے استفادہ کرتا ہے، انہیں از سرِ نو زندہ کرتا ہے۔ . . . .

اُن سے نئے کام لیتا ہے لیکن اس طرح کہ وہ ایک نیا رنگ نئے آہنگ پا کر ایک نئی تخلیقی سمت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اور اس کے تخیل اور فن کے لیے ایک نیا چیلنج پیش کرتے ہیں۔ ورنہ اس کا فن ماضی کی صدائے بازگشت بن جاتا ہے اور پرانے فارم میں ڈھلا ہوا جذبہ بھی پرانا نظر آتا ہے۔ اس کی عبرتناک مثال سمبالزم کے نام پر لکھی جانے والی جدید ALLEGORIES ہیں۔ شاعر سمجھتا ہے کہ وہ علامتی نظم لکھ رہا ہے لیکن ہوتی ہے وہ تمثیل، یا پھیلایا ہوا استعارہ۔ تمثیل کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس کی دانشورانہ دیواریں اتنی سنگین ہوتی ہیں کہ جذبہ نالۂ بے اختیارِ بلبل کی مانند شعر میں ڈھل ہی نہیں پاتا۔ تمثیل میں شعور کا عمل دخل بہت زیادہ

ہوتا ہے، جب کہ علامات کی تخلیق کا پورا بار لاشعور سنبھالے
ہوتا ہے۔ شاعر کی نظر تصوروں کے شہر، روح کے صحرا، دل کے شمشان
پر اس قدر مرکوز ہوتی ہے کہ ان تصورات سے منسلک خیالات
ہی سے نظم کا تار و پود تیار ہوتا ہے اور جذبہ جسے تند و تیز و شدید
ہونا چاہیے خیالات کے حصاروں میں سرد پڑ جاتا ہے۔ بات
یہ ہے کہ فنکار اپنے لیے جس قسم کا رول اختیار کرتا ہے اسی رول
کی مطابقت سے ماضی کا ادب ڈھلے ڈھلائے اظہارِ بیان
کے پیمانے اسے فراہم کرتا ہے۔ معلم اخلاق کا بقراطی رول تمثیل
اور اخلاقی حکایات کے پیمانے انتخاب کرتا ہے۔ یہ
اجتہاد نہیں رجعتِ قہقہری ہے خلاق ذہن ماضی کے ادب سے
ایک رنگ اڑاتا ہے اور ہزار رنگ پیدا کرتا ہے۔ کوئی بھی
بڑا فنکار ماضی کے ادب سے نہ تو کوئی مطلق قدر لیتا ہے نہ
کوئی تمام و کمال اسلوب کسی زمانہ میں ہم نے رنگِ میر زندہ کیا
کہ میر کا دکھی احساس اور فقیرانہ لب و لہجہ ہمارے تنہائی اور جلاوطنی
کے تجربہ کے لیے زیادہ سازگار تھا۔ اقبال اور غالب سے صرفِ
نظر کیا کہ انکار کی دار و گیر کے ہاتھوں پارہ پارہ ذہن کے لیے متاعِ
درد متاعِ جنگ سے زیادہ گراں قدر معلوم ہوئی۔ اس عمل کو قدیم
ادب کے اقدار کی باز آفرینی کہنا ٹھیک نہیں۔

اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے آپ کے دوسرے سوال
یعنی ہیئتی تبدیلیوں اور موضوعاتی تبدیلیوں کی تناسبی اہمیت کو
سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ جدید شاعری اور فکشن میں اسطور
کے چرچے بہت عام ہیں۔ ایلیٹ نے یولیسز پر تبصرہ کرتے ہوئے
بتایا تھا کہ دورِ جدید کے انتشار کو فنکارانہ فارم عطا کرنے میں
اسطور بہت سود مند ثابت ہو سکتا ہے لیکن اساطیر کا استعمال
قدیم ادب میں بہت کثرت سے ہوا ہے۔ سپنسر، ملٹن، کیٹس،
شیلی سب نے یونانی اساطیر سے کام لیا ہے۔ لیکن ان کے یہاں
اساطیر بطور تلمیحات یا بطور شعری زیبائش کے تاریخی مواد
کے استعمال ہوئے ہیں جب کہ جدید فنکار کا رویہ اسطور کو
شعری ساخت و بافت میں علامتی انداز سے اس طرح سمونے
کا رہا ہے کہ اسطور نہ صرف جدید صورتِ حال کا ترجمان بنتا
ہے بلکہ اس کی مدد سے جدید و قدیم متوازی خطوط پر حرکت
کرتے نظر آتے ہیں، اور ماضی کے آئینہ میں حال کو دیکھا جا سکتا
ہے اور دونوں کے تضاد کو شدید اور معنی خیز بنایا جا سکتا ہے
یہاں بھی قدیم ادب کے اقدار کی باز آفرینی نہیں ہے بلکہ ایک
نئے تخلیقی رویہ کی طرف پیش قدمی ہے۔ عمیق حنفی کی نظم "سند باد"
جس کے بعض حصے اچھی شاعری کا نمونہ ہیں اسطور کا تخلیقی استعمال نہیں
کر سکی۔ سند باد نظم کے STRUCTURE کا جزوِ لاینفک نہیں
بنتا۔ اس کا کردار اور اس کی شخصیت ماضی کی دانشمندی کی ایسی
علامت نہیں بنتی جس کی روشنی میں حال کے تضادات اور
پیچیدگیوں کو بہتر طور پر سمجھا جا سکے۔ یہ کام ایلیٹ ٹائریسیاز
سے لے سکا ہے۔ موضوع اور ہیئت کے تناسب پر میں اپنے
ایک مضمون میں جو حال ہی میں "جواز" میں شائع ہوا ہے بحث
کر چکا ہوں۔ میں دونوں کی ثنویت کا قائل نہیں اور محسوس
کرتا ہوں کہ جدید شاعری اگر جدید دور کی ترجمان ہے تو
اس پورے مواد کی مناسبت سے جو جدید دور شاعر کو فراہم
کرتا ہے اس کا فارم، یعنی ڈکشن اسلوب اور خارجی ہیئت
میں بنیادی تبدیلی کا ہونا لازمی ہے ہم نے فارم کو محض خارجی
ہیئت سمجھا اور تکونی اور گول نظمیں لکھنے لگے حالانکہ تبدیلی
کی ضرورت اسلوب اور ڈکشن میں زیادہ تھی۔ اور شعر کے
عروضی نظام اور آہنگ کو زیادہ جدلیاتی بنانا ناگزیر تھا۔
بعض نئے شاعروں مثلاً عمیق حنفی، کمار پاشی، شہریار، محمد علوی
وغیرہ نے اس طرف پیش قدمی کی اور یہی اردو کی جدید شاعری
کا طرۂ امتیاز ہے۔ نام گنانے میں دار پر چڑھنے کا خدشہ ہے اور
جو نام بتائے ہیں وہ سرِ راہ ہیں سرفہرست نہیں۔ اگر آپ اس
مسئلہ پر سوچیں کہ ان شاعروں کے یہاں انیس اقبال اور جوش کا
فارم نہیں جو ترقی پسندوں کے یہاں ملتا ہے تو آپ کو پتہ چلے
گا کہ شاعر شاعری سے تعمیرِ جہاں کا کام کم اور شکستِ ذات
کا اظہار زیادہ کر رہا تھا۔ یہی نہیں بلکہ وہ دنیا کو بدلنے سے پہلے
دنیا کو سمجھنے، دنیا کا مشاہدہ کرنے اور اسے شاعری میں برتنے
کے امکانات سے زیادہ سروکار رکھے ہوئے تھا۔ یہاں
لوگوں سے تخاطب نہیں بلکہ لوگوں میں گم شدگی ہے بھیڑ
میں کھو کر خود کو پانے کی کوشش ہے۔ تخاطبی یا تلقینی شاعری

جن چیزوں کو آنکھ بھر کر دیکھنے کی مہلت نہیں دیتی تھی ان پر نگاہِ شوق مرکوز کرنے کی تڑپ ہے۔ حقیقت کا شاعرانہ یا دلپذیرانہ بیان نہیں بلکہ شعری تخیل کے ذریعہ حقیقت کا انکشاف ہے۔ اسی قسم کی اور بہت سی باتیں جدید شاعری کے متعلق کہی جاسکتی ہیں لیکن یہاں اس کا موقعہ نہیں کہ میں جوابِ سوال کو جوابِ مضمون بنانا نہیں چاہتا۔ البتہ یہ اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہمارے جدید شاعروں کا کلام وقیع ہونے کے باوصف عالمی ادب کے تناظر میں محدود ہے۔ مغرب میں جدیدیت کا بڑا کارنامہ تھیٹر میں ہے اور ہمارے یہاں تھیٹر نسرواں جی آرام کے بعد ہنوز آرام ہی کر رہا ہے۔ مغرب میں ناول کے تسلیم شدہ فارم میں جدید احساس کی ترجمانی کے علاوہ نئے قسم کے تجرباتی ناولوں کا ایسا ذخیرہ سامنے آیا ہے کہ مجھ جیسے فکشن کا روایتی ذوق رکھنے والے لوگ اس کی طرف نظر کرنے سے بھی گھبراتے ہیں۔ جوگندر پال نے نئی طرز کے مختصر ناول لکھے ہیں لیکن ان کے پڑھنے کے لیے عمرِ طویل اور صبرِ ایوب کی ضرورت ہے۔ قاضی عبدالستار میں غیر معمولی تخلیقی صلاحیت ہے —— اتنی غیر معمولی اس قدر غیر اکتسابی کہ ودیعتِ خداوندی معلوم ہوتی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ جس مزاج کی وہ کہانیاں لکھتے ہیں اس سے مختلف مزاج کی وہ لکھیں لیکن یہ کہانیاں جدید دور میں جدید آدمی کے زندگی کے تجربہ کا بیان نہیں۔ وہ ایک مٹتی ہوئی تہذیب کا نوحہ ہیں جو اپنی جگہ اہم ہے اور اس لیے بھی قابلِ قدر کہ اردو میں المیہ کی طرف سنجیدہ پیش قدمی ہے۔ قاضی صاحب کو اسی راہ پر آگے بڑھتے رہنا چاہیئے اور کہانی اور کردار پر اپنی گرفت مضبوط کر کے ایک مخصوص تہذیبی اور تمدنی پس منظر میں المیہ کے امکانات کو زیادہ سے زیادہ کھنگالنا چاہیے۔ نہ میں ایلیٹ ہوں نہ قاضی صاحب کو کالرج سمجھتا ہوں لیکن ایک طنز آلود شوخیٔ طبع کے تحت ہی سہی مجھے یہ دوستانہ مشورہ دینے کی اجازت دیجیے کہ قاضی صاحب کے لیے اردو شاعری میں قنوطیت، اور ہندوستانی جمالیات اور ترقی پسند کانفرنسوں کی رپورٹ سے زیادہ جو چیز مفید ثابت ہوسکتی ہے وہ الزبتھین عہد کے ڈرامے، بالزاک کے ناول اور دوسرے عظیم تخلیقی کارنامے ہیں۔ تخلیقی ادب کے گر فنکار دوسرے عظیم فن پاروں ہی سے سیکھتا ہے۔ جمالیات اور مابعد الطبیعات سے نہیں۔ کارخانۂ قدرت سے جو نعمتِ تخیل انہیں ودیعت ہوئی ہے وہ تاریخی ناولوں پر ضائع کرنے کے لیے نہیں، اور جدید دور میں تاریخی ناول لکھنے کا کیا انداز ہوتا ہے وہ بھی انہیں فلابیر، ژید، اور رابرٹ گریوز سے سیکھنا چاہیے۔ میں نے اپنے عہد کے بہترین دماغوں کو تباہ ہوتے دیکھا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ کرشن چندر کے بعد کسی اور خلاق ذہن کی تباہی کا زخم برداشت کروں۔ یہی بات میں بہت سے جدید افسانہ نگاروں کے متعلق کہنا چاہتا ہوں لیکن گنجائش نہیں ہے۔ نثری شاعری کو شاعری اور شاعرانہ افسانہ کو افسانہ ثابت کرنے کا مجھ میں فقیہانہ حوصلہ نہیں ہے۔ باسٹارڈ کامیڈی کی طرح ادب کی یہ باسٹارڈ اصناف ہیں۔ اٹھارویں صدی کی اس SENTIMENTAL کامیڈی کو گولڈسمتھ نے باسٹارڈ کہا تھا جسے لوگ ہنسنے کی غرض سے دیکھنے جاتے تھے لیکن رو کر نکلتے تھے۔ خلیل جبرانیت نہ جدیدیت ہے نہ ترقی بلکہ رجعت اور انحطاط ہے۔ فلسفیانہ تفکر اگر افسانہ کو ادبِ لطیف کی نوع کا انشائیہ بناتا ہو تو کم از کم فکشن میں غیر شخصی آرٹ کے طریقۂ کار پر ہمیں زیادہ سنجیدگی سے سوچنے کی ضرورت ہے۔ اس آدمی کے لیے شخصیت سے گریز ناگزیر بن جاتا ہے جو فنکار کی بجائے رشی، مونی، سادھو سنت اور عہد نامۂ عتیق کے پیغمبروں کی جلالی شان لیے ہوئے ہو۔ ادب کے معاملہ میں میں تو اس قدر زمینی واقع ہوا ہوں کہ حاضری ملا نظے گو ئٹے اور اقبال کے دربار میں دیتا ہوں لیکن اپنی ذات کو فنا کرتا ہوں شیکسپیئر ورڈزورتھ فیض اور منٹو کی دنیاؤں میں۔ یہ ممکن ہے کہ فنکار ولایت کے مقام کو پہنچ جائے تو نرینہ اولاد کے لیے میں اس سے سفارش کرا لوں۔ لیکن نوویلوں کے لیے تو مجھے اسی فنکار کی طرف رجوع ہونا پڑے گا جو گیتوں کے ہار بنتا ہے۔ ذرا ورڈزورتھ اور فراق کو دیکھیے۔ کبھی کبھی تو تخیل اس مقام پر پہنچتا ہے جو روحانی مکاشفہ کا

مقام ہے لیکن شاعری کی قیمت پر انھیں عرفان کا سودا پسند نہیں۔ رسول اللہ کی طرح معراج سے پھر زمین کی طرف لوٹ آتے ہیں۔ راں بو نے بھی الفاظ کے ذریعہ حقیقتِ مطلق کے عرفان کی کوشش کی تھی۔ انجام ہمیں معلوم ہے۔ "جوئیں دیکھنے والیاں" آج بھی اس کا سب سے درد انگیز تخلیقی کارنامہ ہے۔ منٹو کی طرف نظر کیجیے۔ آنکھوں میں عرفان کی چمک اور دل میں ہڈیوں کو پگھلا دینے والے ماورائی کرب کی آگ ہے۔ حسن عسکری اور ندا فاضلی ——— ایک دانستہ اور دوسرا شاید نادانستہ طور پر، منٹو کو صوفی کہہ گئے۔ بات سو فی صدی درست ہے۔ لیکن آرٹ کا معجزہ دیکھیے مسیح کی دردمندی اور بدھ کے کرونا کا اظہار منٹو کے یہاں کہاں ہوا ہے؟ ——— سوگندھی کی کھولی میں۔ الفاظ کے ذریعہ راں بو حقیقت مطلق کو نہ پاسکا۔ غیر شخصی آرٹ کے طریقۂ کار کے ذریعہ منٹو جان گیا کہ نفی ذات کا اعلیٰ ترین مقام کونسا ہے۔ فن کی DYNAMICS بھی اتنی ہی اہم ہیں جتنے کہ سلوک کے مدارج۔ صوفی اور شاعر دونوں مدرسہ سے باہر نکل کر تجربہ کی آگ میں جلتے ہیں اور اسے گلزار میں بدل لیتے ہیں۔ ہمارے دور کا المیہ دیکھیے کہ فنکار نہ صرف مدرسوں میں داخل ہو گئے بلکہ فن کے آداب چھوڑ کے مدرسہ کے آداب اپنا لیے۔ مدرسہ کی دنیا ریڈر شپ، سکالرشپ، پی ایچ ڈی کے مقالوں اور ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ کی نثری نظموں پر وجد کرنے کی دنیا ہے اور فن کی دنیا ——— سوز و ساز و درد و داغ۔ اس بانورے کی دنیا جو کہانی کا مسودہ لیے شراب کی ایک بوتل کے لیے چودھریوں کے آستانوں کی خاک چھانتا پھرتا ہے۔ فن کار رومانی اور فنکار کا بوہیمین تصور مجھے پسند ہے۔ وہ آدمی مجھے پسند ہے جو خلعتِ شاہانہ اور دستارِ فضیلت کی دنیا میں ہتھیلی پر سر رکھ کر بات کرتا ہے۔ بعینہ اس بچّہ کی مانند جو ملبوساتِ فاخرہ کے ڈھیر پہ برہنہ رہنے پر اڑ گیا ہو۔ سرخ ہو یا سبز، زرد ہو یا کیسری، ہر رنگ کی پوشی سے انکار فنکار کی تخلیقی شخصیت کو زیب دیتا ہے۔ ہماری دنیا نے فنکار کو "ہموار" کرنے کے بے شمار ہتھکنڈے ایجاد کیے ہیں خوش نصیب ہے وہ آدمی جو اپنی نظر کی انفرادیت اور تخیل کی پاکیزگی کو محفوظ کر لے۔ مدرسہ زندہ ادبی تصورات اور توانا تخلیقی رجحانات کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے وہ آپ دیکھنا چاہیں تو ہماری تنقید پر نظر کیجیے۔ علامت اور اسطور ابھی جوان بھی نہیں ہونے پائے تھے کہ چاک کے غبار میں اُن کی سانس اکھڑ گئی۔ کیلے سکوں کی باس آنے لگی ہے ان الفاظ سے۔ بہت سے نقاد شاعر بھی ہیں لیکن اُن کی تنقیدیں وہی مولا بخش ہاتھی کی اللہ رکھی چال چلتی ہیں جو اُن جبّہ در بزرگوں کا خاصہ ہے جو سونٹے سے سر پر سنگھاس ڈالتے ہیں۔ کیا ڈرائیڈن کالرج ورڈزورتھ، شیلی، آرنلڈ، ایلیٹ اور حالی نے جو نقاد و فنکار دونوں تھے ادب اور آرٹ کے مسائل پر اسی انداز سے غور کیا تھا جس انداز سے ہمارے احباب لکھ رہے ہیں؟ — پتہ نہیں کون سے جلالی بزرگ کی بددعا ہے کہ ہمارے یہاں جو بھی نقاد پیدا ہوتا ہے بقراط ہی پیدا ہوتا ہے۔ ادب کو ادب کے طور پر اور ادب کو ادب کے حوالے سے سمجھنے کی تو ہم صلاحیت ہی گنوا بیٹھے ہیں۔ اقتصادیات اور سماجیات کا غلبہ کم ہوا تو نفسیات اور انتھروپولوجی نے دھاوا بولا۔ ہمارا دور علم کے پھیلاؤ کا دور ہے۔ — POPULARIZERS — نے فلسفہ اور نفسیات کو اتنا ہی عام کر دیا ہے جتنا کہ پکوان کی کتابوں نے مغلائی کھانوں کو۔ ہر گنوار جب مرغِ مسلّم کھانے لگے تو مہذب آدمی اپنے دسترخوان پر چٹخارے اور دکھاوے کا اہتمام کرتے ہیں اور — WHQLESOMENESS — پر زیادہ اصرار کرتے ہیں۔ یہی محولہ بالا انگریزی لفظ جسے کاتبوں کے خوف سے دوسری بار لکھنے کی ہمت نہیں کرتا ادبی نقاد کا حصنِ حصین ہے کہ ادبی نقاد مذاقِ سخن کو سنوارنے کا جو کام کرتا ہے وہ فلسفہ کے پروفیسروں اور نفسیات کے ماہروں کے بس کا روگ نہیں۔ علمائے کبار بتا سکتے ہیں کہ اقبال کے فوق الانسان کے تصور کے عناصرِ ترکیبی کے ماخذات کیا ہیں۔ ادبی نقاد یہ بتاتا ہے کہ اقبال کی شاعری اگر قابلِ قبول ہے تو وہ فوق الانسان کے تصور کی وجہ سے ہے یا اس کے باوصف۔ ادبی نقاد کا اہم

کارنامہ یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنی ناقدانہ بصیرت سے ایک فنکار یا
فن پارے میں یا تو از سرِ نو دلچسپی پیدا کرتا ہے یا جو دلچسپی لوگوں
کو ہوتی ہے اسے برقرار رکھتا ہے اور اسے نئی تازگی وسعت
اور شدت بخشتا ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب نقاد کی نظر
ادب پر مرکوز ہو۔ ہمارے نقاد نظر کو پریشان کرتے ہیں۔ ایک
فنکار کو دوسرے فنکار کے حوالے سے نہیں بلکہ فلسفی کے حوالے
سے پڑھتے ہیں۔ فیض کی غنائیت کو عظمت اللہ خان، اختر شیرانی،
حفیظ جالندھری یا دوسرے مشرقی اور مغربی غنائی شاعروں
کی روشنی میں پرکھنے اور اس کی امتیازی صفات کی نشاندہی
کرنے کی بجائے وہ یہ دیکھتے ہیں کہ فیض میں مارکسزم اور
روحِ عصر کی ترجمانی کیسی ہے۔ یہ کام آسان ہے کہ سیاسی پمفلٹ،
عصری تاریخ، اور افکار و تصورات کی مقبولِ عام کتابیں پڑھنا
اتنا مشکل نہیں جتنا کہ عظیم فنکاروں کے عظیم تخلیقی کارناموں
کا جز رس اور تنقیدی مطالعہ ہے۔ تنقید میں علم سے زیادہ
بصیرت اور ذہانت سے زیادہ دانشمندی کی قیمت ہے
اور یہی وہ نکتہ ہے جس سے نہ تو ہمارے معلم نقاد واقف
ہیں نہ ریڈیو اور جرنلزم کے چرب زبان صحافی نقاد۔ اس
میں شک نہیں کہ تنقید کا دوسرے دانشورانہ علوم سے گہرا
تعلق ہے لیکن اگر نقاد کے قدم ادب کی سرزمین پر مضبوطی
سے جمے ہوئے نہیں ہیں تو فلسفہ نفسیات اور انتھروپولوجی
کی فضاؤں میں پرواز پُرخطر ہے کہ ان علوم کے سورج
کی تپش سے فن پارے موم کے نازک کھلونوں کی مانند
پگھل جاتے ہیں اور اپنا ہیئتی حسن کھو کر ایک ایسے لعوب
کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جسے آسانی سے نقاد کے نفسیاتی
یا کسی اور نظریاتی تصور کے پیپے میں ڈھالا جا سکتا ہے۔
یہ افسوس کی بات ہے کہ جدیدیت بھی ہمارے نقادوں
کے اس بنیادی رویہ میں کوئی خاطر خواہ تبدیلی پیدا نہیں
کر سکی۔ پہلے نقاد خیال کی دُم پکڑ کر پیداواری رشتوں
کے کھیت کھلیانوں میں دوڑتا تھا اور اب وہ علامت
کی انگلی پکڑ کر اجتماعی لاشعور کے اندھیرے پانیوں میں ہاتھ پیر
مارتا ہے۔ کبھی وہ یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کرتا کہ علامت
تو خیر ہے نظم میں لیکن نظم نظم بھی ہے یا نہیں۔ نظم میں سورج
صحرا اور جنگل دیکھ کر ہی نقاد خوش ہو لیتا ہے کہ چلو ایک آرکی ٹائپ
ہاتھ آیا۔ پھر وہ نظم پر قناعت نہیں کرتا۔ صحرا کی خاک چھانتا پھرتا
ہے یا انتھروپولوجی کے پر پیچ جنگلوں کی ڈالیوں میں اُلجھ جاتا ہے
ہماری اکثر جدید تنقیدی تحریروں میں گنجلک کا وہ عالم ہے
کہ ترقی پسند بقراط ممتاز حسین کی نثر گلشنِ بے خار معلوم ہوتی ہے۔
ایک زبردست کنفیوژن ہے جو CHAOS میں پرواز کرنے
کے لیے پر تولتا نظر آتا ہے۔ یا پھر فلسفہ کے جسم پر سرد انگلیوں
کا نامردانہ مساس ہے جسے دیکھ کر جھرجھریاں آتی ہیں۔ بھلا
ان وطیروں کا جدیدیت سے کیا سروکار۔ ذرا دیکھیے تو سہی
کہ طباع اور خلاق ذہنوں نے مغرب میں تنقید کی زبان اور
اسلوب کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ ہم سے تو حالی کی نثر بھی
بن نہیں پڑتی۔ محمود گاوان کی نثر لکھتے ہیں منشی گیری کا دوسرا
نتیجہ کیا نکلتا۔

ہمارے یہاں شاعری میں ہیئت کے دلچسپ تجربات
ہوتے ہیں جن کی وقعت کوئی کم کرنا پسند نہیں کرتا لیکن ابھی
تک ہمارے سامنے شاعری کا کوئی ایسا مستند فارم نہیں آیا
جو جدید دور کی حسی زندگی کے فنکارانہ اظہار کی روایت بن
سکے۔ جدیدیت گردوپیش کی نئی دنیا کو شعری استعارے میں
بدلنے کا نام ہے۔ یعنی ہوائی جہاز محض بطور شے کے شاعری میں
موجود نہ ہو شعری استعارے کا ایک ایسا تخلیقی سرچشمہ بن جائے
جو پورے لسانی ڈھانچے یعنی اسما صفات اور افعال تک کو
متاثر کرے۔ ہم یہ کام نہیں کر سکے ہیں۔ ڈانٹے کے فلورنس،
بادلیئر کے پیرس اور ایلیٹ کے لندن کی مانند کیا ہم کسی شاعر
کے یہاں دہلی، بمبئی اور کلکتہ کی شناخت کر سکتے ہیں۔ سچ یہ ہے
کہ ہماری شاعری شاعرانہ موضوعات کی حلقہ بگوشی سے ہنوز
آزاد نہیں ہو سکی۔ وہ جو کرخت بدصورت اور غیر شاعرانہ ہے
یعنی ہمارا دھواں آلود، غبار آلود پرشور صنعتی تمدن، ابھی تک
شعری تخیل کی زد میں نہیں آیا۔ اکثر اس تمدن سے برگشتگی
ایسا نوستالجیا پیدا کرتی ہے جو زرعی تمدن کی شاداب فضاؤں
میں شاعرانہ موضوعات سمجھاتا ہے۔ بمبئی کی زندگی کو پیش

کرنے میں منٹو نے ایک نئے اسلوب سے کام لیا۔ کرشن چندر کا شاعرانہ اور خلیل جبران کا پیغمبرانہ اسلوب شہری زندگی کی ترجمانی کے لیے مناسب نہیں ہے۔ جدید افسانہ اس معنی میں رجعت قہقری ہے۔ مکاشفہ کی زبان پیغمبروں کو زیب دیتی ہے لیکن میں اس گاؤں میں ٹھہرنا پسند نہیں کرتا جہاں کا ہر آدمی خود کو پیغمبر سمجھتا ہو۔ تلاشِ ذات بہت بڑی چیز ہے لیکن ایلیٹ کی طرح مجھے بھی اس منظر سے ہول آتا ہے کہ ایک جم غفیر تلاشِ ذات میں سرگرداں ہو۔ ادب نہ وہ مسجد ہے جس میں تبلیغی مولویوں کا اجتماع ہے نہ وہ خانقاہ جس کا ہر آدمی مجاہدہ اور مکاشفہ میں مشغول ہو۔ فنکار میرے نزدیک اُن اساطیر کا مغنی ہوتا ہے جنھیں معاشرہ جنم دیتا ہے۔ میں اسے گیتوں کا بُننے والا، بھجن اور کیرتن گانے والا، حماسہ سرا اور BARD، اندھا گویّا اور آوارہ گرد، داستان گو، رنگ بھومی کا اداکار اور لفظوں کا جادوگر دیکھنا زیادہ پسند کرتا ہوں۔ ایسے لوگ مدرسوں میں نہیں، چوپالوں، چوراہوں اور بازاروں میں پیدا ہوتے ہیں۔

آپ کا تیسرا سوال تنہائی کے بارے میں ہے۔ یعنی آیا تنہائی کا احساس صرف صنعتی پھیلاؤ کا ردعمل ہے یا یہ ایک تخلیقی ذہن کا ایسا ردعمل ہے جس کا سماجی نظاموں سے محض نسبتی تعلق ہے؟ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ہم علامت پر زیادہ غور کرتے ہیں علامتی شاعری پر کم تجریدی تصورات پر مفکرانہ غور و خوض کی میرے دل میں بڑی قدر ہے لیکن میں اپنے حدود سے اچھی طرح واقف ہوں۔ فلسفیانہ فکر کی صلاحیت سے میں یک قلم محروم ہوں۔ یعنی اگر کوئی مجھ سے کہے کہ عقلِ محض، عینیت، حُسن، اخلاق، مابعد الطبیعات پر اظہار خیال فرمائیں تو ڈیڑھ منٹ بعد میری صورت رونی ہو جاتی ہے۔ وہ جنھیں فلسفہ سے رغبت ہے ان کے کارناموں کا میرے دل پر بڑا گہرا اثر ہے لیکن اُن کی جوتیوں میں بیٹھنے کی نہ مجھ میں ہمت پیدا ہوئی نہ صلاحیت۔ میں جو نہیں ہوں وہ بتانے کی میں نے کبھی کوشش نہیں کی۔ اس سے پیشتر کہ آپ اسے میری اخلاقی خوبی سمجھیں مجھے عرض کرنے دیجیے کہ مجھے اس کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی ــــ اپنی ذہنی سرگرمی کے لیے میں نے جو دائرۂ عمل پسند کیا وہ ادبی تنقید کا تھا اور ادبی تنقید کے لیے فلسفیانہ فکر ایک اضافی صفت ہو سکتی ہے لازمی نہیں۔ ادبی تنقید صحیح ادبی مطالعہ پر مبنی ادبی بصیرت ہے اور ادب پاروں کی پرکھ کا کام کرتی ہے۔ عرفان جس کا ادب میں استعمال ہوتا ہے اس کی خوبیوں اور خامیوں کی نشاندہی کرنے کے لیے جس طرح ماہر لسانیات ہونا ضروری نہیں اسی طرح وہ خیال جس کا کسی فن پارے میں بیان ہوتا ہے اس کی پرکھ کے لیے فلسفی ہونا ضروری نہیں۔ دنیا کے بڑے نقادوں کو ہم نقاد ہی کہتے ہیں فلسفی نہیں۔ سب نقادوں میں سب سے زیادہ مابعد الطبیعات کالرج نے پڑھی لیکن اس مطالعہ سے اس کی تنقید اور شاعری کو نقصان ہی ہوا فائدہ نہیں اسی لیے ایلیٹ نے کہا تھا کہ جب شاعری کی دیوی اس پر مہربان ہو گئی تو اس کے لیے بہتر تھا کہ وہ مابعد الطبیعات کی بجائے سیر و سیاحت کی کتابیں پڑھتا کہ کوئی واقعہ، کوئی منظر، کوئی امیج اسے تخلیقی طور پر کام کا لگتا۔ بعض ایسے بھی فلسفی ہوئے ہیں جو ادبی نقاد بھی مانے گئے ہیں مثلاً سنتایانا لیکن انہیں ادبی تنقید کے صدر نشینوں میں کم ہی جگہ ملی ہے۔ ایلیٹ کو مذہب اور فلسفہ دونوں سے رغبت تھی لیکن اس کے ذہنی ڈسپلن کو دیکھیے کہ ادبی تنقید میں فلسفہ اور تھیولوجی نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہی چیز ایلیٹ کو آرنلڈ سے ممتاز کرتی ہے کیونکہ آرنلڈ کے یہاں ادب آرٹ مذہب اور کلچر پر رسکن اور کارلائل کی طرح فربہ فربہ باتیں بہت ہیں ادیب، ادبی فینومینا، اور ادب پاروں پر تنقید بہت ہی کم۔ بڑے نقاد تو ڈرائیڈن، جانسن، کالرج، ایلیٹ اور حالی ہی ہیں جو حسنِ ادب کا تماشا کرنے کے آداب سے واقف ہیں۔ ہماری تنقید میں سطحی قسم کا فلسفیانہ رعب و داب محض نمائشی ہے اور اس نے تنقید کو ناقابلِ برداشت حد تک سناہری کا کارخانہ بنا رکھا ہے۔ ادب میں تنہائی کا مسئلہ بھی ایسا ہی مسئلہ ہے جسے ادب سے الگ کر کے ایک تجریدی تصور کی شکل دی گئی ہے۔ ادب فی الحقیقت وہ کام کرتا ہے جو فلسفہ اور دیگر علوم کے حیطۂ اختیار میں نہیں یعنی وہ

احساس کو اس کی تمام نزاکتوں اور گھلتے ملتے رنگوں کے ساتھ پیش کرتا ہے، اسی لیے ادب میں پیش کردہ جذبات کی سائنسی درجہ بندی ممکن نہیں۔ ایک شعر میں ایک شاعر ایک احساس کو پیش کرتا ہے جو اس کا اپنا ہے اور ایک مخصوص لمحہ کے لیے ہی اس کا ہے اور وہ لمحہ گزر جانے کے بعد بعینہٖ اسی صورت میں اس احساس کی بازیافت خود اس کے لیے ممکن نہیں۔ جو احساس بیان ہوتا ہے اس کی درجہ بندی اس لیے بھی ممکن نہیں کہ شعر کا میڈیم، یعنی زبان اور الفاظ، الفاظ کے استعاراتی اور علامتی معنی، ان کی آوازیں اور شعر کا آہنگ، سب باہم مل کر نہ صرف احساس کی لطیف سے لطیف لرزشوں کو گرفت میں لاتے ہیں بلکہ اس کی توسیع بھی کرتے ہیں، جو معنوی بھی ہوتی ہے اور حسّی بھی۔

میر کا شعر ہے:

یک بیاباں برنگِ صوتِ جرس
مجھ پہ ہے بیکسی و تنہائی

غالب کا شعر ہے:

کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

صرف الفاظ ہی نے ایک احساس کو بیابانی اور دوسرے کو شہری URBANE بنا دیا ہے۔ ایک میں ہول آفرین بے کسی ہے دوسرے میں جہد و عمل۔ کاو کاو، صبح کرنا شام کا، جوئے شیر کا لانا، اور سخت جانی کے الفاظ میں صلابت حرکت اور عمل ہے جس کے ہوتے ہوئے تنہائی کا احساس اندر ہی اندر روح کی بھائیں بھائیں کرتی ہوئی ویران دیواروں کو چاٹ جانے والا زہر آگین احساس نہیں بن پاتا۔ میر کے یہاں بن پاتا ہے اور بادلیئر کی SPLEEN کی نظموں کی یاد دلاتا ہے۔ غالب کی بذلہ سنجی جذبہ کو محصور کرتی ہے، اور جذبہ خوف و حیرت کی شدتِ کھو دیتا ہے۔ میر کے یہاں احساس صوتِ جرس کے استعارے میں ڈھل کر بیابانی وسعت اور ہیبت پیدا کرتا ہے۔ یہ اور ایسی بہت سی باتیں ان تمام شعروں کے متعلق کہی جا سکتی ہیں جن میں تنہائی کا بیان ہوا ہے ایسے تجزیہ

کے ذریعہ ہم احساس کی نوعیت کو سمجھنے کی بہتر استعداد پیدا کر سکیں گے۔ اس وقت ہمیں یہ بھی پتہ چلے گا کہ تنہائی، خلوت گزینی، دنیا کشی، جلاوطنی، کے احساس میں کونسا نازک فرق ہے۔ شعر اور شاعر کے حوالے سے بات کی جائے تو حقیقی اور مصنوعی، مستعار اور طبعی، مرکزی اور ذیلی احساس کا فرق بھی واضح ہو جائے گا۔ ہم یہ بھی جان سکیں گے کہ آرٹ کا حسن کارانہ عمل جذبہ کو قابلِ برداشت اور المناک ہونے کے باوجود نشاط افزا بناتا ہے یا نہیں۔ میر کا شعر بیک وقت دل کو مسوس کر رکھ دیتا ہے اور دماغ کو محظوظ کرتا ہے۔ دل کو مسوسنے والی کیفیت غالب کے شعر میں نہیں۔ وہ تمام نظمیں جو دل کو مسوستی ہیں یا چرکے لگاتی ہیں لیکن ہمیں کو جمالیاتی نشاط نہیں بخشتیں، آرٹ کے حسن کارانہ عمل کی آنچ سے محروم ہیں اور اسی لیے ناقص ہیں۔ ایسی نظموں میں بیان شدہ تنہائی یا دل گرفتگی کے احساس پہ فلسفیانہ تکرارِ دم بازیاں کرنے سے کیا حاصل۔ اس میں شک نہیں کہ تنہائی کا احساس صنعتی تمدن میں زیادہ شدید ہو گیا ہے کیونکہ آدمی اپنی مانوس وابستگیوں اور حیاتیاتی رشتوں سے کٹ گیا ہے۔ جدید ادب نے اس احساس کو بیان کر کے اپنے وقت کی ایک اہم جذباتی صورتِ حال کو گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے، لیکن یہ سمجھنا کہ محض تنہائی کا احساس بڑے ادب کی تخلیق کا ضامن ہے خوش فہمی ہے۔ احساس میں نہیں بلکہ احساس کے بیان میں فن کا حسن مضمر ہے۔ اگر محض خلوص سے کام چل جاتا تو نوجوانوں کے لکھے ہوئے عشقیہ نغمے عشقیہ شاعری کا عظیم کارنامہ ثابت ہوتے۔ آرٹ جذبہ کی تندی اور تیزی کا انکار نہیں کرتا بلکہ اس پر اختیار پانے کی کوشش کرتا ہے۔ اندرونی بھراؤ اور فارم کے نظم و ضبط کے TENSION سے عظیم آرٹ جنم لیتا ہے سازندہ جانتا ہے کہ مضراب کی ضرب کو قابو میں نہ رکھا گیا تو آہ کراہ میں اور کراہ چیخ میں بدل جائے گی جو ہسٹریا ہے یا پلکوں پر رکے ہوئے آنسو سسکی میں اور سسکی گریہ زاری میں بدل جائے گی جو رقت ہے۔

آپ کا چوتھا سوال تبلیغ و ترسیل اور ان کے خلط ملط

کے بارے میں ہے۔ آج کل جن مسائل کے بارے میں
میں بات چیت کرنا اور سوچنا پسند نہیں کرتا، ان میں نثری نظم،
لسانیاتی تنقید، اور ادب اور پروپیگنڈے کے مسائل پیش
پیش ہیں۔ اس مسئلہ پر پچاس صفحہ کا ایک پورا مضمون "منیق النفس
اور پھونپو" کے عنوان سے شبخون میں لکھ چکا ہوں۔ آپ میرے مضامین
کے پھکڑ عنوانات پر نہ جائیے۔ انہیں پڑھیے۔ عنوان کی پھبتی میں
پچاس کتابوں کے مطالعہ کا بار دو بھرا ہوتا ہے۔

ترقی پسندوں کا سب سے بڑا المیہ یہ تھا کہ انھوں نے
ادب کو پروپیگنڈا سمجھا اور اس سے پروپیگنڈے کا کام لیا۔ یہ
ادب کی جمالیاتی قدروں کی نئی تاویل یا تفسیر نہیں تھی نہ ہی اُن سے
انحراف تھا، بلکہ اُن کا VULGARIZATION تھا۔ ادب
میں تادیب، تلقین، تعلیم اور ترغیب کے عناصر ہوتے ہیں
بعینہٖ اسی طرح جس طرح عورت میں مرد اور مرد میں عورت
کی بائیولوجیکل خصوصیات ہوتی ہیں جن اُن کے توازن اور
تناسب میں ہے۔ یہ کہہ کر کہ عورت میں بھی مرد کی خصوصیات
ہوتی ہیں عورت کا بطور مرد کے استعمال PERVERSION
ہے۔ معمولی لکھنے والے ادب کے کسی ایک عنصر کو سب کچھ
سمجھ کر اسے واحد طریقۂ کار کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ہوریس
اور ڈرائیڈن اور تمام نوکلاسیکی ادیب جانتے ہیں کہ ادب کا کام
تعلیم دینا ہے لیکن پرنشاط طریقہ پر۔ اب یہ جمالیاتی نشاط و
مسرت کی پنخ نے ادب کو کبھی بھی معلمانہ سطح پر گرنے نہیں
دیا۔ یعنی ایک تناؤ پیدا ہو گیا تعلیم و نشاط کے بیچ اور ہر بڑے
شاعر حتیٰ کہ شیلی کی بھی کوشش یہی رہی کہ شاعری مفکرانہ اور
دانشمندانہ ہونے کے باوصف معلمانہ یا DIDACTIC
نہ بنے۔ ترقی پسندوں نے اس تناؤ کو ختم کر دیا اور ایک
کے حق میں فیصلہ کر بیٹھے۔ فی الحقیقت فنکارانہ تناؤ میں
جینے کے کیا معنی ہوتے ہیں وہ ترقی پسندوں نے جانے
ہی نہیں، کہ اُن کے لیے دُنیا کے دوسرے TENSIONS کی
کمی نہیں تھی۔ ایلیٹ جیسا غالی علامت پسند شاعر بھی جب
ڈاگما اور ڈاکٹرائن کی بات کرتا ہے تو ٹیرا ٹسکی کا ہم نوا
ہو جاتا ہے۔ یعنی ذرا سوچئے تو سہی کہ شاعری کو سماجی
طور پر معنی خیز بنانے کے باوجود اسے فلسفہ اور سیاست
کی عکاسی نہ بنانے کی حکمتِ عملی کے دوران وہ کیسی فنکارانہ
کشمکش سے گزرا ہوگا۔ ترقی پسند تو اتنے سہل انگار
تھے کہ سماجی ادب اور پارٹی لٹریچر میں بھی فرق کرنے کی
زحمت اٹھانا نہیں چاہتے تھے۔ ادبی رجحانات ہمیشہ
جدلیاتی عمل کے ذریعہ پروان چڑھتے ہیں۔ میں نے اوپر
جذبہ اور فارم کے تناؤ کا ذکر کیا ہے۔ ایسا ہی تناؤ شخصی
اور غیر شخصی آرٹ میں ہوتا ہے۔ سماجی ادب اور
خالص ادب میں ہوتا ہے۔ ادب میں سماج چاہیے،
ادب میں سماج نہیں چاہیے۔ اس پیکار سے وہ ادب
جنم لیتا ہے جس میں سماج ہوتا ہے لیکن ادب ادب ہی
رہتا ہے ترقی پسندوں نے حتمی فیصلہ کر لیا کہ ادب میں
سماج چاہیے تو سماج تو آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا لیکن
ادب سمٹ سمٹا کر محض حسنِ بیان بن گیا۔ حالانکہ حسنِ
بیان بھی ادب میں اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب ادب
سے سماجی حقائق کے محض بیان یا صحافتی بیان کا نہیں
بلکہ انکشاف کا کام لیا جائے محض بیان کا کام لیں گے
تو تخلیقی تخیل اپنی سب سے بڑی طاقت یعنی قوتِ ایجاد
ہی سے محروم ہو جائے گا۔

پروپیگنڈا کا لفظ ترقی پسندوں کے ہاتھوں نہیں بہر حال
وہ تو شاعر و ادیب تھے بلکہ سیاست دانوں کے ذریعہ اس
قدر بدنام اور نفرت انگیز بن چکا ہے کہ ادب آرٹ اور
تہذیب کے معاملات پر غور کرتے وقت اب لوگ
اس کا استعمال تک کرنا پسند نہیں کرتے۔ پروپیگنڈا تعلیمی
اخلاقی، اور سماجی مقصدیت والے ادب کا بدل نہیں ہے
بلکہ اس کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ جدید ریاست کے
پاس غیر معمولی اقتدار آنے کے بعد پروپیگنڈا فرد کی
انفرادیت کو توڑنے کا سب سے مکروہ ذریعہ بن گیا
ہے، اور فنکار کو جو چیز سب سے زیادہ عزیز ہوتی ہے
وہ اس کی انفرادیت ہے۔ وہ گرد و پیش کی اشیا کو
اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہے، دوسروں کی بخشی

ہوئی نظر سے نہیں۔ پھر شاعری کا تعلق سچائی سے ہے۔ وہ سچائی جسے فنکار کی آنکھ بے نقاب کرتی ہے۔ وہ ایک خاص لمحہ میں شفق کو دیکھتا ہے اور اسے گلستاں پر آگ برستی دکھائی دیتی ہے۔ فی الحقیقت ایسا ہوتا نہیں۔ لیکن وہ جو بات کہہ رہا ہے وہ جھوٹ نہیں ہے۔ فریبِ نظر بھی نہیں ہے، بلکہ ایک مخصوص صورتِ حال میں ایک منفرد نظر کا سچا مشاہدہ ہے۔ جب وہ کہتا ہے کہ

سو رہی ہے گھنے درختوں پر
چاندنی کی تھکی ہوئی آواز

تو ہم جانتے ہیں کہ وہ جھوٹ نہیں کہہ رہا حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ چاندنی کی آواز نہیں ہوتی۔ لیکن شاعر تمام حقیقتوں کی اصل کو دیکھتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ SYNTHESIS ہے، ANALYSIS نہیں، اسی لیے پتھر کا دل چیرنے پر خورشید کا لہو ٹپکنے کے نظارے پر ہم حیران نہیں ہوتے۔ کائنات کی آخری حقیقت اگر محض تنہائی ہے تو کثرت فریبِ نظر ہے اور وحدت اصل حقیقت، پھر تو وہی نظر گراں مایہ نظر ہے جو رقص صاعقات اور گریۂ شبنم اور آتش گل، اور آواز کے دیپک کا مشاہدہ کر سکے کہ یہ وہ حقائق ہیں جنھیں ہم احساس کی دنیا میں دیکھتے ہیں ورنہ ہم جانتے ہیں کہ خارج کی دنیا میں جس کا بیان سائنس کرتی ہے بجلی، اور شبنم، اور پھول اور آواز کی کیا حقیقت ہے۔ آنکھ کھلتے ہی ایک نیرنگِ تماشا ہمارے سامنے آتا ہے۔ سب جیتے جی کا کھیل ہے۔ آنکھ بند ہوتے ہی تماشا خواب و خیال بن جاتا ہے۔ تو اصل چیز وہ آنکھ ہے جو تماشا کرتی ہے۔ یہ آنکھ چیزوں کو اپنے حقیقی رشتوں میں دیکھتی ہے۔ اسی لیے سائنس کی حقیقت اس کے لیے قابلِ قبول نہیں ہوتی۔ سائنس کی اتنی زبردست تحقیقات کے باوجود کائنات پراسرار ہی ہے اور سائنس کی دنیا میں رہنے کے باوجود فنکار اس رجائیت کو قبول نہیں کر سکا جس کا کسی زمانہ میں فلسفۂ سائنس دعویدار تھا۔ کہنے کا مطلب یہ کہ شاعری جو علم نفسی ہے وہ سچا ہے کہ اس کا تعلق آدمی کی حواس کی دنیا سے ہے اور آدمی حواس کے ذریعہ ہی خارج کی دنیا کا عرفان حاصل کرتا ہے۔ پروپیگنڈا جھوٹ کا بھی ہو سکتا ہے اور عموماً جھوٹ ہی کا ہوتا ہے کہ جو بات سچ نہیں ہوتی اسے بار بار کہنا پڑتا ہے اور نقارہ بجا کر کہنا پڑتا ہے۔ شاعری کی بات بظاہر جھوٹ نظر آتی ہے لیکن سچ ہوتی ہے پروپیگنڈے کی بات بظاہر سچ نظر آتی ہے لیکن جھوٹ ہوتی ہے جب کبیر کہتا ہے کہ رام اور رحیم ایک ہیں تو بظاہر یعنی ظاہر پرستوں کو اس کی بات جھوٹ معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت میں سچ ہے بھارتی کرانتی کے پروپیگنڈسٹ جب کہتے ہیں کہ ہندوستانی مسلمان ہندوستانی نہیں ہیں تو ظاہر پرستوں کو بات درست معلوم ہوتی ہے اور داڑھی مسجد اور رسم الخط سب بدیسی معلوم ہوتا ہے، لیکن ہم جانتے ہیں کہ یہ بات جھوٹ ہے۔ وہ آدمی جو دور دراز ملکوں میں عیسائی مذہب کی تبلیغ کرتا ہے ممکن ہے بڑا کام کر رہا ہو لیکن وہ جارج ہربرٹ، ڈن، ملٹن اور ایلیٹ سے جو عیسائی شاعری کرتے ہیں مختلف آدمی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ جارج ہربرٹ اور ایلیٹ دونوں میشنری کام پر روانہ ہوں اور یہ کام انہیں شاعری سے زیادہ اہم نظر آئے لیکن یہ حقیقت ہے کہ شاعری اور جس قسم کی شاعری انھوں نے لکھی تبلیغ کے کام کے لیے موزوں ثابت نہیں ہو۔ انہیں نثر ہی سے کام لینا پڑے گا اور مذہب کے مبادیات کی آسان زبان میں تبلیغ کرنا ہوگی۔ ان کی شاعری ان کی روحانی دارو گیر کی کہانی ہے۔ اور دار و گیر، اپنی ذات سے پیکار، شاعری کا جوہر اور تبلیغ کے لیے زہر ہلاہل ہے۔ اسی لیے عموماً ایک سوال یہ بھی کیا جاتا ہے اور اس سوال سے سردست میں الجھنے کی کوشش نہیں کروں کہ آیا احتجاج بنیادی طور پر شعری رویہ ہے یا نثری؟ ۔ کہنے کا مطلب صرف یہ کہ شاعری جو اپنی اصل میں ایک منفرد شخصیت کے منفرد احساس کی ترجمانی کا کام کرتی رہی ہے شاید بطور ذریعۂ تبلیغ کے اس وقت تک بہت کام نہ آسکے جب تک اسے احساس کی کشمکش اور تخلیقی تخیل کے پیچیدہ عمل سے نجات دلا کر نثر کی سطح پر نہ لایا جائے۔ لیکن یہ ایک بحث طلب نکتہ ہے

لیکن میں سوچ رہا ہوں کہیں تبلیغ و ترسیل سے آپ کا مطلب ابلاغ اور ترسیل تو نہیں ہے۔ اگرچہ تو میں اس مسئلہ پر زیادہ نہیں لکھوں۔ میں ادب میں کمیونی کیشن کا قائل ہوں لیکن یہ نہیں مانتا کہ نظم کسی ایک پیغام، یا ایک معنی یا ایک ایسا خیال جس کو نثر میں بیان کیا جاسکے کی ترسیل کرتی ہے۔ کرسکتی ہے اور کرتی بھی رہی ہے لیکن یہ لوازماتِ شعریں سے نہیں ہے خیالات کی پیش کش ضرب الامثال اور ADAGES کی صورت میں ہوئی ہے لیکن ایسی اخلاقی یا تعلیمی شاعری اس شاعری سے بہت مختلف ہے جس کا ہر لفظ ایک پہلو دار تجربہ کے رگ و ریشہ کو سنبھالے ہوتا ہے۔ نظم میں کسی خیال کی ڈوری کو تھام کر چلنے کی عادت قاری کو تہہ دار اور پیچیدہ شاعری سے لطف اندوز ہونے کی راہ میں حائل ہوتی ہے۔ نظم وہی ہوتی ہے جو کچھ کہ وہ کہتی ہے اور جو کچھ وہ کہتی ہے وہ لفظوں کے لغوی معنوں کے حوالے سے نہیں کہتی بلکہ اُن آوازوں کے ذریعہ بھی کہتی ہے جو ایک مخصوص عروضی نظام کے تاروں پر لفظوں کے تھرکنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ نظم کی گٹھری سے معنی کا گُروا نکالنے کی ایک دلچسپ مثال آرکی بالڈ میکلیش نے دی ہے۔ ایک بڑے عالم نے ایک بار فرمایا کہ ارنسٹ ہیمنگوے کی ناول بوڑھا آدمی اور سمندر سے جو خیال قاری اخذ کرتا ہے وہ ساٹھ ہزار لفظوں اور کم از کم ایک گھنٹہ کے مطالعہ کے بعد اسے ملتا ہے۔ یہی خیال ایک ماہر مصور کی تصویر سے آدمی چند منٹ کے مشاہدے کے بعد حاصل کرسکتا ہے۔ مکلیش نے بتایا ہے کہ یہ ایسی ہی بات ہے جیسی کہ کوئی ڈورے کی اُن تصویروں سے جو ڈانٹے کے جہنم کا نقشہ کھینچتے ہیں ڈانٹے کے نظامِ افکار سے واقف ہونے کی بات کرے۔ بڑے ادب پاروں کے "خیالات" سے واقفیت پیدا کرنے کی ستم ظریفی ہمارے کمرشیل اور افادیت پسند کلچر کا عطیہ ہے۔ میں نے اُن بچوں کو دیکھا ہے جو کامِک میں کارامو زوف، جرم و سزا، اور ہیملٹ کی مصور کہانیاں پڑھتے تھے جب [illegible] نصابی کتابوں چڑھائی تو رالدین نے فرمایا کہ کیا مضائقہ ہے اگر کامِک کے ذریعہ ہی بچے عظیم شہکاروں سے واقف ہوجائیں۔ میں نے جز بز ہوکر کہا کہ کیا ضروری ہے کہ بچے اس عمر میں عظیم شہکاروں سے واقف ہی ہوں۔ اُن کا زمانہ تخیل اور فنتاسی کی دنیا میں جینے کا زمانہ ہے۔ پھر یہ وقت لوٹ کر نہیں آئے گا اور ایک خاص عمر کو پہنچ کر اُن سے حاتم طائی اور الف لیلہ کا پڑھنا مشکل ہوجائے گا۔ دوسری بات یہ کہ جرم و سزا اور ہیملٹ میں اُن کی دلچسپی قتل اور انتقام میں زیادہ ہوتی ہے کیونکہ کمرشیل کامِک انہی پہلوؤں کو سنسنی خیز بنا کر دولت بٹورتا ہے۔ نصابی کتابوں کی تدوین کے سلسلہ میں بھی میرا اربابِ حل و عقد سے اسی مسئلہ پہ جھگڑا تھا۔ وہ غیر دلچسپ اخلاقی کہانیاں رکھنا چاہتے تھے جب کہ میں ایسی دلچسپ کہانیوں پہ اصرار کرتا تھا جو تخیل حیرت اور تجسس کے جذبہ کو مہمیز کرتی ہوں اگر بچوں کا تخیل ہی کُٹھل رہا تو اخلاقی تعلیمات بھی اپنا کام نہیں کرتیں۔ بیورو کریٹ ذہین بھی ہوتا ہے تعلیم یافتہ بھی، اپنے فرائض سے آگاہ اور اخلاقی اصولوں سے واقف بھی، لیکن عموماً غیر تخیلی آدمی ہوتا ہے اس لیے دوسروں کے مصائب اور تکالیف کا اندازہ نہیں کرسکتا نہ دوسروں کی ضرورتوں کو سمجھ سکتا ہے۔ شعر و ادب کا مطالعہ اسی لیے ضروری ہے کہ وہ دوسروں کے جذباتی مسائل کا عرفان عطا کرتے ہیں اور انسان کو بہتر طور پہ سمجھنے کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔ ہماری عیاری دیکھیئے کہ بچوں کو جو اخلاقی تعلیمات ہم دیتے ہیں ان پر ہم خود عمل نہیں کرتے ورنہ سماج اتنا سڑا اندھا نہ ہوتا اور دُنیا اتنی ناقابلِ برداشت نہ ہوتی۔ بچوں کو ہم سکھاتے ہیں کہ باپ کا ادب کرنا چاہیئے لیکن جس قسم کے باپ ہم نے پیدا کیے ہیں اُن کا ادب کرنے والے بچے غوث اور قطب ہو سکتے ہیں آدمی نہیں۔ تخیل کی قیمت پر اخلاقیات پر زور غیر تخیلی سماج کا کارنامہ ہے۔ یہ کارنامہ ترقی پسند نقادوں نے بھی انجام دیا ہے اور اعلیٰ ترین تخیلی نگارشات کو اس لیے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا کہ وہ کھلے طریقہ پر اخلاقی اور سماجی تعلیمات دینے سے دامن بچاتی ہیں۔ ترقی پسند نقاد کا کردار ایک سخت گیر مُلّا کا کردار ہی ہے جو ادب کی مالیت

سے زیادہ سماج کی صحت کا خیال کھائے جاتا ہے۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ یہ نقاد نظم سے خیال کو الگ کرکے اسے سماجی افادیت کی کسوٹی پہ پرکھتے ہیں۔ یہ معلمانہ طریقہ ہے کہ معلم اس نظم کو پڑھانے سے قاصر ہوتا ہے جس کے خیال کو نظم سے الگ کرکے اپنی نثر میں وضاحت سے بیان نہ کرسکے۔ ہمارا دور معصومیت کے خاتمہ کا دور ہے۔ بقول محمد علوی:

منہ زبانی قرآن پڑھتے تھے
پہلے بچے بھی کتنے بوڑھے تھے

ادب کی طرف بھی ہم نے معصوم تحیر اور کھلنڈرے پن کا احساس گنوا دیا ہے۔ بقراط بنے بیٹھے ہیں۔

آپ کا پانچواں سوال ہے کہ جدید ادب کو ایک مدت تک معتوب قرار دینے کے بعد ترقی پسند ناقد اب اسے ترقی پسندی کی توسیع قرار دیتے ہیں۔ اس میں نئے عرفان کو دخل ہے یا پسپائی کا اعتراف ہے۔ یہاں یہ بات یاد رکھیے کہ جدیدیت میں ایک لہر نئے ریڈیکلزم کی تھی اور ہے۔ اردو میں ہی نہیں بلکہ مغرب میں بھی۔ یہ ریڈیکلزم .... بہت ابھر کر سامنے نہیں آیا لیکن اس کے وجود سے انکار تنقیدی دیانتداری نہیں ہے۔ جدیدیوں کا انحراف ترقی پسندوں کے پارٹی اور پروپیگنڈا لٹریچر کے خلاف تھا اور درست تھا۔ وہ ادب سے چند زیادہ معنی خیز کام لینا چاہتے تھے۔ پروپیگنڈا لٹریچر تو ادبی کام تک نہیں کرتا معنی خیز ادبی کام کی تو بات ہی جانے دیجیے۔ ادبی منصوبہ بندی فنکار کی انفرادیت اور آزادی پر پہرے بٹھاتی ہے، اور اس کے خلاف جدیدیوں کی بغاوت وقت کا مطالبہ تھی۔ پھر جن عقائد پہ ترقی پسندی کی اساس تھی وہ بھی خروشچیف کے ورود موعود کے بعد سالم نہیں رہے تھے۔ جدیدیت پر وجودیت کا اثر بھی گہرا تھا لیکن فنکار طبعاً یاسیت کے مقام میں بہت زیادہ نہیں رہتا۔ مغرب میں عیسائیت یا مارکسزم میں وجودیوں نے پناہ ڈھونڈی۔ کامیو جیسے لوگ جو پناہیں تراشنا پسند نہیں کرتے ایک ایسے ہیومنزم کے داعی بنے جس کی رواقیت صرف چند مضبوط اور برگزیدہ بزرگوں کے لیے ہی قابلِ قبول ہوسکتی ہے۔ عام آدمی اس رواقیت کو مشکل سے قبول کرتا ہے پھر سارتر کا مارکسی ہیومنزم جیسی لبرل انقلابی کا تصور پیش کرتا ہے وہ بھی بہت تسکین بخش نہیں۔ لبرل انقلابی بننے سے آدمی کے روحانی اور مابعد الطبعیاتی مسائل کہاں حل ہوتے ہیں، اور یہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ سائنسی فلسفہ اور اس معنی میں نیا فلسفہ اور نئے عمرانی علوم رجائیت پیدا کرنے میں تا حال ناکام رہے ہیں۔ انسان کے بنیادی سوالات کا ان کے پاس کوئی تشفی بخش جواب نہیں۔ اس لیے آسودہ ترین مادی حالات میں بھی انسان کی آسودگی مشتبہ ہی رہی ہے۔ مادیت انسانی آرزؤں کی تسکین کا بیڑا اٹھاتی ہے لیکن انسانی آرزومندی اپنے جوہر میں ہی غیر اطمینانی کا بیج لیے ہوتی ہے۔ اس لیے وہ فلسفہ جو صرف مادی سروکاروں کو حاصلِ حیات سمجھتا ہے اپنے IMPASSES آپ پیدا کرتا ہے۔ مذہب کی خوبی یہ رہی ہے کہ وہ تجریدی تصورات کے ذریعہ نہیں بلکہ RITUALS کے ذریعہ انسان کو تجربہ میں جینے اور زندگی کو معنی خیز بنانے کا کام کرتا ہے۔ لیکن مذہب عقلیت پسند دور میں مدافعتی جنگ کھیل رہا ہے اور آج کا فنکار روحانی مساروں کے چھن جانے کے بعد خالص انسانی دنیا کی انسانی تفسیر کرنے پر مجبور ہے لیکن تسکین بخش طریقہ پر نہیں کر پاتا۔ تھک ہار کر وہ مذہب میں پناہ ڈھونڈتا ہے۔ اس طرح جدیدیت کا ایک روحانی ڈائمنشن ہے اور ہمارے یہاں عمیق حنفی کمار پاشی، منیر نیازی، عادل منصوری وغیرہ کی شاعری میں اسے دیکھا جا سکتا ہے۔ مغرب کے ادب کی داستان ذرا طویل ہے اور اسے یہاں بیان کرنے کا موقع نہیں۔ لیکن اس مابعد الطبعیاتی مسئلے کے علاوہ جدیدیوں کا ایک اہم مسئلہ یہ بھی رہا ہے کہ کھلم طریقہ پہ مقصدی افادی تعلیمی اور پروپیگنڈسٹ بنے بغیر ایسا ادب کس طرح پیدا کریں جو سماجی طور پہ معنی خیز ہو۔ اس مسئلہ پہ میں نے سماجی ادب اور کمٹمنٹ کے ادب کے عنوان سے

ایک مضمون لکھا ہے جو عنقریب شائع ہوگا۔ بہت سے جدید شاعروں نے مثلاً عمیق حنفی، بلراج کومل، محمد علوی، زبیر رضوی باقر مہدی وغیرہ نے کسی آئیڈیولوجی سے کٹ ہوئے بغیر سماجی مسائل پر اچھا ادب تخلیق کیا ہے۔ سماجی مسائل پر جدید شاعروں کا رویہ ترقی پسندانہ لبرل اور انسان دوست ہے۔ مثلاً زبان کا مسئلہ، فسادات کا مسئلہ، جنگ جمہوریت عورت، غربت اور سماجی انصاف کے مسائل پر کوئی بھی جدید شاعر رجعت پسند، فاشسٹ، اور یمینی انداز میں نہیں سوچتا۔ ایک نظم آپ ایسی نہیں بتا سکتے جس میں سماجی مسائل پر OBSCURANTISM کے پردے پڑے ہوں حالانکہ فنکاروں کے لیے یہ مشکل نہیں رہا کہ مثلاً جنگ کو وہ آگ بتائیں جس میں انسانیت اپنا شباب پاتی ہے۔ ترقی پسندوں نے اگر جدید شاعری کا غور سے مطالعہ کیا ہوتا تو انہیں معتوب کرنے کی وجوہات نظر نہ آتیں کیونکہ سماجی مسائل میں جدید شاعروں کا رویہ ترقی پسندانہ اور لبرل ہی تھا۔ رہے سیاسی معاملات تو بین الاقوامی سطح پر خود ترقی پسندوں کے لیے روس چین اور بین الاقوامی کمیونزم کے قصیدے پڑھنا ممکن نہیں رہا تھا۔ ترقی پسند سٹالن کے عہد کو برا بھلا کہتے تھے اور آج بھی کہتے ہیں۔ جدیدیوں کا مسئلہ محض سٹالن کا عہد نہیں تھا بلکہ وہ خوف تھا جسے آمریت کے بر دز نے اُن کے دلوں میں پیدا کیا تھا ہٹلر اور سٹالن کے بعد، بیریا کے پولس راج کے بعد، جدید شاعر ریاستی اقتدار کی بے محابا مرکزیت اور بے لگام استعمال سے خوف زدہ تھا۔ جدیدیت کا سب سے بڑا کارنامہ مغرب میں اور ہمارے یہاں بھی انسان کی ذہنی اور جسمانی آزادی پر حتمی اصرار، اور ہر نوع کے جبر و احتساب کے خلاف شدید بغاوت ہے۔ ترقی پسند یہاں پر جدیدیوں سے ہاتھ ملا کر رخصت ہوتے ہیں کیونکہ انہیں ماسکو کا ہوائی جہاز پکڑنا ہے جدیدیوں نے امریکہ کی تعریف نہیں کی، لیکن انھوں نے روسی کمیونزم کو قبول کرنے سے بھی صاف انکار کر دیا۔ روس کے سرکش شاعروں سے انہیں ہمدردی تھی جب کہ ترقی پسندوں نے سرکشوں کے خلاف ہمیشہ جبر و احتساب کا ساتھ دیا۔ جدیدیوں نے ویٹ نام اور چلی پر نظمیں لکھیں لیکن ان کا نقطۂ نظر حزبی نہیں تھا، انسانی تھا۔ جدیدیوں کے سامنے کمیونزم کی کوئی ایسی نئی تفسیر نہیں آئی تھی جو انہیں بتاتی کہ جمہوری نظام کو قائم رکھتے ہوئے کمیونسٹ سماج کا قیام ممکن ہے۔ آمریت، مطلقیت، اجتماعیت کے ہولناک تجربات کا جس ذہن نے مشاہدہ کیا تھا وہ جمہوریت کی قدروں کو چھوڑنے پر رضامند نہیں تھا۔ ادھر ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کی احمقانہ اور رجعت پسندانہ سیاست نے بھی انہیں برگشتہ خاطر کیا تھا۔ اس لیے عموماً جدید فنکاروں کا کمیونزم کی طرف رویہ تشکیک کا رہا تھا کچھ لوگ البتہ مارکسی پارٹی اور نکسل واد کی طرف راغب ہوئے لیکن اُن کی تحریروں میں یہ رغبت کوئی قابلِ قدر آئیڈیولوجی کی تشکیل کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی یعنی اُن کی تحریریں ایسے مباحث نہیں اُٹھاتیں جو آئیڈیولوجیکل سطح پر غور و فکر کی دعوت دیتی ہوں۔ ترقی پسندوں نے سی پی ایم اور نکسل واد میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ جدیدیوں میں نئے ریڈیکلزم کے سب سے بڑے داعی باقر مہدی ہیں۔ لیکن باقر بنیادی طور پر ایسے انفرادیت پسند باغی ہیں جو انارکزم کی حوض میں وضو بنانے سے نہیں گھبراتے۔ ترقی پسند مارکسی کمیونسٹوں کو قبول نہیں کرتے تو باقر کو کیا خاک قبول کریں گے۔ اور ویسے بھی مثلاً فرانس کی کمیونسٹ پارٹی بغاوت اور انقلاب کی باتوں کے باوجود آرتھوڈوکس اور کلاسیسٹ ہے جب کہ فنکاروں کی بغاوت رومانی ہوتی ہے اور انارکزم رومانیت کا منطقی نتیجہ ہے۔ اس پس منظر میں میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ کونسی جدیدیت کونسی ترقی پسندی کی توسیع ہے جو ترقی پسند نقاد توسیع کی بات کرتے ہیں وہ اسٹبلشمنٹ کی بڑی فربہ تنخواہیں کھانے والے اور ضخیم و جسیم وظیفے بٹورنے والے نقاد ہیں۔ مارکسزم ان کے لیے ڈرائنگ روم دانشوری

کی دانشورانہ زیبائش سے زیادہ کچھ نہیں۔ کمیونسٹ پارٹی کی رجعت پسند پالیسی کے بعد ان کے پاس ایک ہی راستہ تھا کہ وہ مارکسی کمیونسٹ پارٹی یا نکسلواد کے حلیف بنتے۔ اس میں جان کا زیاں اور نقصانِ مایہ تھا۔ لہٰذا مارکسزم کی بات کرتے رہے جو پارٹی کے جھمیلوں سے اور ٹھوس سیاسی موقف اپنانے سے آدمی کو بچانے کا آسان ترین طریقہ ہے۔ جن جدید شاعروں نے جدیدیت کو ترقی پسندی کی توسیع کہا ان میں وحید اختر پیش پیش ہیں۔ ایک طویل مضمون میں میں ان سے اختلافِ رائے کر چکا ہوں۔ دراصل جس قسم کی شہر آشوبی شاعری وحید اختر کر رہے تھے اس کا جدید شاعری میں کوئی مقام نہیں تھا۔ ان کی شاعری کا پورا فارم یعنی زبان ڈکشن اور لب ولہجہ روایاتی تھا۔ ان کے موضوعات سماجی اور سیاسی طنز کے موضوعات تھے۔ وہ دراصل اپنی شاعرانہ شخصیت کا تعین نہیں کر پائے۔ وہ ایک ایسے سماجی باغی ہیں جسے شکستِ ذات کا غم اتنی مہلت نہیں دیتا کہ سماج کے خلاف بھرپور بغاوت کریں۔ ایک نیوروٹک باغی کے طور پر اگر وہ اپنی شخصیت کا اثبات کرتے تو شاید ہملٹ بن سکتے تھے لیکن ہملٹ بننے کے لیے اپنی ذات سے نفرت اور سرگشتگی کے جن عناصر کی ضرورت ہے وہ ان میں نہیں ہیں۔ سماجی اور سیاسی طنز کے لیے جس بھراؤ اور کاٹ کی انہیں ضرورت ہے وہ بھی ان میں نہیں ہے۔ ان کی نرگسیت ان کے سماجی اور سیاسی سروکاروں کو ایک انقلابی کے سروکار بننے نہیں دیتی۔ غرض یہ کہ ایسی ہی بہت سی باتیں ہیں جن کی وجہ سے ان کی شاعری گوناگوں لغزشوں کا شکار رہی۔ اپنی کمزور شاعری کو جدید ثابت کرنے کے لیے انھوں نے جدیدیت کو ترقی پسندی کی توسیع کہا۔ یہ بات ترقی پسندوں کے لیے بھی بہت FLETLERING نہیں ہے کہ کمزور شاعری کو اگر ترقی پسندی کی توسیع کہہ دیا جائے تو اس کی قدر بڑھ جائے۔ وحید اختر اسی طرح یہ بھی کہتے رہے کہ روایتی فارم میں جدید شاعری ممکن ہے۔ حالانکہ جدیدیت کی پہچان اس کا وہ فارم ہے جو نئے احساس کے ساتھ ناگزیر طور پر سامنے آتا ہے۔ اگر جدید شاعروں میں کسی کو سب سے زیادہ اپنی شخصیت سے گریز اپنی شعری روایت سے انحراف اور ایک زبردست اجتہاد کی ضرورت تھی تو وہ وحید اختر کو تھی۔ یہ باتیں میں معاندانہ طور پر نہیں لکھ رہا کیونکہ وحید اختر سے میرے مراسم اچھے ہیں اور میں ان کی دوستانہ محبت کا معترف ہوں۔ لیکن تنقید میں میں صاف گوئی سے کام لیتا ہوں اور الفاظ چبا کر بات نہیں کرتا۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ میں نے اپنے وقت کے بہترین دماغوں کو تباہ ہوتے دیکھا ہے۔ قاضی عبد الستار اور وحید اختر جیسے لوگوں کا اپنے فن سے آگاہ نہ رہنا وقت کا بڑا المیہ ہے۔ مجھ جیسے لوگوں کے لیے شخصی سانحہ بھی کہ میں دوسروں کے دیے ہوئے آرٹ پر جیتا ہوں۔ یہ باتیں بھی میں نہ لکھتا اگر وحید اختر کا دوسرا مجموعۂ کلام پہلے سے بھی زیادہ مایوس کن نہ ہوتا۔ وحید اختر کو زبان و بیان پر زبردست عبور حاصل ہے۔ لیکن کیا فائدہ اگر اسے نیا موڑ دے کر نئے آہنگ میں بدل نہیں سکتے۔ تجربہ کا ایسا خوف۔ پرانے ڈھرے پر ایسی ثابت قدمی، اور یہ سب کیوں اور کس لیے۔ شاعری یوں کبھی اچھی نہیں ہو رہی اندھیرے میں ایک چھلانگ اور سہی۔

آپ کا چھٹا سوال بہت طویل ہے اس لیے دہراؤں گا نہیں۔ لیکن یہ ملک و قوم کی تعمیرِ جدید میں ادب کے کردار ادا کرنے کے متعلق ہے۔ اور آپ یہ پوچھتے ہیں کہ شاعروں کو بھگتی تحریک اور صوفی مت کے شاعروں کی طرح ایک نفسیاتی ماحول تیار کرنا چاہیے یا چند مخصوص نعروں کو بھی اپنی نگارشات میں جگہ دینی چاہیے۔ میں نے ادب نئے ریڈیکلزم کی بات کو ادھورا اسی سوال کے لیے چھوڑا ہے کیا ہمارے ملک میں ایک ایسا انقلاب آچکا ہے کہ لیبارٹری تنقید کے تمام امکانات ختم ہو چکے۔ یاد رکھیے کہ دورِ جدید کا کوئی بھی باشعور فنکار STATUS-QUO کو برقرار رکھنے پر کبھی بھی رضامند نہیں

ہوگا۔ آدمی کو ایک بار یہ محسوس ہو جائے کہ جس سماج میں وہ رہتا ہے وہ سماج انصاف کی قدروں پر قائم نہیں تو وہ خود اطمینانی کا شکار کبھی نہیں ہوتا۔ مارکسزم کی یہی طاقت ہے کہ وہ کسی کو چین کی نیند سونے نہیں دیتا۔ وہ انسانی ضمیر پر ضرب لگاتا ہے۔ عافیت کوشی اور طمانیت کو پارہ پارہ کرتا ہے۔ آدمی اتنا نیک معصوم اور خیراندیش نہیں جتنا کہ ترقی پسند سمجھتے ہیں۔ جلبِ منفعت، حبِّ جاہ، خود غرضی اور مادّہ پرستی کا آسیب سماج کے ایک بڑے طبقے کے لیے زندگی کو اجیرن بنا دیتا ہے۔ سماجی تفریق اور بگاڑ کا تماشائی فنکار کسی نہ کسی نہج سے احتجاج کرتا رہتا ہے اس کے احتجاج کو جو چیز معنی بخشتی ہے وہ اقدار کا شعور ہے۔ دورِ جدید میں یہ اقدار مارکسی ہیومنزم کی بخشی ہوئی تھیں۔ شکستِ خواب کے بعد یہ قدریں بھی تہس نہس ہو گئیں۔ لیکن مارکسزم کا نعم البدل کوئی اور فلسفہ ابھی تک منصۂ شہود پر نہیں آیا۔ میں کہہ چکا ہوں وجودیت یا تو مذہب میں پناہ ڈھونڈتی ہے، یا مارکسزم میں یار واتیت میں۔ ہمارے یہاں مارکسی اقدار کی ازسرِنو تدوین کا عمل شروع نہیں ہوا۔ ایک تو اس وجہ سے کہ یساری سیاست خود بحران میں ہے اور یساری دانشوری کا محاذ کمزور ہے۔ دوسرے اس وجہ سے کہ پرانے ترقی پسندوں کا مارکسی مطالعہ ویسے بھی کمزور تھا۔ اس میں سیاسی پمفلٹ بازی اور فنا ٹسزم کا عنصر زیادہ تھا اور مفکرانہ غور و خوض کا کھلائیت کا یہ عالم تھا کہ ادب آرٹ اور تہذیب کی مارکسی تفسیر کی روشنی میں مرزا ترسون زادہ کے علاوہ ہر فنکار حرام زادہ نظر آتا تھا تیسری وجہ یہ کہ وہ جنھیں مارکسزم سے دلچسپی تھی جیسے باقر مہدی اور عالم خوندمیری وہ بھی مارکسی آئیڈیولوجی کی بحث کو ایک نیا موڑ نہ دے سکے۔ کہنے کا مطلب یہ کہ جن حالات میں ہم رہ رہے ہیں اُن میں وہ فنکار جو سماجی مقصدیت والا ادب پیدا کرنا چاہتا ہے زیادہ دنوں تک اپنے احتجاج کے لیے بغیر کسی آئیڈیولوجیکل BASE کے جی نہیں سکتا۔ نیا ریڈیکلزم مارکسزم ہی میں یہ BASE تلاش کرتا ہے کیونکہ جن ریوہیکل انسانی بستیوں اور

اقتصادی مسائل کا ہمیں سامنا ہے وہ صوفی مت کی طرح نفسیاتی ماحول پیدا کرنے سے حل نہیں ہوتے۔ چنانچہ اگر ہم فنکار کی مکمل آزادی کے قائل ہیں تو اسے یہ بھی حق ملنا چاہیئے کہ وہ سماجی احتجاج کا ادب تخلیق کرے اور اپنے طور پر مارکسزم اور جمہوریت، مارکسزم اور مذہب، مارکسزم اور انفرادیت میں ایک نیا توازن تلاش کر کے ایک نئی انسان دوستی کی بنیاد رکھے۔ پھر ہر ملک و قوم کی زندگی میں ایک ایسا لمحہ آتا ہے جس میں بنیادی اور انقلابی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ فنکار کو اس لمحہ کا رجز خواں بننے سے کون روک سکتا ہے۔ نعرہ بازی تو نعرہ بازی ہی سہی۔ وہ اس لمحہ کے گیت ضرور گائے گا۔ سوال صرف یہ ہے اور یہ بہت اہم سوال ہے کہ کیا جنگ، انقلاب، اور اتھل پتھل کے بحرانی دور کے شعری میلانات کی بنیاد پر ایک پائدار جمالیاتی فلسفہ کی تشکیل ممکن ہے؟ اگر ممکن بھی ہے تو کیا پسندیدہ ہے؟ —— میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ غیر معمولی حالات کے گزر جانے پر ادب اور آرٹ سے وہی کام لینا چاہیے جو وہ کرتے رہے ہیں اور جس کے وہ اہل ہیں۔ یہ نکتہ کمیونسٹ روس نہیں سمجھ سکا اور انقلاب کے بعد ادب کو ریاست کی داسی بنا دیا۔ یہ فنکار کی آزادی کا انکار تھا۔ اس سے ایک بات اور کھل کر سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ ادب آرٹ اور تہذیب جمہوری ممالک میں ہی پنپ سکتے ہیں۔ یہ تصور کہ ریاست کے آمر اور غیر آمر ہونے کا ادب پر کوئی اثر نہیں پڑتا سرے سے باطل ہو جاتا ہے۔ یاد رکھیے کہ جدید ریاست آمر ہی نہیں بلکہ TOTALITARIAN ہوتی ہے اور انسان کی ہر فکری اور تخلیقی سرگرمی کو اپنی آئیڈیولوجی کے رنگ میں رنگتی ہے۔ ریاست کا ایسا کوئی تصور قدیم زمانہ میں نہیں تھا۔ اس سے ایک دوسرا سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا سوشلزم اور جمہوریت کی ثنویت کو ختم کر کے ایک نیا توازن پیدا کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ اسی طرح آج کی دنیا میں ہر آن بدلتے معاشی نظریات کے

تناظر میں مارکسی معاشیات کو حق بجانب ثابت کرنے کے ہمارے پاس کون سے شواہد ہیں؟ سمجھئے کہ ملی جُلی معاشیات ہمارے اقتصادی مسائل کا حل ہو تو احتجاجی ادب کی نظریاتی بنیاد کیا ہو گی؟ کیا اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم ملی جلی معاشیات، خوش حال سماج، جمہوری نظام اور لبرل تصورات کے اس دور سے گزر رہے ہوں گے جس میں فنکار احتجاجی ادب سے صرفِ نظر کر کے زیادہ معنی خیز انسانی تجربات کو موضوعِ سخن بنائے۔ پھر اس کا کام ملک و قوم کی تعمیرِ نو کے لیے نفسیاتی ماحول تیار کرنے کا نہیں رہتا بلکہ صرف ادب تخلیق کرنے کا رہتا ہے جیسا کہ شیکسپیئر اور غالب نے کیا۔ فنکار کو کسی بھی تعمیرِ نو کے کام میں لگانے کا مطلب ریاستی بیوروکریٹ کو اس کے پیچھے لگانے کا ہوتا ہے اور یہ فنکار کی بنیادی آزادی کے خلاف ہے۔

اس بنیادی آزادی کا مطلب آپ سمجھ لیں تو آپ کے آخری سوال کا جواب بھی مِل جائے گا۔ فنکار کو کس قسم کا ادب تخلیق کرنا چاہیے اس کا فیصلہ بہر صورت اسے ہی کرنا پڑتا ہے۔ یہ فیصلے نہ ریاست کر سکتی ہے نہ بیوروکریسی، نہ اکاڈمی نہ نقادوں کا جرگہ۔ اگر فنکار محسوس کرے کہ اسے سماجی احتجاج اور سماجی مقصدیت کا ادب تخلیق کرنا چاہیئے تو اپنے کام کے لیے مناسب طریقۂ کار کی تلاش کا پورا بار بھی اسے ہی سنبھالنا ہوتا ہے۔ نقاد اسے ادب تخلیق کرنے کے گر نہیں بتا سکتا۔ نقاد تو زیادہ سے زیادہ یہ دیکھے گا کہ اس ادب کی خوبیاں اور اس کی حدود کیا ہیں۔ اسی طرح اگر فنکار اپنی افتادِ طبع کے مطابق یہ محسوس کرے کہ یہ بار وہ نہیں اٹھا سکتا، اور سماجی مقصدیت والا ادب اس کے بس کا روگ نہیں تو اسے پورا حق ہے کہ وہ اپنے مزاج کے مطابق وہی کام کرتا رہے جسے کرنے کی اس میں صلاحیت اور اہلیت ہے۔ اگر وہ انسانی تعلقات کے نازک رشتوں، انسان کی جذباتی پیچیدگیوں اور اپنے روحانی کرب کی عکاسی کرنا چاہتا ہے تو اس کا اسے پورا حق ہے۔ فنکار کی آزادی کا جو تصور میرے ذہن میں ہے وہ یہ ہے کہ اسے نہ صرف آمر ریاستوں کے جبر سے بلکہ آئیڈیلوگ کی آئیڈیولوجی اور نظریہ سازوں کے نظریات کے جبر سے بھی آزاد ہونا چاہیے۔ فنکار سماجی اور سیاسی شاعری کرنے اور نہ کرنے دونوں میں آزاد اور خود مختار ہے۔ یہ تنقید کا فریضہ ہے کہ ہر نوع کی شاعری کی کھری جانچ پڑتال کے ذریعہ بتاتی رہے کہ مثلاً سیاسی MUSE کی کیا حدود ہیں اور مذہبی یا رومانی MUSE کے کیا تخلیقی امکانات ہیں۔ اچھی تنقید قدغن اور تادیب سے کام نہیں لیتی۔ البتہ وہ یہ ضرور دیکھتی ہے کہ فنکار نے اپنے لیے جو تخلیقی جولانگاہ پسند کی ہے اس میں تخیل کے ارفع ترین مقامات کو چھونے کے امکانات کتنے ہیں۔ اگر نقاد سماجی مسائل والے ادب کو ادب کا صحیح ترین یا واحد ترین روپ کہنے سے انکار کرتا ہے تو یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ احتساب کر رہا ہے بلکہ اس کی حدود کا تعین کر رہا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ فن پارے جو تخلیقی تخیل کی کرشمہ سازیوں کے بے نظیر نمونے ہیں ان فضاؤں میں جنم لیتے ہیں جو فوری سماجی مسائل سے بلند ہوتی ہیں۔ ان مقامات پر فنکار کی نظر نہ ہو تو اس کا سماجی ادب بھی صحافتی بن جاتا ہے۔ اعلیٰ ادب فوری سماجی مسائل سے سروکار نہ رکھنے کے باوصف چونکہ انسانی ذہن کو رفعت بالیدگی اور کشادگی بخشتا ہے، اس لیے ایک انسانی اور سماجی فریضہ ہی انجام دیتا ہے۔ اس لیے مجھے ترقی پسندوں کی یہ تقسیم کہ سماجی ادب صحت مند ہوتا ہے اور وہ ادب جو سماجی مسائل کی بجائے نفسیاتی روحانی اور جذباتی مسائل سے سروکار رکھتا ہے بیمار ہوتا ہے، کبھی پسند نہیں آئی۔ تنقید میں صحت مند اور بیمار ادب کی اصطلاحوں کو میں معتبر نہیں سمجھتا۔

آپ کا یہ جملہ کہ ادب ناپسندیدہ جذبات کے پُر امن اخراج کا ایک ذریعہ ہے، سخن گسترانہ ہے اور ادبی نقاد سے بہتر ماہرِ نفسیات اس پر تبصرہ کر سکتا ہے گو آج تک ماہرینِ نفسیات نے جس قسم کی ادبی تنقیدیں لکھی ہیں ان کے پیشِ نظر میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس جملہ پر تبصرہ کر کے بھی وہ کونسا قلعہ سر کریں گے ـــ ادب موت کا بھی ذکر کرتا ہے،

گلتی سڑتی لاشوں کا بھی، شمشان اور قبرستان کا بھی، قتل و خون ریزی کا بھی، گناہ اور جرائم کا بھی، GROTESQUE اور MACABRE کا بھی۔ میں نے خود پر آرنلڈ کی اعلیٰ سنجیدگی کو مسلط نہیں کیا اس لیے MINOR شاعری سے بھی لطف اندوز ہو سکتا ہوں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ فنکار کا فن قتل کو قصابیت اور عریانی کو فحاشی بننے نہیں دیتا۔ برہنہ عورت کا مجسمہ اشتعال انگیز نہیں ہوتا کیونکہ آرٹ اتنا غالب ہوتا ہے کہ نظر خطوطِ جسم کا احاطہ کرنے کے باوجود جسم سے نہیں مجسمہ سے لطف اندوز ہوتی ہے۔ کمرشیل کیلنڈر میں چونکہ آرٹ ہی ناقص ہوتا ہے نظر عورت کو دیکھتی ہے تصویر کو نہیں۔ گھناؤنے پن پر آرٹ غالب ہو تو گورستانی ادب بھی نشاط افزا ہے۔ ڈن اپنے محبت کے نغموں میں بھی قبر، لاش، گورستان اور آسیب کا ذکر کرتا ہے لیکن عشقیہ نغمہ کی پاکیزگی کہیں مجروح ہونے نہیں پاتی۔ بادلیئر کی SPLEEN کی نظموں کی بیابانی کیفیت بھی نشاط انگیز ہے۔ خراب آرٹ میں اچھا خیال اور صحت مند جذبہ بھی اپنی اثرانگیزی کھو دیتا ہے۔ اگر آرٹ خراب ہے تو خدا کی حمد بھی ایسی لگتی ہے گویا کوئی کلرک ہیڈ کلرک کی خوشامد کر رہا ہے۔ کیشمیر پر لکھی گئی خراب نظموں سے وہ نظم بہتر ہے جس میں قبرستان کی سوگوار فضا کی کامیاب عکاسی ہے۔ برنارڈ شا نے اس تمام بحث کو ایک جملہ میں بیان کر دیا ہے کہ لوگ تھیٹر میں خوبصورت ٹانگیں اچھالتی حسین دوشیزاؤں کی بجائے شیکسپیئر کی چڑیلوں کو دیکھنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔

▲▲

غزلیں

عروج زیدی

پھول ہی پھول ہیں دامانِ شکیبائی میں
آپ جائیں تو ذرا بات کی گہرائی میں

کسی سناٹے کا امکانِ تعاقب بھی نہیں
سازِ دل چھیڑ دیا کرتا ہوں تنہائی میں

حیرتِ جلوہ گری! تجھ کو پتا ہو شاید
کس نے آئینے جڑے چشمِ تماشائی میں

جلوتوں نے تو کبھی فرصتِ تعمیر نہ دی
زندگی زندگی بن جائے گی تنہائی میں

آپ کی یاد کے انداز رفاقت کی قسم
میں اکیلا نہ رہا عالمِ تنہائی میں

موت کو داخلِ اندازِ شفا یابی کر
اِک اضافہ سہی اعجازِ مسیحائی میں

میرا افسانۂ غم شوق سے سنیئے لیکن
تلخیاں بھی تو ہوا کرتی ہیں سچائی میں

اس روش کا بھی میں شاکی تو نہیں ہوں لیکن
آپ کچھ اور تھے آغازِ شناسائی میں

کچھ عجب موڑ مری زیست میں آیا ہے عروج!
میں دو محفل میں سکوں یاب نہ تنہائی میں

▲▲

منوہر لال ہادی

منزل دھواں دھواں ہے ڈگر غیر معتبر
شاید ہے زندگی کا سفر غیر معتبر

لمحوں کی فوج کا کرو ڈٹ کر مقابلہ
ہوتا ہے بے دلی کا سفر غیر معتبر

سودا اگر ضمیر! نہ کر روح کا زیاں
ہے تیرا جامِ شور و حضر غیر معتبر

یوں تو کبھی تلک کوئی منزل نہ پاؤ گے
چھانٹی ہے تم نے راہ گزر غیر معتبر

وہ بھی بھٹک رہا ہے اسے بھی ملی نہ راہ
دل غیر معتبر ہے، نظر غیر معتبر

پہنچے وہاں تو صرف اندھیرے کھڑے ملے
نکلا دیارِ علم و خبر غیر معتبر

سمجھے کوئی یہ راز تو ہادی بتاؤں بھی
ہے رات بے ثبات، سحر غیر معتبر

▲▲

راہی قریشی

کبھی نجات ملے رنج و درد سے مجھکو
کسی خوشی کی تمنا ہی بخش دے مجھکو

مری رسائی سے پہلے ہی بجھ نہ جائے کہیں
وہ روشنی، جو بلاتی ہے دور سے مجھکو

تمام شہرِ وفا، وحشتِ بے نیازی ہے
کہاں خلوص کا سایہ دکھائی دے مجھکو

اسی کے قرب کو تنہائیاں ترستی ہیں
ہر آئینے میں یہاں جو دکھائی دے مجھکو

مجھے اس آئینہ خانے میں کون پہچانے
کہ اپنا عکس بھی اب اجنبی لگے مجھے

دیارِ نغمہ کو آخر یہ کیا ہوا راہی
بس اِک صدائے خموشی سنائی دے مجھکو

▲▲

★ گیسو حد الدین خاں رامپور یوپی ۲۴۴۹۰۱ ★ ۱۴۱ سیکٹر ۳-آر کے پورم - نئی دلی ۲۲ ★ ۸۱۔ چندر یا نگر، ملز روڈ، گلبرگہ، کرناٹک

غزلیں

جمنا پرشاد راہی

کوئی آزر ہو تو باقی ہے ابھی کام بہت
بے خد و خال ہیں کہسار میں اصنام بہت

اُن درختوں کے مقدر میں بھی لکھ فصلِ یقیں
جن کی شاخوں پہ ہے شادابیِ ابہام بہت

زندگی تا حدِ امکاں ہے سرابوں کا سفر
پھر بھی گنجائشِ ایماں ہے بہر گام بہت

جن کی دہلیز پہ گھٹتے ہیں انا کے سورج
ان کی ہر صبح پہ بھاری ہے مری شام بہت

تھا ازل ہی سے ہمیں خوفِ چلنِ غم خانہ
گو کہ مشکل نہ تھی تعمیرِ در و بام بہت

تم مرے ذکر سے محتاط رہو گے کب تک
کل کے اخبار اچھالیں گے مرا نام بہت

▲▲

مختار شمیم

دشت ہے جن کا مقدر دیکھیے
ان کی آنکھوں میں سمندر دیکھیے

گہری خاموشی کا منظر دیکھیے
اپنے اندر بھی اتر کر دیکھیے

ایک اک ساعت کا دینا ہے حساب
ایک اک لمحے کا محشر دیکھیے

لوگ شیشے کے مکاں میں بند ہیں
اور ہاتھوں میں ہیں پتھر دیکھیے

آگ میں لپٹا ہوا ساون ملے!
سبز جنگل سے گزر کر دیکھیے

▲▲

اختر آنولوی

جلووں کو تیرے آج سرِ عام دیکھ کر
شرمندہ ہوں میں ذوقِ نظر خام دیکھ کر

ساقی کی اور بڑھ گئیں بے التفاتیاں
دستِ طلب میں ٹوٹا ہوا جام دیکھ کر

خاروں کو بھی نہ ہوگی تمنائے فصلِ گل
اب موسمِ بہار کا انجام دیکھ کر

ہر ذرہ دل کا ہے غمِ جاناں کی جلوہ گاہ
چلنا غمِ حیات بہر گام دیکھ کر

دنیا بھی میرے دل کی طلب گار بن گئی
میرا خلوص میری وفا عام دیکھ کر

اختر نہ جانے کس لیے ہیں مجھ پہ طعنہ زن
کچھ لوگ اُن کے ساتھ مرا نام دیکھ کر

▲▲

★ سکریٹری علی گڑھ لٹریری سوسائٹی۔ علی گڑھ ★ گورنمنٹ گرلز کالج۔ موتی طبیلہ۔ اندور ۲۰۲-۴۵۲ ★ دفتر ماہنامہ رنگ، سنگ ۲۴۲ کھنیا بازار کانپور

نظمیں

سلیمان خمار

(۱)

تعجب ہے
کہ جب ہم نیند سے جاگے
تو سمتیں ـــــ
(جو ازل سے طے شدہ ہیں)
رُخ بدل کر
کیوں کھڑی تھیں

▲▲

(۲)

دھند کے اُس پار
جس چمکتی جگمگاتی ـــ بستی کو
سارے لوگ دیکھ رہے ہیں
مجھے وہ کیوں دکھائی نہیں دے رہی ہے

▲▲

(۳)

ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے
ذرا دیر ٹھہرو
ابھی اور چہروں سے پردے ہٹیں گے

▲▲

(۴)

اگر یہ تم ہو
تو وہ کون تھا ـــ جو
مرے ساتھ پچیس سال سے
شانہ بشانہ، قدم سے قدم کو ملا کر
زندگی کے سفر پر
بڑے عزم سے ـــ
مرے ہاتھ میں ہاتھ دے کر چلا تھا
اور ـــ یہ وعدہ کیا تھا
کہ
وہ آخری سانس تک ساتھ دے گا مرا

تم نے دیکھا تو ہوگا اُسے
تم ہی اب بتاؤ
اچانک وہ کب اور کہاں کھو گیا ہے
مجھے آخری سانس لینے کی خاطر ضرورت ہے اُس کی

▲▲

نظمیں

حفیظ آتش امروہوی

زخمی رات

سورج چھپا تو رات کے پر پھیلتے گئے
پھر یوں ہوا کہ تیز ہواؤں کے دوش سے
آندھی اتر کے گیلے درختوں پہ چھاگئی
کچھ شاخیں ٹوٹ کر جو درختوں سے آ پڑیں
اک ساتھ فاختائیں کئی چیخ کر گریں
کچھ گھونسلوں کو تیز ہوائیں نگل گئیں
دن پھر نکل رہا ہے مگر اونگھتا ہوا
قاتل سیہ رخوں کا لہو سونگھتا ہوا

▲▲

اعجاز اعظمی

زندگی

گھن گرج، میگھ، خوف، تنہائی
بڑھ رہے تھے سبھی دشاؤں سے
ہاتھ پھیلائے ـــــ
اندھکار کے بھوت!

نیم شب، محو خواب سناٹا
ٹمٹماتے دیے کی زخمی لو
لے رہی تھی سنبھل کے انگڑائی

پو پھٹی صبحِ نو نکھر آئی

ایک پیغام زندگی لے کر!
کیفِ صد جام و سرخوشی لے کر!!
سازِ و مضراب و نغمگی لے کر!!
مسکرانے لگے گل و گلزار

▲▲

سیّد بشارت علی

موت اپنے سر پہ لادے

موت اپنے سر پہ لادے
ہم ہواؤں کے لہو کو چوستے ہیں
جسم پر آرائشوں کے میلے دھبّوں کو سجا کر ناچتے ہیں
گیت بن کر آسماں کی وسعتوں میں گونجتے ہیں
اور آخر روح کے صحرا کی تپتی ریت کے اندر اتر جاتے ہیں اک دن

▲▲

★ چھوٹو سونا پور، ایم، ایس، علی روڈ، بمبئی ۸ ★ اعظمی بیکری بالرہ، جالان نیپانی پوسٹ ڈکسن ایل ایس ملائیشیا ★ لائف انشورنس ریپریشن آف انڈیا ماسٹی برانچ، بشیر باغ، حیدرآباد - ۲۹ - آندھرا پردیش

عظیم اقبال

شناخت

دونوں کو ہی اُمید تھی کہ ماں کا خط آج ملے گا —— نہیں ملا تو تشویش ہوئی۔ اُس پر جھنجلاہٹ ہوئی۔ غصّہ بھی آیا —— ایسا ہی کرتی ہے۔ جھوٹی! دو مہینے بیتے۔ آئی نہیں، بُلایا بھی نہیں۔ چٹھیوں میں پیاری پیاری باتیں لکھ بھیجتی ہے بس! صرف تاکیدیں۔ جی میں آتا ہے وہ سب کیا جائے جس کے لیے منع کرتی ہے۔ وہ سب نہ کیا جائے، جو وہ چاہتی ہے۔

...... ریما آج پھر آئس کریم کھائے گی —— گھنٹہ بھر بعد بولے گی تو آواز نکلے گی —— سائیں، سائیں! گلا دُکھے گا —— کھانستے کھانستے آنکھیں اُبل پڑیں گی۔ چہرہ لال ہو جائے گا۔ دوا لے گی؟ ہُش! بالکل نہیں ....

...... وِدّیا آج انگریزی کمپوزیشن نہیں چھوئے گی۔ ایک دم نہیں۔ صرف ناول پڑھے گی —— نیل کی جھیل تلے، فیل کرتی ہے تو .... ڈیم اِٹ .....

نیم کے پیڑ پر دھوپ سرک رہی تھی۔ آہستہ آہستہ دو لوگ لٹکتے تاروں کے قریب سے اُفق میں گھور رہی تھیں —— مسلسل۔ کیا کچھ؟ ..... کبھی نظریں بھٹک کر ریل کی پٹریوں تک چلی جاتیں، خود بخود۔ سیٹیاں گونجتیں ..... چھک! چھک! دُھواں پھیل جاتا، اُدھر پہیئے گھومتے رہتے۔ دھڑ! دھڑ! دھڑ! ڈبے گزرتے ..... کالے سروں کا سمندر —— کھڑکیوں سے کوئی ہاتھ نہیں ہلاتا —— ٹاٹا! ..... دُور تک خلا، سنّاٹا... ....کوئی آواز نہیں۔ صرف پڑوسی رانی کی میاؤں، ... میاؤں۔ سویٹی! سویٹی! چُپ .....

وہ چونک اُٹھیں۔

آنٹی آگئی تھیں۔ شیاملی۔ سفید نائیلیکس کی ساڑی میں لہریں اُٹھ رہی تھیں۔ کندھوں پر سیاہ بادل اُمڈ پڑے تھے۔

"شبنو!"

"آنٹی!"

"اندر چلو....؟"

کیسی سُندر ہے آنٹی! پھول جیسی کومل۔ جیسے دودھ سے دُھلی ہو۔ کیسے لچک لچک کر چلتی ہے! ساکت کھڑی ہو تو لگتا ہے جیسے سرسوتی کی مورت ایستادہ ہو —— تیرے ہاتھوں کی وینا کیا ہوئی، تیرے سر کا تاج، تیری سواری —— سفید ہنس؟

ماں کچھ موٹی ہو گئی ہے ...... اُسے توجہ دینی چاہیے ..... لیکن ہے اب بھی پریوں جیسی نفیس، حسین ..... ! ہنستی ہے تو کیسا بھلا لگتا ہے! یکایک کھِلکھِلا پڑے تو لگے جیسے ستار کے تاریک بارگی جھنجھنا اُٹھے ہوں —— جھن، ن ..... !

"رِمّی! آ تیری چوٹیاں گوندھ دوں —— سر دھویا تھا آج؟ —— تیرے ناخن کتنے بڑھ گئے ہیں! .... گندی!"

بلو جرسی پہنے ماموں فٹ بال کھیلنے جا رہا ہے —— گیند کو ہِٹ کرے گا —— دَھپ! دوڑ دوڑ کر تھک جائے گا۔ پسینے میں شرابور آئے گا۔ آتے ہی کہے گا ——

"لو نوا! چل میرے پیر دبا —— زور سے ......
ہاں! شاباش! —— دیدی، جائیے ......"
جائیے، جائیے، جائیے .....
" ماموں، تم اتنی چائے مت پیا کرو —— مجھے پسینہ
آتا ہے —— !"
" آں! چل سگریٹ نکال —— ماچس....."
" اوں! کھوں، کھوں، کھوں —— دھواں
اُدھر پھینکو ماموں! دم گھٹ جائے گا"
" پانی پلائے گی؟ ٹھنڈا"
ماموں کیسے میٹھے گلے سے گاتا ہے —— جیسے
شیلندر سنگھ گا رہا ہو۔ میں شاعر تو نہیں مگر... اُف!
یہ سگریٹ ..... دھواں، دھواں، دھواں ......
تلسی کے پودے کے پاس کھڑی نانی سنکھ بجا رہی
تھی —— چراغ کی لو تھرتھرا رہی ہے۔ ہوا چل رہی
ہے۔ شر..... ر..... ر..... نانی ہاتھ جوڑے کھڑی
ہے۔ آنکھیں موندے —— ماں تو یہ سب مانتی ہی
نہیں —— کہتی ہے —— ڈھکوسلہ ہے —— کبھی
برت نہیں رکھتی ہے۔ مندر بھی نہیں جاتی..... تم
نے درگا ماتا کو ناراض کر دیا ہے ماں! ...... ماں،
ماں، ماں......
پچھواڑے مندر میں گھنٹی بج رہی تھی —— ٹن ——
ن .....ن..... پرارتھنا شروع ہو گئی۔ کیرتن، کیرتن،
کیرتن —— کرشنا، کرشنا، کرشنا... راما، راما، راما...
" ماموں! میں چلوں؟ پڑھنا ہے"
"ہوں ..... !"
ماموں جھپکیاں لے رہا ہے۔ تھک گیا ہے شاید؟
.......سو جا، سو جا.....
اچانک جھلملاتی روشنی کو کالے دیو نے جھپ سے
اپنے سیاہ کمبل میں لپیٹ لیا —— کہیں کچھ نہیں
سوجھتا۔ دیوار سے دیوار تک ٹٹول ٹٹول چلیں۔ کھٹ!
کرسی ہے۔ یہاں کس نے گھسیٹ کر چھوڑ دی؟

" گھر میں موم بتی وغیرہ نہیں ہے؟ —— خلا کے
کیوں نہیں؟ ..... بجلی سالی ......"
نتا ہیں۔ آج بہت سویرے لوٹ آئے! وہ تو
اُجالے میں بھی لڑکھڑا جاتے ہیں۔ اندھیرے میں تو گر ہی
پڑیں گے۔
" وہیں ٹھہرو نتا! میں ٹارچ لاتی ہوں"
اندھیرا، اندھیرا، اندھیرا......
آج موسی پھر ڈانٹ سنے گی۔ نتا پکاریں گے ——
"شیفالی! آنٹی کیا جواب دے گی؟ نانی کہے گی ——
" شیالی! —— تم کچھ نہ کہنا"...... پروفیسر بیچارہ
گالیاں سنے گا۔
نانی سامنے آ جائے تو نتا بولتے بولتے یکایک
چپ ہو جاتے ہیں۔ گویا منہ میں زبان ہی نہ ہو.....
پپا جب بگڑتے تھے تو ماں اُبل پڑتی تھی۔ وہ کیا کیا بکتے۔
وہ بھی بکتی جاتی —— وہ چیختے۔ وہ بھی چیختی۔ وہ اُس کے بال
پکڑتے۔ تھپڑ مار دیتے۔ وہ اُن کے ہاتھ میں دانت گڑو
دیتی۔ پھر سسکتی تھی دیر تک ..... سوں، سوں، سوں
..... چپ ہو جا ماں! .... چپ ہو جا ..... چپ
ہو جا..... چپ ہو جا.....
پپا کو کہاں چھوڑ آئیں ماں؟ .... کدھر، کدھر، کدھر
..... پپا، پپا، پپا.....
میرے لیے گھوڑا نہیں بنو گے؟ چل، چل، چل مرے
گھوڑے چل .....
" ریما! کیرم کھیلے گی؟ تاش؟ چائنیز چیکر؟ ——
ٹلارڈ! اونگھتی ہے! کھا لے تب سونا..... چل، کچن میں
چل —— آنٹی ....."
بارش ہو رہی تھی —— چاندنی کیسی نکھر آئی ہے۔
شانت! —— ٹپ، ٹپ، ٹپ ..... ہار سنگھار ٹپک رہے
ہیں —— پتوں پر اوس کی بوندیں ہیں —— شیتل
تمہاری ٹھنڈی پیشانی کی طرح ماں! ..... لیکن تمہارے
ہاتھ تو تپ رہے ہیں .....

..... انکل! تم میرے لیے گھوڑا نہیں بن سکتے۔ تمہارا نفیس سوٹ میلا ہو جائے گا —— دیکھنا، ماں کے ہاتھ گدلے تو نہیں نا....... ؟

ایک ایک ہار سنگھار گوندھ کر تمہارے لیے گجرا بناؤں، ماں؟ مگر تمہیں تو بیلے پسند ہیں؟ بیلے کے سوکھے ہوئے ہار تم نے بہت سنبھال کر رکھے تھے۔ اُن کا کیا کرو گی؟.... خوشبو کے بنا پھول میں رکھا ہی کیا ہے؟ خوشبو، خوشبو، خوشبو.....

جھاڑیوں میں سرسراہٹ ہوئی —— کہیں سانپ نہ ہو؟ باپ رے! کاٹ لے تو —— موت! ریتا بہت روئے گی۔ اُوں، اُوں، اُوں..... ریما بھی سسکے گی —— ماں تو دھڑام سے بے ہوش ہو جائے گی۔ دانت بیٹھ جائیں گے۔ اے! میں مروں گی نہیں۔ اتنے سارے لوگوں کو رُلانا اچھا لگتا ہے کیا؟

گاڑی دھڑ دھڑاتی ہوئی گزر رہی تھی۔ دھڑ، دھڑ، دھڑ..... زمین کانپ گئی۔ تمہاری ٹرین کب آئے گی، ماں؟ ہمیں لینے آؤ گی نا؟ آنے سے پہلے تو تم خط لکھو گی —— پہلے اپنی سروس کا ٹیلیگرام دو گی۔ کب تک؟ —— ماں تم اکیلی آنا —— چاچاجی بالکل خراب لگتے ہیں —— اُنہیں ساتھ مت لانا.....

پیں پیں ...... شوں ...... گھرر...... کوئی کار تھی، نہیں جیپ۔ چندھیا دینے والی روشنی۔ آنکھوں میں چبھنے لگی۔ ہٹ سالے! جلدی سے موڑ کاٹ لو۔ یہیں سامنے کھڑی کرنا ہے! —— اوہ!

پھاٹک کھول کر موسی دبے قدموں کمپاؤنڈ میں داخل ہوئی۔

"شیفالی!"

نانی نے کھڑکی سے پکارا۔

"درشن!"

شیفالی نے دِدیا کی بانہہ تھام لی۔

"سوئیں نہیں؟ ..... بلو!"

مبہوت سی دِدیا اُس خوشبو کی شناخت کی کوشش کر رہی تھی جو ماں کے جسم سے، کپڑوں سے، انگ انگ سے بھی اکثر پھوٹتی رہتی ہے...!

۸۸

اُردو کے مسلم الثبوت استاد شاعر
مرزا محمد تقی مائل دہلوی کا پورا غزلیہ کلام

کلیاتِ مائل

مرتب: مولوی احترام الدین احمد شاغل عثمانی
ناشر: راجستھان ساہتیہ اکاڈمی
قیمت: تہتر۷۳ روپے پچاس پیسے

نازش بک سنٹر کی تازہ پیش کش

گوپال متل۔ ایک مطالعہ

محمد عبدالحکیم کا تحقیقی اور تنقیدی مقالہ جو عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کے ایم اے سالِ آخر کے لیے لکھا گیا۔ گوپال متل کی زندگی اور ان کے ادبی اور شعری کارناموں کا بھرپور جائزہ —— آخر میں گوپال متل کی نثری اور شعری نگارشات کا انتخاب بھی شامل ہے۔ قیمت: پندرہ روپے

بسمل سعیدی شخص اور شاعر

بسمل سعیدی کے فکر و فن پر دستاویزی اہمیت کی حامل کتاب ممتاز اہلِ قلم کے مضامین کا مجموعہ۔ آخر میں بسمل صاحب کا انٹرویو بھی دیا گیا ہے جو ہماری تاریخِ ادب کے بہت سے مخفی گوشوں کو سامنے لاتا ہے۔ قیمت: اٹھارہ روپے

نیشنل اکاڈمی ۹ انصاری مارکیٹ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

مجتبیٰ حسین | کمار پاشی ــــ یہ بھی ہے آدمی

دماغ پاشی کے نقصانات اور آب پاشی کے فوائد سے تو میں بہت پہلے سے واقف تھا لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ "کمار پاشی" کیا ہوتی ہے ، کیسے ہوتی ہے ، کب ہوتی ہے اور کہاں ہوتی ہے ، پھر مجھے یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ اس "پاشی" کے فوائد ہوتے ہیں یا نقصانات ۔ کھوج کی تو پتہ چلا کہ کمار پاشی اصل میں نام ہے اردو کے ایک شاعر کا ۔ سوچا کہ اس "پاشی" کے تو نقصانات ہی نقصانات ہوں گے لیکن یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ اس ذہنی تعصب کے باوجود دہلی میں جس پہلے ادبی شخص سے میری ملاقات ہوئی وہ یہی حضرت کمار پاشی تھے۔ بزرگوں کا کہنا ہے کہ صبح بستر سے اٹھو تو کوئی کام شروع کرنے سے پہلے نیک شگون کے طور پر کوئی اچھا سا چہرہ دیکھ لیا کرو تاکہ دن پر سکون گزر سکے ۔ اتفاق سے دہلی میں میری ادبی دوستیوں کا آغاز کمار پاشی کے چہرہ سے ہوا تھا ۔ میں کسی حد تک ضعیف الاعتقاد آدمی واقع ہوا ہوں ، بہت پچھتاتا رہا کہ کس کا چہرہ دیکھ لیا ۔ اس کام کے لیے مخمور سعیدی کیا برے تھے ۔ مگر اب پچھتائے کیا ہووت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت ۔

کمار سے میری پہلی ملاقات اروِن ہاسپٹل میں ہوئی تھی ۔ ان دنوں وہ اروِن ہاسپٹل کے ایڈمنسٹریٹیو شعبہ میں کسی ایسے عہدہ پر فائز تھے جہاں ان کا سابقہ ڈاکٹروں سے پڑتا تھا ، چنانچہ انواع واقسام کے ڈاکٹر ان کے آگے پیچھے منڈلایا کرتے تھے ، مریضوں کی نبضیں ڈاکٹروں کے ہاتھوں میں اور ڈاکٹروں کی نبضیں کمار پاشی کے ہاتھوں میں ہوتی تھیں ۔ نتیجہ میں یہ ڈاکٹروں کے بڑے محبوب شاعر بن گئے تھے ۔

بلکہ ایک نوجوان ڈاکٹر میں نے ایسا بھی دیکھا جو کمار پاشی کے کلام کو دوا کے طور پر تجویز کرتا تھا ۔ اس کے پاس کمار پاشی کا ایک مجموعۂ کلام تھا جس کی ہر غزل کے سامنے اس نے خوراکوں کے نشان بنا رکھے تھے ۔ پھر ان غزلوں کے نیچے ہر بیماری کا نام لکھا تھا اور کچھ اس طرح کی ہدایتیں لکھ رکھی تھیں کہ یہ غزل ناشتہ کے بعد پڑھی جائے ۔ اس غزل کے دو شعر دودھ کے ساتھ پڑھے جائیں ، یہ نظم نہار پیٹ پڑھی جائے وغیرہ وغیرہ اور پھر اس نے کتاب کے ٹائٹیل پر جلی حروف میں لکھ رکھا تھا ۔ Shake the book before use حالانکہ بعض کتابیں ایسی ہوتی ہیں جنھیں Shake after use کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے ۔ کمار مجھ سے اکثر کہا کرتے تھے کہ اگر آپ کسی مرض میں مبتلا ہوں تو بلا تکلف بتلا دیجئے ۔ جب انھیں اطلاع ملتی کہ کوئی دوست بیمار ہے تو وہ بہت خوش ہوتے تھے اور خوشی خوشی اس کا علاج اروِن ہسپتال میں کروا دیتے تھے نتیجہ میں اروِن ہسپتال کم از کم اردو ادیبوں اور شاعروں کا محبوب ہسپتال بن گیا تھا ۔ میں نے اروِن ہسپتال میں کمار پاشی کے اس اثر ورسوخ سے ذاتی طور پر صرف ایک بار فائدہ اٹھایا تھا ۔ ہوا یوں تھا کہ اچانک میری ایک ڈاڑھ میں درد شروع ہو گیا ۔ کمار کو اطلاع دی تو وہ اس اطلاع پر بے حد خوش ہوئے اور اپنے اثر ورسوخ کا مجھ پر رعب گانٹھنے کے لیے پورے چھ ڈاکٹروں کو اس ڈاڑھ کے علاج کے لیے مامور کر دیا ۔ ان چھ ڈاکٹروں نے طویل غور وخوض اور صلاح و مشورہ کے بعد میری وہ ڈاڑھ نکال دی جس میں درد نہیں تھا ۔

اردو سیکشن ۔ این ۔ سی ۔ ای ۔ آر ۔ ٹی ۔ آربندو گھوش مارگ ، نئی دہلی

اس کے بعد میں نے طب اور ادب کو کبھی ایک دوسرے میں ملانے کی کوشش نہیں کی۔

کمار کو میں شخصی طور پر چار برسوں سے جانتا ہوں۔ اس مدت میں کمار سے سینکڑوں ملاقاتیں ہوئی ہیں لیکن اس کے باوجود میں ابھی تک اس نتیجہ پر نہیں پہونچ سکا ہوں کہ کمار پاشی اصل میں کیا چیز ہیں شاید انھیں سمجھنے کے لیے مجھے اُن سے اور کئی برس ملنا پڑے گا۔ میں نے اس عرصہ میں بس اتنا ہی اندازہ لگایا ہے کہ کمار پاشی دراصل "سنجیدگی" اور "آوارگی" کے درمیان لٹکنے والا پنڈولم ہے۔ جو کبھی "سنجیدگی" کے دائرہ میں داخل ہوتا ہے اور کبھی "آوارگی" کے دائرہ میں۔ کمار کے گھر جاتا ہوں تو گھر کے قرینہ کو دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ یہ تو بے حد "سنجیدہ" آدمی ہے۔ اتنا سنجیدہ کہ اس کے گھر میں ٹیلی ویژن سیٹ، ریفریجریٹر اور ساری عصری ضروریات موجود ہیں جب کہ اردو کا روایتی شاعر صرف "ضرورتِ شعری" سے مطلب رکھتا ہے اور عصری ضروریات سے دور بھاگتا ہے۔ مگر جب کمار اس "سنجیدگی" کے دائرہ سے نکل کر اپنی "شاعرانہ آوارگی" کی سرحدوں میں داخل ہوتے ہیں تو یہ پتہ چلانا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ شاعر کبھی سنجیدہ بھی رہ سکتا ہے۔ آدمی کی "سنجیدگی" اُس کے گھر میں اور اُس کی "آوارگی" سڑک پر پائی جا سکتی ہے اور میں نے کمار کو "گھر" اور "سڑک" دونوں جگہوں پر دیکھا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جو شخص گھر میں اتنا "سنجیدہ" رہتا ہے وہ سڑک پر اتنا غیر سنجیدہ کیوں ہو جاتا ہے۔ یہ سوال ایسا ہے جس پر اردن ہسپتال کے ڈاکٹروں کو سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔

کمار کے بارے میں یہ تجزیہ میرا نہیں بلکہ خود کمار کا ہے، چنانچہ کمار نے اپنی ایک کتاب اپنے ایک دوست کے نام معنون کرتے ہوئے لکھا ہے "پریم گوپال متل کے نام جو میری آوارگی کے تذکرے سُن کر خوش ہوتا ہے۔"

دلچسپ بات یہ ہے کہ کمار نے اپنی "سنجیدگی" اور "آوارگی" کی بنیاد پر اپنے دوستوں کی تقسیم کر رکھی ہے۔ چنانچہ ان کے کچھ دوست ان کی "آوارگی کے دوست" ہیں اور کچھ دوست ان کی سنجیدگی کے دوست ہیں۔ کمار نے ازراہِ نوازش مجھے ہمیشہ اپنی آوارگی کے دوستوں میں شامل رکھنے کی کوشش کی مگر میں ہمیشہ کنی کاٹ جاتا ہوں۔ غالباً مخمور سعیدی وہ واحد شخص ہیں جو بیک وقت کمار کی سنجیدگی اور آوارگی دونوں کے دوست ہیں۔ ورنہ کمار ایک زمرے کے دوستوں کو دوسرے زمرے میں آنے نہیں دیتے۔ کمار کی شاعری مجھے "سنجیدگی" اور "آوارگی" کے درمیان ایک سمجھوتہ نظر آتی ہے۔ یہی وہ غیر جانبدار علاقہ ہے جہاں پہونچ کر کمار شعر کہتے ہیں، افسانے اور ڈرامے لکھتے ہیں۔ دراصل کمار کا کردار اور اُن کا فن گھر اور سڑک کے درمیان ایک "سرنگ" کی حیثیت رکھتے ہیں۔

کمار کی آوارگی کے تذکرے میں نے بھی سُنے ہیں اور میں بھی خوش ہوا ہوں۔ کبھی پتہ چلا کہ رات کمار نے فلاں نقاد کی ایسی تیسی کر دی۔ فلاں شاعر کا گلا پکڑ لیا۔ فلاں کی کھنچائی کر دی وغیرہ وغیرہ۔ ایسے لوگ اب کہاں ہیں جو اپنی ذات کو خطرہ میں ڈال کر دوسروں کے لیے تفریحِ طبع کا سامان فراہم کریں۔ اس معاملہ میں کمار کا دم غنیمت ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار یہ رات کے دو بجے اپنے گھر جانے کے ارادے سے نکلے اور سپریم کورٹ کی عمارت میں پہونچ گئے۔ دوسرے دن مجھے ان کی گمراہی کی اطلاع ملی تو پوچھا "کیوں حضرت! یہ آپ سپریم کورٹ کی عمارت میں کیوں چلے گئے تھے؟"

بولے "بھئی: انصاف مانگنے گیا تھا مگر چوکیداروں نے انصاف لینے نہیں دیا۔"

کمار کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ یہ کوئی ایک کام کر کے مطمئن نہیں ہوتے۔ شاعری یہ کریں گے، افسانے لکھیں گے، ڈرامے یہ لکھیں گے، کتابوں کا ترجمہ یہ کریں گے، دوستوں کی کتابوں کے دیباچے لکھیں گے۔ اور تو اور ادھر چند دنوں سے انھوں نے اپنے شاعر دوستوں کی کتابوں کے ٹائیٹل بھی بنانے شروع کر دیئے ہیں۔ کمار نے اتنے سارے متبادل راستوں کے ذریعہ یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ ادب سے اس قدر آسانی سے ٹلنے والے نہیں ہیں۔ لوگ شاعری پر اعتراض کریں گے

تو یہ افسانے لکھیں گے، افسانوں پر اعتراض ہوگا تو ڈرامے لکھیں گے، ڈراموں پر اعتراض ہوگا تو ترجمہ کریں گے۔ بھلے ہی کمبل انھیں چھوڑنا چاہے مگر یہ کمبل کو ہرگز نہیں چھوڑیں گے میں شخصی طور پر کمار کے افسانوں کو اُن کی شاعری کے مقابلہ میں زیادہ پسند کرتا ہوں۔ اسی لیے وہ مجھے بہت زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں میں اُن کے افسانوں کے گنے چُنے مداحوں میں ہوں ورنہ ہر شخص کمار کی شاعر کی حیثیت سے تعریف کرتا ہے۔

کمار جدید شاعر ہیں لیکن اس کے باوجود وہ مستقبل پر یقین رکھتے ہیں اور مستقبل سے نت نئی امیدیں وابستہ کرتے ہیں مستقبل پر ان کے ایقان کو ثابت کرنے کے لیے میں ایک واقعہ کا ذکر کروں گا جس نے مجھے بہت دنوں تک کمار سے شرمندہ رکھا تھا۔ میں اصل واقعہ بیان کرنے سے پہلے یہ بتلادوں کہ کمار کے چار لڑکیاں ہیں اور اولادِ نرینہ ایک بھی نہیں ہے۔ ایک بار میرے ایک دوست دہلی آئے جو علم نجوم میں بین الاقوامی شہرت رکھتے ہیں۔ کمار سے میں نے اپنے دوست کی آمد کا ذکر کیا تو وہ مسز کمار کو ساتھ لیے بھاگے بھاگے آئے۔ کہنے لگے "بھئی! میں آپ کے دوست سے ایک اہم مسئلہ پر مشورہ کرنا چاہتا ہوں"۔ میں نے کہا "مشورہ ضرور کیجئے مگر میں شخصی طور پر علم نجوم میں ایقان نہیں رکھتا"۔ بولے "بھئی بات دراصل یہ ہے کہ میری اور مسز کمار کی بڑی خواہش ہے کہ ہمارے گھر ایک لڑکا تولد ہو اور اس لڑکے کو پیدا کرنے کی کوشش میں اب تک ہم چار لڑکیاں پیدا کر چکے ہیں۔ اب اگر آپ کے دوست مشورہ دیں تو ہم لوگ پھر ایک بار لڑکا پیدا کرنے کی کوشش کریں گے"۔ میں نے اپنے دوست کو سارا ماجرا کہہ سنایا۔ میرے دوست نے بڑی دیر تک کمار اور مسز کمار کے ہاتھ دیکھے اور تنہائی میں انھیں یہ مژدہ سنایا کہ اگر اس بار کوشش کی جائے تو انشاءاللہ گوہرِ مقصود حاصل ہو جائے گا۔ کمار اور مسز کمار میرے ہاں سے خوش خوش گھر روانہ ہوئے۔ میں نے کمار کو کبھی اتنا خوش نہیں دیکھا۔ پھر پتہ چلا کہ کمار نے اپنے گھر میں وہ حالات پیدا کر لیے ہیں جو لڑکے کی ولادت کے لیے ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ جوں جوں لڑکے کی ولادت کے دن قریب آتے گئے کمار مجھے فون کر کے کہتے "بھئی! ذرا اپنے دوست کو اطلاع دیجیے ہم نے بس انہی کے کہنے کی بنا پر یہ کوشش کی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ معاملہ اُلٹ ہو جائے"۔ میں کمار کی معصومیت پر مسکرا کر رہ جاتا کہ یہ شخص کئی معاملوں میں دوستوں کی بات نہیں سنتا مگر اب دیکھیے کہ ایک نجومی کی بات پر اس نے اتنا بڑا خطرہ مول لیا ہے۔ کمار کی اس بے چینی کے باعث میں اکثر دعا کرتا کہ اس بار کمار کے ہاں لڑکا ہی پیدا ہو۔ اس سے ایک تو میرے نجومی دوست کا بھرم رہ جائے گا اور دوسرے یہ کہ کمار زندگی بھر میرے احسانمند رہیں گے۔ مگر ہوتا وہی ہے جو نجومیوں کو نہیں بلکہ قدرت کو منظور ہوتا ہے۔ شدید انتظار کے بعد ایک دن مخمور نے مجھے فون کر کے کہا "بھئی! تم نے تو کمار کے ساتھ بڑا اچھا پریکٹیکل جوک کیا ہے۔ اس بار بھی بیچارے کے ہاں لڑکی تولد ہوئی ہے"۔ اس اطلاع کے ساتھ ہی مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ مہینوں تک کمار سے نہیں ملا۔ مگر ایک دن مجبوراً کمار کے گھر جانا ہی پڑ گیا۔ کمار اپنی نومولود بچی کو گود میں اُٹھائے ہوئے تھے۔ مسکرا کر بولے "حضرت! یہی وہ لڑکی ہے جس کے لڑکا ہونے کی پیشین گوئی آپ کے نجومی دوست نے کی تھی"۔

مگر میں نے دیکھا کہ کمار اس لڑکی کو اس طرح سینہ سے لگائے کھڑے تھے جیسے اگر وہ لڑکا ہوتا تو شاید اُس سے اتنی محبت نہ کرتے۔ اُس وقت کمار کے آدمی پر اُن کے اندر بیٹھا ہوا شاعر غالب آچکا تھا۔

کمار میری کمزوری ہیں۔ اُن کی بے اعتدالیوں کے باوجود جب بھی کمار میرے مقابل ہوتے ہیں تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں آئینہ کے روبرو کھڑا ہوں۔ جیسے میں اپنے آپ کو اور اپنے اندرون کو دیکھ رہا ہوں۔ کمار اپنی شاعری کے معاملہ میں بڑے بے نیاز آدمی ہیں۔ اس لیے میں نے انھیں کبھی "عرض کیا ہے" اور "توجہ چاہتا ہوں" ۔۔۔

(باقی صفحہ [illegible] پر)

غزلیں

ستیہ نند جاوا

ہمارے جسم نے جس جسم کو بلایا ہے
وہ روح بن کے کھڑا دور مسکرایا ہے

پتہ چلا کبھی شہرِ انا وہیں پر تھا
جہاں کھنڈر پہ نیا شہر اب بسایا ہے

جس آئینے پہ دھندلکوں نے کھینچ دی چلمن
اسی نے عکس ہمارا ہمیں دکھایا ہے

تمام رات جھروکوں سے رات کے جھانکے
جو دن کی روشنی میں آج تک پرایا ہے

کوئی کھڑا ہے درِ دل پہ منتظر کب سے
مہکتی سانسوں نے آکر ہمیں بتایا ہے

رام پرکاش راہی

جب ساز گار رکھ دیا چلتی ہوا کا نام
ایسے میں کیا ضرور، خدا، نا خدا کا نام

اے دامنِ شکیب یہ آنسو نہیں مرے
غیرت نے لکھ دیا ہے دلِ نارسا کا نام

ہر جنم، اِک امینِ مکرّر رنجات کا
یا درد، جس نے دھار لیا ہو دوا کا نام

جب سر دُھنے بغیر ہی پائیں گی نبضِ شعر
دیں گی سماعتیں اُسے دِل کی صدا کا نام

راہی کہیں تو ہو گی گھٹن ہیں نفس کی ڈور
جیسے قبا کے ساتھ ہے بندِ قبا کا نام

منوہر شرما ساغر پالمپوری

اُن سے ملنے کا سنجوگ
بن گیا جیون بھر کا روگ

اک پل کے سہواس نے ہی
جیون بھر کا دیا بجوگ

اپنے گھر ہیں رہ کر بھی
پردیسی سے ہیں ہم لوگ

ہم کیوں دیں قسمت کو دوش؟
دکھ سکھ ہیں کرموں کے بھوگ

ہم نہ رہے جب ساغر تو
یاد کریں گے ہم کو لوگ

★ ڈائریکٹر اسکول آف خارن لنگویجز منسٹری آف ڈیفنس، آر کے پورم - نئی دہلی، ★ 58. D پنڈارا روڈ - نئی دہلی ۳ ★ اشوک لاج - مراڈا ۱۷۶۱۰۲ (ہماچل)

نظمیں

چندربھان خیال

آوارہ گرد لمحے

آوارہ گرد لمحے یوں بیقرار بھٹکیں
جیسے پرند پیاسے دیوانہ وار بھٹکیں
بے جان و بے تکلّم اک آرزو ہے تنہا
جنگل میں جیسے کوئی ویران سی عمارت

بستی ہے دُور جیسے خاموشیوں کا پربت
تانے کھڑا ہو خود کو جامد سیاہ صورت
احساس اپنی لَو پہ یوں ٹمٹمائے جیسے
شعلوں پہ چل رہا ہو اک بے لباس جوگی

کہتی ہے عقل ہم کو جلوت پسند ردگی
کیا سیاہ دھوؤں میں ایسی جو الا جیگی نہ ہوگی؛
اکثر سمٹتے ہیں بکھرے ہوئے جنوں کو
ہم لوگ آج بھی ہیں کس درجہ نامکمل

شیطاں صفت شرارے اوڑھے دھوئیں کے کمبل
دوشیزگیٔ غم کو جھلسائیں جب مسلسل
چنگھاڑتی ہیں سانسیں سینوں میں بے تحاشا
جیسے عظیم انساں پامال ہو گیا ہو

جیسے ہر ایک لَٹ کر کنگال ہو گیا ہو
اِک مختصر سا پل بھی صد سال ہو گیا ہو
اَجگر گپھا میں لیٹا شیرینیاں چبائے
اور ہم یہ سوکھے پتے اب تک بٹورتے ہیں

★ ۵۷۶۔ بھائی پرمانند کالونی ۔ دہلی ۹ ۱۱۰۰

فرحت قادری

شِو کی جٹا

مَیں نے ماضی کے کھنڈر میں جھانکا
حال کی دہکتی ہوئی ریت پہ سرگرداں رہا
اور اب ڈھونڈ رہا ہوں کہ دُھندلکوں میں کہاں ہے فردا!
میرے احساس کے تپتے ہوئے صحراؤں میں
ایک بھی بوند نہیں شبنم کی ——!
کتنے خوابوں کے گھروندے ٹوٹے
کتنے سپنوں کے جزیرے ڈوبے
ماہ و سال آتے رہے
جاتے رہے
تھپکیاں دے کے سُلاتے رہے
جذبوں کو مرے
وادیٔ موہوم میں پہنچاتے رہے
ہچکیاں لیتی رہی حسرتِ دریا طلبی
روز و شب آگ کی لپٹوں سے گزرتی ہی رہی تشنہ لبی!
کوہ کن پھر سرِ کہسار نہ اُٹھا کوئی
جوئے کم آب بھی افسانۂ موہوم بنی ——!

وہ تمازت کی صدی آئی
کہ ہر سمت اُبلنے لگی جلتی ہوئی ریت
رُک گئیں ٹھنڈی ہوا کی سانسیں
پنگھٹ بھی ادوی گھٹاؤں کے جلے
شِو کی جٹا سوکھ گئی ——!

★ معروف گنج، گیا ۔ بہار

قمر الحسن زیدی

نظمیں

(۱)

کل سے میں یہ دیکھ رہا ہوں
میرے کمرے کا جو نل ہے
اس نل کا واشر ٹوٹ گیا ہے
اور پانی
قطرہ قطرہ ٹپک رہا ہے
اور اسی طرح
قطرہ، قطرہ میرے نل سے
سارا سمندر بہہ جائے گا
اور پھر
بوند بوند خالی سمندر
اک دن پھر سے بھر جائے گا
کل سے میں یہ دیکھ رہا ہوں

▲▲

(۲)

میرے کمرے میں
ایک آئینہ
کھڑکی کے ساتھ ٹنگا تھا
ہوا کے ایک جھونکے سے
کل گر کر ٹوٹ گیا
ٹکڑے ٹکڑے بکھر گیا
ٹوٹے ٹکڑے بٹور رہا تھا
جانے کیسے انگلی سے
خون کا ایک قطرہ نکل آیا
اور
ان بکھرے ہوئے ٹکڑوں میں
خون کے سیکڑوں قطرے چمک اٹھے
پہلے تو یہ بات نہ تھی۔

▲▲

(۳)

ایک سفید و شفاف سی
دھلی چادر
بے شکن، بن چھوئی اور بے داغ
میرے سونے کی چارپائی پر
صبح سے شام تک
بچھی رہتی ہے
اور جب
رات کو میں سوتا ہوں
اس کو دھیرے سے خود
ہٹا دیتا ہوں
اور اس کی جگہ پرانی سی
ایک چادر بچھا دیتا ہوں
صبح کو پھر وہی چادر
بے شکن، بن چھوئی اور بے داغ
چارپائی کی زینت ہوتی ہے
یہ بھرم
دیکھیے
بنا رہ جائے۔

▲▲

(۴)

ایک چھوٹی سی نیم پلیٹ
جس پہ میرا نام لکھا تھا
سال بھر سے میرے کمرے میں
ماری ماری پھر رہی تھی
ٹیبل سے کھڑکی پر
اور کبھی
کھڑکی سے الماری پر
دھول سے اٹی
جگہ بدل رہی تھی
اس اک انتظار میں کہ جب
دو کیلیں اور ایک ہتھوڑی یکجا ہو جائیں
اور کل
بالآخر میں نے
دو کیلوں کی صلیب پہ
اپنے نام کو ٹانگ دیا
اب یہ کمرہ بے نام نہیں ہے۔

▲▲

شفیق احمد صدیقی | زمین آسمان

منگت ایک موچی کا لڑکا تھا۔ اُس کی ماں اُس کی پیدائش کے ایک سال بعد ہی مر گئی تھی۔ اُس کا باپ اُسے اپنے خاندانی کام میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ اُس کی خواہش تھی کہ اُس کا بیٹا پڑھ لکھ کر دفتر کا بابو بنے۔ اس لیے اُس نے منگت کو اسکول میں داخل کر دیا۔ لیکن وہ ہائیر سیکنڈری تک ہی پڑھ پایا تھا کہ اُس کا باپ ٹی۔ بی کا مریض ہو کر مر گیا۔ یتیم ہونے کے بعد منگت کو زندگی کی تلخ حقیقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔

منگت کو اپنے خاندانی کام سے قطعی دلچسپی نہ تھی۔ رین بو رولنگ مل میں ایک کلرک اور ایک چپراسی کی جگہ خالی۔ کلرک کے لیے کم از کم ہائیر سیکنڈری اور چپراسی کے لیے مڈل پاس ہونے کی شرط تھی۔ منگت کو امید تھی کہ کلرکی کی جگہ اُس کو مل جائے گی۔

اپنی درخواست لے کر جب منگت رین بو رولنگ مل کے منیجر راکیش کے دفتر میں داخل ہوا تو ایک عجیب و غریب خوشبو سے اُس کا دماغ معطر ہو گیا۔ مدہوش کر دینے والی بھینی بھینی خوشبو دفتر کے ایک کونے سے آ رہی تھی جہاں ایک نوجوان ٹائپسٹ لڑکی ٹائپ کرنے میں مصروف تھی۔ درخواست پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے منیجر راکیش نے کہا "تم تو صرف ہائیر سیکنڈری ہو۔ کلرک کی جگہ کے لیے ہمارے پاس بی۔ اے اور ایم۔ اے لڑکوں کی سیکڑوں درخواستیں آ چکی ہیں۔ تم چاہو تو تم کو چپراسی کی جگہ رکھا جا سکتا ہے۔"

چپراسی کی نوکری سے منگت کو دلچسپی نہ تھی۔ وہ تو دفتر کا بابو بننا چاہتا تھا۔ وہ منیجر سے اپنی درخواست اُٹھانے ہی والا تھا کہ ٹائپسٹ لڑکی اپنی جگہ سے اُٹھ کر ٹائپ شدہ کاغذات پر اپنے باس راکیش کے دستخط کرانے کے لیے اُس کی میز کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ منگت دیکھتا ہی رہ گیا۔ اُس نے اپنے دل میں سوچا جس دفتر میں اِتنی خوبصورت لڑکی ٹائپسٹ ہو وہاں چپراسی کی نوکری کرنا بھی فخر کی بات ہو گی۔ یہی سوچ کر منیجر راکیش کے سوال کے جواب میں منگت نے ہاں کہہ دی۔

وملا رین بو رولنگ مل کے منیجر راکیش کی اسٹینو کم پرسنل سیکریٹری تھی۔ وہ ایک غریب گھرانے سے تھی اور اعلیٰ مستقبل کی تمنی تھی۔ بی۔ اے اور شارٹ ہینڈ کا امتحان پاس کرتے ہی اُسے رین بو رولنگ مل میں ملازمت مل گئی، یہ اُس کی خوش قسمتی ہی تھی کہ اس ملازمت کے لیے اُس کا انتخاب بغیر کسی سفارش اور رشوت کے ہوا تھا۔ اُس کی تعلیم اور ذہانت ہی اُس کے سفارشی تھے۔

شکل و صورت کے اعتبار سے وملا اوسط درجہ کی لڑکی تھی لیکن جب وہ اپنے چہرے پر تھوڑا سا میک اپ کر لیتی تھی تو بہت خوبصورت لگتی تھی۔ اپنی ذہانت، کام کی لگن اور خوش اطواری کی وجہ سے اُس نے منیجر راکیش کے دل میں ایک اہم مقام حاصل کر لیا تھا۔

دفتر کے اِنٹرینس کے باہر ایک اسٹول پر بیٹھا منگت وملا کے دلکش چہرے کو چور نگاہوں سے دیکھتا رہتا تھا۔ ٹائپ رائٹر کے بورڈ پر وملا کی نازک انگلیوں کو پھرتی سے

۲۶۵ - سروٹ گیٹ اُتری - مظفر نگر - یوپی

چلتے دیکھ کر منگت کو بڑا تعجب ہوتا تھا جب منگت کو اس کا صاحب راکیش کسی کام سے گھنٹی بجا کر اندر بلاتا تو منگت فوراً اپنی خاکی قمیض کے کالر اور سر پر خاکی ٹوپی کو درست کرتے ہوئے اندر داخل ہو کر پوچھتا "جی صاحب!"

"لو یہ فائلیں بڑے بابو کو دے آؤ۔"

منگت فائلیں بڑے بابو تک پہنچا دیتا۔ اگر بڑے بابو یہ کہہ دیتے، منگت یہ کاغذات ذرا وملا جی سے ٹائپ کرا لاؤ، تو اس کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہتا۔ وہ کاغذات لیے وملا کی میز کے پاس آکر کھڑا ہو جاتا۔ کریم پاؤڈر کی خوشبو میں ملی جلی وملا کی جوانی کی مہک اس کے احساس کے پردوں کو چھوتی ہوئی اس کی روح میں جذب ہو جاتی تھی۔ منگت فائل سے کاغذ نکال کر وملا سے کہتا "بڑے بابو نے بولا ہے۔ یہ کاغذ ٹائپ کر دو۔" وملا اپنا گورا گورا ہاتھ بڑھا کر منگت کے ہاتھ سے کاغذ لے کر ان پر ایک نظر ڈالتی اور پھر ٹائپ کرنا شروع کر دیتی۔ اگر وملا کسی کام سے منگت کو اپنے پاس بلاتی تو وہ دوڑا ہوا پہنچتا۔ اپنے صاحب راکیش کی بجائے اس کی اسٹینو وملا کے حکم کو بجا لانے میں وہ زیادہ خوشی محسوس کرتا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وملا اسے کسی نہ کسی کام سے اندر بلاتی رہے اور وہ اس کے جوان جسم کی سحر کن مہک سے لطف اندوز ہوتا رہے۔ جب منیجر راکیش دفتر میں نہ ہوتا وہ اندر آکر چہرے پر ایک نقلی مسکراہٹ لا کر وملا سے پوچھتا "کیا آپ نے مجھے بلایا ہے؟ کہیے کیا کام ہے؟"

وملا ایک دلنواز مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیتی "لگتا ہے تمہارے کان زیادہ سننے لگے ہیں! جب کوئی کام ہوگا تو بلا لوں گی۔"

یوں تو مل میں کام کرنے والے سب مزدوروں اور چپراسیوں سے منگت کی رسم و راہ ہو گئی تھی لیکن رامو کاکا سے اس کی خوب نبھتی تھی۔ رامو کاکا اس کے باپ کی عمر کا ایک ضعیف آدمی تھا جس کے چہرے پر بڑھاپے کی لکیریں نمایاں تھیں۔ وہ یہیں لوہرولنگ مل میں پندرہ سال سے مزدور کی حیثیت سے روزانہ کی اجرت پر کام کر رہا تھا۔ وہ شہر سے دور غریبوں کی بستی میں رہتا تھا۔ منگت جب بھی رامو کاکا کو دیکھتا اسے اپنے باپ کا جھریوں بھرا چہرہ یاد آجاتا۔ شاید اسی لیے وہ رامو کاکا کا بہت ادب کرتا تھا۔

ایک دن رامو کاکا ڈیوٹی پر نہیں آیا۔ منگت نے سوچا ضرور کوئی خاص بات ہے جو رامو کاکا نہیں آیا۔ شام کو ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد چپراسی والی وردی بدل کر منگت رامو کاکا کے گھر کی طرف چل دیا۔ رامو کاکا نے اسے ایک دن اپنے گھر کا پتہ بتایا تھا۔ بتائے ہوئے پتے کے مطابق وہ ایک کچے سے مکان کے پاس جا کر رک گیا۔ سامنے کی دیوار ٹوٹی ہوئی تھی۔ اندر کچا آنگن تھا۔ آنگن میں ایک ڈھیلی سی چارپائی پر بیٹھا ہوا ایک بوڑھا آدمی حقہ کے کش لگا رہا تھا۔ منگت نے بوڑھے آدمی کو فوراً پہچان لیا۔

"آؤ منگت آؤ" رامو کاکا نے منگت کو گھر کے اندر بلاتے ہوئے کہا "آخر آج تو آہی گیا۔"

"ہاں رامو کاکا۔ آج تم فیکٹری نہیں آئے۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ سوچا تمہاری طبیعت ہی پوچھ آؤں۔"

"ہاں بیٹا اگر تو میری طبیعت نہ پوچھنے آتا تو اور کون آتا۔ آخر تو اپنا غریب ساتھی ہے اور اب تو بالکل گھر جیسا ہی ہو گیا ہے۔"

"لیکن رامو کاکا آج تم کام پر کیوں نہیں آئے؟"

"بس بیٹا جسم میں کمزوری زیادہ ہی آگئی ہے۔ سانس کا مریض ہوں۔ آج صبح سے طبیعت خراب ہے۔"

اتنے میں تیرہ چودہ سال کی ایک سانولی سی لڑکی ہاتھ میں کچھ کتابیں لیے گھر میں داخل ہوئی۔ رامو کاکا نے کہا "منگتی ادھر آ۔ جا ذرا سی چائے بنا لے۔ گھر مہمان آیا ہے۔" اور پھر منگت سے مخاطب ہو کر رامو کاکا نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "اپنی ہی بچی ہے۔ آٹھویں جماعت میں پڑھ رہی ہے۔ بڑی ہوشیار ہے مگر

کا سب کام کاج یہی کرتی ہے۔ محلے میں ہندی کے خط یہی پڑھ کر سناتی ہے۔ ویسے اسکول میں انگریزی بھی پڑھ رہی ہے۔ اس کی ماسٹرنی تو کہتی ہے اِسے میٹرک تک پڑھاؤ لیکن منگت اب تو ہی بتا چھوکری کو زیادہ پڑھانے سے کیا فائدہ اِس کی ماں تو کہتی ہے اب کی ہولی پر ہی اِس کے ہاتھ پیلے کر دو۔"

اِتنے میں منگتی نے چائے تیار کرلی۔ چائے کی پیالی منگت کے ہاتھ میں دے کر وہ سر پر دوپٹہ درست کرتی ہوئی اندر چلی گئی۔

منگت چائے کے گھونٹ پیتا رہا اور رامو کاکا سے باتیں کرتا رہا۔ مل کے مزدوروں اور چپراسیوں کا مہنگائی بھتہ، فیکٹری کی یونین کی سرگرمیاں بڑھتی ہوئی مہنگائی، بازار میں ضروری اشیا کی کمی، بلیک مارکیٹنگ، رشوت خوری سبھی مسائل پر تبادلۂ خیال ہوا۔

منگتی کی ماں پھولونتی بڑے غور سے منگت کو دیکھ رہی تھی اور دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ لڑکا تو برا نہیں۔ صحتمند ہے، فیکٹری میں نوکر ہے اور سمجھدار بھی نظر آتا ہے جبھی تو کتنی اونچی اونچی باتیں کر رہا ہے۔

"اچھا رامو کاکا اب میں چلتا ہوں۔ بہت دیر ہو گئی" منگت نے جانے کے لیے اجازت طلب کی۔

"اچھا بیٹا۔ یہاں آتے رہا کرو۔ اِسے اپنا ہی گھر سمجھو۔"

رامو کاکا کے گھر سے منگت جوہو کی طرف چل دیا۔ جوہو کا منظر اُسے بڑا دلکش لگتا تھا۔ سمندر میں اُچھلتی ہوئی پانی کی لہریں ساحل تک آتیں اور دور تک ریتیلی زمین کو تر کر کے واپس چلی جاتیں۔ ریت پر سیکڑوں نوجوان جوڑے چہل قدمی کر رہے تھے۔ کچھ سمندر میں سورج ڈوبنے کے حسین منظر کو دیکھنے کے منتظر تھے۔ کچھ سوئمنگ ڈریس پہنے پانی میں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ کچھ ایک دوسرے پر پانی کے چھینٹے پھینک رہے تھے۔ اِن نوجوان جوڑوں کو پیار محبت کی حسین دنیا میں کھویا دیکھ کر منگت اپنے ساتھ ایک ساتھی کی کمی محسوس کر رہا تھا۔

منگت کو چاروں طرف پیار ہی پیار نظر آ رہا تھا۔ لیکن ابھی تک اُس نے کسی سے پیار نہیں کیا تھا۔ کسی کے حُسن کی تعریف میں شاعرانہ جملے نہ کہے تھے کسی کے سامنے اظہارِ محبت نہیں کیا تھا۔ ہاں اگر کسی کو دل ہی دل میں چاہا تھا کسی کے جوان جسم کو چور نگاہوں سے دیکھا تھا کسی کی جوانی کی مہک سے مدہوش ہوا تھا تو وہ تھی وملا۔ اُس کے دفتر کی اِسٹینو وملا۔ وملا کا خیال آتے ہی اُس نے سوچا اگلے سنڈے کو وہ بھی وملا کو جوہو کی سیر کرانے لائے گا۔ اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے نرم نرم ریت پر چہل قدمی کرے گا۔ اُس کو آئس کریم کھلائے گا۔

اگلے دن موقع پا کر منگت نے وملا سے پوچھا "کیوں وملا جی کیا آپ نے کبھی جوہو کی سیر کی ہے؟"

"ہاں کی تو ہے۔ جب کالج میں پڑھتی تھی تو اکثر سنڈے کو سہیلیوں کے ساتھ پکنک کے لیے جوہو پر جایا کرتی تھی۔"

"کیا آپ اگلے سنڈے کو جوہو پر گھومنے جائیں گی؟"

"اب تو سب سہیلیاں بچھڑ گئی ہیں اور اگر ایک دو ہیں بھی تو وہ اب جوہو پر گھومنے کے لیے جانے کا نام ہی نہیں لیتیں۔"

"اجی آپ سہیلیوں کی پروا نہ کیجیے۔ میں سنڈے کو آپ کو جوہو کی سیر کراؤں گا۔ آئس کریم بھی کھلاؤں گا۔"

منگت کی اس بات پر وملا بے اختیار ہنس پڑی "تم بھی عجیب آدمی ہو منگت۔ ہر وقت ہنساتے رہتے ہو۔"

وملا کے جواب سے منگت نے دل ہی دل میں سوچا کہ وملا نے اُس کے ساتھ جانے کے لیے انکار نہیں کیا۔ اُس نے سوچا کہ وملا کو جوہو پر لے جانے سے پہلے ٹیریکوٹ کی ایک قمیص اور ایک پینٹ خرید لینی چاہیے۔ ورنہ وملا کیا سوچے گی۔ ریڈی میڈ گارمینٹ سینٹر پر جا کر منگت نے ٹیریکوٹ کی ایک قمیص اور ایک پینٹ پسند کر لی لیکن جب اُس کی نظر کپڑوں میں لگی ہوئی ریٹ سلپ پر پڑی تو یہ سودا اُسے اپنے بجٹ سے مہنگا نظر آیا۔ قمیص اور پتلون کی قیمت سو روپیہ تھی لیکن اس نے ہمت کر کے دونوں چیزیں خرید لیں۔

اتوار کے دن منگت نے اپنے جسم کو صابن سے خوب دھویا۔ پالش سے اپنے کالے جوتے کو چمکایا۔ نئی قمیض اور پینٹ پہنی۔ کنگھے سے بالوں کو جمایا اور پھر ماتھے پر بالوں کا چھلا بنایا۔ جب اُس نے آئینہ میں اپنے آپ کو دیکھا تو اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی ہیرو اُس کے سامنے کھڑا ہو۔

بس اسٹاپ پر آیا تو دیکھا بہت لمبی کیو لگی ہوئی ہے۔ وہ بھی کیو کے آخر میں کھڑا ہو گیا اور بس کا انتظار کرنے لگا۔ یوں تو سڑک پر بہت سی بسیں آجا رہی تھیں لیکن اُس اسٹاپ پر ایک بھی نہیں رُک رہی تھی۔ کافی دیر کے بعد اُس نمبر کی بس آئی جس کا منگت کو انتظار تھا۔ بڑی مشکل میں منگت کو بیٹھنے کے لیے جگہ ملی۔

دملا کے گھر پہنچ کر اُس نے اپنی انگلی بیل سوئچ پر رکھ دی۔ گھر کی ڈھلی ہوئی سفید ساڑی میں ملبوس ایک بوڑھی عورت نے باہر آکر منگت سے پوچھا "کس کو پوچھتے ہو بھائی؟"

"مس دملا جی یہیں رہتی ہیں نا؟"

"ہاں۔ ہاں یہیں رہتی ہیں۔ کہو کیا بات ہے؟"

"مجھے اُن سے ملنا ہے"، منگت نے جواب دیا۔

"وہ تو ابھی راکیش صاحب کے ساتھ جوہو پر گھومنے گئی ہے۔"

منگت پر بجلی سی گر پڑی۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے بڑی بے دردی سے اُس کے ارمانوں کا جنازہ نکال دیا ہو۔ اُس کے چہرے پر غم کی پرچھائیاں چھا گئیں۔ راستے میں رامو کاکا کا گھر پڑتا تھا۔ منگت نے سوچا رامو کاکا ہی سے ملتا چلوں۔ رامو کاکا نے منگت کو دیکھا تو اُس کا جھریوں بھرا چہرہ کھل اٹھا۔

"آؤ بیٹا آؤ۔ منگتی کی ماں اپنا منگت آیا ہے۔ منگتی چل تو چائے بنا لے۔"

"چائے وائے رہنے دیجئے کاکا۔ میں تو جوہو پر گھومنے جا رہا تھا سوچا آپ سے بھی پوچھ لوں" یہ کہتے ہوئے منگت کی نظر منگتی پر پڑی جو چائے بنانے کے لیے چولہے میں آگ جلا رہی تھی۔

"بیٹا ہم بوڑھے لوگ جوہو پر کیا گھومنے جائیں گے؟"

"تو کیا ہوا وہاں تو آپ سے بھی زیادہ بوڑھے آدمی گھومنے آجاتے ہیں۔"

"نہ بیٹا۔ اب زیادہ دور چلا نہیں جاتا۔ اگر جلدی آسکو تو منگتی چلی جائے گی۔"

"بس سورج چھپنے سے پہلے ہی لوٹ لیں گے۔"

"تو ٹھیک ہے۔ منگتی جلدی سے چائے بنا کر کپڑے بدل لے"، رامو کاکا نے منگتی سے کہا۔

منگتی کی ماں نے رامو کاکا کو اندر بلا کر کہا "اجی برادری والے کیا کہیں گے؟"

"اری آج کل کا یہی رواج ہے۔ پہلے لڑکا لڑکی آپس میں مل جانے چاہئیں۔ میں منگت کو جانتا ہوں۔ بڑا شریف چھوکرا ہے اور پھر اپنے ہی مل میں نوکر ہے۔"

منگتی نے چائے کی پیالی منگت کو دی اور کپڑے بدلنے کے لیے اندر چلی گئی۔

ماں نے منگتی سے کہا "اری جوہو پر جا رہی ہے تو نئی والی ساڑی پہننا۔"

منگتی نے نئی ساڑی پہنی، سانولے گالوں پر پاوڈر لگایا۔ آنکھوں میں کاجل اور پھر بن سنور کر باہر آئی تو منگت نے دیکھا کہ ساڑی پہنتے ہی منگتی کی جوانی نکھر آئی ہے۔ منگت منگتی کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ رامو کاکا کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔

"جاؤ بیٹا۔ جوہو پر گھوم آؤ۔"

▲▲

ڈاکٹر عنوان چشتی کی نئی کتاب

جدیدیت کی روایت

شعری جمالیات کی روشنی میں جدیدیت کی تاریخ اور تجزیہ۔ اپنے موضوع پر پہلی بھرپور کوشش

(طباعت کے مراحل میں)

تبصرے

پوشکن

مصنف : ظ انصاری۔ صفحات ۲۳۲۔ قیمت : ۱۲ روپے
ناشر : ترقی اُردو بورڈ، ویسٹ بلاک ۸ راما کرشنا پورم نئی دہلی ۲۲

چے خف

مصنف : ظ انصاری صفحات ۱۲۹۔ قیمت : ۱۱ روپے
ناشر : نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، نئی دہلی۔
تقسیم کار : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، بمبئی، علی گڑھ۔

پوشکن اور چے خف دونوں روسی ادب کی وہ قد آور شخصیتیں ہیں جنھیں روس سے باہر بھی غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی اور ان کی تحریروں نے دوسری زبانوں کے ادب پر بھی گہرے اثرات قائم کیے۔ اُردو بھی اس فیضان سے محروم نہیں رہی۔ ان کے براہ راست مطالعے کے مواقع اُردو والوں کو اگرچہ کم میسر آئے لیکن انگریزی کے وسیلے سے انھیں پڑھا گیا اور پچھلی چند دہائیوں میں انگریزی ہی سے ان کی بہت سی تحریریں اُردو میں منتقل ہوئیں۔

ظ انصاری صاحب نے ان دونوں فن کاروں کی زندگی اور ان کے فنی کارناموں کے تعارف میں یہ کتابیں لکھ کر ایک اچھی ادبی خدمت انجام دی ہے۔

ظ صاحب کا طریق کار یہ ہے کہ وہ جب پوشکن یا چے خف کے حالات یا ان کی فنی فتوحات کا بیان کرتے ہیں تو ساتھ ساتھ اس زمانے کے روس کی سماجی اور سیاسی فضا کی تصویر کشی بھی کرتے جاتے ہیں۔ بالخصوص اُن گوشوں کی جن سے کسی نہ کسی سطح پر عظیم مصنف دوچار رہے ہیں۔ اس پس منظر میں ان کا کردار اپنی تمام خوبیوں اور کمزوریوں کے ساتھ اُبھر کر سامنے آتا ہے اور ہماری ملاقات ان کی پرچھائیوں سے نہیں، دو جیتے جاگتے انسانوں سے ہوتی ہے۔ ظ صاحب کی تحریر رواں دواں ہے اور اس میں گفتگو کا سا انداز پایا جاتا ہے۔

اس سے کتابوں کی دلچسپی میں اضافہ ہوا ہے۔

چے خف کا تلفظ اُردو میں بالعموم چیخوف رہا ہے اور اسے اسی طرح لکھا بھی جاتا رہا ہے۔ ظ صاحب نے اس کی وضاحت نہیں کی کہ انھوں نے 'و' ہٹا کر اس کی جگہ زیر کیوں لگایا جب کہ اس زمانے کے دوسرے روسی ناموں میں جو جہاں تہاں متن میں آئے ہیں انھوں نے 'و' کو باقی رکھا ہے مثلاً تیسرے ہی صفحے پر ایک نام ہے یرمی لوف (V. ERMILOV) بعض دوسرے روسی ناموں کا تلفظ بھی ان کتابوں میں اُردو میں مروج تلفظ سے مختلف نظر آتا ہے۔

پوشکن کی نظموں کے منظوم تراجم ظ صاحب نے خود کیے ہیں اور ان میں بھی وہی سلاست باقی رکھنے کی کوشش کی ہے جو ان کی نثر کا خاصہ ہے لیکن کہیں کہیں وہ ٹھوکر کھا گئے ہیں اور بعض مصرعے ناموزوں ہو گئے ہیں۔ مثلاً :

روح کی اس بے قراری کو جہاں ملتا تھا قرار

'تھا' کو حذف کیے بغیر مصرعہ موزوں نہیں پڑھا جا سکتا۔

صبح سے شام ہوتی ہے گزر جاتا ہے یوں دن بھر

یہاں 'صبح' کو 'بروزن سحر' پڑھا جائے تبھی وزن پیدا ہوگا۔

ان کتابوں بالخصوص پوشکن کا مطالعہ روس کے موجودہ ادبی اور سیاسی ماحول کو ذہن میں رکھ کر کیا جائے تو زمانۂ جدید و قدیم میں بعض حیرت ناک مماثلتیں نظر آتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ روسی عوام زار شاہی نظام میں جس جبر کے شکار تھے وہ آج بھی ان کا مقدر ہے۔ زار شاہی جبر کے خلاف اور آئینی حکومت کے قیام نیز شہری آزادیوں کی بحالی کے حق میں جو زیر زمین تحریکیں اُن دنوں چلائی گئیں ان کی رہنمائی اس وقت بھی روس کے دانشور طبقے ہی نے کی جن میں مصنفین بھی شامل تھے اور روس کے موجودہ جابرانہ نظام کے خلاف اندرون روس جو رجحانات اب پنپ رہے ہیں ان کی آبیاری کے لیے بھی وہاں کا دانش ور طبقہ ہی اپنا خون پیش کر رہا ہے۔ یہاں

سنیاروف اور سولژے نتسن کے نام فوراً ذہن میں آتے ہیں۔ ایک جگہ اصاحب نے چے خف کا یہ قول نقل کیا ہے:

"میرے عزیزو، اوّل بات یہ کہ جھوٹ فریب نہیں ہونا چاہیے ——— آرٹ میں یہی تو ایک خصوصیت اور خوبی ہے کہ یہاں فریب نہیں چلتا۔ محبت میں، سیاست میں، میڈیسن میں آدمی جھوٹ سے کام چلانے لوگوں کو فریب دے لے بلکہ خداوند تعالیٰ سے بھی مکروفریب کرلے لیکن آرٹ میں فریب نہیں کرنا چاہیے۔"

اس خیال کی توضیح الیگزنڈر سولژے نتسن نے ان الفاظ میں کی ہے:

"کہا جاسکتا ہے کہ آخر ادب کھلے تشدد اور بے رحمی کے خلاف کیا کرسکتا ہے؟ لیکن تشدد کی آخری پناہ گاہ جھوٹ ہے اور جھوٹ کی تسخیر ادیب اور فن کار ہی کرسکتے ہیں۔ جھوٹ کے خلاف جہاد میں فتح ہمیشہ فن کی ہی ہوتی ہے۔ صداقت کا ایک لفظ پوری کائنات پر بھاری ہے۔"

سولژے نتسن اور اس جیسے دوسرے روسی دانشوروں کے بیش روؤں کی آزادی، صداقت اور انسانی شرف کی بحالی کے لیے لڑائی کامیاب ہوکر بھی ناکامی پر منتج ہوئی لیکن آج وہ جس جرأت مندی اور حوصلے کے ساتھ وقت کے سخت ترین نظامِ جبر کے خلاف نبرد آزما ہیں وہ انہیں کہاں سے حاصل ہوا؟ یہ سرچشمہ غالباً ہمیں اسی روایت میں تلاش کرنا چاہیے جس کی تشکیل میں پوشکن اور چے خف جیسے حریت پسند اور صداقت شعار فن کاروں کا اہم حصہ رہا ہے۔

کتابیں پیپر بیک میں ہیں اور ان کی قیمتیں واجبی سے کچھ زیادہ نظر آتی ہیں۔

——— محمود سعیدی

شعری تخلیقات
بلا طلب ارسال نہ کیے جائیں

کمار پاشی۔ یہ بھی ہے آدمی بقیہ صفحہ ۳۸

کے چکر میں پھنسا ہوا نہیں پایا۔ وہ شعر کہہ کر شعر سے الگ ہو جاتے ہیں۔ انھیں صلہ کی تمنا نہیں ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ وہ آنے والی نسلوں کے لیے شعر کہہ رہے ہیں۔ ایک دن میں نے مذاق مذاق میں کہا "بھئی! آپ جس نسل کے لیے شعر کہہ رہے ہیں وہ پیدا ہوگی بھی یا نہیں اس کے بارے میں کسی نجومی سے ضرور پتہ کر لیجیے"۔

بولے "اب میں نجومیوں اور آنے والی نسل دونوں سے بے نیاز ہو چکا ہوں۔ شعر کہنے کو جی چاہتا ہے بس اسی لیے شعر کہہ دیتا ہوں۔ مجھے کیا پرواہ کہ کوئی ان شعروں کو پڑھتا بھی ہے یا نہیں"۔ احساس کی اس سطح پر پہنچ کر شعر کہنے کے لیے بڑے دل گردہ کی ضرورت ہوتی ہے اور مجھے خوشی ہے کہ کمار کے اندر یہ حوصلہ موجود ہے اور میری دعا یہ ہے کہ یہ حوصلہ اور بڑھے۔

(کمار پاشی کے مجموعۂ کلام "روبرو" کے رسم اجرا کے جلسے منعقدہ ۴ دسمبر ۷۶ ۱۹ء میں یہ خاکہ پڑھا گیا)

▲▲

خبر نامہ (بقیہ صفحہ ۵)

محترمہ آمنہ ابوالحسن اور ڈاکٹر اسلم پرویز نے وامکان، پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا اور اُمید ظاہر کی کہ اچھی شاعری کو پسند کرنے والے حلقوں میں اس کتاب کو خاطر خواہ پذیرائی حاصل ہوگی۔

جلسے میں گوپال متل، جوگندر پال، مجتبیٰ حسین، بانی، لچھ نرائن راز، کمار پاشی، گلزار دہلوی، عزیز وارثی، پروانہ ردولوی، شاہد پرویز، قیس رامپوری، عبداللہ کمال، کرشن موہن، حیات لکھنوی اور راج کھیتی کے علاوہ دوسرے بہت سے ادیب، شاعر، صحافی، اردو کے اساتذہ اور ممتاز سماجی شخصیتیں شامل تھیں۔ جلسے کا اختتام محفلِ موسیقی پر ہوا جس میں صلاح الدین احمد اور ونمنا یاجیاپائی نے ساحرہ بیگم کی غزلیں پیش کیں۔

▲▲

بزمِ احباب

'تحریک'، کا تازہ شمارہ زیرِ مطالعہ ہے۔ جناب بانیؔ کی پانچ شعروں والی یک صفحی غزل ہم نا واقفانِ عروض کے لیے لمحۂ فکریہ فراہم کرتی ہے۔ غور و خوض کے بعد جو وزن متعین کیا جا سکا وہ یوں ہے۔ فعلن، فعلن، فعلن، فعلن، فعلن، فع۔ لیکن چھٹا، نواں بارہواں، اور چودھواں مصرعہ فعول سے شروع ہوتا ہے۔ کیا یہ جائز ہے؟ نویں مصرعے کا آخری لفظ اور تیرھویں مصرعے کا تخلص کا نصف یعنی "نی"، کہیں حدودِ مصرع کو پھلانگ کر باہر تو نہیں جا پڑا؟ امید ہے معانی و مفہوم سے قطع نظر اس عروضی مسئلے پر سیر حاصل روشنی ڈالی جائے گی۔

سوالات، سوالنامے پر اظہارِ خیال سے متعلق دوسرے مسئلے سے تعلق رکھتے ہیں، خصوصاً "ہئیتی" تبدیلیوں سے۔ اب تک تو جواب لکھنے والوں میں کسی نے حتیٰ کہ شمس الرحمٰن فاروقی نے بھی اوزان کے ان جدید تجربوں پر اس رُخ سے کوئی روشنی نہیں ڈالی ہے اس لیے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ بانیؔ کی اس غزل ہی سے اس موضوع پر آپ اور سوالنامے کے مجیب قلم اٹھائیں۔ 'تحریک'، جیسے موقر جریدے کے لیے ہمارے ناقص خیال میں اس نفسِ مضمون پر اچھی بحث ہو سکتی ہے کیونکہ تجربہ برائے تجربہ نہ جدیدیت کو فائدہ پہنچا سکے گا نہ تجربہ کرنے والوں کو۔

شمارۂ زیرِ نظر 'تحریک'، کا شمارہ ہے اور بار بار یہ دہرانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ یہ اپنے انداز کا منفرد رسالہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سنجیدہ مسائل پر افہام و تفہیم کے لیے اس کے قارئین معنی خیز نگاہوں سے اسی کی طرف دیکھا کرتے ہیں اور پاتے ہیں جو کچھ پاتے ہیں۔

——— نسیم آذر، نیو سینما، جی ٹی روڈ، آسنسول

'سوالنامے پر اظہارِ خیال' کے جوابات میں جابجا یکسانیت دکھائی پڑی۔ شمارہ مئی ۷۷ء میں فاروقی نے تکمیلیت کا احساس دلایا۔

——— میر رستم علی، ورود، ضلع امراؤتی (مہاراشٹر)

مئی ۷۷ء کے شمارے میں گوپال متلؔ صاحب کا مضمون "گاندھی جی کے اساسی تصورات" ملک کی موجودہ سیاسی فضا میں بطورِ خاص توجہ طلب ہے۔ یہ اس تضاد کو واضح طور پر سامنے لاتا ہے جو کمیونزم اور گاندھی ازم کے درمیان موجود ہے۔ کانگریس کا دعویٰ رہا ہے کہ وہ گاندھی جی کے اصولوں کی علمبردار ہے لیکن پارلیمنٹ کے حالیہ انتخابات میں اس نے کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ جس طرح انتخابی سمجھوتہ کیا اور اب تو صوبائی اسمبلیوں کے انتخاب میں اس کا جو اعادہ کیا ہے، وہ اس کے نظریاتی دیوالیہ پن کا اظہار ہے۔ پارلیمنٹ کے انتخاب میں کانگریس کو جو شکست ہوئی اس سے اس کی آنکھیں کھل جانی چاہیئے تھیں کہ اس ملک میں ادعائی سیاست کی کوئی گنجائش نہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابھی خود احتسابی کے عمل سے گزرنے کو تیار نہیں اور ان دباؤں سے پیچھا چھڑانا اس کے لیے مشکل ہے جن میں اس کے بعض خود پسند لیڈروں نے اسے مبتلا کر دیا ہے۔

——— عبدالرشید بخشی، امیرا کدل، سرینگر

'تحریک' مئی ۷۷ء میں مطبوعہ غزل کے ساتھ میرا نام 'اشہر ہاشمی'، کی بجائے 'اشعر ہاشمی'، ہو گیا ہے، برائے کرم تصحیح فرما دیں۔

——— اشہر ہاشمی، ۳۱ روشن گولداریلین، ہوڑہ۔

خبر نامہ

○ "گلبرگہ ابتدا ہی سے علمی ادبی تہذیبی سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے۔ اس شہر نے اُردو ادب کو کئی مایۂ ناز شخصیتیں دی ہیں اور ابھی یہ فیض بندہ نواز یہ سلسلہ جاری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی یہاں کے اکثر قلم کار ہندوستان گیر شہرت رکھتے ہیں"

ان خیالات کا اظہار نامور مزاح نگار جناب مجتبیٰ حسین نے اُردو اکیڈیمی گلبرگہ کے سالانہ ترجمان "زاویے" (ناشر اُردو اکاڈمی، دفتر روزنامہ سلامتی، مومن پورہ، گلبرگہ ۴، کرناٹک ضخامت ۲۷۵ صفحات، سائز ڈیمائی، قیمت پانچ روپے) کی رسم اجرا انجام دیتے ہوئے کیا۔ یہ تقریب ۲۴ اپریل ۷۷ء کو ۸½ بجے شب غالب ہال میں منعقد کی گئی تھی۔

مجتبیٰ حسین نے کہا کہ شہر دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جن کے اندر لوگ بستے ہیں دوسرے وہ شہر جو لوگوں کے اندر بستے ہیں۔ گلبرگہ میرے دل میں بسا ہوا شہر ہے۔ موصوف نے "زاویے" کی مجلسِ ادارت کو ایک یادگار مجلّہ کی اشاعت پر مبارک باد دی۔

جلسہ کی صدارت جناب امیر احمد خسرو نے فرمائی، جنھوں نے اُردو دوستوں سے اپیل کی کہ اُردو رسائل خرید کر پڑھیں۔

دیگر مہمانانِ خصوصی ڈاکٹر غیاث صدیقی، وقار خلیل، طیب انصاری، حمید سہروردی اور جلیل تنویر نے "زاویے" کے مشمولات کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی اشاعت کو اراکینِ اُردو اکیڈیمی کی لگن کا مظہر قرار دیا۔ مس تقدیس کوثر نے "زاویے" کی اشاعت پر اپنے تاثرات بعنوان "حرفِ آخر" کار" سنا کر حاضرین کو قہقہے لگانے پر مجبور کیا۔

ابتدا میں سید مجیب الرحمٰن، صدر استقبالیہ نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور مسٹر حامد اکمل، مدیر "زاویے" نے مہمانوں کا تعارف کرایا۔ جناب معظم علی، نائب صدر اکیڈیمی نے مہمانوں کی گلپوشی کی۔

دوسری نشست میں ادبی اجلاس اور محفلِ شعر کا انعقاد عمل میں آیا۔ جناب وہاب عندلیب نے مجتبیٰ حسین کی رنگا رنگ شخصیت پر ایک دل آویز خاکہ بعنوان "ارضِ دکن کا شہزادہ" سنایا۔ مجتبیٰ حسین نے سامعین کے اصرار پر اپنے دو منتخب مضامین سنا کر محفل کو زعفران زار بنا دیا۔

غالب ہال مختلف شعبہ ہائے حیات سے تعلق رکھنے والی ممتاز شخصیتوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔

○ ۲۴ اپریل کی شام کو مولانا علیم اختر مظفر نگری کی یاد میں پھاٹک حبش خاں میں ایک ادبی جلسہ ہوا۔ جلسے کی صدارت کے لیے پاکستان سے آئے ہوئے معزز مہمان حضرت حفیظ جالندھری سے درخواست کی گئی جو مولانا علیم اختر کے صاحبزادگان جناب عظیم اختر اور جناب شہزاد اختر کی گزارش پر اپنی دوسری مصروفیتیں چھوڑ کر اس جلسے میں شرکت کے لیے تشریف لائے تھے۔ لیکن حفیظ صاحب نے فرمایا کہ وہ چونکہ بہت تھکے ہوئے ہیں اور زیادہ دیر یہاں نہیں بیٹھ سکیں گے اس لیے بہتر ہے کہ صدارت کی ذمّہ داری کسی اور کو سونپی جائے۔ یہ کہتے ہوئے انھوں نے مخمور سعیدی کی طرف دیکھا اور اصرار کیا کہ کرسیِ صدارت وہ سنبھال لیں۔ حفیظ صاحب نے کہا کہ مخمور کے شعر میں نے جب جب سنے میرا جی چاہا کہ ان پڑے تو میں انھیں اپنی جیب میں رکھ کر اپنے ساتھ پاکستان لے جاؤں۔ میں ان کے بزرگ کی حیثیت سے ان سے کہتا ہوں کہ وہ یہاں میری قائم مقامی کریں۔

جلسے میں حفیظ صاحب کے علاوہ جنھیں بار بار زحمتِ سخن دی گئی جن دوسرے شاعروں نے کلام سنایا ان میں محسن زیدی، وارثی،

حیات لکھنوی، امیر قزلباش، عظیم اختر، نصرت گوالیاری، شہزاد اختر اور کچھ دوسرے حضرات شامل تھے۔ شروع میں مولانا علیم اختر مرحوم کی ایک غزل کا ریکارڈ جو اُنھی کی آواز میں تھا، سنایا گیا۔

○ ۲۹ر اپریل کی شام کو غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین میں پریس ایشیا انٹرنیشنل فورم کی جانب سے حضرت حفیظ جالندھری کو ایک استقبالیہ دیا گیا جس کی صدارت مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات شری لال کرشن ایڈوانی نے فرمائی۔ حفیظ صاحب کو خراج تحسین پیش کرنے والوں میں مرکزی وزیر امور خارجہ شری اٹل بہاری باجپئی، پروفیسر اے۔ ایم خسرو، جناب جگن ناتھ آزاد، جناب احمد رشید شیروانی، محترمہ منورما دیوان اور مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کے سابق سیکریٹری اختر الواسع شامل تھے۔

مقررین نے حفیظ صاحب کی گراں قدر شعری اور ادبی خدمات کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے، برسوں بعد ان کے ہندوستان آنے پر مسرت کا اظہار کیا اور ہندوستان اور پاکستان کے درمیان مستحکم دوستانہ تعلقات کے قیام پر زور دیا تاکہ بار بار ایسے خوشگوار مواقع میسر آسکیں۔

مسندِ صدارت سے شری لال کرشن ایڈوانی نے کہا کہ حفیظ صاحب سے مل کر اور ان کا کلام سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔ جہاں تک ہندوستان اور پاکستان کے درمیان آمد و رفت کی آسانیاں پیدا کرنے کا تعلق ہے، یہ کوئی سیاسی نہیں انسانی مسئلہ ہے اور اس کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کیا جانا چاہیے۔

وزیر خارجہ شری باجپائی نے کہا کہ دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات بہتر ہوں اس کی ہم بھرپور کوشش کریں گے چاہے اس کے لیے ہمیں یک طرفہ قدم ہی کیوں نہ اُٹھانے پڑیں۔ اُردو کے سلسلے میں انھوں نے کہا کہ پچھلے تیس سال میں اس کے ساتھ جو کچھ ہوا، ہم اس کے ذمّہ دار نہیں ہیں لیکن ہم جو وعدے کر رہے ہیں وہ پورے ہوں گے۔

حفیظ صاحب نے اس تقریب میں وقفے وقفے کے ساتھ اپنے گیتوں اور نظموں سے سامعین کو نوازا اور اس محبت اور اپنائیت کا شکریہ ادا کیا جس کا اظہار اس تقریب کے دوران کیا گیا۔ انھوں نے کہا کہ یہاں آنے کے بعد میں جہاں جہاں بھی گیا مجھے بے پایاں محبت ملی اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ پاکستان کے خلاف میں نے کسی کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ سُنا۔ آخر میں انھوں نے شاہنامۂ اسلام کے اپنے مشہور سلام سے اس مجلس کا اختتام کیا۔

○ ۴ر مئی کی شام کو غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین میں ینگ رائٹرز فورم کی طرف سے اُردو کی ہونہار شاعرہ اور نوجوان شاعر امیر قزلباش کی شریک حیات ساحرہ بیگم قزلباش کے اوّلین شعری مجموعے "امکان" (ناشر نازش بک سنٹر، ۲۰۰۳۲ پھاٹک تیلیان، دہلی۔ قیمت دس روپے) کی اشاعت پر ایک تہنیتی تقریب کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت مرکزی وزیر تعمیرات جناب سکندر بخت صاحب نے فرمائی۔ انھی نے کتاب کا اجرا بھی فرمایا۔

ابتدا میں مخمور سعیدی نے ینگ رائٹرز فورم کی طرف سے سکندر بخت صاحب اور دوسرے معزز مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے ساحرہ بیگم قزلباش کی شاعری کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور سکندر بخت صاحب سے گزارش کی کہ وہ کتاب کا اجرا فرمائیں۔ سکندر بخت صاحب نے "امکان" کی اشاعت اور اس کے اجرا کی تقریب میں اپنی شمولیت پر دلی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میں نے جب سے وزارت کی ذمہ داریاں سنبھالی ہیں، میں اس طرح کی محفلوں سے محروم ہو گیا ہوں جو مجھے ہمیشہ عزیز رہی ہیں۔ اپنی موجودہ مصروفیت [illegible] سعید کا? صاحب کا ایک شعر اکثر میرے ذہن [illegible] رہتا ہے کہ :

اک شخص، کھو گیا ہے جو رستے کی بھیڑ میں
اس کا پتا چلے تو [illegible] خبر ملے

اُردو کے سلسلے میں وزیر موصوف نے فرمایا کہ جب تک اس کا رشتہ کیریر سے نہ جوڑا جائے، اس کے بہتر مستقبل کی باتیں کرنا خود فریبی ہوگی۔ یہ اُردو کی سخت جانی ہے کہ اقتصادیات کے دائرے سے نکال دیے جانے کے بعد بھی یہ اب تک زندہ ہے، اس کا کریڈٹ اس کے لکھنے والوں کو بھی جاتا ہے اور حکومتی سطح پر بھی پچھلے دنوں کچھ ایسے اقدامات ہوئے ہیں جس سے اس زبان کو تھوڑی بہت تقویت ملی ہے لیکن جو چیز اس کی زندگی کی سچی ضامن ہو سکتی ہے وہ یہی ہے کہ اس کا رشتہ کیریر سے قائم کیا جائے اور ابتدائی اور ثانوی درجوں سے یونیورسٹی کی سطح تک اس کی تعلیم کا معقول انتظام ہو۔

(باقی ص ۴۷ پر)

پنجاب اور آندھرا کی لائبریریوں کے لیے منظور شدہ

DR. ZAKIR HUSAIN LIBRARY
JAMIA NAGAR
NEW DELHI-110025

ادارہ تحریر:

گوپال مِتّل ☆ مخمور سعیدی

پریم گوپال مِتّل

سالانہ قیمت: پندرہ روپے، فی کاپی: ایک روپیہ ۲۵ پیسے

بیرونی ممالک سے

(بحری ڈاک سے)

سالانہ: دو پونڈ فی کاپی: چار شلنگ

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتا:

منیجر ماہنامہ تحریک، ۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر

گوپال مِتّل

مطبع نعمانی پریس دہلی

مقامِ اشاعت: ۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

مندرجات

شعری تخلیقات

بلا طلب ارسال نہ کی جائیں

اپنی رقم دوگنی کیجیے

100 روپے
صرف سات سال میں
200 روپے
بن جاتے ہیں

نیشنل سیونگز سرٹیفکیٹ
(پانچواں اجراء)
کے ذریعے

دیگر فوائد:
- سود، ٹیکس سے مستثنیٰ
(سال میں 3000 روپے کی رقم تک)
- دولت ٹیکس سے چھوٹ
(1.5 لاکھ روپے کی رقم تک)

قومی بچت ادارہ

مزید معلومات کے لیے براہ مہربانی
کسی منظور شدہ ایجنٹ یا ڈاک گھر
سے رابطہ قائم کیجیے۔

davp 76/927

گوپال متل

سیکولرزم — صرف ایک پیشہ

"شب خون" کے بیان کے مطابق الہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ڈاکٹر گیان چند کے تقرر کی مخالفت دلی کے ایک ایسے صاحب نے کی جو غالی سیکولرسٹ ہونے کے مدعی ہیں اور جیسا کہ "شب خون" کے بیان سے باہر ہے۔ یہ مخالفت بربنائے مذہب تھی۔

ان صاحب کا نام نہ تو "شب خون" نے ظاہر کیا ہے اور نہ ہم ظاہر کرنا چاہتے ہیں کیونکہ مقصد کسی کو رسوا کرنا نہیں، مدعا یہ ہے کہ ایک مسئلے پر غور کیا جائے اور یہ مسئلہ ہے بے تعصبی اور سیکولرزم کا فرق۔

کسی زمانے میں بے تعصبی اور رواداری ہمارے معاشرے کی عام روش تھی۔ لوگ نہ تو قومی یک جہتی کی دہائی دیتے تھے نہ مذہبی اختلافات سے بالا ہونے کی لیکن رواداری کا عالم یہ تھا کہ ایک فرقے کے لوگ دوسرے فرقے کے لوگوں کے تعصبات تک کا احترام کرتے تھے۔ شب برات کو ہمارے گھر میرے والد کے مسلمان دوستوں کی طرف سے حلوہ آیا کرتا تھا۔ لانے والے حلوے کا تھال ہندو حلوائی کے سر پر رکھوا کر لاتے تھے۔ وہ ہمارے گھر کا دروازہ کھٹکھٹاتے، والد یا بڑے بھائی صاحب باہر نکلتے۔ مصافحہ ہوتا، اس کے بعد حلوہ لانے والا خود پیچھے ہٹ جاتا اور حلوائی تھال گھر کے اندر پہنچا دیتا۔ بڑے ہو کر جب ان تعصبات پر سے میرا ایمان اٹھ گیا، میں اپنے مسلمان دوستوں کے ساتھ آزادانہ کھانے پینے لگا اور گوشت خوری بھی شروع کر دی تو یاد پڑتا ہے کہ اس پر والد کے کچھ مسلمان دوستوں نے بھی اعتراض کیا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ میں اپنی خاندانی روایات ترک کروں۔

معاشرے کی اونچی سطح پر اس قسم کے تعصبات تھے ہی نہیں۔ وہاں لوگوں میں اگر کوئی فرق تھا تو صرف ناموں کا۔ اس معاشرے کے بہترین نمائندے پنڈت موتی لال نہرو اور رفیع احمد قدوائی تھے۔ ان دونوں کی بے تعصبی ان کے کلچر کا حصہ تھی اور اس میں کسی افادی نظریے کو دخل نہیں تھا، نہ شخصی نہ قومی۔ رفیع احمد قدوائی کو تو قوم پرست مسلمان کہلانا بھی ناگوار تھا۔ مولانا آزاد کے زیرِ صدارت قوم پرست مسلمانوں کی کانفرنس ہوئی تو انھوں نے اس میں شرکت سے برملا انکار کر دیا۔ جن دنوں وہ یوپی میں ہوم منسٹر تھے، یوپی کے کسی شہر میں ہندو مسلم فساد ہو گیا۔ وہ سیدھے وہاں پہنچے اور اپنے ایک ہندو دوست کے گھر قیام کیا، جس کی شہرت یہ تھی کہ وہ مذہبی معاملات میں کچھ زیادہ کشادہ دل نہیں۔ اس سے استفسار کیا تو اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ زیادتی ہندوؤں کی ہے۔ قدوائی صاحب نے لکھنؤ واپس آکر ہندوؤں پر اجتماعی جرمانہ عائد کر دیا۔ ظاہر ہے کہ یہ اقدام انتہائی صاف باطنی کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ لوگ انھیں فرقہ پرست ہندو کہا کرتے تھے لیکن ان کا کردار دیکھ کر انھیں قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں سے مشابہت دی جا سکتی تھی۔

اس کے بعد بے تعصبی کلچر کا حصہ نہیں رہی بلکہ سیکولرزم کے نام پر آئیڈیالوجی بن گئی۔ آئیڈیالوجی میں زور تبلیغ اور نعرے بازی پر ہوتا ہے اور جب یہ سلسلہ شروع ہو جائے

تو کسی چور دروازے سے منافقت در آتی ہے۔ میں نے نامی گرامی سیکولر ہندوؤں اور مسلمانوں کو منبر سے قومی یک جہتی اور سیکولرزم کا پرچار کرتے دیکھا ہے اور اندرونِ خانہ ان کی روش کو اس سے بالکل مختلف پایا ہے۔

مصیبت یہیں ختم نہیں ہوئی۔ سیاسی دھڑے بندیاں شروع ہوئیں تو سیکولرزم صرف آئڈیالوجی ہی نہیں، بلکہ پیشہ بن گیا۔ کہتے ہیں کہ یوپی میں شراب کی کشید کے ایک بہت بڑے کارخانے کا مالک شراب نہیں پیتا تھا۔ یہی حال سیکولرسٹوں کا بھی ہے۔ وہ سیکولرزم کی تائید میں تقریریں کرتے ہیں، مضامین لکھتے ہیں اور ان کا معقول معاوضہ وصول کرتے ہیں لیکن سیکولرزم ان کی عملی زندگی میں کہیں دخیل نہیں ہوتا۔

خوشی کی بات یہ ہے کہ دلی کے غالی سیکولرسٹ کی منافقت پر اعتراض کرنے والا جریدہ ایک ایسا جریدہ ہے جس کا ایڈیٹر مسلمان ہے اور وہ اپنے سیکولرسٹ ہونے کا کبھی ذکر نہیں کرتا۔ اس سے اُمید بندھتی ہے کہ بے تعصبی ہمارے معاشرے سے ابھی ختم نہیں ہوئی۔ فساد کی اصل جڑ پیشہ ور سیکولرسٹ ہیں۔ ان کی منافقانہ روش کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ اگر کسی معاملے میں ہندو مسلمان متفق ہوتے نظر آئیں تو ان لوگوں کی زبان سے بیک وقت یہ نعرہ برآمد ہوتا ہے کہ فرقہ پرست آپس میں مل گئے ہیں۔ اب جب آر۔ ایس۔ ایس اور جماعت اسلامی میں باہمی تبادلۂ خیال شروع ہوا ہے تو یہ نعرہ پھر گونجنے لگا ہے۔ کاش کوئی ان حضرات کو اس پرانے مقولے کی یاد دلا دے:

میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی

44

آپ کے پیار کی طرح قدرتی۔ اس میں پانچ قدرتی اجزا شامل ہیں
جو آپ کے بچے کے نازک نظامِ ہضم کو
ٹھیک کرتے ہیں اور پیٹ کی خرابی، درد،
ابھار اور دستوں میں آرام دیتے ہیں

ماں کی
محبت کے بعد!

گوپال متل | حاصلِ گفتگو

دسمبر ۱۹۷۶ء کے شمارے میں مندرجۂ ذیل سوالنامہ شائع کیا گیا تھا :

۱۔ جدید ادب، قدیم ادب سے انحراف ہے یا اُس کی بنیادی اقدار کی بحالی ؟

۲۔ جدید ادب میں ہیئتی تبدیلیوں اور موضوعاتی تبدیلیوں کی تناسبی اہمیت کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے ؟

۳۔ تنہائی کا احساس صرف صنعتی پھیلاؤ کا ردِ عمل ہے یا یہ ایک تخلیقی ذہن کا ایسا وصف ہے جس کا سماجی نظاموں سے محض نسبتی تعلق ہے ؟

۴۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ہر ادب تبلیغ ہوتا ہے۔ کہیں یہ لوگ تبلیغ اور ترسیل کو باہم خلط ملط تو نہیں کرتے ؟ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے ؟

۵۔ جدید ادب کو ایک مدت تک معتوب کرنے کے بعد، ترقی پسند ناقد اب اسے ترقی پسندی کی توسیع قرار دینے لگے ہیں اس میں کسی نئے عرفان کا دخل ہے یا یہ پسپائی کا اعتراف ہے ؟

۶۔ کیا ملک و قوم کی تعمیرِ جدید میں ادب کوئی کردار ادا کر سکتا ہے؟ جواب اثبات میں ہو تو اس سلسلے میں ادیبوں کو بھگتی تحریک اور صوفی مت کے شاعروں کی طرح ایک نفسیاتی ماحول تیار کرنا چاہیے یا چند مخصوص نعروں کو اپنی نگارشات میں جگہ دینا بھی ان کے لیے ضروری ہے ؟

۷۔ ادب کی تعریف بعض لوگوں نے یہ بھی کی ہے کہ یہ ناپسندیدہ جذبات کے پُرامن اخراج کا ایک ذریعہ ہے۔ اگر ایسا ہے تو اس ادب کو بھی سماجی خرابیوں کا حامل ماننا پڑے گا جسے بالعموم مریضانہ ادب کہا جاتا ہے۔ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے ؟

اُردو کے ادیبوں، شاعروں اور تنقید نگاروں سے اس پر اظہارِ خیال کی درخواست کی گئی تھی۔ اس درخواست کی جس انداز میں پذیرائی ہوئی وہ تحریک، کے لیے باعثِ فخر ہے۔

سوالنامہ اس وقت شائع کیا گیا تھا جب ایمرجنسی اپنے پورے شباب پر تھی اور ہندی کی طرح اردو کے ادیبوں کے بارے میں بھی یہ کہا جا رہا تھا کہ وہ اسٹیبلشمنٹ کے تابع مہمل بن گئے ہیں اور سچ بات زبان پر لانا ان کے بس میں نہیں۔ چند سوالوں کے مضمرات ایسے تھے کہ ان کا جواب دینے کے لیے واقعی اخلاقی جرأت کی ضرورت تھی۔ عمائدینِ ادب نے جس صاف گوئی سے سوالات کا جواب دیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسٹیبلشمنٹ کا تابع مہمل بن جانے کا الزام اُردو ادیبوں پر صحیح نہیں تھا۔ اس کے مجرم یا تو متشاعر تھے جن میں سے کچھ کی گزر اوقات سرکاری وظیفوں پر ہوتی تھی اور کچھ سرکاری مشاعرے پڑھ کر اپنا پیٹ پالتے تھے یا وہ ادیب اور شاعر جنھوں نے ایک ایسے نظریے کو اپنا لیا تھا جو اصولی طور پر ادب کو سیاست کا تابعِ مہمل سمجھتا ہے۔ آزادی کے فوراً بعد ان لوگوں کا خیال تھا کہ ہندستان میں اشتراکی انقلاب آنے والا ہے اور اس کے بعد جو حکومت قائم ہوگی وہ باقی کمیونسٹ ملکوں کی طرح ماسکو ہی سے ہدایات لے گی۔ چنانچہ انھوں نے ماسکو کے حکمران سٹالن کی مدح سرائی شروع کر دی۔ جب یہ بھرم ٹوٹا کہ ہندستان

میں اشتراکی انقلاب آنے والا ہے تو انھیں، اسٹالن کی بجائے ہندوستان کے حکمرانوں کی مدح سرائی میں کوئی پس و پیش نہیں ہوا اور جس طرح اسٹالن کی مدح سرائی کرتے وقت وہ اس کے ظلم و ستم کو نظرانداز کر دیتے تھے اسی طرح ہندستانی حکمرانوں کی مدح سرائی کرتے ہوئے بھی انھوں نے ان کے اعمال کا محاسبہ ضروری نہیں سمجھا۔

لیکن وہ لوگ جن کے دل میں تخلیق کی سچی لگن تھی یا جن کی علم اور ادب کے ساتھ جائز قسم کی وابستگی تھی، ان کے دل و دماغ وقتی ہنگامہ آرائیوں سے محفوظ رہے۔ انھوں نے اپنی اصابتِ رائے کو نہ لالچ پر قربان کیا اور نہ حقیقی یا فرضی دہشت پر۔ جن لوگوں نے ہمارے سوالنامے پر اظہارِ خیال کیا ہے، علم و ادب میں وہ واقعی اہم مقام رکھتے ہیں۔ ان میں ڈاکٹر یوسف حسین خان جیسے بزرگ محقق اور ناقد ہیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر گوپی چند نارنگ اور شعبے کے دیگر اساتذہ ڈاکٹر عنوان چشتی، ڈاکٹر شمیم حنفی اور ڈاکٹر مظفر حنفی ہیں۔ الہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر گیان چند جین ہیں کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر شکیل الرحمٰن اور ریڈر ڈاکٹر حامدی کاشمیری ہیں، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے استاد شہریار ہیں، راجستھان یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر فضل امام ہیں، دلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر قمر رئیس اور دوسرے مختلف کالجوں کے اساتذہ میں احتشام اختر، ابرار اعظمی، منظر کاظمی، شاہد میر، ستیہ نند جاوا، خورشید احمد جامی اور وارث علوی ہیں۔ بلراج کومل، کرشن موہن، قمر احسن، پرکاش فکری، ابوالکلام قاسمی، ابوالفیض سحر، شوکت حیات، شمس الرحمٰن فاروقی، سید فضل المتین اور معصوم نظر جیسے شاعر ادیب اور نقاد ہیں۔

سب سے زیادہ خوشی اس بات کی ہے کہ ان معتبر حضرات نے ہمارے سوالنامے کو صرف سرسری توجہ کا مستحق نہیں سمجھا اور بیشتر نے انشا پردازی سے بھی پرہیز کیا جو ادبی مباحث کو بلا وجہ گنجلک بنا دیتی ہے۔ پہلے سوال کے جواب میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کا یہ ارشاد بہت اہم ہے کہ جدید ادب کی سب سے بڑی پہچان یہی ہے کہ یہ ادب کی ادبی اقدار کی بحالی کے لیے کوشاں ہے اور یہ کہ "اس صدی کی چوتھی دہائی میں ایک گروہ نے مقصدیت اور افادیت کی اشتراکی اصطلاحات کے پس پردہ ادب کو سیاسی تبلیغ کا آلۂ کار بنانے کی جو کوشش کی یا جدید اردو ادب دراصل اسی کوشش کے ردِ عمل کے طور پر سامنے آیا ہے ... ادب میں بنیادی اہمیت ادبی اقدار کی ہے۔ نئے ادب نے اپنا نسب نامہ قدیم ادب سے جوڑا ہے اور اب اس میں جامع ادبی جمالیات پر اصرار کیا جانے لگا ہے"۔ بلراج کومل کا یہ کہنا بھی اپنی جگہ صحیح ہے کہ "اعلیٰ پایے کا ادب تصدیق اور تخریب دونوں حالتوں میں بنیادی ادبی اقدار کا احترام کرتا ہے"۔ اس کا بہترین ثبوت ہمارے نزدیک صوفیانہ شاعری ہے۔ اس نے مروجہ مذہبی تعصبات کی تخریب کی لیکن اس کا مقصد بنیادی اخلاقی اقدار پر زور دینا تھا جو مذہبی اقدار سے کسی طرح مختلف نہیں تھیں۔ ادبی اعتبار سے بھی اس نے بنیادی ادبی اقدار کو فروغ ہی دیا۔

ڈاکٹر مظفر حنفی نے بات اور کھل کر کہی ہے۔ ان کا ارشاد ہے: "میرے نزدیک جدید ادب، قدیم ادب سے انحراف نہیں ہے بلکہ ادب کی ان بنیادی اقدار کی بحالی ہے جو دبستانِ لکھنؤ کی غیر ادبی خارجیت، سرسید تحریک کی بڑھتی ہوئی اصلاح پسندی اور ترقی پسندوں کی نظریاتی حصار بندی کی وجہ سے پس پشت جا پڑی تھیں۔ بظاہر نیا فنکار قدیم ادب سے باغی نظر آتا ہے لیکن سچی بغاوت کے لیے لازم آتا ہے کہ جس روایت سے بغاوت کی جا رہی ہو، اس کے حسن و قبح پر باغی کی گہری نگاہ ہو۔ چنانچہ وہی نئے لکھنے والے صحیح معنوں میں ادب تخلیق کر سکے ہیں جو اپنے کلاسیکی سرمائے کا سچا شعور رکھتے ہیں۔" ڈاکٹر حامدی کاشمیری نے مسئلے کے ایک اور پہلو کو اجاگر

کیا ہے۔ یہ کہہ کر کہ "جدید ادب ان معنی میں قدیم ادب کی بنیادی اقدار کی بحالی پر زور دیتا ہے کہ یہ معلومات اور تفصیلات کے نقطہ نظر کو نہیں بلکہ ان کی تخلیقی بازیافت کو اہمیت دیتا ہے" جدید ادب کو قدیم ادب سے انھوں نے ایک اعتبار سے ممیز بھی کیا ہے۔ ان کے نزدیک جہاں "قدیم دور میں فن کار کا ذہن اور تخیل زندگی، معاشرہ یا کائنات کے بارے میں انفرادی نتائج فکر تلاش کرنے کی بجائے مروجہ فلسفیانہ مفروضوں کا پابند رہا" وہاں "نیا ادیب ہر حال میں شعر و فن کے تخلیقی کردار کے استحکام پر زور دیتا ہے"۔

ڈاکٹر شمیم حنفی کی یہ بات اپنی جگہ بہت اہم ہے کہ "اقدار کا مسئلہ اخلاقیات سے متعلق ہے"، لیکن مسئلہ زیر بحث کے سلسلے میں یہ انھیں تسلیم ہے کہ "جدید ادب نے انیسویں صدی کے ربع آخر کی اصلاح پسندی اور امید پرستی نیز بیسویں صدی کی مقصدیت اور نظریۂ زندگی کی فصیلوں کو عبور کر کے قدیم ادب کی وسعتِ فکر سے ایک نیا رشتہ قائم کرنے کی سعی کی ہے اور اس طرح روایت کے تسلسل کو ایک نئے معنی سے ہم کنار کیا ہے۔ جدید و قدیم ادب میں یہ عنصر بلاشبہ ایک مشترکہ قدر کی حیثیت رکھتا ہے کہ دونوں سطحی تعقل اور یک رخے بیرونی مقاصد کے جبر سے آزاد ہیں، اس طرح انسان کے تخلیقی نصب العین کی آزادی کا اثبات کرتے ہیں اور انجمن اشاعت مفیدہ (عرفِ عام میں انجمن پنجاب) اور ترقی پسند تحریک دونوں کی ضابطہ بندی اور حدود کی نفی کرتے ہیں"۔

وارث علوی کا کہنا ہے کہ "انحراف شاعر قدیم ادب سے نہیں کرتا، اس کا انحراف اپنے فوری پیشروؤں کے خلاف ہوتا ہے۔ فنکار جب محسوس کرتا ہے کہ اس کے پیشرو جو کچھ لکھ چکے ہیں یا جس انداز سے اس کے بلوغت کے زمانے تک لکھتے رہے ہیں، وہ اس کے منفرد احساس اور تجربہ کے بیان کے لیے بہت کارگر ثابت نہیں ہو رہا تو وہ انحراف اور اجتہاد سے کام لے کر اپنا راستہ الگ بناتا ہے"۔

شمس الرحمٰن فاروقی کی رائے مختصر بھی ہے اور جامع بھی۔ اسے تمام و کمال نقل کیا جاتا ہے:

"جدید ادب ماضیِ قریب کے ادب (تمام ادب نہیں لیکن تقریباً تمام ادب) سے انحراف لیکن قدیم ادب (یعنی وہ ادب جس کا تصور ہمارے بڑے شعرا سے وابستہ ہے) کی بنیادی اقدار کی بحالی ہے۔ اس کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ ماضیِ قریب کے ادب کا بڑا حصہ غیر ادبی سرگرمیوں کے زمرے میں آتا ہے کیوں کہ اس میں تجربہ و احساس سے زیادہ خیال (اور وہ بھی ایک مخصوص طرح کے خیال) کے اظہار پر زور دیا گیا ہے۔ لہٰذا اس کو صرف اسی معنی میں ادب کہہ سکتے ہیں جس میں قانون یا طب کی کتابوں کو ادب کہا جاتا ہے (قانونی ادب، طبی ادب، اس موضوع پر کیا کیا لٹریچر موجود ہے یعنی کیا لکھا گیا ہے۔) تحریر اسی وقت ادب کے زمرے میں آتی ہے جب اس میں مذکورہ خیالات ادبی حیثیت سے اہم ہوں، یعنی بذاتِ خود اہم ہوں۔ ان کی اہمیت ثابت کرنے کے لیے کسی فلسفے یا نظریے کا سہارا لینے کی ضرورت نہ پڑے۔ ہمارے یہاں شعر اور پھر نثری ادب دونوں کی اصلی روایتیں اس نظریے کا استحکام کرتی ہیں کہ ادب لوگوں کو زندگی کے بارے میں باخبر تر تو بناتا ہے لیکن انھیں کسی مخصوص نظریۂ فکر و حیات کا پابند بن جانے کی ترغیب نہیں دیتا۔ ادب کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ وہ اس میں بیان کردہ خیالات کی وجہ سے نہیں، بلکہ ان کے باوجود اہم اور خوب صورت ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں ماضیِ قریب میں اس بات کو بھلا دیا گیا اور یہ سمجھا گیا کہ ادب اسی وقت اہم اور خوب صورت ہے جب ہم اس میں بیان کردہ نظریات و خیالات کو بھی اہم، خوب صورت، صحیح یا صحت مند سمجھیں۔ جدید ادب اس خیال کو باطل سمجھتا ہے اس لیے وہ ماضیِ قریب کے ادب سے یقیناً منحرف

ہے۔ لیکن ہمارا قدیم سرمایہ جس میں ادب کے صحیح تفاعل کا
پورا شعور ملتا ہے ہماری بیش قیمت ترین میراث ہے۔
قدیم اقدار کی بحالی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تجربے کی
راہیں مسدود کر دی جائیں۔ اکثر تو تجربے کے ہی
ذریعہ قدیم اقدار دوبارہ بحال ہوتے ہیں۔"

دوسرے سوال یعنی جدید ادب میں ہیئتی اور موضوعاتی
تبدیلیوں کے تناسب کے بارے میں تقریباً سبھی حضرات
متفق ہیں کہ ہیئتی تبدیلیاں موضوعاتی تبدیلیوں کا قدرتی
نتیجہ ہیں اور انھیں ایک دوسرے سے الگ کرنا مشکل ہے۔
اس ضمن میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کی یہ بات البتہ قابلِ
غور ہے کہ "اردو میں چونکہ مقلدیت کا خاصا زور رہا ہے
اس لیے ہیئتی تبدیلیاں آسانی سے قبول نہیں ہوتیں۔ نیز
ہیئت پر نظر چونکہ سب سے پہلے پڑتی ہے، اس لیے
سب سے زیادہ ہدفِ ملامت اسی کو بنایا جاتا رہا ہے
اور اس جرم کا ارتکاب اکثر وہی لوگ کرتے ہیں جو موضوع
اور ہیئت کے وحدانی رشتے کو نہیں سمجھتے یا خارجی اثرات
کی وجہ سے محض موضوع یا مواد کو ادب سمجھنے کی غلطی کرتے
ہیں۔"

تیسرے سوال کے سلسلے میں بھی تقریباً اتفاق رائے
ہے کہ تنہائی کا احساس تخلیقی ذہن کا وصف ہے جو اعلیٰ
فن کاروں کا ہمیشہ مقدر رہا ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ
صنعتی پھیلاؤ نے اس احساس کو قوی تر کر دیا ہو کیونکہ
اس نظام میں انسانی رشتے کمزور پڑ جاتے ہیں۔

چوتھے سوال کے بارے میں بھی بیشتر جواب دینے
والوں کا قریب قریب اتفاق ہے۔ اس کے ماحصل کو
ڈاکٹر شمیم حنفی کے الفاظ میں اس طرح بیان کیا جا سکتا
ہے:

"اچھا ادب تبلیغ نہیں ہوتا۔ تبلیغ کے آداب، مقاصد،
صیغۂ اظہار، سب کے سب متعین ہوتے ہیں اور ہمیشہ
Battel Than Thou کے نقطے سے شروع
ہوتے ہیں۔ یہ رویّہ ادب کے منصب کو کم کرنے کے
ساتھ ساتھ اس کی ترکیب اور ہیئت کو بھی مسخ کرتا ہے
رہا ترسیل کا سوال تو اس کا ایک سرا قاری کی استعداد
سے مربوط ہے اور اس پر بھی کچھ ذمے داریاں عائد کرتا ہے"

شمس الرحمٰن فاروقی نے بات ذرا تیکھے پن سے
کہی ہے:

"ادب تبلیغ ہوتا ہے، یہ نظریہ ویسا ہی ہے جیسے
کوئی کہے کہ گھوڑ دوڑ کے گھوڑے کو تانگے میں بھی جوت
سکتے ہیں۔ یقیناً جوت سکتے ہیں لیکن اس میں گھوڑے،
تانگے، تانگے والے اور مسافر سب کا ستیاناس ہو گا۔ چونکہ
تبلیغ کرنے والے ترسیل کے معاملات سے باخبر ہی نہیں ہو سکتے اس لیے یہ فرض
کرنا کہ وہ تبلیغ و ترسیل کو خلط ملط کرتے ہیں، درست نہیں ہے۔"

پانچویں سوال کے جوابات نے یہ طے کر دیا کہ جدید
ادب ترقی پسند ادب کی توسیع ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اگر
کچھ ترقی پسند ناقد اس قسم کی بات کہتے ہیں تو یہ احساس
پسپائی ہے اور اس میں کسی نئے عرفان کو دخل نہیں۔
یہ خیال درست ہے کہ کبھی ترقی پسند ناقد جدید ادب کو
ترقی پسند ادب کی توسیع قرار نہیں دیتے اور اس کے
خلاف برہمی کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ بقول وارث علوی
"ترقی پسند نقاد کا کردار ایک سخت گیر ملّا کا کردار ہے
جسے ادب کی سالمیت سے زیادہ سماج کی صحت کا غم
کھائے جاتا ہے۔"

چھٹا سوال یہ تھا کہ "کیا ملک و قوم کی تعمیر جدید
میں ادب کوئی کردار ادا کر سکتا ہے؟ جواب اثبات
میں ہو تو اس سلسلے میں ادیبوں کو بھگتی تحریک اور صوفی
مت کے شاعروں کی طرح ایک نفسیاتی ماحول تیار
کرنا چاہیے یا چند مخصوص نعروں کو اپنی نگارشات
میں جگہ دینا بھی ان کے لیے ضروری ہے؟"

یہ سوال جس وقت قائم کیا گیا اس وقت ایمرجنسی
بھی نافذ تھی اور نیشنل رائٹرز فورم بھی وجود میں آ چکا
تھا جس کے بارے میں بعض حضرات کو یہ خدشہ تھا کہ
اس فرق کے ساتھ کہ ادیبوں سے سوویٹ یونین کی

مدح سرائی کے بجائے حکومتِ وقت کا تابع مہمل بننے کا مطالبہ کیا جائے، کہیں یہ انجمن پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن کی مثنیٰ تو نہیں؟ ہمیں خوشی ہے کہ اس قسم کے تمام خدشات کے باوجود اردو کے شاعروں اور ادیبوں نے اس سوال کا واضح جواب دیا اور متعدد نے تو اس سے برملا انکار کر دیا کہ تخلیقِ ادب کے سوا بھی بہ طور ادیب ان کے کچھ فرائض ہیں۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ فورم کے شعبہ اُردو کے جنرل سکریٹری تھے لیکن انھوں نے واشگاف لفظوں میں لکھا "ادب کی دنیا فکر و احساس کی دنیا ہے، عمل کی دنیا نہیں۔ ادیب کا کام صفیں آراستہ کرنا یا علم اٹھانا نہیں" ڈاکٹر مظفر حنفی نے زیادہ صراحت کے ساتھ کہا کہ "ادب کسی واضح تبلیغی کاوش کے بغیر فرد کے جذبات کی تطہیر کا فریضہ انجام دیتا ہے، اس کے لیے روحانی غذا فراہم کرتا ہے اور غالب کے الفاظ میں آدمی کو انسان بناتا ہے۔ اس طرح فرد اپنے طور پر خود اخلاقی اقدار کا احترام کرنا سیکھتا ہے اور اس کے اعمال و افعال تعمیری رُخ اختیار کرتے ہیں مخصوص نعروں کو اپنی نگارشات میں جگہ دینے والے تو خیر ادیب و شاعر ہو ہی نہیں سکتے لیکن میں اس کے حق میں بھی نہیں ہوں کہ فنکار شعوری طور پر کوئی خاص نفسیاتی ماحول تیار کرنے کی کوشش کرے" اور بقول احتشام اختر "ادب ملک و قوم کی تعمیر اس طرح نہیں کرتا جس طرح مصلحین اور سماجیات کے ماہرین اور سیاست داں کرتے ہیں۔ اسی لیے ادب نہ تو مخصوص نعروں کو اپنی نگارشات میں جگہ دیتا ہے اور نہ ہی کسی تحریک کی طرح کوئی نفسیاتی ماحول تیار کرتا ہے" ڈاکٹر حامدی کاشمیری کے نزدیک "ادب براہِ راست ملک و قوم کی تعمیر جدید میں کوئی کردار ادا نہیں کر سکتا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ادب کی کوئی افادیت نہیں۔ اس کی افادیت اس کی بصیرت افروزی میں مضمر ہے۔ ملک یا معاشرے کی تعمیرِ نو کا عمل کوئی یک سطحی عمل نہیں"

مختلف حضرات کے الفاظ مختلف ہیں لیکن ان کا ماحصل وہی ہے جو شمس الرحمٰن فاروقی نے ایک جملے میں کہہ دیا ہے: "میں ادب کے ذریعے کسی سماجی فریضے کی ادائگی کا قائل ہی نہیں ہوں"

ساتویں سوال کا جواب دیتے ہوئے معصوم نظر نے بہت صحیح کہا ہے کہ "ادب انسان کے ناپسندیدہ جذبات کو ایک شائستگی عطا کرتا ہے۔ ادب میں سب سے اہم بات رویے کی ہے کہ فنکار کا رویہ کیا ہے" کرشن موہن لکھتے ہیں: "ادب کی یہ تعریف کہ یہ ناپسندیدہ جذبات کے پرامن اخراج کا ایک ذریعہ ہے، قابلِ قبول ہے۔ ایسا ادب بھی بالواسطہ سماجی فریضے کا حامل ہوتا ہے۔ so called مریضانہ ادب جیسے بادلیئر اور میراجی کی نظمیں بسا اوقات نفسیاتی تسکین بہم پہنچاتی ہیں۔ ایسا ادب عظیم نہ سہی لیکن اہم ضرور ہے۔ ناپسندیدہ جذبات کے اخراج کی عکاسی دل کا بوجھ ہلکا کر دیتی ہے (لکھنے والے کا بھی اور ہم آہنگ قاری کا بھی)"

اس نتیجہ خیز بحث کے لیے ہم اپنے تمام کرمفرماؤں کا شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے اپنی دوسری مصروفیتوں کے باوجود اس میں شرکت کی اور اپنے قیمتی خیالات سے پڑھنے والوں کو مستفید کیا۔

▲▲

عروج زیدی کے خیال افروز قطعات
شمع فروزاں
قیمت: پانچ روپے

امیر قزلباش کے شعری مجموعے
باز گشت　قیمت: چھ روپے
انکار　قیمت: دس روپے
نیشنل اکاڈمی سے طلب کریں

کرشن موہن

ریچھ

لوگ کہتے ہیں کہ میں اک ریچھ تھا پچھلے جنم میں
جانور زندہ ہے اب تک
میری جنسی بھوک تابندہ ہے اب تک
کامنا کے جال کتنے
بے پردہ بالی میں گزرے میرے ماہ و سال کتنے
جسم پر ہیں بال کتنے
جو پسند آئیں "مساتی" عورتوں کو
اور مجھ کو چبھ رہے ہیں
"سادیت" ہے میرا مشرب
لذتِ ایذا دہی سے جھومتا ہوں
چاہتا ہے من، ملن ہونٹ نئی رس کامنی سے
شوخ چنچل دامنی سے
بات کومل گات کی ہے
رات چنچل مات کی ہے
"کام" کی رجنی کا بسیا
گیان رسیا
بھوگ کے بس میں ہے جوگی
ضبط سے نا آشنا سا
ریچھ کے مانند، ماراوا سنا سا
کام لہرے ہیں مری مٹی کے نم میں
لوگ کہتے ہیں کہ میں اک ریچھ تھا پچھلے جنم میں

▲▲

B-124 ـــــ بنڈارا روڈ ـــــ نئی دہلی

غزلیں

کرشن مراری

اک فضا جو فضاؤں میں پیدا ہوئی
کچھ حسیں خواب بے کل سے بنتی رہی

آج خوشیوں کا غم۔ آج غم کی خوشی
اس طرح ہی گزرتی گئی زندگی

زندگی کا وہی آج حاصل بنی
دِل کو تجھ سے جو اک خاص نسبت رہی

وہ ترا آستاں میری سجدہ گری
میرے اشعار ہی ہیں مری بندگی

یاس کے راستوں میں ہے وہ موڑ بھی
موت پر آس رکھتے ہے جب آدمی

اپنے حصے کا غم مجھ کو مل ہی گیا
ہے اِسی بات کی آج بے حد خوشی

شمعِ دانش لیے یوں بھٹکتا رہا
خود سے ہی ہو گیا آدمی اجنبی

بکھری بکھری سی بے کل سہانی لگن
بن کے خوش دِل نشیں شاعری میں ڈھلی

▲▲

عروج زیدی

عشق نے یہ کہہ کے مفہومِ وفا چمکا دیا
زندگی کو یوں سمجھئے جیسے اک جلتا دیا

نیتِ ایفا سلامت، خاطرِ وعدہ بخیر
آگ جو دل میں دبی تھی اس نے کیوں شعلہ دیا

اور رنگیں ہو گئے انجامِ حیرت کے نقوش
حُسن نے جب عشق کے ہاتھوں میں آئینہ دیا

جو دیئے تھے راہِ ہستی میں امیدوں نے فریب
اُن فریبوں نے کہیں دیوار دی، سایا دیا

میں تو پابندِ سکوتِ احتیاط آمیز تھا
اس طریقِ کار نے محفل کو اٹھا تا دیا

قولِ انساں: "دل بدست آور کہ حج اکبر است"
کارِ انساں: اہلِ دل کو زہر کا پیالہ دیا

کوئی مانے یا نہ مانے سچ ہے یہ قولِ عروج
آپ بے چہرہ تھے ہم نے آپ کو چہرا دیا

عبداللہ کمال

اگر اونچے اڑے تو سر جھلس جائیں گے
مگر پرواز نیچی ہو تو کیا لا پائیں گے

جہاں تک سر پہ سورج ہے، سفر جاری ہے
جہاں پر شام ڈھل جائے، ٹھہر جائیں گے

یہاں سے گوشت کا رشتہ صدائیں دے گا
لہو کے سلسلے بس ذات تک آئیں گے

کسی بچے کے ہاتھوں کا غبارہ تھے ہم
بہت دکھ ہے پلٹ کر اب نہیں آئیں گے

کہ ہم تیزابی لمحوں کے مسافر ٹھہرے
مثالِ رنگ دھیرے دھیرے اڑ جائیں گے

▲▲

۴-سی، اروِن روڈ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

★ گھر سیف الدین خاں۔ رامپور۔ یوپی

★ دوسرا فلور، شاہجی بلڈنگ آر۔ ۲۸ نورباغ بمبئی

غزلیں

آفتاب شمسی

عمر بھر پہچانا چھوڑا جانے کیسا درد تھا
دل کی ویرانی کے آگے سارا صحرا گرد تھا

آج تک بھولا نہیں دل اُس کے جانے کا سماں
شام بھاگی آ رہی تھی دن کا چہرہ زرد تھا

گرم رکھا کتنے ہی ذہنوں کو جس نے مدتوں
ہاتھ اس کا میں نے جب بھی چھو کے دیکھا سرد تھا

عمر بھر اک دوسرے کی خامیاں گنتے رہے
میں بھی اُس کا یار تھا وہ بھی مرا ہمدرد تھا

سامنے کھڑکی کے سب ہی دیر تک لیٹے رہے
ریل کی سیٹی میں جانے کس بلا کا درد تھا

▲▲

حیات لکھنوی

سکوت ایسا کہ طوفاں ٹھہر گیا جیسے
تمام شہر فرشتوں سے بھر گیا جیسے

مجھے تو لوگ بھی یوں مطمئن سے ملتے ہیں
سروں سے بارِ تمنا اتر گیا جیسے

یہ قتلِ جسم کی لذت کا جاں فزا احساس
وہ میری روح پہ احسان کر گیا جیسے

کچھ اس طرح مجھے ہر شے دکھائی دیتی ہے
نظر سے آج شعورِ نظر گیا جیسے

تو عکسِ آئینہ برعکس ہو گیا ہے کیا
خود اپنے چہرے سے ہر شخص ڈر گیا جیسے

فضائے صحنِ چمن اس طرح مہکتی ہے
گلوں کے پاس سے کوئی گزر گیا جیسے

یوں شاہکار ملے تشنۂ کمال حیات
ہنر وروں ہی سے ذوقِ ہنر گیا جیسے

▲▲

ڈاکٹر سخاوت شمیم

اس نے کچھ کہنے سے پہلے یہ نہ سوچا ہوگا
میرے احساس سے اس کا کوئی رشتہ ہوگا

آئنہ سے کبھی باہر جو نکلتا ہوگا
اجنبی شخص کا ہمدرد سا چہرہ ہوگا

منتظرِ شام کے لمحوں میں سمائی ہے حیات
اب نہ رات آئے گی کوئی، نہ سویرا ہوگا

یوں تو کچھ لوگ چلے آئیں گے چیخیں سن کر
کون مجروح صداؤں کا مسیحا ہوگا

کوئی عیسیٰ ہے نہ منصور، نہ کوئی سقراط
جنبشِ لب سے کوئی معجزہ اب کیا ہوگا

گم نہ کر دے کہیں ہنگامۂ ہستی اس کو
گھر سے ہر شخص یہی سوچ کے چلتا ہوگا

ہم اگر مر بھی گئے لوگ منائیں گے شمیم
تم اگر جیتے رہو گے تو بھلا کیا ہوگا

▲▲

★ شعبۂ اردو، گورنمنٹ رضا پوسٹ گریجویٹ کالج رامپور
★ امامیہ ہال، پنچکوئیاں روڈ، نئی دہلی
★ سینیر بائز میڈیکل ہوسٹل، جے پور، راجستھان

فخرالدین عارفی | دو، دو = چار

عشرت کا نام ایک جدید شاعر کی حیثیت سے غیر معروف نہیں ہے۔ اس وقت رسالہ دیکھتے دیکھتے اس کا چہرہ اچانک تمتما اٹھا ہے۔ رسالے کو اس نے اپنے دوست نشاط کے آگے پھینک دیا جو اس کے قریب ہی دریچہ کے پاس بیٹھا تھا۔

"کیا ہوا عشرت؟" اس نے پوچھا، "شاید ناقدوں نے تمہیں آڑے ہاتھوں لیا ہے ——"

"ادب ختم ہو گیا، میرے دوست ......!"
عشرت نے آہستہ سے کہا۔ جب عشرت آہستہ بولتا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ وہ بہت سنجیدہ ہے۔ اس نے رسالہ دوبارہ اٹھالیا اور ورق گردانی کرنے لگا۔

"بھئی نشاط یہ تو تمہارے جیسا موٹے دماغ کا آدمی بھی جو دن سات چھوکریوں کے تعاقب میں شہر کے گلی کوچوں کی خاک اڑاتا پھرتا ہے سمجھ سکتا ہے کہ آج کل ادب کی کیا درگت بن رہی ہے ذرا اس شمارے کے مشتملات ملاحظہ کرو تو تمہیں ایک مضمون بوسے کے آغاز و ارتقا پر ملے گا۔ دوسرا اس پر کہ عورتیں اپنی جنسی خواہشات کا اظہار مردوں پر کن وسیلوں سے کیا کرتی ہیں تیسرا اس پر کہ کیا آپ معیاری شوہر ہیں؟ ایک افسانہ ہے جس کی ہیروئن مختلف مردوں سے اپنے جنسی تعلقات استوار رکھتی ہے۔ ایک اور فرضی قصہ جس کا ہیرو محبت میں ناکامی کے بعد خودکشی کر لیتا ہے۔ نشاط اب تم ہی کہو ادب کہاں زندہ ہے؟ کیا میں جھوٹ کہتا ہوں کہ ادب مر گیا۔ دفن ہو گیا ہے؟"

نشاط نہایت آرام سے ایزی چیئر پر بیٹھا تھا جو کھڑکی کے قریب رکھی تھی اور اپنے شاعر دوست کے ادبی مرثیے کو سن رہا تھا۔ اس کا چہرہ جذبات سے بالکل عاری تھا۔ اس کی آنکھوں میں اپنے دوست عشرت کی طرح ادب کے لیے کوئی اضطراب اور بے چینی بھی نہ تھی ——

عشرت کے کمرے کا وہ دریچہ جس کے پاس نشاط بیٹھا تھا ایک سنسان گلی کی طرف کھلتا تھا۔ کھڑکی کے سامنے ہی ایک سال خوردہ، خستہ عمارت اونگھ رہی تھی۔ اس قلعہ نما عمارت میں ایک سن رسیدہ، مرنجاں مرنج آدمی رہتا تھا جس کو اپنے پرانے مکان سے بہت محبت تھی اور جسے وہ کسی قیمت پر بھی فروخت کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اگرچہ مکان آہستہ آہستہ منہدم ہو رہا تھا اور وہ خود بھی جانتا تھا کہ چند سال کے بعد اس عمارت کی ایک اینٹ بھی سالم نہیں بچے گی —— نشاط قریب قریب روز ہی عشرت کے یہاں آتا تھا۔ وہ خود بھی ادب کا ایک طالب علم تھا۔ لیکن اس کی رومانیت اس کے پورے وجود پر حاوی تھی اور حسن وعشق کے چکر میں پڑکر

گو یادہ تباہ ہو چکا تھا۔ اُسے بھلا اس کی کیا فکر ہو سکتی تھی کہ موجودہ بگڑا ہوا حقیقی ادب سے ٹوٹ رہا ہے اور ادب کے نام پر آج کل اوٹ پٹانگ چیزیں زیادہ لکھی جا رہی ہیں جتنی بھی غیر ادبی چیزیں ہوتی ہیں ان کو فنکار تجربے کا نام دے کر تمام تر ادبی ذمہ داریوں سے یکسر سبکدوش ہو جاتا ہے ـــــ اسے تو بس اپنے معاملاتِ عشق سے دلچسپی تھی۔ عشرت کی کھڑکی کے پاس بیٹھنا اس کا محبوب مشغلہ تھا اور عشرت کو اس پر کوئی اعتراض بھی نہ تھا اس لیے کہ نشاط اس کا گہرا دوست تھا۔

"بھئی ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ اس رسالے کے اڈیٹر نے تمہاری نظموں کو لائق اشاعت نہیں سمجھا ہوگا اور واپس کر دیا ہوگا اسی کا یہ سارا غصہ ہے" نشاط نے عشرت کو چڑانے کے لیے کہا اور عشرت سچ مچ بگڑ گیا تھا۔

"جی ہاں یہ بھی کسی چھوکرے کا جو کھٹا ہے جسے دیکھ کر آپ رائے قائم کر سکیں کہ چڑیا جال میں پھنسے گی یا نہیں اور آپ کا اندازہ درست بھی نکلا ـــــ آپ کی اطلاع کے لیے اس شمارے میں میری ایک نظم موجود ہے۔"

"اچھا تو پھر سناؤ ......؟" نشاط نے اپنے پائپ سے نکلے ہوئے دھوئیں کے بادلوں کو گھورتے ہوئے فرمائش کی ـــــ

"ضرور...... سماعت فرمائیے۔ عنوان ہے 'دو، دو = چار ـــ'"

"بہت خوب، عنوان تو بہت خوب صورت ہے" نشاط نے تعریف کی۔

"عنوان ہی نہیں نظم بھی خوب صورت ہے" عشرت زیر لب مسکرایا۔

"ضرور ہو گی" نشاط نے لاپروائی سے جواب دیا اور عشرت نظم سنانے لگا ـــــ

"اندھیرے میں ہر عورت
میری بیوی ہوتی ہے
ہر مرد تاریکی میں ہر ناری کا
پتی ہوتا ہے۔
لیکن وہ نہیں مانتی تھی
شاید کہ پتی ورتا کی قائل تھی)
میں نے اس سے کہا تھا
تم کبھی اندھیرے میں میرے پاس آؤ تو
حقیقت کی یہ گرہ کھل جائے گی
وہ ایک دن ـــــ
تنہائی اور اندھیرے میں
جب مجھ سے ملی، تو ـــــ
مجھے تھپڑ رسید کر گئی ......"

"واہ کیا خوب صورت خیال ہے۔ یار آج میں تمہاری شاعرانہ صلاحیتوں کا قائل ہو گیا" نشاط نے عشرت کی تعریف کی اور پھر اچانک اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ جیسے اُسے کوئی ضروری کام یاد آگیا ہو۔

"یار اب میں چلتا ہوں" اور نشاط پرانی عمارت پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے سیٹی بجاتا ہوا باہر نکل گیا۔

دوسرے دن شام میں عشرت اپنی نئی نظم کے ایک مصرعے میں زیادہ روانی پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی درمیان اس کی نظر پرانی قلعہ نما عمارت کے دریچہ پر پڑی، جو کھلا ہوا تھا۔ دریچے میں اس کے رومان اور شاعری کا ایک حسین مجسمہ سفید لباس میں ملبوس کھڑا نظر آیا ـــــ اُسے ایک لمحہ کے لیے محسوس ہوا جیسے اس کے خواب مجسم ہو گئے ہوں۔ یہ ایک حسین لڑکی تھی۔ جو شبنم کی طرح تر و تازہ، کسی چنبیلی بیل کی طرح نازک اور اس پھول کی طرح خوب صورت تھی جس کی تعریف میں شاعر رطب اللسان رہتے ہیں۔ عشرت نے آج اُسے پہلی مرتبہ دیکھا تھا وہ کچھ دیر تک دریچہ میں کھڑی رہی اور پھر غائب ہو گئی۔

عشرت کے کانوں تک کسی گیت کے مدھر بول آئے اور پھر یہ بول سڑک کی آمد و رفت کی آوازیں کھو گئے لیکن اس ایک لمحہ کے منظر نے عشرت کی دُنیا ہی بدل دی تھی۔ اب بیل گاڑیوں کے پہیّوں سے جو اس کے مکان کے پاس سے گزرتی تھیں محبّت کا نغمہ نکلتا تھا۔ گھڑی کی ٹِک ٹِک میں اُسے ساز کی آواز سنائی دیتی تھی اور گھر کی ساری چیزیں اُسے رومانی دُھند میں لپٹی معلوم ہوتی تھیں۔

دوسرے دن تین بجے شام میں عشرت نے دوبارہ سرزمین رومان کی سمت نگاہ دوڑائی اور اس کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ اس نے دیکھا کہ سامنے کی عمارت کے دریچہ میں ایک تختی لٹک رہی ہے اور اس پر جلی حرفوں میں لکھا ہے۔

"دو، دو = چار"

"معلوم ہوتا ہے یہ تختی خاص اشارہ ہے"۔

پھر اس نے دل میں خیال کیا کہ اگر اس نے ان اشاروں کو نہیں سمجھا تو یہ اس کی انتہائی درجہ کی بے عقلی اور بیوقوفی ہوگی ——— یقیناً اس نے میری نظم "دو، دو = چار" پڑھی ہوگی اور اس سے متاثر ہوکر اس تختی کے ذریعہ اپنی پسند کے اظہار کے ساتھ مبارکباد کا پیغام بھی بھیجا ہے۔ یقیناً وہ جانتی ہوگی کہ ہندوستان کا ایک اہم جدید نظم نگار شاعر اس کا پڑوسی ہے ——— اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے مختلف رسائل میں میری تصویریں بھی دیکھی ہوں اور وہ مجھے شکل سے بھی پہچانتی ہو ———

اس نے اپنا نام بھی رقم کیا ہے۔ ضرور یہ مجھ سے اس کی محبت کی علامت ہے ..... اگر میں نے اس خوب صورت اور لطیف علامت کی زبان کو نہیں سمجھا تو یہ میرا اناڑی پن ہوگا۔

اور اسی طرح ان گنت خیالات کے بھنور میں عشرت کے دل کی نیّا گھر گئی تھی۔ وہ اپنے خیالات کی لہروں میں تادیر ہچکولے کھاتا رہا اور اس کے دل کی کشتی ڈوبتی اُبھرتی رہی ———

پھر اس کے دل میں خیال آیا کہ آج بھی وہ دریچہ پر ضرور آئے گی اور آج اس کے ساتھ کوئی ایسی چیز بھی ہوگی جس کے سہارے وہ کچھ دیر تک دریچہ پر ٹھہر سکے گی ——— جیسے سوئٹر بننے کا سامان یا پھر کوئی میگزین وغیرہ ..... عشرت کے چہرے پر مسکراہٹ کی ایک لہر دوڑ گئی [illegible] اس وقت مسکراتا ہے جب وہ سمجھتا ہے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گا۔ برخلاف اس کے محبت کرنے والی عورت کامیابی کے بعد مسکرانا ترک کر دیتی ہے۔

دفعتاً عشرت کو کسی کے زور زور سے زینہ چڑھنے کی آواز سنائی دی۔ وہ چونک پڑا۔ یہ نشاط کی آمد کا سگنل تھا ———

نشاط معمول کے مطابق آکر اسی دریچہ کے پاس کھڑا ہوگیا اور اس کی نظریں قلعہ نما عمارت پر مرکوز ہوگئیں۔ اس وقت وہ بہت خوبصورت نظر آرہا تھا اس کا سوٹ گہرے عنابی رنگ کا تھا جس کی ایک جیب سے سگاروں کے سرے دکھائی دے رہے تھے۔ اس کے جوتے اور موزے کشمشی رنگ کے تھے قمیض سفید، جس کے کالر بہت سخت اور بگلے کی طرح اُجلے تھے ———

"یار کہاں بجلی گرائے گے؟" عشرت نے مسکراتے ہوئے نشاط سے سوال کیا۔

"تمہارے دل پر"، جواب میں نشاط بھی مسکرا پڑا تھا۔ پھر اس نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی اور تیزی سے دروازے کی طرف لپکا۔ جیسے اُسے اچانک کچھ یاد آگیا ہو۔

"اُف تین بجکر پچاس منٹ ہو رہے ہیں۔ اب میں ایک لمحہ بھی یہاں نہیں ٹھہر سکتا ہوں"۔ وہ خود ہی بڑبڑایا ———

"جب تمہیں اس وقت کسی سے ملنا تھا یا کوئی اور ضروری کام تھا تو پھر یہاں آنے کی ایسی کیا ضرورت پیش آگئی تھی؟"
عشرت نے مسکراتے ہوئے گویا نشاط کی بدحواسی پر طنز کیا تھا۔
نشاط جلتے جاتے رُکا، ایک خاص ادا سے مسکرایا اور کہنے لگا۔
"یار میں معذرت خواہ ہوں۔ لیکن تمہیں میں کیسے بتاؤں کہ جب تک میں تمہارے یہاں نہیں آیا تھا مجھے خود بھی علم نہیں تھا کہ مجھے آج چار بجے کس سے ملنا ہے۔"
"یہ بھی عجیب بات ہے۔" عشرت نے اپنی حیرت کا اظہار کیا۔ اور تب نشاط کہنے لگا۔
"یار اب تم سے کیا پردہ، قصہ دراصل یہ ہے کہ سامنے والی قدیم عمارت میں ایک خوب صورت لڑکی رہتی ہے اور میں اس پر جان دیتا ہوں اور اب تو عنقریب ہم دونوں ایک دوسرے سے وابستہ بھی ہونے والے ہیں ...... میرا مطلب ہے شادی کرنے والے ہیں — میں شہناز کے دریچہ کو یہاں تمہاری کھڑکی سے دیکھ سکتا ہوں۔ جب وہ مجھ سے ملنا چاہتی ہے تو مجھے خاص اشارہ کر دیتی ہے اور میں اس سے مل لیتا ہوں۔ آج چار بجے ملاقات کا وقت مقرر ہے۔ مجھے چاہیے تھا کہ یہ راز تم سے اور پہلے کہہ دیتا لیکن خیر ایک ہی بات ہے۔ تم میرے دوست ہو اور مجھے یقین ہے کہ اس کے لیے برا نہیں مانو گے۔ اچھا یار اب میں چلتا ہوں، دیر ہو رہی ہے — خدا حافظ"۔
"لیکن کم بخت یہ تو بتاتا جا کہ اس نے تجھے کیسے اشارہ کیا؟" عشرت نے جلدی سے پوچھا —
اس کے چہرے سے جیسے مسکراہٹ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئی تھی —
"دیکھو سامنے ایک تختی لٹک رہی ہے اور اس پر لکھا ہے دو، دو = چار — دو، دو کا مطلب ہے۔ روڈ نمبر دو اور کوارٹر نمبر ۲ اور چار کا مطلب ہے ۴ بجے —"
"لیکن کہاں؟" عشرت نے بوکھلا کر پوچھا۔
"وہیں، جہاں اکثر ملتے ہیں ....."
اور نشاط زینے سے اترتے ہوئے چلایا —
"اچھا پھر ملاقات ہوگی، چلتا ہوں۔ خدا حافظ —"
(مرکزی خیال او ہنری کی ایک کہانی سے ماخوذ)
▲▲

بیانؔ میرٹھی (بقیہ صـ۳۸)

جناب محمد شرف الدین ساحل نے اپنے مضمون بیان میرٹھی مطبوعہ تحریک ۳۲ میں سید حتیار الاسلام عیاں کو بھی اُن کے شاگردوں میں شمار کیا ہے۔ یہ غلط ہے عیاںؔ کا سال پیدائش ۱۸۹۷ء ہے اور بیان کا سال وفات ۱۹۰۰ء۔ تین سال کا بچہ اُن کا شاگرد کیسے ہو سکتا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ بیانؔ رشتے میں اُن کے تایا تھے لہ۔ جناب ساحل نے اُن کے ایک شاگرد کا نام بھی غلط لکھا ہے برکت اللہ خاں ادیب کی بجائے برکت شیر خاں ادیب لکھنا چاہیئے تھا۔ یہ سید دقار عظیم کے نانا تھے — بیانؔ کی وفات بھی عجیب حالات میں ہوئی۔ ۱۸۹۹ء میں، انھیں معمولی بخار آیا۔ جو بڑھ کر گردوں کے ورم تک پہنچ گیا۔ ایک دن وہ چارپائی پر لیٹے لیٹے ایک قسم کی ورزش کر رہے تھے کہ ناگہانی ان کے ہاتھ چھوٹ گئے، وہ چارپائی سے نیچے آ رہے اور مالک حقیقی سے جا ملے۔ ان کے انتقال کی تاریخ ۱۳ مارچ ۱۹۰۰ء ہے۔ امیر مینائی نے تاریخ وفات کہی ~ یزداں بخشد جناب بیدانی را
دو نگار پر شادؔ سرور نے بے مثل مرثیہ لکھا جس کے دو اشعار درج ذیل ہیں

میر و مرزا سے زیادہ ترا رتبہ نہ سہی
اُن سے کم تھا ترا پایہ یہ کہیں ہم کیونکر
چوم لیتی تھی فصاحت ترا منہ وقت کلام
اے بیانؔ ختم تھی اعجاز بیانی تجھ پر

▲▲

جدید غزل میں پیکر تراشی

ڈاکٹر عنوان چشتی

پیکر کے دو مفہوم عام ہیں۔ ایک نفسیاتی و تجریدی ہے جس میں پیکر کو تصور، عکس اور ذہنی شبیہ خیال کیا جاتا ہے۔ اور دوسرا لسانی ہے جس میں پیکر کو زبان کی مختلف شکلوں یعنی تشبیہ، استعارہ اور "لفظی تصویر" وغیرہ تصور کیا جاتا ہے۔ پیکر کا پہلا مفہوم نفسیات اور دوسرا ادب سے قریب تر ہے۔ لیکن پیکر کی جامع تعریف ان دونوں تصورات کے امتزاج کے بغیر نہیں کی جاسکتی۔ اردو تنقید میں پیکر کا دبی تصور کی جھلک "وصف"۔ مصوری اور محاکات کی تعریفوں میں ملتی ہے۔ "وصف" کی تعریف یہ ہے کہ "جو شعر منہ سے نکلتا ہے عالم کلام میں باغ جنت کا پھول بن جاتا ہے یعنی صورت کی ہو بہو تصویر ہو جاتا ہے[1]" اس تعریف میں کسی قدر پیکر کی تعریف کی جھلک ملتی ہے۔ شاعرانہ مصوری کی تعریف یہ ہے کہ "شاعری مصوری ہے[2]"۔ اس تعریف میں مصوری اور شاعری کو ایک دوسرے کا مترادف قرار دیا گیا ہے مصوری مادّی اور بصری ہوتی ہے۔ اس لیے جزوی طور پر اس کی تعریف پیکر کے مفہوم کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ محاکات کی تعریف یہ ہے کہ "محاکات کے معنی کسی چیز یا حالت کا اس طرح ادا کرنا ہے کہ اُس شے کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے"۔ محاکات کی تعریف "وصف" اور مصوری کی تعریفوں کے مقابلے میں پیکر کی تعریف سے زیادہ قریب ہے کیونکہ اس میں "چیز اور حالت" دونوں کی "تصویر" آنکھوں میں پھر جانے کی شرط ہے اور یہ تعریف "ذہنی پیکریت" اور "لسانیاتی پیکریت" دونوں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ پھر بھی اردو کی کوئی پرانی اصطلاح پیکر کے مفہوم کو ادا نہیں کرتی۔

نفسیاتی پیکر مادی ادراک کی تخلیق جدید ہے — جو جذباتی لمحات کے موقعوں پر ذہن میں ابھرتا ہے مثلاً اگر کوئی شخص کسی مخصوص رنگ کو دیکھتا ہے تو وہ اس رنگ کا ایک مخصوص پیکر اپنے ذہن میں محفوظ کر لیتا ہے۔ چونکہ پیکر کو داخلی کیفیت کی صورت میں محسوس کیا جاتا ہے۔ اس لیے خود پیکر خارجی رنگ کی ثانوی نقل قرار پاتا ہے۔ پیکر محض قوت باصرہ کے ذریعہ ہی دماغ میں نہیں ابھرتے بلکہ کل حواس یعنی باصرہ، شامہ، ذائقہ، لامسہ اور سامعہ کے ذریعہ بھی پیدا ہوتے ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض اوقات پیکر مادی ادراک کے بغیر ذہن میں نمودار ہو جاتے ہیں مثلاً
(۱) کسی چیز کو کبھی پہلے دیکھا ہو اور وہ شے فی الوقت سامنے نہ ہو۔ محض یادداشت سے ذہن میں اُس کے پیکر کی تخلیق

---

۱ مولوی عبدالرحمٰن بجنوری : مراۃ الشعر (۱۹۲۶ء) دہلی ص ۱۴۲
۲ مولوی عبدالرحمٰن بجنوری : محاسن کلام غالب (۱۹۲۵ء) اورنگ آباد (طبع ثانی) ص ۱۸
۳ شبلی نعمانی : شعر العجم جلد چہارم (۱۹۵۱ء) اعظم گڑھ ص ۶

ریڈر شعبۂ اردو ۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ ، نئی دہلی ۲۵

ہو جاتی ہے۔ ایسے پیکروں کا تعلق ماضی کی یادداشتوں سے ہوتا ہے اس لیے ایسے پیکروں کو یادداشتی پیکر کہتے ہیں۔

(۲) بعض اوقات ذہن کسی مخصوص تجربہ پر بالواسطہ مرکوز رہتا ہے اور اس کے پیکر تراشتا رہتا ہے۔

(۳) تخیل کے ذریعہ ادراک کے نئے نئے مرکبات بنتے رہتے ہیں اور ان مرکبات سے نئے نئے پیکر ابھرتے رہتے ہیں۔

(۴) ذہن خواب کے عالم میں پیکر تراشی کا عمل کرتا ہے۔

(۵) بخار کے عالم میں ذہن پیکر تراشی کے نیم شعوری عمل سے گزرتا ہے۔

لسانیاتی پیکریت ان تمام پیکروں کی طرف اشارہ کرتی ہے جنھیں زبان اور اس کی مختلف شکلیں ذہن میں پیدا کرتی ہیں۔ الفاظ شاعر کے ان تجربوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو مادی ادراک کو جگاتے ہیں اور قاری کے تجربوں کو بیدار کرتے ہیں۔ یا حسی تاثرات کو ابھارتے ہیں چونکہ شعر تجریدی خیال اور پیکر کا مرکب ہوتا ہے اس لیے پیکریت میں دونوں چیزیں یعنی خالص پیکر اور خیال و پیکر کے مرکبات شامل ہیں۔ جو چیز پیکر کو قوت اور تاثیر عطا کرتی ہے۔ وہ پیکر کی محاکاتیت سے زیادہ اس کی ذہنی وقوع پذیری ہے جو کہ ہیجانات سے متعلق ہوتی ہے۔ اگرچہ پیکر حسی ادراک کی ہوتا ہے مگر یہ کسی غیر حسی شے کی نمائندگی کرتا ہے۔ اور کسی داخلی شے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ بیک وقت ذہنی خاکہ، اظہار، بیان اور استعارے کی تمام صورتوں پر مشتمل ہو سکتا ہے پیکریت کی تمام تعریفوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(۱) ذہنی پیکریت۔ (۲) مجازی پیکریت۔ (۳) تجسیمی پیکریت

جو تعریفیں پیکر کو خالص ذہنی پیکر قرار دیتی ہیں وہ نفسیاتی ہیں سر فرانسس گیلٹن (Sir Francis Galton) نے تجربہ کے بعد یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ہر آدمی کی پیکروں کو تخلیق کرنے کی عادت الگ الگ ہوتی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اگر مختلف آدمیوں سے جنھوں نے ایک ساتھ ناشتہ کیا تھا پوچھا جائے کہ صبح کھانے کی میز پر کیا کیا تھا تو ہر آدمی کا جواب جدا ہوگا ہر شخص حواس خمسہ میں سے کسی ایک کی بنیاد پر جواب دے گا۔ کوئی تخیلی اور کوئی غیر تخیلی انداز میں جواب دے گا۔ اس لیے ایک چیز کے پیکر مختلف ذہنوں میں مختلف ہوتے ہیں ——— مجازی پیکریت میں دو پہلو شامل ہوتے ہیں۔ لغوی پیکریت اور مجازی پیکریت۔ مجازی پیکریت میں کبھی ایک اور کبھی دونوں پہلو شامل ہوتے ہیں اس میں خیال اور لسانیاتی شکلوں پر گفتگو کی جاتی ہے میکس میولر کا خیال ہے کہ جب انسان اپنے مجرد خیالات کو ترقی دیتا ہے تو اس کا اظہار مادی وسیلوں سے کرتا ہے چونکہ لغوی انداز بیان اس کی ضرورت کو پورا کرنے سے قاصر رہتا ہے اس لیے وہ مجازی انداز بیان اختیار کرتا ہے۔ اس طرح میکس میولر کے خیال میں مجازی پیکریت اظہار کو زیادہ جامع بناتی ہے ——— تجسیمی پیکریت میں پیکروں کے عمل پر بحث کی جاتی ہے۔ خواہ پیکر لغوی ہوں یا مجازی اس کے دائرہ میں دونوں شامل ہیں۔ پیکر شاعر کے وجدان، بصیرت اور داخلیت کا انکشاف کرتا ہے اس کے ذہن کی حسی صلاحیتوں اور اس کے مزاج و کردار کا مظاہرہ کرتا ہے۔

ذہنی پیکریت، خالص ذہنی، وجدانی اور رمزیہ ہوتی ہے۔ اس لیے اس پر تجزیاتی اور سائنٹیفک انداز سے گفتگو نہیں ہو سکتی۔ ذہنی پیکریت کو لسانی پیکریت کے ذریعہ سمجھا جا سکتا ہے واقعہ یہ ہے کہ ذہن کا بنیادی عمل ہی پیکر سازی اور علامت سازی کا عمل ہے۔ اس عمل میں مجرد پیکروں اور علامتوں کو مجازی یا لسانی پیکروں میں تبدیل کرنا بھی شامل ہے اس لیے جدید اردو شاعروں کی پیکریت کے مطالعہ سے ان کی ذہنی اور وجدانی بصیرت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ چند مثالیں دیکھیے:

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر
اداسی بال کھولے سو رہی ہے

دھیان کی سیڑھیوں پہ پچھلے پہر
کوئی چپکے سے پاؤں دھرتا ہے

——— ناصر کاظمی

عذاب یہ ہے کہ مجھ جیسے پھول اور بھی ہیں
صلیبِ وقت سے دستِ خزاں اتار مجھے
دریوزۂ بہار کی خاطر ہر ایک شاخ
پھیلی ہوئی ہے دستِ طلب گار کی طرح
(انور صدیقی)

جم گئیں احساس کی مٹی پہ ایسی کائیاں
جن سے دلدل میں دھنسی جاتی ہے جینے کی اُمنگ
چہرے کے گرد ایسا ہے ہالہ عتاب کا
جیسے ہو چودھویں کو سمندر کے منہ میں جھاگ
(کرامت علی کرامت)

ان اشعار میں گھر کی دیواروں پر اداسی کا بال کھول کر سونا۔ دھیان کی سیڑھیوں پر چپکے سے پاؤں دھرنا، صلیب وقت سے خود کو اتارنے کی خواہش، ہر شاخ کا دریوزۂ بہار کی خاطر دستِ طلب گار کی طرح پھیلنا۔ احساس کی مٹی پر کائیاں جمنا، اور چودھویں کی چاندنی میں سمندر کے منہ میں جھاگ ہونا، ایسے استعارے ہیں، جو ان اشعار کی پیکریت کی تشکیل کرتے ہیں ان اشعار اور ان کے بنیادی پیکروں کے تجزیئے سے چند باتیں صاف معلوم ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان میں بیشتر ایسے پیکر ہیں جنھیں کوئی ایک نام نہیں دیا جا سکتا۔ اگرچہ بنیادی طور پر ان سب میں "بصیرت" قدر مشترک کا کام کرتی ہے۔ مگر دوسرے حیاتی عناصر بھی شامل ہیں اور مزاج کے اعتبار سے کہیں متحرک، کہیں جامد، کہیں رنگین، اور کہیں بے رنگ بھی ہیں۔ اس طرح یہ پیکریت اپنی جگہ واضح، شفاف اور ترسیلی ہوتے ہوئے بھی کسی قدر پیچیدہ اور مبہم ہے۔ یہ خصوصیت اس میں ایک طرف تازگی اور دوسری طرف معنویت پیدا کرتی ہے دوسری خصوصیت یہ ہے کہ تمام پیکر اگرچہ گرد و پیش کے ماحول اور فطرت نیز مظاہر فطرت سے اخذ کیے گئے ہیں مگر یہ شاعر کے داخلی، وجدانی اور جمالیاتی تجربوں کے "نقوش" کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ ان نقوش کے ذریعہ شاعر کے ذہنی اور روحانی تاثر اور تجربے کی بنیادی خصوصیت تک رسائی ہو جاتی ہے۔ ان اشعار میں سے کسی شعر کو لے لیجئے اور ادراک کے پیکر کا تجزیہ کر کے شعر کی ہیئت اور زینت نیز پورے تناظر میں دیکھیے تو ذہن پر شاعر کے مخصوص تجربوں کی گرہیں مشک نافے کی طرح کھل جاتی ہیں۔ ابلاغ کی اس منزل میں قاری یا سامع مسرت کے ذریعہ بصیرت محسوس کرتا ہے۔ تنہا یہی خصوصیت ان اشعار کی پیکریت کو کامیاب پیکریت ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔

پیکروں کو ان کے تخلیق کے سرچشموں اور ان کے "اندازِ عمل" کی بنیاد پر الگ الگ نام دیئے جاتے ہیں۔ بعض پیکر حسّی ادراک ہوتے ہیں۔ اس لیے انھیں حواسِ خمسہ کی نسبت سے نام دیئے جاتے ہیں۔ مثلاً وہ پیکر جو کسی چیز واقعہ یا حالت کو دیکھنے سے ذہن میں پیدا ہوتا ہے اس کو پیکر باصرہ (Visual image) کہتے ہیں۔ وہ پیکر جو کسی چیز واقعہ یا حالت کی کھنک سننے سے ذہن میں پیدا ہوتا ہے اس کو پیکر سامعہ (Auditory image) کہتے ہیں اس طرح کسی خوشبو سے جو پیکر ابھرتا ہے وہ پیکر شامہ (Olfactory image) چھونے سے جو پیکر ابھرتا ہے وہ پیکر لامسہ (Tactile image) کہلاتا ہے۔ چونکہ قوت بصارت سے ہم ہر چیز کو دیکھ سکتے ہیں اور اس کے پیکر کو زیادہ بہتر صورت میں ذہن میں محفوظ کر لیتے ہیں اس لیے سب سے زیادہ طاقتور "بصری پیکر" ہوتا ہے اس کے بعد دوسرے حواس سے متعلق پیکر آتے ہیں۔

ان پیکروں کے علاوہ اور قسم کے پیکر بھی ہوتے ہیں۔ احساس حرارت سے ہم گرم چیزوں کا احساس کرتے ہیں اور ذہن میں حرارتی پیکر (Thermal image) بنا لیتے ہیں۔ احساس برودت سے سرد اشیاء کا احساس کرتے ہیں اور ذہن میں ان کے پیکر بنا لیتے ہیں ایسے پیکروں کو برودتی پیکر (Hibernal image) کہتے ہیں احساس حرکت سے ہم ذہن میں مختلف قسم کی جنبشوں کے پیکر بنا لیتے ہیں جنھیں پیکرِ جنبش (E[illegible] image) کہتے ہیں اسی طرح ایک احساس استغراق

بھی ہے اس قوت سے ہم کسی تخلیق کے حسن میں محو ہو جاتے ہیں اور محویت کے عالم میں استغراقی پیکر (synaes image) بناتے ہیں اس کے علاوہ ایک احساس رنگ بھی ہے جس کے ذریعہ ہم کسی چیز کو ایک حواس سے دوسرے حواس کی طرف منتقل کر دیتے ہیں۔ مثلاً کسی آواز کو سنکر ذہن کسی رنگ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور اس کے رنگ کا پیکر بنالیتا ہے۔ ایسی صورت میں ذہن آواز کو رنگ کی صورت میں تبدیل کر کے محفوظ کر لیتا ہے۔ مثلاً وائلن کی آواز کو سُنکر اس کی ساخت اور اُس کے رنگ کی طرف ذہن منتقل ہو جائے۔ اس کیفیت کو رنگین سامعہ یا الوانی سامعہ کا نام دیا جاسکتا ہے اور یہ کیفیت دو مختلف حواس کے امتزاج سے ظہور پذیر ہوتی ہے۔

پیکروں کی تقسیم دوسری طرح بھی کی جاسکتی ہے مثلاً اگر پیکر ذہن میں متحرک ہو یا احساس حرکت پیدا کرتا ہو تو اس کو متحرک پیکریت (Dynamic Imagery) کہتے ہیں اگر پیکر رنگ برنگے ہوں تو اس کو رنگین پیکریت (Color Imagery) اور بے رنگ ہوں تو بے رنگ پیکریت (Colorless imagery) کہتے ہیں اس کے علاوہ بعض پیکر اپنی تخلیق اور تلازمات کے نقطۂ نظر سے بالکل آزاد ہوتے ہیں اور کسی نظم میں ایک دوسرے سے ظاہری ربط نہیں رکھتے انھیں آزاد پیکریت (Free imagery) کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس محصور پیکریت (Tied imagery) اس وقت نمودار ہوتی ہے جب قاری محویت کے عالم میں مطالعہ کرتا ہے اور ذہن میں یکے بعد دیگرے پیکروں کے سلسلے بنتے چلے جاتے ہیں اور ایک دوسرے سے مل کر گھنی تہہ بنا لیتے ہیں۔ جدید غزل کے پیکروں کا تجزیہ دیکھیے۔

بصری پیکر :-

اب بھی ہر گھر کے کالک لگے طاق پہ خیر لوسوں کی پرچھائیاں ثبت ہیں
اک دیا ہوں میں یادوں بھری رات کا، مت جلاؤ ہواؤں کے رُخ پر مجھے

——— (اشتر خانقاہی)

گھر کے کالک لگے طاقوں پر لوسوں کی پرچھائیں ثبت ہونا
یادوں بھری رات کا دیا۔

سماعی پیکر :-

یہ میری ذات ہے کہ کوئی گونجتا کھنڈر
اپنی صدا پہ آپ ہی پاگل ہوا ہوں میں

——— (امن موہن تلخ)

گونجتا کھنڈر ہونا
اپنی صدا پہ پاگل ہونا

لمسی پیکر :-

آخری بوسے کی ٹھنڈی راکھ بس ہونٹوں پہ ہے
اب کہاں وہ سرخ انگارے جو پانی ہو گئے

——— (اشتر خانقاہی)

آخری بوسے کی ٹھنڈی راکھ کا ہونٹوں پر ہونا
سرخ انگاروں (ہونٹوں) کا پانی ہونا۔

پیکر شامہ :-

یہ کس نے چھین لیے مجھ سے خوشبوؤں کے مکان
یہ کون وحشت کی دیوار کر گیا مجھ کو

——— (انور صدیقی)

دھری رہے گی یہ خوشبو کی کھو کھلی زنجیر
ہر ایک رنگ سے اُڑ جائیں گا ہوا کی طرح

——— (کیلاش ماہر)

خوشبوؤں کے مکان کا چھن جانا
خوشبو کی کھو کھلی زنجیر

پیکر ذائقہ :

محسوس کر رہا ہوں ہر اک رس کی لذتیں
اک لمسِ کیف رنگ سے کیا ہو گیا ہوں

——— (عنوان چشتی)

لمسِ کیف رنگ سے ہر ایک "رس" کی لذت محسوس

رنگین پیکر :-

مرجھا گیا جو دل میں اجالے کا سرخ پھول
تاروں بھرا یہ کھیت بھی بنجر لگا مجھے

——— (... اللہ)

سنہری مچھلیاں بادل میں کوند جاتی ہیں
بدن وہی ہے جو بندش میں بھی قبا سے لڑے
سیاہ رات کے سر پر سفید پھول کھلا
روایتوں میں بڑی پیچ دار جدت ہے
—— (بشیر بدر)

اے ساعتِ اول کے ضیا ساز فرشتے
رنگوں کی سواری کے نکلنے کی خبر دے
کوئی بھولی ہوئی شے طاق ہر منظر پہ رکھی تھی
ستارے چھت پہ رکھے تھے شکن بستر پہ رکھی تھی
—— (بانی)

میری جیب سے بھی صداؤں کی شعاعیں نکلیں
ایسے لہجے کی تپیا کی دمک ہے مجھ میں
—— (من موہن تلخ)

دل میں جو چٹکیاں سی لیتا ہے
یہ سرد ہاتھ کس کا ہے
—— (مخمور سعیدی)

اُجالے کا سرخ پھول۔ بادل بھرے کھیت کا بنجر ہونا۔ سفید پھول کا کھلنا۔ ساعت اول کا ضیا ساز فرشتہ، رنگوں کی سواری کا نکلنا۔ بھولی ہوئی شے کا ہر منظر کے طاق پر رکھا ہوا ہونا۔ ستاروں کا چھت پر اور شکن کا بستر پر رکھا ہوا ہونا۔ جیب سے صداؤں کی شعاعوں کا نکلنا۔ لہجے کی تپیا کی دمک، سرد ہاتھ کا دل میں چٹکیاں لینا۔

بے رنگ پیکر:

ہر ایک سمت ہی دیوار آب تھی اُس کے
مگر وہ مجھ سے زیادہ پیاسا لگتا تھا
یقیں کی کترنیں جیبوں میں چھانٹ کر بھرلیں
قدم قدم پہ اک اندھا سراب تھا آگے
—— (عتیق اللہ)

پہنچ گیا ہوں زمان و مکان کے جلسے تک
مری انا مجھے الزام نارسائی نہ دے
سانحہ یہ بھی اک روز کر جاؤں گا
وقت کی پالکی سے اتر جاؤں گا
—— (مظہر امام)

دیوارِ آب، یقین کی کترنیں۔ اندھا سراب، زمان و مکان کا ملبہ، وقت کی پالکی سے اُترنا

متحرک پیکر:۔

کھل گئی تھی آندھیوں کے سامنے دل کی کتاب
ایک کاغذ سا ہوا میں دیر تک اڑتا رہا
—— (بمل کرشن اشک)

بدن کی دیوار پر رواں ہیں
اداس لمحے کہ چونٹیاں ہیں
—— (کرشن موہن)

آندھیوں میں دل کی کتاب کھلنا، کاغذ کا ہوا میں لہرانا، اداس لمحوں کا بدن پہ چیونٹیوں کی طرح رینگنا۔

جامد پیکر:۔

جھیلوں کے آس پاس تھے خیمے سکوت کے
ہنگامۂ حیات تو آبِ رواں میں تھا
—— (حسن نعیم)

اوس کی بوندوں میں بکھرا ہوا منظر جیسے
سب کا اِس دور میں یہ حال ہے میرا ہی نہیں
—— (شکیب جلالی)

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جیسے سوکھے ہوئے کچھ پھول کتابوں میں ملیں
—— (احمد فراز)

جھیلوں کے پاس سکوت کے خیمے، اوس کی بوندوں کا بکھرا ہوا منظر، سوکھے ہوئے پھول۔

آتشیں پیکر:۔

میلوں تلک تھی جھلسی ہوئی دوپہر کی قاش
سینے میں بند سینکڑوں صدیوں کی پیاس تھی
—— (وزیر آغا)

ہر چند مدا کہ ہو کے بکھرتا ہے راہ میں
جلتے ہوئے پروں سے اڑا ہوں مجھے بھی دیکھ
——— (شکیب جلالی)

دوپہر کی قاش جلتے ہوئے پروں سے اُڑنا۔

برودتی پیکر:-

ہم جسم سے ہٹا نہ سکے کاہلی کی برف
جس کی تہوں میں خواب بڑے تابناک تھے
——— (ربانی)

ہاتھ جو مجھ سے چھڑاتی تھی وہی پرچھائیں
لگ کے سو جاتی ہے راتوں کو مرے سینے سے
——— (خلیل الرحمان اعظمی)

آنسوؤں سے کوئی آواز کو نسبت نہ سہی
بھیگتی جائے تو کچھ اور نکھرتی جائے
——— (غلام ربانی تاباں)

کاہلی کی برف کا جسم پہ جمنا۔ ہاتھ چھڑاتی ہوئی پرچھائیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آواز کا نکھرنا۔

نظم یا شعر میں ایک پیکر بنیادی ہوتا ہے اور دوسرے پیکر اُس کے گرد اس انداز سے جمع ہو جاتے ہیں کہ وہ بنیادی پیکر کی خصوصیت کو نمایاں کرتے ہیں۔ گویا ایک پیکر بنیادی ہوتا ہے اور دوسرے پیکر ثانوی لیکن یہ ثانوی پیکر اپنی انفرادیت کو بنیادی پیکر کی انفرادیت میں تحلیل کر کے نظم کی داخلی فضا کی وحدت میں اضافہ کرتے ہیں بعض نظموں یا غزل کے شعر میں پیکروں کا ایک سلسلہ ہوتا ہے ایک پیکر دوسرے پیکروں سے اشتراک عمل کرتا اور کل نظم کی وحدت اور تشکیل میں مددگار ہوتا ہے۔ ایسے تمام پیکر یکساں اہمیت کے مالک ہوتے ہیں ان میں سے اگر ایک کو بھی نظر انداز کر دیا جائے تو نظم کے مفہوم کی گہرائی وسعت اور تنوع پر اثر پڑتا ہے۔ کبھی کبھی ایک پیکر دوسرے پیکر سے متضاد ہوتا ہے۔ بظاہر ان میں کوئی ربط نہیں ہوتا۔ مگر ان میں ایک معنوی ربط ہوتا ہے۔ جو خیال یا جذبہ کے داخلی رشتوں سے وابستہ ہوتا ہے۔ جدید غزل کی پیکریت میں یہ صورتِ حال بہت واضح ہے۔

بعض شاعر ایک متعین پیکر کو ایک نظم میں یا مختلف نظموں میں بار بار استعمال کرتے ہیں۔ شاعر کا یہ انتخاب اور استعمال اس کے خالص نجی تجربہ کی علامت بن جاتا ہے۔ پیکروں کے انتخاب کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ پیکر کی تلاش محض آرائش کے لیے کی جائے یہ مصنوعی پیکریت ہوتی ہے دوسرے یہ کہ پیکر خود بخود شعری تجربے کے بطن سے نمودار ہو۔ یہ اصل کامیاب پیکریت ہے۔ پیکر کی کامیابی اور رعنائی کا انحصار اس بات پر ہے کہ پیکر کتنا واضح روشن اور نمایاں ہے۔ اور معانی کی ترسیل میں کتنا موثر ہے۔ بہت مبہم پیکر معانی کی ترسیل میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوتے۔ کامیاب پیکر قاری یا سامع کے ذہن پر تصویروں کے جلوؤں کی نقاب کشائی کے ساتھ تلازموں کی طلسمی فضا کی تشکیل کرتا ہے اور بیک وقت معانی کی بہت سی تہوں کو کھولتا ہے۔

نازش بک سنٹر کی پیش کش

گوپال متّل ——— ایک مطالعہ

محمد عبد الحکیم کا تحقیقی اور تنقیدی مقالہ جو عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کے ایم۔ اے۔ سال آخر کے لیے لکھا گیا۔
گوپال متّل کی زندگی اور اُن کے ادبی اور شعری کارناموں کا بھرپور جائزہ ——— آخر میں گوپال متّل کی نثری اور شعری نگارشات کا انتخاب بھی شامل ہے۔ قیمت پندرہ روپے۔

نیشنل اکادمی سے طلب کریں

نظمیں

بال کرشن بیتاب★

تضاد

ایک عالی شان منظر دیکھیے
خوبصورت زاویے
دلکش نمونے
روشنی کے قمقمے
بے جان بھی جاندار بھی
جابجا سکوں کا جادو
جابجا پیسے کی دھوپ
جنتِ سیاح
رنگین سیرگاہ
اور اس منظر کے پہلو میں یہاں
ایک منظر اور بھی:
بے طرح بے وضع سے
خستہ مکاں
ہر طرف افلاس کا
بڑھتا دھواں
آدمی
کمزور اور بے جان سے
پاؤں میں پہنے ہوئے
مجبوریوں کی بیڑیاں
اور ان کے پیٹ میں
وعدوں کی باسی روٹیاں

▲▲

رونق زیدی★

گلی

کچے پکے فرش کی گلی
دائیں، بائیں
اِدھر، اُدھر
جانے کیا ڈھونڈنے نکلی
آڑی ترچھی ہوکر
لیکن بے چاری!!
جس طرف جاتی
ٹھٹھک کر رہ جاتی
اِدھر اُدھر مکان
اُدھر جھکا آسماں
آخر ——
ایک سڑک کو سونپ
اپنا وجود ——
لوٹ آئی

▲▲

★ ایڈمنسٹریٹر ایف۔سی۔اے۔ فرید آباد۔
★ ریسرچ سکالر شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

نظمیں

بدنام نظر

تعاقب

رات اندھیری میں بجلیوں کا ہجوم
بلڈنگوں کے سروں پہ خوف کا بھوت
کانپتے قدموں کا سفر جاری
بکھری بکھری سی شبنمی یادیں
چہرہ، چہرے پہ لپکے کی گرد
گرد کی تہہ میں ادھ جلی آنکھیں
اُبلے دیدوں میں آرزو نہ اُمنگ
پیٹھ پر خنجروں کے گہرے گھاؤ
اک تعاقب کا سلسلہ قائم
یادِ ماضی عذاب ہے یا رب
▲▲

فرحت قمر

سکونِ پرآشوب

زندگی اک جھیل کی مانند ہے!
کوئی ہنگامہ
کسی کی یاد
کوئی حادثہ
ایک پتھر کی طرح گرتا ہے گہری جھیل میں!

دائرے، ہلچل، ذرا سا شور، امواجِ رواں
وقت کے ہاتھوں ذرا سی دیر میں دب جائیں ہیں!

پھر وہی ٹھہرا ہوا پانی
وہی معمول کی سی شانتی
روزمرہ کی وہی مانوس ٹھہری زندگی،

ہاں ـــــ مگر ـــــ
ایک پتھر جھیل کی تہہ میں کہیں موجود ہے!
▲▲

شاہ ظہیر

پیمانہ

سامنے کا وہ پیڑ
جیسے میری آنکھیں دیکھتی ہیں
کیا واقعی اتنا بڑا ہے
جتنا کہ ہے ـــ
یا اس سے کم (یا) زیادہ
بلند ـــ (یا) پست

یہ میرا پالتو کتا،
جو مجھے نہار رہا ہے
کیا اس کی آنکھوں میں
میں اتنا ہی لمبا ہوں
جتنا کہ ہوں
یا اس سے مختلف

کون سا پیمانہ ہے
جسے درست سمجھا جائے
اے خدا ـــ!
مجھے مفروضوں سے نکال۔!!
▲▲

غزلیں

راج کھیتی

یہ دور بھی حیات کا کتنا عجیب تھا
ہر شخص جیسے آپ ہی اپنا رقیب تھا

تھی دشمنی ہر خوشی سے، ہمارے مزاج کو
اک غم ہی جیسے دہر میں اپنا حبیب تھا

بچ کر گزر سکا نہ میں دنیائے درد سے
ہر حادثہ حیات کا میرے قریب تھا

کیا دیکھا ہم نے زیست کی راہوں میں کہیں
ہر شخص اپنے کاندھے پہ رکھے صلیب تھا

چھائے رہے جو خوف کی مانند ذہن پر
اُن حادثوں کا بھوت بڑا ہی مہیب تھا

▲▲

عکس فیروزپوری

ٹوٹ کر میں گرا ہمیشہ ہی
حادثہ یہ ہوا ہمیشہ ہی

لوگ لڑتے ہیں دوسروں سے مگر
میں تو خود سے لڑا ہمیشہ ہی

کتنے سورج چمک چمک ہارے
اِک اندھیرا رہا ہمیشہ ہی

اُس کو پایا سدا لہو دے کر
پھول کانٹوں میں تھا ہمیشہ ہی

بن نہ پایا میں آج تک کندن
آگ میں گو جلا ہمیشہ ہی

وہ جو سایہ تھا میرا ہی اے عکسؔ
مجھ سے کٹتا رہا ہمیشہ ہی

▲▲

شاهد میر

وجود جس کا بکھر جائے گرد کی صورت
وہ کس طرح نظر آئے گا فرد کی صورت

گرے تھے شاخ سے اک برگِ زرد کی صورت
بھٹکتے پھرتے ہیں اب کوچہ گرد کی صورت

بیاں ہوا نہ کبھی خوش لباس شعروں میں
وہ اک خیال جو اٹھتا ہے درد کی صد

ترے بغیر تو ساون کا سرمئی بادل
مرے بدن پہ برستا ہے درد کی صورت

پڑے گی ضرب جو غم کی شرار پھوٹیں گے
سمجھ نہ دل کو مرے سنگِ سرد کی صورت

▲▲

★ محلہ سوداں نزدیک موتی بازار پھگواڑہ پنجاب ★ خالصہ کالج - سری گنگا نگر - ★ گورنمنٹ کالج، بانسواڑہ، ۱۰۰ ۳۲۷

ہرشرن سنگھ

جینے کے لیے

ترجمہ : راج شرما ایم اے

کردار

۱۔ شاعر
۲۔ منگل
۳۔ بیرا
۴۔ عورت

ہر دوار میں ایک ہوٹل کا کمرہ۔ ایک پلنگ، ایک میز اور ایک کرسی نظر آتے ہیں۔ دیوار پر ایک عکسی شیشہ لٹکا ہے۔ ایک دروازہ عقبی دیوار میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

جب پردہ اٹھتا ہے، بالکل اندھیرا ہے۔ کچھ دیر کے بعد، بیرونی دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ پھر بجلی کے بٹن کی کلک کی آواز سنائی دیتی ہے۔ کمرہ روشنی سے جگمگا اٹھتا ہے۔ کمرے میں مٹیالے سے لباس میں چھریرے بدن کا ایک نوجوان نظر آتا ہے۔ اسی وقت دو اور نوجوان کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ ایک اچھے خاصے تندرست جسم والا، کمبل لپیٹے ہوئے، اس نے تہمد باندھ رکھی ہے دوسرا عمر میں چھوٹا، اوسط جسم والا گرم سوٹ میں ملبوس ہاتھ میں چمڑے کا بیگ تھامے ہوئے۔

بیرا : (تندرست جسم والے کو، کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) دیکھ لو دادا۔

منگل : ٹھیک ہے۔ بستر لا کر لگا دو۔

بیرا : کیا ..... ؟

منگل : بستر لاؤ، سؤر کے .....

بیرا : ابھی لایا۔ مگر دادا، یہ گالی والی .....

منگل : جاتا ہے یا ..... (مارنے کے انداز میں ہاتھ اٹھاتا ہے)۔

بیرا : ابھی لایا (باہر کی طرف جھانکتا ہے) ابھی لایا۔

منگل : (اونچی آواز سے) نیا بستر لانا۔ (راہی سے) تم ابھی کرسی پر بیٹھو۔

(راہی آگے بڑھتا ہے۔ ٹھوکر سی کھا کر لڑکھڑاتا ہے منگل اسے تھامتا ہے)

منگل : نصف بوتل سے ہی تیرے قدم لڑکھڑانے لگے ہیں۔

شاعر : منگل۔ میں تو سوچ رہا ہوں۔ آج کی رات کیسے کٹے گی ؟

منگل : کٹ جائے گی جیسے پہلے کٹتی رہی ہیں۔

شاعر : آج کی رات، جیسے قبر میں تنہا لاش۔

منگل : تم آج سارا دن ہی ایسی ویسی باتیں کرتے رہے ہو۔ شاعر، میری مانو تو پاؤ آدھ پاؤ اور پی لو۔ سو غموں کا علاج۔ میں جلدی سے لے آتا ہوں۔

شاعر : نہیں منگل تم مت جانا، آج کی رات۔

منگل : (ٹوکتے ہوئے) میں اب نہ گیا تو اور کچھ دیر میں چلا جاؤں گا۔ میں نے تمہیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ میں رات تمہارے پاس نہیں ٹھہر پاؤں گا۔

شاعر : میرے پاس کوئی نہیں رہے گا ..... میں تنہا .....

منگل : (ٹوکتے ہوئے) تم برا مان گئے۔ میں تو .....

مکان نمبر ۱۱۱۹ سیکٹر ۱۹ بی۔ چنڈی گڑھ

شاعر: (روتے ہوئے) میرے پاس میری ماں نہیں رہی
جس نے مجھے جنم دیا۔ پالا پوسا۔
منگل: مجھے علم ہے کہ ماں کی جدائی کا دکھ بہت ہوتا
ہے مگر میں تو......
شاعر: (رکتے ہوئے) میری ماں، مجھے بہت پیار کرتی تھی۔
مجھے چوما کرتی تھی اور کہا کرتی تھی۔ میں چوموں تیرے بال۔
تم ہو میرے اکلوتے لال۔
منگل: تیری رات نہیں گزرے گی۔ مجھے محسوس
ہوتا ہے (گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے) ابھی وقت ہے،
میں تجھے گاڑی میں بٹھا آتا ہوں۔ اٹھو، میرا رکشا ابھی باہر
کھڑا ہے۔ میں تمہیں لپک کر اسٹیشن پر پہنچا دوں گا۔
شاعر: (روتے ہوئے) میری ماں کہاں چلی گئی ہے۔
تم مجھے میری ماں کے پاس پہنچا دو منگل۔
منگل: جہاں تمہاری ماں چلی گئی ہے وہاں تم جیتے جی
نہیں پہنچ سکتے۔
شاعر: (اور بھی زیادہ روتے ہوئے) میں زندگی کے
ویران راستوں میں اکیلا رہ گیا ہوں۔
منگل: یہاں جو بھی آتا ہے۔ دوپہر تک گنگا میں استھیاں
بہا دیتا ہے اور گاڑی پکڑ لیتا ہے۔ تم میرے گاؤں کے
ہی نکل آئے اسی لیے رات بھر کے لیے روک لیا۔ سوچا
تھا کہ تمہارا دل بہلاوا کر دوں گا مگر تم تو......
شاعر: (آنسو پونچھتے ہوئے) اچھا، تم جاؤ۔ جا کر
آرام کرو۔ سارا دن مجھے اپنے رکشا پر گھماتے رہے ہو۔
تم نے آج کچھ بھی نہیں کمایا۔
منگل: میں ہر روز کماتا ہی ہوں (جیب میں سے
کچھ روپے نکالتے ہوئے)۔ یہ دیکھو پچھلے دو دنوں کی کمائی۔
اور پھر میں تو ایک دن کی کسر دوسرے دن نکال لیتا جاتا
ہوں جو سواری بنا بھاؤ تاؤ کئے رکشا میں بیٹھ جاتی ہے میں
اُس سے دو گنے تگنے پیسے وصول کر لیتا ہوں۔ چوں چرا
کرنے پر میں اسے گردن سے دبوچ لیتا ہوں۔
شاعر: تم اب جاؤ۔ میں سنبھل جاؤں گا۔

منگل: میری پی ہوئی تو لگتا ہے اتر گئی۔ تم کیسا
سنبھلو گے۔
شاعر: نہیں، میں اب سنبھل جاؤں گا۔
منگل: میں دوڑ کر ایک آدھی بوتل اور چکھنا لاتا ہوں۔
شاعر: نہیں۔ اب مجھ میں اور پینے کی ہمت نہیں۔
(کوٹ کھونٹی پر ٹانگتا ہے)
منگل: مجھے جان پڑتا ہے کہ تم رات رو رو کر کاٹو
گے۔ شاعروں کے دل لڑکیوں جیسے ہوتے ہیں، بات
سنو، ذرا کان دو تو.... (شاعر اُس کے قریب آتا ہے)
اگر تم کہو تو میں تمہارے پاس کسی کو چھوڑ جاتا ہوں۔
شاعر: نہیں منگل نہیں۔ میری نسوں میں خون جم
رہا ہے۔
منگل۔ تم میرا اشارہ تو سمجھ گئے ہو نا؟
شاعر: نہیں منگل نہیں۔ زندگی کا لاوا کسی ریگستان
میں سرایت کر رہا ہے اور اٹھ رہے ہیں شرارے۔
منگل: تمہارا دل لگا رہے گا اور پھر رات بھی
کٹ جائے گی۔
شاعر: نہیں منگل نہیں۔ مجھے آج کی رات تنہا
ہی بسر کر لینے دو۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میری ساری
زندگی آج کی رات کی مانند ہی کٹے گی۔
منگل: ساری زندگی کا انتظام تم خود ہی کر لینا۔
آج کی رات کا بندوبست میں.....
شاعر: نہیں منگل نہیں۔ اگر آج کی رات میں نے
تنہا کاٹ لی تو ساری عمر گزار لوں گا۔ آج کی رات امتحان
کی رات ہے۔
منگل: اچھا۔ تیری مرضی،
شاعر: (آہ بھرتے ہوئے) آج کی رات....
منگل: پھر آج کی رات..... میں یہاں سے
کبھی نہ جاتا مگر میں نے لاڈا کہیں اور پہنچانا ہے۔
شاعر: تم جاؤ۔
(بستر لے آتا ہے)

منگل: تم نے بہت دیر لگا دی سالے!

بیرا: کیا دادا؟

منگل: کیا کارخانہ سے لینے چلا گیا تھا؟

بیرا: دادا، تم نے کہا تھا نا کہ نیا بستر چاہیے۔ میں نے منیجر سے بولا۔ منیجر نے بولا بی بی جی سے بولو۔ میں بی بی جی کے پاس گیا اور اس سے بولا۔

منگل: اچھا اچھا۔ اب اور مت بھونکو۔

بیرا: کیا دادا؟

منگل: تم نے اِس بالو کا دھیان رکھنا ہے۔ سُنا تم نے؟

بیرا: سُنا دادا.. تم.....

منگل: (ٹھوکتے ہوئے) اگر ان کی رات اچھی نہ کٹی تو میری تیری ماں.....

بیرا: ماں کیا دادا

منگل: اس کی ماں مرگئی ہے یہ ساری رات روتا نہ رہے۔ سُنا۔

بیرا: سُنا دادا، تم فکر مت کرو۔

منگل: اچھا شاعر۔ میں چلا، صبح تڑکے ہی تمہارے پاس آجاؤں گا۔

(چلا جاتا ہے)

بیرا (بستر لگاتے ہوئے) دادا سے بہت ڈر لگتا ہے۔ وہ قتل کر دیتا ہے۔ دادا، آپ کا رشتہ دار ہے کیا؟

شاعر: نہیں۔

بیرا: تب آپ کا دوست ہوگا۔

شاعر: میرے گاؤں کا ہے۔

بیرا: گاؤں کا؟

شاعر: ہاں۔

بیرا: یہاں ایک خوبصورت عورت دادا پر بہت مہربان ہے۔ ارے باپ رے (اپنے گالوں پر تھپڑ مارتا ہے) ہمارے پیٹ میں کوئی بھی بات ٹھہر نہیں پاتی۔ مجھے اس سے نقصان بھی ہوتا ہے۔ مگر یہ عادت ہے کہ جاتی ہی نہیں۔ اچھا، تم دادا سے مت کہنا۔ ہم رات کو تمہارا بہت خیال رکھے گا۔ بستر لگا دیا ہے تم اب بستر پر دراز ہو جاؤ۔ وہ گھنٹی ہے بیل۔ جب بھی تم بجاؤ گے میں چراغ کے جن کی طرح حاضر ہو جاؤں گا۔ اچھا اب میں جاتا ہوں۔

(چلا جاتا ہے۔ وہ بیرونی دروازہ بند کر دیتا ہے۔ شاعر پلنگ کی طرف آہستہ آہستہ بڑھتا ہے اور پلنگ پر بیٹھ جاتا ہے۔ جوتوں کے تسمے کھولتا ہے۔)

شاعر: (دکھ بھرے لہجے میں۔ اپنے آپ سے) اُڑ رہی ہیں چنگاریاں میرے تخیل میں کسی جلتی ہوئی چتا کی۔ (سر کو تھام لیتا ہے) ہر سو خاموشی، جیسے چیر رہی ہیں گنگا کی سرکتی سرسراتی لہریں (گلوگیر ہو کر) کر چلا ہوں تمہیں ان کے حوالے.... میری ماں (روتا ہے) (کچھ دیر کے بعد چہرے سے ہاتھ اٹھاتا ہے) کون کہہ سکتا ہے کہ میری ماں کی آتما اس برہمانڈ کی وسعت کے کس پڑاؤ پر (چھت کی طرف دیکھتا ہے ٹکٹکی باندھے) کب کون مجھے بھی اسی طرح گنگا کی لہروں کے حوالے کرنے آئے گا۔ میں کیا جان سکتا ہوں، کیا کہہ سکتا ہوں (روتا ہے) نراشا۔ دکھ اور رنج کی آگ سے جھلسی میری استھیاں بہائے گا۔ یہاں گنگا کے نرمل، پوتر اور ٹھنڈے جل میں جو مکتی پردان کرتا ہے ہائے میری ماں (بیرونی دروازہ کھلتا ہے۔ ایک عورت جس کی عمر ۲۰، ۲۲ سال کی اُداس چہرہ، عام لباس میں ملبوس اندر آتی ہے۔ وہ دروازہ بند کر دیتی ہے۔ مڑ کر شاعر کی طرف دیکھنے لگتی ہے۔ وہ خاموش ہے)

شاعر: آپ (حیرانی سے) آپ کون ہیں؟

(عورت کوئی جواب نہیں دیتی)

شاعر: آپ کون ہیں؟؟

(عورت خاموش ہے)

شاعر: (شاید آپ میری زبان نہیں جانتیں) میں پوچھ رہا ہوں۔ آپ کون ہیں۔

عورت : میں ، میں ایک عورت ہوں۔
شاعر : میرا مقصد یہ جاننا تھا کہ آپ یہاں کیوں آئیں۔

(عورت خاموش رہتی ہے)

شاعر : میں آپ کو نہیں جانتا۔
عورت : (رو کر۔ کچھ غصے سے) آپ نے مجھے بلوایا ہی کیوں تھا ؟ اگر اس طرح ہتک کرنی تھی۔
شاعر : (تعجب سے) میں نے . . . . میں نے تو . . میں نے تو نہیں بلوایا ؟
عورت : (اُسی طرح) میرے ساتھ ہر روز فریب ہوتا ہے۔
شاعر : میں نے واقعی آپ کو . . . . . .
عورت : کل رات بھی مجھے یہی کچھ سننا پڑا تھا۔
شاعر : کل رات میں گاڑی میں تھا۔ میرے پاس میری ماں کے جسم کے پھول تھے۔ میرے انگ انگ میں خون جم رہا تھا اور میری آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔
عورت : میرے دُکھ کو کوئی نہیں سمجھتا بلکہ مجھے اور دُکھی کرتے ہیں۔
شاعر : میں اپنے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے آپ کو کوئی دُکھ نہیں دیا۔
عورت : (اور زور سے روتے ہوئے) میں کیا کروں۔ کہاں جاؤں ؟ ؟
شاعر : میرے سامنے اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔
(وہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ عورت روئے جا رہی ہے)
میں آپ سے شاید ہمدردی کا ایک لفظ بھی نہ کہہ سکوں۔ میں تو اپنی ماں کے ماتم میں گم ہوں۔ آج میرے موتھ سے جو کچھ بھی نکلے گا، رُلا دے گا۔
عورت : مجھے اپنی موت چاہیے۔
شاعر : مانگنے سے موت نہیں ملا کرتی۔ (ایک لمحہ کی خاموشی کے بعد) میری ماں مجھے بتایا کرتی تھی کہ جب اُس کا جیون ساتھی وفات پا گیا تو وہ کتنے دنوں تک موت کی طلبگار رہی۔ مگر موت اُس کے نصیب میں نہ تھی۔ ۱۸ برس گزر گئے۔ اب جب وہ خواب میں بھی موت کی خواہشمند نہ تھی۔ اُسے موت نے آدبوچا۔
عورت : (روتی ہوئی۔ غصے کے ساتھ) مجھے صرف چار دن اور جینا ہے اس کے بعد میں گنگا میں ڈوب مروں گی۔
شاعر : (سنجیدگی سے) چار دن کے انتظار کے بعد گنگا میں ڈوب مروگی ؟
عورت : مجھے جیوتشیوں نے بتایا ہے کہ وہ دس دن کے بعد واپس آ جائے گا۔ آج چھ دن گزر چکے وہ ایک ماہ سے ہر روز یونہی جایا کرتا تھا۔ مگر اُس دن وہ لوٹ کر نہیں آیا۔
شاعر : وہ کہاں چلا گیا ؟
عورت : مجھے لوگوں نے بتایا کہ وہ گنگا کے بہتے پانی میں کود کر کہیں آگے چلا گیا ہے۔
شاعر : (دُکھ سے) اس نے خودکشی کر لی کیا ؟
عورت : (چیخ کر) نہیں۔ نہیں ؟ ؟
شاعر : وہ اس تعصب اور عناد بھری دُنیا سے دُور چلا گیا ہے۔
عورت : نہیں نہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ کچھ میل دُور نیچے ملاح اور مچھیرے اُسے پکڑ کر باہر نکال لیں گے۔
شاعر : (سنجیدگی سے) بہتے پانی اور جانے والے کبھی واپس نہیں لوٹے۔
عورت : وہ ضرور آئے گا، مجھے جیوتشیوں نے بتایا ہے کہ دس دنوں میں ضرور لوٹ آئے گا۔
شاعر : آج چھ دن گزر گئے ہیں۔ مگر وہ نہیں آیا۔
عورت : وہ ضرور آئے گا۔ ابھی چار دن باقی پڑے ہیں وہ ضرور آئے گا۔
شاعر : اگر انتظار ہی ٹھہرا تو فقط چار دن کیوں ؟ لوگ

تو انتظار میں زندگی گزار دیتے ہیں۔

عورت : انتظار تو میں سارا جیون کر سکتی ہوں۔ مگر یہ عمر میں کس کے آسرے گزاروں۔

شاعر: عمر گزارنے کی چاہت کو زندہ رکھنا چاہیے۔ آسرا کوئی نہ کوئی مِل ہی جاتا ہے۔

عورت: جو آسرا مجھے ملا ہے۔ جب وہ اُس کے بارے میں دیکھے۔ سنے گا تو میرا گلا گھونٹ دے گا۔

شاعر: آپ نے ایسا آسرا قبول ہی کیوں کیا؟

عورت: اگر مجھے یہ دس دن دوزخ میں سے بھی گزرنا پڑے تو بھی گزر دوں گی (روتے ہوئے) میں ایک بار اپنے پیارے کا منہ دیکھنا چاہتی ہوں۔

شاعر: وہ نہیں آئے گا۔

عورت: نہیں وہ ضرور آئے گا۔

شاعر: اُس نے بیکاری سے تنگ آکر خودکشی کر لی ہے۔

عورت :- نہیں۔ نہیں۔

شاعر: دریا کی لہروں نے اُسے جلدی ہی موت کی نیند سلا دیا ہوگا۔

عورت: نہیں نہیں۔

شاعر: وہ اب نہیں آئے گا (دُکھ بھرے لہجہ میں) جیسے میری ماں اب میرے پاس نہیں آسکتی۔ میری ماں اور تمہارا پریمی دونوں اب کبھی نہیں آئیں گے۔ کبھی نہیں آئیں گے۔ آپ پڑھی لکھی ہیں؟

عورت : نہیں۔

شاعر: آپ کا گاؤں کون سا ہے؟

عورت : میرا گاؤں کوئی نہیں۔ جس گاؤں کے لوگ میری محبت کے دشمن بن گئے وہ میرا گاؤں کیسے ہو سکتا ہے؟

شاعر: آپ کے والدین؟

عورت : وہ مجھے گھر میں قید رکھا کرتے تھے۔

شاعر: اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو آپ کے والدین کے پاس پہونچا سکتا ہوں۔

عورت : میں اُن کے لیے مر چکی ہوں اور وہ میرے لیے۔

شاعر: چاہے ہم لاکھ بار رشتہ ختم کر لیں مگر ہمارے دِل رشتوں کی ڈوری کا آخری سرا پکڑے بیٹھے رہتے ہیں۔

عورت : میرا دِل سب ڈوریاں توڑ چکا ہے صرف ایک ڈوری تھی جسے میں نے مضبوطی سے پکڑے رکھنے کا تہیہ کر رکھا تھا مگر اب وہ بھی۔

شاعر : دِل کے ہاتھ کبھی خالی نہیں رہتے۔ اُن میں کسی نہ کسی کی ڈوری ہمیشہ رہتی ہے۔

عورت : (قوتِ ارادی سے) اگر میرے دل کے ہاتھوں سے آخری ڈوری بھی نکل گئی تو میں اس کو کسی اور ڈوری کو کبھی نہ پکڑنے دوں گی۔

شاعر: میں اِس بارے میں ہی بات کروں گا مگر پہلے آپ بیٹھ جائیے سردی میں کھڑے کھڑے آپ کے ہاتھ پاؤں بھی سُن ہو چکے ہوں گے۔ اِس بلب کی روشنی بھی کتنی مدھم ہے۔ بیرے نے بھی ہماری خبر نہیں لی۔ (گھنٹی بجاتا ہے)

بیرا: (آکر) ہاں صاحب! (عورت کو دیکھ کر) ارے باپ رے۔ تم یہاں تمہیں تو ساتھ والے کمرے میں جانا تھا۔ بابا۔ ایک تو تم کسی کو پسند نہیں آتیں اگر آجاتی ہو تو غلط کمرے میں چلی جاتی ہو۔ ساتھ والے کمرے میں جاؤ۔ موٹا سیٹھ تمہارے انتظار میں سوکھ رہا ہوگا.....

جاؤ۔ جاؤ۔ (شاعر سے) دادا کو مت بتانا صاحب۔ وہ مجھے مارے گا۔ یہ غلطی سے اِدھر آگئی۔ پہلے میں اِسے کمرے میں چھوڑ آؤں۔ پھر آپ کی سیوا میں حاضر ہو جاؤں گا۔ جو حکم آپ دیں گے بجالاؤں گا۔ چراغ کے جِن کی طرح۔

(عورت زور سے رونے لگتی ہے۔ پھر چل پڑتی ہے)

شاعر: ٹھہرو۔

(باقی ص ۴۲ پر)

سلمیٰ فردوس نقّاش | نثری نظمیں

جھروکا

گلی کے اُس موڑ پر
جھروکے سے
دو حسین آنکھیں مجھے گھورتی رہتی ہیں
وہ آنکھیں
مجھ سے بہت کچھ کہتی ہیں
مگر بھوک اور افلاس کی گرد سے
پیار کا احساس مفلوج ہو کے رہ گیا ہے
سینے میں دھڑکتا دل بھی ہے
زندگی کی کشمکش سے
میرا ہی سینہ میرے ارمانوں کا مدفن بن گیا
کیسے تمہیں بتاؤں
پیار کی قندیلیں بجھا دو
میری دُنیا میں روشنی کا گزر ممکن نہیں !!

ٹکڑوں کی تقسیم

آؤ
زندگی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیں
پھر
وہ ٹکڑے اُن لمحوں میں بانٹ دیں
سگریٹ کی مانند سُلگتے ہوئے وہ لمحے
جن میں یگوں کا زہر پیا ہم نے
اور
اُڑا کے دُکھ بھرے یُگوں کی دھجیاں
صرف لمحوں کو امر کر لیں !!

468 - جواہر نگر - سری نگر ۱۹۰۰۱ (کشمیر)

غزلیں

عین تابش

میں سوچتا ہوں کہ کیا خوب آدمی میں تھا
تمام اپنوں میں بس ایک اجنبی میں تھا

وہ خیریت تھی کہ دل کانپ کانپ اٹھتا تھا
وہ قہقہے تھے کہ خود اپنی بے بسی میں تھا

تمام عمر اسی تشنگی میں بیت گئی
وہ مضطرب تھا اور اک بات ان کہی میں تھا

ترا خیال بھی آیا تو میں لرز اٹھا
یہ اور بات کہ خود اپنی برتری میں تھا

مجھے معاف کرے میری بے حیائی بھی
تمام لوگ خفا تھے مگر وہی میں تھا

٭٭

شان بھارتی

ہمیں اس نے تماشا کر دیا ہے
بلندی دے کے بونا کر دیا ہے

جلا ڈالا ہے اپنے گھر کو لیکن
بہر صورت اجالا کر دیا ہے

تری رونق نے اے شہرِ نگاراں
مری آنکھوں کو خیرہ کر دیا ہے

مرے سجدوں کی یہ معجز نمائی!
کہ ہر پتھر کو کعبہ کر دیا ہے

رگوں میں دوڑتی ہیں بجلیاں کیوں
تری نظروں نے یہ کیا کر دیا ہے

٭٭

معصوم نظر

دھوپ ڈھلنے کے لیے بیتاب ہے
شام کے سینے میں پیچ و تاب ہے

پھر اندھیروں کا وہی سیلاب ہے
ذرّہ ذرّہ شہر کا غرقاب ہے

کھل رہی ہے پھر مرے دل کی کتاب
پھر وہی غم کو لیے ہر باب ہے

بادلوں کی گھن گرج سے کیا ہوا
دل کا صحرا آج تک بے آب ہے

میرے سر پر آ گرا سورج کوئی
جسم کی جلتی ہوئی محراب ہے

٭٭

★ شاہ ہارون۔ سسرام۔ ۸۲۱۱۱۵ ★ سجوا۔ دھنباد ★ لال پورہ۔ ڈونگر پور، راجستھان ۱۴۰۱ ۳۱۴

بیان میرٹھی

محمد مشتاق شارق

پیدائش ۱۸۵۰ء وفات ۱۹۰۰ء، جب میں نے ہوش سنبھالا تو ایسے احباب کے ساتھ بیٹھنا ہوا انھیں ادب سے بغایت دل چسپی تھی۔ بیاؔن میرٹھی ہماری گفتگو کے محبوب کردار تھے۔ اُس وقت بیاؔن کے دیکھنے والے اور اُن کے بعض شاگرد حیات تھے۔ کبھی کبھی گھنٹوں ان کے بارے میں باتیں ہوتیں۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے بیان سے خاصا اُنس پیدا ہو گیا تھا۔

بیان کا نام سید مرتضیٰ حسین تھا۔ بیاؔن اور یزدانی اُن کے دو تخلص تھے۔ والد کا نام سید گوہر علی تھا۔ اُن کے آباد اجداد جارچہ ضلع بلند شہر سے آکر میرٹھ میں آباد ہو گئے تھے[1]۔ یہیں موضع اُگون میں اُن کے والد نے سید عمر دراز علی ڈپٹی کلکٹر کی لڑکی سے شادی کی تھی۔ جب بیاؔن کے نانا جھانسی میں تعینات تھے تو ۱۸۵۰ء[2] میں بیاؔن کی پیدائش ہوئی۔

بیان نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سید گوہر علی سے حاصل کی اور پھر اپنی ذاتی محنت سے اردو اور فارسی پر عبور حاصل کیا۔ سید احمد حسین فرقانی و شاکی بیان کے رشتے کے ماموں تھے۔ اُن کی صحبت میں، بیاؔن کو شاعری کا شوق ہوا۔ فرقانی نے اُن کے ذوق کو جلا دی بحیثیت شاعر بیان کا مقام بلند ہے۔ معاصرین سے ان کی چشمکیں ان کے علم کو ظاہر کرتی ہیں۔ انھوں نے شوکت میرٹھی، حاؔلی اور اودھ پنچ سے ٹکر لی اور ان جھڑپوں میں کامیاب رہے۔

بیاؔن کو صحافت سے بھی دلچسپی تھی۔ طوطیِ ہند اور جلوۂ طور اُن کی ادارت میں برسوں شائع ہوئے۔ ان کے بند ہونے کے بعد، انھوں نے لسان الملک جاری کیا جو ان کی وفات تک شائع ہوتا رہا۔ ان پرچوں میں ادبی مباحث کے علاوہ، غالب کے کلام کی شرح بھی بالاقساط چھپتی تھی۔

بیان کا ادب میں کیا مقام تھا۔ اِس کے لیے اُس زمانے کے مشہور تذکروں کے اقتباسات دیکھیے:۔

"سید محمد مرتضیٰ یزدانی، سید احمد حسین فرقانی کے شاگرد اور میرٹھ کے قابل شاعر تھے۔ فن سخن میں کامل مہارت تھی۔ ۱۸۴۰ء میں پیدا ہوئے۔ طوطیِ ہند کے ایڈیٹر رہے۔ اس کے علاوہ جلوۂ طور وغیرہ اخباروں میں مدت تک مضامین نکالے۔ انھوں نے حاؔلی کے جواب میں ایک مسدس لکھا

---

[1] جس مکان میں بیاؔن رہتے تھے وہ آج بھی محلہ کرم علی، میرٹھ میں شاہ نتھن کی مسجد کے قریب اچھی حالت میں ہے۔ اس میں بیاؔن کے اخلاف میں سے میرے عزیز دوست سید صفدر حسین ایم۔ اے رہتے ہیں۔

[2] مولف قاموس المشاہیر اور مرتب خم خانۂ جاوید دونوں بیان کا سال پیدائش ۱۸۴۰ء لکھتے ہیں۔ ڈاکٹر سید صفدر حسین نے 'نقشِ بیان' کے دیباچے میں ۱۸۵۰ء تحریر کیا ہے۔ یہی صحیح ہے۔

وی۔ ایم۔ ایچ۔ ایس۔ رحمانیہ انٹر کالج۔ مودہا۔ ڈاکخانہ لگول، ہمیرپور

ہے جو چھپ گیا ہے[۱]"

(قاموس المشاہیر)

"بیان میرٹھ کے نامور اور قابل شعرا میں تھے۔ استعداد علمی بہت معقول اور فن سخن میں دستگاہِ کامل حاصل تھی۔ نظم و نثر پر قادر تھے۔ مبدا رفیاضی سے شعرگوئی اور سخن فہمی کا نہایت شستہ اور صحیح مذاق آپ کو ملا تھا۔ فارسی میں نہایت قابلیت کے ساتھ دادِ سخنوری دی ہے۔ جملہ اصنافِ سخن پر قادر تھے۔ جس رنگ میں چاہتے فکر سخن کرتے۔ اس رنگ میں اپنے زورِ طبیعت سے وہ وہ اختراعیں کرتے کہ سننے والے حیران رہ جاتے ...."

(خم خانۂ جاوید)

سر عبدالقادر نے اُنھیں بہت قریب سے دیکھا تھا۔ بیان کی نکتہ طرازی کے سلسلے میں انھوں نے ایک نہایت دل چسپ واقعہ کا اظہار کیا ہے۔ اختصار کے ساتھ ملاحظہ فرمائیں:

سر سید احمد خاں مرحوم کی عمر کا آخری دور تھا جب اُن کی قائم کی ہوئی تعلیمی کانفرنس ۱۸۹۶ء میں میرٹھ میں منعقد ہوئی۔ اس میں اُس زمانے کی کئی معتبر ہستیاں شریک ہوئی تھیں[۲]۔ اُس زمانے میں کانفرنس سے پہلے نظموں کے پڑھوانے کا رواج تھا۔ محسن الملک نے اِسے تضیعِ اوقات سمجھا۔ بیان نے یہ سوچ کر کہ کانفرنس اُن کے شہر میں منعقد ہو رہی ہے، اُن سے ضرور نظم کی فرمائش ہو گی، ایک مسدس کہہ لیا[۳] لیکن کسی کو بیان جیسے صاحبِ کمال کا خیال نہ رہا۔ انھیں مدعو نہیں کیا گیا۔ بیان نے بھی بغیر بلائے شریکِ جلسہ ہونا خودداری کے خلاف سمجھا لیکن اِسے بھی اخلاص و مروت کے خلاف سمجھا کہ سر سید اور سید محمود جیسی عظیم شخصیتیں اُن کے شہر میں آئیں اور وہ اُن کی خدمت میں حاضر نہ ہوں۔ لہٰذا بعد اختتام جلسہ ایک پالکی میں بیٹھ کر خیمہ گاہوں تک آئے۔ اتفاقاً سر عبدالقادر نے انھیں دیکھ لیا۔ خود انھیں لے کر سر سید تک گئے۔ سر سید بڑے اخلاق سے پیش آئے۔ دوسرے حضرات بھی بیان کے مرتبے سے واقف تھے۔ ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ بیان نے سر سید سے کہا "حضرت میں آپ سے تو ملنے نہ آتا کیونکہ آپ نے اپنی کانفرنس کے جلسے میں میرے شہر میں آکر بھی یاد نہ فرمایا مگر میں آپ کے فرزند سید محمود[۴] سے ملنے آیا ہوں"۔ سر سید نے شکریہ ادا کیا اور محمود اور محسن الملک کو بلوایا۔ جب نوکر چلنے لگا تو بیان نے اُسے ایک پرچہ دیا اور کہا لو بھئی یہ وزٹنگ کارڈ سید صاحب کو دے دینا۔ سید محمود دوڑے ہوئے آئے اور بڑے تپاک سے ملے اور سر سید سے کہا "آپ نے دیکھا میر صاحب نے کارڈ پر کیا لکھا ہے اور بیان سے کہا آپ ہی پڑھ کر سنائیے۔ بیان نے گرج کر پڑھا:

فارغ ز اندوہ و پیل اندیشۂ رود آمدم
فردوسیِ دہر ستم و در بزمِ محمود آمدم

سب حاضرین نے تعریف کی اور انھیں مدعو نہ کرنے پر اظہارِ ندامت کیا۔ چلتے وقت بیان نے سر سید کی شان میں کہے ہوئے فارسی کے چند اشعار پڑھنے کی اجازت چاہی۔ دو شعر ملاحظہ ہوں۔

درنگر با چشمِ دل کایں قوم چوں پیکر بود
سید احمد خاں بہادر پیکرش را سر بود

---

[۱] حالی کے شکوۂ ہند کا جواب بیان نے رخصتِ عروسی کے نام سے دیا تھا۔ جس طرح شکوہ میں حالی نے ہندوستان کی شکایت کی ہے کہ اُس نے ہم کو خراب کیا اِس طرح رخصتِ عروس میں یزدانی نے خود اپنی شکایت کی ہے کہ ہم نے ہندوستان کو خراب کیا۔
تاریخ ادب اردو از سکسینہ چوتھا ایڈیشن ص ۴۱۴

[۲] عماد الملک سید حسین بلگرامی، ڈاکٹر نذیر احمد، میاں محمد شفیع، میاں شاہ دین، آفتاب احمد خاں وغیرہ، [۳] مسدس کا عنوان تھا اسلام کا سرنگوں علم، [۴] سر سید کے چھوٹے بیٹے۔ ۲۴ مئی ۱۸۵۰ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ کالج کے اصول و ضوابط کو انھی نے منضبط کیا تھا۔ یہ پہلے ہندوستانی تھے جو صوبے کے ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ فنِ شعر سے مناسبت تھی۔ ۸ مئی ۱۹۰۱ء کو سیتاپور میں انتقال کیا۔

انتلاف توم پیکر را جُدا دارد زسر
پیکرے کو سر ندارد جہاں ابتر بود[1]

بیاںؔ سے متعلق ایک اور لطیفہ دیکھئے :

کہتے ہیں کہ مولوی سید آفتاب حسین ساکن پتن کھیڑا (بجنور) ایک مرتبہ بیاںؔ سے ملنے گئے۔ جب آپ مکان پر پہنچے تو آواز دی۔ بیاں نے پوچھا "کون ہے ؟" جواب میں مولوی صاحب نے کہا "آفتاب" بیاںؔ نے کہا "مغرب کے بعد آفتاب کیسا ؟" مولوی صاحب نے فرمایا "مرتضےٰ کے واسطے رجعت کر رہا ہوں۔" (یہاں اس کا خیال رہے کہ بیاںؔ کا نام مرتضیٰ حسین تھا)[1]

بیاںؔ کے سلسلے میں بعض باتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں وہ اعلیٰ پایہ کے شاعر اور صحافی تھے وہیں کسی حد تک وہم کے اسیر بھی تھے۔ "روشنی کے مضر ہونے کے خیال سے وہ سالہا سال تک اپنی تنگ و تاریک کوٹھری سے باہر نہ نکلے۔ اگر کبھی کسی مجبوری سے باہر نکلنا پڑا تو بند پالکی میں جاتے تھے۔"[2]

بیاںؔ وجیہہ اور بلند قامت تھے۔ رنگ گورا اور نقش و نگار اچھے تھے۔ عام طور پر شیروانی اور پاجامہ پہنتے تھے۔ سر پر صافہ باندھتے تھے۔ کاندھوں پر رومال پڑا رہتا تھا۔

بیاںؔ غزل گو تھے لیکن انھوں نے نظمیں بھی کہی ہیں۔ نعتیں بھی اور سلام اور مرثیے بھی۔ اُن کی یہ نعتیہ غزل ؎
"اے دو عالم کے حسینوں سے نرالے آجا"
بہت مشہور ہوئی۔ نظموں میں اُمید اور "اردو شاعری کی الوداع" اُن کی نہایت کامیاب نظمیں ہیں۔

ان کی نظموں کا ایک مجموعہ چھپ چکا ہے مگر اب نایاب ہے۔ اپنے زمانۂ طالب علمی میں، میں نے اسے فیض عام کالج میرٹھ کی لائبریری میں دیکھا تھا اس کے بعد بیاں کے عزیز سید صفدر حسین سے لے کر پڑھا۔ افسوس ہے اب دونوں جگہ نایاب ہے۔ ڈاکٹر سید صفدر حسین ڈائرکٹر آف ایجوکیشن، لاہور کے حالیہ خط سے معلوم ہوا[3] کہ انھوں نے بیاں کی مندرجہ ذیل کتابیں شائع کرادی ہیں :

(۱) نقشِ بیان (مجموعہ غزلیات)
(۲) رنگِ شہادت (عزائیہ نظمیں)
(۳) قندیلِ حرم (نعتوں کا مجموعہ)

بیان کا سال پیدائش ۱۸۵۰ء اور سال وفات ۱۹۰۰ء ہے۔ اس طرح وہ پچاس سال کے قریب اس دنیا میں مقیم رہے۔ اس مختصر زندگی میں انھوں نے جو ادبی سرمایہ اپنے پیچھے چھوڑا ہے وہ ہر طرح وقیع اور گراں قدر ہے۔ اگر سب نہیں تو اس کا بہت بڑا حصّہ نقش دوام ثابت ہوگا۔

بیان کو مقابلے کی غزلیں کہنے کا بڑا شوق تھا۔ غالب کی ایک مشہور غزل ہے جس کا مطلع ہے ؎

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں، منہ سے مجھے بتا کہ یوں

اس ردیف قافیے میں بیان کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں :

صبح قیامت آئے گی کوئی نہ کہہ سکا کہ یوں
آئے وہ در سے ناگہاں کھولے ہوئے قبا کہ یوں[4]

---

[1] ادبی دنیا، لاہور، نوروز نمبر ۱۹۲۲ء بعنوان یادِ رفتگاں، [2] دہلی کی یادگار ہستیاں مصنفہ امداد صابری ص ۸۲،
[2] ایک روایت یہ بھی ہے کہ انھیں یہ وہم ہو گیا تھا کہ اگر وہ باہر نکلیں گے تو پریاں اُنھیں اُٹھا کر لے جائیں گی۔ واللہ اعلم بالصواب
[3] یہ خط ۲۲ ر نومبر ۱۹۷۴ء کا تحریر کردہ ہے۔
[4] نا طق گلاؤٹھی نے شرح کلام غالب میں لکھا ہے کہ بیاںؔ کا مطلع اس طرح ہے :
آئے گا حشر کس طرح اُس نے بتا دیا کہ یوں
بندِ قبا کو کھول کر سامنے آگیا کہ یوں

رنگ نہیں ہے بن تلاش کہتی تھی تنگیِ معاش
گردشِ سنگِ آسیا دینے لگی صدا کہ یوں

غالب کی ایک اور زمین میں کچھ اشعار دیکھیے :-

اُن کا من جملۂ ارباب وفا ہو جانا
میرے نزدیک ہے بندے کا خدا ہو جانا

قلبِ ماہیت اشیاء ہے یہ تاثیر فشار
درد کو چاہیے پہلو میں دوا ہو جانا

تھا جو در پردہ بیاں زخمہ زن تارِ نفس
مجھ کو ہر پردے میں تھا پردہ سرا ہو جانا

بیاں کی نظموں کا انداز وہی ہے جو حالی، نظیر اور آزاد کے یہاں پایا جاتا ہے۔ بیان محمد اسمٰعیل میرٹھی کے معاصر ہیں۔ بیاں کی بہت سی نظموں کا اثر انھوں نے قبول کیا ہے۔

اب اُن کی غزلیہ شاعری کے کچھ نمونے دیکھیے :

شمع کہتی ہے مرے سر سے دھواں اُٹھتا ہے
تو نے روکیں دلِ پرسوز یہ آہیں کیونکر

سارے جہاں کے دل میں تیرا مقام نکلا
تو ہم سے بھی زیادہ رسوائے عام نکلا

اے مجھے کھو کے نہ رو دُکھ اگر روئے گی شمع
جان پڑ جائے گی کیا راکھ میں پروانے کی

نہ کھولی آنکھ وقتِ نزع بیمارِ محبت نے
کسی کا پردہ رکھنا تھا، کوئی آنکھوں میں پنہاں تھا

اِدھر دیکھ لینا، اُدھر دیکھ لینا
پھر اُس شوخ کو اک نظر دیکھ لینا

شیخ کے ماتھے پہ مٹی، برہمن کے سر میں بُت
آدمی دیر و حرم سے خاک پتھر لے چلا

بیاں جس عہد سے تعلق رکھتے تھے غزل میں وہ داغ اور امیر کا عہد تھا۔ اس میں خیال سے زیادہ زبان کی صفائی اور طرزِ ادا پر زور دیا جاتا تھا لب و لہجہ کی خوبی اور بے ساختگی یہ دو وصف ہیں جو غزل گوئی کے خاص جوہر سمجھے جاتے تھے۔ شاعر کا محبوب شوخ اور بازاری ہوتا تھا۔ کبھی ادھر سے چھیڑ چھاڑ ہوتی کبھی اُدھر سے چٹکیاں لی جاتیں۔ بیاں کی شاعری بھی یہ سب کچھ اپنے اندر نہاں رکھتی ہے۔ بولتے ہوئے ڈھلے ڈھلائے مصرعے اور لب و لہجہ کا انوکھا پن ان کی شاعری میں عجیب مزا دیتا ہے۔

صنفِ غزل سے تعلق رکھنے والی ایک اور صنف ہے جسے خمسہ کہتے ہیں۔ کمالِ شاعری حاصل کرنے کے لیے، اِس دور میں ضروری تھا کہ شاعر اپنی اور اساتذہ کی غزلوں پر خمسے کہے۔ بیاں نے اس صنف میں بھی اپنی طبیعت کے جوہر دکھائے ہیں۔ غالب کی ایک مشہور غزل کے خمسے کا انتخاب دیکھیے :

اک بلبلا ہے گنبدِ گردوں مرے نزدیک
اک لہر ہے انگیزشِ امکاں مرے نزدیک
اک سحر ہے نیرنگِ بہاراں مرے نزدیک
اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

کیا سرکہ جبیں۔ سرمہ گلو دیکھتے ہیں یار
شیشے میں پری ہو تو پری خواں ہوں نمودار
آگے ہو گلِ سرخ تو بلبل ہو گہر بار
پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیِ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

اخیر میں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ بیاں جیسا شاعر آخر تاریخِ ادب میں اپنا مقام کیوں نہیں بنا سکا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ اُن کی صحافی زندگی کی مشغولیت تھی۔ اُن کی شاعرانہ زندگی زیادہ تر معاصرانہ چشمکوں میں گزری۔ جتنا وقت اور جتنی توجہ اُنھیں شاعری پر صرف کرنا چاہیے تھی وہ نہ کر سکے۔ اس کے علاوہ اُن کی گوشہ نشینی بھی بڑی رکاوٹ ثابت ہوئی اُنھیں مقبولِ عام بنانے میں۔

بیاں کے شاگردوں میں سے چند کے نام یہ ہیں: ناطق گلاوٹھی، شمس میرٹھی، علی حسن خاں بسمل، فضل صاحبِ دیوان، اکبر وارثی مشہور نعت گو اور صاحبِ دیوان، پروفیسر گرامی۔ منشی درگا پرشاد سرور جہان آبادی وغیرہ۔

(باقی ص۱۸ پر)

ستیہ پرکاش | کیا کمیونسٹ جمہوری نظام اپنا سکتے ہیں؟

جو لوگ اٹلی اور فرانس کے کمیونسٹ لیڈروں کے بیانات سے متاثر ہو کر اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ سوویٹ نواز کمیونسٹ پارٹیاں سازشانہ اور متشددانہ طریق کار کو خیرباد کہہ کر پر امن اور جمہوری طریق کار کو خلوص دل سے اپنا لیں گی، انھیں کمیونسٹ ماہرین نظریہ کی ان تحریروں کو غور سے پڑھنا چاہیے جو انھوں نے چلی کے موضوع پر لکھی ہیں۔

"ورلڈ مارکسسٹ ریویو" کے ۱۹۷۴ء کے چھٹے شمارے میں بونوماریو نے چلی کے واقعات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا تھا کہ ان واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ کمیونسٹوں کو مندرجہ ذیل اقدامات کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

(۱) انقلابی فتوحات کے دفاع کے لیے انقلاب دشمنوں کے خلاف تشدد کا استعمال۔

(۲) یساری مہم جویوں کو غیر موثر بنانا۔

(۳) عبوری دور کے لیے صحیح اور لچک دار اقتصادی پالیسی طے کرنا۔

(۴) طبقاتی دشمن کو اطلاعات کی بہم رسانی اور پروپیگنڈے کے وسائل سے محروم کرنا۔

(۵) کمیونسٹوں کے برسر اقتدار آنے سے پہلے جو حکومتی نظام تھا اُسے طاقت کے اہم وسائل، مثلاً فوج اور پولیس سے محروم کرنا۔

بونوماریو کا کہنا تھا کہ چلی کے واقعات سے جو سبق حاصل ہوا ہے وہ موجودہ حالات میں انقلاب کی پیش رفت کے نقطۂ نگاہ سے بہت اہم ہے۔ الفاظ دیگر دنیا بھر کے تمام کمیونسٹوں کو، جن میں یورپی کمیونسٹ بھی شامل ہیں، انھیں ازبر کر لینا چاہیے۔

اب ایک اور تاریخی جریدے "نوو ایا ای نوو شیایا اسٹوریا" کے ۱۹۷۶ء کے نومبر/دسمبر کے شمارے میں دو اور ماہرین ایم۔ ایف۔ کراچکن اور وی۔ جی کچینکو کا مضمون شائع ہوا ہے جو اس اعتبار سے اور بھی اہم ہے کہ یہ دونوں ایک کتاب "انقلاب چلی — اس کا تجربہ اور مفہوم" کے مصنف بھی ہیں۔

کراچکن کا کہنا ہے کہ چلی کے کمیونسٹوں کو اب محسوس ہونے لگا ہے کہ ان کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ انھوں نے اپنی اس صلاحیت پر بیجا بھروسہ کر لیا کہ وہ ریاست کے موجودہ اداروں کے ذریعہ کام کر سکیں گے۔ انھوں نے ان ریاستی اداروں کے طبقاتی کردار کو فراموش کر دیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ایلنڈے کی حکومت دور رس انقلابی تبدیلیاں لائی اس نے قومیانے کا عمل بھی کیا اور لوگوں کو جائداد سے محروم بھی کیا لیکن سوشلزم کی راہ پر آگے بڑھنا تبھی ممکن تھا اگر طاقت کے مسئلے کو صحیح طور پر حل کر لیا جاتا اور یہ آئین کی حدود میں رہ کر ممکن نہیں تھا۔ مئی ۱۹۷۳ء میں پارلیمنٹ اور جوڈیشری کی تخریب کاری کا سامنا ہوا تو ایلنڈے نے کوشش کی کہ ریاستی مشنری کو آئین کی حدود میں رہ کر از سر نو منظم کیا جائے۔ لیکن اُس وقت یہ ممکن نہیں تھا کیونکہ وہ مرحلہ بیت چکا تھا جب کمیونسٹ آئینی حدود میں رہ کر کام کر سکتے تھے۔ یہ وہ مرحلہ تھا جب سیاسی اقتدار کے مسئلے کو اپوزیشن کے خلاف فیصلہ کن لڑائی کے ذریعہ ہی طے کیا جا سکتا تھا۔

سوویٹ ماہر نظریہ کے خیال میں چلی کی پارٹی نے

ریاستی نظام کے جمہوری عوامل پر ضرورت سے زیادہ بھروسہ کیا اور ریاستی نظام اور فوج میں مناسب تبدیلیاں کرنے میں ناکام رہی۔

کراچکن کے خیال میں چلی کے تجربے نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انقلاب خواہ پرامن ہو خواہ متشددانہ، لینن کا یہ بنیادی اصول صحیح ہے کہ انقلابی قوتوں کو ہر قسم کے اقدامات کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ مثلاً مخالفوں کی مکمل سرکوبی، تخریب کاری کے خلاف موثر اقدامات اور اپنی طاقت کے تحفظ کے لیے کنٹرول اور جبر کے دوسرے وسائل کا استعمال۔ محنت کش طبقے کو طاقت کے حصول اور اسے برقرار رکھنے کے لیے جدوجہد کے ہر قسم کے وسائل استعمال کرنے چاہئیں۔ "انقلابی جدوجہد میں صرف انتخابی رویہ، یعنی پرامن اور غیر مسلح رویہ اختیار کرنے پر اصرار طبقاتی جنگ کی شدید تر صورتوں کو سامنے لاسکتا ہے۔ اس کے نتیجے میں یعنی موقع پرستی کے عناصر کو ابھرنے کا موقع مل سکتا ہے۔"

سوویٹ ماہرین نظریہ کے ان واضح بیانات کی روشنی میں یہ باور کرنا خالصتہً سادہ لوحی ہے کہ کمیونسٹ کبھی بھی متشددانہ اور سازشانہ کردار کو خیرباد کہہ کر جمہوری طریق کار پر ایمان لاسکتے ہیں۔ اگر کسی وقت وہ ایسا کرتے ہیں جیسا کہ اس وقت اٹلی اور فرانس کے کمیونسٹ کر رہے ہیں، تو اس میں یا تو اُن کی اپنی مصلحتیں شامل ہیں یا سوویٹ یونین کی۔

کمیونسٹوں کے وقتی بیانات پر ایمان لانے سے پہلے یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ لینن نے بھی بار ہا کہا تھا کہ ایک بار اگر بولشویک برسر اقتدار آگئے تو وہ ہر سیاسی پارٹی کو اپنا اخبار جاری کرنے کی اجازت دیدیں گے۔ ۱۹۱۷ء کے بولشویک شب خون کے دن بھی لینن نے اعلان کیا تھا کہ اگر عوام نے آئین ساز اسمبلی میں بولشویکوں کے خلاف ووٹ دیا تو بولشویک پارٹی اقتدار سے دست بردار ہو جائے گی۔

یہ بھی جانتے ہیں کہ روسی عوام نے آئین ساز اسمبلی کے انتخابات میں بولشویک پارٹی کے خلاف ووٹ دیا تھا لیکن اس پارٹی نے اقتدار سے دست بردار ہونے کی بجائے بندوق کے زور پر اپنا اقتدار قائم کرلیا۔

●●

جینے کے لیے (بقیہ صـ۳۲)

بیرا: حکم دیجئے صاحب۔

شاعر: (عورت سے) میں چاہتا ہوں کہ تم میرے پاس ہی رہو۔

بیرا: آپ رکھنا چاہتے ہیں، رکھ لیں۔ میں موٹے سیٹھ سے کہہ دوں گا آج مال وال نہیں ہے۔

(چلا جاتا ہے)

شاعر: تمہارے ساتھ تمہارے بریکی کا میں بھی انتظار کروں گا۔ چار دن کے بعد اگر وہ نہ آیا تو میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔ کسی بھی قیمت پر مرنے نہیں دوں گا۔ میں تمہیں زندہ رکھوں گا۔

عورت: میں زندہ نہیں رہنا چاہتی۔ نہیں۔ میں جینا نہیں چاہتی۔

شاعر: میں تمہیں زندہ رکھوں گا۔

عورت: (پاگلوں کی طرح) نہیں۔ نہیں

(شاعر دیوار پر لگے بجلی کے بٹن کو دباتا ہے۔ ایک اور بلب جل اٹھتا ہے جس سے پہلے سے زیادہ روشنی ہو جاتی ہے۔ عورت روئے جا رہی ہے۔ شاعر بیرونی دروازہ کھولتا ہے۔ کھڑکیوں کے پردے اٹھاتا ہے اور کہتا جاتا ہے) میں تمہیں زندہ رکھوں گا۔ میں تمہیں زندہ رکھوں گا۔

(پردہ گرتا ہے)

●●

سونو | نثری نظمیں

(۱)

وہ آخری شخص بھی آخر
یہی کہہ کر چلا گیا
کہ میرے بدن کا ہر ناسور
یوں ہی رستا رہے گا
کہ ایسے زخموں کا مداوا
ہوا ہے
نہ ہوگا
ایک آخری امید تھی جو
ایک نحیف سی ڈور تھی جو
اُسے بھی توڑ کر چلا گیا وہ
معذوری اور بے بسی کا
یہ کیسا عالم ہے کہ
ڈاکٹر ہے
نہ چارہ گر
نہ مرہم
نہ پٹی
نہ دوا کوئی
اور جسم سے گلے ٹکڑے نوچ کر پھینکنے والا
ایک داھنا ہاتھ تھا جو
وہ بھی شل ہو چکا ہے
اور جسم
بے حس
اور میں اپنے مواد میں
گلے تک
ڈوبا ہوا ہوں

(۲)

غلیظ کیڑے کا مقدر ہے
غلیظ فرش تو
سوگ گیا، المیہ کیسا
لیکن ایک ذہن کہ جس میں
یادیں ہیں
کسی گوشے میں
سربستہ ایک فلک کہ جس میں
ہوا، روشنی، رنگ، موسم اور پھول
لہراتے ہیں
گزشتہ لذتوں اور ادھورے خوابوں کا ایک جہان کہ جس کے
آج بھی پیام آتے ہیں
چند مناظر کہ جو ہاتھوں میں ایاغ لیے
آج بھی بلاتے ہیں
ہر چند کہ سیلن، گھٹن، بو اور گندگی
مقدر رہے لیکن
اسی نحوست میں چھپا کوئی
ایک دوسری دنیا کی تصاویر دکھاتا ہوا
زیر لب
رفتہ رفتہ
مسکراتا ہوا
کیڑا۔ غلیظ فرش پر رینگتا ایک کیڑا
اکثر
رک جاتا ہوا........

اسسٹنٹ لاڈ سار جمنٹ، اولڈ سیکرٹریٹ، پٹنہ ۱۵

نثری نظمیں

مہدی ٹونکی

کل کی بات

کل کی بات ہے ——
تم نے کہا تھا،
ہمارے فرزند ارجمند
فرماتے ہیں ہم سے ——
—— وقت کا تقاضہ ہے
زمام اقتدار ہمیں سونپ دو
یہ سن کر تم بپھر گئے تھے،
چنگیز خاں بن گئے تھے
سر بازار سرزنش کی تھی اُس کی،
تمہارے ہم نوا ساتھیوں نے
لعنت ملامت کے پتھر برسائے تھے اُس پر!
اور آج ——
اور آج کی بات ہے
تمہارے وقت کا سورج ڈوب رہا ہے
تم اپنے پھڑپھڑاتے ماتھے پر،
جھلسے ہاتھ کی اوٹ بنا کر
رتوندھی آنکھوں سے
مرجھائے ہونٹوں سے
اُسی فرزند ارجمند سے
مدد مانگ رہے ہو
یعنی نئی نسل سے آسرا چاہ رہے ہو!
اور کل کی بات ہوگی ——
تمہاری لاش،
قبر کی تقدیر بنے یا
گدھوں اور کتوں کی خوراک ——
یہ نئی نسل کے اختیار میں ہوگا!

▲▲

کڑوا سچ

ہاں میں مجرم ہوں
جو چاہو سزا دو!
بس میں نے
اتنا سا جرم کیا ہے
حقیقت کا پتھر
کانچ کے چہروں پہ مارا ہے!

▲▲

مبارک منزل - پانچ بتی - ٹونک - راجستھان

غزلیں

سکندر حمید عرفان ★

جھلس گیا تپشِ غم سے زندگی کا بدن
دُھواں دُھواں سا نظر آئے ہر خوشی کا بدن

شبِ سیہ کو کسی آفتاب کی ہے تلاش
کہاں کہاں لیے پھرتی ہے تیرگی کا بدن

وہ تیر طنز کے پھینکے ہیں دوستداروں نے
سسک رہا ہے صلیبوں پہ دوستی کا بدن

نہ جانے کون سے چشموں کی جستجو ہے اسے
بھٹک رہا ہے سرابوں میں تشنگی کا بدن

چمن کی راہ سے جب جب صبا گزرتی ہے
مہکنے لگتا ہے عرفان ہر کلی کا بدن

▲▲

نور محمد یاس ★

خوں آلودہ ہر خواہش کا آنچل ہے
شاید میرے اندر کوئی مقتل ہے

تن سے لیکر پیراہن تک آسیب رنگ
روح سے دل تک پھیلا ہوا اک جنگل ہے

تعبیروں کی کھوج میں گھر سے کیا نکلیں
اپنا تو ہر سپنا غیر مکمل ہے

صحرا صحرا گونج رہے ہیں سناٹے
بستی بستی آوازوں کا جنگل ہے

یوں ہوتے ہیں یاسؔ مخاطب ہم سے لوگ
جیسے ان کے پاس مسائل کا حل ہے

▲▲

عبد القادر نشاط ★

رات آسیبی صدائیں اور میں
میرے ہونے کی سزائیں اور میں

رنگ برساتی صدائے بازگشت
جسم کی اندھی گپھائیں اور میں

الجھنوں کے تنگ ہوتے دائرے
میری ناکارہ دعائیں اور میں

پھر وہی بے سمت راہوں کا سفر
سر پھری پاگل ہوائیں اور میں

جاگتے لمحوں کا قاتل کون ہے
گونجتی چاروں دشائیں اور میں

▲▲

★ ۸/۱ ریلوے بکسٹال۔ کسنڈوہ ۔ ۴۵۰۰۰۱ ★ ۱۴۱ ہٹیا محل لین بھوپال ۱ ایم۔پی ★ سکریٹری انجمن ترقی اردو نہٹور ضلع بجنور

غزلیں

فداءالمصطفیٰ فدوی*

تیری ہی بستیوں میں یہیں تیرے پاس ہوں
پہچان کس کے جلتے لہو کی ہیں پاس ہوں

بادل برس کے جس کی تشفّی نہ کر سکے
اے دشتِ زندگی وہی صدیوں کی پیاس ہوں

لڑتا رہا جو آخری دم تک ہواؤں سے
اس سانس ٹوٹتے ہوئے پنچھی کی آس ہوں

جکڑا ہوا جو دیکھوں زنجیرِ وقت میں
دیکھو مجھے کہ رینگتے لمحوں کا داس ہوں

میں خود کو اوڑھ دشنیوں میں پھرا کیا
محسوس کب کسی کو ہوا بے لباس ہوں

بستے ہیں تیرے شہر میں اکثر خدا شناس
لیکن میں اپنے وقت کا فطرت شناس ہوں

▲▲

شاہد رسا*

راکھ کے ڈھیر میں چنگاری دبائے رکھیے
سرد ماحول میں بھی آگ لگائے رکھیے

توڑ دے جو غمِ دوراں کی سیاہی کا فسوں
ایسی اک شمع بہر گام جلائے رکھیے

سرد ہو جائیں نہ ماضی کے سسکتے دیپک
ان کو خوابوں کے دریچوں میں سجائے رکھیے

بزمِ عشرت میں بھی ہے غم کا بھی روشن احساس
ایسی تصویر بھی کمرے میں لگائے رکھیے

پھونک ڈالیں گے سرِ بزم دلوں کو شاہد
تپشِ الفاظ کی اتنی نہ بڑھائے رکھیے

▲▲

گوہر عثمانی*

یوں بھی پرائی آگ میں جلنا پڑا مجھے
ٹھوکر لگی کسی کے سنبھلنا پڑا مجھے

وہ دوست جن میں ہوئے وفا نام کو نہ تھی
کچھ دوراں کے ساتھ بھی چلنا پڑا مجھے

کچھ ایسی منزلیں بھی محبت کی تھیں جہاں
مفہومِ آرزو بھی بدلنا پڑا مجھے

جب مہر و ماہتاب بھی ظلمت میں کھو گئے
پھر شمع بن کے بزم میں جلنا پڑا مجھے

گوہر پئے شکستِ سکوتِ سخن شناس
اک سوز بن کے ساز میں ڈھلنا پڑا مجھے

▲▲

---

* کیرتی نکیتن ۱۲۳/۵، ریجنل کالج آف ایجوکیشن شیاملا ہلز بھوپال ۱۳ (ایم۔پی)
* دفتر اخبار ندرت، ۱۰ شاہ آباد۔ بریلی
* نئی بستی۔ مرادآباد

تبصرے

لہو کے مول

مصنفہ : شکیلہ اختر
صفحات : ۲۰۰ ۔ ناشر بک امپوریم سبزی باغ پٹنہ ۴۔
قیمت : ۷ روپے ۵۰ پیسے ۔

شکیلہ اختر کا نام اُردو افسانے میں پچھلی چار دہائیوں .... سے متعارف ہے "لہو کے مول" ان کے نئے افسانوں کا مجموعہ ہے جس میں کل بارہ افسانے ہیں یہ افسانے خاندانی معاملات اور معاشرتی موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں متوسط طبقے کی گھریلو زندگی اور اس طبقے کے افراد کے باہمی معاملات کی پیچیدگیوں پر مصنفہ کی نظر گہری ہے ۔ وہ بہت باریک بینی کے ساتھ مرد و زن کے تعلقات کی الجھنوں اور نفسیاتی پیچیدگیوں کا مشاہدہ کرتی ہیں ۔ انھوں نے ان افسانوں میں زندگی کی عکاسی چھوٹے چھوٹے واقعات کے ذریعہ کی ہے ، ایسے واقعات جو عام طور سے ہماری زندگی میں ظہور پذیر ہوتے ہیں ۔

اس افسانوی مجموعے کی جو بات سب سے پہلے متوجہ کرتی ہے وہ ممتا کا جذبہ ہے جو کسی نہ کسی شکل میں ساری کہانیوں میں جاری وساری ہے دوسری بات جو نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے وہ زندگی کی اداسیوں سے عبارت ہونا ہے جس کی سب سے اچھی مثال "سیندور کی ڈبیا" اور "لہو کے مول" ہیں جن میں دکھ کی ہلکی اور تیز ٹیسیں ہیں ۔ کردار جو شادمانی کی تلاش میں نکلتے ہیں اور اداسیوں کے شہر میں جا اُترتے ہیں ۔ اداسیوں کے اس نگر کے کوچے الگ الگ نام رکھتے ہیں ۔ کہیں وقت کی بے رحم گردش "ڈرائنگ" میں کنو جیسی کم عمر بچی پر ننھے ننھے بچوں کی جانوں کی ذمہ داری ڈال دیتی ہے اور کہیں انسانی جبلت کا تلون اور نرگسیت "ٹوٹی ہوئی گڑیا" میں نیاز کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے

تیسری اور آخری بات جو ان کہانیوں میں ہے وہ "حسنِ تضاد" ہے کہ وہ اپنے تقریباً سارے افسانوں کے کردار اور ماحول ایک دوسرے کے مخالف اور کاٹتے ہوئے بناتی ہیں مثلاً "ڈرائنگ" میں باجی جن کے لیے کھانے کے انبار لگے ہیں مگر ڈاکٹر نے کھانے ان کے لیے بند کر رکھے ہیں ۔ دوسری طرف کنو ہے جو کئی دن سے بھوکی ہے اور اپنے تین بھائی بہنوں کے لیے ہر چھوٹا ٹکڑا خود کھانے کے بجائے بچا کر رکھتی ہے

زندگی سے لبریز ان کہانیوں کو پڑھنے کے بعد بھی ایک تشنگی باقی رہتی ہے اور ادب کے ہاتھ ہنوز پھیلے رہ جاتے ہیں کہ شکیلہ اختر کچھ بڑی کہانیاں اس کے دامن میں ڈال دیں ۔

—— اقبال مسعود

صنم کدہ

عمر انصاری کی ذہنی نشوونما جس ادبی ماحول میں ہوئی اُسے نہ تو ادب کی قدیم روایتوں سے منسوب کیا جا سکتا ہے نہ آئے دن بدلتے ہوئے ادبی رجحانات سے اس کا رشتہ جوڑنا مناسب ہوگا ۔ ان کی شاعری معتدل اور سنبھلے ہوئے اندازِ فکر کی حامل ہے ۔ ان کے کلام میں کلاسیکل مزاج کے ساتھ ساتھ اس ذہنی لچک کا بھی سراغ ملتا ہے جو تبدیلیوں کی پذیرائی کے لیے ضروری ہوا کرتی ہے ۔ معاشرے میں رونما ہونے والی تبدیلیوں سے ذہنِ شاعر کس طرح متاثر ہوا ہے ۔ اس کی چند مثالیں ذیل کے اشعار میں نظر آتی

ہیں اور ان سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ کلاسیکل لہجے میں بھی عمر انصاری انھیں کس طرح موثر بنا کر پیش کر سکتے ہیں :

نہ واقعاتِ دہر سے موڑوں تو کس طرح
خود بھی تو ایک سلسلۂ واقعات ہوں

جواب ہی نہیں اس دورِ بے یقینی کا
کہ جو بھی لمحہ ہے مستعار سا ہے

یوں زمانے کو دیکھتا ہوں میں
سو کے جیسے ابھی اٹھا ہوں میں

عمر انصاری کے "صنم کدہ" میں غزل کے وہ سارے نقش و نگار موجود ہیں جن کا رنگ روپ ذہن و نگاہ کے لیے دلکش ہو سکتا ہے۔ شاید اس کا سبب یہی ہے کہ انھیں غزل کی ساری روایتیں بے حد عزیز ہیں۔ بعض صورتوں میں وہ "حالات" کی عکاسی کرنے کی خواہش کے باوجود اپنی غزل کو "ماضی" کے تسلط سے نہیں بچا پاتے اور اسی لیے ان کے بہت سے ایسے اشعار بھی جو ان کے اس قول کی عکاسی کرتے ہیں "روایت کو تیسرد کے اندر حدود کے بڑھا لیے جانے کو برا نہیں سمجھتا" — پڑھنے میں تو لطف دیتے ہیں لیکن ذہن پر دیر پا نقوش مرتسم نہیں کر پاتے۔

عزیز اندوری

کیفِ تمام (شعری مجموعہ)

شاعر : خان جلیل نعمانی
سائز : $\frac{20 \times 30}{16}$ ، ضخامت : ۱۲۸ صفحات مجلد
قیمت : دس روپے
ملنے کا پتا : نعمانی پبلشنگ ہاؤس، نعمانی اسٹریٹ رام پور (یو۔پی)

"کیفِ تمام" جناب جلیل نعمانی کا پہلا اور نمائندہ شعری مجموعہ ہے، وہ دبستانِ رام پور کے ایک اہم غزل گو شاعر ہیں اور ایک مقامی انجمن کی طرف سے "آبروئے غزل" کے خطاب سے متصف، انھوں نے کلاسیکی اردو غزل اور فارسی ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اردو زبان کے ہم عصر نامور شعراء سے نہ صرف ملے ہیں بلکہ ان سے دوستانہ تعلقات بھی رہے ہیں۔ انھوں نے غزل کے مزاج کو سمجھ کر اس کا رشیشہ گری کو اپنایا ہے۔

ان کے تخلیقی شعور کی تربیت کلاسیکی ادبیات کے زیرِ اثر ہوئی ہے اس لیے ان کا ذہن، فکر کے روایتی اور رسمی سانچوں کے استعمال کا عادی ہے وہ غزل اور صرف غزل کے شاعر ہیں ان کی شاعری میں اگر عصری حسیت کا وجود ہے تو برائے نام ہے وہ روایت کی لے میں لے ملانے کے قائل ہیں اور غمِ دوراں کو غمِ جاناں میں سمو کر پیش کرتے ہیں بایں ہمہ ان کا آہنگ دور سے پہچانا جاتا ہے اگرچہ غزلوں میں موضوعات محدود ہیں مگر تاثر کی کمی نہیں، اسلوب پسندیدہ اور کلام کہنہ مشقی کا آئینہ دار ہے جس میں محاسنِ شعری بھی ہیں۔ روانی اور برجستگی بھی، تراکیب شگفتہ اور برمحل ہیں، ان کے اشعار نہ تو بعض متاخرین کے انداز میں متبذل، سوقیانہ ہیجان انگیز اور مادی زندگی سے آلودہ تصورات کی عکاسی کرتے ہیں اور نہ وہ زندگی کا مرثیہ ہیں، ذہن رومان زدہ ضرور ہے مگر لب و لہجہ میں مشرقی مزاج کی شائستگی، بنیادی متانت و تہذیبِ غزل کی جھلکیاں پائی جاتی ہیں، نمونتاً چند اشعار پیشِ خدمت ہیں ؎

جنبشِ پردۂ رخ بھی ہے برابر کی شریک
صرف میری نگہِ شوق کو الزام نہ دو

میں بھی ہوں وہی، تم بھی وہی، دل بھی وہی ہے
پورے نہ ہوئے گردشِ دوراں کے ارادے

بہار آئی ہے اور آتی رہے گی
مگر وہ پھول جو مرجھا گئے ہیں

ارے دیوانے! اتنی احتیاطیں!!
زمانہ سوچنا بھی جانتا ہے

داغ ہے تم نے تو پیمانِ وفا توڑ دیا
ہم سے پوچھو کہ ہمیں اب بھی یقین ہے کہ نہیں

محتاط اور قادر الکلام شاعر ہونے کے باوجود ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ عربی اور فارسی الفاظ کے حروفِ علّت کے سقوط اور تعقیدِ لفظی وغیرہ کو اہمیت نہیں دیتے۔

کتاب کے ابتدائی صفحات میں حضرت مولانا عرشی اور کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ صاحب کے مضامین "دبستانِ رام پور" اور "تعارف" کے عنوان سے شاملِ اشاعت ہیں۔

"کیفِ تمام" کے صوری حسن میں سادگی اور سلیقہ پایا جاتا ہے اور سرورق دیدہ زیب ہے۔

——— عروج زیدی

قند شیراز

مترجم: احسن مفتاحی، مطبوعہ: کلکتہ فوٹو پریس کلکتہ
قیمت: آٹھ روپیے،

ترجمہ کا فن ایک مشکل فن ہے۔ خیال کی روح کو ایک قالب سے دوسرے قالب میں منتقل کر دینا بادی النظر میں ایسا دشوار نظر نہیں آتا لیکن نئے قالب کی تخلیق کے لیے جیسی صلاحیت اور عرق ریزی کی ضرورت ہوتی ہے ہر شخص اس کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔

قند شیراز خواجہ حافظ شیرازی کی غزلیات کے چار سو بتیس منتخب اشعار کا منظوم ترجمہ ہے۔ خواجہ حافظ کے سیکڑوں اشعار زبان زد خاص و عام ہیں اور اردو میں بھی ضرب الامثال کی حیثیت رکھتے ہیں۔ احسن مفتاحی صاحب مستحق مبارکباد ہیں کہ انھوں نے بعض اشعار کا نہایت برجستہ اور بامحاورہ ترجمہ کیا ہے بحر وں کے حسن انتخاب کے علاوہ اور بہت سے مشکل مراحل سے کامیابی سے گزر گئے ہیں لیکن اکثریت ایسے اشعار کی ہے جن میں حافظ کے ساتھ انصاف نہیں ہو سکا۔ چنانچہ صرف اردو ... .. ترجموں کا مطالعہ کیا جائے تو دل د ماغ باور کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے کہ یہ حافظ کا کلام ہے احسن صاحب نے ترجمہ میں اگرچہ بڑی جاں فشانی سے کام لیا ہے اس کے باوجود الفاظ کے انتخاب میں ایسی لغزشیں سرزد ہو گئی ہیں کہ شعر کے معنوی اور جمالیاتی پہلو متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے مثلاً:

اے مدعی برو کہ مرا با تو کار نیست
احباب حاضرند با عدا چہ حاجت است

اس شعر کا ترجمہ ہے:

چلا جا مدعی تجھ سے نہیں کوئی مرا جھگڑا
ہیں جب احباب حاضر دشمنوں کی کیا ضرورت ہے

"کار نیست" کا ترجمہ "نہیں جھگڑا" میرے خیال میں شعر کو لطافت اور صداقت سے دور لے جاتا ہے۔

تا صد ہزار خار نمی روید از زمیں
از گلبنے گلے بگلستاں نمی رسد

الفاظ کے عجز انتخاب کی بدولت ترجمہ لطافت سے بالکل عاری ہو کر رہ گیا ہے ؎

اُگتے ہیں پہلے کانٹوں ہزاروں زمین سے
تب جا کے ایک پھول گلستاں میں کھلتا ہے

مصرعِ اول میں غالباً کتابت کی غلطی سے "کانٹے" کی جگہ "کانٹوں" ہو گیا ہے۔

اسی طرح یہ مشہور شعر ؎

تو و طوبیٰ و ما و قامتِ یار
فکر ہر کس بقدر ہمتِ اوست

جس کا ترجمہ ہے ؎

تو ہے طوبیٰ کا عاشق اور ہیں ہم یار کے قد کا
مزاج اپنا پسند اپنی مذاقِ انتخاب اپنا

ترجمہ اگرچہ اپنے اندر خاصی جاذبیت رکھتا ہے لیکن اس نے اصل شعر کے مزاج کو بالکل بدل ڈالا نیز مفہوم کی تہہ داری اور ہمہ گیری کو سمیٹ کر محدود دائرے میں اسیر کر دیا ایک مقام پر حافظ کہتے ہیں ؎

حافظ از بادِ خزان چمن دہر مرنج
فکرِ معقول بفرما گلِ بے خار کجاست

ترجمہ کا شعر بطورِ خاص ثانی مصرعِ مفہوم کی خیانت اور زبان کی ناپختگی کا احساس دلاتا ہے ؎

خزاں آئی ہے گلشن میں تو رنجیدہ نہ ہو حافظ
جہاں پر پھول ہوتے ہیں وہیں کانٹے بھی ہوتے ہیں

لیکن "قندِ شیراز" میں ایسے تراجم بھی ہیں جن کی برجستگی داد طلب ہے : مثلاً ؎

شبے مجنوں بہ لیلیٰ گفت اے محبوب بے ہمتا
ترا عاشق شود پیدا ولے مجنوں نخواہد شد

کا ترجمہ ؎

کہا مجنوں نے لیلیٰ سے کہ اے محبوب لاثانی
ترے عاشق بہت ہوں گے مگر مجنوں نہیں ہوگا

رواں دواں ہونے کے ساتھ ساتھ مفہوم کے لحاظ سے بھی حافظ کے شعر سے قریب ہے بالخصوص "مگر مجنوں نہیں ہوگا" بہت خوبصورت ترجمہ ہے۔

————— خالد محمود

مثنوی رنجیت رانی رمبھا

قیمت : ۵ روپے۔ ملنے کا پتہ : اقدار کتاب گھر ۲۵/اے شمس الہدیٰ روڈ۔ کلکتہ ۱۷،

"مثنوی رنجیت رانی رمبھا" امیر حسن کی تصنیف ہے جو سیوان (بہار) کے رہنے والے تھے۔ امرا میری (ریسرچ فیلو۔ کلکتہ یونیورسٹی) نے اسے ترتیب دیا ہے۔ ان کا یہ کام یقیناً لائقِ ستائش ہے کیونکہ اس شاعر اور اس مثنوی سے اردو ادب کا عام قاری اب تک ناواقف تھا۔ مثنوی پڑھنے کے بعد یہ ماننا پڑتا ہے کہ یہ نظر انداز کیے جانے کے لائق نہیں ہے مثنوی کا مرکزی خیال "نیرنگِ خیال" لاہور میں شائع شدہ ایک افسانے سے ماخوذ ہے۔ جس کی نشاندہی مرتب نے کی ہے۔ مثنوی کا ماخذ کچھ بھی ہو زبان و بیان پر مرزا شوقؔ کا خاصا اثر پایا جاتا ہے :

رات دن بیقرار ہوں تجھ بن
غمزدہ سوگوار ہوں تجھ بن

سانس لینا محال ہے مجھ پر
زندگانی وبال ہے مجھ پر
گاہ غم گاہ دردِ سینہ ہے
ایسا جینا بھی کوئی جینا ہے
تیرے دم تک تھی زندگی کی بہار
گل بھی ہے اب نظر میں تجھ بن خار

مرتب کا کہنا ہے کہ امیر حسن اردو عربی اور فارسی پر اچھی دسترس رکھتے تھے "ہندی الفاظ پر اضافت لگانے کا رواج ان کے یہاں عام ہے۔ ممکن ہے ایسا انھوں نے اجتہاد پسندی کی بنا پر کیا ہو"۔ لیکن "راجگانِ جہاں" تک تو اسے "اجتہاد پسندی" مانا جاسکتا ہے "پھولِ سرسوں" اور "سزائے پھانسی" تک نہیں بعض جگہ تذکیر و تانیث میں امتیاز نہیں کیا ہے :

کہتی رنجیت سے ہے یوں امبھا
آج مجھ کو فلاتی گیت سُنا

ہو سکتا ہے کہ یہاں عام بول چال کو امیر حسن نے سامنے رکھا ہو۔ بہار اور مشرقی یوپی میں عموماً گیت "گائی جاتی ہے" (بول چال کی حد تک) مثنوی میں ایک "اچھوت" لڑکے اور برہمن لڑکی کے عشق کی داستان بیان کی گئی ہے اسکول میں نئے زمانے کی آہٹ سُنائی دیتی ہے کیونکہ برہمن زادی میں "اچھوت" کے عشق میں گرفتار ہوتی ہے جاگیردارانہ نظام کے خلاف خاموش احتجاج جگہ جگہ جھلکتا ہے مثنوی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ مقامی فضا اور موسموں کی اچھی عکاسی کی گئی ہے۔

سرورق خوبصورت ہے کتاب آفسیٹ پر چھپی ہے۔ کہیں کہیں کتابت کی معمولی سی غلطیاں رہ گئی ہیں جنھیں نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔

————— معین اعجاز

بزمِ احباب

● اُردو کا ایک مشہور شعر ہے ؎

تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو
رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے

کہا جاتا ہے کہ یہ میر تقی کا شعر ہے (مگر اُن کے کلیات میں شامل نہیں) اس روایت کی تصدیق ۱۸۷۱ء کے ایک فارسی خط سے بھی ہوتی ہے۔ مکتوب نگار شریف العلما سید شریف حسین خلف ارسطو جاہ نے اپنے بڑے بھائی کو ۲۹ ذی الحجہ ۱۲۸۷ھ مطابق ۲۱ مارچ ۱۸۷۱ء کے ایک مکتوب میں حیدرآباد سے تحریر کیا ہے۔

"..... بامیر انیس صاحب اکثر مجالست می باشد... میر انیس دو شعر میر تقی خواند چونکہ نہایت خوب گفتہ است عرض می شود ؎

تیری گلی میں ہم نہ چلیں اور صبا چلے
یونہی خدا جو چاہے تو بندے کا کیا چلے
تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو
رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے"

لیکن پہلا شعر خفیف سے لفظی تغیر کے ساتھ خواجہ میر کا ہے اس لیے دوسرے شعر کا میر تقی میر سے انتساب مشکوک ہو گیا۔ صرف اتنی بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ یہ شعر مذکورہ خط کی تاریخ تحریر ۲۱ مارچ ۱۸۷۱ء سے بہر حال پہلے کا ہے۔

قارئین میں کسی صاحب کے علم میں ہو تو مطلع فرمائیں کہ یہ کس کا شعر ہے۔ کتاب کا حوالہ ضرور دیا جائے۔

شبیر علیخاں شکیب ایڈوکیٹ ڈسٹرکٹ کورٹ امیر

● "تحریک" کے نئے شمارے (جون ۱۹۷۷ء) میں نسیم آذر صاحب کا مراسلہ نظر سے گزرا جس میں انھوں نے باقی کی غزل کے وزن پر حیرت کا اظہار کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ "آہنگ" ہئیت کا ایک لازمی عنصر ہے۔ شعری آہنگ" کے تجربوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جو مروجہ اوزان و بحور کے دائرے میں کیے گئے ہیں اور جنھیں "توسیعِ روایت" کا نام دیا جا سکتا ہے۔ دوسرے وہ جو ہندی چھندوں اور دوسری زبانوں کے ادب کے زیرِ اثر ہوئے ہیں۔ باقی کا نام اس صف میں شامل ہے جو "توسیعِ روایت" یا تسلسلِ روایت کا فرض انجام دے رہی ہے۔ باقی کے ساتھ، صغیر احسنی، شمس الرحمٰن فاروقی، مخمور سعیدی اور زیب غوری کا نام بھی لیا جا سکتا ہے۔ مثلاً :

صغیر احسنی

شعر۔ مری دنیائے دل کیوں آج ہی زیر و زبر معلوم ہوتی ہے
زہے قسمت کہ ان کی ملتفت مجھ پر نظر معلوم ہوتی ہے

وزن۔ مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن
مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن

بحر۔ بحر ہزج معشر سالم (اردو میں یہ بحر مثمن صورت میں رائج ہے۔ اس کو معشر انداز میں برتنے کا عمل تجربہ ہے)

باقی

شعر۔ اپنے سینے میں کہیں میری وفا محفوظ کر لے
میں کہوں تیرا ہوں میں میرا کہا محفوظ کر لے

وزن۔ فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن
فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن

بحر۔ رمل مثمن سالم (یہ بحر بھی اُردو میں مستعمل نہیں اس لیے "تجربہ" ہے)

شمس الرحمان فاروقی

شعر: عزیز تھا لیکن، پر غرور سر تو نہ تھا
حقیر تھا پھر بھی خاکِ رہ گزر تو نہ تھا

وزن: مفاعلن مفعولن مفاعلن فعِلن
مفاعلن مفعولن مفاعلن فعِلن

بحر: مجتث مجنون محذوف یا مشعت محذوف (یہ بحر بھی مستعمل نہیں ہے اس لیے تجربہ ہے)

کتب عروض و بلاغت میں ایسی بحروں کو نامطبوع کہا گیا ہے جو عام طور پر مستعمل نہیں ہیں مندرجہ بالا تجربوں کا نسب نامہ "نامطبوع بحروں" سے ملتا ہے ان تجربوں پر اس انداز سے گفتگو ہونی چاہیے کہ کیا آہنگ کا یہ انداز شاعر کے شعری تجربوں کی خارجی نقش گری کی صورت میں وجود پذیر ہوا ہے اور کیا یہ آہنگ شاعر کے شعری تجربے کے اظہار کے لیے واقعی ناگزیر تھا۔ اگر ایسا ہے تو آہنگ کے یہ تجربے اپنا "جواز" رکھتے ہیں۔ اگر نہیں تو پھر یہ تجربے عروض دانی اور قادر الکلامی کے مظہر ہیں۔ اور ان کا رشتہ "ناسخیت" سے مل جاتا ہے۔ اس دور میں بعض شاعر (جدید شاعر بننے کے شوق میں) اپنی عروض دانی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ اور زبان نیز اسلوب کی سطح پر بھی "ناسخیت" کا اعادہ کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں "زرد زرخیز" کا نام لیا جاسکتا ہے۔ لیکن مخمور سعیدی، بانی اور بعض دیگر شعراء کے تجربے جینوئن معلوم ہوتے ہیں۔

——— عنوان چشتی

شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵

● تازہ شمارے میں وارث علوی نے گرچہ 'تحریک' کی تقریباً آدھی ضخامت کو گھیر لیا ہے لیکن ان کا مضمون اس لائق ہے کہ طوالت کے باوجود تمام لوگ پڑھیں گے اور بہت دنوں تک یاد کیا جاتا رہے گا۔ وارث کا مضمون بلاشبہ اس مرتبہ حاصل تحریک کہا جاسکتا ہے۔ طوالت تو خیر وارث علوی کے قلم کا خاصہ ہے تاہم وہ اپنے مضامین میں کہیں بھی جگہ عبادت بریلوی نظر نہیں آتے۔ حفیظ صاحب کی غزل ان کے اپنے مخصوص انداز کی اچھی غزل ہے۔

——— فاروق شفق، جی/۱۲ دھن کھیتی، گارڈن ایچ روڈ، کلکتہ

● 'تحریک' کا تازہ شمارہ سامنے ہے ——— وارث علوی نے سوالنامے پر کھلے دل سے اظہار خیال کیا ہے۔ ان کا 'خیال نامہ' طویل سہی، لیکن بیان کی لطافت، مطالعے کی فراوانی اور متوازن رائے اسے بار خاطر نہیں ہونے دیتی ہے ——— عظیم اقبال کی شناخت ان کی منفرد طرز نگارش کی شناخت ہے۔ کہانی کے اختتام پر ایک نامعلوم سی کسک، ایک لطیف سے درد کا احساس ہوتا ہے۔ جذبات نگاری عروج پر ہے ——— مجتبیٰ حسین کا خاکہ دلچسپ ہے۔ کمار پاشی کو 'سنجیدگی اور آوارگی' کے پنڈدم سے باندھ کر مجتبیٰ نے ہمیں بھی کمار کا ہمراز بنا لیا ہے ——— صفدر، چندر کھا خیال، اور حفیظ آتش کی نظمیں تنوعِ فکر سے معمور ہیں ——— بزرگ شاعر حفیظ جالندھری اور کرشن موہن کی غزلیں پیاری ہیں۔

——— ایم۔ ایم۔ وفا، گنج ۲، بتیا، مغربی چمپارن

● 'تحریک' کے تازہ شمارے میں کئی چیزیں بہ طور خاص پسند آئیں گوپال متل صاحب نے اپنے مضمون میں اس بنیادی تضاد کی بڑے دل نشین انداز میں وضاحت کی ہے جو کمیونسٹ نظام اور جمہوری نظام کے مابین پایا جاتا ہے ستیہ پرکاش کا مضمون روسیوں کی موقع پرستی کو جس طرح ظاہر کرتا ہے۔ اُس سے اِس پروپیگنڈے کا ابطلان ہوتا ہے کہ روسی بین الاقوامی سیاست میں اصول پسندی کے قائل ہیں ——— سوالنامے پر اس بار صرف وارث علوی کا اظہار خیال شامل ہے لیکن یہ سیر حاصل ہے۔ پھر مجتبیٰ حسین کا کمار پاشی پر لکھا ہوا دلچسپ خاکہ اور سب سے آخر میں "بتشکن" اور "صحیفہ" پر مخمور سعیدی کا تبصرہ جو ان کتابوں کا تعارف تو کراتا ہی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ وضاحت بھی پیش کرتا ہے کہ کسی بھی جابرانہ نظام حکومت کے تئیں سچّے ادیبوں کا کیا رویّہ ہونا چاہیے۔ یہ نکتہ ہر ملک اور ہر زبان کے ادیبوں کے لیے لمحۂ فکریہ فراہم کرتا ہے جن میں اردو کے ادیب بھی شامل ہیں۔ جن میں سے بیشتر نے ایمرجنسی کے دور میں ایسے طور طریقے اپنائے جن کا کوئی جواز پیش نہیں کیا جاسکتا۔

——— ہرچرن داس سیٹھی، لوکو فیلڈ، گنگا پور سٹی

پنجاب اور آندھرا کی لائبریریوں کے لیے منظور شدہ

ماہنامہ

تحریک

نئی دہلی

شمارہ: ۵ جلد: ۲۵

اگست ۱۹۷۷ء

ادارۂ تحریر:

گوپال متّل ☆ مخمور سعیدی

پریم گوپال متّل

سالانہ قیمت، پندرہ روپے، فی کاپی: ایک روپیہ ۲۵ پیسے

بیرونی ممالک سے

(بحری ڈاک سے)

سالانہ: دو پونڈ فی کاپی: چار شلنگ

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتا:

منیجر ماہنامہ تحریک، ۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۲-۱۱

پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر

گوپال متّل

مطبع: نعمانی پریس دہلی

مقامِ اشاعت: ۹ انصاری مارکیٹ، دریا گنج نئی دہلی ۲-۱۱۰۰۰

مندرجات:

اُردو کا مسئلہ ـــــ جنتا پارٹی اور کانگریس

گوپال متل

وزیرِ اعظم جناب مرارجی ڈیسائی نے اُردو کے بارے میں فرمایا کہ اسے کسی بھی ریاست کی ثانوی سرکاری زبان نہیں بنایا جا سکتا۔ ساتھ ہی انھوں نے اُردو والوں پر یہ طعن بھی کیا کہ وہ اپنی زبان کے لیے جو درجہ مانگ رہے ہیں وہ اس کی حیثیت سے کم ہے کیونکہ یہ تو کل ہند زبان ہے۔

وزیرِ اعظم کا یہ بیان پڑھا تو مجھے پروفیسر خورشید الاسلام کی ایک نظم بے ساختہ یاد آگئی جو اس طرح ہے:

جب کوسوں
پانی کی ایک بوند
دکھائی نہیں دیتی تو میں
اس خیال سے خوش ہو لیتا ہوں
کہ دریا میرا میزبان ہے

شاعر کو کوسوں تک پانی کی ایک بوند بھی دکھائی نہیں دیتی تو وہ خود کو اس خوش فہمی سے تسلی دے لیتا ہے کہ کہیں نہ کہیں دریا اس کی میزبانی کے لیے تیار ہوگا۔ اسی طرح وزیرِ اعظم صاحب اردو والوں کو بھی اس فریب میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں کہ اگرچہ کسی صوبے میں ان کی زبان کی کوئی سرکاری حیثیت نہیں ہوگی لیکن یہ ایک کل ہند زبان ہے۔

شاعر کی خوش فہمی کے ازالے کی صورت شاید کبھی پیدا نہ ہو کیونکہ وہ خواب و خیال کی دنیا میں رہتا ہے۔ لیکن اُردو والوں کی خوش فہمی کا ازالہ جلد ہی ہو گیا جب یوپی اسمبلی کے تیرہ ممبروں نے اُردو میں حلف لینا چاہا اور انھیں اس کی اجازت نہیں دی گئی۔ ان کا یہ مطالبہ بھی ٹھکرا دیا گیا کہ اوّل وہ اُردو میں حلف لیں اور پھر ہندی میں۔

وزیرِ اعظم اور جنتا پارٹی کے دوسرے لیڈروں نے اُردو کے بارے میں جو رویّہ اختیار کیا ہے اس پر کوئی خاص احتجاج نہیں ہوا جس کی وجہ ہمارے خیال میں یہ ہے کہ اُردو والوں نے اپنی ہار قبول کر لی ہے۔ اس اعترافِ شکست کا کچھ جواز بھی ہے۔ کیونکہ اُردو کے بارے میں نئی حکومت کی پالیسی سابقہ حکومت کی پالیسی سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ فرق اگر کچھ ہے تو لہجے کا ہے ۷۶ء میں اُردو ایڈیٹرز کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کی ایک میٹنگ ہوئی تھی۔ میں نہ کانفرنس کا ممبر تھا نہ اس کی ورکنگ کمیٹی کا لیکن خصوصی دعوت پر مجھے میٹنگ میں شرکت کا موقع ملا۔ اکثر شرکاء یہ کہہ رہے تھے کہ اب اُردو کو اس کا جائز مقام ملنے میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آنی چاہیے۔ مضمراً ان کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال موجود تھا کہ حکومت اُردو کو اس کا حق دینا چاہتی تھی لیکن مخالفت کے ڈر سے خاموش تھی۔ اب جبکہ ایمرجنسی نے مخالفوں کی زبان بند کر دی ہے اُردو کو اس کا حق ضرور مل جائے گا۔ اسی بنا پر میرے اس مشورے کو کہ کانفرنس کو سیاسی

(۱) اس سوال پر تفصیلی اظہارِ خیال مدیرہ وجہ نہیں کیا جا سکا کہ "مانگے کا اُجالا" میں "ندائے ملت" لکھنؤ کا اداریہ نقل کیا جا رہا ہے جو اسی سوال سے متعلق ہے۔

ریزولیشن پاس نہیں کرنے چاہئیں در خور اعتنا نہ سمجھ کر ایمرجنسی کے حق میں قرارداد بھی پاس کر دی گئی۔ ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ کے بعد شرکاء کو مسز اندرا گاندھی سے ملاقات کرنا تھی۔ میں نے دیگر مصروفیات کی بناء پر اس سے معذرت چاہی لیکن جو لوگ وہاں گئے تھے ان کی زبانی معلوم ہوا کہ جب اردو کو کچھ ریاستوں میں ثانوی سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ پیش کیا گیا تو مسز گاندھی نے صاف کہہ دیا کہ ایسا نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اگر ایسا کیا گیا تو اکثریت ناراض ہو جائے گی۔

اردو بولنے والے سب سے زیادہ یوپی میں ہیں یہاں کے سابق وزیر اعلیٰ کملا پتی ترپاٹھی نے بھی اپنے دور حکومت میں اتر پردیش اردو اکادمی کے جلسے میں دو ٹوک کہہ دیا تھا کہ اردو کو ثانوی سرکاری زبان قرار دیے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ پنڈت آنند نرائن ملا نے بھی جو اکادمی کے صدر تھے ترپاٹھی کی ہاں میں ہاں ملائی اور اس کے بعد بھی وہ اردو تحریک کے قائد بنے رہے۔

۷۷ء کے اسمبلی انتخابات سے پہلے انجمن ترقی اردو دہلی میں اپنی سالانہ کانفرنس منعقد کرنا چاہتی تھی۔ تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ استقبالیہ کمیٹی کا چناؤ بھی ہو چکا تھا جس میں میں نائب صدر تھا۔ ایک میٹنگ میں فنڈز کی فراہمی کا مسئلہ زیر غور تھا۔ ملا صاحب نے فرمایا کہ فنڈز کی فکر نہیں کرنی چاہیے۔ میری اپنی تجویز یہ تھی کہ فنڈز کسی ایک طرف سے نہیں آنے چاہئیں اور استقبالیہ کمیٹی کے ممبروں کو مل جل کر ان کی فراہمی کرنا چاہیے۔ اس کے بعد دوسرے امور پر بحث ہوئی۔ ملا صاحب نے یہ تجویز پیش کی کہ کانفرنس کا افتتاح مسز گاندھی سے کرایا جائے اس تجویز کی میں نے سرگرم مخالفت کی۔ اس بنا پر نہیں کہ مجھے کانگریس سے عناد تھا۔ میرا کہنا یہ تھا کہ اردو کو اگر اس کا جائز حق نہیں مل رہا تو اس کے لیے حکومت ہی ذمہ دار ہے۔ اور اسی سے اردو والوں کو بجا طور پر شکایت ہو سکتی ہے۔ اس صورت میں وزیر اعظم سے کانفرنس کا افتتاح کرانا قابل جواز نہیں۔ میری تجویز کی کچھ لوگوں نے مخالفت کی کچھ نے حمایت۔ لیکن ملا صاحب نے قریب قریب حاکمانہ انداز میں فرمایا کہ کانفرنس کا افتتاح وزیر اعظم ہی کریں گی۔ میں نے بھی پورے زور سے کہا۔ کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس پر خلیق انجم نے جو ان دنوں آنند نرائن ملا کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ فرمایا کہ میں کیا کروں گا؟ میں نے کہا صرف اتنا کہ استقبالیہ کمیٹی کی نائب صدارت سے مستعفی ہو کر کانفرنس کے دن ایک احتجاجی جلوس لے کر وہاں پہنچ جاؤں گا۔ پروفیسر آل احمد سرور نے ماحول میں کچھ اعتدال پیدا کیا۔ اس کے بعد استقبالیہ کمیٹی کی کچھ میٹنگیں بھی ہوئیں لیکن کانفرنس کا مسئلہ التوا میں پڑتا گیا۔ یہاں تک کہ انتخابات ختم ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد ملا صاحب کے نزدیک کانفرنس کی افادیت ختم ہو گئی تھی چنانچہ وہ آج تک نہیں ہوئی اور جن لوگوں نے استقبالیہ کمیٹی کی رکنیت کی فیس دی تھی نہ وہ انہیں واپس کی گئی نہ ان وجوہ سے انہیں آگاہ کیا گیا جو کانفرنس کے التوا کا باعث بنی تھیں۔

اردو کے تحفظ کے لیے انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام دلی میں کانفرنس ۱۹۵۸ء میں بھی ہوئی تھی۔ کانفرنس کے سرگرم حامیوں میں مولانا حفظ الرحمن مرحوم بھی شامل تھے۔ ان کے اثر و رسوخ کی بدولت سیاسی لیڈروں نے کانفرنس میں شرکت منظور کر لی تھی اور جب پنڈت جواہر لال نہرو نے کانفرنس کے افتتاح کی درخواست قبول کر لی تو اعیانِ کانفرنس کی پُر امیدی کی کوئی حد نہ رہ گئی۔ برسر اقتدار پارٹی کی تائید و حمایت کی موجودگی میں آخر کار فرقہ پرست پارٹیاں یا افراد نیم براعظم کی اس نفیس ترین زبان کی ترقی میں کیا رکاوٹ ڈال سکتے تھے؟

لیکن کانفرنس کے آغاز کے ساتھ ہی انالہ کر کا

سلسلہ شروع ہو گیا۔ پنڈت نہرو نے اپنی افتتاحی تقریر کی ابتدا یہاں سے کی کہ وزیر اعظم کی حیثیت سے نہیں بلکہ نجی حیثیت میں یہاں تقریر کر رہے ہیں۔ ملک کے قومی پریس نے کانفرنس کی کارروائی کی وسیع پیمانے پر اشاعت کی لیکن اہمیت کانفرنس کے اسی ریزولیشن کو دی جس میں ہندی کو ملک کی مسلمہ قومی اور سرکاری زبان تسلیم کیا گیا تھا۔ وہ ریزولیشن جن میں اردو کے تحفظ کے مطالبے پیش کیے گئے تھے، جس کے لیے یہ کانفرنس بلائی گئی تھی، قومی اخباروں کے لیے زیادہ قابل توجہ نہیں تھے۔

تاہم یہ باتیں شاید ایسی نہ تھیں کہ داعیانِ کانفرنس کی امیدوں کو پست کر سکتیں۔ وہ بدستور یہ باور کیے رہے کہ پنڈت نہرو جلد ہی اردو زبان کو اس کا حق دلوا دیں گے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے پنڈت نہرو کے فوراً بعد تقریر فرمائی اور کانفرنس کے شرکاء کو باور کرایا کہ اردو کے کاز کی حمایت ملک کے وزیر اعظم ہی نے کی ہے۔ کانفرنس کی تمام تقریروں کا خاص موضوع یہی رہا کہ اگر اردو کے حامی برسر اقتدار پارٹی اور اس پارٹی کے اندر پنڈت نہرو کے حامیوں کے ہاتھ مضبوط کریں تو اقلیتوں کے تمام مسائل جن میں اردو کا مسئلہ بھی شامل ہے بخیر و خوبی حل ہو جائیں گے۔

اس کے بعد ملک میں بہت کچھ ہوا۔ کانگریس کے اقتدار میں اضافہ ہوتا گیا اور پنڈت نہرو کو تو وہ اثر و اقتدار حاصل رہا جس کا کوئی جمہوری لیڈر بمشکل ہی خواب دیکھ سکتا ہے۔ لیکن اقتدار کے اس ارتکاز سے اردو کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا اور جب پنڈت جواہر لال نہرو کا انتقال ہوا تو اردو کی حالت ۱۹۵۸ء کے مقابلے میں، جب انھوں نے آل انڈیا اردو کانفرنس کا افتتاح کیا تھا، ابدتر تھی۔

پھر مسز گاندھی برسرِ اقتدار آئیں لیکن جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے اقتدارِ مطلق حاصل کرنے کے باوجود انھوں نے اردو کے لیے کچھ نہیں کیا۔

اردو کے سلسلے میں یسار یت اور یمینیت کی بحث بھی بیکار ہے۔ ڈاکٹر رام منوہر لوہیا سوشلسٹ تھے لیکن اردو کے سخت مخالف۔ کمیونسٹوں کو مجمع بازی کا فن خوب آتا ہے لیکن تان ان کی بھی ہمیشہ اردو مخالفت پر ٹوٹتی ہے۔ ڈاکٹر دھرم ویر بھارتی کا بیان ہے کہ ۱۹۴۷ء کے فوراً ہی بعد اردو کے کمیونسٹ ادیبوں نے اردو کے لیے دیوناگری رسم الخط کی حمایت شروع کر دی تھی۔ ۱۹۷۰ء میں اردو کے کمیونسٹ ادیبوں نے ہندی والوں کے ساتھ جو معاہدہ کیا اس میں واضح طور پر مانا گیا تھا کہ یوپی کی واحد سرکاری زبان ہندی ہو گی۔ بعد میں جب اردو والوں نے مظاہرے کیے تو ان لوگوں نے حوصلہ ہار دیا۔ اور آئیں بائیں شائیں کرنے لگے۔ لیکن راسخ العقیدہ کمیونسٹ ادیب پھر بھی فارسی رسم الخط کو خیر باد کہنے اور ہندی لپی اختیار کرنے پر مصر ہے۔ اسی برس انڈیا انٹرنیشنل سنٹر میں اردو زبان کے مسئلے پر ایک سیمینار ہوا تھا جس میں رضیہ سجاد ظہیر نے حامیانِ اردو پر جارحانہ عقیدہ پرستی کا الزام لگایا اور ان سے پوچھا تھا کہ وہ دیوناگری لپی اختیار کرنے سے کیوں خائف ہیں؟ اردو کو یوپی کی ثانوی سرکاری زبان بنانے کے مطالبے کی انھوں نے یہ کہہ کر مخالفت کی تھی کہ اس سے مہاراشٹر، گجرات اور دوسرے صوبوں میں اردو کے مفاد کو نقصان پہنچے گا۔ یہ تقریباً وہی بات ہے جو مرارجی ڈیسائی نے اپنے بیان میں کہی ہے۔

اردو کا مشہور شعر ہے:

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
اس کے کوچے میں سب حقیر ہوئے

حمایت اردو کے معاملے میں تقریباً سبھی سیاسی پارٹیوں کا یہی حال ہے۔ موجودہ وزیر صحت جناب راج نرائن کبھی کبھی بے تکلفی میں پتے کی بات کہہ جاتے ہیں۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے ملک زادہ منظور احمد کے بیان کے مطابق انہوں نے یوپی کے کسی شہر میں اپنی تقریر میں کہا تھا:

یوپی کے دیہات اور قصبات میں لوگوں کے پاس ایک ہی شیروانی ہوتی ہے جو صندوق میں بند رہتی ہے شادی بیاہ یا کسی اور تقریب کے موقع پر یہ نکال کر پہن لی جاتی ہے اور اس کے بعد پھر صندوق میں رکھ دی جاتی ہے۔ حمایتِ اردو بھی اسی قسم کی شیروانی ہے جسے سیاسی پارٹیاں انتخابات کے موقع پر پہن لیا کرتی ہیں اور پھر اتار کر صندوق میں رکھ دیتی ہیں۔

تو کیا اردو کی بقا کے لیے جدوجہد کی کوئی گنجائش نہیں؟ ہمارا خیال ایسا ہرگز نہیں۔ اردو تحریک کی ناکامی کا سبب یہ ہے کہ اردو والے واہموں میں مبتلا رہے ہیں اور انھوں نے حقائق کا احترام نہیں کیا۔ ملک میں سیکولر اور سوشلسٹ رجحانات کو تقویت دینا اپنی جگہ خواہ کتنا ہی مستحسن ہو لیکن اس سے اردو کے تحفظ کی ضمانت ہرگز حاصل نہیں ہوگی۔ کسی واحد سیاسی پارٹی کے ہاتھ میں مکمل اقتدار پہنچ جانا بھی اقلیتی مفادات کے منافی ہے۔ اقلیتی مفادات کا بہتر تحفظ ایک ایسی ریاست میں زیادہ ممکن ہے جہاں رائے عامہ ایک سے زائد سیاسی پارٹیوں میں قریب قریب مساوی طور پر بٹی ہوئی ہو۔

ایک واہمہ یہ بھی رہا ہے کہ اردو کی ملکیت میں غیر مسلموں کا حصہ کچھ زیادہ بنا دیا جائے تو اردو کا تحفظ از خود ہو جائے گا۔ جہاں تک بطور امر واقعہ اردو کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان ہونے کا تعلق ہے، اس سے نہ کبھی انکار رہا ہے اور نہ آئندہ کبھی ہوگا۔ لیکن جہاں تک اردو کے تحفظ کا تعلق ہے بہر حال یہ ضروری ہے خواہ یہ مسلمانوں کے بہتر فرقوں میں سے بھی صرف ایک فرقے کی زبان ہو اور دستور میں اس کی گنجائش موجود ہے۔ ان سطور کا مطلب صرف اتنا ہے کہ بے عمل لوگوں کو صرف اس بنا پر تحریک کا قائد نہیں بنانا چاہیے کہ وہ غیر مسلم ہیں۔ ہر تحریک کو کامیابی سے چلانے کے لیے اس کے ساتھ جذباتی وابستگی ضروری ہوتی ہے جو شخص بھی اس وابستگی اور سرگرمی کا ثبوت دے سکے اسے تحریک میں آگے آنے دینا چاہیے اور بے عمل لوگوں کو صرف غیر مسلم ہونے کی بنا پر بغیر استحقاق آگے بڑھانے کی روش ترک ہونی چاہیے۔

اس وقت تک ہم کچھ ایسا بھی سمجھتے رہے ہیں جیسے اردو کا مسئلہ چند حکام اور لوگوں کی سفارش سے حل ہو جائے گا۔ ہم یہ بھول گئے کہ حکام کی کشتہ مصلحت بنانے کی اہمیت بھی رکھتی ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ لوگ اردو تحریک کے زور پر آگے بڑھیں اور اس کے بعد اردو کے مطالبات کی تکمیل کے بجائے ذاتی مفادات کے حصول میں مصروف ہو جائیں۔

جن تحریکوں کی پشت پر مقاصد کا واضح شعور اور متحدہ آواز نہیں ہوتی ان کا حشر اکثر یہی ہوتا ہے لہٰذا اگر اردو کا تحفظ واقعی مقصود ہے تو اس کی پشت پر متحدہ رائے عامہ ضرور ہونی چاہیے اور اس رائے عامہ کو اتنا فعال ہونا چاہیے کہ وہ تحریک کے لیڈروں کا محاسبہ بھی کرتی رہے۔

اردو شاعری میں ہیئت کے تجربے کے بعد

ڈاکٹر عنوان چشتی کی نئی کتاب

اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت

جس میں ہند و پاک کے صدہا شاعروں کے کلام کا تجزیہ کر کے جدیدیت کی بنیادی خصوصیات کا تعین کیا گیا ہے۔
اپنے موضوع پر پہلا تنقیدی و تحقیقی کارنامہ

قیمت: عام ایڈیشن ۲۰ روپے
ڈی لکس ایڈیشن ۴۰ روپے

ملنے کا پتہ:
نیشنل اکادمی۔ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۲

ہم سے طلب کیجیے

اقبالؒ کی شخصیت، ان کی شاعری اور ان کے فلسفے پر پانچ فکر انگیز کتابیں

خطوطِ اقبالؒ اپنے عہد کی اہم شخصیتوں کے نام اقبال کے ایک سو گیارہ خطوط جواب تک مدون ہو کر منظر عام پر نہیں آئے تھے۔ اقبال کی شخصیت کے ساتھ ساتھ اُن کے عہد کو سمجھنے کے لیے بھی یہ خطوط ایک بڑا وسیلہ ہیں۔ مرتب: رفیع الدین ہاشمی، حواشی نے کتاب کی افادیت اور بڑھا دی ہے۔

قیمت: تیس روپے

اقبالؒ شخصیت اور شاعری اقبالؒ کی حکیمانہ شخصیت اور شاعری پر اقبالؒ کے سب سے بڑے قدر شناس اردو کے بلند پایہ ناقد پروفیسر رشید احمد صدیقی کے مضامین کا مجموعہ جس کی قدر و قیمت کا اندازہ آپ اسے پڑھ کر ہی کر سکیں گے۔

قیمت: بارہ روپے

سفرنامۂ اقبالؒ اقبال نے متعدد غیر ملکی سفر کیے تھے اور اس سیاحت نے ان کے فکر و فن پر جو اثرات مرتب کیے، اُن کی اہمیت کا اعتراف سبھی کو ہے۔ اس کتاب میں ان کے ہر سفر کی تفصیل کچھ ان کی اور کچھ ان کے قریبی دوستوں کی زبانی بیان ہوئی ہے۔ انتہائی معلومات آفریں اور انتہائی دلچسپ کتاب،

مرتب: حق نواز۔

قیمت: پچیس روپے

اقبالؒ، ایک تجزیاتی مطالعہ اقبالؒ کے اندازِ فکر کے مختلف اہم پہلوؤں کا تجزیہ۔ لکھنے والوں میں پرانے اور نئے کئی اہم نقادوں کے نام شامل ہیں۔ ہر نقاد نے کسی ایک پہلو پر قلم اٹھایا ہے اور اس کے تمام مضمرات سے عالمانہ بحث کی ہے۔

مرتب: سید معراج نیّر۔

قیمت: پندرہ روپے

قرآن اور اقبالؒ اقبالؒ کے افکار کا بنیادی سرچشمہ قرآنی تعلیمات ہیں۔ یہ کتاب اس خیال کی مدلل توثیق کرتی ہے اور اقبالؒ کے خطوط، اُن کے خطبات اور ان کی شاعری میں جہاں جہاں قرآن مجید کے حوالے آئے ہیں وہ سب فاضل مرتب ابو محمد مصلح نے اس میں یکجا کر دیے ہیں۔

قیمت: اٹھارہ روپے

ہر کتاب ڈمائی سائز میں فوٹو آفسیٹ کے ذریعے سفید خوشنما کاغذ پر شائع کی گئی ہے

نیشنل اکاڈمی، ۹۔ انصاری مارکیٹ، دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

کرشن موہن | غزل

زیب دیتی ہے تجھے توصیف اپنی
شاعر خوش فکر کر تعریف اپنی

دور کر دیتی ہے ہر تکلیف اپنی
قلب کی تالیف ہے تصنیف اپنی

آپ کرتے ہیں جو یوں تعریف اپنی
ہم سمجھتے ہیں اِسے تخفیف اپنی

حسن کے الطاف کی توصیف اپنی
عشق کے اوصاف کی تصریف اپنی

اپنے اعمالِ نکوہیدہ کے باعث
ہم نے کر لی آپ ہی تخویف اپنی

ہر نفس اہلِ ہوس کا سامنا ہے
زندگی ایثار کی توقیف اپنی

غیر کی تصنیف میں تنصیف کر کے
ہم بنا لائے ہیں اک تالیف اپنی

جو ہجومِ مہ وشاں میں گھومتے تھے
لائے ہیں وہ آج بس تشریف اپنی

صدر ہیں ہم آج اقلیمِ سخن کے
ہم نے کر لی آپ ہی تحلیف اپنی

نیک و بد میں بٹ گئے ہم کٹ گئے ہم
کب ہمیں تسلیم تھی تنصیف اپنی

کرشن موہن ہم زباں کے مجتہد ہیں
گوہرِ تاباں ہے ہر تحریف اپنی

غزلیں

بشر نواز

سب مناظر فسوں تماشا ہیں
کل گھٹائیں تھیں آج دریا ہیں

جانے ہونٹوں کو ہے طلب کس کی
ایک مدت سے تشنہ تشنہ ہیں

کوئی یادوں سے جوڑ لے ہم کو
ہم بھی اک ٹوٹتا سا رشتہ ہیں

ناؤ جیسے بھنور میں چکرائے
اب بھی آنکھوں میں خواب زندہ ہیں

بے تحاشہ ہواؤں سے پوچھیں
راستے کس سفر کا نوحہ ہیں

دھند اوڑھی نگاہیں کیسی ہیں
سانس لیتے ہوئے کھنڈر کیا ہیں

دو گھڑی اس طرف بھی ابرِ رواں
جلتے صحرا کا ہم بھی حصہ ہیں

مظفر حنفی

خوش ہیں یا بے حال پرندے
زخمی ہوں گے لال پرندے

آخر دانا پھر دانا ہے
دیکھ چکے تھے جال پرندے

ہاتھوں میں ریکھائیں بے بس
پنجروں میں رمّال پرندے

نقاروں میں کون سُنے گا
ایسے میں کہہ ڈال پرندے

شکرہ بیٹھا سوچ رہا ہے
یہ جی کے جنجال پرندے

اپنی چالیں بھول چکے ہیں
میرے کچھ نقّال پرندے

آج مظفر یاد آتے ہیں
جنگل، پربت، تال، پرندے

پرکاش فکری

چھوڑ کر پیڑوں کی چھاؤں اب کہاں تو جائے گا
دُور تک بنجر زمیں ہے دیکھنا پچھتائے گا

گھر کے بادل جب بھی برسیں گے اندھیری رات کے
غم پناہیں ڈھونڈنے کو بستیوں میں آئے گا

اپنے ہی سائے سے ڈر کے لوگ جب چھپنے لگے
راستہ پھر خامشی کے درد سے چلّائے گا

سارے منظر اُجلی اُجلی دُھند میں کھو جائیں گے
پربتوں پہ برف ہوگی اور کُہرا چھائے گا

اپنی آنکھوں میں سمیٹیں رنگ یہ فکری تمام
کیا پتہ ہے کب یہ موسم لوٹ کے پھر آئے گا

٭ محلہ گھاٹی، اورنگ آباد۔ ٭ ۳۴۲۔ بٹلا ہاؤس۔ جامعہ نگر، نئی دہلی ٭ ٹورنٹو، درزی محلہ، رانچی ۸۳۴۰۰۲

حمید سہروردی

فاصلے سمٹ سمٹ گئے

فاصلے سمٹ سمٹ گئے
گھڑی کی سوئیاں
ڈائیل پر پھیلتی چلی گئیں
اور پھر
رگ و ریشہ میں اُترتی چلی گئیں
اونٹ کے کوہان میں ریگ ریگ بس گئی
کیا تمام وقت شب کا تھا
سمندروں کی مچھلیاں بے آب ہوگئیں
تو پھر
گھڑی میں کیا بجا ہے اب
ستارے ٹمٹما چلے
عرش و فرش یوں چپک چپک گئے
کہ طاق میں رکھے ہوئے
روشن کتابوں کے ورق پھڑ پھڑا گئے
عالمِ لاہوت میں ناخن اور رنز خرا
ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے
بے لباس لوگ تھے،
جسم جسم ہو گئے
اور پھر
وہ کہاں سے آئے تھے
نقطہ نقطہ ہو گئے
گھڑی میں کیا بجا ہے اب
عالمِ افلاک میں
دھند دھندرا کہو میں
ستارے یوں بکھر بکھر گئے
کہ زمین جسم پر
گندم کے دانے بکھر بکھر گئے
لا مکاں ہو گئے
بے زماں ہو گئے
چور چور ہو گئے
گھڑی کا پنڈولم
پیہم جہد میں
خانہ بدوش ہو گیا
صدائے جرس بند ہے
ایک دھماکہ ہو گیا
نشیب و فراز بھی
ریزہ ریزہ ہو گئے
گھڑی میں کیا بجا تھا جب
اور اب
فاصلے سمٹ سمٹ گئے

لیکچرر اُردو - نوگن کالج - بھیڑ (مہاراشٹر)

نظمیں

اقبال کرشن

زمزمۂ خودی

مرا سر کسی در و آستاں پہ جھکا نہیں
نہ کبھی کسی کو خدا کہا
نہ کبھی کسی کی ثنا پڑھی
نہ قلم کو رہن کیا کہیں
نہ علم کسی کا لیا کبھی
مرا سر کسی در و آستاں پہ جھکا نہیں
سدا اپنے نعرۂ حق سے آپ لگا کے آگ فنا ہوا

▲▲

خالد سعید

نیند ؟!

نیند، اک سرمئی گھنیرا بادل
سفید و سیہ جزیرے پر
ہر طرف اوس چھوڑ جاتی ہے
کسی ملاح کے قدم کی چاپ گنگناتی ہے
نہ پرندہ پر پھڑپھڑاتا ملے جزیرے پر
بس دھندلکا ہے جو سنستاتا ہے
اور
کیچڑ بھرے کناروں پر
اندھی موجوں کا دست کف آلود
چھوڑ جاتا ہے جھاگ کھارا
جس پر دھندلکے کا کوئی نقش نہیں
نیند کا سرمئی گھنیرا بادل
فقط اوس چھوڑ جاتا ہے

خوشتر مکرانوی

خودکشی

زندگی کے نگار خانے میں
کوئی محرم نظر نہیں آتا
سوچتا ہوں کہ اب کدھر جاؤں
موت کے غار میں اتر جاؤں
کوئی پہچان کا ملے شاید

▲▲

خود اعتمادی

میرے بینا لمحوں سے
اکثر ٹکرا جاتے ہیں
بے چہرہ لمحات یہاں
لیکن گھبرا جاتے ہیں
سورج سے مہتاب تغزاد

▲▲

★ نزد نیشنل فلادر اسکول، گلبرگہ　　★ بلجی منزل، مکرانہ، راجستھان۔

ڈاکٹر انجم آرا انجم

چند اُردو الفاظ کی اصلیت اور تاریخ

کسی زبان کے لسانی مطالعے کے دلچسپ پہلوؤں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس کے الفاظ کی اصلیت اور ان کے صوری اور معنوی ارتقا اور تغیرات کی تلاش و تحقیق کی جائے۔ اُردو زبان جس کا ذخیرۂ الفاظ اخذ و اختیار، صیاغت اور تصریفی صلاحیتوں کے تنوع اور بوقلمونی کا ایک شاہکار ہے اس طرح کے لسانی مطالعوں کے نہایت وسیع اور دلکش امکانات کا حامل ہے۔ تاہم یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ اردو کا دامن تحقیق کے ان موتیوں سے ابھی تک خالی خالی سا ہے۔ یقیناً منتشر کوششیں اس خلا کو پر کرنے کے لیے کی گئی ہیں لیکن ابھی تک اردو دنیا اس سلسلے میں ایک ایسی جامع اور وسیع کاوش کی منتظر ہے جس کی بنیاد واقعاتی اور تحقیقی مطالعے پر استوار ہو نہ کہ محض تخیل کی بلند پروازی پر۔ اردو میں اس میدان میں جو بھی کام ہوا اس پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ چند ایک کاوشوں کو چھوڑتے ہوئے باقی سب حقائق و واقعات سے زیادہ خیالوں اور خواہشات کی دنیا کی چیزیں ہیں۔ الفاظ کی اصلیت اور ان کے صوری اور معنوی تغیرات کے مطالعے کی راہ میں سہل انگاری اور ذوقِ تحقیق کی کمی کے علاوہ، دوسرے جو سنگ گراں حائل ہیں، ان میں ایک تو ان زبانوں اور بولیوں میں سے ایک یا متعدد سے ناواقفیت ہے جن کی حیثیت اردو کے ذخیرۂ الفاظ کے لیے سرچشمے کی ہے، مثلاً عربی، فارسی، ترکی، پشتو، سنسکرت، انگریزی، فرانسیسی، ولندیزی، پرتگیزی، کھڑی بولی، برج بھاشا، پراکرت، پنجابی وغیرہ۔ دوسرے خود ان زبانوں یا بولیوں کے ذخیرۂ الفاظ پر، اصل الالفاظ، صوری اور معنوی ارتقا اور لسانیاتی تاریخ کے موضوعات پر جو تحقیقی کام ہوئے ہیں ان کے بارے میں عدم اطلاع ہے تیسرے الفاظ کی سطحی صوتی یا صوری مشابہتوں سے فریب خوردگی بھی انھیں موانع میں شمار کرنے کے لائق ہے جس کی متعدد مثالیں آزاد نے مقدمۂ آبِ حیات میں دی ہیں اور جو تھے محض خیال آرائی سے کام لے کر الفاظ کے مآخذ اور ان کی تشکیل و تصریف کا غلط تعین ہے ابھی کچھ عرصہ ہوا اس سلسلے کی ایک اور کوشش سامنے آئی ہے۔ یہ ہے جناب حسن الدین احمد کی کتاب "اردو الفاظ شماری" کا ایک باب جس کا عنوان ہے "الفاظ تاریخ کی دین ہیں" جو سات صفحوں پر پھیلا ہوا ہے اور جس میں پچاس سے زیادہ الفاظ کی تاریخ کا سراغ یہ کہتے ہوئے لگایا گیا ہے "لیجیے اردو کے چند الفاظ کی تاریخ یا پس منظر پیش ہے۔ اپنی رائے کی تائید میں میں کوئی حوالہ دینے سے اس لیے قاصر ہوں کہ میری تحقیق طبع زاد ہے اور اس کے لیے میں خود ذمہ دار ہوں"۔ ہمیں شاید اس سلسلے میں قلم اٹھانے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی اگر ان کی کتاب کے تبصرہ نگاروں میں سے کسی ایک نے بھی نقد و نظر کی کسوٹی پر کس کر کھوٹے کھرے کو الگ کر دیا ہوتا یا خود جناب مؤلف کا یہ اصرار نہ ہوتا کہ "ہر لفظ کے پس منظر کے تعلق سے میری رائے اس وقت تک درست قرار پانی چاہیے تا وقتیکہ اس کو غلط قرار نہ دیا جائے" اور سب سے بڑھ کر یہ خطرہ نہ ہوتا

۳۔ شبلی روڈ ۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۔ علی گڑھ

کہ اگر حقیقت کو واضح نہ کیا گیا تو "اردو الفاظ شماری" کے قارئین مستقل غلط فہمی میں مبتلا ہو کر رہ جائیں۔ یہ بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ ہماری تنقید کا موضوع فقط مذکورہ باب میں پیش کردہ تحقیقات ہیں نہ کہ بحیثیت مجموعی کتاب "اردو الفاظ شماری" جس کے بارے میں ہمارا بھی یہی خیال ہے کہ اپنے موضوع پر ایک وقیع کوشش ہے اور مفید نتائج کی حامل۔ ہم نے اپنے اس تنقیدی مطالعے میں جناب مؤلف کے پیش کردہ تمام الفاظ پر بحث نہیں کی ہے بلکہ صرف اٹھارہ الفاظ کی لسانی تحقیق پیش کی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں کہ باقی ماندہ تحقیقات سے ہم متفق ہیں۔

۱- بربریت

بربریت کے بارے میں مؤلف "اردو الفاظ شماری" لکھتے ہیں "افریقہ کے ایک قبیلہ کا نام بربر ہے جو ظالم اور سفاک تصور کیا جاتا تھا۔ اس طرح بربریت کے لفظ نے جنم لیا۔" یہ بات سرے سے غلط ہے کہ بربر افریقہ کے کسی ایک قبیلے کا نام ہے۔ یاقوت الحموی نے اپنی کتاب "معجم البلدان" میں 'بربر' کے زیرِ عنوان بتایا ہے کہ بربر ایک ایسا نام ہے جو جبال مغرب میں بسنے والے قبائل کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور بے شمار ایسے قبائل اس نام سے موسوم ہیں جو برقہ سے لے کر آخر مغرب اور بحر محیط تک اور جنوب میں بلاد سودان تک بسے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ہر مقام اس قبیلے کے نام سے موسوم ہے جو اس جگہ سکونت پذیر ہے۔ ان قبائل کے علاقوں کو بحیثیت مجموعی بلادِ بربر کہا جاتا ہے۔ بربر کے نسب کے بارے میں رائیں بہت مختلف ہیں۔ اکثر و بیشتر بربر اپنے آپ کو عربی الاصل سمجھتے ہیں لیکن یہ بالکل غلط ہے۔ 'بربرہ' کے بارے میں یاقوت کا کہنا ہے کہ "یہ کچھ دوسرے علاقے ہیں جو بلادِ حبش و زنج و یمن، ساحل بحر یمن اور بحر زنج کے درمیان واقع ہیں۔ یہاں کے رہنے والے بے حد سیاہ فام ہیں اور ایسی زبان بولتے ہیں جو کسی سے سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ لوگ خانہ بدوش ہیں۔ شکار پر گزر بسر کرتے ہیں اور ان کے علاقوں میں ایسے وحشی جانور پائے جاتے ہیں جو دوسری جگہ نہیں ملتے مثلاً زرافہ، شیر ببر، گینڈا، تیندوا، ہاتھی وغیرہ۔" پھر یعقوب الہمدانی الیمنی کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ "سواحل یمن کے مقابل جو جزائر ہیں ان میں ایک جزیرہ بَربَرہ ہے جو جزیرۂ سقوطرا کے بھی مقابل پڑتا ہے۔" اسی طرح لین (LANE) نے اپنی عربی - انگریزی لغت 'مدّ القاموس' (ARABIC-ENGLISH LEXICON) میں عربی لغتوں مثلاً الصحاح، المغرب، المصباح المنیر اور القاموس کے حوالے سے لفظ 'بربر' کے تحت لکھا ہے کہ "المغرب یعنی مصر کے مغرب میں جو شمالی افریقہ کا علاقہ ہے وہاں کے باشندوں کو البربر کہا جاتا ہے۔ یہاں کے باشندے سختی، کم تر پن، علم کی قلت اور دین کی طرف لاپروائی میں بدو عربوں سے ملتے جلتے ہیں۔" لین نے یہ بھی بتایا ہے کہ اس لفظ کا اطلاق ان اقوام پر بھی ہوتا ہے جو حبش اور زنج کے درمیان آباد ہیں اور ان میں کچھ عجیب و غریب رسمیں رائج ہیں۔ وہ مزید بتاتا ہے کہ البَرابِرۃ کا لفظ جس کا واحد بربری ہے متاخرین مورخین کے یہاں اور موجودہ دور میں بھی ان اقوام کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جو نیل کی وادی کے اس علاقے میں آباد ہیں جسے ہم عام طور پر نوبیا کہتے ہیں۔

لغت نامہ دھخدا میں عربی۔فارسی لغت "منتہی الأرب" کے حوالے سے مذکور ہے کہ 'بربر' مغرب میں آباد بادیوں کو کہا جاتا ہے۔ اسی لغت نامہ میں عربی لغت 'اقرب الموارد' کے حوالے سے لکھا ہے کہ 'بربر' وہ لوگ ہیں جو حبشہ اور زنگ کے درمیان سکونت پذیر ہیں۔ پھر 'غیاث اللغات' کے حوالے سے بتایا ہے کہ 'بربر' حبشہ کے پاس ایک علاقہ ہے جہاں کے لوگ سبز رنگ ہوتے ہیں۔ اس کے بعد تحریر کیا ہے کہ مصر کے مغرب میں شمالی افریقہ کے جو علاقے ہیں یعنی طرابلس، تونس، الجزائر اور مراکش انھیں بربر کہا جاتا ہے۔

آکسفورڈ ڈکشنری میں باربری BARBARY

سے تحت بتایا ہے کہ یہ عربی لفظ "بربرۃ" سے ماخوذ ہے۔ اور عرب جغرافیہ داں قدیم زمانے سے اس لفظ کو شمالی افریقہ کی اقوام کے لیے استعمال کرتے ہیں جو مصر کے جنوب اور مغرب میں بستے ہیں۔ اسی ڈکشنری سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ " باربیری کا لفظ ان مسلمان ملکوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جو افریقہ کے شمالی ساحل پر واقع ہیں اور اب اس لفظ کا کوئی مفہوم اس کے علاوہ باقی نہیں "۔

ان لغوی اور جغرافیائی تفصیلات سے یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ "بربر" کسی ایک خاص قبیلے کا نام نہیں بلکہ ایک وسیع علاقے کے باشندوں کو، جن میں مختلف قومیں، قبیلے اور انسانی گروہ شامل ہیں، اس نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ "بربریت" کا لفظ کیسے وجود میں آیا؟ لگتا بظاہر ایسا ہی ہے کہ "بربر" سے "بربریت" بنا لیا گیا تاہم اگر اس بات کو درست سمجھ بھی لیا جائے تو اس کا کوئی جواب نہیں ملتا کہ "بربریت" میں سفاکی اور درندگی کا مفہوم کہاں سے آیا؟ واقعہ یہ ہے کہ "بربریت" کے لفظ کی تشکیل اتنی سیدھی سادی نہیں۔

آیئے پہلے اس لفظ کے مفہوم کا مطالعہ عربی کے لسانی پہلو سے کریں۔ المصباح المنیر اور القاموس میں بتایا گیا ہے کہ بَرْبَرَ فِی کَلَامِہٖ کے معنی ہیں وہ بہت بولا اور دورانِ گفتگو اس نے اس قدر شور و غل مچایا کہ بات سمجھ میں نہ آئی (بَرْبَرَ ماضی کا صیغہ ہے اس کا مصدر بَرْبَرَۃٌ ہے) المصباح میں یہ تصریح کی گئی ہے کہ بَرْبَرَ کے مفہوم کے سلسلے میں شور و غل کا مطلب صرف اس شور سے ہوتا ہے جس میں زبان استعمال کی گئی ہو۔ بربر کا ایک مفہوم غصہ میں بولنے یا اس طرح بولنے کا ہے جس سے بات سمجھ میں نہ آسکے۔ لین (LANE) نے اس مفہوم کو ظاہر کرنے کے لیے TALK CONFOSEDLY کے الفاظ استعمال کیے ہیں اور بتایا ہے کہ بَرْبَرَ فِی کَلَامِہٖ کا اصل مفہوم یہ ہے کہ آدمی بولے تو بہت مگر اس طرح کہ سننے والے کی سمجھ میں کچھ نہ آسکے کہ متکلم کی مراد کیا ہے۔ اتنی بات بہرحال صاف ہے کہ اس لفظ کا استعمال اسی وقت کیا جاتا ہے جب متکلم کے اندازِ بیان یا زبان کے اُلجھے ہوئے ہونے کی وجہ سے سامع پر اس کی مراد واضح نہیں ہو پاتی اور متکلم گفتگو کے اولین مقصد ابلاغ سے قاصر رہتا ہے۔ یہ بات بھی عیاں ہے کہ جب عدم ابلاغ میں دخل متکلم کی کوتاہی کو ہو نہ کہ سامع کی قلتِ فہم کو تبھی بَرْبَرَ کے لفظ کا استعمال درست ہوگا ورنہ نہیں۔

یاقوت الحموی نے "معجم البلدان" میں بَرْبَرَہ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اور جس خصوصیت کو واضح کیا ہے کہ ان علاقوں کے رہنے والے ایسی زبان بولتے ہیں جو سرے سے سمجھ میں نہیں آتی اس سے خیال ہوتا ہے کہ بلاد حبش و زنج و یمن، ساحل بحرِ یمن اور بحرِ زنج کے درمیان واقع علاقے نیز مغرب کے وہ علاقے جو افریقہ کے شمالی ساحل پر واقع ہیں، جن کے باشندے بعد کو اسلامی فتوحات کے نتیجے میں مسلمان ہو گئے اور جہاں مقامی بولیاں یا زبانیں متروک ہو کر عربی زبان رائج ہو گئی ان سب پر عربوں نے لفظ بَرْبَرَ کا اطلاق شروع میں اسی لیے کیا کہ عرب ان کی زبان کو سمجھ نہ پاتے تھے۔ گویا اس علاقے کے ایک اجنبی زبان بولنے والوں کے لیے انھوں نے بربر کا لفظ استعمال کیا جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ یہ وہ قومیں یا قبیلے ہیں جو عربی زبان استعمال نہیں کرتیں بلکہ ایسی الجھی ہوئی بولیاں یا زبانیں بولتی ہیں جو عربوں کے لیے ناقابلِ فہم ہیں۔ اس قیاس کی تائید ابن خلدون کے اس بیان سے ہوتی ہے جو انھوں نے بَرْبَرْ کا تعارف کراتے اور وجہ تسمیہ بتاتے ہوئے کیا ہے۔ کہتے ہیں "بربر نسلِ انسانی کے اس حصے کا نام ہے جو مغرب قدیم کی باشندہ ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ افریقش ابن قیس بن صیفی جو ملوک تبابعہ میں سے تھا (اور جس کے نام پر، کہا جاتا ہے افریقیا کا نام رکھا گیا) جس نے مغرب اور افریقیا پر فوج کشی کی، ملک جرجیس کو قتل کیا اور بہت سے شہر اور بستیاں بسائیں جب اس نے ان اجنبیوں (اعاجم) کو دیکھا اور ان کی ناقابلِ فہم گفتگو سنی اور ان کی بولیوں کے اختلاف اور تنوع کا اسے علم ہوا تو اسے بڑا تعجب ہوا اور اس کی زبان سے نکلا

مَا اَکْثَرَ بَرْبَرَہ تَکَلُّمُ، یعنی تمہاری بولی کتنی الجھی ہوئی ہے چنانچہ ان لوگوں کا نام ہی بربر پڑ گیا۔ یہ قصہ خود اپنی جگہ واقعہ ہو یا افسانہ تاہم اس سے یہ تو پتہ چلتا ہے کہ اس نسلِ انسانی کی گفتگو عربوں کی سمجھ سے باہر تھی اور انھیں اس سے الجھاؤ اور شور و غل کا احساس ہوتا تھا اس لیے اس زبان کے بولنے والوں کو انھوں نے بربر کہا۔ ابن خلدون نے یہ بھی بتایا ہے کہ عربی زبان میں بَرْبَرَۃٌ ملی جلی اور سمجھ میں نہ آنے والی آوازوں کو کہتے ہیں۔ (ابن خلدون، تاریخ ۶/۱۷۵)۔ یہاں اس بات کی طرف اشارہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ عربوں نے اپنے مشرق یا ایران میں بسنے والی غیر عربی زبان بولنے والی قوموں کے لیے عجم کا لفظ استعمال کیا (جس کے معنی گونگے کے ہیں) اور مغرب یا افریقہ میں بسنے والی غیر عربی زبان استعمال کرنے والی اقوام کے لیے بَرْبَر کا (جس کے معنی ناقابلِ فہم شور و غل کے ہیں)۔ یہ بات محتاجِ تحقیق ہے کہ اس تسمیاتی فرق کے پس پردہ کون سے لسانیاتی یا تہذیبی عوامل کام کر رہے تھے۔

اب آئیے انگریزی کے نقطۂ نظر سے غور کریں آکسفورڈ ڈکشنری میں BARBAROUS کی تشریح کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ یہ یونانی الاصل لفظ ہے اور غالب خیال یہی ہے کہ اس کا مفہوم زبان و بیان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس یونانی الاصل لفظ کے مقابلے کا لفظ لاطینی میں BALBUS ہے جس کے معنی لکنت کے ہیں اور یہ ہر اس زبان کے لیے بولا جاتا تھا جو غیر لاطینی ہو۔ چنانچہ اس یونانی لفظ کا حقیقی اور اصلی مفہوم 'غیر یونانی زبان' ہے۔ اسی ڈکشنری میں BARBARIAN اور BARBAROUS کی تشریحات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں یونانی BARBARIAN کے لفظ کو ہر ایسے اجنبی اور غیر یونانی کے لیے استعمال کرتے تھے جس کی زبان اور طور طریقے یونانیوں کی زبان اور طور طریقوں سے مختلف ہوں۔ زمانہ گزرنے کے ساتھ اس اصل یونانی مفہوم میں بھی تغیر ہوا اور جب یونانی رومیوں کے محکوم ہو گئے تو اس لفظ کو نہ صرف غیر یونانی بلکہ غیر لاطینی یا غیر رومی کے معنوں میں بھی استعمال کیا جانے لگا۔ نیز ہر ایسی زبان کے لیے بھی اسے استعمال کرنے لگے جو نہ یونانی ہو اور نہ لاطینی یا جو کلاسیکی، خالص شدھ یونانی یا لاطینی نہ ہو۔ آج بھی لفظ BARBARISM کو انھیں معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔

یہاں تک تو عربی لفظ بَرْبَرَۃٌ اور یونانی و لاطینی الفاظ BARBARIAN اور BARBAROUS کے معنوی سفر کی داستان قریب قریب ایک ہی ہے کہ عرب اور یونانی و رومی ان الفاظ کو ان زبانوں کے لیے استعمال کرتے تھے جو غیر عربی یا غیر یونانی و غیر لاطینی ہیں اور نتیجے کے طور پر ان اقوام کے لیے بھی استعمال کرتے تھے جو غیر عرب یا غیر یونانی و غیر لاطینی ہیں۔ ان الفاظ کا استعمال ان اقوام کے لیے بھی ہوتا ہے جن کی زبان متکلم کی زبان سے مختلف ہے۔ (اس فرق کے ساتھ کہ عربی میں بَرْبَر کا استعمال صرف ایک خاص خطۂ زمین پر بسنے والی غیر عرب اور عربی نہ بولنے والی اقوام کے لیے ہوتا ہے اور یونانی اور لاطینی میں ہر غیر یونانی اور غیر لاطینی زبان، فرد اور قوم کے لیے)۔ یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ سنسکرت کا لفظ बर्बर (بَرْبَر) بھی یہی مفہوم ادا کرتا ہے کہ اس طرح بولنا کہ بات سمجھ میں نہ آئے جس سے اردو لفظ بڑبڑانا نکلا ہے جس کا مفہوم بھی قریب قریب یہی ہے۔ عربی، یونانی اور سنسکرت کے باہمی تعلقات پر ابھی تک کوئی کام نہیں ہوا تاہم بَرْبَر BARBARIAN BALBUS اور बर्बर جیسے اور بھی کتنے ہی ایسے الفاظ ہیں جو ان زبانوں کے باہمی تعلقات یا کم از کم ایک مشترک سرچشمہ یا نقطۂ اتصال کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ان تعلقات کی نوعیت، شدت اور وسعت کا مطالعہ خود تحقیق کا ایک بڑا موضوع ہے۔

جہاں تک خالص معنیاتی نقطۂ نظر کا تعلق ہے عربی اور یونانی دونوں لفظوں کے اس ابتدائی مشترک مفہوم کے بعد تہذیبی اثرات کے عمل کی بنا پر ان دونوں زبانوں کی سمت سفر ان لفظوں کے بارے میں بالکل الگ ہو جاتی ہے۔ عربی زبان کے لفظ 'بَرْبَر' کا استعمال شمالی افریقہ میں بسنے والی ان قوموں کے لیے مخصوص رہا جن کی

اصل زبان عربی نہ تھی اور اگرچہ بعد میں عربوں کے زیر اثر ان علاقوں میں نہ صرف عربی زبان رائج ہوئی جس نے اکثر و بیشتر تو مقامی بولیوں یا زبانوں کو بالکل ختم کر دیا یا ان پر عربی اثرات ایسے غالب آگئے کہ ایک تیسری زبان وجود میں آگئی بلکہ عربوں کے تہذیبی اثرات نے اس علاقے کو اس درجہ متاثر کیا کہ اس علاقے کے بسنے والے اپنے عربی النسل ہونے کا دعویٰ کرنے لگے۔ اس لسانی اور تہذیبی انقلاب کے بعد بھی ان اقوام کے لیے اسم جنس کے طور پر بربر ہی کا لفظ استعمال ہوتا رہا اور ابتدا میں اس لفظ میں مقامی بولیوں کے بارے میں جو ہلکا سا پرتو تحقیر کا تھا وہ بھی ختم ہو گیا اگرچہ بعض عرب جغرافیہ دانوں نے اس علاقے کے بعض حصّوں کے باشندوں کی تہذیبی پسماندگی یا بدویانہ خصوصیات کے بارے میں لکھا تاہم لفظ بربر کو ان اقوام کے قومی یا جغرافیائی تشخص کے اظہار کے علاوہ کسی اہانت آمیز انداز میں استعمال نہیں کیا گیا۔ ابن خلدون نے تو اپنی تاریخ کا نام ہی "کتاب العبر و دیوان المبتدأ والخبر فی ایام العَرَب والعجم والبربر ومن عاصرھم من ذوی السلطان الاکبر" رکھا ہے جس میں عرب، عجم اور بربر کے الفاظ کو تین مختلف اقوام یا نسلوں یا جغرافیائی حدود میں بسنے والے انسانوں کے تشخص کے لیے استعمال کیا ہے۔ اس کے ساتھ اقوام بربر کی بہادری، جنگ میں ان کی پامردی، آزادی سے ان کی محبت اور ان کی تعداد کی کثرت کے گن گائے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب یہ لفظ عربی سے فارسی میں منتقل ہوا تو فارسی میں بھی اس میں جغرافیائی یا نسلی تشخص کے اظہار کے علاوہ اور کسی اہانت آمیز مفہوم کا شائبہ تک نہ تھا۔ مثلاً نظامی کہتے ہیں ؎

ببیں تا بہ ہنگام کیں گستری
چہ خوں راندم اندر زنگی و بربری

(لغت نامہ دھخدا)

دوسری جگہ لکھتے ہیں ؎

حبش بر یمیں، بربری بر یسار
بقلب اندرون زنگی دیوسار

(لغت نامہ دھخدا)

ان اشعار سے حبش، زنگ اور بربری اقوام کے میدان جنگ میں ثبات و استقامت کا سراغ ملتا ہے۔ فارسی میں اس لفظ کے استعمالات سے تعریف ہی کا پہلو برآمد ہوتا ہے۔ مثلاً فردوسی نے لکھا ہے

زیاقوت و از تاج و انگشتری
ز دیبا و از جامۂ بربری

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بربر کا علاقہ کپڑے کی مصنوعات کے لیے مشہور تھا۔ اتنا ہی نہیں حسن و جمال کے اظہار کے لیے بھی اس لفظ کو استعمال کیا گیا ہے مثلاً فرخی کا شعر ہے

گاہ چوں زریں درخت اندر ہوائے سرکشد
گہ چو اندر سرخ دیبا لعبتِ بربر شود

یا گشتاسپ نامہ میں کہا گیا ہے ؎

شہِ روم را دخترے دلبراست
کہ از روئے رشکِ بت بربراست

ہاں اتنا ضرور ہے کہ فارسی میں بعض اوقات اس لفظ کا استعمال ایران و افغانستان کی سرحد کے باشندوں کے لیے بھی کیا گیا (لغت نامہ دھخدا بحوالہ فرہنگ فارسی ڈکٹر معین) جیسا کہ گرشاسپ نامہ کے اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے

ز بربر زمیں تا بخاور درون
زیک ماہہ رہ داشت کشور فزوں

اور یہ استعمال غالباً اس لفظ کے اسی ابتدائی عربی لسانیاتی مفہوم کے پیش نظر ہوا جس میں غیر عربی بولنے والوں کو بربر کا نام دیا گیا۔ ایران و افغانستان کی سرحد کے باشندے کسی نسل کے اور کسی زبان کے بولنے والے رہے ہوں گے جنھیں ایرانیوں کے لیے ان کی زبان کے ناقابل فہم ہونے کی وجہ سے یہ نام دیا گیا ہوگا۔ لغت نامہ دھخدا میں لفظ بربر کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ یونانی لفظ باربار سے ماخوذ ہے جس کے معنی غیر یونانی کے ہیں جیسے عجم ان کو کہتے ہیں جو غیر عرب ہوں۔ مؤلف یہ بھی بتاتے ہیں کہ غیر یونانی کو بربر اسی طرح کہا جاتا ہے جیسے کہ ہماری فارسی داستانوں میں غیر ایرانی کو تور کہا گیا ہے اور عرب غیر عرب کو عجم کہتے

ہیں۔ مؤلف لغت نامۂ دہخدا نے اس پر متنبہ کیا ہے کہ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یونانی لفظ بربر وحشی کے معنی میں ہے جو درست نہیں۔ اپنے دعویٰ کے ثبوت میں انھوں نے مورخ ہیروڈوٹس کی عبارت بھی پیش کی ہے۔ اس گفتگو سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ بربر کا لفظ عربی یا فارسی میں کبھی اہانت آمیز یا تحقیر آمیز انداز میں استعمال نہیں ہوا۔ اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں کہ 'بربریت' کا لفظ جس میں وحشت، درندگی، جنگلی پن اور بے رحمی کا مفہوم پایا جاتا ہے عربی یا فارسی لفظ 'بربر' سے بنا لیا گیا اور اس لیے بنا یا گیا کہ 'بربر' اپنی درندگی اور وحشی پن کے لیے مشہور تھے۔

عربی لفظ 'بربر' کے برخلاف یونانی 'بار بار' کا تہذیبی تغیراتی سفر بہت طویل رہا۔ جیساکہ بتایا گیا اس کا مفہوم غیر یونانی زبان کا تھا اور ہر ایسے شخص کو BARBARIAN کہا جاتا تھا جو یونانی نہ تھا اور یونانیوں کے لیے اجنبی تھا۔ جب رومیوں کا غلبہ ہوا تو اس کے مفہوم میں وسعت پیدا ہوئی اور نہ صرف غیر یونانی بلکہ غیر رومی (غیر لاطینی) لوگوں کو بھی باربیرین (BARBARIAN) کہا جانے لگا۔ رومی شہنشاہیت کے دور میں BARBARIAN اور BARBAROUS کے الفاظ کا استعمال ان اقوام و ملل کے لیے عام تھا جو رومی شہنشاہیت اور اس کی تہذیب کے دائرۂ اثر سے باہر بستے تھے۔ ان الفاظ کا استعمال خاص طور سے ان شمالی وحشی قبائل و اقوام پر کیا گیا جنھوں نے بالآخر رومی شہنشاہیت کا تختہ الٹ دیا تھا۔ یونانی اور بعد میں رومی چونکہ اپنے آپ کو دنیا کی سب سے متمدن اور مہذب قوم سمجھتے تھے اور اپنی تہذیبی دائرے سے باہر کے لوگوں کو غیر متمدن اور غیر مہذب اور ان کی زبان کو پسماندہ اور ناترقی یافتہ خیال کرتے تھے اس لیے ان الفاظ کا استعمال غیر مہذب، غیر متمدن، وحشی اور جنگلی کے معنی میں ہونے لگا۔ یہ اس لفظ کا پہلا معنیاتی اور تہذیبی تغیر ہے جس سے دوسری اقوام کے لیے حقارت اور تنفر کا اظہار ہوتا ہے۔ بعد میں جب مسیحیت رومی شہنشاہیت کا سرکاری مذہب قرار پائی اور غیر رومی کا مطلب غیر مسیحی بھی سمجھا جانے لگا تو ان الفاظ کے معنی میں بھی دوسرا تغیر ہوا اور BARBARIAN اور BARBAROUS کا مفہوم علاوہ غیر مہذب کے غیر مسیحی بھی ہو گیا چونکہ رومی شہنشاہیت کے اس زمانے کے سب سے بڑے بیرونی فوجی اور مذہبی حریف مسلمان تھے اس لیے ان دونوں لفظوں کا مفہوم نہ صرف غیر مسیحی بلکہ مسلمان بھی ہو گیا۔ اس کے علاوہ عرصۂ دراز تک یورپ کے مسیحی چونکہ مسلمانوں کے بارے میں یہی سمجھتے رہے کہ یہ کوئی ایسی قوم ہے جو بت پرستی کرتی ہے اس لیے اس کا مفہوم بت پرست اور مشرک بھی ہو گیا۔ یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ شمالی افریقہ کا پورا علاقہ جو بربر قبائل کا مسکن ہے عربوں کی آمد سے قبل مسیحیت کے زیر اثر تھا اور بعد میں عربوں کے ذریعے اسلام کے زیر نگیں ہو گیا اس لیے ان مسلم بربر قبائل کے لیے مسیحی رومی شہنشاہیت اور اس کے باشندوں کے دل میں مذہبی تنفر اور حقارت کا اور اضافہ ہوا۔ اور یہ الفاظ محض حقارت اور نفرت کے اظہار کا ذریعہ بن کر رہ گئے۔ نشاۃ ثانیہ کے دور تک کے اطالوی اس لفظ کو اٹلی سے باہر بسنے والی اقوام کے لیے استعمال کرتے تھے لیکن اس کے بعد ان الفاظ کا مفہوم عام طور سے وحشی، جنگلی، سخت بے رحم اور غیر انسانی کا ہو گیا۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ BARBARIAN، BARBAROUS اور BARBARISM کے الفاظ کا ان ثانوی اور بعد کے مفاہیم یعنی غیر مسیحی، مسلمان، وحشی، بے رحم، غیر انسانی، درندہ صفت کا استعمال سب سے پہلے انگریزی زبان میں ہوا جو اس نفرت کا آئینہ دار ہے جو انگریزوں کو اپنے دور استعمار میں اسلام اور مسلمانوں کی طرف سے رہی اور یہ ایسا ہی ہے جیسے اسی مسلم دشمنی کے تحت وہابیت اور وہابی کے لفظ کو انگریزوں نے بغاوت اور باغی کے قابلِ مذمت تصورات کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال کیا۔ BARBARISM کے اصل یونانی مفاہیم غیر خالص زبان، غیر زبان بولنے والا، غیر ملکی یہ سب مفہوم انگریزی میں صرف ان کتابوں کے تراجم تک محدود ہے جو یونانی یا لاطینی سے انگریزی میں ترجمہ کی گئیں۔ اس طرح خود بربریت کا لفظ اور اس لفظ کے وحشت، درندگی اور بے رحمی کے

مفاہیم عربی یا فارسی لفظ "بربر" سے نہیں بلکہ انگریزی لفظ BARBARISM سے ماخوذ ہیں۔ اس کے برخلاف عربی اور فارسی کا لفظ "بربر" آج بھی صرف جغرافیائی اور نسلی تشخص کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

۲۔ پوست کندہ

اس لفظ کے بارے میں موصوف کا کہنا ہے "لفظ پوست کندہ اس زمانے کی یاد دلاتا ہے جب انسانوں کے جسم پر نشان لگا دیے جاتے تھے کہ ان سے فلاں سنگین جرم سرزد ہوا ہے تاکہ ان سے احتیاط برتی جا سکے۔ یہ نشان ناقابلِ تردید ہوتا تھا اس طرح پوست کندہ ناقابلِ تردید کے لیے استعمال ہونے لگا۔"

واقعہ یہ ہے کہ پوست کندہ کا استعمال ناقابلِ تردید کے لیے سرے سے نہیں ہوتا اور نہ کسی لغت میں اس لفظ کے یہ معنی بیان کیے گئے ہیں۔ پوست کندہ فارسی لفظ ہے۔ کندن کے معنی کھودنے کے ضرور ہیں لیکن پوست کندن کے معنی کھال کھودنے کے نہیں آتے۔ لغت نامہ دہخدا میں ہے

"پوست کندن : پوست باز کردن، پوست گرفتن، پوست برآوردن، پوست کردن، پوست، باز گرفتن"

یعنی کھال کھینچنا کھال ادھیڑنا، کھال اتارنا، کھال نوچنا۔ دہخدا نے سعدی کا شعر بھی پیش کیا ہے۔

بناخن پری چہرہ می کند پوست
کہ ہرگز بدیں کے شکیبم ز دوست

اس طرح پوست کندہ کے معنی جو اس سے حاصل مصدر ہے دہخدا ہی میں یہ دیے ہیں "(پوست برآوردہ) کہ پوست آں برداشتہ باشند، پوست باز کردہ، مقشر" یعنی وہ جس کی کھال کھینچ لی گئی ہو، کھال اتار لی گئی ہو، جس کی چھال یا چھلکا علیحدہ کر دیا گیا ہو۔ یہ تو پوست کندہ کے حقیقی اور اولین معنی ہوئے، اس کے مجازی اور ثانوی معنی جن میں اکثر و بیشتر اس کا استعمال ہوتا ہے یہ ہیں "بے پردہ صریح واضح، آشکارا، فاش، برملا، روشن، بے کنایہ" (دہخدا) دہخدا نے سہ ہان ابرقوہی کا شعر بھی پیش کیا ہے جس میں پوست کندن کے حقیقی اور مجازی دونوں مفہوم موجود ہیں۔

در حقِ سر تراشِ ایں حمام
سخن راست بندہ می گویم
می کند پوست از سرِ مردم
سخنِ پوست کندہ می گویم

دوسرے شعر کے پہلے مصرع میں حقیقی مفہوم اور دوسرے میں مجازی پہلو مدنظر ہے۔ اردو میں پوست کندہ فارسی ہی سے آیا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ اردو میں اس کا استعمال حقیقی اور اولین مفہوم ظاہر کرنے کے لیے نہیں بلکہ صرف مجازی اور ثانوی مفہوم کے لیے ہوتا ہے یعنی صاف صاف، واضح بے لاگ لپیٹ کے۔

۳۔ ہَودَہ

ہودہ کے بارے میں "اردو الفاظ شماری" کے مؤلف لکھتے ہیں "ہودہ حوضہ کا بگڑا ہوا لفظ ہے، ہودہ اس عماری کو کہتے ہیں جو اوپر سے کھلی ہو یہ شائستگی کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ اس سے لفظ بے ہودہ وجود میں آیا جس کے معنی ہیں ناشائستہ اور غیر مہذب"۔

اس تشریح میں ایسے الفاظ کو ایک رشتے میں پرونے کی کوشش کی گئی ہے جن کا ایک دوسرے سے کوئی واسطہ نہیں۔ اردو لغت نگار اس بارے میں کہ ہودہ کس لفظ سے بنا ہے کافی مختلف الرائے ہیں۔ فرہنگِ آصفیہ میں بتایا گیا ہے کہ حوضہ بگڑ کر اردو میں ہودہ ہو گیا ہے اور اس کے دو معنی ہیں "۱۔ ایک قسم کی عماری جو اوپر سے کھلی ہوئی ہوتی ہے۔ ۲۔ چوبچہ، چاہ بچہ، چھوٹا سا حوض"۔ نور اللغات میں لکھا ہے کہ ہودہ ہودج سے بگڑ کر بنا ہے۔ معنی کی تشریح میں بتایا ہے "ایک قسم کی عماری جو ہاتھی کی پیٹھ پر بیٹھنے کے واسطے رکھتے ہیں ایرانی اس کو حوضہ کہتے ہیں کیونکہ اس کی شکل حوض کے مانند ہوتی ہے" غیاث اللغات میں کہا گیا ہے کہ "نوعے از بر نشستنی است کہ بر سر پشت جمل بندند بعربی ہودج گویند لاکن ہودج در عرب سواری زناں را گویند خواہ بر پشت شتر کشند خواہ بر پشت اسپ"

یعنی ایک قسم کی نشست گاہ جسے اونٹ پر باندھ دیتے ہیں اسے عربی میں ہودج کہتے ہیں فرق یہ ہے کہ ہودج عربی میں عورتوں کی سواری کو کہا جاتا ہے چاہے وہ اونٹ پر ہو یا کسی دوسرے چوپائے پر۔ فیلن (FALLON) نے اپنی A NEW HINDUSTANI ENGLISH DICTIONARY, 1879 میں لکھا ہے کہ ہودہ ہودج کی بگڑی ہوئی شکل ہے اور ہاتھی پر رکھی ہوئی نشست گاہ کو کہتے ہیں۔ اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ ہودہ حوض سے بھی بگڑ کر بنا ہے اس صورت میں اس کے معنی چھوٹے سے حوض کے ہوتے ہیں۔ پلاٹس (PLATTS) نے URDU CLASSICAL HINDI & ENGLISH DICTIONARY میں ہودج کو عربی اور ہودہ کو ہندی لفظ بتا کر لکھا ہے کہ ان کے معنی ایک تو اونٹ کے کجاوے کے ہیں جس میں عرب عورتیں سوار ہوتی ہیں دوسرے اس کھلی ہوئی نشست گاہ کے بھی ہیں جسے ہاتھی کی پشت پر رکھا جاتا ہے اور ہندوستان میں اس کے عموماً یہی معنی لیے جاتے ہیں۔ اس نے اس سلسلے میں ہوا دار کا بھی حوالہ دیا ہے اور کہا ہے کہ محذا یا ہودہ کو اس پر محمول کیا جا سکتا ہے۔

آیئے اب فارسی لغتوں کو دیکھیں۔ لغت نامہ دہخدا میں ہودہ کی تشریح میں لکھا گیا ہے "ہودج، بارگیر کہ مرکبی است زناں را" اور حوالہ منتہی الارب کا دیا گیا ہے لیکن اگر آپ منتہی الارب دیکھیں تو ہودہ کا لفظ ہی اس میں موجود نہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دہخدا نے ہودہ کا مفہوم ہودج بتایا ہے اور ہودج کی تشریح منتہی الارب سے نقل کی ہے نہ کہ ہودہ کی مزید بحث سے آگے وہ لفظ 'ہودج' کی طرف رجوع کرنے کے لیے کہتا ہے۔ ہودج کا مفہوم غیاث اللغات کے حوالے سے دہخدا نے یہ بتایا ہے کہ اس کجاوے کو کہتے ہیں جس میں عورتیں بیٹھتی ہیں جس میں عورتیں بیٹھتی ہیں اور عماری شتر کو بھی ہودج کہا جاتا ہے۔ ہودج کی یہی تشریح فرہنگ آنندراج میں بھی ملتی ہے مگر ہودہ کا لفظ آنندراج میں نہیں دیا گیا۔ لغت نامہ دہخدا ہی میں 'حوضہ' کے معنی فرہنگ آنندراج کے حوالے سے یہ بتائے گئے ہیں "عماری فیل وجز آں کہ بصورت حوض بسازند" یعنی ہاتھی کی عماری یا اس کے علاوہ بھی جسے حوض کی شکل پر بنایا جائے۔ آنندراج میں نظامی کا ایک شعر بھی نقل کیا گیا ہے جس میں حوضہ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ دہخدا نے نظامی کے مزید دو شعر نقل کیے ہیں جن میں یہ لفظ آیا ہے مگر عجیب بات ہے کہ تینوں میں سے کسی شعر سے یہ اشارہ نہیں نکلتا کہ حوضہ کو کسی نشست گاہ کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ برخلاف اس کے تینوں جگہ حوضہ کے معنی چھوٹے حوض کے معلوم ہوتے ہیں۔

STEINGASS کی فارسی۔ انگریزی لغت سے معلوم ہوتا ہے کہ حوضہ کے معنی ہیں اٹھے ہوئے کناروں کے برتن کی شکل کا میانہ جس میں ہاتھی کی پشت پر سوار ہوتے ہیں۔ اس نے اس لفظ کا ہودج اور ہودہ سے مقابلہ کرنے کا مشورہ بھی دیا ہے لیکن ہودہ کا لفظ STEINGASS کے یہاں بھی نہیں ملتا ہے، ہودج البتہ موجود ہے جس کا مفہوم اس نے یہ بتایا ہے "اونٹ کا کجاوہ جس میں عرب عورتیں سفر کرتی ہیں (یہ لکڑی کا بنا ہوتا ہے یا ایسے کپڑے کا جسے ایک ڈھانچے پر باندھ دیتے ہیں یہ چھت کی طرف بند بھی ہوتا ہے اور کھلا بھی)۔ ایسے چھتر، نقاب یا پردے کو بھی ہودج کہا جا سکتا ہے جس کے ذریعے سفر کرنے والی عورتیں پردے میں رہ سکیں۔ یا وہ نشست گاہ جسے پشت فیل پر رکھتے ہیں"۔

لین نے اپنی عربی۔ انگریزی لغت مدّ القاموس (ARABIC-ENGLISH LAXICON) میں ہودج کے معنی یہ بتائے ہیں کہ یہ اس عماری یا کجاوے کو کہتے ہیں جو اونٹ پر رکھا جاتا ہے۔ اصلاً ہودج عورتوں کے استعمال کے لیے تھا۔ لکڑی کے ڈنڈے کھڑے کرکے اوپر پتلی لکڑیوں کی چھت ڈال کر اس پر کپڑا منڈھ دیا جاتا تھا کہ اس کی صورت قبے کی سی ہو جاتی تھی اسی کو ہودج کہتے تھے لیکن بند ہونا لازمی بات نہ تھی۔ بند بھی ہوتی تھی اور کھلی ہوتی تھی۔ ہودج کے بارے میں بعض عربی لغت نگاروں نے لکھا ہے کہ یہ معرّب ہے لیکن اکثر و بیشتر لغت نگار اسے ٹھیٹ عربی ہی قرار دیتے ہیں۔

ہَوْدہ کا لفظ عربی نہیں ہے ہاں ھَوْدَہ کا لفظ عربی زبان میں ملتا ہے جس کے معنی لین نے اونٹ کے کوہان کے بالائی حصّے کے بتائے ہیں۔ غالباً اسی ھَوْدَہ سے ہودج بنا ہے۔

مذکورہ بالا عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اُردو لغت نگار اس بارے میں کہ ہَودہ کس لفظ سے بنا ہے دو مختلف رائیں رکھتے ہیں۔ ایک فریق کا کہنا ہے کہ یہ ہودج سے بنا ہے اور دوسرا یہ کہتا ہے کہ یہ حوضہ کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ فارسی میں ہودج اور حوضہ دونوں لفظ عربی سے لیے گئے ہیں اگرچہ حوضہ کو عماری فیل کے معنی میں عربی میں استعمال نہیں کرتے۔ ہمارے خیال میں قرینِ قیاس یہ معلوم ہوتا ہے کہ عربی لفظ ہودج سے فارسی میں ہَودہ بنا لیا گیا اور اس کے معنی میں بھی تبدیلی کر لی گئی۔ ہودج اونٹ پر رکھی جانے والی عورتوں کی نشستگاہ کے لیے مخصوص تھا فارسی میں ہاتھی پر رکھی جانے والی نشستگاہ کے لیے استعمال کیا گیا نیز عورتوں سے جو اسے خصوصیت تھی اسے بھی ختم کر دیا گیا مزید برآں ہاتھی کی پشت پر زیادہ گنجائش نیز عورتوں کے لیے خاص نہ رہنے کی بنا پر اس کی شکل میں بھی تبدیلی ہوئی اور اس کی ... شکل اب قریب قریب چوکور اور اوپر سے کھلی ہوئی ہو گئی۔ ان تغیرات کے بعد چونکہ اس کی شکل ایک چھوٹے سے حوض کی ہو گئی تھی نیز ہَودہ اور حوضہ اپنے مخارج کے اعتبار سے نہ صرف قریب بلکہ فارسی تلفظ کے لحاظ سے ایک ہی سی آواز رکھتے تھے اس لیے ہودہ کے املا میں تبدیلی ہو کر اسے حوضہ لکھا جانے لگا۔ ہودج کے لفظ کا یہ ارتقا اور ہودہ اور حوضہ کی تشکیل ہمارے خیال میں اس سے کہیں زیادہ قابلِ قبول ہے کہ ہودہ کو بلا دلیل حوضہ سے ماخوذ سمجھا جائے خصوصاً اس صورت میں کہ ہودج کا تصور تو اصلاً نشستگاہ اور سواری سے وابستہ ہے اور حوضہ کے لفظ میں اصلاً اس طرح کا کوئی مفہوم نہیں پایا جاتا۔

یہ کہنا کہ "ہودہ اس عماری کو کہتے ہیں جو اوپر سے کھلی ہو اور نا شائستگی کی علامت سمجھی جاتی ہے" ایسا دعویٰ ہے جس کا کوئی ثبوت نہیں۔ ہودج جیسا ابھی بتایا گیا اوپر سے ڈھکا ہوا بھی ہوتا تھا اور کھلا ہوا بھی یہی بات ہَودہ کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں شائستگی اور ناشائستگی کے بجائے فیصلہ کن چیز ضرورت اور موسم ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ ہودج ہو یا ہودہ اگر پردہ نشینوں کے زیرِ استعمال ہوتا تو کم از کم چاروں طرف سے اس کا ڈھکا ہوا ہونا ضروری تھا۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ عماری چاہے وہ اونٹ پر ہو یا ہاتھی پر اگر مردوں کے استعمال میں ہوتی تھی تو موسم یا ضرورت یا تزک و احتشام کے نقطۂ نظر سے اسے اوپر سے ڈھکا بھی جاتا تھا چاہے چاروں طرف وہ ڈھکی ہوئی ہو یا کھلی ہوتی۔

بہر حال اس ہَودہ کا کوئی تعلق بیہودہ سے نہیں، جو 'برہان قاطع' کے مطابق بیہودہ کے وزن پر ہے اور جس کے معنی لغت نامہ دہخدا اور برہان قاطع میں "حق و راست و درست" دیے گئے ہیں اور جس کے سلسلے میں بتایا گیا ہے کہ "چنانچہ بیہودہ ناحق و باطل و بیہرزہ را گویند" یعنی اسی وجہ سے ناحق، باطل، بیکار اور نامعقول کو بیہودہ کہتے ہیں۔ کہاں ہودج اور کہاں بیہودہ۔ پہلا عربی اور دوسرا فارسی۔ دونوں کے معنی کا آپس میں کوئی تعلق ہی نہیں۔

اُردو میں ہودج کے لفظ کا استعمال بھی ہوتا ہے اگرچہ کجاوے اور عماری کے الفاظ اس کے مقابلے میں زیادہ عام ہیں۔ ہَودہ بھی اردو میں بولا جاتا ہے مگر تحریری زبان میں اس لفظ کا شمار فصیح الفاظ میں نہیں کیا جاتا عماری کو فصیح سمجھا جاتا ہے۔ جہاں تک بیہودہ کا تعلق ہے اس لفظ کو اس شکل میں اردو میں استعمال نہیں کرتے۔ ہاں بیہودہ اردو کا ایک عام طور سے استعمال ہونے والا لفظ ہے اور اسی معنی میں بولا اور لکھا جاتا ہے جس میں فارسی میں استعمال ہوتا ہے یعنی نامعقول، بدتمیز، بے تہذیب، بیکار کے مفہوم میں۔

۴۔ زنانہ

مؤلف نے اس لفظ کے بارے میں لکھا ہے "افریقہ کے قبیلہ بربر کے قبیلے کا نام زنانہ ہے۔ عربوں نے ان کی عادات و اطوار اور طریقہ لباس کو نسوانی قرار دیا اور اس طرح لفظ زنانہ وجود میں آیا۔" افریقہ اور بربر قبائل

کی پوری تاریخ چھان ڈالیے مگر آپ کو 'زناتہ' نام کا کوئی قبیلہ نہ ملے گا۔ حقیقت صرف اتنی سی ہے کہ شمالی افریقہ میں بسنے والے بربری قبائل کی ایک شاخ 'زناتہ' (زن ات ہ) کے نام سے معروف ہے جسے فاضل مؤلف نے نہ جانے کس جھونک میں 'زنانہ' پڑھ لیا اور یہ گھڑت پیش کر دی کہ ان کے عادات و اطوار اور طریقہ لباس نسوانی تھا حالانکہ جیسا 'بربر' کے تحت بتایا گیا۔ بربری قبائل اپنی شجاعت، مردانگی اور جفاکشی کے لیے مشہور رہے ہیں۔ لغت نامہ دھخدا نے اور مشہور عربی لغت القاموس المحیط نے اسے ز کے زیر کے ساتھ ضبط کیا ہے یعنی زِناتہ۔ دھخدا نے حوالے کے طور پر ابن حوقل کی 'المسالک و الممالک'، ابن اثیر کی تاریخ 'الکامل' اور قلقشندی کی عربی ادب کی کتاب صبح الاعشیٰ کے نام لیے ہیں۔ تاریخ ابن خلدون (شائع کردہ دار الکتاب اللبنانی بیروت ۱۹۶۸ء) کے ایڈیٹر نے اسے ز کے زبر کے ساتھ ضبط کیا ہے۔ تاریخ ابن خلدون میں زَناتہ کی وجہ تسمیہ بھی دی ہے۔ ابن خلدون کہتے ہیں کہ اس لفظ زناتہ کی اصل 'جانا' ہے جو اس قبیلے کے مورث اعلیٰ کا نام ہے اور جس کا نام قبیلہ مذکور کے نسب نامہ میں 'جانا بن یحییٰ' آتا ہے۔ ان لوگوں کی مقامی بولی میں جب کسی اسم مفرد کو اسم جنس بنانا ہوتا تھا تو اس کے آخر میں ت بڑھا دیتے تھے مثلاً جانا سے جانات اور اس کے بعد بھی اگر عموم پیدا کرنا ہوتا تھا تو ت کے بعد ن کا اضافہ اور کر دیا جاتا تھا مثلاً جانات سے جاناتن۔ یہ بربری قبیلہ اس لفظ جانات میں جیم کا جو تلفظ کرتا تھا وہ عربوں کے حرف جیم کے تلفظ سے بہت مختلف تھا۔ عربی میں جیم اور سین کے جو مخرج ہیں بربری ان دونوں مخارج کے درمیان سے جیم کی ادائیگی اس طرح کرتے تھے کہ زبان سین کے مخرج کی طرف مائل ہو جاتی تھی اور ادائیگی میں صفیر (سیٹی) کی کیفیت محسوس ہوتی تھی۔ عربی میں چونکہ یہ آواز نہیں پائی جاتی اس لیے عربوں نے اس کا حل یہ نکالا کہ چونکہ سین سے قریب ترین مخرج زے کا ہے اس لیے جانات کے جیم کو زے سے بدل دیا اور زانات کہنے لگے۔ اب زانات ان عربوں کے تئیں ایک ایسا مفرد لفظ تھا جو اسم جنس کا کام دیتا تھا۔ انھوں نے مزید یہ کیا کہ آخر میں ہائے نسبتی کا اضافہ کر کے ز کے بعد والے الف کو حذف کر دیا اور اس طرح 'زناتہ' کا لفظ اس قبیلے کے نام کے طور پر وجود میں آگیا جو اگرچہ پورے شمالی افریقہ میں پھیلا ہوا ہے مگر مغرب اوسط میں اس کی اتنی کثرت ہے کہ اسے "وطن زناتہ" ہی کہا جاتا ہے۔ اگر ابن خلدون کی یہ توجیہ درست ہے تو اس لفظ کا ز کے زبر سے ہونا زیادہ قرین قیاس ہے کیونکہ کثرت استعمال سے ایسا ہوتا ہے کہ الف گھٹ کر صرف زبر رہ جاتا ہے اس صورت میں 'زاناتہ' سے 'زَناتہ' زیادہ قرین صواب معلوم ہوتا ہے بہ نسبت زِناتہ کے۔

جہاں تک لفظ 'زنانہ' کا تعلق ہے اس کے لیے کسی افریقی قبیلے تک جانے کی ضرورت نہیں۔ روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ یہ فارسی لفظ 'زن' بمعنی عورت سے اسی طرح بنا ہے جیسے مرد سے 'مردانہ'، اور اصول اس کا نہایت واضح طور پر یہ ہے کہ جب کسی اسم سے کسی طور طریق کو نسبت دینا یا کسی شے کو اس اسم کے لیے مخصوص کرنا چاہتے ہیں تو اس کے آخر میں 'ان ہ' کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ یہ اصول اردو میں بھی مستعمل ہے اور فارسی ہی سے ماخوذ ہے۔ لغت نامہ دھخدا میں 'زن' کے تحت ناظم الاطبا کے حوالے سے لکھا ہے:

"زنانہ: ۱- جائے مخصوص بہ زناں کہ مرد در آں نباشد (ناظم الاطبا): حمام زنانہ

۲- ہر چیز منسوب بہ زن و موافق کارہائے زناں و مانند زناں (ناظم الاطبا)"

یعنی زنانہ کے ایک تو معنی ہیں وہ جگہ جو عورتوں کے لیے مخصوص کر دی گئی ہے اور وہاں مردوں کا گزر نہیں جیسے زنانہ حمام دوسرے ہر وہ چیز جو عورتوں سے منسوب ہو یا عورتوں کے افعال کے موافق ہو یا عورتوں کی طرح ہو۔ انھیں دونوں معنوں میں اس کا استعمال اردو میں بھی ہوتا ہے۔ 'زنانہ' اردو میں بھی مکان کے اس حصے کو کہتے ہیں جہاں غیر مردوں کا گزر نہیں 'مردانہ' مکان کا وہ حصہ ہوتا ہے جو مردوں کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔ زنانہ اسپتال، زنانہ لباس، زنانہ اسکول وغیرہ اردو کے عام استعمالات ہیں۔

'زنانہ' ایک خالص فارسی لفظ ہے جو عربی میں کسی

صورت میں مستعمل نہیں۔ اگر عرب کسی قبیلے کے زنانہ طور طریقے دیکھ کر اسے کوئی نام دیتے بھی تو ایسا لفظ استعمال کرتے جو عربی ہوتا نہ کہ خالص فارسی۔

۵۔ رعونت

مؤلف 'اردو الفاظ شماری' لکھتے ہیں کہ "مصر کے بادشاہوں کا لقب فرعون تھا۔ یہ بادشاہ مطلق العنان اور جابر تھے اس طرح لفظ فرعونیت وجود میں آیا۔ لفظ رعونت بھی اس کی بدلی ہوئی شکل ہے جس کے معنی سرکشی اور گھمنڈ کے ہیں"۔

اس میں اتنی بات تو صحیح ہے کہ مصر کے بادشاہوں کا لقب فرعون تھا اور اردو کے عام قاعدے کے مطابق (جو عربی اور فارسی ہی سے ماخوذ ہے) یت کا اضافہ کر کے اسم صفت فرعونیت بنا لیا گیا لیکن مطلق العنان اور جابر ہونا کوئی انھیں کی خصوصیت نہ تھی۔ علاوہ بریں یہ اختراع محض ہے کہ رعونت بھی اسی کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ فرعون ان عربی الفاظ میں سے ہے جو اصلاً عربی نہیں بلکہ دوسری زبان سے ماخوذ ہوئے اور عربی میں گھل مل گئے۔ فرعون کو عبرانی میں پرعوہ کہتے ہیں۔ یہ عبرانی لفظ قدیم مصری لفظ پرعو سے ماخوذ ہے جس کے معنی 'بڑے گھرانے' کے ہیں۔ (دیکھیے WEBSTER'S INTERNATIONAL DICTIONARY) یقین کے ساتھ کہنا مشکل ہے کہ عربی زبان میں یہ لفظ براہ راست مصری زبان سے لیا گیا (جس کے کافی امکانات ہیں کیونکہ عربوں کے نہایت قریبی براہ راست تعلقات مصریوں سے انتہائی قدیم زمانے سے رہے ہیں) یا عبرانی کے ذریعہ عربی میں منتقل ہوا بہر حال عربی، عبرانی یا مصری کسی زبان میں اس لفظ میں رعونت، سرکشی یا غرور کا مفہوم کبھی شامل نہیں رہا۔

رعونت عربی لفظ ہے اور عربی ہی سے فارسی میں آیا ہے مگر معنی میں کچھ تغیر کے ساتھ۔ عربی میں رعونت کے معنی حماقت اور ہلکا پن ہیں (دیکھیے لین کی عربی۔ انگریزی لغت مدّ القاموس) فارسی میں اس میں غرور تکبر کے مفہوم کا اضافہ ہوا۔ یہ اضافہ غالباً رعونت کے منشا یا اس کے لوازم کے پیش نظر ہوا یعنی رعونت چونکہ اکثر و بیشتر حماقت اور ہلکے پن سے ناشی ہوتی ہے یا چونکہ حماقت رعونت کے لوازم میں سے ہے اس لیے مجازی اعتبار سے فارسی میں رعونت کو تکبر و غرور کے لیے استعمال کرنے لگے اور بعد میں اس نے حقیقی معنی کی جگہ اختیار کر لی (لغت نامہ دہخدا میں رعونت کے بارے میں یہ لکھ کر کہ عربی سے ماخوذ ہے، منتہی الارب، تاج المصادر بیہقی، اقرب الموارد، بحر الجواہر اور کشاف اصطلاحات الفنون کے حوالوں سے بتایا ہے کہ عربی میں اس کا مفہوم 'کاہل شدن' 'بے خبر شدن' 'حمق' اور 'کم فکر' ہے۔ پھر ناظم الاطبا اور غیاث اللغات کے حوالے سے کہا ہے کہ فارسی میں بھی رعونت نادانی و کم عقلی، ابلہی، بلاہت اور حماقت کو کہتے ہیں اور یہ معنی عربی ہی سے ماخوذ ہیں۔ اس کے بعد دہخدا نے فرہنگ آنند راج کے حوالے سے لکھا ہے کہ نادانی و کم عقلی کے علاوہ فارسی میں رعونت کے معنی غرور و تکبر کے بھی آتے ہیں اور ابو الفضل بیہقی، تاریخ جہاں گشائے جوینی کی عبارتوں اور منوچہری، نظامی اور سعدی کے اشعار کو بطور شواہد کے پیش کیا ہے۔ علاوہ بریں غیاث اللغات کے حوالے سے بتایا ہے کہ اس کے معنی سرکشی کے بھی ہیں۔ اردو میں یہ لفظ فارسی ہی سے منتقل ہوا ہے اور صرف فارسی مفہوم میں استعمال ہوتا ہے یعنی سرکشی، غرور، تکبر، اینٹھ اور اکڑ کے لیے۔ اس تشریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ رعونت اور فرعونیت کا آپس میں ایک دوسرے سے کوئی معنوی یا لفظی تعلق نہیں۔

۶۔ کفر

اس لفظ کی تشریح میں موصوف فرماتے ہیں "افریقہ کے BANTU قبیلے کے ایک گروہ کا نام تھا کافر۔ اس قبیلے کی عادات اور خصوصیات کے پیش نظر عربی میں ڈھکنے چھپانے کے لیے لفظ کفر کا استعمال ہوا۔ اسلام نے اس لفظ کو اللہ کے وجود کے انکار کے لیے استعمال کیا یعنی حقیقت کو چھپانا اور یہی معنی اردو میں بھی لیے گئے۔ قرآن میں ہے جب حق آتا ہے تو باطل غائب ہو جاتا ہے چنانچہ کفر کو بھی

ایسی چیز [illegible] دیکھتے دیکھتے غائب ہو جائے؟ موصوف
کی اتھنالوجی [illegible] کا مفاد یہ ہے کہ لفظ "کفر" خالص عربی نہیں
بلکہ معرب یا دخیل ہے۔ یہ دعویٰ صحیح نہیں اور اس کی توجیہ
کے لیے جو [illegible] سے بعض بطور قبیلے کی شاخ کافر کے
اطوار و عادات سے اس لفظ کو اخذ کیا جانا وہ بھی درست
نہیں جس کے لیے کوئی ثبوت مہیا نہیں کیا جا سکتا واقعہ
یہ ہے کہ یہ لفظ خالص عربی ہے اور اس کے حقیقی معنی کسی چیز
کو چھپانے، پردہ ڈالنے اور مستور کرنے کے آتے ہیں (لین بحوالہ
الصحاح للجوہری، المصباح المنیر، القاموس) بیج بونے اور
اسے زمین میں چھپا دینے کے لیے کفر کا لفظ استعمال ہوتا ہے
(لین بحوالہ التاج العروس)۔ جب بادل ایسے گھر کر آئیں کہ
آسمان کو چھپا لیں تو عربی میں کہا جاتا ہے کَفَرَ السَّحَابُ
السَّمَاءَ۔ اسی طرح کَفَرَ مَتَاعَهُ اس وقت بولا جاتا ہے
جب کوئی اپنی متاع کو پوشیدہ کر دے (لین بحوالہ التاج العروس)
کَفَرَ نَفْسَهُ بِالسِّلَاحِ کا مطلب ہوتا ہے اس نے اپنے
آپ کو ہتھیاروں سے ڈھک لیا۔ کَفْر رات کی تاریکی یا
اندھیرے کو کہتے ہیں کیونکہ وہ اشیاء کو چھپا لیتا ہے۔ اسی
طرح قبر کو بھی کَفْر کہا جاتا ہے کیونکہ نعش اس میں چھپ جاتی
ہے (لین بحوالہ الصحاح و القاموس)۔ اس کی جمع کُفُور آتی
ہے۔ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِاَھْلِ الْکُفُوْرِ کا مطلب یہ ہے کہ
اے اللہ اہل قبور کی بخشش فرما دے۔ انھیں معنی کے پیش نظر
بیج بونے والے (لین بحوالہ الصحاح، القاموس) یا زمین جوتنے
والے (المصباح المنیر) یعنی کسان کو کافر کہا جاتا ہے کیونکہ
وہ بیج کو مٹی میں چھپاتا ہے (لین بحوالہ الصحاح، المصباح المنیر)
گھنے بادل، یا صرف بادل، رات اور تاریکی کو بھی اسی
مفہوم کے مد نظر کافر کہا جاتا ہے۔ یہ تو لفظ کفر کا اپنے حقیقی
معنی میں استعمال ہے۔

کَفَرَ النِّعْمَةَ یا کَفَرَ بِالنِّعْمَةِ یا کَفَرَ نِعْمَةَ اللّٰهِ یا
بِنِعْمَةِ اللّٰهِ (جس سے مصدر کُفران آتا ہے) کا مطلب ہوتا
ہے اس نے ان نعمتوں یا احسانات کو جو اس پر کیے گئے تھے
چھپایا، پوشیدہ کر لیا، یا ان سے منکر ہو گیا یا انھیں تسلیم
کرنے سے روگردانی کی (لین بحوالہ المصباح المنیر)۔ الصحاح اور
المصباح المنیر کے حوالے سے لین نے بتایا ہے کہ کُفر کا استعمال اس
طریقے سے اس وقت ہوتا ہے جب کوئی احسان ناشناسی کرے
یا اپنے طرزِ عمل سے ناشکری یا ناسپاسی کا ثبوت دے۔ چنانچہ
جب کوئی بالخصوص خدا کی نعمتوں کی ناشکری کرے یا اس کے
احسانات کو تسلیم کرنے سے انکار کرے اور اس طرح کی نعمتوں
اور احسانات کو چھپائے ...... تو اس وقت کُفرِ نعمت
بولا جاتا ہے (لین بحوالہ القاموس)

لین ہی کی لغت[1] سے معلوم ہوتا ہے کہ کفر کے لفظ کا
جب نعمتوں یا احسانات سے انکار یا ان کے عدم تسلیم کے
استعمال کیا جاتا ہے تو یہ استعمال دراصل حقیقتِ عرفیہ کے
طور پر مجازی اعتبار سے ہوتا ہے چنانچہ کُفر اور کُفران کے
الفاظ کو مطلقاً انکار کرنے یا تسلیم نہ کرنے کے معنی میں
بولا جاتا ہے۔ کُفر کے لفظ کا یہ استعمال قرآن کریم میں بھی ملتا
ہے کفر بالطاغوت کے معنی شیطانی طاقتوں اور سرکشی
تسلیم نہ کرنے کے ہیں۔ اس طرح کُفر بالصانع کے معنی صانعِ
حقیقی یا خدا کے انکار کرنے کے آتے ہیں۔ کُفر، کُفُر، کُفران
اور کُفور ان سب مصادر کا مطلب ہوتا ہے یقین کرنے سے انکار کرنا
کافر ہو جانا، تسلیم نہ کرنا۔ اس مفہوم کے اعتبار سے یہ ایمان
یعنی یقین کرنا، مان لینا، تسلیم کر لینا کی ضد ہے کیونکہ جو کفر
کفر کرتا ہے تو وہ دراصل حق کو چھپاتا ہے، پوشیدہ کرتا ہے
اور اللہ کی نعمتوں کو جو منعم حقیقی ہے تسلیم کرنے سے انکار کرتا
ہے۔ اس طرح اس لفظ کا اصل اور حقیقی مفہوم چھپانے یا
ڈھانکنے کا ہے اور لزومی معنی کے اعتبار سے اس کا مفہوم انکار
ہو گیا۔ یہ دونوں مفہوم یعنی چھپانا اور انکار کرنا ٹھیٹ عربی

---

[1] بعض حضرات لفظ لغت کو فرہنگ کے معنی میں بھی مذکر
استعمال کرتے ہیں۔ یہ غلط ہے۔ ان معنی میں اس کی تذکیر کے
سارے شواہد مخدوش ہیں۔ دیکھیے راقم کا مضمون "لفظ لغت
کی تذکیر و تانیث"، ہماری زبان مطابق یکم و ۸ جون
۱۹۷۷ء۔

ہیں کسی دوسری زبان سے عربی میں منتقل نہیں ہوئے (یعنی دخیل نہیں) اور نہ بعد کی پیداوار ہیں (یعنی مولّد نہیں)۔

عربی سے یہ لفظ جب فارسی میں منتقل ہوا تو اس کے معنی میں توسیع ہوئی اور علاوہ ان مفاہیم کے کافر کو ستم گر، ظالم اور شوخ کے معنی میں بھی استعمال کیا جانے لگا۔ معنی میں یہ توسیع غالباً ابتدائی ترک اسیرانِ جنگ کو سامنے رکھ کر ہوئی جو شروع میں نہ صرف منکرِ اسلام تھے بلکہ اپنی جنگجوئی، تند خوئی اور حسن و جمال کے لیے ممتاز تھے۔ فارسی میں محبوب کے لیے جفا پیشہ، ستمگر، قاتل کے الفاظ کا استعمال بھی اسی دور کی یادگار معلوم ہوتا ہے بلکہ ترک کا لفظ بھی محبوبِ جفا پیشہ یا صرف محبوب اور حسین کے معنی میں اسی زمانے کی پیداوار ہے۔ حافظ کا مشہور مصرع ہے ؎

اگر آں ترکِ شیرازی بدست آرد دلِ مارا

فیضی کا مصرع ہے ؎

اے ترکِ غمزہ زن کہ مقابل نشستۂ ای

فارسی میں اس لفظ کے مفہوم ہی میں تغیر نہیں ہوا بلکہ حرکات میں بھی تبدیلی آئی یعنی محبوب یا جفا جو کے مفہوم میں ف کے زیر کے بجائے ف کے زبر کے ساتھ استعمال کیا جانے لگا اور کافر کو خنجر کا ہم قافیہ قرار دیا گیا۔ بقول مؤلف فرہنگ آنند راج اس تبدیلی کی وجہ احتیاط تھی کہ کافر بمعنی منکرِ اسلام ایسے شخص کے لیے استعمال نہ ہو جو واقعتاً اسلام کا منکر نہیں۔

اردو میں کفر کا لفظ اپنے ابتدائی عربی مفہوم یعنی پوشیدہ کرنے، چھپانے کے لیے نہیں آتا بلکہ صرف ثانوی مفہوم میں استعمال کیا جاتا ہے یعنی انکار کرنا، خدا کو تسلیم نہ کرنا، وجود خداوندی سے انکار کرنا۔ احسان ناشناسی کے لیے اردو میں کفر کے بجائے عموماً کفران کا لفظ بولا جاتا ہے۔ کافر کو اردو میں ثانوی عربی مفہوم اور فارسی مفہوم دونوں کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ احسان ناشناس کے لیے اردو میں کافر کو بجائے مطلقاً کے عموماً اضافت کے ساتھ بولا جاتا ہے مثلاً کافر نعمت وغیرہ۔ کافر کا یہ استعمال فارسی ہی سے مستفاد ہے چنانچہ ؎ کافرِ نعمتم مسلمانی مرادر کار نیست میں مراد کافر حقیقی نہیں کافر مجازی ہے۔ اردو میں کافر کو ڈھیٹ اور ضدی کے معنی میں بھی کثرت سے استعمال کیا جاتا ہے اور یہ استعمال غالباً انکار کے مفہوم ہی سے مستعار ہے یعنی وہ جو کسی طرح بات مان کر نہ دے جیسے ؎ لیکن یہ بڑا کافر دل ہے مایوس نہ اپنا ہو سکا۔ فارسی میں کافر کا یہ استعمال نظر سے نہیں گزرا۔

کفر کے لفظ کی مؤلف کی تشریح کا سب سے عجیب پہلو یہ ہے کہ "قرآن میں ہے جب حق آتا ہے تو باطل غائب ہو جاتا ہے چنانچہ کفر کو بھی ایسی چیز تصور کیا گیا جو دیکھتے دیکھتے غائب ہو جائے"۔ قرآن میں یہ تو ہے کہ "بل نقذف بالحق علی الباطل فیدمغہ فاذا ھو زاھق" (ایسا نہیں ہے بلکہ ہم تو حق کو باطل پر پھینک مارتے ہیں جو اس کا سر توڑ ڈالتا ہے اور باطل دیکھتے دیکھتے مٹ جاتا ہے) لیکن یہ بات صرف ذہنی اختراع ہے کہ "کفر کو ایسی چیز تصور کیا گیا جو دیکھتے دیکھتے غائب ہو جائے"۔ کفر کے لفظ کا کوئی ایسا استعمال جس میں غائب ہو جانے کا مفہوم پایا جاتا ہو عربی، فارسی یا اردو کی کسی لغت میں ملتا ہے اور نہ ادب میں۔ اگر اس مفہوم کو قرآن کی آیت سے نکالنے کی کوشش کی گئی ہے تو یہ مزید ستم ظریفی ہے۔ کفر یقیناً باطل ہے لیکن ہر باطل تو کفر نہیں ہوتا۔ کفر کے علاوہ بھی اور کتنی ہی چیزیں باطل ہیں۔ اس لیے قرآنی آیت کے باطل کو جس میں اطلاق پایا جاتا ہے اور جس میں کفر اور غیر کفر دونوں طرح کے امور شامل ہیں صرف کفر کے لیے مقید کر دینا غلط انداز فکر ہے۔

(مضمون کا باقی حصہ آئندہ شمارہ میں ملاحظہ فرمائیں)

آپ کی پسند کی تمام کتابیں
ہم سے طلب فرمائیں

غزلیں

شاہین بدر

دھوپ میں اپنے ہی سائے کا کفن لیجائیں گے
ہم جہاں بھی جائیں گے یہ پیرہن لے جائیں گے

جب بڑھیں گے سبز لانوں کی طرف سورج کے ہاتھ
ساتھ اپنے گلستاں کا بانکپن لے جائیں گے

ورنہ پیلی دھوپ پی جائے گی سارا سبز خون
خشک پتوں کی چتا اہلِ چمن لے جائیں گے

ریگزارِ آرزو پیاسا نہ رہنے پائے گا
اپنی ان آنکھوں میں ہم گنگ و جمن لے جائیں گے

ساعتوں کی وادیِ ظلمات میں شاہین بدر
ہم سنہری صبح کی پہلی کرن لے جائیں گے

▲▲

ساحل احمد

آسماں زرد ہوا ہے لوگو
کتنی مخدوش فضا ہے لوگو

موسمی فکر اُٹھی ہے دل میں
آئینہ سبز ہوا ہے لوگو

کچھ بھی دستِ ہوس کا قصہ
آئینہ ٹوٹ گیا ہے لوگو

جاتے موسم کا وداعی تحفہ
ایک پتہ ہی بچا ہے لوگو

اتنی وحشت کہ ہوا کا چہرہ
تختۂ مشق بنا ہے لوگو

▲▲

ندرت نواز

سمجھانے سے کیا ہونا تھا
اُس کو تو اُس کا ہونا تھا

ہر شے میں رہ کر بھی اُس کا
ہر شے سے پردہ ہونا تھا

چاہے بچھڑتے چاہے ملتے
آنکھوں کو گیلا ہونا تھا

پربت بھی چپ چاپ کھڑے تھے
ٹیلوں کو اونچا ہونا تھا

کیوں مرتا تھا خود پہ ندرت
کب تجھ کو تیرا ہونا تھا

▲▲

★ پوربی سرائے روڈ، مونگیر ۸۱۱۲۰۱ ★ ایوننگ کرسچن کالج، الہ آباد ۲۱۱۰۰۳ یوپی ★ ٹیکنیکل انسپکٹر، بنگلا اسٹریٹ، امروہہ ۲۴۴۲۲۱

نظمیں

عزیز انل وارثی

(۱)

تم نے اپنی جیبوں کے اندر
کتنے "تم" رکھے ہیں بھر کر
تم ــــ ہر "تم" کو
حسبِ موقع
جیب سے اپنی باہر لاکر
لوگوں میں بکھرا دیتے ہو
سب کو خوش تم رکھتے ہو

(۲)

میں نے اپنے دوستوں کو لکھ دیا
ایک لفظ کا وہ خط لکھیں
ملال ــــ یا خوشی
اور بس ــــ
کچھ نہیں ــــ
"کارِ جہاں دراز ہے ــــ!"

(۳)

راستے مسدود تھے
سلسلے محدود تھے
آدمی مردود تھے
ہم بچے ہیں ــــ کس طرح ؟؟ ــــ

(۴)

زندگی رسوا ہوئی
آرزو سودا ہوئی
گفتگو بے جا ہوئی
ان کے میرے درمیاں

شہلا نگار شمسی

جمتے لمحے بکھرتا وجود

ڈاکٹر نے کہا ہے
بستر سے اٹھنا
میرے لیے خطرۂ جاں ہے
اور یہاں
لیٹے لیٹے پیٹھ میں اک جلن سی ہوتی ہے
اور احساس میں ایک چبھن سی
کتابیں ؟
اب بہت بور کرتی ہیں
انھیں چھونے سے بھی جی ڈرتا ہے
ریڈیو ؟
اب اس کی آواز سے بھی
اک ٹھیس سی لگتی ہے
اہلِ خانہ ؟
ان کی فرصت کی چند گھڑیاں
میرے بیکار وقت کا سہارا نہیں بن سکتیں
دوست ؟
ان کی پرلطف صحبتیں
جیسے جلتے توے پہ دودھ کی چند بوندیں
مناظرِ قدرت ؟
کیسے دیکھوں
حدِ نظر تک صرف چھت اور دیواریں ہیں
لمحے ؟
جو کبھی ٹھہرے نہیں تھے
اب آ کے میرے پاس جم سے جاتے ہیں
کاش ڈاکٹر سمجھ سکتا
یہ لمحے کتنے بھاری ہیں!

۵۵

★ معرفت ڈاکٹر خورشید عالم ۔ ایم سی پی ڈبلیو بی ۔ ایم سی ایچ پٹنہ ۴

نیا سورج ۔ نئی کروٹ

ریاست حسین فاروقی

بعد ایک مدت کے
صبح پھر سے جاگی ہے
حوصلوں نے نگلا ہے
اس کریہہ منظر کو
جس کے خوف سے دُنیا
سہمی سہمی رہتی تھی

ہر طرف تھا سناٹا
ہر جگہ تھی مجبوری
ہر جگہ تشدد تھا
ہر جگہ اندھیرا تھا

پیاس، ہر طرف ارزاں
بھوک، ہر طرف زندہ
ہر طرف، گریباں چاک
اس حسین دُلہن کا
جس کو لائے تھے مجنوں
سر کو ہاتھ پہ لے کر
رات کی سیاہی سے
ظلم کے شکنجے سے
کتنی آرزوؤں سے
اس امید کی خاطر
تاکہ پھول کھل جائیں
اور ہر طرف چڑیاں
اپنے گیت برسائیں

اپنے شوخ نغموں سے
اپنی مست چہلوں سے
دل کو تازگی بخشیں
اور آسماں سے شبنم
اس حسین دھرتی کو
چوم چوم کر خوش ہو
آسمان کی چادر
اپنا نور برسائے

پر ہماری نخوت نے
جام عشرت و انوار
سب ہی توڑ کر پھینکے
اور اس جگہ پہنچے
جس جگہ سے انساں کو
خود سے شرم آجائے

کس میں اتنی ہمت تھی
کس میں اتنا کس بل تھا
سامنے جو آ پائے
اپنی بات کہہ پائے
دوسروں کی سن پائے
اور حقائقِ سنگیں
جو تھے ہر طرف عریاں
خود کو اُن سے ٹکرا کے
زندگی کو لے جائے

اس حسین دنیا میں
جس میں پیار کا امرت
حسن کی جوانی ہو
اور بہار کے جھونکے
سب کو زندگی بخشیں
ہاں مگر یہ جرأت ہے
اُن عظیم لوگوں کی
جو نکال کر لائے
صبح کو سیاہی سے

یہ جو صبح جاگی ہے
یہ جو دن سا پھیلا ہے
روشنی سی چمکی ہے
سب انھیں کی برکت ہے
اور یہ نیا سورج
خوف کو مٹائے گا
تفرقوں کی دیواریں
سلسلے تشدد کے
سب ہی ٹوٹ جائیں گے
اور اب ہر اک انساں
زندگی کے ہر رُخ کو
اس حسین دھرتی پر
پیار سے سنوارے گا
پیار کا نیا سورج
سب کو زندگی دے گا ۸۸

۸۸۔ چمن پورہ۔ اودے پور (راجستھان)

مراجعت

عبدالرحیم نشتر

میں اپنے کھنڈرات میں جیون گزار رہا تھا۔ دن آرہے تھے۔ راتیں گزر رہی تھیں۔ ڈوبتے ستاروں اور اُگتے سورجوں کے درمیان اپنے زخموں کی مدارات کرتا ہوا میں ایک سادھارن ویکتی ——! اپنے گناہوں اور اپنی نیکیوں کے لیکھن واچن سے بے نیاز ہو کر، گزرتے لمحات کی مہکار —— بڑی بھلی اور میٹھی سوندھی مہکار کو اپنے سینے میں اُتار کر اپنی رگوں میں خون بنا کر دوڑا رہا تھا اور اپنی ساری اُلجھنیں، ساری چنتائیں اور ساری فکریں سانسوں کی ڈوریں باندھ کر کھلی ہوا میں عمر کی الگنی پر لٹکا رہا تھا کہ اچانک گھنگھور گھٹا چھا گئی۔ سرمئی اور نیر دئی بادل چاروں اور سے امڈ امڈ کر آگئے۔ میرا آکاش ایک سرے سے دوسرے سرے تک ظلمات کے اندھے ہاتھیوں کے لشکر سے گھر گیا۔ بپھرے ہوئے سیاہ فیل —— پھن پھناتے ہوئے تیرہ و تار ہیولے ——! وہ مجھ پر اس طرح ٹوٹ کر برسے کہ میرے مانوس خرابے جل تھل ہو گئے —— پھر اس زور کی باڑھ آئی کہ مجھے اپنا خون پلا کر شکتی دینے والی دیواریں گرنے لگیں اور میں ان دیواروں تلے دبنے لگا۔

میں نے نیلمبر سے پرارتھنا کی۔ وہ اپنی نیلی نیلی آنکھیں اور شیام رنگ ہونٹوں سے مسکراتا ہوا میری سہایتا کو دھرتی پر اُتر آیا۔ بے رحم ہوائیں تھم گئیں۔ پانی کے رواں دھارے رُک گئے اور چنگھاڑتے بادل شانت ہو گئے۔ شیام رنگ آتما ایک ناؤ بن گئی اور میں اپنے مانوس کھنڈرات کی پناہ گاہوں سے نکل انجان جزیروں کی طرف چل پڑا۔

جزیروں میں کوئی آدم زاد نہ تھا۔ طلسمی جل پریاں تھیں، نیلے نیلے ملبوس، سیمیں سیمیں زلفیں، فیروزی لب، فیروزہ بدن ——! میرا سراپا نیلم اور پکھراج کا انعکاس ہو گیا۔ اپنے سیاہ بدن سے ٹکراتی ہوئی نیلی نیلی شعاعوں میں زرد رنگ کی چاہت گھول کر میں ان پری پیکر سیم تنوں میں اُترنا چاہتا تھا کہ ایک پری چہرہ مجھ سے خفا ہو گئی۔ غصہ میں آکر اس نے اپنے پر نوچ لیے اور میری طرح آدم زاد بن گئی۔

نیلمبر پھر میری سہایتا کو آئے اور ایک ناؤ پروان کرتے ہوئے بولے "پرانی کے من میں بڑی موہ مایا ہے۔ وہ اپنی ہوس اور طمع سے باز نہیں آتا۔ مورکھ پرانی اب تجھے اس وشال ساگر میں اُتار رہا ہوں جس میں ذرا بھی کھوٹ نہیں۔ جو تھوڑا پاپ بھی سہن نہیں کرے گا۔ اپنی آنکھیں کھلی رکھ۔"

پھر ناؤ مجھے اور اس نئی آدم زاد کو لے کر طوفانی لہروں کے جھولے پر ہچکولے لگاتی ہوئی لے چلی۔ میں اپنے پچھلے کرتوتوں سے سہما ہوا تھا اس لیے موہ مایا سے منہ موڑ کر اپنی جگہ چپ چاپ بیٹھا ہوا تھا مگر وہ جل پری جو اب ایک آدم زاد بن گئی تھی، اس میں انسانی خواہشات بیدار ہو گئیں اور وہ مجھے اپنی ضرورتوں کی تکمیل کے

بقیہ صفحہ پر

فنی بینگل سٹورز انصاری وارڈ - بھنڈارہ - ایم - ایس

سوویٹ روس میں مارکس کے رقیب کی عزّت افزائی

سریندر موہن

بیکونن، کارل مارکس کا ہمعصر اور اس کا حریف تھا۔ مارکس جب بھی اپنے حریفوں کے خلاف زبان کھولتا تھا تو حد و دِ اعتدال سے تجاوز کر جاتا تھا۔ بیکونن کے خلاف بھی اس نے جی کھول کر زبان درازی کی اور ایک بار اس بنا پر اسے پہلی انٹرنیشنل میں بیکونن سے معافی بھی مانگنا پڑی۔ مارکس اور اینگلز دونوں نے بیکونن کو "یورپی پرولتاریہ کا غدار" قرار دیا تھا اور کہا تھا کہ "اسے اور اس کے نائبین کو پرولتاری تحریک میں بدنظمی پھیلانے کے صلے میں اپنی سرپرست حکومتوں سے مدد ملتی ہے"۔

گریٹ سوویٹ انسائیکلوپیڈیا کے دوسرے ایڈیشن میں جو اس صدی کے پانچویں دہے میں شائع ہوا، بیکونن کو "مارکسزم کا جانی دشمن" اور "انارکسزم کا نظریہ ساز" قرار دیا گیا ہے۔ اس میں یہ بھی درج ہے کہ "بیکونن انقلابی تحریک کے بنیادی مفادات سے غداری کا مرتکب تھا اور یہ حقیقت ہے کہ اس نے روسی انقلابی جمہوریوں کے سلسلے میں غدارانہ رول ادا کیا"۔

حیرت ہے کہ مارکس اور اینگلز کے نام کی بدستور دہائی دینے کے باوجود روسی کمیونسٹوں نے اب بیکونن کے بارے میں اپنی رائے بدل لی ہے اور مارکس اور اینگلز کے برعکس وہ اس پر مدح و ستائش کی بارش کر رہے ہیں۔ یہ سلسلہ خروشچیف کے زمانے میں شروع ہو گیا تھا۔ لیکن بریزنیف کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد بیکونن کی خوبیوں کا واضح ترانداز میں اعتراف ہونے لگا۔ گریٹ سوویٹ انسائیکلوپیڈیا کا تیسرا ایڈیشن جو ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا ہے اس میں بیکونن کو روسی انقلابی قرار دیا گیا ہے۔ بیکونن پر پہلے جو الزام لگایا جاتا تھا کہ اس نے "زار کو خیر باد کہہ کر، آنکھوں میں آنسو بھر کر زار سے رحم کی درخواست کی تھی"، اس کی تاویل گریٹ سوویٹ انسائیکلوپیڈیا میں یہ کی گئی ہے کہ "ممکن ہے یہ بیکونن کی حکمتِ عملی ہو جس کی رو سے وہ ہر قیمت پر جیل سے باہر آنا چاہتا ہو"۔

اسی برس "ممتاز لوگوں کی زندگی" کے عنوان سے ایک سلسلۂ کتب بھی شائع ہوا۔ اس سلسلے میں بیکونن پر ایک کتاب آئی ہے جس میں لکھا گیا ہے کہ "وہ بے پناہ انقلابی قوت کا حامل تھا جو ہر جگہ انقلاب برپا کرنا چاہتا تھا"۔ کتاب میں یہ بھی درج ہے کہ بیکونن "یورپ بھر میں سوشلزم کے جرأت مندانہ دور کا نمائندہ انقلابی رہنما تھا اور سلاو اقوام کی نجات کے لیے سرگرم جہاد کر رہا تھا"۔ کتاب کی مصنفہ نے لکھا ہے کہ "جس چیز کو بیکونن کی غداری کہا جاتا ہے وہ دراصل اس کی حکمتِ عملی تھی"۔ مصنفہ کے خیال میں "کسی شخص کے عقائد کی اصولی بنیادوں کو اس کی حکمتِ عملی سے جو وہ وقتاً فوقتاً اختیار کرتا ہے خلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔ یہ بات بہت عجیب ہو گی کہ ہم بیکونن کے کسی خاص موقعے پر کہے ہوئے لفظوں سے یہ نتیجہ اخذ کر لیں کہ وہ انقلابی اصولوں سے منحرف ہو گیا"۔

نیو چائنا نیوز ایجنسی کے بیان کے مطابق روسی کمیونسٹ بیکونن کے بارے میں اپنی رائے اس لیے تبدیل کر رہے ہیں کہ وہ اس سے اپنی توسیع پسندی اور قوم پرستانہ جارحیت کا جواز پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اس ایجنسی کے الفاظ میں بیکونن اس عالمی روسی قوم پرستی اور توسیع پسندی کا

مبلغ تھا جس پر پرانے زار عمل پیرا تھے۔ جب اٹھارویں صدی کے چھٹے اور ساتویں دہے میں وہ سائبیریا میں جلاوطن تھا تو اس نے چین کے خلاف روسی جارحیت کی ستائش کر کے اپنے آپ کو زار کا وفادار خادم ثابت کر دیا۔ ۱۸۶۱ء میں اس نے اے آئی ہرزن کو جو خط لکھا تھا اس میں بڑی بے حیائی سے چین کے خلاف زاری روس کی جارحیت کی مدح کی گئی تھی۔ اور مشرقی سائبیریا کے اس وقت کے لفٹیننٹ گورنر نکولائی موزیا دلیف کی تعریف میں تو زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے گئے تھے۔ بیکونن کے نزدیک قومی جارحیت اور توسیع پسندی کا یہ ظالم علمبردار ایک نفیس شخص اور روس کا نجات دہندہ تھا۔ بیکونن نے چین پر روس کے ظالمانہ قبضے کو عظیم قوم پرستانہ کارنامہ قرار دیا۔ جب وہ مغربی یورپ میں جلاوطن تھا تو اس نے پان سلاوازم کی بلند آہنگی سے حمایت کی کیونکہ اس سے یوروپ میں زار کی توسیع پسندانہ پالیسی کے مفادات کو فائدہ پہنچتا تھا۔"

ایجنسی نے مزید کہا کہ "نکولائی اول کو بیکونن نے جو مقالہ پیش کیا تھا اس میں زار سے کہا گیا تھا کہ وہ پان سلاوازم کے حق میں جہاد کو شایت خودی اور جرأت مندی کے ساتھ جاری رکھے تاکہ روس کی عظمت میں اضافہ ہو۔ اس کے لیے مارکس اور اینگلز نے بیکونن کی کڑے لفظوں میں مذمت کی تھی۔ مارکس اور اینگلز نے لکھا تھا: یہ وہی شخص ہے جو ۱۸۶۸ء سے خود کو بین الاقوامیت کا حامی کہہ رہا ہے لیکن ۱۸۶۲ء میں اس نے روسی حکومت کے مفادات کے لیے نسلی جنگ کی تبلیغ کی تھی۔ پان سلاوازم سینٹ پیٹرزبرگ کے زاری کابینے کا اختراع تھا اور اس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا کہ یوروپی سرحدوں کو مغرب اور جنوب کی طرف پھیلایا جائے۔ نکولس کا پان سلاوازم اور بیکونن کا پان سلاوازم ان دونوں کا ایک ہی مقصد ہے اور ان دونوں میں سرمو فرق نہیں۔"

نیو چائنا نیوز ایجنسی کے الفاظ میں "آج کے نئے زاروں کی امنگیں پرانے زاروں سے بھی زیادہ ہیں وہ عظیم روسی قوم پرستی کی جارحیت اور توسیع پسندی پر اور بھی ثابت قدمی سے چل رہے ہیں۔ انھوں نے چین کے صرف انھی علاقوں پر قبضہ قائم نہیں رکھا جن پر زار شاہی کے عہد میں قبضہ ہوا تھا بلکہ وہ ان علاقوں پر بھی قبضہ جمانے کی کوششیں کر رہے ہیں جن پر قبضہ کرنے میں زار ناکام رہے تھے۔ پرانے زار صرف یہ خواب دیکھتے تھے کہ یوروپ پر اپنی بالادستی قائم کریں اور مشرقی یوروپ کی سلاو اقوام کو اپنے زیر نگیں لے آئیں۔ نئے زار صرف یوروپ پر ہی قبضہ کرنا نہیں چاہتے بلکہ ایشیا افریقہ اور لاطینی امریکہ میں بھی اپنی توسیع پسندی کا جال پھیلا کر دنیا بھر کے آقا بننا چاہتے ہیں۔"

"گزشتہ دس برس کے دوران سوویٹ توسیع پسندوں نے چین کے خلاف زاری روس کی جارحیت کا جواز پیدا کرنے کے لیے تاریخ کو مسخ کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ وہ اس قسم کی دلیلیں پیش کرتے رہے ہیں کہ یہ دوسری طاقتوں کی نو آبادیاتی توسیع پسندی کا توڑ تھی۔ بیکونن پر اپنی رائے میں نئے زاروں نے جو تبدیلی کی ہے اس کا مقصد یہی ہے کہ سوشلسٹ سامراجی توسیع پسندی کے مقصد کو تقویت پہنچانے کے لیے بیکونن کے بھوت سے بھی مدد لی جائے۔"

"تاریخ کو مسخ کرنا ممکن نہیں۔ اس کوشش میں کوئی بھی کامیاب نہیں ہو سکا۔ بیکونن پر مارکس اور اینگلز کے فیصلے کو مسترد کرنے کی کریملن کی کوششیں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ اس سے صرف یہی ہوگا کہ بریزنیف اور ان کے ساتھی پوری طرح بے نقاب ہو جائیں گے اور لوگ سمجھ لیں گے کہ وہ مرتد سوشلسٹ سامراجی ہیں۔"

دھویں کی دیوار

تنہا تماپوری

کچھ ہی دیر پہلے دھوپ کا جو ٹکڑا میرے قدموں سے لپٹا ہوا تھا وہ اب اس کھڑکی میں اُتر چکا ہے۔

پتہ نہیں کھڑکی کے اُس پار کیا ہوگا؟

ابھی تو میں کھڑکی کے اس طرف ہی کھڑا ہوا ہوں اور خود کو اُس خواہش کے بوجھ تلے دبتا ہوا محسوس کر رہا ہوں جو ابھی ابھی کسی انجان سمت سے مجھ پر آ گری ہے۔

خواہش :

کاش! میں نے اُس ٹکڑے کو اپنے پیروں تلے مسل دیا ہوتا!!! —— اب —— کہ یہ بوجھ مجھ پر مسلط ہو چکا ہے —— دھوپ کی تلاش ناگزیر ہے! —— اگر میں اِس کھڑکی سے جھانکنے کی کوشش کروں تو ——؟!

میری نظریں کسی بھی آنکھ میں میرے سوال کا جواب کھوجنا چاہتی ہیں مگر ہر آنکھ نہ جانے کیوں تحقیر کے دھویں سے بھری ہوئی ہے۔ دھواں، جو ہمیشہ یہ احساس دلاتا ہے کہ یہیں کہیں قریب ہی دھیمی دھیمی آگ سُلگ رہی ہے۔ دھویں کی اِس دیوار کو پھلانگ کر اُس آگ تک پہنچنا شاید میرے لیے ایک مشغلہ بن گیا ہے۔ میں برس سے میری سانسیں جس گھٹن کا احساس دلا رہی ہیں اس نے اسی آگ سے جنم لیا ہے۔ آگ سے اِس قریبی رشتے نے مجھے وہ صلاحیت ودیعت کر دی ہے جس کے سہارے میں دھویں کے کے راستوں سے پوری طرح واقف ہو چکا ہوں.....

ذِلت اور رسوائیوں کا یہ دھواں —— یہ گھٹن.....

مگر مجھے تو دُھوپ کی تلاش ہے اور میں اِن دھواں بھری آنکھوں سے آگ تک پہنچنے کی بات سوچ رہا ہوں۔ ایک ہی وقت میں دو کام اپنے وجود سے باہر کیسے انجام دیے جا سکتے ہیں شاید میں اُس خوف سے فرار حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں ——

خوف :

کھڑکی کے اس پار اگر چاندنی بکھری ہوئی ہو —— تب ——؟؟!!

اگر یہ کھڑکیاں مجھ سے روٹھی ہوئی اُس چاندنی کا پتہ نہیں بتا سکتیں تو پھر اُس کی یاد کو میرے سامنے کیوں لے آتی ہیں۔

برسوں پرانی بات ہے،

مگر مجھے ہمیشہ ایسا لگتا ہے کہ یہ کل ہی کی بات ہو۔

دِن کے آسمان کی جلتی ہوئی گولائی شام کے آسمان کے ٹھنڈے اندھیروں میں اپنی تھکن چھپانے جا چکی تھی۔ چراغوں کی گردن پر شعلوں کے چہرے اُبھرنے لگے تھے ایک چراغ اپنی بڑھتی ہوئی لو کے ساتھ کھڑکی سے جھانکنے لگا تھا۔ اُس کی روشنی، اندھیری گلی میں دُور تک پھیلنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ میرے پاؤں کے نیچے کی زمین پہ کھڑکی اپنی پوری سلاخوں کے ساتھ اُتر آئی تھی —— اور —— میں اپنے آپ کو ان سلاخوں کے پیچھے ایک ایسا قیدی محسوس کرنے لگا تھا جسے عمر قید کی سزا دی گئی ہو ——

وہ سزا کتنی حسین تھی۔

کھڑکی کے اُس پار کی چاندنی کو میں نے دیکھ لیا تھا۔

پوسٹ رنگم پیٹ (۵۸۵۲۲۰) ضلع گلبرگہ۔ کرناٹک

میرے اور اُس کے درمیان چراغ کی گردن پہ کھڑے ہوئے شعلے کا چہرہ سُرخ ہونے لگتا جب ــــ تن پر غصّے اور نفرت کی سُرخی چھا جاتی ہے ــــ تو ــــ چاندنی ڈوب جاتی ہے!

جب ــــ گلی میں کھڑکی اپنی پوری سلاخوں کے ساتھ اُتر کر پھیل جاتی ہے ــــ تو ــــ کوئی قیدی اپنے سینے میں ایک انجانی آگ لیے بھٹکنے لگتا ہے!!

بیس برسوں تک بھٹکنے کے باوجود مجھے اُس چاندنی کا ایک چھینٹا بھی نصیب نہ ہوسکا۔ کیونکہ ــــ

دُور دیش کے ایک کالے بادل نے سُرخ چہروں سے پوری چاندنی خرید لی تھی۔ بوڑھے سُرخ چہروں نے اپنے انتقام کو میرے اندر ــــ جلتی ہوئی آگ میں بدل دیا تھا کیونکہ وہ اُس چاندنی کے مالک تھے ــــ وہ آگ مجھ میں کسی کی امانت بن کر آج بھی سُلگ رہی ہے ــــ!

بیس سال پہلے میں ایک بیوہ دھرتی کا بیٹا تھا۔ جس کی مرجھائی ہوئی فصلوں پر اُس چاندنی کے دھوئیں کی شبنم مسکرایا کرتی تھی اور ــــ

آج میں ایک فیکٹری کا مالک ہوں جس کی چمنیوں سے نکلتے ہوئے دھوئیں میں میری آگ نے ایک دوسرا ہی روپ اختیار کرلیا ہے۔

درخت کٹ کر چولہے کا پیٹ بھرتا ہے یا مختلف شکلیں بدل کر ایک سے انیک ہو جاتا ہے یہ تپائی جس پر گوتم کا یہ خوبصورت مجسمہ کھڑا ہوا ہے کسی ٹوٹے ہوئے درخت کا ہی ایک انگ ہے۔

میں بھی ٹوٹ چکا ہوں ــــ

میرا اکلوتا انگ، میرا سورج ــــ ابھی ابھی اُس کار میں باہر چلا گیا ہے جو اُس کالے بادل کی چاندنی نے سورج کے جنم دن پر تحفہ میں پیش کی تھی۔

میرے سورج نے اپنا یہ جنم دن اُس چاندنی کے ساتھ ایک ایسی ہوٹل میں منایا جس کی کھڑکی سے بے شمار بلب کچھ اس طرح جھانکتے ہیں کہ کھڑکی اپنے شیشوں کے ساتھ نیچے زمین پر پھیلتی ہوئی دکھائی نہیں دیتی۔

وہ سلاخیں کس قدر مضبوط تھیں!!

اور یہ شیشے کس قدر نازک ہیں!!

میری فیکٹری کی چمنیوں سے دھواں نکل رہا ہے اور میں کسی بھی آنکھ سے دھوپ کا پتہ پانے کی کوشش کرتے ہوئے ہر آنکھ میں دھواں دیکھ رہا ہوں۔ دھواں چاروں طرف پھیل چکا ہے میں دھوئیں کے راستوں سے آگ تک پہنچنے کا عادی بن چکا ہوں۔

مگر

اب کہ دھوپ کا یہ ٹکڑا اُس کھڑکی میں پوری طرح اُتر چکا ہے۔

میں اپنی چاندنی اور اپنی دھوپ کو کھو کر دھوئیں کی دیوار میں دفن ہو چکا ہوں ــ میرے اندر کہیں کوئی شیشہ ٹوٹ چکا ہے آگ کا زہر کرچیوں پر پھیل گیا ہے کچھ ہی دیر بعد ــــ!

یہ بہتا ہوا خون بھی منجمد ہو جائے گا۔

اور میرا سناٹا مٹی بن جائے گا.... !!!

۵۵

بسمل سعیدی

شخص اور شاعر

بسمل سعیدی کے فکر و فن پر دستاویزی اہمیت کی حامل کتاب ممتاز اہلِ قلم کے مضامین کا مجموعہ۔ آخر میں بسمل صاحب کا انٹرویو بھی دیا گیا ہے جو ہماری تاریخِ ادب کے بہت سے مخفی گوشوں کو سامنے لاتا ہے۔ قیمت: اٹھارہ روپے

نیشنل اکادمی، انصاری مارکیٹ، نئی دہلی

غزلیں

حبیب احمر

سیاہ شب میں جہاں تک مری نظر جائے
لکیر یادوں کی اُجلی سی اک اُبھر جائے

جو ایک درد مقید سکوتِ لب میں ہے
فضا میں آہ نہ بن کر کہیں بکھر جائے

کشش یہ بڑھتے ہوئے فاصلوں کی ہے شاید
کہ بار بار تری سمت اب نظر جائے

اسی خیال سے خاموش رہ گئے ہم بھی
کہیں نہ طرزِ تخاطب میں زہر بھر جائے

سفر طویل تعلق کا ہو گیا احمر
عجب نہیں کہ کوئی حادثہ گزر جائے

▲▲

حسن عزیز

مل نہیں پایا ان آنکھوں کو کہیں ملبوسِ آب
پھر رہی ہے دھوپ کے صحراؤں میں تعبیرِ خواب

صبح ہوتے ہی شعاعوں میں بٹا ہے آفتاب
بچ نکل آتے ہیں اکثر رات کے بوسیدہ خواب

مجھ سے ان تشنہ سوالوں کو نہ مل پائے گا کچھ
لکھتا رہتا ہوں میں سطحِ آب پر اپنا جواب

توڑ کر سارے حصاروں کو چلا آیا ہے وہ
چاہتا میں بھی نہیں تھا درمیاں کوئی حجاب

میں جسے پڑھ بھی نہ پاؤں ایسی تحریرِ نفیس
یعنی اس نے دی ہے مجھ کو ایک لاحاصل کتاب

▲▲

خالد محمود

اس کے خلوص و مہر و مروت کا شکریا!
آج اُس نے مجھ کو دیکھ کے پہچان تو لیا

جن راستوں پہ دھوپ تھی اب دھوپ بھی نہیں
سورج نے اپنا سایہ بھی سر سے اٹھا لیا

میں سوچتا تھا آئینہ ہی داغدار ہے
داغ آئینے کے دھو لیے چہرہ وہی رہا

ہر شے ہر ایک شے کی طرح بے ثبات ہے
کچھ دن کے بعد تو بھی مجھے بھول جائے گا

خالد میاں یہ زیست کوئی کھیل تو نہیں
اک بات میں ہی آپ کا چہرہ اتر گیا

▲▲

غزلیں

ڈاکٹر ابوالمحامد حامد

ملگجی سی روشنی میں حادثہ اک ہو گیا
رات کا آسیب میرے گھر میں آکر سو گیا

ہو گیا فرض کفایہ سب کی جانب سے ادا
آکے اک پاگل جنازے پر کسی کے رو گیا

کاٹنے آئے نہ جانے فصل کب ویسے تو وہ
بیج زہریلے دماغوں میں سبھی کے بو گیا

اپنی صورت آڑے ترچھے آئینے میں دیکھ کر
قہقہوں کی بھیڑ میں حامد اچانک کھو گیا

●●

اسلام پرویز

اس طرح کا خواب میں نے آج تک دیکھا نہ تھا
اپنی ہی آواز پہ خود اس قدر چونکا نہ تھا

سب کے سب تاریکیوں کے غار میں گم ہو گئے
میں نے جب نظریں اٹھائیں ایک بھی چہرہ نہ تھا

سخت تر دشواریاں حائل تھیں میری راہ میں
دور تک صحرا ہی صحرا تھا، کہیں سایہ نہ تھا

خانۂ دل میں یہ اب کس کا بسیرا ہو گیا
پہلے اس ویران گھر میں کوئی بھی رہتا نہ تھا

یہ محبت کی کہانی ان دنوں کی بات ہے
وقت کے گیسو میں جب پرویز خم آیا نہ تھا

●●

اسماعیل ذبیح

لوگ کیوں سمجھیں گے مجھ کو بے گناہوں میں میاں
میں رہا ہوں آیتِ حق کے گواہوں میں میاں

ہر طرف بھڑکے ہوئے شعلے ہیں راہوں میں میاں
کب میں آتا ہوں نگہبان کو نگاہوں میں میاں

سر پٹکتا ہے ہوس کی سخت باہوں میں میاں
آج کا ہر شخص ہے میری نگاہوں میں میاں

کر رہی ہیں پھر تعاقب خوف کی پرچھائیاں
میرے خوابوں کی سنہری خواب گاہوں میں میاں

جگمگاتی بستیاں کیوں چھوڑ کر جائیں ذبیح
روشنی ناپید ہے اب خانقاہوں میں میاں

●●

★ سکریٹری ترقی اردو ادب، اردو اسٹیشن روڈ بیرتی ہٹا۔ بستی ۲-۲۷۲ ★ ڈاکخانہ ہسول، سیتامڑھی (بہار) ★ محلہ لوری سرونج (ایم۔پی)

نظمیں

حق اعظمی

لمحے کا زوال

مسلسل جھنجھناہٹ رنگ برساتے ہوئے موسم
ہوائیں ہمسفر
جب گھر سے میں نکلا،
مجھے باہنوں کے ہالے میں لیے
جلتی دوپہر میں
بھیگتی راتوں
سمٹتے دن، ادھوری صبح اور گرد ھوبی شاموں میں
مری اگوائی کرتی ———
جنگلوں، مردہ سمندر، گھاٹیوں، پگڈنڈیوں بے نور راہوں میں
وہ شاید ڈھونڈھتی ہی پھر رہی ہو گی
مگر،
میں ہوں کہ چلتا جا رہا ہوں خامشی کے دشت میں تنہا
صدا کی مٹھیاں بھنچتی ہی جاتی ہیں
وہ اک آواز جو مجھ میں ہی جنمی تھی
مجھے اب ڈوبتی معلوم ہوتی ہے

شفیع اقبال

خواہشِ بے زباں

یہ حقیقت ہے کہ تم ہو مری ہمرازِ حیات
میں کہ فنکار ہوں
احساس کا مارا میں ہوں
میں محبت کے سمندر میں بکھرنا چاہوں
ٹوٹ کر چاہے کوئی، ہے یہ تمنا میری

تم نہ ہو پاس تو
اِک یاد بگولہ بن کر
میرے اس جسم کے صحرا کے ہر اک گوشے میں
کرب کی دھول لیے پھرتی ہے ماری ماری
لمحہ لمحہ مرا احساس جھلستا ہے
مگر
تم جو آجاؤ ہو
معمول پہ آجاتی ہے دُنیا میری
پھر وہی جھگڑے
شب و روز کی ذمہ داری
یہ تمنا کہ مجھے ٹوٹ کے چاہے کوئی
یہ تصور کہ میں تمثیلِ وفا بن جاؤں!
یہ حقیقت ہے کہ تم ہو مری ہمرازِ حیات
میری ضرورت ہو مگر
یہ تو مشکل ہے
کہ تم ٹوٹ کے چاہو مجھ کو
اور میں تمثیلِ وفا بن جاؤں!!

★ ۱۹۱ - انوگرہ پوری کالونی - گیا (بہار)
★ ۹-۵-۴۹۲ نامپلی مارکیٹ، حیدرآباد - ۵۰۰۰۰۱

کیا ماؤ کی بیوہ چین کی ملکہ بننا چاہتی تھی؟

ستیہ پرکاش

کمیونسٹ نظام میں اقتدار کی سازشانہ جد و جہد میں جو بھی ہارتا ہے وہ بدی کا مجسمہ بن جاتا ہے۔ ماؤزے تنگ کی بیوہ چیانگ چنگ خود کو اپنے کئی رفیقوں کے مقابلے میں زیادہ سیاسی اور بہتر کمیونسٹ سمجھتی تھی لیکن اس کے زوال کے بعد چینی اخباروں میں اس پر الزام لگایا جا رہا ہے کہ وہ پورے طور پر "خود پرور خواتین" کی نمائندہ تھی اور چین کی ملکہ بننا چاہتی تھی ظاہر ہے کہ کسی کمیونسٹ ملک کے اخباروں میں جو کچھ چھپتا ہے اس سے صرف ہوا کے رخ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ان خبروں سے کوئی غیر جانبدار شخص یہ اندازہ نہیں لگا سکتا کہ ان میں کتنا جھوٹ ہے اور کتنا سچ۔

چیانگ چنگ کے بارے میں برسر اقتدار گروہ کے رویے کا اظہار اس بات سے ہوتا ہے کہ گزشتہ اکتوبر میں جب اس کا زوال ہوا، اس میں اور چین کی تین سابقہ حکمران یا قائم مقام حکمران خواتین میں مشابہتیں تلاش کی جا رہی ہیں ان میں سے ایک ملکہ لو شیہ ہے جو ان خاندان کے پہلے شہنشاہ ہیو یانگ کی بیوی تھی اور اس کی موت کے بعد اس کے خاندان کے مختلف افراد کے نام پر حکومت کرتی رہی۔ دوسری ملکہ ہو ٹسیہ ٹین ہے یہ تانگ خاندان کے شہنشاہ ثانی لسٹو نگ کی بیوہ تھی اور اپنے خاوند کی موت کے بعد شہنشاہ کا لقب اختیار کر کے ۶۹۰ء سے ۷۰۵ء تک حکومت کرتی رہی — تیسری چیانگ خاندان کی ملکہ ٹز و ہسیہ جس نے ۱۸۶۱ء سے ۱۸۸۹ء تک بیوہ ملکہ کی حیثیت سے اور ۱۸۹۸ء سے ۱۹۰۸ء تک قائم مقام حکمران کی حیثیت سے حکومت کی —

ان تینوں ملکاؤں کے بارے میں چینی مورخوں کی رائے کچھ اچھی نہیں رہی۔ اس کی وجہ ایک تو یہ ہو سکتی ہے کہ یہ عورتیں تھیں اور غاصب بھی اور دوسری یہ کہ ان کے زمانے میں انتظام حکومت بھی اچھا نہیں رہا۔ ان میں سے ملکہ ہو کے بارے میں چین کے اندر بھی اور چین کے باہر بھی کافی تحقیق ہوئی ہے جس کی بنا پر انداز نظر میں کچھ تبدیلی بھی آئی ہے لیکن جہاں تک انقلابی چین کا تعلق ہے اس کے نزدیک یہ تینوں خواتین جابرانہ اور بے بصیرت حکومتوں کی نمائندہ تھیں، لہٰذا ان میں چیانگ چنگ کی دلچسپی کو خاص طور پر شک و شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ "ریڈ فلیگ" کے ۱۹۷۷ء کے پہلے شمارہ کے مطابق چیانگ چنگ نے ہو کے ساتھ برملا طور پر اپنا موازنہ کیا تھا۔

کینٹن ریڈیو کے ۱۲ر نومبر ۱۹۷۶ء کے نشریے کے مطابق چیانگ چنگ نے صوبہ کوانگ تنگ کی چنگ شان لائبریری کے عملے سے کہا تھا کہ وہ اسے "قدیم شاہی خاندانوں کے رسم و رواج اور ان کے آداب حکمرانی کے بارے میں کتابیں فراہم کریں"۔ "ریڈ فلیگ" نے اپنے متذکرہ بالا شمارے میں یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ چیانگ چنگ اور اس کے ساتھیوں کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ ملکہ لو اور ملکہ ہو کے حق میں پروپیگنڈہ کر کے پارٹی اور ریاستی اقتدار پر ناجائز قبضہ جما لیں اور چیانگ چنگ کو چین کی ملکہ قرار دے دیں۔ انھوں نے ماضی کی ۵۱ دو

ملکاؤں کے حق میں پروپیگنڈہ اپنے سیاسی مقاصد کے لیے کیا۔ چیانگ چنگ پر کینٹین ریڈیو نے اپنے ۵ دسمبر ۱۹۷۶ء کے نشریے میں یہ الزام بھی لگایا ہے کہ وہ قدیم ملکاؤں کے ملبوسات کے بارے میں معلومات حاصل کر رہی تھی تاکہ وہ تخت نشینی کے لیے اس نمونے کا شاہی لباس اپنے لیے بھی تیار کرائے۔ اس نے کھلے کالر کا ایک ایسا لباس تیار کرایا تھا جو قدیم شاہی کے اشرافیہ اور خوش حال گھرانوں کی عورتیں پہنتی تھیں ۱۹۷۵ء کے وسط میں اس قسم کا لباس دوکانوں پر بھی سجایا گیا۔ اس قسم کے لباسوں پر یہ چیٹ آویزاں ہوتی تھی کہ یہ لباس پہننے کی عام اجازت ہے لیکن ننگھائی ریڈیو نے اپنے ۲۹ نومبر ۱۹۷۶ء کے نشریے میں کہا کہ چیانگ چنگ کا رائج کردہ یہ قومی لباس مقبول نہیں ہو سکا۔

چیانگ چنگ پر ذاتی حملے کا ایک اور انداز یہ ہے کہ اس کا ماؤ کی پہلی بیوی یانگ کائی ہوی سے موازنہ کیا جاتا ہے جو ۱۹۳۰ء میں ۲۹ برس کی عمر میں قوم پرستوں کے ہاتھوں ہلاک ہو گئی تھی۔ ۲۴ نومبر ۱۹۷۶ء کو ہونان کے صوبے میں مرحومہ کی قبر پر خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے جو جلسہ ہوا اس میں لوگوں نے اس بات پر اس کی بہت تعریف کی کہ وہ ماؤ اور اس کے انقلابی طریقہ کار کی وفادار اور چینی انقلاب کی سرگرم حامی تھی (چانگسا ریڈیو، ۲۵ دسمبر ۱۹۷۶ء) پیکنگ ریڈیو نے ۷ دسمبر ۱۹۷۶ء کو اپنے نشریے میں کہا کہ چیانگ چنگ یانگ کائی ہوی کے کارناموں کو شہرت دینے کی اجازت نہیں دیتی۔ وہ یہ تک نہیں چاہتی کہ اس کا کہیں نام بھی لیا جائے۔ "پیپلز ڈیلی" کے ۲۲ دسمبر ۱۹۷۶ء کے اداریے میں درج ہے کہ ماؤ خود بھی چیانگ چنگ کی مجنونانہ آرزومندی اور اس کے ضدی پن سے نالاں تھا۔ "ریڈ فلیگ" کے ۱۹۷۷ء کے پہلے شمارے میں یہاں تک کہا گیا ہے کہ ماؤ نے ہوا کیو فینگ کو ملکہ لو کے خاوند کی کہانی سنائی تھی جس نے اپنی موت سے قبل یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ لو اور اس کا قبیلہ ریاستی اقتدار پر قبضہ کرنے کی سازشوں میں مصروف ہے۔ اور یہ کہ چینی رائے عامہ کو اس بنا پر بڑا صدمہ پہنچا ہے کہ چیانگ چنگ نے گزشتہ اگست میں ماؤ کی آخری بیماری کے وقت نہ اس کی تیمارداری کی نہ اسے توجہ کا مستحق سمجھا۔

آسمانِ صحافت پر چمکنے والا نیا ستارہ
ہفت روزہ
وقت و صداقت
جو آئینِ جوانمردی حق گوئی و بیباکی کا آئینہ دار ہوگا
بہت جلد منظرِ عام پر آ رہا ہے

دفتر ہفت روزہ وقت و صداقت ۲۹۴ پالم روڈ
حیدرآباد
فون:- ۴۲۳۸۴

اردو کے معتبر ناقدین کے بہترین مضامین کا انتخاب
فن اور تنقید
مرتب:- انور کمال حسینی
اس کتاب میں احتشام حسین، آل احمد سرور، خواجہ احمد فاروقی، گوپی چند نارنگ، قمر رئیس، جگن ناتھ آزاد، وقار عظیم، ممتاز حسین، عندلیب شادانی، مسعود حسین، گیان چند وغیرہ کے مقالے شامل ہیں جو نہ صرف اردو طلبا کے لیے قابل قدر ہیں بلکہ عام قاری کو بھی اردو تنقید کے مختلف گوشوں سے آگاہ کرتے ہیں
سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۴۴۸
قیمت:- ۱۴ روپے

نیشنل اکاڈمی سے
طلب کریں

تبصرے

محمود سعیدی

حافظ اور اقبال

ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب علمی دنیا میں کئی حیثیتوں سے متعارف ہیں - وہ ایک صاحب نظر ناقد بھی ہیں، محقق بھی اور ادیب بھی۔ تاریخ اور فلسفے کا بھی انھوں نے مطالعہ کیا ہے بالخصوص اسلامی تاریخ اور اسلامی فلسفے پر وہ گہری نظر رکھتے ہیں - ادبیات میں اردو اور فارسی کے علاوہ فرانسیسی ادب سے بھی انھیں عالمانہ واقفیت ہے اور ان کی مشہور کتاب "فرانسیسی ادب" اردو میں اپنے موضوع پر سب سے معتبر کتاب سمجھی جاتی ہے۔ شاعروں میں انھیں حافظ، غالب اور اقبال سے خصوصی شغف رہا ہے - غالب اور اقبال کے فکر و فن پر ان کے خیالات "غالب اور آہنگِ غالب" اور "روحِ اقبال" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو کر سند اعتبار حاصل کر چکے ہیں - زیر نظر کتاب میں انھوں نے اس عام خیال کے برعکس کہ اقبال، حافظ کے فکری اور فنی رویوں کے مخالف تھے یہ دلیلیں فراہم کی ہیں کہ اختلافات کے باوجود ایسے کئی مقامات ہیں جہاں اقبال اور حافظ ایک دوسرے کے بہت قریب آ جاتے ہیں - ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ جہاں تک اسلوبِ بیان اور پیرایۂ اظہار کا تعلق ہے، اقبال حافظ کے شعوری مقلد ہیں - اس ضمن میں انھوں نے اقبال کے ایک اعتراف کا بھی ذکر کیا ہے - انھوں نے خلیفہ عبدالحکیم سے ایک مرتبہ گفتگو کے دوران میں کہا تھا "بعض اوقات مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حافظ کی روح مجھ میں حلول کر گئی ہے۔"

ڈاکٹر صاحب کسی شاعر کے ذہن کو سمجھنے کے لیے اس کے سوانحی حالات اور معاشرتی کوائف کو غیر ضروری اہمیت نہیں دیتے لیکن وہ انھیں سراسر نظر انداز بھی نہیں کرتے - حافظ اور اقبال کے ذہنی رویوں میں جو فرق ہے اس کے اسباب کی نشاندہی کرتے ہوئے وہ دونوں کے زمانوں کے فرق کا بھی ذکر کرتے ہیں اور ان سماجی اور سیاسی حالات کا بھی جن سے دونوں شاعروں کو اپنے اپنے زمانوں میں سابقہ رہا — ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ حافظ کے دور میں مشرق سے مغرب تک مسلمانوں کا سیاسی اقتدار قائم تھا اور اسلامی تہذیب کی بنیادیں مضبوط تھیں - قوت و اقتدار کے جھگڑے آپس کے تھے، غیروں سے نہ تھے - اس لیے حافظ کو یہ موقع حاصل تھا کہ وہ اپنی داخلی کیفیات میں سرشار رہے - اس کی تنقید کا رخ ان کی طرف تھا جو دین و تمدن کی پیشوائی کے دعوے دار تھے اور اپنے اخلاقی عیوب کو ریاکاری کے پردے میں چھپاتے تھے... اس نے علماء، صوفیا، زاہد، واعظ، شحنہ، سب کو اپنے تشیرِ طنز کا نشانہ بنایا اور ان کی قلعی کھولی، کیونکہ اس کے پیش نظر معاشرتی زندگی کی طہارت تھی" اس کے برعکس اقبال کے عہد میں تقریباً پوری اسلامی دنیا غیروں کی سیاسی غلامی میں مبتلا تھی اور اسلامی تہذیب و تمدن کا شیرازہ بکھر چکا تھا اس لیے اقبال نے جو اپنے دل میں ملتِ اسلامی کا درد رکھتے تھے اپنی شاعرانہ صلاحیت سے اس ملت کی اصلاح کا کام لینا چاہتے تھے - فکر و تصوف کے ان مظاہر کی مخالفت کی جو دروں بینی کی نشہ آور کیفیات سے آشنا کر کے فرد

کو اس کی اجتماعی ذمہ داری سے بے پروا بناتے تھے۔ انھوں نے ان کیفیات کے مقابلے میں جہد و عمل کے جذبوں کی تلقین کی جن کی رہنمائی قبول کرنے ہی میں انھیں فرد اور ملت دونوں کی نجات نظر آتی تھی۔

یہ تجزیہ ڈاکٹر صاحب کے تاریخی شعور اور ان کی تنقیدی بصیرت دونوں کا آئینہ دار ہے۔ میں ادب کے ساتھ اتنا اور کہنا چاہوں گا کہ اقبال کو حافظ کے تئیں سخت رویّہ اختیار کرنے پر جن چیزوں نے مجبور کیا ان میں حافظ کے کلام کی وہ عجمی لے بھی شامل ہے جو انھیں اسلامی معاشرے کے مقتدر اداروں بلکہ بعض اوقات اسلامی شعائر کی بے حرمتی تک لے جاتی ہے۔ عربوں کے مقابلہ میں ایرانی سیاسی طور پر شکست کھا گئے تھے اور انھوں نے اپنا آبائی مذہب ترک کر کے اسلام بھی قبول کر لیا تھا لیکن ان کے لاشعور میں کہیں نہ کہیں اپنے نسلی تفوق اور تہذیبی برتری کا احساس باقی رہا اور پھر بعد میں یہ کئی صورتوں میں ظاہر بھی ہوا جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ یہ ہی احساس تھا جس نے شاہنامے میں فردوسی سے ایسے اشعار کہلوائے:

زشیرِ شتر خوردن و سوسمار
عرب را بجائے رسید است کار
کہ تختِ کیاں را کنند آرزو
تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو

اپنی شاعری کے آخری دور میں جو ان کی ذہنی پختگی کا دور ہے اقبال بار بار یہ ماتم کرتے نظر آتے ہیں کہ "عجم ہنوز نہ داند رموزِ دیں" سے ناواقف ہے اور "وطنیت" کا تصور اب تک اتنا قوی ہے کہ ملی زندگی کے تقاضوں کی تکمیل میں مزاحم ہو سکتا ہے۔

اس کتاب کا بنیادی موضوع حافظ اور اقبال کے مابین پائے جانے والے فکری اور فنی اختلافات اور مماثلتیں ہی ہیں لیکن ضمناً اور بھی بہت سے علمی ادبی مباحث اس میں آ گئے ہیں جو ڈاکٹر صاحب کے علم اور مطالعے کی وسعت کی گواہی دے رہے ہیں۔

کتاب کا دوسرا باب "حافظ کا نشاطِ عشق" حافظ کے فکر و فن کا ایسا عالمانہ تجزیہ پیش کرتا ہے کہ اسے بہ آسانی ایک جداگانہ کتاب کی حیثیت دی جا سکتی ہے۔ ڈاکٹر محمد دین تاثیر کے ایک طویل مضمون کے بعد جو کراچی سے شائع ہونے والے رسالے "ماہِ نو" میں چھپا تھا، یہ دوسری تحریر نظر سے گزری جس میں حافظ کی شخصیت اور اس کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کا اس ناقدانہ ژرف نگاہی اور دقیقہ رسی کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے

ڈاکٹر صاحب نے حافظ اور اقبال کے درمیان جن ذہنی قربتوں اور فنی رویّے کی جن مماثلتوں کی نشان دہی کی ہے اور اپنے اس دعوے کے حق میں جو دلیلیں دی ہیں ضروری نہیں کہ ان سے مکمل اتفاق کیا جائے۔ جس دیدہ ریزی سے یہ کتاب لکھی گئی ہے اس کا اصل ثمرہ یہ ہوگا کہ دوسرے ناقدین اور ادب کے ذمہ دار قارئین بھی ان خطوط پر سوچیں اور حافظ اور اقبال دونوں کے بارے میں ڈاکٹر صاحب نے تنقیدی غور و فکر کے جن نئے امکانات کا دروازہ وا کیا ہے، ادھر قدم بڑھائیں۔

کتاب کی طباعت وغیرہ اگر بہت اچھی نہیں تو بری بھی نہیں ہے۔ کتابت کی کچھ غلطیاں ضرور کھٹکتی ہیں، بالخصوص اشعار میں:

حافظ جادو بیاں شیرازی است
عرفیِ آتش بیاں شیرازی است

دوسرے مصرعے میں "آتش بیاں" کی جگہ "آتش زباں" ہونا چاہیے۔

بادہ زن با عرفیِ ہنگامہ خیز
زندہ از صحبتِ حافظ گریز

"زندہ" کے بعد "ای" چھوٹ گیا ہے۔

ضخامت ۴۲۲ صفحات، رنگین کی جلد، قیمت ۲۵ روپے۔ ناشر: غالب اکیڈمی نظام الدین، نئی دہلی۔

سازِ مغرب

ولا اکیڈیمی (عزیز باغ، سلطان پورہ، حیدرآباد) کے سلسلۂ مطبوعات کی ۱۳ویں کڑی ہے جو انگریزی نظموں کے منظوم تراجم پر مشتمل ہے۔ کتاب کے مرتب جناب حسن الدین احمد ہیں جو تالیف و تصنیف کے نئے نئے گوشے تلاش کرتے رہتے ہیں۔ انھوں نے تنہا اپنی کوشش سے بعض ایسے علمی کارنامے انجام دیئے ہیں جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے اجتماعی کوششوں کے متقاضی تھے اس کی ایک مثال ان کی مشہور کتاب "اُردو الفاظ شماری" ہے جس کا آج بھی علمی حلقوں میں چرچا ہے۔ میری دانست میں زیر نظر کتاب کو بھی اسی ذیل میں رکھا جا سکتا ہے۔ جو ۴۷ تراجم اس میں شامل ہیں۔ ان میں سے بیشتر مختلف رسالوں کی پرانی فائلوں سے تلاش بسیار کے بعد حاصل ہوئے ہوں گے ایسے تراجم چند ہی ہیں جو بعض شعرا کے مجموعوں سے ماخوذ کہے جا سکتے ہیں، مثلاً اقبال کے ترجمے جو ان کے مجموعوں میں موجود ہیں، لیکن حسن الدین احمد صاحب نے یہ اہتمام کر کے اپنے کام کو مشکل تر بنا لیا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اصل نظموں کے انگریزی متن بھی حاصل کر کے شامل کتاب کر دیے جائیں۔ بہر حال ان کی لگن نے ان کی یہ مشکل بھی آسان کر دی، بیشتر اصل نظموں کے متن انھیں مل گئے اور (انگریزی حروف میں) شامل کتاب ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کتاب کی افادیت دوچند ہو گئی ہے۔ کتاب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اگر کسی نظم کے ایک سے زائد ترجمے دستیاب ہوئے ہیں تو وہ سبھی شامل کر لیے گئے ہیں۔ ان ترجموں کے تقابلی مطالعے سے ایک دلچسپ بات یہ سامنے آتی ہے کہ اچھے ترجمے وہی ہیں جنھیں شہرت حاصل ہوئی۔ مثال کے طور پر گرے کی نظم ایلجی کے چار ترجمے دیے گئے ہیں جن میں علی حیدر طباطبائی کا ترجمہ ہی کامیاب ترین نظر آتا ہے۔ امیر چند بہار کا ترجمہ بھی برا نہیں لیکن اس میں جگہ جگہ طباطبائی کے مصرعوں کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے بحر مشترک ہے اور دونوں نظموں کی ساخت میں بھی نمایاں مشابہت ہے باقی دونوں ترجمے ادبی حسن سے عاری ہیں اور ان کی خصوصیت صرف تقابلی نقطۂ نظر سے ہی قابل جواز ٹھہرائی جا سکتی ہے۔ بعض اور ترجمے بھی اسی ذیل میں آتے ہیں۔ یہ نہ صرف تاثر سے بلکہ زبان و بیان کی صحت سے بھی عاری ہیں۔ ایچ۔ ڈبلیو۔ لانگ فیلو کی نظم A PSALM OF LIFE کے تین ترجمے دیے گئے ہیں۔ ان میں ایک ترجمہ کسی غیر معروف شاعر سعد حسین سعد کا ہے۔ اس کے آٹھ مصرعے ایک بحر میں ہیں، باقی دوسری بحر میں۔ دونوں بحریں آسان ہیں مگر شاعر دو مصرعے ناموزوں کر گیا ہے:

نہ رنج و غم کا وقفہ، موقعہ نہ سرخوشی کا
ناکامیاں ملیں یا فتح ہو تم کو حاصل

پہلے مصرعے میں 'نہ' کو 'نا' اور دوسرے میں 'فتح' کو 'فتحا' کے وزن پر باندھا گیا ہے۔ کتابت کی غلطیاں بھی جا بجا ملتی ہیں۔ اور بہت سے مصرعے ان غلطیوں کی وجہ سے ناموزوں ہو گئے ہیں۔ یہ دو مصرعے دیکھیے:

نگہ یاس سے دیکھا نہ ہو مڑ کے پیچھے
مگر ایک دن میں نے وہاں اس کو نہیں دیکھا

پہلے مصرعے میں ایک 'مڑ' زیادہ ہو گیا ہے اور دوسرے مصرعے میں 'مگر' کے بعد غالباً لفظ 'پھر' چھوٹ گیا ہے۔

کتاب کے پیش لفظ میں حسن الدین احمد صاحب نے لکھا ہے جس سے اختلاف کی کم ہی گنجائش ہے:

" دوسری زبانوں کے نظموں کے منظوم تراجم کو اردو شاعری کی ایک مستقل صنف قرار دیا جا سکتا ہے ... ۔ ان ترجموں نے اُردو ادب کو جدید خیالات، نئی تشبیہات اور تازہ استعارے دیے اور اردو شاعری کو ایک نئی جہت میں وسعت دی ..... اس جدید صنفِ ادب کے مطالعے پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے کیونکہ اس وقت تک اس نوعیت کے مطالعے کی کوئی با اصول کوشش نہیں کی گئی "

اصولی طور پر اس کتاب میں بھی ایک کمی رہ گئی ہے اور وہ ہے ان رسالوں کے نام جہاں یہ نظمیں شائع ہوئیں اور ان نظموں کی تاریخ اشاعت کا نہ دیا جانا۔ جیسا کہ فاضل مرتب نے پیش لفظ میں کہا ہے وہ اس سلسلے کی کچھ اور جلدیں بھی مرتب کر کے شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، اگر ان جلدوں میں رسالوں کے نام اور نظموں کی اشاعت کی تاریخیں بھی دے دی جائیں تو اس کام کی قدر و قیمت اور بھی بڑھ جائے گی۔

"سازِ مغرب" ڈیمائی سائز کے ۲۱۷ صفحات پر مشتمل ہے اور اس کی قیمت بیس روپے ہے۔ ڈی لکس ایڈیشن کی قیمت جو میرے پیش نظر نہیں، نوے روپے لکھی گئی ہے۔

تلاش

یہ دلّی کے ایک کہنہ مشق مگر گوشہ نشین شاعر پنڈت گوکل چند حسرت شوری کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ حسرت صاحب غزل کی ان تمام روایات کے نگہدار بھی ہیں اور پاسدار بھی جنھیں داغ دہلوی اور ان کے خاندان سے منسوب کیا جاتا ہے۔ زبان کا چٹخارہ، بیان کی سلاست اور صفائی، ثقیل الفاظ نیز دقیق مفاہیم سے گریز، بات کہنے کا براہ راست انداز اور اسی میں لطف پیدا کرنے کی کوشش، یہ سب چیزیں حسرت صاحب کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ چند اشعار سے آپ بھی لطف اندوز ہوں:

مجھے اعتبارِ محبّت نہیں ہے
محبّت نے مجھ پر بھروسہ کیا ہے

حرم کو چلا تھا کہاں آ گیا
ترا آستاں درمیاں آ گیا

اٹھایا تھا سر شوقِ دیدار نے
حجابِ خودی درمیاں آ گیا

غم کے پیمانے میں ملتی ہے وہ صہبائے حیات
جس کو پی کر پھر نہیں انسان ہنستے بولتے

"تلاش" ڈیمائی سائز کے ۱۲۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ کلام کی تدوین اور کتابت و طباعت سے سلیقہ نمایاں ہے۔ دس روپے میں درج ذیل پتے سے طلب کی جا سکتی ہے: پنڈت گوکل چند حسرت شوری، جی ۴۴ ڈی ڈی اے فلیٹس (ایم آئی جی) راجوری گارڈن، نئی دہلی۔

بقیہ: خبرنامہ

صفحہ ۴۹ سے آگے

مگر اردو داں طبقہ اس کے باوجود انگریزی ہی کا دلدادہ ہے۔ اردو کی ترقی کے لئے حکومت ہر ممکنہ امداد دینے پر آمادہ ہے لیکن اس سے فائدہ اٹھانے والے نہیں ملتے اگر یہی صورت حال برقرار رہی تو وہ دن دور نہیں کہ نچلی اور اعلیٰ سطح کے تعلیمی اداروں سے اردو کا شعبہ نکال دیا جائے گا۔ اور مراعات ختم کر دی جائیں گی اور اس نقصان عظیم کے ذمہ دار خود اردو والے ہوں گے۔

وزیر موصوف نے مجموعہ کلام کی ایک جلد ۵۰ روپے میں اور سیٹھ لکشمن داس گڈوانی نے ۷۵/- روپے میں خریدی۔ ڈاکٹر محمد ہاشم علی صاحب نے مقررہ قیمت چھ روپے فی جلد سے پچاس جلدیں خریدیں دیگر کئی ایک اردو دوست احباب نے بھی زائد اور مقررہ قیمت پر کتابیں خرید کر اپنی اردو دوستی اور ضمیر نوازی کا ثبوت دیا۔

اردو کے مسلم الثبوت استاد حضرت مائل دہلوی کا پورا غزلیہ کلام

کلیاتِ مائل

مرتب:- مولوی احتشام الدین احمد شاغل عثمانی مرحوم
قیمت:- تہتّر روپے پچاس پیسے
نیشنل اکاڈمی سے طلب کریں

بزمِ احباب

● جون کے تحریک میں باقی کے چند مصرعوں پر نسیم آذر نے جو عروضی اعتراضات اٹھائے تھے، عنوان چشتی نے جولائی کے شمارہ میں ان کو نظر انداز کر کے مسئلے کی تعمیم کر دی ہے۔

یہ اعتراض صحیح ہے کہ مندرجہ ذیل مصرعے فعول سے شروع ہوتے ہیں۔

۱ - کبھی سپرد بدن سا مجھے میسر آ
۲ - مجھے پتہ تھا اک دن لوٹ کے آئے گا تو
۳ - نہیں اترتا آنگن میں تو چھت پر آ
۴ - بہت دنوں پھر گھوم لیا، واپس گھر آ

یہ فنی حیثیت سے جائز تو نہیں لیکن کم موزوں طبع لوگ (چاہے آپ انھیں عروض سے ناواقف لوگ کہہ لیجئے) اکثر ایسی بے راہ روی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ پہلے مصرعے میں 'کبھی' کو 'کبھ' پڑھنے سے یہ سُقم دور ہو سکتا ہے لیکن بات نہیں بنتی۔ 'کبھی' کی جگہ 'آج' لکھ دیجے تو کچھ بات بن جائے گی۔ مصرعے کے آخری حصے میں تھوڑی سی گڑبڑ پھر بھی رہ جاتی ہے۔

دوسرے مصرعے میں 'مجھے' کو 'مجھ' پڑھیے یا 'مجھکو' لکھیے۔ مصرعے کے آخر میں 'کے' اور 'تو' اڑا دیجے تو یہ مصرعہ بالکل 'تندرست' ہو جائے گا یعنی

مجھکو پتہ تھا اک دن لوٹ آئے گا تو

روزمرہ بھی لوٹ آنا ہی ہے نا کہ لوٹ کے آنا — تندرست مصرعے میں 'گا تو' بھی 'گتو' نہیں پڑھا جاتا۔ تیسرے مصرعے میں 'نہیں' کو 'نا ہیں' پڑھنا پڑے گا

چوتھا مصرعہ یوں ہونا چاہیے

کتنے ہی دن گھوم لیا واپس گھر آ

شاعر کو اپنے مصرعے میں وزن کی خاطر 'گھوم پھر' کی جگہ "پھر گھوم" لکھنا پڑا تھا۔ درست شدہ مصرعے میں یہ سُقم بھی دور ہو گیا۔

تیرھواں مصرعہ "اس نے عجب کچھ پیار سے اب کے لکھا باقی" کافی حد تک صحیح ہے صرف "کے" کی "ے" دب گئی ہے۔ جو جائز بھی جانی چاہیے۔ اگر اس مصرعے کو بالکل صحیح ہی کرنا ہے تو 'کے' کو تیاگ کر یوں لکھیے۔

اس نے عجب کچھ پیار سے اب لکھا باقی

مصرعوں کی صحت اور چستی کی خاطر چند فالتو الفاظ تیاگنے پڑتے ہیں۔ فراق کا ایک مشہور شعر تھا

تو بھی تھا سچا میں بھی تھا سچا
عشق میں سچ ہی کا رونا تھا

میں نے 'تھا سچا' یعنی 'تھسچا' پر اعتراض کیا تھا اور اب غالباً فراق نے میری ترمیم تسلیم کر کے یہ شعر یوں کر لیا ہے

میں بھی سچا تو بھی سچا
عشق میں سچ ہی کا رونا تھا

باقی کے ایک دوست نے حساب رنگ کے مطالعے کے بعد یہ شعر چست کیا ہے،

گرانہ وزن سے اشعار جا بجا باقی
حساب رنگ میں رنگِ حساب پیدا کر

سچ تو یہ ہے کہ ان اسقام کے باوجود باقی کی مذکورہ غزل

نہایت ستودہ و پسندیدہ ہے لیکن غلطی تو غلطی ہی رہے گی۔

— کرشن دیو 24 – B بینڈا را روڈ انئی دہلی ۔

● جون کے "تحریک" میں نسیم آذر کا خط بہت ہی خوب تھا بلکہ چبھتا ہوا، شائستہ طنز اور معقول اعتراض کا یہ ڈھنگ پسند آیا جس طرح جدید غزل کے نمایاں شاعروں میں باقی کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اسی طرح غزل کی دنیا میں ٹکر کھاتے اوزان کو تجربے کے نام پر کوئی اہمیت نہیں دی جا سکتی، محض چند نقادوں کی انتہا پسندانہ توڑ پھوڑ کی تائید کو جدیدیت مان کر مرعوب کرنے اور فیشن پرستوں کی صف میں شامل ہو کر خود کو جدید تر ثابت کرانے میں سطحیت بے پردہ ہو جاتی ہے۔ اب اگر اس خط کو وقار کا مسئلہ بنا لیا گیا تو حصہ "مکتوبات" میں باقی کی خوشنودی حاصل کرنے والا گروپ نسیم آذر پر قدامت کا لیبل لگا کر جلد بازی کو جدیدیت ثابت کرنے کے لیے مغربی آیات نازل فرمائے گا یا کیچڑ اچھالنے پر اتر آئے گا اسی طرح باقی کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے حسد کرنے والا طبقہ نسیم آذر کو نقادِ اعظم کی سطح پر لے آئے گا اور عروضی مسئلے پر سیر حاصل بحث کا فنی پہلو چٹکلوں کے بوجھ تلے دب جائے گا — وہ لوگ جو اس فنی پہلو پر غیر جانبداری کے ساتھ عالمانہ بحث کر سکتے ہیں اپنا دامن بچانے کے لیے خاموشی اختیار کر لیں گے اسی خاموشی نے ہاتھیوں کو سرو قد بنا دیا ہے۔

" سوالنامے" پر وارث علوی کا طویل، مدلل، جامع اور بے باک اظہار خیال حاصل سوالنامہ کہلانے کا مستحق ہے۔ وارث علوی کے مضامین کے متعلق محمود ایاز نے "سوغات" میں لکھا تھا کہ ان مضامین کا حریفانہ انداز اور لہجے کی خطیبانہ دار وگیر کھٹکتی ہے اس کے جواب میں وارث علوی نے وعدہ کیا تھا کہ چند مضامین کے بعد وہ اپنا یہ اسلوب ترک کر دیں گے۔ اب مجھے یوں لگا کہ یہ مضمون اسی وعدہ کی تکمیل کا آغاز ہے۔

کمار پاشی پر مجتبیٰ کا مضمون بہت ہی خوب ہے۔ مجتبیٰ نے اپنے منفرد مزاجیہ طرز میں شخصیاتی خاکوں کو ایک انوکھا انداز بخشا ہے محمود سعیدی کی شخصیت سے متعلق اس قسم کا ایک بہت ہی خوبصورت خاکہ "نخلستان" میں پڑھ چکا ہوں۔

— تنہا تماپوری، رنگم پیٹ ضلع گلبرگہ۔

● جون کا شمارہ اس وقت ملا جب میں سمر کورس کے تہذیبی پروگراموں میں شدید مصروف تھا۔ پھر بھی وقت نکال کر مجتبیٰ حسین کا خاکہ پڑھ ڈالا تھا۔ تھکن بھی دور ہوئی تھی اور مجتبیٰ حسین اور کمار پاشی سے ذہنی قربت بھی پیدا ہوئی تھی۔ خط لکھنے میں تاخیر ہوئی اور جولائی کا شمارہ آ گیا۔ "سیکولرزم صرف ایک پیشہ" نے خوبصورت یادوں کو گدگدا دیا۔

ہمارے سمر کورس میں گجرات، مہاراشٹر، مدھیہ پردیش اور گوا کے طلبا شریک ہوتے ہیں۔ اسٹوڈنٹس کونسل کے تمام ممبران غیر مسلم تھے جو مختلف صوبوں سے متعلق تھے اور گجرات کے منصوری کی مالی امداد کے لیے بضد تھے۔ منصوری کو مالی امداد دینا منظور کر لیا گیا۔ تین چار طلبا کے نام اور پیش کیے گئے اور ایک ایسے طالب علم کی بھی نشاندہی کی گئی جو غریب تھا اور جس کے نام سے کوئی بھی واقف نہیں تھا۔ اسے مالی امداد دینا بھی منظور کر لیا گیا۔ یہ طالب علم احمد تھا جس کا تعلق مہاراشٹر سے تھا۔ نام لکھتے لکھتے میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ میں خوش اس لئے نہیں تھا کہ مسلم طلبا کو مالی امداد ملی تھی۔ میری خوشی کی وجہ یہ تھی کہ فرشتوں کی طرح معصوم طلبا مجھے میسر تھے۔

— اخلاق اثر، پرنسپل کالج آف ایجوکیشن بھوپال

● جولائی ۱۹۷۴ء کا "تحریک" نظر نواز ہوا۔ گوپال متل کے مختصر مضمون "سیکولرزم۔ صرف ایک پیشہ" میں یہ بات کہ رفیع احمد قدوائی کو قوم پرست مسلمان کہلانا بھی ناگوار تھا اس لئے مولانا آزاد کے زیر صدارت قوم پرست مسلمانوں کی کانفرنس میں شرکت سے برملا انکار کر دیا تھا" اس کی وضاحت نہیں کی گئی۔ سردار پٹیل کسی مسلمان کو قوم پرست

نہیں سمجھتے تھے ان کے نزدیک پنڈت نہرو ہی قوم پرست مسلمان تھے اور غالباً ربیع احمد قدوائی خود کو اسی لیے قوم پرست مسلمان کہلانا گوارا نہیں کرتے تھے کہ پنڈت نہرو جیسے قوم پرست مسلمان کی موجودگی میں انھیں دعویٰ "مسلم قوم پرستی" بے معنی نظر آتا ہوگا ——— گوپال متل کا مضمون "حاصل گفتگو" بھی اچھا ہے اور "رسوا النامہ" کے سلسلہ میں تحریکی دانشوروں کے خیالات سے ایک نشست میں لطف اندوز ہوا ——— شارق میرٹھی کے مضمون "بیان میرٹھی" عنوان نامکمل ہے اس کا عنوان "بیان یزدانی میرٹھی" ہونا چاہیے تھا۔ اس سے پہلے ان کا ایک مضمون "شوکت میرٹھی" کے متعلق "شوکت مجددی میرٹھی" کے عنوان سے شائع ہوا تھا شوکت میرٹھی "مجددی" نہیں تھے بلکہ مجدد السنہ تھے ——— بیان یزدانی کے متعلق یہ بات بلا دلیل اور بغیر حوالے کے درست نہیں معلوم ہوتی کہ وہ "توہم کے اسیر تھے اور روشنی کے متنفر ہونے کے خیال سے سالہا سال تک اپنی تنگ و تاریک کوٹھری سے باہر نکلتے اگر کسی مجبوری سے باہر نکلنا پڑا تو بند پالکی میں جاتے تھے"۔ اور یہ روایت کہ انہیں وہم ہو گیا تھا کہ اگر وہ باہر نکلیں گے تو پریاں اٹھا کر لے جائیں گی "اس روایت کے راوی" کا اتا پتا ضروری تھا۔ بیان نہایت ہی حسین تھے۔ حضرت شیر خاں بوم میرٹھی مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ بیان یزدانی اتنے خوبصورت تھے کہ لوگ انہیں آدم زاد نہیں بلکہ جمیل و شکیل "پری زاد" کہتے تھے۔

میرے استاد بھائی حضرت شمس رامپوری احسنی اس زمانے میں جب میں مینڈھو ضلع علی گڑھ میں تھا فرمایا کرتے تھے کہ بیان یزدانی "اپنے حسن و جمال میں سکندر لودھی کے ثانی نظر آتے تھے۔ ایک زمانے میں مولود خواں ان کی نعتیں مولود شریف کی محفلوں میں سنا کر داد و تحسین وصول کیا کرتے تھے اور ان کی یہ نعت تو بے حد مشہور تھی "کملی والے مجھے کملی میں چھپا لے آجا" شارق میرٹھی اس بات کے لیے قابل صد ستائش ہیں کہ انہوں نے میرٹھ کے مشاہیر شعر و ادب پر لکھنا شروع کیا ہے امید ہے کہ ان کا تیسرا مضمون اب "ندرت میرٹھی" پر پڑھنے کو ملے گا ندرت میرٹھی کا شعر ہے ؎

> یہ تصور کا کرشمہ ہے یہ تاثیر خیال
> آپ سوتے ہیں جہاں ہم بھی وہاں ہوتے ہیں

——— خان غازی کابلی، کوچہ رحمان دہلی

● مئی کے "تحریک" میں میری کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے تبصرہ نگار نے "پاؤں" کو میرا املائی تسامح کہا ہے ——— "پاؤں" کے حق میں اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ یہ لفظ بعینہ فیروز اللغات، جامع اللغات، کریم اللغات اور فرہنگ آصفیہ میں موجود ہے۔ جبکہ فیروز اللغات، جامع اللغات اور فرہنگ آصفیہ میں اس کی تینوں صورتیں "پانو"، "پاؤں" اور "پاؤں" پائی جاتی ہیں کریم اللغات میں محض "پاؤں" دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں بحر فصاحت میں اس کو "پاؤں" ہی لکھا گیا ہے یہاں تک کہ دو ایک جگہ مرقع غالب اور شاعر بمبئی (غالب نمبر) میں غالب کے اشعار میں بھی اس کا املا "پاؤں" ملتا ہے۔ آتش "پاؤں" کو جائز قرار دیتے تھے سیماب اکبرآبادی بھی اس کو صحیح سمجھتے تھے چنانچہ ان کے کلام کے تمام مجموعوں میں "پاؤں" ہی نظر آتا ہے۔ اردو املا میں اس لفظ کی مندرجہ بالا تینوں صورتوں کو تسلیم کیا گیا ہے غالب نے "پانو" کو صحیح کہا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے تتبع میں مولوی عبدالحق، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور رشید حسن خاں نے بھی فیصلہ "پانو" کے حق میں دیا مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جس املا کو آتش اور سیماب ایسے اساتذہ نے درست سمجھا وہ صحیح نہیں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی صراحت کے مطابق غالب کو "پاؤں" کی جمع نہ ملنے کی وجہ سے الجھن پیدا ہوئی ہوگی۔ حالانکہ بعض الفاظ ایسے ہیں جن کی جمع ہوتی ہی نہیں بلکہ وہ خود ہی واحد اور خود ہی جمع ہوتے ہیں "پاؤں" ایک ایسا ہی لفظ ہے اب دیکھیے کہ خود غالب نے "پانو" کو جمع کے صیغے میں نظم کیا ہے ؎

> دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کے پانو
> رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پانو

اسدؔ خوشی سے مرے ہاتھ پانو پھول گئے
کہا جو اُس نے ذرا میرے پانو داب تو دے

(غالب نے "پانو" کی جمع "پاؤں" بتائی ہے جو فعلن کے وزن پر ہے مگر غالب کے دونوں شعروں میں "پانو" فاع کے وزن پر ہے)

ویسے "پاؤں" کو اکثر و بیشتر صحیح مانا گیا ہے اور اس کا اعتراف رشید حسن خاں نے کیا ہے مگر انہوں نے جو نحوی دلیل دی ہے وہ قابل قبول ہے۔ تو بھی یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ یوں لکھنا املا کی غلطی ہے۔ اس سلسلے میں مجھے کچھ احباب کے خط موصول ہوئے ہیں۔ میں یہاں صرف ایک خط کا اقتباس نقل کرنے پر اکتفا کروں گا۔ نائیبور سے جناب طرفہ قریشی لکھتے ہیں: "میں نے کبھی "پانْوں" کو "پاؤں" نہیں لکھا۔ میں بھی "پانْوں" کو درست سمجھتا ہوں۔ پانْوں، چھانْوں، گانْوں ان الفاظ کو دو تنوین کے ساتھ لکھنا ہی بہتر ہے ورنہ پاؤں، چھاؤں اور گاؤں پڑھا جائے گا۔ ایسا لکھنے میں تلفظ کی ادائیگی میں غلطی کا احتمال ہے۔"

آخر میں ایک لطیفہ سن لیجیے۔ دیوان غالب میں "باہر نکلنے کے پانو" والی غزل کو "واؤ" کی تحقیق میں شریک کیا گیا ہے مگر نجمی رامپوری نے بحر الفصاحت کے لیے اس کا مطلع نقل کرتے ہوئے "پانو" کو "پاؤں" سے بدل دیا۔ آپ اسے ستم ظریفی بھی کہہ سکتے ہیں۔

—— ضیا فتح آبادی ج ۵/۲۱ راجوری گارڈن نئی دہلی

● ذرا توجہ فرمایئے تحریک ماہ جون میں صفحہ ۴۰ پر چھپی فرحت قادری صاحب کی نظم "شیو کی جٹا" کی طرف۔ یہ عنوان جمائے اور "دھو کی جٹا شو کی گئی" ٹیپ کا مصرعہ جوڑے بغیر بھی حضرت قادری کی نظم جیسی تیسی صورت میں مکمل تھی۔ تعجب اس پر آتا ہے کہ آپ ایسا سلجھا ہوا ادیب ایسی بکواس اپنے جریدہ میں چھاپنے کی اجازت دے دے جو بھگوان شیو کے عقیدت مندوں کے جذبات کو مجروح کرنے کا باعث بنتی ہو۔ اگرچہ میں فرقہ پرستی سے بالاتر ہوں۔ مگر ہندو ہونے کے ناطے اپنے دیوتاؤں اور بزرگوں کی بے حرمتی پر متحرک ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

—— رشی پٹیالوی ۲-۱۵/۷/۵۷ ۲ چندی گڑھ ۱۶۰۰۱۹

بقیہ صفحہ ۴۸ سے

سانگے کا اُجالا

تک اس بارے میں احتجاج ہٹ پر قائم ہے اور اُردو کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا جارہا ہے جس کی مثال ملک کی کسی دوسری مجلس قانون ساز میں نہیں مل سکتی۔ بلکہ ان سطور کے لکھتے وقت پانڈیچری اسمبلی کے حلف لینے کی کارروائی میں یہ پڑھنے میں آیا کہ ایک ممبر نے فرانسیسی زبان میں حلف لیا اور اتنے ممبروں نے ملیالم زبان میں اور اتنے نے تامل زبان میں۔ اس روش کو بدلوانے کا واحد طریقہ کار یوپی اسمبلی کے ۴۹ مسلم ممبران اور یوپی کونسل کے مسلم ممبران (جو مختلف پارٹیوں سے تعلق رکھنے کے باوجود اردو کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں رکھتے) ان غیر مسلم ممبران کو ساتھ لے کر جو اردو کے ساتھ ہونے والے ظلم و ناانصافی کے خلاف احتجاج میں شریک ہونے پر آمادہ ہوں۔ باقاعدہ تحریک چلائیں۔ یوپی کی مجلس قانون ساز کے یہ قواعد و ضوابط کی لسانی تنگ نظری کا بدترین نمونہ پیش کرتے ہیں اور یہ کانگریسی وزارت کے زمانے میں ٹنڈن اور سمپورنانندی ذہنیت کے تحت وضع کیے گئے تھے جمہوری طریقہ پر منسوخ کرانے کی متحدہ جدوجہد شروع کرنے میں ایک لمحہ کی تاخیر نہ ہونی چاہیے۔ اس سلسلے میں مسلم وزراء و نائب وزراء کا جو فرض ہے وہ بالکل کھلا ہوا ہے اور انہوں نے اس سلسلے میں اب تک جو افسوسناک و ناقابل تاویل سکوت اختیار کر رکھا ہے وہ یقیناً قابل احتساب ہے۔

اداریہ ندائے ملت لکھنؤ

مانگے کا اُجالا

یو۔پی کی نئی اسمبلی میں ممبران کے حلف لیتے وقت حسب توقع اُردو کا سوال پھر اُٹھا۔ ۴۹ مسلم ممبران میں سے جو مختلف پارٹیوں کے ٹکٹ پر اور آزاد حیثیت سے منتخب ہوئے تھے صرف تیرہ ایسے نکلے جنھوں نے اخباری رپورٹ کے مطابق اُردو کو اپنی مادری زبان قرار دے کر اس میں حلف لینے کا مطالبہ اور اس پر اصرار کیا۔ اس مطالبہ اور اصرار میں ابتداء کا شرف اور ایک انڈے پنڈنٹ ممبر مسٹر ریاست حسین کے حصے میں آیا۔ چیرمین صاحب نے ان قواعد کی رُو سے جو صرف یو۔پی کی ریاست میں نافذ ہیں اس مطالبہ کو ماننے سے انکار کر دیا اور صاف کہہ دیا کہ حلف صرف ہندی میں لیا جا سکتا ہے۔ ان نیز دحامی اُردو ممبران نے ایک درمیانی صورت یہ نکالی کہ اوّلاً زبان اُردو میں حلف لیا پھر ہندی میں۔ لیکن چیرمین نے اعلان کیا کہ اردو میں حلف لینے کا کوئی ذکر ایوان کی کارروائی میں نہیں درج ہوگا۔ اور اس بنا پر بعض انگریزی اخبار کے نامہ نگاروں نے اس خبر میں یہ لکھ دیا کہ اُردو والوں کو اُردو میں حلف لینے نہیں دیا گیا۔ اور یہ بات مطابق واقعہ ہے۔

وزیر اور نائب وزیر ملا کر نئی وزارت میں پانچ مسلمان لئے گئے تھے ان کے حلف وفاداری کے سلسلہ میں کچھ نہ چھپا کہ انھوں نے کس زبان میں حلف لیا؟

ظاہر ہے کہ اگر انھوں نے اُردو میں حلف لیا ہوتا یا اس کا مطالبہ کیا ہوتا تو اس کا بھی وہی حشر ہوتا جو ممبران کے اُردو حلف لینے کا ہوا۔ ان وزراء میں مسلم مجلس کے نمائندے بھی شامل ہیں اور دوسرے مسلم وزراء اور نائب وزراء میں سے کسی سے متعلق یہ بدگمانی نہیں کی جا سکتی کہ اس کی مادری زبان اُردو کے سوا کچھ اور ہے۔

ناظرین کو شاید یاد ہو کہ مسلم مجلس کے بانی اور رہنما قائد ملت ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی مرحوم نے یو۔پی کونسل (ایوانِ اعلیٰ) سے احتجاجی واک آؤٹ اسی بنا پر کیا تھا کہ ان کو اُردو زبان میں تقریر کرنے سے روکا گیا تھا انھوں نے احتجاج کے وقت عہد کیا تھا کہ جب تک اُردو زبان میں تقریر کا حق جو ملک کے آئین کی رو سے انھیں ملنا چاہیے نہ ملے گا وہ ایوان میں قدم نہ رکھیں گے اور اس عہد کو انھوں نے آخر تک نبا ہا۔ اس کے بعد بھی اردو میں حلف کا سوال یہاں کی اسمبلی میں اُٹھا اور گزشتہ سال صدر جمہوریہ جناب فخرالدین علی احمد صاحب مرحوم نے اس مسئلہ کی اہمیت اور اُردو والوں کی اس جائز شکایت کو محسوس کرتے ہوئے لکھنؤ کی ایک کانفرنس میں جس میں گورنر یو۔پی۔ وزیر اعلیٰ یو۔پی (مسٹر نرائن دت تیواری) اور اسمبلی کے اسپیکر (مسٹر واسدیو سنگھ) موجود تھے خاصے زوردار الفاظ میں ان سے کہا تھا کہ وہ اس غلط اور غیر منصفانہ قاعدہ کو جو صرف یو۔پی کی مجلس قانون ساز میں رائج چلا آ رہا ہے جلد منسوخ کریں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ یو۔پی کی کانگریسی وزارت ایمرجنسی ہی کے زمانے میں صدر صاحب کے اس مشورے کو تسلیم کر لیتی لیکن افسوس ایسا نہیں ہوا اور نہ ان کی وفات کے سانحہ کے بعد ان کی اس نصیحت کو وصیت کا درجہ دے کر اس پر عمل کیا گیا۔ مرکزی

حکومت نے جو کہنا چاہیے تھا کہ اس وقت تمام تر مسز اندرا گاندھی ہی سے عبارت تھی صدر مرحوم کے مشورہ کا وہی حشر کیا جو اردو سے متعلق سابق وزیر اطلاعات مسٹر اندر کمار گجرال کی تحقیقاتی رپورٹ کا ہو چکا ہے یعنی اتنی مدت گزر جانے کے بعد بھی اس پر عمل ہونا تو در کنار دنیا کو یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ اردو کے بارے میں آخر اس کمیٹی نے (جس سے بڑی توقعات قائم کی گئی تھیں) کیا سفارشیں کیں ہیں۔

موجودہ وزیر داخلہ چودھری چرن سنگھ اور وزیر اعظم مسٹر مرار جی ڈیسائی نے جنتا وزارت کے قیام کے بعد اردو کے سلسلے میں جو بیانات دیئے ہیں ان کی پچھلی لسانی روش کے پیش نظر ذرا بھی حیرت انگیز نہیں کہے جا سکتے۔ اس لئے یوپی کی نئی وزارت سے بھی اس بارے میں انصاف کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی تھی رہے سہے صرف ایک مرکزی وزیر مسٹر بہوگنا نے اردو کے بارے میں یہ کہہ کر اطمینان دلانے کی کوشش کی تھی کہ مرکزی کابینہ نے تا حال اردو کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ اس اعلان پہ مدت گزر چکی۔ اور اب چودھری چرن سنگھ بالقابہ نے پارلیمنٹ میں یہ ارشاد فرمایا ہے کہ موجودہ مرکزی وزارت اردو کے بارے میں کسی نئی نہیں ٹھیک اس پالیسی پر عامل ہے جو کانگریسی وزارت کی شروع سے چلی آ رہی تھی۔ جنتا وزارت نہ معلوم کتنی چیزوں میں اپنی پیشرو کانگریسی وزارت کی پالیسیوں اور احکام کو غلط اور غیر جمہوری قرار دے کر ان کو بدلنے کا اعلان کر چکی اور کر رہی ہے صرف اردو میں ایسی چیز نکلی جس کے بارے میں وہ اس قابل ملامت کانگریسی وزارت کی تقلید اس سے بھی کہیں سختی اور پابندی سے کرنا ضروری سمجھتی ہے۔

پارلیمنٹ میں جو مسلم ممبران جنتا پارٹی کے ٹکٹ پہ منتخب ہوئے ہیں انہوں نے اب تک وزیر اعظم اور وزیر داخلہ کے ان اردو دشمن بیانات و جوابات پر کسی ادنیٰ قسم کے زبانی احتجاج کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی۔ یوپی میں اردو والے ممبران کا، دکش اس لحاظ سے کچھ غنیمت کہی جا سکتی ہے کہ ان میں سے کم سے کم تیرہ ممبران نے اردو حلف میں اصرار کیا اور اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کی ایک صورت نکالی بھی لیکن یہ صورت کسی صاحب فہم کے نزدیک اردو کے اس حق کو جواز روئے آئین اسے ملنا چاہیے نفاذ دلانے والی نہیں کہی جا سکتی۔ یوپی کی مجالس قانون ساز میں اردو اب بھی بدستور شجرہ ممنوعہ کی حیثیت رکھتی ہے اور اس وقت تک رکھے گی جب تک کہ اردو والے متحد ہو کر اس کے بارے میں کوئی موثر قدم نہ اٹھائیں۔ کم سے کم اتنا تو ہوتا کہ مرحوم ڈاکٹر فریدی کے اتباع میں اس سلسلے میں واک آؤٹ کیا جاتا۔ افسوس اتنی مدت گزر جانے کے بعد بھی یوپی کے اردو والے ممبران اس سلسلے میں کوئی متفقہ قدم اٹھا نہیں سکے۔ البتہ ۵ ار جولائی کے بعض اخباروں میں چند ممبروں کے جلسے کی خبر چھپی ہے جس کی صدارت مسلم مجلس کے لیڈر مسٹر حبیب احمد نے کی۔ اور دو غیر مسلم ممبروں نے اس جلسہ میں شرکت کر کے اردو کے ساتھ ہونے والی ناانصافی پر احتجاج کیا ہے۔ اور یوپی پارلیمنٹ کے ایک غیر مسلم رکن مسٹر رام دھن نے جو یوپی کی وزارت عظمیٰ کے ناکام امیدوار رہ چکے ہیں ایک بیان میں اردو کے بارے میں نا روا روش پر احتجاج کیا ہے۔ یہ کارروائیاں ہر اعتبار سے ناکافی ہیں۔

اردو کو دوسری سرکاری زبان قرار دینے کا مطالبہ تو تنہا یوپی کے ساتھ مخصوص نہیں لیکن حلف کے معاملہ میں دھاندلی تو صرف یوپی ہی میں چلی آ رہی ہے اسمبلی کے اس سلسلے کے قواعد و ضوابط ملک کے آئین کی ان دفعات سے سراسر متناقض ہیں جن میں مادری زبان میں حلف لینے کی اجازت دی گئی ہے۔ اور خود مرحوم صدر بھی اس سلسلے میں زبردست فہمائش ریاستی حکومت کو کر چکے ہیں اور غالباً کئی سال ہوئے مرکزی وزارت داخلہ نے بھی اس غلط روی پر کانگریسی وزارت کو ٹوکا تھا۔ (جس کا کوئی اثر اس وزارت نے قبول نہیں کیا) لیکن اب

بقیہ صفحہ ۴۶ پر

خبرنامہ

● ۱۱ر جون کی شام کو غالب انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے ایوانِ غالب کے آڈیٹوریم میں حضرت حفیظ جالندھری کے اعزاز میں ایک ثقافتی تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ تقریب کے داعی غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر سعید سہروردی اور ان کے رفقائے کار تھے۔

پاکستان کے قومی شاعر حفیظ جالندھری گزشتہ مارچ میں دلی کے ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے ہندوستان آئے تھے اور تب سے اپنے دوستوں، مداحوں اور قدردانوں کے اصرار پر یہیں ٹھہرے ہوئے تھے ان کا قیام نئی دلی میں جناب ظفر پیامی کے یہاں تھا لیکن درمیان میں وقفے وقفے سے وہ کئی بار دلی سے باہر بھی گئے اور حیدرآباد، پٹنہ، علی گڑھ، فریدآباد اور دوسرے کئی شہروں کے مشاعروں میں شرکت کی۔ اب وہ پاکستان واپس جا رہے تھے اور یہ الوداعی تقریب تھی جس میں دلی کے سبھی ادبی حلقوں کی نمائندہ شخصیتیں شریک ہوئیں۔

ابتدا میں بلال احمد خاں اور ان کے ساتھیوں نے حفیظ صاحب کی کئی غزلیں موسیقی کے ساتھ پیش کیں اور دو گھنٹے تک پوری محفل پر ساز و آواز کا سحر چھایا رہا۔ بزمِ موسیقی کے بعد مشاعرے کی محفل ہوئی جس میں حفیظ صاحب کے علاوہ کنور مہندر سنگھ بیدی، کرشن موہن، احسن نعیم، شہاب جعفری، مخمور سعیدی، باقی، کمار پاشی، امیر قزلباش، اظہار اثر، سعید سہروردی، گلزار دہلوی، جمیلہ بانو اور کچھ دوسرے شاعروں نے اپنا کلام سنایا اور سامعین سے داد و تحسین حاصل کی۔

● پچھلے دنوں بانیِ بزمِ اردو میسور جناب ضمیر عاقل شاہی کے دوسرے مجموعہ کلام "اجالوں کا سفر" کی رسمِ اجراء بمقام انجمن اتحادِ اسلام، منڈی محلہ میسور زیرِ صدارت جناب سعید عبدالرحمٰن صاحب سابق ایم ایل سی انجام پذیر ہوئی۔ ماسٹر کمال کی قرأت اور ماسٹر محسن کی نعت سے جلسہ کا آغاز ہوا۔ اقبال فرید جنرل سکریٹری نے حاضرین کو خوش آمدید کہتے ہوئے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ یہاں کی زرخیز مٹی سے جواب روز بروز نم ہوتی جا رہی ہے کچھ اور مجموعوں کے پھول بھی عنقریب کھلنے والے ہیں۔

وزیرِ اوقاف و تعلیمات ایس ایم یحییٰ صاحب نے کتاب کے اجراء کے بعد اردو کی لطافت لچک اور زبان پر فوراً چڑھ جانے کی صفات کو واضح کرتے ہوئے کہا کہ اردو کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ اپنے علمبرداروں ہی کی عدمِ توجہی کا شکار ہے۔ خود مسلمانوں کی اکثریت جو اردو سے جذباتی لگاؤ رکھتی ہے اپنے بچوں کو اردو تعلیم دلانے سے گریز کر رہے ہیں جو بھی مسلمان نرسری اسکول کے قیام کی منظوری کے لیے ان کے پاس آئے، ان کا اصرار یہ تھا کہ ذریعہ تعلیم انگریزی ہو۔ ڈگری کورسوں میں اردو سے دامن بچانے والے طلبا کثرت سے ملیں گے۔ ابتدائی اسکولوں میں اردو کے لیے خاص مراعات ہیں۔ (باقی صفحہ ۵۶ پر)

مراجعت (بقیہ ص ــ)

لیے اکسانے لگی۔

میں نے نیلی آنکھوں والی شیام رنگ آتما کا دھیان لگایا اور اس کے وچاروں میں لین ہو گیا۔ جل پری جھلا گئی اور جب ناؤ ایک بھنور میں پھنسنے لگی تو میں نے دیکھا اس کے نئے نئے پر نکل آئے ہیں۔ اس نے مجھے نفرت سے دیکھا اور اڑتے ہوئے اتھاہ ساگر میں کھو گئی۔

میں نے اڑتے ہوئے بدروں سے ایک شاخ جھپٹ لی اور نیلمبر کا نام لے کر طوفانی ساگر میں کود گیا۔ مجھے لگا نیلی آتما نے ایک مچھلی کا روپ دھارن کر لیا ہے اور مجھے نگل گئی ہے اور جب میری آنکھ کھلی تو میں ریت پر پڑا ہوا تھا مہربان ہوائیں سانس بن کر میرے بدن میں اتر رہی تھی اور میرے پیروں میں شکتی کے چاک لگا رہی تھیں۔

میں اٹھا اور چلنے لگا۔ چلتے چلتے دور نکل گیا۔ جب میں نے وشرام کے لیے ٹھہرنا چاہا تو معلوم ہوا کہ میں پھر اپنے مانوس کھنڈر میں لوٹ آیا ہوں۔

۵۵

نازش بک سینٹر کی پیش کش

گوپال متل ـــــ ایک مطالعہ

محمد عبدالحکیم کا تحقیقی اور تنقیدی مقالہ جو عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کے ایم۔ اے سال آخر کے لیے لکھا گیا۔

گوپال متل کی زندگی اور ان کے ادبی اور شعری کارناموں کا بھرپور جائزہ ـــ آخر میں گوپال متل کی نثری اور شعری نگارشات کا انتخاب بھی شامل ہے۔ قیمت پندرہ روپے

نیشنل اکاڈمی سے طلب کریں

پنجاب اور آندھرا کی لائبریریوں کے لیے منظور شدہ

ماہنامہ

تحریک

نئی دہلی

شمارہ ۔۔۔ جلد : ۲۵

ستمبر ۱۹۷[illegible]ء

ادارۂ تحریر:

گوپال متل ☆ مخمور سعیدی

پریم گوپال متل

سالانہ قیمت : پندرہ روپے فی کاپی : ایک روپیہ ۲ پیسے

بیرونی ممالک سے

سالانہ تین پونڈ فی کاپی : چھ شلنگ

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتا

منیجر ماہنامہ تحریک، ۹ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر : گوپال متل

مطبع : نعمانی پریس۔ دہلی

مقامِ اشاعت : ۹ انصاری مارکیٹ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

مندرجات :

مزارِ ذوق کی بے حرمتی
— کیا اس بار واقعی تلافی ہو جائے گی ؟

گوپال متل

سُنتے ہیں کہ ذوق مرحوم کے مزار کی جو بے حرمتی ہو رہی ہے، دلی کے نئے ڈپٹی میئر مولانا امداد صابری کی کوششوں سے اب اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ یہاں سے میونسپل بیت الخلا ہٹا دیا جائے گا اور مزار کی از سر نو تعمیر ہو جائے گی۔ اگر ایسا ہو جائے تو دلی کے ماتھے پر سے ایک بدنما داغ مٹ جائے۔

ذوق کے مزار کی بے حرمتی کے خلاف آواز "تحریک" نے دس سال پہلے بلند کی تھی۔ جون ۱۹۶۸ء کا مندرجہ ذیل اداریہ اس کا شاہد ہے :

"اس وقت جب ہندوستان سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر غالب کی صد سالہ برسی منانے کی تیاریاں کر رہا ہے، اس کے ہمعصر اور بہادر شاہ ظفر کے استاد شیخ محمد ابراہیم ذوق کا مزار زبانِ حال سے کہہ رہا ہے ؎

گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر اندازِ چمن کچھ تو اِدھر بھی

ذوق کے مزار کی حالت پہلے بھی بہتر نہیں تھی۔ واقعاتِ دار الحکومت مصنفہ بشیر الدین احمد دہلوی (مطبوعہ شمسی پریس آگرہ، ۱۹۱۹ء) کے صفحات ۲۴۲ و ۲۴۳ پر درج ہے : 'قدم شریف کے پاس کلو کا تکیہ دہلی کا مشہور قبرستان ہے۔ یہیں ایک جگہ املی اور پیپل اور نیم کے تین درخت برابر برابر واقع ہیں جن کے متصل ایک شکستہ چہار دیواری کے اندر طوطیِ ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق، ابو ظفر محمد سراج الدین بہادر شاہ ظفر دہلی کے آخری بادشاہ کے استاد آرام فرماتے ہیں۔ سرہانے سنگ باسی کی لوح لگی ہے اور اس پر یہ قطعہ کندہ ہے۔

اللہ اکبر

طوطیِ ہند حضرت استاد ذوق نے
لی گلشنِ جہاں سے جو باغِ جناں کی راہ
سالِ وفات جو کوئی پوچھے تو اے ظفر
کہہ ذوق جنتی زسرِ بخشش الٰہ

افسوس ان کے شاگردوں اور شاگردوں کے شاگردوں پر ہے کہ ایسے بڑے شاعر نامور فخرِ ہندوستان کا مزار یوں کس مپرسی کی حالت میں پڑا ہے اور چہار دیواری جابجا سے گر پڑی ہے۔ اگر جلد توجہ نہ کی گئی اور یہی غفلت رہی تو تھوڑے ہی دنوں میں ان کے مزار کا پتہ چلنا بھی دشوار ہو جائے گا'۔

دلی جو شرافت اور وضعداری کا شہر کہلاتا ہے، اس کے باشندوں پر اس تحریر کا کوئی اثر نہیں ہوا اور خاقانیِ ہند کے مزار کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ پہلے لوحِ مزار غائب ہوئی، پھر چار دیواری پر لوگ اُپلے تھاپنے لگے، پھر مزار کا احاطہ بیت الخلا کے طور پر استعمال ہونے لگا اور اب وہاں باقاعدہ میونسپل پاخانہ تعمیر ہو گیا ہے۔

"چند دن ہوئے انگریزی اخبار 'انڈین ایکسپریس' کے نامہ نگار کو خاقانیِ ہند کے مزار کی جستجو ہوئی۔ وہ ایسے کئی لوگوں کے پاس گیا جو اردو والے کہلاتے ہیں اور خدمتِ ادب پر ناز کرتے ہیں۔ اس کا بیان ہے کہ مزارِ ذوق کی تلاش میں کسی نے اس کی مدد نہیں کی۔ وہ انجمن

ترقی اردو ہند کی مقامی شاخ کے دفتر میں بھی گیا جس کی سیکریٹری غالب سے قرابت کی دعویدار حمیدہ سلطان ہیں۔ انجمن کا جواب اور بھی حوصلہ شکن تھا۔ نامہ نگار کو بتایا گیا ــــــ انجمن کو صرف غالب سے دلچسپی ہے۔

انجمن اور حمیدہ سلطان کو ذوق سے دلچسپی ہو نہ ہو لیکن شہر دہلی کو ہندوستان کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کی ذات سے بہت تعلق ہے۔ غالب کی بے حرمتی مقصود نہیں لیکن اردو شعر و ادب کی تاریخ خاقانیِ ہند کے ذکر کے بغیر ہرگز مکمل نہیں کہی جاسکتی۔ اگر دہلی ایک بے ضمیر شہر نہیں تو اسے اس بے توجہی کی تلافی ضرور کرنی چاہیے جو اس وقت تک مزارِ ذوق کی طرف سے برتی گئی ہے۔ مزار ازسرِنو بننا چاہیے اور اسے اربابِ علم و ادب کی اہم زیارت گاہ ہونا چاہیے"۔

اداریے کی اشاعت کے بعد ہمیں سرکاری حلقوں کی طرف سے یقین دلایا گیا کہ مزارِ ذوق کی ازسرِنو تعمیر کرادی جائے گی چنانچہ اگست کے شمارے میں ہم نے خوش ہو کر لکھا:

"جون کے شمارے میں مزارِ ذوق کی بے حرمتی کے خلاف جو آواز اٹھائی گئی تھی وہ محرومِ پذیرائی نہیں رہی ــــــ قارئینِ "تحریک" کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ سرکاری سطح پر مزارِ ذوق کی ازسرِنو تعمیر کا فیصلہ ہوگیا ہے۔ اس فیصلے کے لیے "تحریک" حکومتِ دلی کو مبارکباد پیش کرتا ہے"۔

ہم خود بھی خوش ہو لیے، قارئین "تحریک" کو بھی خوش کر دیا اور حکومتِ دلی کو مبارکباد بھی پیش کر دی لیکن اردو والوں کے ساتھ کیے جانے والے بے شمار دوسرے وعدوں کی طرح یہ وعدہ بھی پورا نہ ہوا۔ خدا کرے مولانا امداد صابری نے مزار کی دوبارہ تعمیر کا جو وعدہ کیا ہے، اس کا بھی یہی حشر نہ ہو اور مولانا موصوف وقتی واہ واہ پر قناعت کر لینے کی بجائے اردو والوں کی مستقل ممنونیت کے اہل قرار پائیں۔

بسمل سعیدی ہم میں نہیں رہے
لیکن ان کی یاد
ہمارے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہے گی
بسمل صاحب کی شخصیت اور
شاعری پر ایک جامع کتاب

بسمل سعیدی
ــــــ شخص اور شاعر

- سترہ اہم تنقیدی اور تجزیاتی مضامین
- بسمل صاحب کے کلام کا بھرپور انتخاب
- شعرا کے منظوم تاثرات
- بسمل صاحب کی زمین میں ممتاز شعرا کی غزلیں

اور آخر میں
بسمل صاحب سے طویل انٹرویو جو بسمل صاحب کی شاعرانہ شخصیت کے علاوہ ماضی قریب کی ادبی تاریخ کے کئی اہم گوشوں پر روشنی ڈالتا ہے۔

ڈیمائی سائز
معیاری کتابت اور طباعت
مضبوط جلد قیمت: اٹھارہ روپے

نیشنل اکادمی ۹۔ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

بسمل صاحب کا آخری خط اور غزل

ممنونِ التفاتِ ستم ہو کے آ گیا، اِس طرح جیسے رہنِ کرم ہو کے آ گیا

جا کر تو کم ہُوا تھا میں اپنی نظر میں بھی، اُن کی نظر میں کم سے بھی کم ہو کے آ گیا

زہرابۂ تعنّت و تلخابِ طنز میں، شیر و شکر کی طرح باہم ہو کے آ گیا

جس طرح اپنے دوش پر اپنی ہی لاش ہو، اِس طرح اک جنازۂ غم ہو کے آ گیا

وہ رحم قہر کوش، کرم وہ کہ خود فروش، میں بے نیازِ رحم و کرم ہو کے آ گیا

غفلت شعار آنکھ کو آنسو کہاں نصیب، حیرت شعار آنکھ میں نم ہو کے آ گیا

یہ سوچ کر کہ ختم ہو دورِ ستم کہیں، میں خود بھی کچھ شریکِ ستم ہو کے آ گیا

اِس عہد (حال) کا نہ ماضیِ مرحوم مل سکا، ہر قبر پر خدا کی قسم ہو کے آ گیا

دور

مخمور صاحب! آٹھ ہی شعر ہو سکے اب اِس آہنگ و مفہوم کے مطابق کوئی شعر نہیں ہوتا۔ اِن میں ملتا جلتا مقطع میرے تخلص سے تم کہہ کر شامل کردو اور مناسب سمجھو تو تحریک میں شائع کردو۔ گوپال متل صاحب کا شکریہ میں ادا کرتا رہوں گا۔

بسمل سعیدی

دہلی

مطبع ہوٹل

جواہر

سکت بھی کہاں تک ساتھ دے، طبیعت صدمات برداشت بھی کرے اور اُنھیں بیان بھی کرے، یہ تو مشکل ہے۔

ما کی قربانی قبول نہ کیا کہ یہ لوگ میری اولاد ہیں۔

کرشن موہن | میڈم

یہ نہ سمجھو کہ یہ زیست کا داغ ہے
"جنس" اظہار ہے، حسنِ ترسیل ہے، لطفِ ابلاغ ہے
یہ تو انگ انگ کا دل نشیں رنگ ہے
ایک آہنگ ہے، پیار کا سنگ ہے
جنم داتا فنونِ لطیفہ کا، یہ جذبۂ آتشیں
شاہکارِ زمیں
خوب سیرت ہے یہ، خوب صورت ہے یہ
بے کدورت ہے یہ
آئینہ دارِ کیف و نفاست ہے یہ
درحقیقت امینِ لطافت ہے یہ
جسم کا، جو طلسم بقا ہے، اُسے
تربیت، جنس دے
جنس تو زندگی کی ہے تابندگی
زیورِ زندگی
رونقِ باغ ہے، نزہتِ راغ ہے
یہ نہ سمجھو کہ یہ زیست کا داغ ہے

۴۴

غزلیں اور اشعار

عروج زیدی

شوقِ بے تاب کو تھا ضبط کا یارا مشکل
اب حجابات اُٹھے ہیں تو نظارا مشکل

یہ اشاروں کی زباں ہیں تری محفل تو نہیں
ایک مے خانہ جہاں جام اٹھانا مشکل

اہلِ دل کے لیے یہ عذر نہیں، وجہِ جواز
آرزو سہل ہے، تہذیبِ تمنا مشکل

مرضیِ دوست سے ممکن ہی نہیں سرتابی
اب وہاں ہوں کہ جہاں عزم تقاضا مشکل

ناخدا جس کے ڈبونے میں ہو طوفاں کا شریک
ایسی کشتی کو بھی مل جائے کنارا مشکل

پردۂ شعر تو ہے پردۂ ناموسِ بیاں
اب اشارا کوئی مشکل، نہ کنایا مشکل

اُن کو معلوم ہے اجمال کی تفصیل عروجؔ!
وعدہ آساں ہے مگر وعدے کا ایفا مشکل

▲▲

من موہن تلخ

پہلی بار اپنے بارے میں من میں کچھ کچھ ڈر رہے ہیں
اب کیوں خوش نہیں ہوتے اب تو وہ رہے جو ہم گھر رہے ہیں
چہروں کے ساگر میں بس اک شکل جو دیکھی کو ڈوبے
اب جو لگے ہیں ڈوبنے تو نا واقف زمانے بھر رہے ہیں

اُلٹے سیدھے سارے تعلق توڑ کے کوئی بھاگ چلا
ہم سچے جھوٹوں کے نگر میں کیسا دن آج ڈھلا
کوئی کسی کا خون کرے، یہ اپنے نگر کی ریت نہیں
یہ وہ پیارا شہر ہے جس میں اپنی چھری اور اپنا گلا

اک تعلق کے ساتھ مر بھی چلیں
سانس بھی لیں، کہیں ٹھہر بھی چلیں

▲▲

قمر اقبال

اُلٹ کے ظلمتِ شب کا نقاب گزرے گا
ہمارے شہر سے کب آفتاب گزرے گا

خدا کا شکر کہ اِس دور میں کیا بید
سنا ہے اور زمانہ خراب گزرے گا

بس ایک پل کو ملا کر نگاہ وہ مجھ سے
مرے سوال کا دے کر جواب گزرے گا

کھلو زمیں سے کتاب انتظار ہے کس کا
کوئی یہاں سے نہ اہلِ کتاب گزرے گا

بجھی بجھی سی یہ آنکھیں ہیں منتظر کس کی
کوئی سلگتا ہوا اب نہ خواب گزرے گا

سمندروں میں اتر جائیں گے سبھی صحرا
ہر ایک سمت سے وہ سیلِ آب گزرے گا

رہے گی شاخ پہ کونپل نہ خاک پر سبزہ
زمیں کو چھو کے وہ ابرِ عذاب گزرے گا

نہیں ہے جس کی حقیقت قمرؔ وہی لمحہ
تمام عمر کا لے کر حساب گزرے گا

▲▲

★ گوہر سیف الدین خاں، رام پور (یوپی) ★ ۶/۱۱۱، ایم ایچ ایس کالونی، کلینا، بمبئی - ۲۹ ★ روشن گیٹ، کریم کالونی اورنگ آباد

ڈاکٹر انجمن آرا انجم

چند اردو الفاظ کی اصلیت اور تاریخ

(گزشتہ سے پیوستہ)

۷۔ کافور

کفر کی مذکورہ بالا تشریح کرتے ہوئے مؤلف اردو الفاظ غماز نے لکھا ہے "چنانچہ کفر کو بھی ایسی چیز تصور کیا گیا جو دیکھتے دیکھتے غائب ہو جائے کافور بھی ایسی چیز ہے جو رکھے رکھے غائب ہو جاتی ہے اس لیے اس کو کافور کہا گیا۔" جیسا کہ ابھی بتایا گیا کہ کفر کے لفظ میں سرے سے کوئی مفہوم غائب ہونے کا کبھی نہیں پایا گیا۔

لفظ کافور کی اصل کا معاملہ بہت دلچسپ ہے اور الفاظ میں عالمی سطح پر جو لسانیاتی اخذ و اختیار کا عمل ہوتا ہے اس کی ایک بہت اچھی مثال پیش کرتا ہے۔ اردو، فارسی، عربی، سنسکرت، لاطینی، فرانسیسی، جرمن، انگریزی وغیرہ جتنی زبانیں ہیں ہر ایک میں اس خوشبو کے لیے جو نام استعمال ہوتا ہے وہ صوتی اور لفظی اعتبار سے کافور سے ملتا جلتا ہے۔ اردو، فارسی اور عربی میں اسے کافور کہتے ہیں، سنسکرت میں اسے कर्पूर (کرپورم) لاطینی میں CAMPHORA (کامفورا) فرانسیسی میں CAMPHRE (کامپفر) جرمن میں KAMPFER (کامفر) انگریزی میں CAMPHOR (کیمفر) کہا جاتا ہے۔ اس مشابہت سے یہ نتیجہ نکالنا دشوار نہیں کہ یا تو یہ سب الفاظ کسی مشترک سرچشمے سے اخذ کیے گئے ہیں یا انھیں میں سے کسی ایک زبان سے لفظ کے دوسری زبانوں میں اسے اختیار کر لیا گیا۔ ویبسٹر (WEBSTER) کی NEW INTERNATIONAL DICTIONARY, 1957 سے معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی میں یہ لفظ وسطی انگریزی (MIDDLE ENGLISH) لفظ CAUMFRE سے لیا گیا جو خود اینگلو فرنچ سے تعلق رکھتا ہے اور جس کا ماخذ وسطی لاطینی (MIDDLE LATIN) لفظ CAMPHORA ہے ویبسٹر لغت کے مطابق یہ لاطینی لفظ عربی لفظ کافور سے اخذ کیا گیا ہے اور عربی کافور خود ملائی لفظ کاپور سے لیا گیا ہے۔ ویبسٹر سے اتنا تو پتہ چلتا ہے کہ یورپی زبانوں میں اس خوشبو کے لیے استعمال ہونے والے لفظوں کی اصلیت عربی ہے اس سے آگے کا ویبسٹر کا بیان سخت نزاعی ہے۔ عربی لفظ کافور کے بارے میں عرب لغویین اکثر و بیشتر یہی رائے رکھتے ہیں کہ یہ خالص عربی لفظ ہے۔ وہ اسے کفر یعنی پوشیدگی سے مشتق بتاتے ہیں، چنانچہ لین نے الصحاح، القاموس، تاج العروس کے حوالے سے لکھا ہے کہ کافور کے معنی کھجور کے غلاف کے ہیں اور غلاف کو کافور اس لیے کہا گیا کہ وہ شگوفے کو چھپائے ہوئے ہوتا ہے۔ تاج العروس کے حوالے سے لین نے بتایا ہے کہ انگور کے خوشے کے نکلنے کی جگہ کو بھی کافور کہتے ہیں کیونکہ یہاں اسے مستور کیے ہوئے ہوتی ہیں۔ لین نے القاموس کے حوالے سے کہا ہے کہ کافور مشہور خوشبو کا بھی نام ہے جو ہندوستان اور چین کے علاقوں میں پائے جانے والے پہاڑوں کے بعض ایسے درختوں سے حاصل کیا جاتا ہے جو بہت سے انسانوں اور دوسری مخلوق پر سایہ فگن رہتے ہیں (یعنی ان کی سایہ فگنی یا سایہ میں پوشیدہ کر لینے کی صفت کی بنا پر انھیں کافور کا درخت

۳۰، شبلی روڈ ۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۔ علی گڑھ

کہا گیا ہے)۔ تاج العروس میں اس عبارت پر اتنا اضافہ اور ہے کہ "طویل و عریض ہونے یا اپنی شاخوں کی کثرت تعداد کی وجہ سے پوشیدہ کر لینے کی صفت کی بنا پر"۔ مشہور عرب لغوی ابن دُرید کا کہنا ہے کہ میرا خیال ہے کہ کافور عربی الاصل نہیں کیونکہ اسے کبھی کبھی قافور اور قفور بھی کہا جاتا ہے۔ ابن دُرید کا یہ قول تاج العروس کے حوالے سے لین نے بھی نقل کیا ہے اور جوالیقی نے جو مشہور عرب لغوی اور نحوی ہیں اپنی کتاب "المعرّب" میں اس قول کو بغیر اعتراض کے پیش کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی اس موقف کی صحت کے قائل ہیں۔ باقی کوئی ایسا قابلِ ذکر عربی لغوی نہیں معلوم ہوتا جو کافور کے لفظ کو درآمدہ الفاظ میں شمار کرتا ہو۔ سید سلیمان ندوی کافور کو ان تین ہندی نژاد الفاظ میں گنتے ہیں[1] جو عربی زبان میں داخل ہو کر عربی مبین کا حصہ بن گئے اور قرآن کریم میں استعمال ہوئے (باقی دو لفظ مِسک بمعنی مُشک اور زنجبیل بمعنی سونٹھ یا ادرک ہیں)۔ جوالیقی کی کتاب کا حاشیہ نگار سختی سے کافور کے لفظ کے غیر عربی الاصل ہونے کا انکار کرتا ہے بلکہ قفور اور قافور کو بھی ٹھیٹ عربی الفاظ قرار دیتا ہے۔ اس صورت میں جب کہ عربی لغویین عموماً اس پر مصر ہیں کہ کافور خالص عربی نژاد لفظ ہے اور وہ اسے کفر سے مشتق قرار دے کر اس کی تسمیاتی توجیہ بھی کرتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ بعض نامور لغوی اس کی عربی اصلیت کے منکر بھی ہیں تو ہمارے لیے اس کا فیصلہ سخت دشوار ہے کہ یہ لفظ ٹھیٹ عربی ہے یا کسی دوسری زبان سے ماخوذ۔ تاہم ہمیں یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید اس کی اصلیت کے بارے میں یہ فیصلہ قرین قیاس ہے کہ جہاں تک کافور کے غلافِ شگوفۂ نخل اور خوشۂ انگور کی پوشیدگی کے موضع کے معنی دار ہونے کا تعلق ہے تو ان معنوں مفاہیم کے اعتبار سے یہ لفظ خالص عربی ہے اور کفر سے مشتق ہے لیکن معروف خوشبو کے نام کی حیثیت سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ عرب تاجروں کے ذریعہ جو انڈونیشیائی اور ملیشیا جزائر کے مستقل زائر تھے، اس خوشبو کا ملائی نام (کاپور) یا اس سنسکرت مترادف (کرپور) جزیرہ نمائے عرب میں منتقل ہوا اور چونکہ صوتی اور لفظی اعتبار سے کافور کا لفظ جو دوسرے مفاہیم میں استعمال ہوتا تھا پہلے سے عربی زبان میں موجود تھا اس لیے اس خوشبو کو بھی بجائے کسی دوسرے نام سے موسوم کرنے کے کافور ہی کا نام دے دیا گیا۔ ہمارے اس خیال کو خود القاموس کے بیان سے مہمیز ہوتی ہے جس سے اتنا تو بہرحال معلوم ہوتا ہے کہ اس خوشبو کی عرب میں درآمد ہند و چین کے بحری علاقوں سے ہوئی۔ القاموس اور تاج العروس کی تسمیاتی توجیہ میں تو لفظ کافور کے دونوں مفاہیم (یعنی غلافِ شگوفۂ نخل یا منبت خوشۂ انگور اور معروف خوشبو کا نام) کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش معلوم ہوتی ہے۔ اس طرح گویا ہمارا موقف یہ ہے کہ کافور کا لفظ عربی الاصل بھی ہے اور معرّب بھی۔ عربی الاصل اس صورت میں جب اسے غلافِ خوشۂ نخل یا منبت خوشۂ انگور کے معنی میں استعمال کیا جائے اور معرّب اس صورت میں جب اسے معروف خوشبو کے نام کے بطور بولا جائے۔ اس طرح عربی لغویوں کی اکثریت بھی ایک طرح صحیح کہتی ہے جب وہ اس کلمہ کو عربی الاصل بتاتی ہے اور ابن دُرید، جوالیقی اور سید سلیمان ندوی بھی ایک اعتبار سے درست کہتے ہیں جب اس کے عربی نژاد ہونے کا انکار کرتے ہیں۔

کافور کا لفظ اردو میں ہندوستانی زبانوں یا بولیوں کے ذریعہ نہیں بلکہ عربی اور فارسی زبان کے واسطے سے منتقل ہوا ہے اور فارسی کی طرح غیر عربی نژاد مفہوم میں یعنی معروف خوشبو کے نام کے طور پر ہی استعمال ہوتا ہے۔

مزے کی بات تو یہ ہے کہ فارسی میں اگرچہ کافور کے لفظ سے بہت سے محاورات وجود میں آئے لیکن کافور شدن یا کافور گشتن (یعنی غائب ہو جانے کے) جیسے محاوروں سے فارسی سرے سے ناآشنا ہے۔ غائب ہو جانے کے مفہوم کو "کافور ہو جانا" سے تعبیر کرنا (جیسے درد کافور ہو گیا، یا ظلمت شب کافور ہوئی) خالص اردو محاورہ معلوم ہوتا ہے جو اردو

---

[1] عرب و ہند کے تعلقات۔ سید سلیمان ندوی، الہ آباد ہندوستانی اکاڈمی یوپی ۱۹۳۰ء ص ۷۱، ۷۲

ہی میں پیدا ہوا عربی یا فارسی سے اردو میں منتقل نہیں ہوا اس لیے اس کی لسانیاتی توجیہہ کا سرا عربی یا فارسی کے کسی فرد کا فرد سے ملانے کی کوئی وجہ جواز موجود نہیں۔

۸۔ صحرا

مؤلف اردو الفاظ شماری لکھتے ہیں "افریقہ کے ریگستان صحارا سے لفظ صحرا وجود میں آیا اور بعد میں ہر ایسے علاقے کے لیے استعمال ہونے لگا یہی وجہ ہے کہ فرہنگ آصفیہ میں صحرا کے متضاد معنی چٹیل میدان جس میں درخت یا گھاس وغیرہ نہ ہو اور جنگل بتائے گئے ہیں"۔ جو کچھ اس عبارت میں کہا گیا ہے حقیقت اس کے عین برعکس ہے۔ شمالی افریقہ کے لیبیائی ریگستان کو عربوں نے الصحرا یا الصحراء الاعظم کا نام دیا۔ سہارا اسی صحرا کی بگڑی ہوئی شکل ہے جو انگریزی میں رائج ہوا اور بعض لاپرواہ صحافیوں کے ذریعے اب اردو میں بھی کہیں کہیں دکھائی دینے لگا ہے۔ 'THE OXFORD ENGLISH DICTIONARY' اٹھا کر دیکھیے لفظ SAHARA کے تحت بتایا گیا ہے کہ انگریزی میں اس لفظ کی مختلف شکلیں مختلف زمانوں میں رائج رہی ہیں۔ سترھویں صدی عیسوی میں اسے 'SARRA' اٹھارویں صدی میں 'ZAARA' انیسویں صدی میں SAARA اور SAHRA بھی کہا گیا ہے۔ انیسویں صدی کی دوسری شکل تو عربی صحرا کا قریب قریب بالکل صحیح تلفظ ہے۔ آکسفورڈ ڈکشنری میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ SAHARA عربی صحرا یعنی ریگستان سے ماخوذ ہے اور جب اسے بڑے S سے لکھتے ہیں تو یہ شمالی افریقہ یا لیبیائی ریگستان کا اسم علم ہوتا ہے۔ آکسفورڈ ڈکشنری میں سترھویں سے انیسویں صدی کے وسط تک کی تحریروں سے اس لفظ کے استعمال پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ 1613ء کی ایک کتاب PILGRIMAGE کے حوالے سے عبارت دی گئی ہے he called Sarra, for so the Arabians [illegible] call a desert. ALGIERS ۱۸۴۴ء کی تصنیف سے یہ جملہ دیا گیا ہے He withdrew among his Arab confederates in the Sahara. اسی طرح کی شائع شدہ ... Desert

Louisiana سے نقل کیا ہے Having some resemblance to the Steppes of Tartary or the Saara's of Africa.

اس کے علاوہ مولف اردو الفاظ شماری کا یہ کہنا درست نہیں کہ صحرا کا لفظ "بعد میں ہر ایسے علاقے کے لیے استعمال ہونے لگا جس میں میلوں انسان کا نام و نشان نہ ہو"۔ عربی میں صحرا کے معنی ایسے وسیع میدان کے ہیں جس میں روئیدگی سرے سے نہ ہو۔ اور اسی وجہ سے ریگستان کے لیے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اس کے عربی مادے صحر میں پکنے اور دھوپ سے دماغ کو تکلیف پہنچنے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ چنانچہ صحرا عربی میں ایسے میدان وسیع و عریض کو کہتے ہیں جہاں دھوپ سے پناہ نہ ملے (لسان العرب) اور چونکہ ریگستان کی حالت یہی ہوتی ہے اس لیے ریگستان کے لیے اسے استعمال کیا گیا ہے۔ انسان کا ہونا یا نہ ہونا اس لفظ کے مفہوم سے قطعی غیر متعلق بات ہے۔ لغت نامہ دہخدا میں صحرا کے "دشت، زمین ہموار، گشادگی، فراخ، بے گیاہ، بیابان، بر، ہامون، زمین ہموار و فراخ" دیے گئے ہیں۔ سرسری نظر سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ سارے فارسی مفاہیم صحرا کے اصل عربی مفہوم سے مستعار بلکہ اس کا پرتو ہیں۔ لیکن فارسی میں اصل عربی مفہوم میں ایک بہت لطیف تغیر ہوا ہے جو لغت نامہ دہخدا جیسی مفصل فارسی لغت میں بھی نہیں آ پایا کیونکہ دہخدا کی لغت کی حقیقت یہ ہے کہ وہ صرف ناقل ہے اور اکثر و بیشتر اپنے پیشرو لغت نگاروں کے خیالات کو نقل کر دیتی ہے۔ ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ وہ الفاظ کے ان مفاہیم کو بھی پیش کر دے جنھیں اگرچہ کسی لغت نگار نے ضبط نہیں کیا لیکن جو فصحائے زبان کے ان الفاظ کے استعمالات سے جھلکتے ہیں۔ صحرا کے لفظ میں جس لطیف معنوی تغیر کی طرف ہم اشارہ کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ عرب میں چونکہ بڑے بڑے میدان صرف بے آب و گیاہ وسیع و عریض علاقہ ہائے زمین ہی کی صورت میں موجود تھے اس لیے عربی لفظ صحرا کا مفہوم روئیدگی سے محروم وسیع چٹیل میدان یا ریگستان سے آگے نہ بڑھ پایا لیکن جب یہ لفظ مرغزاروں کی سرزمین فارس کے باشندوں کی زبان پہ آیا تو اس نے وسعت و پہنائی کے مفہوم کو تو محفوظ رکھا لیکن جغرافیائی عوامل

کی عظمت کھو گیا ہونے کے مفہوم کی مکمل طور پر حفاظت نہ کر سکا۔ چنانچہ ریگستان کے لیے مخصوص نہ رہ کر ایسے وسیع و عریض بے حد و بے حساب میدان کے لیے بھی استعمال کیا جانے لگا جہاں کی بجائے سبزہ و سبزی نظر آتا ہو گی۔ بجستا تھا مفہوم کی یہ تبدیلی فارسی شعراء کے کلام میں جھلکتی ہوئی بھی نظر آتی ہے۔ مثلاً کسائی کا شعر ہے:

عالم بہشت گشتہ کا شانہ زشت گشتہ
عنبر سرشت گشتہ صحرا چو روئے حورا (دہخدا)

یا ناصر خسرو کہتے ہیں:

تو رخ سبزِ صحرا بخند ید خوش
چو بر روے سیہ ابر بگریست زار (دہخدا)

یا خاقانی نے کہا ہے:

نگار ینا بہ صحرا زد کہ صحرا حلہ می پوشد
ز شادی ارغواں با گل شراب وصل می نوشد (دہخدا)

اس کے علاوہ مذکورہ تغیر کے نتیجے میں صحرا کو زمین کی طبعی جغرافیائی تقسیم کے تین افراد یعنی پہاڑ، دریا، میدان کے ایک فرد کے طور پر بھی استعمال کیے جانے لگا چنانچہ فردوسی کا شعر ہے:

سپاہے کہ صحرا و دریا و کوہ
شد از نعلِ اسپانِ ایشاں ستوہ (دہخدا)

ظاہر ہے کہ یہاں صحرا، دریا، کوہ کو روئے زمین کی تین طبعی قسموں کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ صحرا کے لفظ کا یہ لطیف معنوی تغیر اس لسانیاتی حقیقت کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ جغرافیائی عوامل الفاظ میں معنوی تغیرات کے اسباب کیوں کر اور کیسے بن جاتے ہیں۔

جیسا ہم نے ابھی کہا صحرا کے عربی یا فارسی معنوں میں براہ راست ویران یا غیر آباد جگہ کا مفہوم شامل نہیں بلکہ یہ اس کا لزومی یا دوسرے الفاظ میں مجازی مفہوم ہے۔ وہ اس طرح کہ عربی مفہوم کے لحاظ سے یہ بات واضح ہے کہ چٹیل اور بے آب و گیاہ میدان یا ریگستان میں انسانی آبادی کا کیا سوال اور فارسی مفہوم کے لحاظ سے بھی کسی میدان کی فراخی اسی وقت باقی رہے گی جب تک وہ آبادی سے معمور نہ ہو جائے۔ چنانچہ اپنے لزومی معنی کے اعتبار سے عربی اور فارسی دونوں میں (اور بعد میں اردو میں بھی) اسے ویران اور غیر آباد وسیع قطعۂ زمین کے لیے استعمال کیا گیا۔ اردو زبان میں بھی صحرا کا لفظ عربی اور فارسی کے سارے رنگا رنگ مفاہیم و معانی کا خزینہ دار ہے۔

یہاں مؤلف "اردو الفاظ شماری" کی ایک اور غلط فہمی دور کر دینا مناسب معلوم ہوتی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے "رفتہ رفتہ جنگل کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہونے لگا یہی وجہ ہے کہ فرہنگ آصفیہ میں صحرا کے متضاد معنی چٹیل میدان جس میں درخت یا گھاس وغیرہ نہ ہو اور جنگل بتلائے گئے ہیں۔"

فرہنگ آصفیہ میں صحرا کی تشریح اس طرح کی گئی ہے "زمین ہموار جو نہ بہت نرم ہو اور نہ سخت، میدان، چٹیل میدان جس میں درخت یا گھاس وغیرہ نہ ہو، جنگل، بیابان، بنجر، ویرانہ، دشت، بادیہ، ریگستان، تھل"۔ یہاں مؤلف "اردو الفاظ شماری" کو جنگل کے لفظ نے دھوکے میں ڈال دیا ہے۔ انھوں نے یہ سمجھا ہے کہ جنگل کے معنی صرف درختوں کے بڑے قطعے کے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے جنگل کا لفظ سنسکرت سے ماخوذ ہے۔ سنسکرت لفظ जङ्गल جس کے حقیقی معنی "بہت پیاسے" کے ہیں کئی معنی میں آتا ہے۔ صفت کے طور پر اسے خشک اور ویران کے معنی میں استعمال کرتے ہیں اور اسم کے طور پر اسے خشک زمین، ویرانہ اور ریگستان کے لیے بولتے ہیں (MACDONELL - A PRACTICAL SANSKRIT DICTIONARY, OUP 1924; VAMAN SHIVRAM - THE PRACTICAL SANSKRIT-ENGLISH DICTIONARY, POONA 1890)

اپنے ان معنی کے لحاظ سے یہ عربی لفظ صحرا کا مترادف ہے۔ ان مفاہیم کے علاوہ اسے درختوں کے جھنڈ یا اس وسیع میدان کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے جس میں کثرت سے درخت، جھاڑیاں وغیرہ پائے جائیں (بحوالۂ سابق)۔ جنگل کا لفظ فارسی میں بھی مستعمل ہے چنانچہ لغت نامہ دہخدا میں اس کے معنی کی تشریح ان الفاظ میں ملتی ہے "زمین وسیعی پر از درختہائے انبوہ، جائے پُر درخت و بیشہ و سعت زیادہ از زمین مشجر (ناظم الاطباء)، اجمہ و غیضہ

زیادہ ریگ محل بطورے کہ پوشانند زمین را و زمینے کہ پوشیدہ شدہ باشد از درخت و نے وعلف (ناظم الاطباء)" اس عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ ایسے وسیع قطعۂ زمین کو جہاں درخت ہوں فارسی میں جنگل کہا جاتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب بہت سے درخت اس طرح پائے جائیں کہ زمین ان میں چھپ کر رہ جائے تب ان درختوں کے مجموعے کو جنگل کہا جاتا ہے۔ اس زمین کو بھی فارسی میں جنگل کہتے ہیں جو درخت، پودوں اور گھاس میں پوشیدہ ہو کر رہ گئی ہو۔ اس تشریح سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فارسی جنگل کا مفہوم سنسکرت جنگل کے مفہوم سے صرف ایک شق میں متحد ہے یعنی بکثرت درختوں کے مجموعے کو ظاہر کرنے کے لحاظ سے۔ فارسی لفظ جنگل کے بارے میں ایک اشارہ کر دینا نامناسب نہ ہوگا۔ فارسی زبان میں جنگل کے لفظ کا استعمال فارسی کے فصحائے متقدمین و متاخرین کسی کے یہاں، ہمارے علم کی حد تک نہیں ملتا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ مولف دہخدا اس لفظ کے شواہد فارسی کے کلاسکی ادب سے پیش کرنے میں ناکام رہا ہے اور اس نے محض بعض معاصر تحریروں کی پیشکش پر اکتفا کی ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ جنگل کا لفظ ہندوستان میں سنسکرت زبان سے لے کر مذکورہ بالا معنوی تغیر کے ساتھ فارسی میں داخل کیا گیا ورنہ اصلاً یہ فارسی کا لفظ نہیں۔

بہر حال بتانا یہ مقصود تھا کہ جنگل کا لفظ اُردو میں سنسکرت سے آیا اور اس میں سنسکرت کے اصل معنی پورے طور پر ملحوظ رہے اگرچہ سنسکرت اور فارسی کے مشترک معنی کا ظہور بھی اس میں بھرپور طریقے سے ہوا۔ فرہنگ آصفیہ اٹھا کر دیکھیے تو مولف 'اردو الفاظ شماری' کے علی الرغم جنگل کے پانچ معنی دیے گئے ہیں :-

"۱۔ جھاڑی، بن کھنڈ، بن نخلستان۔

۲۔ صحرا، بیاباں، میدان، ریگستان، جیسے جنگل میں منگل ...

۳۔ بنجر، غیر مزروعہ زمین، بے کاشت زمین، بلا مزروعہ زمین، زمین افتادہ، اجڑ، ویران جگہ۔

۴۔ چراگاہ، علف گاہ، چوپاؤں کے چرنے کی زمین۔

۵۔ بادشاہی شکار گاہ، صید گاہ، رمنا، خود رو درختوں کی زمین، تراکم اشجار۔ درختوں کی کثرت۔"

جنگل کے سنسکرت اور فارسی مفہوم فرہنگ آصفیہ کے بتائے ہوئے جنگل کے مفاہیم اور فرہنگ آصفیہ ہی کی لفظ صحرا کی تشریح کو دیکھیے تو یہ کہنا انصاف سے بعید نظر آتا ہے کہ فرہنگ آصفیہ میں صحرا کے متضاد معنی بتائے گئے ہیں۔ جنگل کے لفظ کی جو تشریح فرہنگِ آصفیہ میں نمبر ۲ کے تحت دی ہوئی ہے (یعنی صحرا، بیاباں، ریگستان) اس سے صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ فرہنگ آصفیہ کے مولف کی نظر میں جنگل اپنے کسی مفہوم کے اعتبار سے صحرا کا مترادف ہے مولف اردو الفاظ شماری کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ جنگل کے صرف ایک معنی ہیں یعنی وہ قطعۂ زمین جہاں بکثرت درخت پائے جائیں۔ اگر وہ جنگل کی تشریح فرہنگ آصفیہ ہی میں دیکھ لیتے تو انھیں معلوم ہوجاتا کہ اردو میں جنگل کا لفظ بیاباں، میدان اور ریگستان کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ جو بات ہم کہنا چاہتے ہیں اسے زیادہ واضح طور پر یوں سمجھیے کہ اردو میں صحرا کے لفظ کے اگرچہ تمام عربی اور فارسی مفاہیم ملحوظ ہیں تاہم جس مفہوم کا آہنگ سب سے بلند ہے وہ بیاباں، میدان، ریگستان اور ویرانہ ہی ہے اور یہی بات فرہنگ آصفیہ میں بھی بتائی گئی ہے۔

۶۔ طرفدار

مولف اردو الفاظ شماری' کہتے ہیں" ہم روزمرہ کی بول چال میں لفظ طرفدار یا طرفداری استعمال کرتے ہیں اور یہ لفظ جانب داری کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یہی لفظ قطب شاہی دور میں طرف صوبہ کو کہتے تھے طرفدار گویا صوبہ دار کے مماثل ایک عہدہ دار ہوتا تھا۔ مال گزاری تعہدداری کے ذریعہ وصول کی جاتی تھی اور طرفدار یا تو تعہدداروں کی تائید کرکے حکومت کو نقصان پہونچاتے یا حکومت کی تائید کرکے تعہدداروں کو نقصان پہونچاتے اس طرح طرف داری کرنا جانب داری کے ہم معنی ہوگیا۔" مولف نے نہ صرف طرفدار بلکہ متعدد دیگر الفاظ دعونس، طرہ بازخاں وغیرہ کی تشریح اس طرح کی ہے گویا ایسے الفاظ اور ان کے مفاہیم حیدرآباد کی پیداوار ہیں اور بعد میں انھیں اردو کے مقبول و مروج الفاظ و مفاہیم کا مرتبہ حاصل ہوگیا ہے

بات نہ صرف غلط بلکہ لغوی حیثیت سے گمراہ کن بھی ہے۔ طرف عربی کا لفظ ہے اور اس کے معنی کسی چیز کی حد، انتہا، خاتمہ، گوشہ، کنارہ، کرنٹ اور جانب کے ہیں۔ ہاتھ پاؤں اور سر کو اطراف البدن اسی لیے کہتے ہیں کہ ان پہ جسم کی انتہا ہو جاتی ہے۔ فارسی اور اردو "تکلف برطرف" میں یہی معنی ملحوظ ہیں کہ تکلف کو ایک طرف یا گوشے میں رکھتے ہوئے یا تکلف سے دور رہ کر۔ اطرافِ ملک کا مطلب ملک کی سرحدوں، حدود یا سرحدی علاقوں سے ہوتا ہے۔ اطراف و اکنافِ عالم کا مفہوم دنیا کا ہر گوشہ کونا، انتہائی خطہ ہے۔

فارسی میں طرف میں دار کا اضافہ کر کے اسم فاعل بنا لیا گیا اور اس کا مفہوم سرحدی علاقے کا حاکم ہو گیا چنانچہ لغت نامہ دہخدا میں غیاث اللغات کے حوالے سے اس کے معنی حاکم سرحد نشیں اور برہان قاطع و فرہنگ آنند راج کے حوالے سے فقط سرحد نشیں دیے ہوئے ہیں۔ حاکم سرحد نشیں کے مفہوم میں سے سرحد نشیں کی قید اڑا کر اس کے معنی فقط حاکم کے بھی لیے گئے ہیں چنانچہ آنند راج اور برہان قاطع کے حوالے سے دہخدا نے حاکم و حکام کے مفہوم بھی پیش کیے ہیں۔ سرحدوں کی حفاظت کے لیے چونکہ عموماً نامور شخص کو بحیثیت حاکم تقرر ہوتا ہے اس لیے اس کا مفہوم طاقتور حاکم بھی لیا جانے لگا اور چونکہ سرحدوں کی حفاظت بالآخر بادشاہ کی ذمہ داری ہوتی ہے اور اس کی عظمت و دبدبہ کو سرحدوں کی حفاظت میں بڑا دخل ہوتا ہے اس لیے طرفدار کا مفہوم بادشاہ یا عظیم الشان بادشاہ بھی ہو گیا۔ دہخدا نے برہان قاطع کے حوالے سے طرفدار کے معنی "کنایہ از پادشاہاں است"، اور غیاث اللغات اور آنند راج کے حوالے سے "بادشاہ عظیم الشان" دیے ہیں۔ طرف دار نجوم سیارۂ مریخ کو کہا جاتا ہے جسے فنِ نجوم میں فلک پنجم کا حاکم بتایا جاتا ہے۔ بعد میں اس کا مفہوم فقط جاگیردار (دہخدا بحوالہ برہان قاطع، آنند راج، غیاث اللغات) یا زمین دار (دہخدا) بھی ہو گیا۔

طرفدار کا یہ مفہوم اس صورت میں لیا جاتا ہے جب طرف کا مفہوم طرفِ ملک یا طرفِ زمین، لیا جائے۔ لیکن جب طرف کا مفہوم صرف جانب یا کروٹ لیا جاتا ہے تو طرفدار اسے کہتے ہیں جو وسط سے کسی ایک جانب کو مائل ہو جائے یا الفاظ دیگر وسط سے ہٹ کر کسی کی جانب داری اور حمایت کرنے لگے۔ چنانچہ طرفدار کا مفہوم جنبہ داری کرنے والا، حامی، حمایت کرنے والا ہوتا ہے۔ دہخدا نے آنند راج کے حوالے سے طرفداری کے معنی جانب داری، حمایت اور فرہنگ انجمن آرائے ناصری کے حوالے سے طرف گرفتن کے معنی حمایت کردن دیے ہیں۔

اردو میں طرفدار فارسی ہی سے لیا گیا ہے لہٰذا اپنے اسی دوسرے فارسی مفہوم میں مستعمل ہے یعنی حامی، جانب دار، تائید کرنے والا کے معنی دیتا ہے اور اس مفہوم کے لیے وہ بہمنی اور قطب شاہی دور کے انتظامی یا سیاسی ڈھانچے کا رہینِ منت نہیں۔

۱۔ فریسی

مولف "اردو الفاظ شماری" کہتے ہیں "یہودی علماء فریس کہلاتے تھے چونکہ وہ نہایت ہوشیار اور عیار ہوتے تھے اس لیے لفظ فریس ہوشیار کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔" یہودی علماء کبھی فریس نہیں کہلائے۔ ان کا ایک گروہ ایسا ضرور تھا جسے اردو میں فریسی، عربی میں فریسی اور انگریزی میں PHARISEE کہا جاتا ہے WEBSTER'S NEW INTERNATIONAL DICTIONARY 1957 میں PHARISEE کے تحت بتایا گیا ہے کہ یہ لفظ لاطینی PHARISACUS سے ماخوذ ہے۔ لاطینی میں یہ لفظ یونانی PHARISAISOS سے آیا۔ خود یونانی نے اسے ارامی لفظ PERISHAIYA سے لیا جو PERISH کی جمع ہے۔ ارامی لفظ PERISH اپنی جگہ عبرانی لفظ PARUSH سے ملتا جلتا ہے جس کے معنی "علیحدہ کیے ہوئے" کے ہیں۔ برینڈن (BRANDON) نے اپنی کتاب A DICTIONARY OF COMPARATIVE RELIGION (LONDON 1970) میں PHARISEE کے زیر عنوان اسی بات کی تائید کی ہے کہ یہ ایک ارامی لفظ سے ماخوذ ہے جس کے معنی "علیحدہ کردہ" ہیں۔ AN ENCYCLOPEDIA OF RELIGION (NEW JERSEY 1959) میں جسے VERGILIUS FERM نے ایڈٹ کیا ہے، افرائیم بینٹ (EPHRAIM BENNET) اور لوئی فنکلسٹائن (LOUIS FINKELSTEIN)

نے اپنے مقالے PHARISEES میں اس طرف اشارہ کرکے کہ یہ لفظ عبرانی میں PERUSHIM ہے یہ بھی کہا ہے کہ "لیکن خود اس عبرانی لفظ کا حقیقی مفہوم آج تک تاریکی میں ہے۔" غالباً یہی وجہ ہے کہ ویبسٹر اور بریٹانکا نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ اسے عبرانی کے بجائے ارامی سے ماخوذ قرار دیا جائے اور غالباً اسی غیر یقینی صورتِ حال کی بنا پر R.PIKE نے اپنی کتاب ENCYCLOPAEDIA OF RELIGION & RELIGIONS, 1951 میں یہ بتانے کے بجائے کہ یہ ارامی سے ماخوذ ہے یا عبرانی سے اتنا کہہ کر چھوڑ دیا ہے کہ PHARI SEES کے نام کا مطلب "علیحدہ کردہ باشدہ" یا "الگ تھلگ" ہے۔ مذکورہ بالا چاروں کتابوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فریسی یہودیوں کے ایک مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو کہا جاتا ہے بحیثیت ایک جماعت کے یہ لوگ مقابیوں کی بغاوت کے بعد ابھرے۔ ان کے حریف اور مدّمقابل گروہ کا نام صدّوقی تھا۔ فریسی ان کا نام اس لیے پڑا کہ یہ دوسرے لوگوں سے کٹ کر یہودیت کو مشرکانہ رسوم و رواج سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ یہ لوگ عبادات کی ظاہری رسوم اور طریقوں پر سختی کے ساتھ عمل پیرا تھے اور زبانی روایات کے حجت ہونے کے شدت کے ساتھ قائل۔ ساتھ ہی یہ اسرائیل کے بت پرست حاکموں کے سخت ترین مخالف تھے۔ صدّوقیوں سے ان کا ایک بنیادی اختلاف تو یہ تھا کہ یہ صدّوقیوں کے برخلاف روایات (یعنی مشناۃ) کو صحت اور سند قرار دیتے تھے۔ دوسرے روح کے لافانی ہونے، موت کے بعد جسمانی حشر و نشر اور آخرت میں جزا و سزا کے قائل تھے۔ فرشتوں، روحوں اور مسیح منتظر پر ایمان رکھتے تھے اور نظریۂ قدر یعنی انسانی اختیار کو مانتے تھے (اپنے نام اور اس آخری عقیدے یعنی نظریۂ قدر کے لحاظ سے دیکھا جائے تو انھیں یہودی کے معتزلہ کہنا کچھ بے جا نہ ہوگا کیونکہ معتزلہ کے لفظی معنی بھی یہی ہیں کہ وہ لوگ جو دوسروں سے کٹ گئے یا علیحدہ ہو گئے)۔ یہ عجیب بات ہے کہ مسیح منتظر پر سختی کے ساتھ ایمان رکھنے کے باوجود یہی وہ گروہ تھا جس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سب سے زیادہ مخالفت کی اور انھیں تسلیم نہ کیا۔ چنانچہ عہد نامہ جدید میں ان کا ذکر انتہائی مکروہ طریقے سے ملتا ہے جہاں ان کے کردار کو منافقانہ بتایا گیا ہے اور انھیں "اژدہوں کی اولاد" اور "افعی کے بچوں" کے الفاظ سے خطاب کیا گیا ہے۔ ان کے بارے میں معلومات زیادہ تر مورخ جوزیفس، تالمود اور عہد نامۂ جدید سے ملتی ہے۔ جوزیفس خود فریسی تھا اس لیے ان کا ذکر اچھے انداز میں کرتا ہے۔ لیکن فریسی فرقہ کا کوئی ذکر عہد نامۂ قدیم میں کسی عنوان نہیں ملتا۔ فریسیوں کی وجہ تسمیہ ہوشیاری اور عیاری کے گمان بے جا کے بجائے ان کا وہ مذہبی کٹرپن اور رسوم و ظواہر پرستی تھی جس کی وجہ سے وہ دوسرے لوگوں سے کٹ کر رہ گئے تھے۔ اردو میں اسی یہودی فرقے کے لیے فریسی کا لفظ استعمال ہوتا ہے جو بائبل کے اردو ترجموں کے ذریعہ اردو میں رواج پذیر ہوا ہے۔ عربی میں اس لفظ کا تلفظ فَرِّیسِی ہے۔

عربی لفظ 'فَرِیس' کو مذکورہ بالا اصطلاحی مفہوم سے کوئی تعلق نہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ اپنے لغوی مفہوم کے اعتبار سے فَرِیس کا مادہ فرس، ارامی لفظ پیرش (PERISH) یا عبرانی لفظ پاروش (PARUSH) یا پیروشم (PERUSHIM) سے بہت ملتا جلتا ہے۔ مشہور عرب لغوی ابن فارس نے بتایا ہے کہ عربی میں ف ر س کا مادہ عموماً قطع کرنے اور کاٹنے کے لیے مستعمل ہے (مقاییس اللغۃ) چنانچہ فَرَس کے معنی جانور کی گردن توڑ دینا، علیحدہ کر دینا یا کسی بھی چیز کو ٹکڑے ٹکڑے اور جدا جدا کر دینا ہیں۔ بلکہ بعد میں فَرَس کا لفظ انھیں معنی کے پیش نظر ہر قتل کے لیے بولا جانے لگا (لسان العرب، اقرب الموارد)۔ اس لحاظ سے فَرِیس کے معنی مقتول کے آتے ہیں یا وہ چیز جسے جدا کر دیا گیا ہو۔ ان معنوں کو مدنظر رکھا جائے تو فریسی اور فریس لغوی اعتبار سے اگر ہم معنی نہیں تو قریب المعنی ضرور ہیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ معنی کی یہ قربت دونوں الفاظ کے ماخذ کے متحد ہونے کی طرف اشارہ کرتی ہے یا یہ لسانی لین دین کا نتیجہ ہے۔ فارسی میں بھی فَرِیس مقتول ہی کے معنی میں مستعمل ہے۔ لیکن اہم بات یہ ہے کہ صاحبِ فراست یا تیز فہم اور زیرک کے معنی میں لفظ فَرِیس عربی میں مستعمل ہے نہ فارسی میں۔ اردو میں بھی اس کا استعمال اس مفہوم

میں لفظ سے نہیں گزرا۔ معتبر فارسی اور اردو لغتوں میں بھی فریس کو صاحبِ فراست کے معنی میں نہیں دیکھا گیا۔ ہاں بعض لوگوں کو گفتگو میں اس لفظ کو صاحبِ فراست کے معنی میں استعمال کرتے ہوئے ضرور پایا گیا ہے مگر ان معنی میں یہ استعمال غلط فہمی پر مبنی معلوم ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ عربی میں دو لفظ فَراست اور فِراست استعمال ہوتے ہیں۔ فَراست بفتح ف کے معنی ہیں گھوڑوں اور ان سے متعلقہ امور کے بارے میں مہارت رکھنا اور فِراست بکسرِ ف کے معنی ہیں بصیرت، اصابتِ رائے، تیزی و درّاکیٔ ذہن، باطن شناسی، دوربینی اور ظاہری امور سے باطنی امور پر استدلال کرنے کی صلاحیت۔ عربی اور فارسی دونوں میں فَراست اور فِراست دونوں لفظ مستعمل ہیں۔ اردو میں فَراست (ف کے زبر سے) تو نہیں ہاں فِراست (ف کے زیر سے) بکثرت استعمال ہوتا ہے تیزیٔ فہم اور ذہانت کے مالک کے لیے عربی میں فارِس اور متفرِّس کے الفاظ اور فارسی اور اردو میں صاحبِ فراست، اہلِ فراست، فراست شناس وغیرہ لفظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ فَریس بمعنی صاحبِ فراست نہ عربی میں درست ہے نہ فارسی اور اردو میں۔ غلط فہمی یہ ہوئی ہے کہ فَریس کو فِراست سے مشتق سمجھ لیا گیا حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اس کا اشتقاق فَرس سے ہوا ہے جو قتل کے معنی میں ہے۔ اردو لفظ فرسہ جو تبر اور گنڈاسے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے وہ بھی جہاں تک گمان ہے مِفرسہ کی بگڑی ہوئی اردو شکل ہے جس کے معنی عربی میں آلۂ قتل کے ہیں۔

۱۱۔ کوکو

اس لفظ کے بارے میں فاضل مؤلف کا کہنا ہے

"کوکو ایک شہر کا نام ہے جو دریائے نیل کے کنارے واقع ہے یہاں ایک خاص قسم کے پودے پائے جاتے ہیں ان پودوں سے جو چیز حاصل ہوتی ہے اس کو کوکو کا نام دے دیا گیا۔" آپ نہ صرف افریقہ بلکہ روئے زمین کی اٹلس لے کر دیکھ جائیے تب بھی "کوکو" نام کا کوئی شہر آپ کو پردۂ دنیا پر نظر نہ آئے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ کوکو (COCOA) جو انگریزی لفظ ہے دراصل ککاؤ (CACAO) کی بگڑی ہوئی شکل ہے اور "ککاؤ" جو چاکلیٹ کے درخت اور اس کے بیجوں اور دالوں کے لیے بولا جاتا ہے، خود ایک اسپینی لفظ ہے جو میکسیکن ایزٹک (MEXICAN AZTEC) زبان لفظ ککاکٹل (CACAUCATL) سے ماخوذ ہے۔ چاکلیٹ (CHOCOLATE) کا لفظ بھی میکسیکی انڈین لفظ چاکو CHOCO (یعنی جھاگ) اور اٹل ATLE (یعنی پانی) سے اخذ کیا گیا ہے۔ اردو میں کوکو کا لفظ انگریزی کے توسط سے آیا ہے۔ ککاؤ یا کوکو دریائے ایمزن اور دریائے اورینوکو کے میدانوں کے گرم اور مرطوب جنگلوں اور وسطی امریکہ اور میکسیکو کے نشیبی علاقوں کی مقامی نباتاتی پیداوار ہے۔ "کوکو" کے درختوں کی قدرتی اونچائی چالیس فیٹ کے قریب ہوتی ہے جو کاٹ چھانٹ کر پندرہ سے پچیس فیٹ تک کر دی جاتی ہے۔ قدیم امریکہ کے باشندے انکا، مایا اور ایزٹک کوکو کے بیجوں کو ذریعۂ مبادلہ کے طور پر استعمال کرتے تھے اور اس کا مشروب استعمال کرتے تھے۔ اور اس کا مشروب استعمال کرتے تھے۔ مشہور شہنشاہ مونٹزوما (MONTEZUMA) کا تو یہ پسندیدہ ترین مشروب تھا۔ اپنے چوتھے سفر میں کولمبس ۱۵۰۲ء میں کوکو کے بیج اسپین لایا۔ ہرنینڈو کورٹیس (HERNANDO CORTES) پہلا یورپی ہے جس نے کوکو کے گرم مشروب کو ونیلا اور شکر کی آمیزش کے ساتھ ۱۵۲۰ء میں رواج دیا اور ۱۵۸۰ء تک اسپین میں یہ عام طور پر مروج ہو گیا تھا۔ ۱۶۰۰ء کے قریب یہودی تاجروں کے ذریعے یہ فرانس پہنچا اور ۱۶۶۰ء میں ماریا تھیریسا، اسپینی شاہزادی نے جو لوئی چہاردہم سے شادی کے لیے اسپین آئی تھی اس کو مقبولِ خاص و عام بنا دیا۔ سترہویں صدی کے اوائل میں اس کا انگلینڈ میں داخلہ ہوا اور ۱۶۵۰ء کے قریب برٹش ویسٹ انڈیز میں اس کی کاشت شروع ہو گئی۔ ۱۶۵۷ء میں لندن میں اس کا اشتہار ہوا اور کہیں ۱۷۶۵ء میں یو۔ ایس۔ اے میں اس کی پہلی چکی قائم ہوئی۔ ۱۸۲۹ء میں ایک آہن گر TETTI QUESI اس کے بیج افریقہ کے گولڈ کوسٹ لایا جہاں کی آب و ہوا کوکو کی ابتدائی

پیداوار کے علاقے سے ملتی جلتی تھی چنانچہ اس کی کاشت وہاں شروع کر دی گئی اور آج صحرائے اعظم اور سمندر کا درمیانی علاقہ کوکو کی عالمی سپلائی کا سب سے بڑا مرکز ہے (بحوالہ مقالہ ککاؤ از پروفیسر رالف ہولٹ چینی، انسائیکلوپیڈیا امریکانا)
RALPH HOLT CHENEY, PROFESSOR OF BIOLOGY BROOKLYN COLLEGE

۱۲۔ دھاوہ

اس لفظ کی تشریح میں مؤلف کہتے ہیں "عہد وسطیٰ میں پیدل ڈاک کا یہ انتظام تھا کہ ایک میل میں تین چوکیاں ہرکاروں کی ہوتی تھیں اس چوکی کو داوہ کہتے تھے۔ جنگ کی تیاری کے وقت پر داوہ کو اطلاع دی جاتی تھی جس سے لفظ دھاوہ وجود میں آیا۔" سید سلیمان ندوی مرحوم نے اپنے مضمون "بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق" (دیکھیے: اردو میں لسانیاتی تحقیق، مرتبہ عبدالستار دلوی، ۱۹۷۱ء، ص ۲۰۶-۲۲۴) میں اس لفظ کی اصلیت پر روشنی ڈالی ہے۔ سید صاحب نے 'ڈاک' کے لفظ کی تحقیق کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ڈاک کو عربی میں برید کہتے ہیں۔ ہندوستان میں لفظ 'دھاوے' نے اس کی جگہ لے لی اور اس کا رواج عام ہو گیا۔ سید صاحب لکھتے ہیں کہ تغلقوں کی تاریخ میں یہ لفظ استعمال ہوا اور ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں بعینہ اس لفظ کو درج کیا۔ بہمنی کی تاریخ فیروز شاہی میں بھی یہ لفظ آتا ہے۔ یہ ساری معلومات پیش کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں "مگر اس کو دھاوا کیوں کہتے تھے؟ اس کا پتہ ہم کو انھوں سے نہیں بلکہ ابن بطوطہ جیسے بیگانے سے چلتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دھاوا کے معنی اہلِ ہند میں تہائی میل کے ہیں چونکہ یہ ہرکارے ہر تہائی میل پر مقرر ہوتے تھے اس لیے اس کو دھاوا کہتے تھے اور استعمال سے راستے کے بجائے خود راستے والے پیادے کو دھاوا کہنے لگے۔" 'اردو الفاظ شماری' کے مولف کو شاید اسی قسم کی کسی تحریر سے غلط فہمی ہوئی ہے تاہم یہ ان کا طبع زاد اضافہ ہے کہ "جنگ کی تیاری کے وقت پر داوہ کو اطلاع دی جاتی تھی جس سے لفظ دھاوہ وجود میں آیا۔" سید سلیمان ندوی نے ابن بطوطہ کی فراہم کردہ تشریح پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے "لیکن غریب ناآشنائے زبان کو اس میں غلط فہمی ہوئی ہے، دھاوا کے معنی سنسکرت میں دوڑنے کے ہیں۔ چونکہ یہ دوڑ کر چلتے تھے اس لیے ان کی چال کو دھاوا کہنے لگے، پھر وہ (خود) دھاوا ہو گئے اور ہر تہائی میل پر جہاں وہ ٹھہرتے تھے وہ دھاوا ہو گیا۔ دھاوے کے ان پیادوں کی چوکیاں ہر تہائی میل پر دلی سے لے کر دولت آباد تک بنی ہوئی تھیں۔ پیادہ گھنگھرو دار لاٹھی کو کندھے پر رکھ کر تیزی سے دوڑتا ہوا اگلے دھاوے پر پہنچتا تھا وہاں دوسرا پیادہ گھنگھرو کی آواز سن کر تیار رہتا تھا۔ وہ فوراً اس سے ڈاک لے کر آگے کے دھاوے کو دوڑتا تھا۔ اس طرح سندھ سے دلی پانچ دن میں ڈاک پہنچتی تھی (ابن بطوطہ)۔" ہمیں سید صاحب موصوف کی اس تشریح سے اتفاق ہے لیکن اس کے بعد جو انھوں نے کہا ہے کہ "اس دھاوے کی یادگار ہماری زبان میں دھاوا کرنا، دھاوے پر چڑھنا، دھاوا بول دینا اور دھاوا مارنا آج بھی موجود ہے" اس کے بارے میں ہم کچھ عرض کرنا چاہیں گے۔ بات یہ ہے کہ دھاوہ جس سنسکرت لفظ سے لیا گیا ہے وہ धाव (دھاو) ہے جو خود سنسکرت میں کئی معنی میں استعمال ہوتا ہے مثلاً:

۱۔ دوڑنا، بڑھنا، حرکت کرنا، رینگنا،
۲۔ کسی کی طرف دوڑنا، کسی کے خلاف بڑھنا، حملہ کرنا، مقابلہ کرنا،
۳۔ دودھ دینا (گائے کا)
۴۔ دھونا، صاف کرنا، کھنگالنا، رگڑنا۔

(V.S. APTE - THE PRACTICAL SANSKRIT ENGLISH DICTIONARY 1890) ہو سکتا ہے کہ اس لفظ کے حقیقی اور اولین معنی دوڑنے اور آگے بڑھنے ہی کے ہوں اور باقی معنی ثانوی ارتقا کا نتیجہ ہوں تاہم یہ سارے مفاہیم اصل سنسکرت لفظ میں شروع سے پائے جاتے ہیں۔ ہمیں یہاں صرف اس طرف اشارہ کرنا ہے کہ

اس سنسکرت لفظ کے سارے مفاہیم ہندوستان میں مختلف صورتوں اور زمانوں میں استعمال ہوئے۔ دھاوے کا لفظ صرف دوڑنے کے مفہوم کے لحاظ سے ڈاک کے انتظامات کے سلسلے میں استعمال ہوا لیکن اس کا یہ مفہوم بہت پہلے ترک ہو گیا اور اردو تک نہ پہنچ پایا۔ خود سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے "مگر معلوم ہوتا ہے کہ آل تیمور نے جب ہندوستان پر دھاوا کیا تو یہ لفظ یہاں سے مٹ چکا تھا چنانچہ اکبر کے زمانے میں جب بدایونی نے اس لفظ کا استعمال کیا تو اس کے ترجمے کی ضرورت ہوئی ... فرشتہ نے جہانگیر کے زمانے میں اپنی کتاب لکھی تو دھاوے کا لفظ مٹ کر ڈاک چوکی کا لفظ پیدا ہو چکا تھا۔" اس لفظ کا دوسرا مفہوم یعنی کسی کی طرف دوڑنا یا کسی کے خلاف بڑھنا، حملہ کرنا، مقابلہ کرنا آج کے اردو لفظ دھاوے کا اصل مفہوم ہے اور غالباً پراکرت لفظ धावा کے توسط سے آیا ہے۔ سید سلیمان ندوی نے جتنی مثالیں دی ہیں "دھاوا کرنا، دھاوے پر چڑھنا، دھاوا بول دینا، دھاوا مارنا" وہ سب سید صاحب کے خیال کے برخلاف اس سنسکرت لفظ کے پہلے مفہوم یعنی دوڑنے سے نہیں بلکہ دوسرے مذکورہ مفہوم سے ماخوذ ہیں۔ اس لفظ کا تیسرا مفہوم بھی آج تک اردو لفظ دوہنے (گائے بھینس بکری) میں موجود ہے۔ چوتھا مفہوم بھی اردو لفظ دھونے اور دھوبی وغیرہ کی شکل میں مستعمل و رائج ہے۔

۱۳ - ۵ - تنکہ - ٹکا - تنکا

مؤلف "اردو الفاظ شماری" لکھتے ہیں "تنکہ ایک قدیم سکہ تھا جو ۱۰۰ رتی یا ۸۰ رتی کا ہوتا تھا۔ سنسکرت میں اس کو ٹنک کہتے تھے چونکہ یہ بہت چھوٹا ہوتا تھا اس لیے بہت چھوٹی چیز کو تنکہ کہتے تھے۔" ان چند جملوں میں مختلف الفاظ ہیں جن کی اصلیت ایک دوسرے سے قطعاً مختلف ہے مؤلف نے التباس پیدا کر دیا ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے اپنے مذکورہ بالا مضمون "بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق" ہی میں "اشرفی" پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے "تغلق کے زمانے میں ہم کو "اشرفی" کے لیے دو لفظ ملتے ہیں۔

ایک تنکۂ زر، یہ تنکہ سکے کے معنی میں عام طور سے بولا جاتا ہے (برنی ص ۳۱۴، ۳۱۵) اور اسی سے تنخواہوں کی تعیین ہوتی تھی۔ پیادے کی ماہانہ تنخواہ ۲۴ تنکہ اور سوار کی ۸۰ تنکہ تھی (برنی ص ۳۱۹)۔ مخدوم زادۂ بغداد کے لیے دس لاکھ تنکہ وظیفہ مقرر ہوا (برنی ص ۴۹۶)۔ مصری خلیفہ کا سفیر جب سلطان محمد تغلق کے دربار میں آیا اور جمعہ کے دن خلیفہ کا نام خطبہ میں پہلی بار پڑھا گیا تو چندیں طبقہائے پر از تنکۂ زر و نقرہ برآں نثار شد (برنی ص ۴۹۲)۔ اس سے معلوم ہوا کہ اشرفی کے لیے اس زمانے میں تنکۂ زر بولا جاتا تھا۔ خلجی کے زمانے میں ایک تنکۂ زر ایک تولہ سونے کا ہوتا تھا اور تنکۂ نقرہ ایک تولہ چاندی کا (فرشتہ ص ۱۱۴)۔ وہ بیہ کو تنکۂ نقرہ اور اس سے کم درجے کے سکے کو صرف تنکہ کہتے تھے۔ یہ لفظ قدیم یادگار کے طور پر آج بھی بعض پرانے خاندانی مسلمانوں میں دین مہر کی تعیین میں بولا جاتا ہے کہ یہی تنکہ تو آج سکے کی صورت میں ہمارے سامنے نہیں۔" (المدد میں لسانیاتی تحقیق ص ۲۹)

لغت نامہ دھخدا نے اسے تین طرح ضبط کیا ہے تنگہ، تنکہ، تنکا اور غیاث اللغات و فرہنگ آنند راج کے حوالے سے بتایا ہے کہ قرص رائج کو تنکہ کہا جاتا ہے خواہ وہ سونے کا ہو، چاندی کا یا تانبے کا۔ فرہنگ انجمن آرائے ناصری کے حوالے سے لکھا ہے کہ ہر جگہ کی اپنی اصطلاح کے مطابق سونے یا چاندی کی کسی مقررہ مقدار کو بھی تنکہ کہتے ہیں۔ ناظم الاطبا کے حوالے سے کہا ہے کسی بھی دھات کے ٹکڑے، سکۂ رائج الوقت اور ایک مخصوص قسم کے سکے کو تنکہ کہا جاتا ہے۔ منتخب لطائف نے عبید زاکانی کی وہ عبارت بھی دی ہے جس میں تنکہ کا لفظ سکے کے معنی میں استعمال ہوا ہے جس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس معنی میں تنکہ کا استعمال ہندوستان سے مخصوص نہیں بلکہ باہر بھی یہ لفظ انہیں معنوں میں مستعمل تھا۔

جہاں تک تنکہ کی اصلیت کا تعلق ہے تو یہ سنسکرت لفظ टंक ٹنکہ (ٹ ن ک) سے ماخوذ ہے۔ چار ماشہ یا چوبیس رتی (ٹنکا) کے برابر وزن کی چاندی کو ٹنکہ

کہاجاتا تھا۔ ٹنک پتی سنسکرت میں دارالضرب کے افسر کو کہا جاتا تھا اور ٹنک شالہ دارالضرب کو۔ ٹنکلہ (टङ्क) مُہر لگے ہوئے سکے کو کہتے تھے۔ خالص چاندی کے سکے کا نام بھی یہی تھا۔ دارالضرب کے افسر یا نگراں کو ٹنکہ پتی اور دارالضرب کو ٹنکہ شالہ بھی کہاجاتا تھا۔ (دیکھیے — M.
WILLIAMS A SANSKRIT— ENGLISH DICTIONARY, OXFORD 1872)
یہی سنسکرت ٹنک یا ٹنکہ ہے جو فارسی میں ٹ کی تخفیف کے بعد تنکہ بنا۔ اور بالآخر متروک ہوگیا۔ سید سلیمان ندوی مرحوم کا یہ خیال درست نہیں معلوم ہوتا کہ فارسی تنکہ اردو میں ٹکا بن گیا۔ غالباً ہوا یہ کہ سنسکرت کا टङ्क: ٹنکہ پراکرت میں ٹنگا د टङ्का میں تبدیل ہوا جہاں سے وہ اردو میں ٹکا کی شکل میں داخل ہوا۔

تنکے کا کوئی تعلق تنکہ یا ٹکے سے نہیں، بلکہ اس کی اصل سنسکرت کا مادہ तृण ہے ترِنِّڑ، ترِنِّڑم، ترِنِّڑو سنسکرت میں گھاس، گھاس کی پتی، بانس، نرکل کو کہتے ہیں اور اکثر اوقات یہ لفظ حقیر، بے کار، بے قیمت ہونے کے وصف کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کے معنی تنکے کے بھی ہیں اور اس گھاس پھونس کے بھی جس سے چھپر تیار کیا جاتا ہے۔ ترِنّڑ کا ٹڑ گھاس کے ڈھیر کو کہتے ہیں۔ ترِنّڑ کُٹی گھاس پھوس کی جھونپڑی کو کہتے ہیں اور ترِنّڑکہ (तृणक) گھاس یا گھاس کی بے کار، حقیر پتی یا بیکار آدمی کو بھی کہتے ہیں۔
(WILLIAMS-ASANSKRIT-ENGLISH DICTIONARY, OXFORD 1872)
سنسکرت کا لفظ ترِنّڑ گھاس، گھاس کی پتی یا تنکے کے معنی میں رگ وید میں بھی استعمال ہوا ہے۔ سنسکرت مادے ترِنّڑ اور لفظ तृणक: ترِنّڑکہ نے مختلف ہندوستانی زبانوں اور بولیوں میں جو شکلیں اختیار کیں اور اس کے مفہوم میں جو تغیرات ہوئے وہ حسب ذیل ہیں:

پالی: تِنا (گھاس کی پتی)؛ پراکرت: تَرڑاں، ترِڑاں (گھاس)؛ پنجابی: ترِن، تن (گھاس کی پتی)؛ کاشمیری: تِنکا (تنکڑے)؛ کمایونی: تِنکو (گھاس کی پتی)؛ بنگالی: تِنکا (لقمہ)؛ بہاری: تِنکا (آم کے درخت کی پتی کی نس کا ٹکڑا)؛ ہندی: تِنکا (گھاس کی پتی، گھاس، تنکا) (R.L.TURNER
-A COMPARATIVE DICTIONARY OF THE INDO-ARYAN LANGUAGES OUP.1966)
سنسکرت: तृणक، جو کشمیری، بنگالی اور بہاری میں بحذف را معنوی تغیر کے ساتھ تنکا بنا وہ ہندی اور اردو میں بھی تنکا بنا مگر اپنے اصل مفہوم کو محفوظ رکھتے ہوئے۔

۱۶-۱۸- ناچ - توپ - تولیہ

مؤلف "اردو الفاظ شماری" کا کہنا ہے "ناچ، توپ، تولیہ اور ایسے ہی بیسیوں الفاظ یورپی زبانوں سے اردو ادب میں داخل ہوگئے اور وہ اس دور کی یاد دلاتے ہیں جب ہمارے ملک کے مختلف حصے ان کے زیرِ نگیں تھے"۔ مذکورہ تینوں لفظوں میں سے فقط تولیہ (جہاں تک خیال ہوتا ہے یہ تولیہ کی مقامی شکل ہے کیونکہ تولال کا لفظ اردو لغتوں میں نہیں ملتا) انگریزی لفظ 'TOWEL' سے ماخوذ ہے۔ باقی دو لفظوں میں سے ایک خالص ہندوستانی ہے اور دوسرا ترکی۔

ناچ - یورپی زبانوں میں کوئی ایسا لفظ نہیں ہے جو ناچ کے لفظ سے ملتا جلتا ہو اور جسے ناچ کا ماخذ قرار

لہ دیکھ ان لفظوں میں ہائے مختفی کو صرف آخر حرف کی حرکت کو، جو یہاں زبر ہے، ضبط کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ اردو املا کے اصول و قواعد کے لحاظ سے آخر حرف کے زیر زبر کی حرکت کو جو الف یا ی سے کم تر ہو ضبط کرنے کی صورت اس حرف کے بعد ہائے مختفی کے اضافے کے سوا اور کچھ نہیں۔ جو لوگ اس ہائے مختفی کو جو محض کم تر از الف علامت حرکت کے اظہار کے لیے غیر عربی و فارسی الفاظ میں املا میں استعمال کی جاتی ہے، ترک کرکے اسے الف سے بدلتے ہیں اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ سنسکرت اور ہندی میں ہائے مختفی نہیں وہ غلطی پر ہیں۔

دیا جاسکے سی، ڈی بک (C-D-BUCK) نے اپنی کتاب A DICTIONARY OF SELECTED SYNONYMS IN THE PRINCIPAL INDO-EUROPEAN LANGUAGES, CHICAGO 1949 میں DANCE کے لیے جو یورپی مترادفات دیے ہیں وہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہیں۔ ان مترادفات میں سے بعض یہ ہیں لاطینی، SALTARE؛ اطالوی BALLARE؛ DANZARE؛ فرانسیسی: DANCER؛ اسپینی: BAILER؛ DANZAR؛ پرتگالی؛ DENSA؛ ڈینش: DANSE وغیرہ۔ بک (BUCK) نے سنسکرت کے مادے NRT کو پیش کرکے جس کے معنی ناچ، کھیل کود کے بتائے ہیں یہ لکھا ہے کہ شاید اسے کسی قدر لتھوانی (LITHUANIAN) لفظ NIRTES سے جس کے معنی غضبناک ہونے کے ہیں یا قدیم پرشش (OLD PRUSSIAN) کے ernertimai سے جس کا مفہوم ہے (ہم غصہ ہو گئے) اس اعتبار سے کسی حد تک قریب کہا جاسکتا ہے کہ ان سب میں شدید حرکت یا جذبے کا تصور مشترک ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ اشتراک اتنا دور از کار ہے کہ اسے لسانیاتی اخذ و اختیار کی بنیاد خاص طور سے نرت (NRT) کے لفظ کے سلسلے میں نہیں بنایا جاسکتا۔

فیلن (FALLON) کی لغت (THE HINDUSTANI-ENGLISH DICTIONARY By S.W. FALLON, 1879) میں ناچ کو नृत्त سے ماخوذ بتایا گیا ہے۔ پلاٹس (PLATTS) نے اس کا اصل ماخذ नृत्य قرار دے کر اس کا قریبی ماخذ پراکرت کے لفظ नच्च کو قرار دیا ہے۔ پلاٹس کی بات زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے اگرچہ اس بات کا بھی قوی امکان ہے کہ اس کا اصل ماخذ नृत्य کے بجائے नाट ہو جس کے معنی ناچنے یا اداکاری کرنے کے ہیں۔ بہرحال اس میں سے جس بات کو درست قرار دیا جائے اتنی بات قطعی ہے کہ لفظ ناچ کا ماخذ کسی یورپی زبان کا کوئی لفظ نہیں۔

توپ

لغت نامہ دہخدا کے مولف نے لکھا ہے "توپ لغت فارسی است در اردوے ہندی مستعمل و آں یکے از آلات جنگ است" اور حوالہ فرہنگ آنندراج کا دیا ہے۔ اس کے بعد ناظم الاطباء کے حوالے سے بتایا ہے "ماخوذ از ترکی، یکے از اسلحۂ آتشی بشکل لولۂ بزرگ کہ از آہن و یا مفرغ سازند و بر روے چرخ گردوں حمل کنند"۔ خود دہخدا نے اس کلمہ کی بابت جو یادداشت سپردِ قلم کی ہے وہ یہ ہے "اصل ایں کلمہ ممکن است از توب (TUBE) فرانسہ بمعنی لولہ باشد و شاید مناسبت صورت آں "تُپ" ایں نام بدو دادہ باشد"۔ مولف فرہنگ آنندراج کا یہ کہنا کہ توپ فارسی ہے صرف اس حد تک درست ہے کہ یہ فارسی زبان میں داخل ہو کر فارسی کا لفظ بن گیا ہے۔ لیکن اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اصلاً فارسی ہے تو یہ بات قطعی نادرست ہے۔ ناظم الاطباء کی یہ بات درست ہے کہ اسے ترکی سے لیا گیا ہے۔ ان کی یہ بات بھی کہ "توپ آتشی اسلحہ میں سے ہے جس کی شکل ایک بڑی نال کی ہوتی ہے۔ اسے ڈھالا بھی جاتا ہے اور علیحدہ علیحدہ اس کے حصے تیار بھی کیے جاتے ہیں اور اسے پہیوں پر لاد کر چلاتے ہیں" اس حد تک درست ہے کہ توپ جس آلۂ جنگ کا نام ہے اس کی تفصیل اس سے معلوم ہو جاتی ہے۔ رہی یہ بات کہ ترکی میں اس کا اصل مفہوم کیا ہے اس سوال کا جواب اس عبارت میں نہیں ملتا دہخدا کی یادداشت سے جو معلومات حاصل ہوتی ہے یعنی کہ یہ امکان ہے کہ یہ فرانسیسی کلمہ ٹیوب (TUBE) سے ماخوذ ہو جس کے معنی نال یا اسطوانے کے ہیں وہ سرے سے غلط ہے انھیں یہ غلط فہمی الفاظ کے تجانس اور ہم آواز ہونے سے پیدا ہوگئی ہے اور اصلیتِ الفاظ کے بارے میں ہم آوازی غلط فہمی کا ایک عام سرچشمہ ہے۔

بات درست یہی ہے کہ توپ اصلاً ترکی لفظ ہے جس کی ترکی شکل "طوپ" ہے اور جس کے معنی گول چیز، گولے، گیند یا کرہ کے ہیں اسے اسم کے طور پر بھی استعمال

(باقی ص۵ پر)

مخمور سعیدی | ہوا کو نہ روکو

ہوا طے شدہ راستوں کی مسافر نہیں ہے
ہوا کا سفر بے نشاں منزلوں کی طرف بھی رہا ہے
مگر سچ تو یہ ہے اِس آزادہ رو نے جدھر رُخ کیا ہے
نئے راستے خود بخود بن گئے ہیں
نئی منزلیں سامنے آگئی ہیں

شرارت پہ آمادہ آوارہ جھونکے
کبھی دیو قامت پہاڑوں، تناور درختوں کو بے طرح چھیڑیں
کبھی خوش نما گھاٹیوں، پُر سکوں وادیوں میں اُتر کر ——
پریشان کن کھیل کھیلیں
کبھی دشت و دریا میں ہلچل مچائیں
کبھی چاند سورج کی شمعیں بجھائیں
ہزاروں برس اِس پُرانی زمیں کے مکینوں کو کیا کیا انوکھے تماشے دکھائیں
مگر سچ تو یہ ہے، یہ آوارہ جھونکے
ہماری گنہ گار آبادیوں سے اگر روٹھ جائیں
نئے موسموں کے مقدس فرشتے
ہمیں موت کی بے حسی سے بچانے ——
ہمارے عفونت زدہ مقبروں میں نہ آئیں

ہوا چلتے چلتے ابھی رُک گئی تھی تو کتنی گھٹن تھی
یہاں سے وہاں تک ——
ہر اک زندہ شے کس قدر خستہ جاں خستہ تن تھی
کچھ آوارہ جھونکے مگر سرسرائے
درختوں پہ چپ چاپ بیٹھے پرندوں نے پَر پھڑپھڑائے
ہوا چل پڑی ہے تو کتنی سہانی فضا ہے
یہاں سے وہاں تک ——
ہر اک زندہ شے جیسے نغمہ سرا ہے
یہ نغمہ کہ جو زندگی کے محافظ فرشتوں کی آوازِ پا ہے

ہوا چل پڑی ہے تو اس کو نہ روکو
ہزاروں برس اِس پُرانی زمیں کی گواہی کو مانو،
اس آزادہ رو نے جدھر رُخ کیا ہے
نئے راستے خود بخود بن گئے ہیں
نئی منزلیں، یعنی تازہ سفر کی شروعات کے مرحلے سامنے آگئے ہیں
جو، مُردہ مناظر تھے دھندلا گئے ہیں
ہوا کو نہ روکو ...

دوہے اور نظم

کرشن مراری

دوہے

تیرے شوخ بدن کا چنچل کنچن پگھلا جائے رے
پل بھر میں ہی من جوگی کا سارا جوگ بھلائے رے
چھل چھل کر سوچ البیلی ۔ منوا پریوں چھائے رے
دور گگن میں جیسے پنچھی پنکھوں پر منڈلائے رے
گھر بابل کا چھوڑ چلی ہے جگ کی ریت نبھائے رے
ٹھمک ٹھمک البیلی گوری ساجن کے گھر جائے رے
لانبی لانبی رات گھنیری ۔ لانبے لانبے سائے رے
بن ساجن سجنی تڑپت ہے ۔ تڑپت نیند نہ آئے رے
بہکی بہکی پرکھا چلے ہے ۔ آنچلے الجھے سائے رے
سوچ رہے ہیں ہم اب شاید ۔ تیری گلی میں آئے رے
دیپک ساری رات جلے ہے ۔ اپنا آپ مٹائے رے
اندھیارے میں اجیارے کی جیون جوت بڑھائے رے
جگ من آنگن باس کھلی ہے ۔ پھاگن سی لہرائے رے
ناچے کلیوں کی چنچلتا ، گد پہ گگن مسکائے رے

۸۸

C-4 اردن روڈ ۔ نئی دہلی

یشونت / بدیع الزماں خاور

سبیل

سبیل میں نے یہ سب کے لیے لگائی ہے
نہیں ہے فرق یہاں ذات اور مذہب کا
یہ ریگ زار کا موسم یہ دھوپ صحرا کی
یہ تشنگی بدن، روح کی یہ بے تابی
گرے بغیر پسینہ یہے بغیر آنسو
کسی کو مل نہیں پاتا ہے بوند بھر پانی
ہوائیں گرم ہیں اتنی کہ جسم جلتے ہیں
جدھر بھی دیکھو طاری ہے ایک مدہوشی
زمیں پہ نام نہیں ہے کہیں بھی سایے کا
سروں پہ حدِ نظر تک ہے آگ سورج کی
دکھائی دیتا ہے ہر سمت قحط کا عالم
جہاں بھی جائیے سختی و شدت ہے گرمی
بنا ہی لی ہے مگر میں نے خشک سالی میں
سبیل تیرے لیے اے تھکے ہوئے راہی
تلاش آب میں پھرتا رہا ہوں آوارہ
ہوئی ہے تب کہیں تیار یہ سبیل مری
جہاں بھی مجھ کو دکھائی دیا کوئی چشمہ
جہاں بھی آنکھ کو آئی نظر کوئی ندی
وہیں سے بھر کے میں لے آیا اپنا مشکیزہ
ہزار رنگ ہے میری سبیل کا پانی
یہی ہے میری تمنا کہ اپنے پانی سے
بجھاؤں پیاس میں اس تیز دھوپ میں تیری
نہیں ہے قید کوئی چاہے جس قدر پی لے
ٹھہر کے راہ میں میری سبیل کا پانی
میں چاہتا ہوں بس اتنا کہ تیری پیاس بجھے
یہ آرزو ہے کہ بجھ جائے تیری تشنہ لبی
ترے تھکے ہوئے قدموں میں تازگی آجائے
نصیب مجھ کو سفر کے لیے ہو تازگی
تو آگے بڑھتے ہوئے دل سے جو دعا نکلے
مری حیات کا حاصل وہی دعا ہوگی

سبیل میں نے یہ تیرے لیے لگائی ہے
سبیل میں نے یہ سب کے لیے لگائی ہے
مری سبیل میں جو آب ہے سو تیرا ہے
مری سبیل میں جو آب ہے سو ہے سب کا
نہیں ہے فرق یہاں ذات اور مذہب کا
(مراٹھی نظم)

غزلیں

حکیم منظور

ہے دل پہ آج بھی ہیبت کسی سمندر کی
کہ جاگتی ہی نہیں آنکھ میرے اندر کی

تمام عمر ہمیں جس نے تشنہ لب رکھا
وہ آب جو تھی امانت کسی سمندر کی

خلا کے ساتھ ہے اب تک تصور پر و بال
اڑا رہے ہیں زمینوں پہ لوگ بے پر کی

مجھے یہ دکھ ہے وہ ظاہر پرست کتنا ہے
وہ کہہ رہا ہے کہ ہر مورتی ہے پتھر کی

میں اپنی نظروں کو کیا کہہ کے اب تسلی دوں
کہ ڈھل چکی ہے سیاہی ہر ایک منظر کی

لہولہان ہوا میں ہی اس کا کیا کیجے
اگرچہ چوٹ زمانے کو بھی برابر کی

ہرا کر مٹھی میں بھرنے کے شوق میں منظور
ہمارے پاؤں تلے کی زمین بھی سرکی

●●

لطف الرحمٰن

کس نے جینے کو کہا مجھ سے فسانے کی طرح
ہیں حقیقت نہ بنا آج بھی کس کے ڈر سے

صبح تک مجھ کو چراغوں کی طرح جلنا ہے
سو گئی رات لپٹ کر مرے بام و در سے

ذرے ذرے میں بجھا اپنے لہو کا سورج
ہائے اس شیشے کو ٹکرا دیا کس پتھر سے

کوئی جھونکا، کسی آوارہ گھٹا کا جھونکا
نسبتِ گرد ہے آنکھوں کو عجب منظر سے

اس سے اک لفظ بھی زخموں کا اٹھایا نہ گیا
جس کے سینے کو بہت ربط رہا خنجر سے

●●

مدحت الاختر

کتنے خورشید بجھاتے ہیں اسی پانی سے
آس باقی ہے ابھی خاک کی طغیانی سے

شاخ سے ٹوٹ کے آوارہ پھرا کرتا ہوں
کیا ملا مجھ کو ہواؤں کی ثنا خوانی سے

کس نئے لفظ سے اب روح کا اظہار کروں
سارے الفاظ ہوئے جاتے ہیں بے معنی سے

ہر صدا اپنی ہی قاتل ہے اگر کھو جائے
جی لرزتا ہے صداؤں کی فراوانی سے

میں چمکنا ہی نہیں چاہتا لیکن مدحت
زرد ہو جائیں گے چہرے مری تابانی سے

●●

★ برکت کالج ... ★ ڈیپارٹمنٹ آف اردو ایل این یونیورسٹی ... بہار ۸۱۲۰۰۷ ★ نیا گودام - کامٹی

غزلیں

عابد ادیب

انجمن اپنی ہے، لوگ اپنے ہیں سب اپنا ہے
پھر بھی کہنا ہی پڑا ہے کہ ہمارا کیا ہے

یہ مرے عہد کی آواز ہے سمجھو یارو!
یہ نہ فریاد ہے کوئی نہ کوئی نغمہ ہے

لوگ پاگل ہیں کہ آواز سے کیسے جاتے ہیں
وہ بھی دیوانہ ہے چپ چاپ کھڑا تکتا ہے

توڑنے کے لیے اِک ضربِ صدا کافی ہے
آدمی کتنا ہی مضبوط ہو، دل شیشہ ہے

ساتھ چلنا ہو تو رفتار بڑھاؤ یارو!
وقت اِک تیز رو دریا کی طرح بہتا ہے

پہلے وہ راستے ہموار کیا کرتا تھا
اب وہ ہر موڑ پہ دیوار کھڑی کرتا ہے

سر پہ سورج ہے دہکتے ہوئے انگارے لیے
اِس کڑی دھوپ میں عابدؔ تو کہاں نکلا ہے

▲▲

خالد رحیم

ہرگز نہ غم کی دھوپ سے ڈرنا مسافرو
برگد ہے سایہ دار ٹھہرنا مسافرو

وہ شخص دشمنوں کا طرف دار ہو گیا
اب اُس سے میرا ذکر نہ کرنا مسافرو

بیمار خواہشوں کے سمندر میں کود کر
لمحوں کی موج بن کے اُبھرنا، مسافرو

جنگل کی سمت لے کے چلی ہے مہیب رات
پتّوں کی آہٹوں سے نہ ڈرنا مسافرو

یہ دوسروں کا شہر ہے اس شہر میں کبھی
سایوں کا اعتبار نہ کرنا مسافرو

وہ بھی ہے اپنے سر پہ لیے زندگی کا بوجھ
خالدؔ کو ساتھ لے کے گزرنا مسافرو

▲▲

نصیر پرواز

وجود اپنا غم کا انداز ہے
مری ذات ہی جس کی غمّاز ہے

مرے دل میں کوئی بھی خواہش نہیں
مری نامرادی کا اعجاز ہے

مجھے فکرِ تخلیقِ شام و سحر
خدا میرے لمحوں کا ہمراز ہے

مری روح عریاں خلا کا سفر
ازل تا ابد اک تگ و تاز ہے

بکھر جائے گا یہ محل ریت کا
مجھے اپنے ذرّوں پہ کیوں ناز ہے

حقائق مرے جسم کو کھا گئے
مری زندگی صرف آواز ہے

وہ آنکھوں میں اشکوں کی اِک ندی تھا
جو سہمے ہوئے ذہن کا راز ہے

▲▲

★ بوہرہ واڑی۔ احمد پور
★ سپنا اسٹور بخشی بازار، کٹک ۱
★ [illegible] الیکٹریکل لمیٹڈ [illegible] دہلی

واسو

سلام بن رزّاق

اس کے کپڑے میلے چیکٹ ہو رہے تھے، جوتوں پر دھول کی موٹی سی تہہ جمی ہوئی تھی اور پسینے سے سارا بدن چپچپا رہا تھا۔ چہرے سے اس قدر تھکن مترشح تھی کہ صاف لگتا تھا ایک طویل مسافت طے کر کے آ رہا ہے۔ کاندھے سے ایک میلا سا جھولا لٹک رہا تھا اور وہ اس طرح گھسٹ گھسٹ کر چل رہا تھا جیسے دو چار قدم چلنے کے بعد ہی لڑکھڑا کر گر پڑے گا۔ وہ جوں توں کر کے اپنے مکان کے سامنے پہنچ گیا۔ مکان کا دروازہ کھلا تھا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ بیٹھک کے کمرے میں اس کی ماں بیٹھی رامائن کا پاٹھ کر رہی تھی۔ اس کی آہٹ پاتے ہی اس نے گردن اٹھائی اور چونک کر ایک دم سے رامائن پڑھنا بند کر دیا۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے آگے بڑھا اور سامنے بچھی آرام کرسی میں ڈھیر ہو گیا — جھولے کو کاندھے سے اتار کر فرش پر ڈالتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔

"کون ہے؟ — کون ہو تم؟"

اس کی ماں کی گھبرائی ہوئی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ رامائن بند کر کے کھڑی ہو گئی تھی۔

"میں ہوں ماں! —" اس نے تھکے تھکے لہجے میں آنکھیں بند کئے ہوئے ہی جواب دیا

"میں، کون؟" ماں کے لہجے میں اضطراب برقرار تھا — "اور اس طرح بغیر اجازت کے تم اندر کیسے آ گئے؟"

ماں کے آخری جملے پر وہ چونک پڑا۔ آرام کرسی پر اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"ارے ماں! میں ہوں — واسو — کب سے کہہ رہا ہوں چشمے کا نمبر بدل لو، دیکھو اب دن کے اجالے میں بھی تمہیں دکھائی نہیں دے رہا ہے۔"

"ارے چل! تو کہاں سے آیا میرا واسو۔ اری بہو! دیکھ تو یہ کون مشٹنڈا گھر میں گھس آیا ہے۔"

اتنے میں اندر کے کمرے سے اس کی بیوی برآمد ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں جھاڑو تھی۔ شاید وہ ماں کی آواز سن کر جھاڑو دیتی دیتی باہر چلی آئی تھی۔ اس پر نظر پڑتے ہی ٹھٹھک کر دروازے ہی میں کھڑی ہو گئی پھر ایک ہاتھ سے اپنے بائیں گال پر جھول آئی بالوں کی لٹ کو انگلی سے سرکاتی، سینے پر پلّو کو درست کرتی بولی۔

"کون ہیں آپ؟"

"ارے کیا ہو گیا ہے تم لوگوں کو؟ کیا سفر نے میرا حلیہ اتنا بدل دیا ہے کہ تم لوگ مجھے پہچان ہی نہیں پا رہے ہو؟"

"اری بہو! اس موئے کی ہمت تو دیکھو، دن دہاڑے اپنے آپ کو واسو کہہ رہا ہے۔"

"کیا؟" اس کی بیوی بری طرح چونکی۔ ایک بار اسے گھور کر دیکھا۔ پھر تیوریوں پر بل ڈال کر بولی: "مسٹر کون ہیں آپ؟ یہ شریفوں کا مکان ہے۔ یہاں دھوکا دھڑی نہیں چلے گی۔"

"اری بہو! ذرا پڑوس سے وکرم بھائی کو تو آواز دے۔ ابھی اس لباڑی کا لباڑپن معلوم ہوا جاتا ہے۔"

"ارے کہیں تم لوگوں کے دماغ تو خراب نہیں ہو گئے؟ کُمد! ماں کی آنکھوں میں تو ویسے ہی موتیا ہے اسے ٹھیک سے دکھائی نہیں دیتا۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ میں بہت تھک گیا ہوں۔ ذرا پانی گرم کر دے۔ نہا کر سوؤں گا۔"

۴۸/۲ - ڈی - فریش نگر — کرلا — بمبئی ۴۰۰۰۷۰

"اے ہے، پانی گرم کر دو۔ کون تیرے باوا کا نوکر بیٹھا ہے رے جو تی خور، دیکھو تو یہ اچھی عورت کا کیسی بے شرمی سے نام لیتا ہے۔ بہو! میں کہتی ہوں جلدی سے کسی کو آواز دے کر بلا۔ کہیں یہ بدمعاش کمرے سے کچھ اچک کر بھاگ نہ نکلے۔" اتنے میں اس کا سات سالہ بیٹا گنٹو اسکول سے آ گیا۔ گنٹو پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرائی۔

"گنٹو! اِدھر آ کے بیٹے! ہمارے پاس۔ دیکھو تمہاری دادی اور ممی پاگل ہو گئی ہیں۔ چلو انہیں ہسپتال میں بھرتی کروا دیں۔"

گنٹو نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ جلدی سے ماں کی کمر سے لگ کر کھڑا ہو گیا اور سہمی سہمی نظروں سے اسے دیکھتا ہوا بولا۔

"ممی! کون ہیں یہ؟"

اب تو اس کے پیروں تلے کی زمین ہی کھسک گئی۔ تو کیا گنٹو بھی اسے نہیں پہچان پا رہا ہے۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ کیا وہ سچ مچ اتنا بدل گیا ہے۔ مگر اسے یہاں سے گئے بہت لمبا عرصہ بھی تو نہیں ہوا۔ پھر یہ لوگ اسے کیوں نہیں پہچان پا رہے ہیں۔ اسے تو سب کچھ یاد ہے ایک ایک چہرہ، ایک ایک بات، ایک ایک واقعہ۔ کہیں ان چند دنوں میں گھر والے تو نہیں بدل گئے۔ اس نے ماں، بیوی اور بیٹے کے چہروں کو دیکھا۔ چہرے تو وہی تھے جو وہ پیچھے چھوڑ گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اب اندر ہی اندر اسے بھی ایک عجیب سا خوف محسوس ہونے لگا تھا۔

وہ کرسی سے اٹھ گیا اور گنٹو کی طرف بڑھتا ہوا پیار سے بولا۔

"گنٹو بیٹے! اِدھر آؤ دیکھو ہم تمہارے لیے ٹافیاں لائے ہیں۔"

وہ جوں ہی آگے بڑھا۔ اس کی بیوی نے ایک زور کی چیخ ماری اور گنٹو کو گھسیٹتی ہوئی اندر کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی۔ اِدھر ماں بھی زور زور سے چلّانے لگی۔ اب وہ بری طرح خوفزدہ ہو گیا۔ مارے گھبراہٹ کے کبھی دروازے کی طرف دیکھتا کبھی ماں کی طرف جو اپنی پیشانی پر دوہتڑ مارتی ہوئی متواتر چلا رہی تھی۔ آخر وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ باہر سے کسی کی آواز آئی۔

"کیا ہوا ماؤسی؟ کیا بات ہے؟" اور ساتھ ہی پڑوس کا اشوک اندر گھس آیا۔ اس کے ہاتھ میں ہاکی اسٹک تھی، شاید وہ ہاکی کھیلنے جا رہا تھا۔ ماں نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ارے دیکھ بیٹا، یہ کون لفنگا گھر میں گھس آیا ہے اور اپنے آپ کو واسو بتاتا ہے" اشوک اس کے پڑوسی دوست ایسے کا چھوٹا بھائی تھا۔ اس نے تیوریاں چڑھا اور ہاکی اسٹک پر اپنی گرفت مضبوط کرتا ہوا بولا۔

"کون ہو تم؟" اب اس کی بوکھلاہٹ شباب پر تھی۔ اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"ارے اشوک! میں۔ میں ——"

اتنے میں پڑوس کی دو تین عورتیں بھی کیا ہوا؟ کیا ہوا؟ کرتی ہوئی اندر گھس آئیں۔ مارے گھبراہٹ کے اس کے پسینے چھوٹ گئے۔ وہ حیران و پریشان سا کمرے میں کھڑا ایک ایک کا منہ تک رہا تھا۔ سب لوگ اسے گھیر کر کھڑے ہو گئے تبھی باہر سے اس کے پتا جی اور چھوٹا بھائی رمیش بھی آ گئے انھیں بھی صورت حال سے آگاہ کر دیا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سب نے مل کر اسے پکڑ لیا اور کرسی پر گرا کر رسی سے جکڑ دیا۔ وہ چیخ چیخ کر احتجاج کرنے لگا۔ مگر کسی نے اس کی ایک نہ سنی۔

"اب بول بدمعاش! تو کون ہے؟" اس کے پتا جی نے اس کے بال پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔

"پتا جی یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ آپ لوگ یقین کیوں نہیں کرتے کہ میں واسو ہوں۔"

"شٹ اپ حرام زادے تجھے ابھی پتا چل جائے گا کہ تو کون ہے۔ دن دہاڑے ہماری آنکھوں میں

ڈھول جھونکتا ہے۔"

"مگر پتاجی! اس کے چھوٹے بھائی رمیش نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"یہ شخص تو ہم سب کے ناموں سے واقف ہے سب کے رشتے بھی صحیح بتا رہا ہے۔"

"اسے کوئی بہت بڑا ٹھگ معلوم ہوتا ہے بہت دنوں سے ہمارے پیچھے رہا ہوگا۔"

"آخر آپ لوگ مان کیوں نہیں لیتے کہ میں واسو ہوں"

"کیسے مان لیں جبکہ تم واسو نہیں ہو۔"

"اب میں آپ کو کیسے سمجھاؤں کہ میں واسو ہوں۔"

"بہو! ذرا واسو کا کوئی فوٹو لانا۔ ابھی سارا بھید کھل جاتا ہے۔"

اس کے پتا نے بہو سے مخاطب ہو کر کہا۔

اس کی بیوی جلدی سے اندر کے کمرے میں چلی گئی۔ اور تھوڑی دیر بعد بوکھلائی ہوئی سی لوٹ آئی۔

"بابو! ان کی ساری تصویریں غائب ہیں۔"

"کیا ــــ؟" یک وقت کئی لوگوں کی زبان سے نکلا ــــ

"ہاں ــــ یہ دیکھئے یہ البم، اس میں ان کی ایک بھی تصویر نہیں ہے ــــ دیوار پہ جو فریم لگی تھی وہ بھی غائب ہے ــــ"

سب نے جلدی جلدی البم کو الٹ پلٹ کر دیکھا ــــ سچ مچ البم میں اس کی ایک بھی تصویر نہیں تھی۔ پھر سارا گھر چھان مارا گیا۔ کہیں سے بھی اس کا کوئی فوٹو برآمد نہیں ہوا۔ تھک ہار کر سب لوگ پھر اس کے گرد جمع ہو گئے۔

"اس سے دستخط کرنے کے لیے کہیے ابھی سب معلوم ہو جائے گا۔" کسی نے تجویز رکھی۔ کاغذ قلم لایا گیا اور اس سے دستخط کرنے کو کہا گیا۔ اس نے فوراً کاغذ پر دستخط کر دیے۔ دستخط واسو ہی کے تھے۔ سب کے چہروں پر حیرانی اور کشمکش کے آثار دکھائی دینے لگے۔ ماں، باپ اور بیوی کے چہرے تو فق ہو گئے۔ اس نے لوگوں کی اس گومگو کیفیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔ ارے میں واسو ہوں اور آپ لوگ یہ ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں کہ میں واسو نہیں ہوں۔ میں ایک ہزار ثبوت دے سکتا ہوں کہ میں واسو ہوں ــــ مجھے پریشان مت کیجئے ورنہ میرا دماغ الٹ جائے گا۔ اُف! انتہا ہو گئی ماں اپنے بیٹے کو نہیں پہچانتی، بیوی اپنے شوہر کی انکاری ہے۔ بھائی بھائی کو نہیں جانتا حد ہو گئی ــــ" اس کا گلا رندھ گیا۔

کوئی کچھ نہیں بولا۔ پھر اس کے پتاجی نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔

"اچھا بتاؤ میں کون ہوں؟"

"آپ کون ہیں؟ ارے آپ میرے پتاجی ہیں ــــ آپ کا نام گوپی ناتھ ہے۔ آپ کے پتاجی کا نام امرناتھ تھا۔ یہ میری ماتا ہیں۔ یہ رمیش ہے۔ میرا چھوٹا بھائی۔ بی کام کے آخری سال میں ہے۔ یہ گڈو ہے میرا بیٹا سینٹ میری میں فرسٹ اسٹینڈرڈ میں پڑھ رہا ہے۔ یہ میری پتنی ہے کملا . . . "

"ہٹ ــــ میں تیری پتنی کیوں ہونے لگی نگوڑے۔" اس کی پتنی نے غصے اور شرم سے سرخ ہوتے ہوئے کہا۔ اس پر کچھ لوگ دبی دبی ہنسی ہنس دیے۔

"تم میری پتنی نہیں ہو"، اسے بھی غصہ آ گیا۔

"کیا یہ جھوٹ ہے کہ ہماری شادی چودہ نومبر انیس سو اڑسٹھ کو ہوئی تھی۔ یہ بھی جھوٹ ہے کہ پانچ جنوری ستّر کو گڈو پیدا ہوا تھا۔ اور . . . اور ــــ یہ بھی جھوٹ ہے کہ تمھاری دونوں چھاتیوں کے بیچ میں ایک بڑا سا کالا تل ہے۔"

"چپ ــــ بدتمیز ــــ" اس کے پتاجی گرجے اور ایک زور کا چانٹا اس کے منہ پر رسید کر دیا ــــ

اس کی بیوی "اوئی ماں!" کہتی ہوئی دروازے کی اوٹ میں ہو گئی ــــ اور ایک بار پھر سب اس پر

ٹوٹ پڑے — اور اُسے مارتے گھسیٹتے مکان کے اندر ایک اندھیری کوٹھری میں لے گئے۔ ہاتھ پاؤں باندھ کر ایک کونے میں پھینکا اور باہر سے کنڈی چڑھا دی۔ دوبارہ سب بیٹھک کے کمرے میں جمع ہو گئے اور سر جوڑ کر اس اُفتاد پر غور کرنے لگے۔ گوری اور نندا بابو کو بہت پریشان تھے، اس کا جھولا وہیں فرش پر پڑا تھا۔ اسے الٹا گیا، اندر سے کچھ کاغذات ایک کتاب مسواک، تولیہ ایک جوڑی کپڑے اور ٹافیوں کا ایک ڈبہ برآمد ہوا۔ کاغذات پر عجیب عجیب نقشے اور زائچے بنے ہوئے تھے کہیں کہیں مختلف اعداد کو لکھ لکھ کر بار بار کاٹا گیا تھا۔ سارا سامان وہی تھا جو واسو سفر پر جاتے وقت لے گیا تھا۔ صرف ٹافیوں کا ڈبہ زائد تھا۔

"سامان تو سب وہی ہے جو وہ ساتھ لے گئے تھے۔" اس کی بیوی نے چیزوں کو الٹتے پلٹتے کہا۔

"ہاں سامان تو وہی ہے۔" ماں نے تصدیق کی

"پھر بھیا کہاں چلے گئے۔" رمیش نے پرتشویش لہجے میں کہا۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا چکر ہے"۔ اس کا باپ دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بڑبڑانے لگا۔

"انکل آپ پولیس میں اطلاع کر دیجیے" واسو کے دوست اجے نے مشورہ دیا۔

"کیا اطلاع کی جائے — ہمارے پاس بھی کیا ثبوت ہے کہ وہ واسو نہیں ہے"

"ارے ہم سب گواہ ہیں کہ وہ واسو نہیں ہے"

"مگر وہ جس تفصیل اور باریکی سے ایک ایک بات بتا رہا ہے وہ تو صرف واسو ہی بتا سکتا تھا"

"سو تو ہے پھر بھی —"

بات بڑھانے سے شبکی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ — بس کسی صورت اس سے یہ قبول کروا لینا ہے کہ وہ واسو نہیں ہے۔ یا پھر واسو کے لوٹنے تک ہمیں انتظار کرنا ہوگا۔"

"واسو نے کب تک لوٹنے کو کہا تھا؟"

"ٹھیک چالیس روز بعد۔ آج اماوس ہے نا۔ بس آج رات تک لوٹ آنا چاہیے کیوں بہو، تم سے بھی کچھ کہا تھا۔؟"

"نہیں — بس اماوس تک لوٹنے کی بات کہی تھی"۔

"مگر انکل سفر کی نوعیت کیا تھی۔؟"

"نوعیت —" اس کے پتاجی سوچ میں پڑ گئے — "نوعیت تو مجھے بھی نہیں معلوم بیٹا۔ بس ایک دن اچانک کہنے لگا میں شہر سے باہر جا رہا ہوں اور پورے چالیس دن بعد لوٹوں گا۔ ہم نے پوچھا بھی کہاں جا رہے ہو، بولا لوٹ کر بتاؤں گا۔ مجھے تلاش کرنے کی کوشش نہ کیجیے گا میں خود لوٹ آؤں گا —"

"اوہو —" اجے کے ہونٹ تشویش کے سے انداز میں سکڑ گئے۔

"انکل، آپ کو یہ بات مجھے بہت پہلے بتانا چاہیے تھی"

"ہاں بیٹا، اب میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ شاید اُس کے یوں اچانک چلے جانے سے میری مت ماری گئی تھی"

"خیر — تو پھر آج کا ایک دن اور دیکھیے"

"یہی کرنا ہوگا۔"

اس کے بعد پڑوس کے لوگ ایک ایک دو دو کر کے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ اور گھر کے افراد اس طرح گم سم جہاں کے تہاں بیٹھے رہ گئے جیسے ابھی ابھی کسی عزیز کی موت کی خبر سنی ہو۔

شام ہوئی شام سے رات ہوئی، پھر صبح بھی ہو گئی۔ ایک دن، دو دن، تین دن واسو نہیں لوٹا —

اس عرصے میں وہ لوگ صبح شام اس کی کوٹھری میں جا کر اس سے قبلوانے کی کوشش کرتے کہ وہ واسو نہیں ہے اور ہر بار وہ ان سے گڑگڑا کر کہتا۔

"تم لوگ کیوں مجھے زندہ درگور کیے ہوئے ہو۔ اگر میں واسو نہیں ہوں تو مجھے زہر دے کر مار دو —

قتل کر کے یہیں کوٹھری میں دفن کر دو۔ یا پھر مجھے پولیس
کے حوالے کر دو تاکہ مجھے اس عذاب سے نجات ملے "
مگر اس کی کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھا۔ جب بھی
کوٹھری کا دروازہ کھلتا ۔۔ اس سے پوچھا جاتا۔
" سچ سچ بتاؤ کیا تم واسو ہو ؟ "
" بتاؤ واسو کہاں ہے ؟ کہیں تم نے اسے قتل تو
نہیں کر دیا ؟ "
اور ہر بار وہ جواب دیتا " میں واسو ہوں،
میں واسو ہوں، ہزار بار واسو ہوں۔ میں خود اپنا
اپنا قتل کیسے کر سکتا ہوں "
اسی طرح مزید چند روز گزر گئے۔ اس کے بعد
انہوں نے اسے زد و کوب کرنا شروع کر دیا، بید اور
چابک سے اتنا مارا کہ سارے بدن پر نیل پڑ گئے ۔
گرم گرم سلاخوں سے داغا۔ بال پکڑ کر بری طرح کوٹھری
میں گھسیٹا، سوئیوں سے چھیدا۔ مگر وہ یہی کہتا رہا،
"میں واسو ہوں، میں واسو ہوں، مجھے مت مارو
میں واسو ہوں "
پتا نہیں پھر کیا ہوا، شاید وہ لوگ اسے سزا
دیتے دیتے تھک گئے، یا پھر اسے سزا دینا ان کے
نزدیک، روزمرہ کا ایک بے کیف معمول بن کر رہ
گیا ۔
جو بھی ہو صبح شام، رات دن، اسے دیکھتے اپنے
کاٹتے، گالیاں دیتے غالباً اب وہ سب لوگ اس کے
وجود کے عادی سے ہوتے جا رہے تھے۔ اسے دیکھتے
ہی اب بھی ان کی آنکھوں میں خون اتر آتا۔ مگر جوں
جوں دن گزرتے جا رہے تھے انہوں نے محسوس کیا کہ
نفرت اور غصے کی ان سبز تہوں کے نیچے انسیت اور
ہمدردی کا ایک ننھا سا چشمہ بھی کروٹیں لینے لگا ہے
ہر چند کہ اس کا شور ابھی مدھم تھا تاہم دھیرے دھیرے
اس کی دھمک وہ لوگ اپنے لہو میں محسوس کرنے لگے
آخر ایک دن سب لوگ بیٹھک کے کمرے میں
جمع ہوئے۔ باپ، ماں، بیوی، بھائی، پڑوسی، دوست
احباب سبھی موجود تھے بہت دیر کی تکرار و بحث کے
بعد یہ طے پایا کہ اسے واسو تسلیم کر لیا جائے۔ اس کے
سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ انہوں نے سوچا۔ ممکن ہے
وہی صحیح کہہ رہا ہو۔ وہ واسو ہی ہو اور یہ لوگ کسی بھیانک
غلط فہمی کی وجہ سے اسے واسو تسلیم کرنے سے انکار
کر رہے ہوں۔ سب لوگ اس کی کوٹھری کے سامنے
آ کر کھڑے ہو گئے۔ ماں اس کے لئے ہاتھوں میں کھانے
کی تھالی لئے کھڑی تھی۔ بیوی ایک دھلا دھلایا کپڑوں
کا جوڑا لئے دروازہ کھلنے کی منتظر تھی۔ ایک طرف بھائی،
دوست اور دوسرے عزیز کھڑے تھے۔ سب کی نظریں
کوٹھری کے دروازے پر جمی تھیں ۔
آخر اس کے باپ نے آہستہ سے کوٹھری کا دروازہ
کھولا۔ کوٹھری میں اندھیرا تھا۔ کسی نے ٹارچ جلائی۔
ٹارچ کی محدود روشنی میں لوگوں نے دیکھا کہ وہ ایک
کونے میں گھٹنوں میں سر دئیے بیٹھا ہے۔ کمرے میں ایسا
تعفن پھیلا تھا کہ دو منٹ رکنا محال تھا۔ اس پر ٹارچ
کی روشنی پڑتے ہی اس نے وحشی جانور کی طرح چونک کر
گردن اٹھائی۔
اُف ! آنکھیں تھیں کہ لہو کے جیسے بھرے کٹورے۔
باپ نے دھیرے سے پکارا ۔
" بیٹا واسو ! چلو، باہر چلو ہم تمہیں لینے آئے ہیں "
اس آواز پر وہ یک بارگی بری طرح چونکا ۔
چونک کر گردن اٹھائی پھر چند لمحے آنکھوں سے
ایک ایک کو تکتا ہوا اجنبی لہجے میں بولا ۔
" واسو ؟ میں واسو نہیں ہوں ۔ آپ لوگ
کون ہیں ؟ "
چھنن ۔۔ نن ۔۔ نن ۔۔ ن ۔۔ ن ۔۔
ماں کے ہاتھ سے کھانے کی تھالی چھوٹ کر فرش پر گر گئی۔
اور وہ سب ایک دوسرے کو حیرت اور استعجاب
سے دیکھتے رہ گئے

"بھرشٹا چار بند —— پانی کا پربندھ"

ہمیں سرزمینِ ہریانہ کے تمام علاقوں کی ترقی، کاشتکاری، پشو پالن اور چھوٹی صنعتوں کے فروغ، خاص کر یہاں کے دیہات کی چہار سو ترقی کو یقینی بنانے کے لیے کمر بستہ ہونا ہے۔
ہمارا نعرہ ہے .....

"بھرشٹا چار بند ..... پانی کا پربندھ"

دیوی لال
وزیرِ اعلیٰ، ہریانہ

جاری کردہ :- محکمہ تعلقاتِ عامہ، ہریانہ

سوویٹ یونین میں ذہنی امراض کا معالجہ

سریندر موہن

اس مرتبہ جن ہندوستانیوں کو سوویٹ لینڈ نہرو ایوارڈ ہے، ان میں ڈاکٹر دھریندر ناتھ گنگولی بھی شامل ہیں جو رپاٹ" کے بیان کے مطابق ذہنی عوارض کے معالج ۱۹ر اگست کو ایوارڈ پانے والوں کے اعزاز میں منعقدہ ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے ب کے میدان میں سوویٹ یونین کی ترقیات کی بڑی ریف کی اور یہ بھی کہا کہ نفسیاتی اور سماجی روابط کے ہے میں سوویٹ یونین میں بڑا کام ہوا ہے۔

ڈاکٹر گنگولی کی خوش قسمتی تھی کہ وہ ایک ایسے جلسے تقریر کر رہے تھے جس میں یا تو انھیں کی طرح سوویٹ نڈ نہرو ایوارڈ پانے والے شریک تھے یا سوویٹ یونین کے رے مداحین۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے لوگوں سے یہ نہیں تھا کہ وہ کرید کرید کر کوئی بات پوچھیں گے۔ انھیں جس قسم کے سامعین کا سامنا ہوتا تو وہ ان یہ ضرور پوچھتے کہ طب میں ان کا جو مخصوص دائرۂ کار اس میں سوویٹ یونین میں کس نوع کی ترقیاں ہوئی ر نفسیاتی اور سماجی روابط میں سوویٹ طب کیا انجام دیتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ذہنی معالجے کے سوویٹ یونین میں جو کچھ ہوتا ہے وہ کافی شرمناک ہے۔ ویٹ یونین سے باہر کے لوگ بخوبی جانتے ہیں کہ الی معالجے کے نام پر سوویٹ یونین میں غیر مقلد افراد مریض قرار دے دیا جاتا ہے۔ علاج کے نام پر یا ایسی ادویات دی جاتی ہیں جو جسمانی طور پر مضر ہوتی ہیں انھیں یا تو سچ مچ کا مریض بنا دیتی ہیں، یا تنگ لوگ "توبہ" کر لیتے ہیں۔

۱۹۶۲ء کے بعد سے بیرونی دنیا کو ایسے دو سو دس اشخاص کے بارے میں پتہ چلا ہے جنھیں اپنے سیاسی، مذہبی اور دوسری طرح کے غیر مقلدانہ عقائد کی بنا پر اس قسم کی تعذیب کا شکار ہونا پڑا۔ ظاہر ہے کہ یہ تودۂ برف کا وہ حصہ ہے جو سطحِ آب کے اوپر ہے۔ سوویٹ یونین میں جو سخت اور ہمہ گیر سنسرشپ کا نظام ہے، اس کی وجہ سے بے شمار غیر مقلدوں کی تعذیب کے بارے میں بیرونی دنیا کو علم نہیں ہوتا۔

بیرونی دنیا کو جو اطلاعات ملتی ہیں، اس کے مختلف النوع ماخذ ہیں۔ بہت سے غیر مقلدوں نے اپنی تعذیب کی مفصل روداد لکھی ہیں۔ کچھ غیر مقلد ایسے بھی ہیں جو اس تعذیب کا شکار ہونے کے بعد سوویٹ یونین سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئے اور سوویٹ یونین کے کچھ ڈاکٹر جو نفسیاتی معالجے کے نام پر تعذیب کا کام کرتے تھے اور نقل مکانی کر کے باہر آ گئے۔ مثلاً ڈاکٹر گولڈ سٹائن، ڈاکٹر سیگل، ڈاکٹر ددی خانسکایا، ڈاکٹر یاروشیوسکی اور ڈاکٹر زوبک وغیرہ۔

معلومات کا اہم ترین ذریعہ سوویٹ جریدۂ "حالیہ واقعات کا کرانیکل" ہے جسے وہ لوگ شائع کرتے ہیں جنھوں نے اندرونِ روس انسانی حقوق کے تحفظ کی مہم چلا رکھی ہے۔ یہ جریدہ جس میں بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی کی مصدقہ اطلاعات شائع ہوتی ہیں، خفیہ طور پر ۱۹۶۸ء سے نکل رہا ہے اور ٹائپ شدہ شکل میں غیر سرکاری طور پر تقسیم ہوتا رہتا ہے۔

سب سے زیادہ تفصیلی معلومات ولادیمیر بکوسکی

نے تھما کی میں جو گزشتہ دہے میں خود بھی ذہنی مریض قرار پایا تھا اور تعذیب کا شکار ہوا تھا۔ وہ اب انسانی حقوق کے معروف ترین حامیوں میں ہے۔ ۱۹۷۱ء میں اس نے چھ غیر مقلدوں کے بارے میں نام نہاد طبی رپورٹیں باہر بھیجی تھیں اور مغرب کے ڈاکٹروں سے اپیل کی تھی کہ وہ ان رپورٹوں کا تفصیلی معائنہ کریں اور اس کے بعد یہ رائے دیں کہ کیا یہ غیر مقلد واقعی اس قابل تھے کہ انھیں نفسیاتی معالجے کے لیے زبردستی کسی اسپتال میں داخل کر دیا جائے۔ ان رپورٹوں کی مغرب میں اشاعت کے ایک ہفتے بعد دوکروسکی کو سوویٹ دشمن پروپیگنڈے کے الزام میں روسی پولیس نے گرفتار کر لیا۔ اس کا جرم یہ تھا کہ اس نے بیرونی دنیا کو نام نہاد سوویٹ ماہرین نفسیات کی غیر اخلاقی روش سے آگاہ کر دیا تھا۔ بطور پاداش اسے سات برس کی قید اور پانچ سال کی جلاوطنی کی سزا دی گئی۔

مختلف ذرائع سے جتنی بھی اطلاعات ملتی ہیں، ان سب کا ماحصل ایک ہی ہے۔ طے شدہ ریاستی پالیسی کے تحت ہر قسم کی عدم تقلید کو خواہ وہ سیاسی ہو یا اور کسی نوعیت کی، ذہنی عارضہ قرار دے دیا جاتا ہے۔ غیر مقلدوں کو ذہنی مریض قرار دے دینے کے بعد انھیں "مناسب علاج" کے لیے ذہنی شفاخانے میں بھیج دیا جاتا ہے۔

اس تعذیب کا شکار ہونے والوں کو مندرجۂ ذیل پانچ گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ انسانی حقوق اور سوویٹ نظام کو جمہوری بنانے کے حامی۔ تعذیب کا شکار ہونے والوں میں نصف کے قریب لوگ اسی گروپ کے ہیں۔ ان لوگوں کا قصور یہ ہے کہ انھوں نے درخواستوں، اپیلوں، پرامن مظاہروں اور اس قسم کے دوسرے ذرائع سے سوویٹ حکام سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ شہریوں کے آئینی حقوق کا احترام کریں۔ اس قسم کے اقدامات کرتے ہوئے ان غیر مقلدوں نے پوری پوری احتیاط برتی کہ وہ سوویٹ ضابطے کی خلاف ورزی کے مرتکب نہ ہوں۔

۲۔ علاقائی قوم پرستی کے حامی۔ یہ غیر مقلد سوویٹ آئین کے مطابق اپنے مخصوص نسلی گروہوں کے لیے بہتر حقوق کا مطالبہ کرتے ہیں۔ جیسا کہ سب جانتے ہیں سوویٹ آئین اصولی طور پر اپنی پشتارہ قومی جمہوریتوں کو بہت بڑی حد تک خود مختاری کا حق دیتا ہے مثلاً کے طور پر میکولا پلا کھوٹینوک جو ایک نوجوان یوکرینی ڈاکٹر ہے، ۱۹۷۲ء میں یوکرین کو بہتر حقوق دیے جانے کے حق میں لٹریچر تقسیم کرتے ہوئے گرفتار کیا گیا۔ ڈاکٹروں نے قرار دے دیا کہ وہ اس وہم میں مبتلا ہے کہ دوسرے اس کے درپئے آزار ہیں اور اس کا رویہ غیر ذمہ دارانہ ہے۔ اس وقت سے وہ اسپتالی قید میں ہے۔

۳۔ ترکِ وطن کے خواہشمند۔ ان میں یہودی اور وولگا جرمن شامل ہیں جنھوں نے حکومت سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ وہ انھیں ان کے آبائی خطوں میں جانے کی اجازت دے دے۔ اس کے علاوہ کچھ روسی بھی ہیں جو سوویٹ یونین کی سکونت ترک کرنا چاہتے ہیں مثال کے طور پر نکولائی کریوچکوو جس نے ۱۹۷۴ء میں حکومت کو درخواست بھیجی تھی کہ اسے سوویٹ یونین چھوڑ کر امریکہ جانے کی اجازت دے دی جائے جب صدر نکسن ماسکو گئے تو یہ شخص دماغی اسپتال میں تھا اسپتال میں اسے داخل کیے جانے کی وجہ تحریری طور پر یہ ظاہر کی گئی تھی کہ وہ سوویٹ یونین سے ہجرت کرنا چاہتا ہے۔

۴۔ مذہب کو ماننے والے افراد جنھیں ان کی مذہبی سرگرمیوں کی بنا پر اسپتال بھیج دیا جاتا ہے۔ ان پر غیر قانونی گروپ بنانے اور مذہبی لٹریچر تقسیم کرنے کے الزام میں مقدمہ بھی چلایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جینڈی شیمانوو کو اسی قسم کے ایک گروپ میں شرکت کی پاداش میں ذہنی امراض کے اسپتال میں بھیج دیا گیا تھا۔ وہاں سے تبھی رہائی نصیب ہوئی جب اس نے بھوک ہڑتال کر دی۔

۵۔ ایسے شہری جو پارٹی یا حکومت کے چھوٹے موٹے کارکنوں کی ناخوشی کا ہدف بن جاتے ہیں جب یہ لوگ ان کارکنوں کی غیر قانونی کارروائیوں کے خلاف مسلسل شکایت کرتے رہیں تو وہ انھیں دماغی ہسپتالوں میں پہنچانے کا انتظام کر دیتے ہیں۔

عدم تقلید کو ذہنی عارضہ قرار دیے جانے کے اسباب پیچ در پیچ ہیں۔ ایک سبب وہ فکری رجحان ہے جس کا سوویٹ یونین خوگر ہو چکا ہے سوویٹ سماج میں ساٹھ برس تک مارکس ازم/لینن ازم کی تبلیغ ہوتی رہی ہے چنانچہ یہ ناقابل قیاس نہیں کہ ذہنی امراض کے کچھ ماہرین مخلصانہ طور پر اور کچھ ابن الوقتی کے زیر اثر یہ کہنے لگیں کہ کمیونسٹ پارٹی پر نکتہ چینی اور سماجی تبدیلیوں کے مطالبے کا باعث یہ ہے کہ ایسا کرنے والے لوگ ماحول سے پوری طرح ہم آہنگی پیدا نہ کرسکے۔ ایک ایسا شخص جو سوویٹ یونین جیسے متینہ مکمل سماج میں تبدیلیوں کا مطالبہ کرتا ہے، اس کے بارے میں ان لوگوں کے نزدیک یہی رائے قائم کی جاسکتی ہے کہ وہ اصلاح پسندانہ واہموں کا شکار ہے۔

معلوم نہیں ڈاکٹر گنگولی کبھی یہ بھی سوچتے ہیں یا نہیں کہ اگر اس انداز نظر کو کہ سیاسی عدم تقلید دیوانگی ہے، ہندوستان میں بھی صحیح مان لیا جائے تو ان کا اپنا کیا حشر ہوگا؟ غالباً یہی کہ انھیں ڈاکٹری بجائے ذہنی مریض قرار دے دیا جائے۔

مارچ ۱۹۷۸ء میں

تحریک

اپنی اشاعت کے ۲۵ سال پورے کر رہا ہے

ایک سنجیدہ علمی ادبی رسالے کے لیے پوری چوتھائی صدی تک باقاعدگی سے جاری رہنا کم فخر کی بات نہیں، بالخصوص موجودہ دور میں جب اردو زبان خود اپنے وطن میں بے وطن ہو کر رہ گئی ہے۔

اس موقع پر ہم ان مشکلات کا ذکر کرنا نہیں چاہتے جو "تحریک" کو زندہ رکھنے کے لیے ہمیں قدم قدم پر پیش آئیں، بلکہ ہم شکریہ ادا کرنا چاہتے ہیں اپنے ان کرم فرماؤں اور دوستوں کا جن کے تعاون نے ہمیں ان مشکلات پر قابو پانے کا حوصلہ دیا۔ ان کرم فرماؤں دوستوں میں ہمارے قلمی معاونین بھی ہیں، مشتہرین بھی اور ادب کے وہ قارئین بھی جن کی پسندیدگی "تحریک" کے لفظ اشاعت میں متواتر توسیع کا وسیلہ بنی۔

انھی کرم فرماؤں اور دوستوں کے تعاون پر بھروسہ کرتے ہوئے ہم نے اگلے سال "تحریک" کا سلور جبلی نمبر شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ "تحریک" کے خاص نمبر جب جب شائع ہوئے ہیں ادبی حلقوں میں ان کی دھوم مچ گئی ہے۔ ہماری کوشش ہوگی کہ سلور جبلی نمبر سابقہ تمام نمبروں پر سبقت لے جائے۔

ہم یقین دلاتے ہیں کہ "تحریک" کا سلور جبلی نمبر ایک بے مثال ادبی تحفہ ہوگا۔

اس کی تیاری میں ہمارا ہاتھ بٹائیے

اس کے لیے اشتہارات کی فراہمی میں ہماری مدد کیجیے۔

اور

اسے رعایتی داموں پر حاصل کرنے کے لیے تحریک کی سالانہ خریداری قبول کیجیے

ہم ہمیشہ کی طرح آپ کے مخلصانہ تعاون کے منتظر ہیں

نثری نظمیں

عظیم اختر

تیرا پیغام مجھے گیا ہے شالو
دھڑکنا قلب کی رفتار بہت تیز ہوئی
جل اٹھے پھر سے تیری یادوں کے چراغ
روشنی پھیل گئی تا حدِ خیال ——
خوشبوئیں بیتے ہوئے لمحوں کی
چھا گئیں احساس کے ویرانوں پہ
جھلملانے لگا تمنا کا گوہر
جگمگانے لگا احساس کا شیشہ
سرگوشیاں —— خوابیدہ
انگڑائیاں لینے لگیں
گنگنا اٹھے پھر سے وہی
دھندلائے ہوئے گیت
بے نام سے وہ درد
جو سلگتے ہی رہا کرتے تھے
آج پھر شعلہ فشاں بن اٹھے
سوزِ غم اور بڑھا، درد کی لے تیز ہوئی
تیز ہوئی ——
کاش کہ
تونے یہ پیغام نہ بھیجا ہوتا ——!!

●●

قمر الحسن زیدی

۱

جب کبھی
پتھروں کے پتھریلے
آنگن میں
شام کی نرمی ڈھل جاتی ہے
اور
سخت سنگلاخ سطحوں پر
پانی کے نرم و نازک بوسوں سے
ہری ہری کائی کی
مخمل چمک اٹھتی ہے
تمھارے ہونٹوں کے لمس یاد آتے ہیں

جب اک
چنچل، الھڑ بہتی ندی کا
تھا تھا سا کوئی کنارہ
ہولے ہولے ٹکرا رہا تھا
چٹانوں سے
اور
دور تک
پہاڑوں کی دراڑوں میں
دوب اگ آئی تھی

●●

۲

کل
دھل کر آئے کپڑوں میں
جو
اک لال دوپٹہ
زائد تھا
آج آئی دھوبن
لے گئی
اور
"باقی کپڑے پورے ہیں"
بتلا گئی
پھر بھی
کپڑوں کی بھری گٹھری
جانے کیسی سوتی ہے
خالی خالی لگتی ہے

●●

★ رنگ محل۔ پھاٹک حبش خاں۔ دلی　　★ ایچ ۵ ماڈل ٹاؤن دہلی ۱۱۰۰۰۹

نثری نظمیں

سونو

لا

برسات کا موسم
بارش ہوتی ہے
شام سے رات گئے تک
لگاتار بارش ہوتی ہے
مناسب تو یہی ہے کہ ایسے میں
نرم، گداز بستر ہو
تیز دھن بکھیرتا ریکارڈ چینجر
شراب ہو
اور حسین اور جوان ـــــ عورت
پھر بات جانے کیسے
رفتہ رفتہ
روٹیوں اور گوشت سے ہوتی
فقط چند پکوڑیوں اور چائے پر چلی آتی ہے
اور پھر نادم و پشیمان
سگریٹ کے کالے دھوئیں پر آ کر
ایک دم سے ختم ہو جاتی ہے
پھر خالی ڈبیہ
بدستور رہتی ہے
بارش ہوتی ہے
شام سے رات گئے تک
لگاتار
بارش
ہوتی ہے

▲▲

مشکور جاوید

خوشبوؤں کے ہرن

تتلیوں کے سفر سے نہ گھبراؤ تم
تمہارے مکانوں کی کھڑکیوں سے کبھی
دھواں باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگے
ہوائیں تمہارے لباسوں پہ آ کر
سنگین جرموں کی باتیں کریں۔
یا خوشبوؤں کے ہرن تم کو پہچان لیں
سنو تو ذرا
آہٹوں کے جزیرے پہ ابتکیں ہی
دھوپ سر کو جھکائے کھڑی ہے
تتلیاں بھی سفر سے پریشان ہونے لگی ہیں
تتلیوں کے سفر سے نہ گھبرانا تم

▲▲

رونق زیدی

نظم

زرد ملبوں میں
قطرہ، قطرہ ـــــ
جھلملاتا ہوا
آبِ حیات ـــــ
ہر قطرے میں ـــــ
خواہشوں کی پرکشش عریانی
کھنچتے ہوئے قدم
لپکتے ہوئے ہاتھ
اور ـــــ
دلدل میں دھنستے ہوئے اجسام

▲▲

غزلیں

نور تقی نور

آشفتگی کا بوجھ ہے سر پر کیسے منزل پائے گا
جیون ہے اک بوڑھا راہی تیز چلا گر جائے گا

کب تک گیت سنائے گا من پنچھی اس جنگل میں
کب تک یہ بیچارہ شیشہ پتھر سے ٹکرائے گا

پچھلے جنم میں شاید میں نے کچی کلیاں مسلی تھیں
اب میرا ویرانہ آنگن پھول کہاں سے لائے گا

تیرا آنا آج کی دولت، تیرا جانا کل کی امید!
لیکن کیا آنے جانے میں یہ جیون کٹ جائے گا

رکتے رکتے رکیں گے آنسو، رونا ہے ہنسی تو ہیں
آتے آتے دکھ آیا ہے جاتے جاتے جائے گا

اُن کی نیند بھری آنکھوں میں ایسا جادو ہے اے نورؔ
تو نے اُن کو چھو بھی لیا تو سونے کا بن جائے گا

▲▲

مخمور جمالی سنبھلی

بال و پر جب کسی طائر نے نکالے ہوں گے
جال اربابِ ہوس نے کئی ڈالے ہوں گے

میں تو سمجھا تھا کہ وقت آگیا حق گوئی کا
یہ خبر کیا تھی زباں پر مری تالے ہوں گے

پیش خیمہ ہے چراغاں کا ہجوم ظلمت
تیرگی حد سے گزرنے دو اُجالے ہوں گے

جن کو مس کر کے جھلس جائے گی خود بادِ سموم
کچھ وہی پھول مرے خون کے پالے ہوں گے

حوصلہ سب کو کہاں موت سے ٹکرانے کا؟
ہم سے دیوانے صلیبوں کے حوالے ہوں گے

قابلِ دید سماں ہوگا جنوں میں مخمورؔ
ملتے کانٹوں سے گلے پاؤں کے چھالے ہوں گے

▲▲

اسعد بدایونی

ہجوم زرد میں لوگوں کے پھنس کر رہ گیا ہوں میں
مجھے تنہائیوں کے سبز جنگل سے صدا بھی دو

نژادِ سنگ سے میرا تعلق ٹھیک ہے لیکن
مرے ہاتھوں میں پل بھر کے لیے اک آئینہ بھی دو

سکوتِ پارہ پارہ بس نہ جائے روح میں سب کی
مری مانو تو شب کی جھیل میں پتھر گرا بھی دو

برس بیتے ہزاروں دیکھتے یہ ملگجا منظر
ردائے ابر نیلے آسماں سے اب ہٹا بھی دو

تم اپنی ذات کے اظہار سے ڈرتے رہے لیکن
ہمارا عکس ہے جس میں وہ آئینہ دکھا بھی دو

درختوں پر ابھی کچے ہیں پھل آہستہ ہو جائے
ہوائے تیز کو اتنا مرے یارو بتا بھی دو

▲▲

★ "اردو بھون" صابن گراں میرٹھ ۲ ★ ایچ-ایم-آئی-کالج-نہٹور ★ احمد بلڈنگ سرائے چودھری بدایوں-یوپی

غزلیں

شاہد عزیز

تجھ سے میرا کیا رشتہ
تو ٹھنڈی میں گرم ہوا

جانے کیسی دھرتی تھی
دُور تلک تھا سناٹا

پچھلی باتیں یاد نہ کر
اب تو مجھ کو بھول بھی جا

میرے جسم کے اندر بھی
شاید تو ہی رہتا تھا

پتھر جیسی آنکھوں سے
آنسو بن کے میں ٹپکا

▲▲

حسن رضا

آخری ہچکیاں لے رہا تھا دیا، سو رہی تھی ہوا: اونگھتی رات تھی
اُس کے ہاتھوں میں خنجر چمکتا ہوا، اور کمرے میں تنہا مری ذات تھی

ایسی پاگل ہوئی جنگلوں کی ہوا، بادلوں کو اُڑاتی ہوئی لے گئی
کھیت اِک بوند پانی کو ترسا کیے راستے راستے گرچہ برسات تھی

حوصلے اپنی جھنڈی ہلاتے رہے، کامیابی کی آنکھیں چمکتی رہیں
اک فریبِ نظر کے سوا دور تک، ذات کی کھوج میں مات ہی مات تھی

آبلے تھے مرے پاؤں میں جا بجا، ہر قدم تھا تجسس میں بڑھتا ہوا
سر پہ سورج تھا لاوا اگلتا ہوا، اور تشنہ لبی بھی مرے ساتھ تھی

پاؤں دھنستے رہے ریت میں اے رضاؔ اور گھٹتا گیا قدِ مرادِ بہیلن
صحرا صحرا بھٹکتا رہا عمر بھر ان سرابوں میں تنہا مری ذات تھی

▲▲

شاہ حسین نہری

سامنے سپنوں کی بازی ہے میاں!
سعیِ تعبیرات ہوگی رائیگاں!

بادلوں میں بننے والی صورتیں
اعتبارِ چہرگی کیا ہے گماں!

نیلگوں گہرا سمندر۔ بیچ میں
راستے پر سبز پھسلن ۔ میں یہاں!

فرشِ آتش بجھ گیا پیروں تلے
چلچلاتی دھوپ کا ہے سائباں!

آبشاروں کی صلابت تھی، اُڑی
بن کے میں بھی رہ گیا آبی دھواں!

چاٹ لے دیمک دو قلب و ذہن کو
شاہؔ اخود کو سینت رکھا ہے کہاں!

▲▲

★ بنگالی۔ امد سے پورا چھتان ★ قاضی پورہ۔ کھنڈوا۔ ایم۔ پی ★ بلیم آرٹ اینڈ سائنس کالج بھیڑ دھار اشٹر

دوڑ

عبدالوحید سحر

آج کی زندگی کا نام دوڑ ہے۔ ہر انسان دوڑ رہا ہے۔ کوئی حواسِ خمسہ بیدار کر کے کوئی عالمِ بدحواسی میں کوئی شعوری طور پر کوئی لاشعوری طور پر۔ دوڑ شاید سبھی کا مقدر بن گئی ہے۔ کوئی ایک غرض سے دوڑ رہا ہے، کوئی کسی دوسری غرض سے کوئی محض اس لیے کہ اُسے دوڑنا ہے۔ جو شئے جس کے پاس ہے اُسے ساتھ لے کر دوڑ رہا ہے۔ کوئی فائیلیں بغل میں دبائے، کوئی بیوی کا ہاتھ ہاتھوں میں لیے، کوئی محبوبہ کو بانہوں میں لیے، کوئی بچہ کی انگلی پکڑے، کوئی اپنا پرس سنبھالے ہوئے۔ القصہ ایک لامتناہی دوڑ ......

ایک لمبا رن ...... سمت کا کوئی تعین نہیں۔ منزل کا کہیں پتہ نہیں۔ تیز رفتاری نے راہوں کے نشان بھی دھندلے کر دیے۔ ہم آج جس دور سے گزر رہے ہیں اُسے سائنسی دور کہنے کی بجائے بھاگ دوڑ کا دور کہنا بجا ہوگا۔ ہر شئے بھاگ رہی ہے۔ ہر انسان دوڑ رہا ہے۔ دوڑ سب رہے ہیں۔ ہر اک کی نامعلوم منزلیں مختلف ہیں۔ اور میں بھی تو زندگی کی لامتناہی دوڑ دوڑتے دوڑتے تھک گیا ہوں۔ اس لیے اس پلیٹ فارم کے کونے میں آکر کھڑا ہو گیا ہوں۔

دوڑتے دوڑتے وہ میڈم گر پڑیں۔ ساری کو لہوں تک اُٹھ گئی اس کے ساتھ ہی جیسے کائنات ساکت ہو گئی ہو۔ لوگوں کے پیروں میں جیسے زنجیریں پڑ گئیں زندگی کی یہ دوڑ اچانک تھم گئی۔ بھاگتے لمحے اچانک ٹھہر گئے۔ انسانی جنبشیں لمحوں میں مقید ہو کر رہ گئیں کیوں؟ اندر پلنے والی حیوانیت نے پیروں میں زنجیر ڈال دی۔ لمحات مقید ہو کر رہ گئے۔ یہ منظر اور کھلے عام ...... میڈم اپنی ساری ٹھیک کرتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ لوگوں کے پیروں کی زنجیریں دھیرے دھیرے ٹوٹنے لگیں ......

پھر وہی دوڑ ...... لیکن اُتنی تیز نہیں ......۔ یہ کیا!... لوگ بھاگتے ہوئے بار بار پیچھے گردن پلٹ کر دیکھ رہے ہیں ...... شاید بچھڑے لمحوں کا غم اُنھیں ستا رہا ہے۔ اور ساتھ ہی اُکسا رہا ہے۔ میڈم شرماتی لجاتی اپنی غلطی پر پشیماں چلی جا رہی ہیں۔ اب وہ غرور سے اپنا سر اونچا کر کے لوگوں سے نگاہیں نہیں ملا سکتیں۔ کیوں؟؟؟ میڈم نے کسی کا کبھی شکریہ ادا نہیں کیا۔ نہ ہی کسی کو تھینک یو کہا؟ وہ جانتی ہے کہ مجھے بچانے سے زیادہ اس میں ان کی غرض ہے......

یہ ٹرین بمبئی وی۔ ٹی سے آئی ہے۔ لوگ بھوکے کتوں کی طرح پُل کی طرف دوڑ پڑے۔ ہر انسان پُل پر پہلے چڑھنا چاہتا ہے۔ دوڑتے دوڑتے بچہ کا ہاتھ ماں کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ بچہ بھیڑ کو چیرتا ہوا آگے بڑھا کسی چیز کی ٹھوکر لگی اور وہ گر پڑا۔ بچہ کی آواز بے زبان ہلکی۔ بدقسمتی نے اُسے بھی گرا دیا کسی طرح وہ بچہ تک پہونچنے میں کامیاب ہو گئی۔ اُس کی ساری پر لوگوں کے جوتے، چپلوں کے نشاں بنتے چلے گئے۔ اچھی خاصی موڈرن ڈیزائن بن گئی۔ لوگ دوڑ رہے ہیں کسی کو اتنی فرصت نہیں کہ دیکھے کہ پیروں تلے کونسی شے کچلی جا رہی ہے۔ اُن کے خیال میں ہوگا کوئی بھکاری یا

معرفت محمد ابراہیم ۵/۶ ۹ قدوائی نگر۔ رفیع احمد قدوائی روڈ، واڈالا۔ بمبئی ۴۰۰۰۳۱

ایسی ہی کوئی شئے جو راہوں میں پڑی رہتی ہے۔ زندگی میں جس کی کوئی اہمیت نہیں۔ ماں نے کسی طرح اپنے بچہ کو بچالیا۔ میں سوچ رہا ہوں وہ بھی اُسے چھوڑ کر بھیڑ میں کیوں گم نہیں ہوگئی۔ شاید وہ اُس کی ممتا تھی جو لوگوں سے ہزاروں میل آگے دوڑ رہی تھی جس نے اپنے بچے کو بچالیا۔ گر وہ چاہتی تو بچے کو بلکتا سسکتا چھوڑ کر وہ بھی زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھ جاتی۔ لیکن نہیں۔ یہ ماں اور ممتا کا اٹوٹ رشتہ ....

اب اس ریلوے پُل پر قدرے سکون ہے۔ یکایک ایک صاحبزادی نمودار ہوتی ہیں۔ آڑھے ترچھے پڑتے قدم، بڑے بڑے پائنچوں کا بیل باٹم، اونچی ایڑی کی سینڈل، سکڑتا ہوا بش شرٹ، آگے کی طرف قدرے بڑھی ہوئی سینے کی مخروطی اٹھانیں، بغل میں بیگ۔ وہ ٹرین کے لیے دوڑی، سینڈل میں بیل باٹم کا پائنچہ اٹکا وہ زمین پر گرنے ہی والی تھی کہ نہ جانے کون سے جذبے نے کس احساس نے مجھے وہاں پہونچادیا۔ دوسرے ہی لمحہ وہ میری بانہوں میں جھول رہی تھی۔ اسی لمحہ کی شاید وہ بھی منتظر تھی۔ میرے ہاتھوں کو مَس کرتی سینے کی مخروطی اٹھانیں مجھے اُس سے قریب کرتی جارہی تھیں۔ اُس کی گرم گرم سانسیں مجھ میں ہیجان برپا کررہی تھیں..... چاروں طرف شادیانے بجنے لگے۔ حریم دل میں ہزاروں شمعیں فروزاں ہوگئیں چاروں طرف پھولوں کی بارش ہورہی تھی۔ دفعتاً تھینک یو کی آواز نے سارے خوابوں کے محل چکنا چور کردیے۔ وہ بائے (Bye) کرتی ہوئی پُل کی دوسری جانب اُتر پڑی۔ فروزاں شمعیں یک لخت بجھ گئیں۔ چاروں طرف دُھواں ہی دُھواں تھا۔ میں دوڑ کر اُس جگہ جانا چاہتا تھا جہاں کھڑا تھا لیکن ہمت پسپا ہوچکی تھی۔ قوٰی مضمحل ہوچکے تھے۔ زندگی کی دوڑ کا تھکا ہارا وجود، اب مزید دوڑنے کی مجھ میں سکت نہیں رہی تھی۔

▲▲

پیٹ بھر کھانے کے بعد
पचनोल
پچنول
بدہضمی، اپھارا، سینے کی جلن اور معدے میں تیزابیت جیسی تکلیفوں سے بچنے کے لیے کھانا کھانے کے بعد پچنول لیجیے
ہمدرد
JHD-4031-U

بجھتی شمع

ایڈورڈ ایلن
عرفان عباسی

میرے شوہر! میرے سرتاج! ان کی نقاہت اور بے بسی مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔ وہ زندگی کے آخری موڑ اور موت کے دہانے پر کھڑے ہیں —— ان کا مفلوج اور لاغر جسم باہری کمرے کی مسہری پر بے حس و حرکت پڑا ہے، جیسے سارے رنگ اپنی جگہ پر جم گئے ہوں معمولی سی آہٹ بھی اب ان کے لیے ناقابلِ برداشت ہے —— ہلکے قدموں کی آواز بھی انھیں بے چین کر دیتی ہے انھیں اس اذیت سے بچانے کے لیے میں بہت احتیاط سے آہستہ آہستہ گھر کے سارے کام انجام دیتی ہوں۔

چند ساعت میں کھانا تیار ہو جائے گا۔ پلیٹ میں لے کر میں دبے قدموں، بدن اور کپڑوں کو سنبھالتے ہوئے، تاکہ کسی طرح کی آواز نہ ہو، ان کی مسہری کے پاس جاؤں گی —— اور مجھے دیکھتے ہی ان کے پژمردہ، زرد چہرے کی رنگت جھریوں کو چیر کر مسکراہٹ کی ایک لکیر سی ابھر آئے گی۔ مومی شمع کی ہلکی روشنی میں مسکراتا چہرہ دیکھ کر کتنی راحت ملتی ہے مجھے!

لیکن...... دیا سلائی ختم ہو گئی ہے —— کھانا نکالنے سے پہلے دیا سلائی لانا بہت ضروری ہے۔

طویل بیماری نے ان کی قوتِ برداشت ختم کر دی ہے —— ان کی پیلی پیلی، بے نور آنکھیں اب تیز روشنی بھی برداشت نہیں کر سکتیں۔ ان کی آنکھوں کو چکا چوند سے بچانے کے لیے میں برقی قمقموں کے بجائے مومی شمع جلاتی ہوں —— مومی شمع کی مدھم روشنی سے ان کی آنکھوں کو تکلیف کم ہوتی ہے اور اس کی ہلکی روشنی ہمارے چہروں کو بے درد زمانے کی دی ہوئی ٹیڑھی، میڑھی انگنت جھریوں کو بھی کسی قدر نمایاں نہیں ہونے دیتی —

لیکن...... سب سے پہلے دیا سلائی!

میں شمع جلانے کے علاوہ دیا سلائی سے ایک اور نہایت اہم کام بھی لیتی ہوں...... اس کی تیلیوں میں لگی ہوئی گندھک کھرچ کر میں روزانہ ان کی دوائیں شامل کر دیتی ہوں۔

یہ سن کر کس قدر حیرت ہوگی آپ کو —— کوئی باوفا اور شوہر پرست بیوی اپنے شوہر کی دوائیں گندھک جیسا زہر کبھی نہیں ملا سکتی ——

میری یہ ذلیل اور شرمناک حرکت سن کر شاید آپ سوچیں کہ پاگل میں ہوں یا مجھے اپنے شوہر سے نفرت ہے —— نہیں —— یہ دونوں باتیں غلط ہیں —— اگر یہ غلط نہ ہوتیں تو آپ ہی فیصلہ کریں، جب میں ان کی دوائیں گندھک گھولنے لگتی ہوں تو میری شرمسار آنکھوں سے آنسو کی لڑی کیوں پھوٹ نکلتی ہے؟

میں پاگل نہیں ہوں، مجھے اپنے شوہر سے بے پناہ محبت ہے —— میں ان سے نفرت کا تصور بھی نہیں کر سکتی —— لیکن...... مجھ سے ان کی ناقابل برداشت اور لا علاج تکلیف دیکھی نہیں جاتی —— انھیں ان کربناک حالات سے نجات دلانے کی بے پناہ آرزو در پردہ مجھے یہ ذلیل اور ناگوار فرض انجام دینے پر مجبور کرتی ہے۔

عرفان عباسی ۵۷ ڈاکٹر موتی لال بوس روڈ۔ لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

یں اشکوں کو روک نہیں پاتی —— یہ خوف ہمیشہ دامنگیر رہتا ہے کہیں آنسو میرا حوصلہ پست نہ کر دیں۔ — کچھ بھی ہو مجھے یہ اشک پینا ہی پڑے گا ——

میں نے بہت سوچا ہے، بہت غور کیا ہے اور اس نتیجے پر پہونچی ہوں کہ جب ڈاکٹروں کے پاس ان کے مہلک اور اذیت ناک مرض کا کوئی علاج ہی نہیں ہے، شفا کی ساری امیدیں دم توڑ چکی ہیں اور طے ہے کہ انھیں اس کرب سے موت نجات دلا سکتی ہے —— صرف موت —— تو وہ کام جو قدرت کچھ دنوں بعد کرنے والی ہے اگر انھیں تکلیف سے نجات دلانے کے لیے میں ذرا جلدی کرنے کی کوشش کروں تو کیا اُسے نفرت اور بے وفائی کہا جا سکتا ہے ؟ موت برحق ہے۔ وہ ضرور آئے گی —— لیکن ان کی بے بسی و بے چارگی مجھ سے دیکھی نہیں جاتی ——

ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی میں اشک پی کر، دل پر پتھر رکھے، ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ بکھیرتی ان کے کمرے میں داخل ہوں گی —— زندگی کے دوراہے میں ایک ساتھ دو کردار میرے لیے بیحد دشوار ہیں — لیکن یہ مجھے کرنے ہوں گے، ایک فرض کی طرح —— میں جانتی ہوں یہ میرا فرض ہے۔

اب میں پلیٹ لیے، مسکراتی ہوئی، آہستہ آہستہ باہری کمرے میں داخل ہو رہی ہوں۔

اُف! کس قدر احتیاط اور دبے قدموں سے وہ آہستہ آہستہ کمرے میں داخل ہو رہی ہے۔ کیسا سنبھل کر قدم رکھتی ہے کہ کوئی آہٹ تک نہیں ہوتی — ہر لمحہ قریب تر ہوتے ہوئے اس کے چہرے پر میں نے نگاہیں گاڑ دی ہیں —— میرے خدا! بے رحم وقت نے اُسے بھی نہیں بخشا —— کتنی جھریاں پڑ گئی ہیں اس کے پھول جیسے چہرے پر —— ہائے کتنی شگفتگی تھی اس کے حسین و دلکش چہرے پر۔ گلابی رنگ، کتابی چہرہ، جھیل کی طرح نیلگوں آنکھیں سب کچھ بدل گیا —— کاش میں یہ سب نہ دیکھتا ——

ہماری زندگی کتنی عجیب ہے ؟ ہم کیوں جیتے ہیں ؟ موت کے منہ میں جانے کے لیے نا ؟ —— اور موت —— یہ موت کیا ہے ؟ ایک جامہ اتار کر دوسرا پہن لینا ؟

کس قدر خلوص ہے اس کی بے لوث تیمارداری میں —— اپنا سکھ چین تج کر کسی دیوی کی طرح چوبیس گھنٹے میری خدمت و دلدہی میں لگی رہتی ہے —— شروع شروع میں اس کا یہ بے پایاں خلوص مجھے کتنا مصنوعی سا لگتا تھا —— مگر اب سوچتا ہوں —— کس قدر چاہتی ہے مجھے —— کس قدر جد و جہد کرتی ہے، کوئی وقت ہو، کیسے ہی حالات ہوں —— میرے آرام کے لیے اس کی ساری شخصیت، وقف ہے۔ اس کے وجود کا مقصد ہی جیسے صرف میری خدمت و تیمارداری ہو —— وہ مجھ سے بے پناہ محبت — بے حساب پیار کرتی ہے ——

میں اس کی ذہنی حالت کو سمجھ رہا ہوں۔ وہ اپنی ہر آرزو کا خون کر کے میری معذوری و بے بسی کے احساس تک کو اپنے میں جذب کر لینا چاہتی ہے ——

جسم فانی ہے، اُسے مٹنا ہی ہے۔ ہر شخص موت کو اٹل کہتا ہے لیکن مرنے کے لیے تیار کوئی نہیں — زندہ رہنے ہی کے لیے تو انسان، ساری جد و جہد کرتا ہے —— لیکن میں نے مرنے کا فیصلہ کر لیا ہے —— جتنی جلد ہو سکے میں اپنی معذوری، بے بسی اور لاعلاج بیماری کا خاتمہ چاہتا ہوں — میں اُسے تمام دکھوں سے نجات دلانا چاہتا ہوں ——

میں موت سے گلے ملنے کے لیے تیار ہوں —— اس فیصلہ سے مجھے ایک عجیب سی تقویت کا احساس ہونے لگا ہے ——

میں دیکھ رہا ہوں جیسے شمع گرد و پیش کو روشنی دکھ

(بقیہ صفحہ ۵۰ پر)

نظمیں

ماھر منصور

شرارت

سفر طویل تھا، کانٹوں پہ چل رہا تھا میں
غبارِ راہ میں منزل سی جب نظر آئی
نسیمِ صبح کے جھونکے سے چل گئے دل میں
دعائیں دیں مرے زخمی قدم نے منزل کو

ابھی سرور بھی محسوس کر نہ پایا تھا
کہ گرم لو نے مرے ساتھ پھر شرارت کی
غبارِ راہ مرا حاصلِ سفر ٹھہرا
پھر ایکبار ملی مجھ کو آبلہ پائی

●●

حفیظ آتش امروہوی

اِکائی کا سفر

وہ دن بھی موم کی صورت پگھل گئے آخر
ستاروں کا ملمع تھا جن کے چہروں پر
اندھیرے چاٹ گئے ڈھلتی روشنی کا لہو
سرور سرمئی شاموں کا اب نہیں باقی
زمیں کی گہری تہیں منتظر ہیں منہ کھولے
چڑھا جو عمر کا سورج وہ اب اُتر آئے
اور اپنے خانوں میں تقسیم ہو کے یوں بکھرے
کہ پھر شناخت نہ یہ ہو سکے کہ تم کیا تھے

●●

صفدر

کمند

برف پوش آسمانی چوٹیوں کے اُس طرف
کیا دھرا ہے اے پہاڑ ؟
دے رہا ہے پہرہ تو !
تو بتائے گا بھی کیا ؟
بے زبان پہرہ تو !

ہاں مگر
کولتار کی سڑک
برف کاٹتی سفید چوٹیوں پہ جائے گی
کچھ پیام لائے گی

●●

★ [illegible] ★ چھوٹو سونا پور، ایم ایس علی روڈ، بمبئی ۸ ★ معرفت [illegible] ۴۴۴۹۰۲ [illegible] ضلع [illegible]
(ایم-ایس)

نظمیں

زین الحق

نظم

اگر کبھی تم ادھر سے گزرو تو
دیکھ لینا!
کہ زندگی کے حسین گلشن میں
کھل رہی تھیں جو تازہ کلیاں
کہ جن کی خوشبو سے زندگی کی
تمام راہیں
مہک رہی تھیں
کہ جن کے اندر مچل رہی تھی
تمہارے قدموں کی چاپ سننے کی اک تمنا
کہ جن کی آنکھوں میں جگمگاتی تھیں
آہٹوں کی لطیف کرنیں
اب ان کے رنگیں وجود کا
کچھ پتہ نہیں ہے
اگر کبھی تم ادھر سے گزرو تو
دیکھ لینا

★ شاہ ہارون، سہسرام

نازاں جمشید پوری

پتھر کا خدا

آج کیوں امن واماں کی راہ پر
دوڑتی پھرتی ہیں
رد میں شرپسندوں کی بہاں
جا بجا رستے ہیں
ہولی خون کی
کھیلتی ہیں وقت کی بدکاریاں
اور چپ سادھے ہوئے
بیٹھا ہے پتھر کا خدا!

دھند

وقت کا کالا سمندر
رات کی ظلمت لیے
آسماں کی وسعتوں پر چھا گیا
دور تک
گہرا ہی گہرا
ہے خلاؤں کو محیط
ساعتوں کی دھند
سارے شہر میں پھیلی ہوئی

★ قادری بخش بلڈنگ شوپ ایریا، دھتکیڈیہ جمشید پور ۱-۸۳۱۰۰

غزلیں

ساغر شفائی

بدلی کے سائے کے پیچھے اُڑتے اُڑتے پنچھی نے
کڑی دھوپ میں ناحق اپنے پر جھلسائے پنچھی نے

صبر کا دامن کبھی نہ چھوڑا بھوکے پیاسے پنچھی نے
تیرے لطف کے نغمے گائے سانجھ سویرے پنچھی نے

دھرتی پر بے درد شکاری موں کی تاک میں بیٹھ گئے
اُڑنے کو جب نیل گگن میں پنکھ پسارے پنچھی نے

صحرا صحرا بھٹکا ایک بوند جل پانے کو
جھیل پہ آکر توڑ دیا دم آخر پیاسے پنچھی نے

اپنے کھیت سے چگ کے تنکا اور اپنے حال میں مست رہا
قدم قدم پر بکھرے دیکھے یوں تو دانے پنچھی نے

خوف کے مارے میرے گھر میں آنا جانا چھوڑ دیا
جب سے دیکھے ہیں لوگوں کے اصلی چہرے پنچھی نے

ساغر کیوں توڑی وہ ڈالی جس پر رین بسیرا تھا
تم کیا جانو کیسے کاٹے رات کے لمحے پنچھی نے

▲▲

شاہد شیدائی

مڑ کے دیکھا بھی نہیں جادوگروں کے شہر میں
اور پتھر ہو گیا ہوں پتھروں کے شہر میں

جو فصیلوں پر ہے لکھا اُس کا مطلب بھی سمجھ!
پیش منظر اور ہے پس منظروں کے شہر میں

جانے اب کس کھونٹ جا کر چھپ گئیں سچائیاں
سوچ زخمی ہے بہت دانشوروں کے شہر میں

چھین لیتے ہیں رقم اور مال بھی دیتے نہیں
گھر گیا ہوں آج کن سوداگروں کے شہر میں

گاؤں سے آیا ہوں شاہدؔ مشکلوں کا حل کوئی!
کاٹتا رہتا ہوں چکر دفتروں کے شہر میں

▲▲

گلشنِ بہار

رات کو خواب میں جب صبح کے منظر دیکھے
دھوپ کو اوڑھے ہوئے کالے سمندر دیکھے

کچے گھر روئے تھے بارش میں بہت رات گئے
دھوپ میں ہنستے ہوئے اُن پہ مقدر دیکھے

جو سرابوں میں سلگتے ہیں سمندر کی طرح
ہم نے صحرا میں وہ پگھلے ہوئے پتھر دیکھے

بوڑھے رستوں نے بھی پہنا ہے لباسِ خوشبو
کوئی ماضی کی رہِ خشک پہ چل کر دیکھے

کس نے چوراہے پہ آواز لگائی ہم کو
اجنبی موڑ بہت شہر کے اندر دیکھے

▲▲

★ ۱۰/۱۱، کوٹلی پیر عبدالرحمٰن۔ باغبانپورہ لاہور، پاکستان ★ بی - ۷۷ / XXIII بھارت نگر لدھیانہ۔

غزلیں

معصوم نظر

دن شام کی ڈھلان سے جا کر پھسل گیا
ہر سمت پھر دھواں اٹھا منظر بدل گیا

کیسی حسین شام اداسی میں ڈھل گئی
جیسے اداسیوں کا سمندر مچل گیا

جب رات انتظار کی حد سے گزر گئی
پھر اس کا اعتبار بھی دل سے نکل گیا

کیسی عجیب آگ خیالوں میں تھی نظرؔ
پھر تیز آنچ ہوئی جسم جل گیا

▲▲

خلیق الزماں سحرؔ

پیاس کی شدت میں یوں اکثر لگا
بھیگا بھیگا سا ہر اک منظر لگا

ذہن میں اک حشر برپا کر لیا
اپنی تنہائی سے جب بھی ڈر لگا

پتھروں کے دیش میں شیشہ گری!
مجھ کو تو وہ شخص پیغمبر لگا

زد سے طوفاں کی تو بچ آئے مگر
ناؤ ساحل سے لگاتے ڈر لگا

دیکھ کر انجامِ خواہش اے سحرؔ
اپنی ہر خواہش سے مجھ کو ڈر لگا

▲▲

پردیسی رومانی

اور بھی اک فریب کھانے دے
مسکراتا ہوں مسکرانے دے

آشنا زندگی سے کر مجھ کو
اپنی آنکھوں میں ڈوب جانے دے

آج اپنا ہے آج کی کر فکر
کل پرایا تھا کل کو جانے دے

دل کہیں بجھ نہ جائیں اے پردیسی
درد کی لو مجھے بڑھانے دے

▲▲

● لال پورہ۔ ڈوڈنگر پوسٹ ۱۴۳۱ ● دلسا گردوارڈ۔ سیوانی ● سکریٹری آل انڈیا ہندی اردو سنگم، رنگ مینگ مالی کیدل سری نگر ۲، کشمیر

مشہور مصنفین کی مشہور کتابیں

ناول

کتاب	مصنف	قیمت
ایک عورت ہزار دیوانے	کرشن چندر	۵-۵۰
زلف کے سر ہونے تک	ٹھاکر پونچھی	۴-۰۰
پیاسے بادل	"	۴-۵۰
یادوں کے کھنڈر	"	۳-۰۰
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے	"	۳-۰۰
پگھلتے خواب	حامدی کاشمیری	۳-۰۰
آج کی بات	جگدیش بل	۳-۰۰
بھیگی راتیں	مخمور جالندھری	۴-۰۰
طوفانِ بہار		۴-۰۰
ایک چادر میلی سی	راجندر سنگھ بیدی	۴-۰۰
کالی راتیں	راج ولش	۴-۰۰
محبوبہ	گلشن نندہ	۴-۰۰
بھنور	"	۴-۰۰
کیسے کاٹوں رین اندھیری	واجدہ تبسم	۱۰-۰۰
سنگریزے	رفیعہ بٹ	۱۰-۰۰
شہرِ ممنوع	واجدہ تبسم	۱۲-۰۰
آیا بسنت سکھی	"	۱۸-۰۰
جزیرۂ سخنوراں	غلام عباس	۶-۰۰
گونتھہے بھگوان	کوثر چاندپوری	۲-۵۰
پتھر اور آئینے	ناز بریلوی	۸-۰۰
ٹیڑھی لکیر	عصمت چغتائی	۱۵-۰۰
سنگھار کرے ہیں	کرشنا کماری	۳-۰۰
جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں	عزیز احمد	۶-۰۰

شعری مجموعے

کتاب	مصنف	قیمت
نکہتِ دل	منشاء الرحمن منشا	۲-۰۰
لہو پکارے گا آستیں کا	رشی پٹیالوی	۶-۰۰
ہست و بود	"	۱۰-۰۰
روحِ افکار (منتخب اشعار)	واجد سحری	۶-۰۰
آوازیں	پریم کمار ہوش	۲-۰۰
موسمِ گل کے آنے تک	شکیب رامپوری	۵-۰۰
نغمۂ سروش	جوش ملسیانی	۵-۰۰
تبسمِ غم	وسیم بریلوی	۱۰-۰۰

کتاب	مصنف	قیمت
خاکِ دل	جاں نثار اختر	۲-۰۰
فردوسِ گوش	جوش ملسیانی	۶-۰۰

سوانح ادب

کتاب	مصنف	قیمت
امیر خسرو	عرش ملسیانی	۱۰-۰۰
دیدارِ غالب	"	۵-۰۰
آئینۂ اصلاح	جوش ملسیانی	۵-۰۰
رسوم دہلی	سید احمد دہلوی	۷-۰۰
پری خانہ	واجد علی شاہ	۷-۰۰
انارکلی پر ایک نظر	آمنہ روح افزا رحمان	۵-۰۰
سچی کہانیاں	سلامت علی مہدی	۳-۰۰
پوسٹ مارٹم	عرش ملسیانی	۴-۰۰
فرہنگِ غالب	امتیاز علی خاں عرشی	۱۲-۰۰
شیر کیا سوچتا ہوگا	سید رفیق حسن	۵-۰۰
چھیڑ غالب سے چلی جائے	اکبر علی خاں	۱۰-۰۰
طوطیانِ ہند	ایس این گوریکر	۲۵-۰۰
شاہ فیصل کے بعد	سلامت علی مہدی	۵-۰۰
شاہ فیصل	" "	۴-۰۰

طنز و مزاح

کتاب	مصنف	قیمت
غم غلط	شوکت تھانوی	۵-۰۰
چوپٹ راجہ	فکر تونسوی	۶-۰۰
چچا چھکن	امتیاز علی تاج	۶-۰۰
ابن بطوطہ کے تعاقب میں	ابن انشاء	۴-۰۰

متفرقات

کتاب	مصنف	قیمت
صحت و زندگی	خوشتر گرامی	۵-۰۰
انتخاب تیر و نشتر	" "	۱۸-۰۰
پریم شاستر	" "	۵-۰۰
کام شاستر	" "	۵-۰۰
گربھ شاستر	" "	۵-۰۰
بیسویں صدی کی کشیدہ کاری		۸-۰۰
قبلۂ اول کی پکار		۸-۰۰
بھٹکی تلاش	آمنہ نورالعین صدیقی	۵-۰۰

نیشنل اکاڈمی، ۹ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۲

رفتید و لے نہ از دلِ ما

دلی میں ۲۶ راور ۲۷ راگست کی درمیانی شب میں بسمل سعیدی وفات پا گئے۔ بسمل صاحب سال ڈیڑھ سال سے بیمار تھے اور معالجے کے لیے اپنے آبائی شہر ٹونک چلے گئے تھے۔ وہاں وہ کئی مہینے اپنے دو ڈاکٹر بھتیجوں ڈاکٹر سعید سعیدی اور ڈاکٹر اجمل سعیدی کے زیرِ علاج رہے اور پھر طبیعت کچھ سنبھلی تو دلی چلے آئے لیکن واپسی کے کچھ ہی ہفتے بعد مرض پھر شدت اختیار کر گیا۔ پچھلے دو ہفتے سے وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں تھے۔ کچھ کھا پی نہیں سکتے تھے۔ کوئی مزاج پرسی کو جاتا تو اسے بمشکل ہی پہچانتے تھے۔ زبان میں لکنت آگئی تھی۔

بسمل صاحب صحیح معنی میں ایک باکمال شاعر تھے۔ ان کی پختہ گوئی اور قادر الکلامی مسلمات کا درجہ رکھتی تھی۔ جہاں تک اردو زبان وادب کا تعلق ہے، ان کا علم اتنا وسیع تھا کہ کہا جا سکتا ہے، جو کچھ ان کے حلقہ سے باہر تھا وہ اس قابل ہی نہ تھا کہ اسے جانا جائے۔ فارسی ادبیات کا بھی انھوں نے غایر مطالعہ کیا تھا اور عربی زبان سے بھی وہ خاطر خواہ واقفیت رکھتے تھے۔ فنِ شاعری کے رموز ونکات پر جتنی گہری نظر ان کی تھی، اتنی گہری نظر رکھنے والا ان کے بعد کوئی نہیں رہا۔ سخن سنجی کے ساتھ ساتھ سخن فہمی میں بھی وہ اپنی مثال آپ تھے۔ ان کی زندگی میں بہت سے مشہور اور غیر مشہور شاعروں نے ان سے مشورۂ سخن کیا ہے۔ ان میں سے کچھ اس کے معترف ہیں لیکن اکثر ایسے ہیں جنھوں نے اسے ایک راز رکھنا چاہا اور یہ بسمل صاحب کی عالی ظرفی تھی کہ وہ اس "راز" کی پردہ پوشی میں ہمیشہ ان کے معاون رہے۔

بسمل صاحب ایک ذی علم اور خوشحال گھرانے کے فرد تھے لیکن ورثے میں انھیں صرف علم وادب کی دولت ہی ملی، خوشحالی ان کے حصے میں نہیں آئی۔ اس کے نتیجے میں ان پر جو بد دلی غالب آئی، اس نے انھیں مجبور کیا کہ وہ ٹونک کو خیرباد کہہ دیں۔ کچھ مدت تک وہ جے پور میں رہے، پھر دلی چلے آئے اور اب برسوں سے اپنے اہل وعیال کے ساتھ یہیں مقیم تھے۔ دلی نے کشادہ دلی سے ان کی پذیرائی کی مگر ان کے نجی حالات کچھ ایسے رہے کہ قلبی سکون انھیں یہاں بھی نہ مل سکا۔ اب وہ یہیں کی خاک میں ہمیشہ کو جا سوئے ہیں

بسمل کا رنج دل سے بھلایا نہ جائے گا
کس بے کسی کی موت مرا ہے کہ ہائے ہائے

پس ماندگان میں بیوہ کے علاوہ ایک فرزند محبوب سعیدی اور دو بیٹیاں ڈاکٹر اسما سعیدی اور ریحانہ سعیدی دلی میں ہیں۔ ایک صاحبزادے حکیم حبیب سعیدی لاہور میں اور ایک بیوی اور ان کے بطن سے تین لڑکیاں کراچی میں ہیں۔

●

دلی میں ایک اور سانحہ جو اسی مہینے ہوا جناب سعی جو بڑھ کا انتقال پر ملال ہے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر پچاس سے کچھ ہی اوپر ہوگی۔ دیکھنے میں ان کی صحت بہت اچھی تھی اور وہ پریس کلب سے اٹھ کر خوش وخرم گھر پہنچے تھے لیکن گھر پہنچنے کے کچھ ہی دیر بعد انھیں سینے میں تکلیف کا احساس ہوا اور اس سے پہلے

کسی قسم کی طبی مدد پہنچے، انھوں نے ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ ڈاکٹروں نے دل کے دورے کو موت کا سبب بتایا۔

روی جوپلے انگریزی زبان کے مشہور صحافی تھے اور مختلف اخباروں میں سیاسی، سماجی اور تہذیبی مسائل پر ان کی تحریریں شائع ہوتی رہتی تھیں۔ اُردو ادب سے انھیں بہت لگاؤ تھا اور ہندوستان میں اردو زبان کی بقا اور اس کے تحفظ سے بھی انھیں گہری دلچسپی تھی۔ اردو کی ادبی محفلوں میں بڑے ذوق وشوق سے شریک ہوتے اور خود بھی اس طرح کی محفلوں کا اہتمام کرتے رہتے تھے۔ وہ تقسیم کے بعد لاہور سے دلی آگئے تھے اور اپنی باغ و بہار شخصیت کے سہارے جلد ہی یہاں کی ثقافتی زندگی میں انھوں نے اپنے لیے ایک نمایاں جگہ حاصل کرلی تھی۔ ان کی اچانک موت سے یہ جگہ خالی ہوگئی ہے اور جن لوگوں نے انھیں اس مقام پر متمکن دیکھا ہے، قریب سے یا دور سے بھی ان کے شناسا رہے ہیں، وہ ہمیشہ ان کی کمی محسوس کرتے رہیں گے۔

●

۱۹ اگست کی شام کو جبلپور میں جے کرشن چودھری حبیب کا حرکتِ قلب بند ہو جانے سے انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر ۷۰ سال کے قریب تھی۔ پانچ برس پہلے ان پر فالج کا حملہ ہوا تھا جس سے وہ بچ نکلے تھے لیکن بتدریج کمزور ہوتے گئے اور آخر میں بستر سے اُٹھنا بھی ان کے لیے مشکل ہوگیا تھا۔

جے کرشن چودھری حبیب خود شاعر ہونے کے علاوہ شاعری کے اچھے مترجم بھی تھے۔ تلسی داس، کالیداس اور میرا بائی پر ان کی مستقل تصانیف ہیں جن میں ان کے کلام کے ترجمے بھی شامل ہیں اور یہ ترجمے اصل زبان سے کیے گئے ہیں، انگریزی یا کسی اور زبان کے وسیلے سے نہیں۔ بھاس کے ایک مکمل ڈرامے کا ترجمہ بھی انھوں نے کیا ہے جو "خوابِ شیریں" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ بھرتری ہری کا ترجمہ بھی ان کی یادگار ہے۔

تصنیفی مشاغل کے علاوہ وہ سماجی فلاح کے کام میں بھی حصہ لیتے رہتے تھے۔ سرکاری ملازمت میں کئی اہم عہدوں پر انھوں نے کام کیا اور اپنے منصبی فرائض سے ذمہ داری اور خوش اسلوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے۔

●

کرپال سنگھ بیدار مولانا تاجور نجیب آبادی کے نامور شاگرد تھے اسی مہینے پٹیالے میں ان کا بھی انتقال ہوگیا۔ موت سے پہلے وہ بالکل تندرست تھے، اچانک ان پر دل کا دورہ پڑا جس سے جانبر نہ ہوسکے۔

بیدار اُردو کے علاوہ کبھی کبھی فارسی زبان میں بھی فکرِ سخن کیا کرتے تھے۔ ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں حکومتِ پنجاب نے انھیں کئی اعزازات سے نوازا تھا۔ افسوس ہے کہ ان کی زندگی میں ان کے کلام کا کوئی مجموعہ شائع نہ ہوسکا۔ پنجاب میں ان کے عقیدتمند کافی تعداد میں موجود ہیں۔ امید ہے وہ ان کے کلام کو ضائع نہ ہونے دیں گے اور اس کی ترتیب و اشاعت کی طرف فوراً دھیان دیں گے۔

●

ن۔ن نجمی ایک ابھرتے ہوئے نوجوان شاعر تھے۔ ساحر ہوشیارپوری صاحب سے مشورۂ سخن کیا کرتے تھے۔ پچھلے دنوں ان کا بھی انتقال ہوگیا۔ ان کی موت ان امکانات کی موت ہے جو ان کی شاعری میں صاف نظر آتے تھے۔

●

ٹونک کے ممتاز عالم دین جلال الدین صاحب ۳ اگست کو بعمر ۷۳ سال انتقال کر گئے۔ وہ دمے کے

عارضے میں مبتلا تھے ——— مرحوم عالم دین ہونے کے علاوہ اچھے تاریخ گو شاعر بھی تھے اور قدرت نے تنقیدی بصیرت سے بھی انہیں بہرہ ور کیا تھا مشاعرے میں اچھے شعروں پر برمحل داد دیتے اور اگر کسی شعر میں کوئی سقم ہوتا تو بڑی خوش اسلوبی سے اس کی طرف بھی اشارہ کر دیتے ۔ ریاست ٹونک کے آخری فرمانروا نواب محمد اسماعیل خاں تاج کی وفات کے بعد جو اُن کی بڑی قدردانی فرماتے تھے، مرحوم نے ادبی مجلس میں شریک ہونا بہت کم کر دیا تھا اور گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی ۔

●

راجستھان کے نوجوان صحافی رحیم ادیب کے والد منشی حمید اللہ خاں ۶ اگست کو راہی ملکِ بقا ہوئے مرحوم پرانی تہذیبی روایات کے امین اور ملنساری اور وضعداری کا جیتا جاگتا نمونہ تھے ۔ صوم و صلوٰۃ کی سختی سے پابندی کرتے تھے اور ضعیفی اور کمزوری کے باوجود آخر وقت تک اپنی روزی خود پیدا کرتے رہے ۔ اب ایسے لوگ مشکل سے پیدا ہوں گے ۔

ہم مرنے والوں کے سوگواروں میں شامل ہیں اور ان سانحات پر اپنے دلی رنج کا اظہار کرتے ہیں ۔

——— ادارہ

گوپال مِتّل

——— ایک مطالعہ

محمد عبدالحکیم تحقیقی اور تنقیدی مقالہ جو عثمانیہ یونیورسٹی کے ایم ۔ اے سالِ آخر کے لیے ڈاکٹر غلام عمر خاں کے زیرِ نگرانی قلمبند کیا گیا ۔

گوپال مِتّل کی صحافتی زندگی اور ان کے ادبی اور شعری کارناموں کا بھرپور جائزہ ۔

آخر میں گوپال مِتّل کی نثری اور شعری نگارشات کا انتخاب بھی شامل ہے ———

قیمت پندرہ روپے ۔

نیشنل اکاڈمی سے طلب کریں

آل انڈیا ریڈیو نئی دلی کا ترجمان

آواز

اب نئی آب و تاب کے ساتھ شائع ہو رہا ہے آل انڈیا ریڈیو کے تمام اسٹیشنوں کے پروگراموں کی تفصیل کے علاوہ ریڈیو سے نشر ہونے والی ادبی تخلیقات کا بہترین انتخاب، پروگراموں میں حصہ لینے والے ادیبوں، شاعروں اور دوسرے آرٹسٹوں کی تصاویر کے ساتھ ۔ قیمت فی شمارہ : پچاس پیسے ۔

خط و کتابت کا پتہ :

پندرہ روزہ آواز ۔ آکاش وانی بھون ۔ پارلیمنٹ اسٹریٹ نئی دلی

چند اُردو الفاظ... بقیہ صلہ

کرتے ہیں اور صفت کے طور پر بھی (یعنی گول، کردی، گیند کی شکل کا کے معنی میں)۔ چنانچہ: طوپ جہرہ لی، گول چہرے والے آدمی کو کہتے ہیں (بحوالہ A. VAHID MORAN —— A TURKISH — ENGLISH DICTIONARY, ISTANBUL 1946)
اسی طرح طوپ جو فارسی میں آکر توپ بنا اور وہاں سے اردو میں منتقل ہوا ترکی میں دراصل گولے کے معنی رکھتا ہے۔ پھر بعد میں ترکی ہی میں یہ لفظ اس گل یا آلے کے لیے استعمال ہونے لگا جس سے گولے پھینکے جاتے تھے۔ فارسی اور اردو میں اس کا استعمال ترکی کے صرف اسی ثانوی مفہوم میں ہوتا ہے۔

پچھلے شمارے میں غلطی سے مصنفہ کا نام ڈاکٹر انجمن آرا انجم کی بجائے ڈاکٹر انجم آرا انجم لکھا گیا تھا جس کے لیے ادارہ متاسف اور معذرت خواہ ہے۔

▲▲

بجھتی شمع (بقیہ صلہ)

کے لیے دھیرے دھیرے گھل گھل کر جلتی رہتی ہے بالکل اسی طرح وہ بھی میرے لیے اندر ہی اندر سلگ رہی ہے، جل رہی ہے، ختم ہو رہی ہے۔ میرے دل میں اس کے لیے بے پناہ عقیدت ہے۔ بے حساب محبت اور انتھاہ پیار ہے .... مجھ سے دیکھا نہیں جاتا کہ وہ میرے لیے دُکھ جھیلے تکالیف اور درد سہے —— اس لیے میں اپنا خاتمہ چاہتا ہوں۔
آہستہ آہستہ وہ میرے پاس آرہی ہے۔ اس کی مسکراہٹ کا جواب مجھے بھی مسکرا کر دینا چاہیے —— اتنی ہی مسرت تو میں بخش سکتا ہوں اُسے ——
ایک راز کی بات بتاؤں؛ وہ میری صحت کے لیے، وقت کی پابندی کے ساتھ مجھے دوا پلاتی رہتی ہے —— لیکن میں نظر بچا کر دوا کا پیالہ قریب رکھے گملے میں اُلٹ دیتا ہوں —— وہ خالی پیالہ اٹھا لے جاتی ہے —— ہر روز ایسا کرنے کی وجہ سے گملے کا سرسبز و شاداب پودا سوکھنے لگا ہے...
...... لیکن میں مجبور ہوں ....

(امریکی کہانی)

▲▲

جدید اُردو ادب کے لیے
سال میں چار بار
سطور
تیسرا شمارہ شائع ہوگیا
ترتیب و تہذیب: کمار پاشی
مدیر: رزّاق ارشد
قیمت فی شمارہ: تین روپے، سالانہ: بارہ روپے
پتہ: سطور پرکاشن، ۳۳۷۱، دہلی گیٹ، نئی دہلی ۲

پنجاب اور آندھرا کی لائبریریوں کے لیے منظور شدہ

ماہنامہ

تحریک

نئی دہلی

شمارہ : ۷ جلد ۲۵

اکتوبر ۱۹۷۷ء

ادارۂ تحریر:

گوپال متل ☆ مخمور سعیدی

پریم گوپال متل

سالانہ قیمت : پندرہ روپے فی کاپی : ایک روپیہ ۲۵ پیسے

بیرونی ممالک سے

سالانہ تین پونڈ فی کاپی : چھ شلنگ

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتا

منیجر ماہنامہ تحریک ۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دلی ۱۱۰۰۰۲

پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر : گوپال متل

مطبع : نعمانی پریس، دہلی

مقامِ اشاعت : ۹ انصاری مارکیٹ نئی دلی ۱۱۰۰۰۲

مندرجات :

گوپال متل | عملی بے تعصبی

یہ میں کئی بار لکھ چکا ہوں کہ کسی شخص یا جماعت کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنے کے لیے اس کے عقائد پر نظریاتی بحث کرنے کی بجائے اس کے اعمال کا جائزہ لینا چاہیے ۔ اپنی اس رائے کے جواز میں جماعتِ اسلامی کے سرکاری ترجمان "دعوت" کی ۴ ستمبر کی اشاعت سے اخبار کے ایڈیٹر مولانا محمد مسلم کی اس تحریر کا ایک پارہ نقل کر رہا ہوں جو انھوں نے نیپال کا دورہ کرنے کے بعد سپردِ قلم کی ہے :

"نیپال کی ترائی میں جو مسلمان جا کر آباد ہوئے ہیں، بعض کا قیام سو ڈیڑھ سو سال پرانا ہے اور بعض ایسے بھی ہیں جو ۱۹۴۷ء کے حالات سے گھبرا کر امن کی خاطر وہاں جا کر بس گئے تھے ۔ جمہوری ہندوستان کے مقابلے میں شاہی نیپال کے طرزِ حکـ ـت کا یہ فرق عجیب و غریب ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں علاقوں میں رہتے تھے، ایک ہی بولی بولتے تھے ، ایک ہی طرح کے اخبارات پڑھتے تھے اور عقاید اور روایات بھی یکساں تھیں لیکن سرحد کے اس پار ہر طرح کی زیادتی ہو رہی تھی اور دوسری طرف کسی کی نکسیر تک نہیں پھوٹی ۔

"ایک بار مظفر نگر کے کچھ شرارت پسند لوگ روتہٹ کے ضلع میں جا پہنچے اور گائے کا مسئلہ کھڑا کر کے ہنگامہ برپا کر دیا۔ کئی گھروں کو آگ بھی لگا دی اور لوٹ مار بھی کی ۔ لیکن کاٹھمنڈو اس کی اطلاع پہنچتے ہی موجودہ فرماں روا جو اس وقت ولی عہد تھے ، وہاں پہنچ گئے ۔ ایک ایک مظلوم کے گھر جا کر اس کی تسلی کی ، ظالموں سے ان کو معاوضہ دلوایا، سرکاری اسٹاف کو اور خطاکاروں کو سخت سزائیں دیں اور وہاں کی تاریخ میں یہ پہلا اور آخری فرقہ وارانہ ہنگامہ تھا جو برپا ہوا اور آئندہ کے لیے اچھے اثرات قائم کر گیا ۔ نیپال دستوری لحاظ سے ہندو ریاست ہے اور اس میں کسی دوسرے مذہب کی تبلیغ یا تبدیلی قانوناً جرم ہے لیکن اس کے باوجود نیپالی ہندو عوام آزادی کے ساتھ دوسرے مذاہب کا مطالعہ کرتے ہیں ۔"

یہ تحریر ایک ایسی ریاست کے بارے میں ہے جس کا حکمران سیکولرزم کا مدعی نہیں اور اپنی ریاست کے ہندو ریاست ہونے کا برملا معترف ہے۔ اس کے باوجود وہاں عملاً بے تعصبی کا مظاہرہ ہوتا ہے اور اقلیتوں کے ساتھ زیادتی نہیں ہوتی ۔ اس امر کا اعتراف بھی ایک ایسے شخص نے کیا ہے جو ایک ایسی دینی جماعت کا فرد ہے جو ایمرجنسی کے دوران فرقہ پرستی کے الزام میں معتوب رہی اور وہ خود بھی جیل میں رہا ۔

ہندوستان کی کئی سابقہ ریاستوں میں شرنارتھیوں اور مہاجروں کا فراخدلی سے خیر مقدم کرنے کے باوجود انھیں اس امر کی اجازت نہیں دی گئی تھی کہ ان کے ساتھ جو زیادتیاں بیرونِ ریاست ہوئی ہیں ان کا انتقام وہ مقامی آبادی سے لیں ۔ مثلاً جے پور، ٹونک اور مالیر کوٹلہ کی ریاستیں ۔

جس دن ہمارے رہنماؤں کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ ایک ماشہ عمل من بھر تلقین سے بہتر ہوتا ہے، ہمارے بہت سے مسائل حل ہو جائیں گے ۔

اسلام کے خلاف سوویٹ بلاک کی غیر مختتم جنگ

گوپال متّل

مسلم ممالک کو اپنے دامِ تزویر میں پھانسنے کے لیے سوویٹ بلاک کے ممالک اس بات سے برابر انکار کرتے رہتے ہیں کہ وہ اسلام دشمن ہیں یا یہ کہ وہاں مسلمانوں کو ستایا جاتا ہے۔ لیکن خود اپنی سرحدوں میں وہ اسلام اور کمیونزم کے تضاد پر مسلسل زور دیتے رہتے ہیں کمیونسٹ ممالک میں برملا کہا جاتا ہے کہ اسلام ایک رجعت پسند اور خطرناک مذہب ہے اور سوشلسٹ نظام میں اس کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ اسلام پر تازہ ترین حملہ بلغاروی ماہر نظریہ اے بچی نو نے کیا ہے۔ بلغاریہ کی کمیونسٹ پارٹی کے اخبار "ادبی جیتلوین گلاس" کی ۵ جولائی ۷۷ ۱۹ء کی اشاعت میں اس نے "اسلام کا اینٹی سوشل اور اینٹی سائنٹفک کردار" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے جس میں درج ہے :

"اسلام فطرتاً قطعی اینٹی سائنٹفک ہے۔ اس کے ماننے والے اس کی اس حیثیت سے فائدہ اٹھا کر حقیقی سائنس کے خلاف شدید جنگ جاری رکھے ہوئے ہیں۔ وہ مادّہ پرستی کے تو جانی دشمن ہیں۔ زندگی کی ابتدا اور اس کی تنظیم کے مادّی نظریے سے انھیں دشمنی ہے جو اسلام کی بے معنویت اور اس کے غیر سائنٹفک کردار کو بے نقاب کرتی ہے۔ اسلام کو ماننے والے دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ الہام کا نتیجہ ہے۔ یہ عوام میں اچھے مراسم کی تلقین کرتا ہے اور انھیں زندگی کا کچھ راستہ دکھاتا ہے اور اس سلسلے میں ان کی تربیت کرتا ہے۔ صرف یہی نہیں کہ اس قسم کے تصورات غیر سائنٹفک اور ناقابلِ جواز ہیں بلکہ یہ خود اسلام کو ماننے والوں کے لیے بھی ضرر رساں ہیں کیونکہ یہ انھیں جابروں اور لوٹ کھسوٹ کرنے والوں کی تابعیت کرنے اور صبر و سکون سے رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ اللہ ان جابروں اور لوٹ کھسوٹ کرنے والوں کی پشت پر ہے۔

"سوشلسٹ نظام تبھی قائم ہو سکتا ہے اگر سرمایہ دارانہ نجی جائداد کے سسٹم کو ختم کر دیا جائے اور ذرائع پیداوار پبلک کی ملکیت ہوں۔ اسلام نجی جائداد کا دفاع کرتا ہے۔ اور اس بنیادی مسئلے پر سوشلزم سے متصادم ہے لہٰذا سوشلسٹ نظام میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں۔"

سوویٹ ماہرین نظریہ مسلم ممالک اور تیسری دُنیا کے دوسرے ممالک کے درمیان اختلاف کی خلیج پیدا کرنے کے لیے پان اسلامزم کا ہوا کھڑا کرنے سے بھی باز نہیں رہتے۔ اس سلسلے میں حال ہی میں زہرناک ترین مضمون سوویٹ ماہر نظریہ آر۔ اے الیانوسکی نے لکھا ہے جو سوویٹ کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے بین الاقوامی شعبے کا صدر ہے۔ سوویٹ جریدے "جدید اور حالیہ تاریخ" کے ۷۷ ۱۹ء کے تیسرے شمارے میں وہ لکھتا ہے :

"اس دور میں رجعت پسندانہ بورژوا اور جاگیرانہ نظام پر مبنی نیشنلزم نے سماجی ترقی، سامراج دشمن قوم پرستی اور سوشلسٹ دُنیا میں باہمی اتحاد کے حامیوں کے خلاف مذہب اور مذہبی تنظیموں کو استعمال کرنے کی کوششوں کو تیز تر کر دیا ہے۔

گزشتہ پانچ چھ برس میں پان اسلامک تحریک کو نمایاں فروغ حاصل ہوا جس کی پشت پر سعودی عرب اور چند دوسری ریاستیں ہیں۔ اس تحریک کے رہنما رجعت پسند اسلامی حلقوں کو اینٹی کمیونسٹ پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ مشرقِ قریب، مشرقِ وسطیٰ اور شمالی افریقہ کے ممالک میں جہاں مسلمانوں کی کثیر آبادی ہے، ترقی پسندانہ تحریکوں کا توڑ پیدا کر سکیں۔

"پان اسلامزم مذہبی نہیں بلکہ واضح طور پر ایک طبقاتی پالیسی ہے۔ پان اسلامزم کا مقصد ایشیائی قوموں کو سامراج کے خلاف جنگ میں متحد کرنا نہیں بلکہ یہ ایک ایسا نظریاتی اور سیاسی رجحان ہے جس کا مقصد جاگیرداری کی دشمن تحریکوں، سیکولر نظامِ حکومت، سماجی ترقی اور جمہوریت کے خلاف رجعت پسند اسلامی حلقوں کو متحد کرنا ہے۔"

اس قسم کے پروپیگنڈے کا مقصد صرف یہی نہیں کہ مسلم ممالک اور تیسری دنیا کے ممالک میں اختلافات کی خلیج پیدا کی جائے بلکہ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کچھ ملکوں مثلاً ہندوستان میں مسلم اقلیت کے خلاف جذبہ پیدا ہو جائے۔ اندریں حالات ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کا یہ دعویٰ کہ وہ مسلمانوں کی دوست اور ان کے حقوق کی حامی ہے، مشکل ہی سے باور کیا جا سکتا ہے۔

بسمل سعیدی ہم میں نہیں رہے
لیکن ان کی یاد
ہمارے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہے گی
بسمل صاحب کی شخصیت اور شاعری پر ایک جامع کتاب
بسمل سعیدی
شخص اور شاعر

- سترہ اہم تنقیدی اور تجزیاتی مضامین
- بسمل صاحب کے کلام کا بھرپور انتخاب
- شعرا کے منظوم تاثرات
- بسمل صاحب کی زمین میں ممتاز شعرا کی غزلیں

اور آخر میں
بسمل صاحب سے طویل انٹرویو جو بسمل صاحب کی شاعرانہ شخصیت کے علاوہ ماضی قریب کی ادبی تاریخ کے کئی اہم گوشوں پر روشنی ڈالتا ہے۔
ڈیمائی سائز
معیاری کتابت اور طباعت
مضبوط جلد، قیمت : اٹھارہ روپے
نیشنل اکاڈمی
۹ - انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

گوپال مِتّل

سوویٹ اقتصادی مدد اور تیسری دُنیا

سوویٹ یونین اقوامِ متحدہ میں چین کے طرزِ عمل سے بہت نالاں ہے۔ بقول "ازویستیا" "اقوامِ متحدہ کا ممبر بننے چین کو چار برس سے کچھ زیادہ ہو گئے ہیں اور اس عرصے میں پیکنگ کے لیڈروں نے صرف اتنا کیا ہے کہ اقوامِ متحدہ اور اس کے مختلف اداروں کو بین الاقوامی مراسم میں جو نئی لہر پیدا ہو رہی تھی، اسے روکنے کے لیے استعمال کیا ہے۔" "ازویستیا" کی سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ "اقوامِ متحدہ کی ایجنسی برائے تجارت و ترقی میں چین نے اس مدد کی نوعیت کے بارے میں معاندانہ باتیں کہی ہیں جو سوویٹ یونین، سوویٹ بلاک کے دوسرے ممالک اور ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ملکوں کو دے رہا ہے۔ وہ سوشلسٹ ممالک اور ترقی پذیر ممالک میں تعمیری اقتصادی تعاون کی مخالفت کر رہا ہے اور اس قسم کی تجاویز میں مزاحم ہو رہا ہے۔ مثلاً مشترکہ تجارتی اور صنعتی کمپنیوں کا قیام۔" "ازویستیا" کا کہنا ہے کہ "اس طرح نو آزاد ممالک کو جو صنعتی ترقی کی راہ پر گامزن ہیں، جدید ترین مشنری ملنے کے امکانات کو ضعف پہنچتا ہے۔"

عجیب و غریب بات یہ ہے کہ ماسکو اور اس کا ترجمان "ازویستیا" مشترکہ تجارتی اور صنعتی کمپنیوں کی مخالفت کے لیے کمیونسٹ چین کے خلاف برہمی کا اظہار ایک ایسے وقت میں کر رہا ہے جب سوویٹ روس کی رہنمائی میں دنیا بھر کی کمیونسٹ پارٹیاں بین الملکی کمپنیوں کے خلاف، جو صنعتی ترقی کی خواہشمند نو آزاد ریاستوں کو جدید ترین مشنری فراہم کرنے کی واقعی اہل ہیں، جہاد کر رہی ہیں۔ یہ بات کہ مغرب کی مشنری سوویٹ یونین کے مقابلے میں جدید تر ہے، اس بات سے ظاہر ہے کہ خود سوویٹ یونین بھی اس سے مستفید ہو رہا ہے۔

سوویٹ بلاک ترقی پذیر ممالک کو جو اقتصادی مدد دے رہا ہے، اس کی قدر و قیمت بھی مشتبہ ہے۔ ترقی پذیر ممالک اس بات کو اپنے تجربے کی بنا پر اچھی طرح جانتے ہیں اور انھیں کمیونسٹ چین کے نمائندوں کی رہنمائی کی چنداں ضرورت نہیں۔ اس بات کو کینیا کے اخبار "نیشن" نے دو ٹوک لفظوں میں لکھا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ "سوویٹ یونین اور چین کو آپس میں جھگڑنے کا پورا حق حاصل ہے لیکن اس جھگڑے کو انھیں اس انداز سے پیش کرنا چاہیے کہ وہ ترقی پذیر ملکوں کے حامی ہیں۔ ہمارا مشورہ یہ ہے کہ وہ بین الاقوامی کانفرنسوں میں اپنی توجہ ان مسائل کو حل کرنے ہی میں صرف کریں جو ترقی پذیر ممالک کو درپیش ہیں۔ اپنی لفظی جنگ کے لیے وہ کوئی اور میدان تلاش کر سکتے ہیں۔"

ہندوستان کو سوویٹ مدد سب سے زیادہ ملتی ہے لیکن "ٹائمز آف انڈیا" کے ۱۵ رمئی کے شمارے کا جو اداریہ ہے اس میں سوویٹ مدد اور مغرب کی مدد کا جو موازنہ کیا گیا ہے وہ سوویٹوں کے لیے سازگار ہرگز نہیں۔ اسی پرچے نے اپنے ۱۲ رمئی کے شمارے میں نیروبی کے نامہ نگار کی خبر شائع کی ہے جس میں درج ہے کہ "یہ نظریہ کہ یورپ کی خوشحالی اور تیسری دنیا کا افلاس خالصتہً نو آبادیاتی نظام کی نفع اندوزی کا نتیجہ ہے، کافی کمزور ہے اور حقائق کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا۔

تمام یورپی ممالک میں صرف چھ ملک ایسے تھے جو آبادکاری کی راہ پر گامزن ہوئے اور ان میں سے دو ملک یعنی اسپین اور پرتگال اس کے نتیجے میں خوشحال ہرگز نہیں بن پائے۔ حقیقت یہ ہے کہ یورپ کے امیر ترین ممالک مثلاً سویڈن، سوئٹزرلینڈ، مغربی جرمنی، ناروے اور ڈنمارک کبھی بھی نوآبادکاری کی راہ پر گامزن نہیں ہوئے۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ۱۹۴۷ء میں جب برطانیہ نے ہندوستان کو خیرباد کہا تو ہندوستان دیوالیہ ملک ہرگز نہیں تھا اور اس کے پاس اسٹرلنگ سرمایہ اتنا تھا جو پہلے کبھی نہیں رہا تھا۔"

قرضے میں لی ہوئی گندم کی واپسی میں ہندوستان کو جو حال ہی میں تجربہ ہوا ہے وہ ظاہر کرتا ہے کہ روسی صرف یہی نہیں کہ تجارتی معاملات میں فراخدلی کے قائل نہیں بلکہ وہ خیروشر کے تصورات سے ماورا ہو کر انتہائی سنگدلی بھی برت سکتے ہیں، اتنی سنگدلی جس کا اہل وہ روایتی یہودی بھی نہیں تھا جو ایک پونڈ گوشت کی وصولی پر بضد تھا۔ نئی دہلی کے "اکنامک ٹائمز" نے اپنی ۱۱ رمئی ۱۹۷۷ء کی اشاعت میں لکھا ہے :

"ہندوستان سوویت یونین کو ڈیڑھ ملین ٹن گندم کے علاوہ جو اس نے بہ طور قرض لی تھی تیس ہزار ٹن گندم مفت دینے کے لیے بھی تیار ہو گیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ جس گندم کے بارے میں کہا گیا تھا کہ وہ بلاسود ہوگی، اب ہندوستان کو اس پر سود بھی دینا پڑا ہے۔"

"واقفکار حلقوں کا کہنا ہے کہ روسی اپنی بات پر اڑے رہے اور سودے بازی میں کافی سختی کا ثبوت دیا۔ رضا مندی کا اظہار انھوں نے تبھی کیا جب ہندوستان تیس ہزار ٹن گندم دینے پر آمادہ ہوا۔"

مارچ ۱۹۷۸ء میں

تحریک

اپنی اشاعت کے ۲۵ سال پورے کر رہا ہے

ایک سنجیدہ علمی و ادبی رسالے کے لیے پوری چوتھائی صدی تک باقاعدگی سے جاری رہنا کم فخر کی بات نہیں، بالخصوص موجودہ ماحول میں جب اردو زبان خود اپنے وطن میں بے وطن ہو کر رہ گئی ہے۔

اس موقع پر ہم ان مشکلات کا ذکر کرنا نہیں چاہتے جو "تحریک" کو زندہ رکھنے کے لیے ہمیں قدم قدم پر پیش آئیں بلکہ ہم شکریہ ادا کرنا چاہتے ہیں ان مہربان کرم فرماؤں اور دوستوں کا جن کے تعاون نے ہمیں ان مشکلات پر قابو پانے کا حوصلہ دیا —— ان کرم فرما دوستوں میں ہمارے قلمی معاونین بھی ہیں، مشتہرین بھی اور ادب کے وہ قارئین بھی جن کی پسندیدگی "تحریک" کے حلقۂ اشاعت میں متواتر توسیع کا وسیلہ بنی۔

انھی کرم فرماؤں اور دوستوں کے تعاون پر بھروسہ کرتے ہوئے ہم نے اگلے سال "تحریک" کا سلور جبلی نمبر شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

"تحریک" کے خاص نمبر جب جب شائع ہوئے ہیں ادبی حلقوں میں ان کی دھوم مچ گئی ہے —— ہماری کوشش ہوگی کہ سلور جبلی نمبر سابقہ تمام نمبروں پر سبقت لے جائے۔ ہم یقین دلاتے ہیں کہ "تحریک" کا سلور جبلی نمبر ایک بے مثال ادبی تحفہ ہوگا۔

اس کی تیاریوں میں ہمارا ہاتھ بٹائیے —— اس کے لیے اشتہارات کی فراہمی میں ہماری مدد کیجیے۔

اور

اسے رعایتی داموں پر حاصل کرنے کے لیے تحریک کی سالانہ خریداری قبول کیجیے۔

ہم ہمیشہ کی طرح آپ کے مخلصانہ تعاون کے منتظر ہیں

حسرت آباد

کرشن موہن

حسرت آباد ہے میرا مسکن
ایک ہفتے میں پگھل جاتا ہے مکھن کا پہاڑ
اتنی رونق ہے مگر دِل ہیں اُجاڑ
تیس چالیس کا چکّر ہر روز
اپنی حالت بھی ہے کتنی پُر سوز
پانی اور بجلی کے ہر ماہ پچاسی، نوّے
بڑھ گئے کتنے ہی گھر کے خرچے
یاس و حسرت ہے بسیط
دو چٹانیں ہیں محیط
یاد آتی ہیں مجھے
راجپوتوں کی وہ اکڑی مونچھیں
ٹوٹ جائیں گے مگر جھکنا خلافِ شان ہے
دو چٹانوں میں گھٹا جاتا ہے دم
ہے کہاں زخمِ خرد کا مرہم
اتنی رونق ہے مگر دل ہیں اُجاڑ
میرے گھر کا بھی عجب ہے عالم

▲▲

B.124 — بنڈارا روڈ — نئی دہلی

پریم وار بر ٹنی | دو نظمیں

ایک تاثّر

دم بخود ہیں تمام تشبیہیں
اور منہ فق ہیں استعاروں کے
کون سمجھے مرے سخن کی زباں
کون پوچھے مزاجِ دردِ نہاں
کون دیکھے مری نگاہوں سے
سرد رُت کے یہ آتشیں جلوے
برف کے فرش سے گزرتے ہوئے
جل اُٹھے اور دھوپ کے تلوے

▲▲

چھلاوا

لطیف لمس بھری لذتوں کے ریشم میں
بصد نیاز شفق کی شریر لڑکی نے
نئی رُتوں کے چھلکتے بدن لپیٹ لیے
سنہری دھوپ کے اُڑتے ہوئے پرندوں نے
ابھی نہ شام ہوئی تھی کہ پَر سمیٹ لیے

سمندروں میں ستاروں کی کشتیاں ڈالے
نکل پڑی ہے بھرے ساحلوں کی رعنائی
یہ روشنی کے بھنور میں کہیں زمیں تو نہیں
چٹان پر جو کھڑی ہے برہنہ انگڑائی

▲▲

۱۱۶۹ - سیکٹر ۸ سی ـــــ چنڈی گڑھ -

غزلیں

عروج زیدی

آسودگی قلب و نظر کون لے گیا
ہم سے ہمارے شام و سحر کون لے گیا

ہلچل مچی ہوئی ہے حریمِ جمال میں
اُن کے حضور دل کی خبر کون لے گیا

کیا پاسبانِ عقل کو بھی کچھ پتا نہیں
رنگینیٔ حیاتِ بشر کون لے گیا

موتی جڑے ہوئے تھے جن میں روش روش
وہ دولتِ نگارِ سحر کون لے گیا

اب تو غمِ فراق بھی ہے قابلِ قبول
دل سے یقینِ جذب و اثر کون لے گیا

اے چشمِ شوق! تو، یہ کہاں جم کے رہ گئی
توفیقِ احتیاطِ نظر کون لے گیا

آشوبِ جاں تھی ہم کو ملاقاتِ اولیں
اُن کے حضور بارِ دگر کون لے گیا

جو لکھا ہوں خواب تو یہ مصرعہ ہے بر زباں
سرمایۂ نشاطِ نظر کون لے گیا

وہ کیا گئے کہ اپنی تو دنیا بدل گئی
کیا کیسے حسنِ شام و سحر کون لے گیا

بے تابیاں اگر مری تقدیر میں نہ تھیں
وہ جس طرف تھے مجھ کو اُدھر کون لے گیا

دامانِ ناز سے پلکوں پہ اے عروج
میری متاعِ دیدۂ تر کون لے گیا

●●

فضا ابن فیضی

اور کیا مجھ سے کوئی صاحب نظر لے جائے گا
اپنے چہرے پر مری گردِ سفر لے جائے گا

چھاؤں میں نخلِ جنوں کی آؤ ٹھہرا لیں اسے
کون جلتی دھوپ کو صحرا سے گھر لے جائے گا

آسماں کی کھوج میں ہم سے زمیں بھی کھو گئی
کتنی پستی میں شعورِ بال و پر لے جائے گا

کاٹ کر دستِ دعا کو میرے خوش ہو لے مگر
تو کہاں آخر یہ شاخِ بے ثمر لے جائے گا

میں ہی تنہا ہوں یہاں اس کی صلابت کا گواہ
کون اٹھا کر یہ مرا سنگِ ہنر لے جائے گا

پست رکھوا اپنی آوازوں کو ورنہ دور تک
بات گھر کی، رخنۂ دیوار و در لے جائے گا

اس سے پہلے ہی تم قسطوں میں مرنا سیکھ لو
لے کے وہ شمشیر آئے گا تو سر لے جائے گا

میں اٹھاتا ہوں قدم حالانکہ سیلِ رَو کے خلاف
جانتا ہوں وقت کا جھونکا کدھر لے جائے گا

اتنی لمبی بھی نہیں لوگو! یہ گمنامی کی عمر
ڈھونڈ کر مجھ کو شعورِ معتبر لے جائے گا

کاروبارِ زندگی تک ہیں یہ ہنگامے فضا
کیا وہ سایہ چھوڑ دے گا جو شجر لے جائے گا

●●

نازش پرتاپگڈھی

شکستِ ذات ہوں، پسپائیوں کا چہرہ ہوں
برایں مسرتِ غم کس قدر اکیلا ہوں

خود اپنے سرخ لہو کو چھپائے پھرتا ہوں
کہ زہر بن کے میں اپنے بدن میں اترا ہوں

کسے غرض جو کرے میرے زخمِ دل کا شمار
لہولہان میں خود اپنے گھر میں پھرتا ہوں

مرا وجود مکمل سہی مگر لوگو!
ذرا قریب سے دیکھو میں کتنا بکھرا ہوں

تلاش کرتا ہے اب تک انہیں شعورِ خرد
وہ منزلیں میں جنہیں پیچھے چھوڑ آیا ہوں

سمٹ گیا اک اچٹتی نگاہ پڑتے ہی
خیال یہ تھا کہ میں بے کنار صحرا ہوں

مری وفا کو نہ آئینہ مل سکا نازش
میں دوستوں کے دلوں میں غبار سا ہوں

●●

○ محمد سیف الدین خاں، رامپور ۲۴۴۹۰۱ ○ مئو ناتھ بھنجن، یو۔پی ○ بیگم وارڈ، پرتاپگڈھ، یو۔پی۔

غزلیں

احتشام اختر

پیار کا نقش مٹاؤں کیسے
دل کی دیوار گراؤں کیسے

منہ سے آواز نکلتی ہی نہیں
جانے والے کو بلاؤں کیسے

خشک دریا کی طرح ہوں میں بھی
کوئی طوفان اٹھاؤں کیسے

پیار ہے سنگِ گراں کی مانند
راہ سے اس کو ہٹاؤں کیسے

ہائے اب آنکھ میں آنسو بھی نہیں
آگ دامن کی بجھاؤں کیسے

شہر میں کوئی نہیں ہے بینا
زخم خوابوں کے دکھاؤں کیسے

▲▲

عبدالرحیم نشتر

شبِ زوال سا اک رنگ میرے اندر تھا
شکستِ ذات ہی جیسے مرا مقدر تھا

کھلی جو آنکھ تو گم صم ملے در و دیوار
گزشتہ رات یہاں جشن جیسا منظر تھا

گھروندے ریت کے جس طرح ٹوٹتے جائیں
کچھ ایسا خوف ہمارے دلوں کے اندر تھا

وہ ڈوبتا ہے تو اب کون بوجھنے والا
گئی وہ بات کہ سورج سروں کے اوپر تھا

یہ بوڑھے پیڑ سناتے ہیں اپنی رودادیں
گلوں کی رت تھی، مہکتا ہوا سوئمبر تھا

▲▲

شکیلے مظہری

ہم ترے شہر میں مصلوبِ تمنا ٹھہرے
کتنی جلتی ہوئی سوچوں کا نتیجہ ٹھہرے

دہر سے ان کی شناسائی نہ ہو پائی کبھی
ہائے وہ لوگ جو لفظوں کے شناسا ٹھہرے

یہی دستور ہے اس کا یہی ہوتا ہے یہاں
ہر کوئی شہرِ تمنا میں اکیلا ٹھہرے

درد کی دولتِ نایاب ملی تھی ہم کو
پھر بھی کیوں سب کی نظر میں تہی مایہ ٹھہرے

کسی گرداب میں پھینکو کہ جلا دو ہم کو
ہم تمناؤں کا متروک صحیفہ ٹھہرے

مظہری وقت نے بخشا ہمیں اعزاز کہ ہم
درد کا گیت بنے، یاس کا لہجہ ٹھہرے

▲▲

○ استاد شعبۂ اردو، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج کوٹہ ○ انصاری وارڈ۔ بھنڈارا۔ ایم ایس ○ لائبریرین، دلی ڈنٹل فیرو الاسر ہموڈنٹیل۔ ۵۰۳۲۲۵

قمر احسن | گمشدہ نیشِ عقرب کا نوحہ

ہر سخن ثبت ہر اک دل پہ تھی
سن نہ سکا کوئی مگر ایک حرف
شور سکوت ایسا کہ مدت پوچھیے
بن کے شرر صوت و صدا اُڑ گئے . . . .

میرے ساتھی پر اکثر و بیشتر ایک کیفیت طاری ہوتی تھی ——— چپ رہنے کی۔ جس میں انجماد۔ بے حسی اور بے کیفی شامل رہتی تھی۔ یہ کیفیت اکثر کسی شدید جھٹکے کا ملازمہ ہوتی تھی ——— مثلاً آپ کو اگر کوئی تکلیف ہے تو آپ بے چین رہیں گے لیکن میرے ساتھی سید محمد رضا باقر کو اگر کھٹمل کاٹ لے تو وہ بڑے اطمینان سے سوتا تھا۔ نہ جانے اس کی کون سی حس اسی طرح کی اذیتوں سے لطف اندوز ہوتی تھی۔

جزیرہ پھول پھول کر اچھن اچھن کر سانسیں لیتا رہتا۔ اور اس پر مہین مہین برف کے ذرات جمتے رہتے۔ جیسے کسی پہاڑی نالہ کی موسم برف باری میں اوپری سطح پر جمتی ہوئی برف. . . . .
بس اچانک کوئی حادثہ ——— یاد ——— اور ٹوٹن آتی۔ اور اوپری سطح پر ایک لمحہ کے لیے شگاف پڑ جاتا ——— جس کے نیچے لمحہ بھر کے لیے ٹھٹھرا ہوا پانی آہستہ روی سے گزرتا دکھائی دیتا ——— چند ثانیوں بعد ہی برف پھر واپس آکر اتنی ہی سخت ہو جاتی ——— اوپر اوپر خشک منجمد برف اور نیچے کہیں دبی ہوئی ہلکی سی رعنائی۔

اب تو ایک عجیب سی بے حسی طاری ہوتی جا رہی تھی۔ بھیا محمد حسن شاہد نے کہا تھا۔ تم کسی سے توقع نہ رکھو ——— مطمئن رہو گے ——— لیکن یہ عمداً علیحدگی بھی تو نہ حاصل ہو سکی یہاں تو مکمل جبر تھا ——— توقع رکھوں بھی تو کس سے۔ لہٰذا اپنے اردگرد کا سارا سب کچھ ——— تمام ——— بالکل بے معنیٰ تھا ——— اور انتہائی سبک ———

مچھلی شہر کے شکلا جی نے کہا تھا کہ ایک دن سب آپ کو مکھی اور مچھر نظر آئیں گے۔ لیکن یہاں تو اس ایک دن کے آنے سے پہلے ہی آس پاس کے تمام زندہ اور متحرک وجود مکھی اور مچھر میں بدلتے جا رہے ہیں۔ سچ مچ کے ——— یہ قلب ماہیت کسی اکراہ کا نتیجہ نہ تھی بلکہ سراسر منطقی تھی ———

یہ باپ۔ یہ ماں ——— یہ بھائی ——— یہ رشتہ دار اور یہ احباب ——— شہنشاہ مرزا، تنویر نقوی۔ شاہنواز قریشی۔ بھائی کاظم اور انیس اشفاق۔ سب مہمل اور فضول ———
زندہ سچائی تو صرف اتنی تھی کہ شیعہ کالج کے کمرہ ۵۳۔ ۵۵ کی میلی جھاڑن سے صفائی ——— اشرف ہوٹل میں سال بھر تک صرف ایک وقت کھانا ——— سٹی اسٹیشن کی سرد رات میں رکشہ پر جکڑی ہوئی انگلیاں اور پھر نیا بھارت اُردو ——— یا سچائی یہ تھی کہ شری کلپ ناتھ سنگھ شاستری سے کچھ دیر دکھڑا رو لیا جائے اور اپنے لیے ان کی ہمدردیاں حاصل کر لی جائیں ——— اور D.I.G صاحب سے صرف ملنے کے لیے ملاقات کر لی جائے بہوگنا جی ——— ہا ——— ہیم وتی نندن بہوگنا ——— اترپردیش کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری اور نیا بھارت ہندی اردو کے چیف ایڈیٹر ——— اندرا میں ان کا لیکنگ۔ یا کیا پتہ یہ سب شدید جھوٹ رہا

نیشنل آرکائیوز، سنٹرل لائبریری، بھوپال، ایم۔ پی

ہو ــــ اور سچائی صرف اتنی ہو کہ میرا ساتھی ــــ انتہائی خود غرض ــــ بزدل اور شدید کمتری کے احساس میں مبتلا رہا ہو ــــ ورنہ رالکٹ لائبریری کے سامنے لاٹری کے ٹکٹ بیچنے سے شفو میاں عرف شفاعت حسین کی دوستی سے احتراز کیوں ممکن ہوتا ــــ ہاں شفو میاں ــــ میں جانتا تھا کہ تمھیں مجھ سے بہت محبت ہے ۔ لیکن میں کیا کرتا ــــ تمھاری دوستی کا دوستی سے جواب دینے کی مجھ میں ہمت ہی نہیں تھی ــــ تم مجھے لولیتا پڑھنے کو کہتے اور میں تمھیں آگ کا دریا دے دیتا ــــ بس اتنا ہی ربط تھا ہم دونوں میں ــــ

ایسا لگتا ہے جیسے اچانک سب سے ــــ تمام رشتے منقطع ہو گئے ہوں ــــ کہاں ہیں مرزا قریشی اور کاظم ۔ انہیں کبھی آنا نوید اسے سیاہ چائے بھی نہ پلا پاتا ــــ ستّی بھائی کے یہاں جاتا تو انھیں اپنے سے زیادہ احساس کمتری میں مبتلا پاتا ــــ ان کے پاس دو قصے تھے ۔ ماہے اور اوشا میں دونوں سے یا تو اکتا چکا تھا یا حسد میں مبتلا ہو گیا تھا ۔ اس لیے کہ میرے واسطے تو ہلدی اور لہسن پیاز کی بو میں بسی ہوئی دھبے دار شلواریں اور ہلکی ہلکی کھٹی بو والے لحافوں کی نیم تاریکی ہی تھی ۔ جو زینت عقد اور رخصتی کی طلبگار رہتیں ۔ اور مجھے ان سب سے ــــ اپنے چہار اطراف سے سخت گھن آتی ۔ بالکل ویسے ہی جیسے آپ کو بلغم چبانے ۔ قے کھانے اور گو کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو انگلیوں سے مسلنے میں آتی ہے ۔ لیکن میں دن رات تمام اطراف سے آنکھیں بند کر کے اسی گھن میں لتھڑتا جاتا ــــ اس لیے کہ میں ایک وقت میں ایک ہی کام کر سکتا ہوں ۔ ایک لمحہ میں ایک ہی بات سوچ سکتا ہوں اور ایک دن میں ایک ہی راستہ پر چل سکتا ہوں ۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت میں نے جتنے افسانے لکھے یا سوچے سب میں گھن کا یا اثر شدید تھا ــــ دراصل میں اپنے آپ کو ابھی اپنے اردگرد سے الگ کر ہی نہ پاتا تھا ــــ افسانے ــــ اب تو کاظم ــــ مرزا صاحب اور شاہنواز قریشی کی تنقیدوں پر بھی مسکرا دیتا تھا ۔ ارے مرزا جی ــــ تم احساس ہی نہ کر پائے کہ یہ دراصل میرا شدید احساس کمتری ہے ــــ جسے میں داخلی گھٹن کہتا ہو[ں]

ورنہ کہاں میں کہاں افسانہ نگاری ــــ دراصل سا[رے] محرومیوں کو اس طرح اپنے اوپر واضح اور واضح کرنا چاہ[تا] ہوں ۔ ورنہ مجھ کو ادب ودب سے کیا لینا دینا ــــ کہا[ں] کا سماج سدھار اور کہاں کی عظیم تخلیق ــــ بھیا اپن تو اپنی گھ[ٹن] کا اخراج کرتے ہیں ۔ اب تک آس پاس کوئی یہ پوچھنے وا[لا] بھی نہ تھا کہ قمر تم کیا سوچتے ہو ــــ لہٰذا ــــ میرا سا[یہ] اب خود میرا دوسرا بن کر مجھ سے کبھی کبھی پوچھ لیتا ہے ۔ قم[ر] تمھیں کیا غم ہے ــــ کبھی دن کو کبھی رات کو اور کبھی ٹھ[یک] دوپہر میں چپکے سے وہ میرے پاس آجاتا ــــ اچھا تو [ـ] تب میں ابل پڑتا ــــ دراصل میری بربادی کی سار[ی] ذمہ داری میرے والدین پر ہے ــــ نہ میں نے ایک ک[ی] شفقت پائی نہ دوسرے کی ممتا ــــ باپ کے شف[یق] ہاتھوں اور ماں کی نرم گرم گود ــــ دونوں میر[ے] لیے اجنبی رہے ــــ سوچتا کہ کیسے ہوں گے یہ دونوں کبھی کبھی ــــ بس کبھی کبھی ــــ ان دونوں سے ایک اتھ[ا] اتھلی ہمدردی محسوس کرتا ۔ ہا بیچاروں کا بڑا لڑکا ــــ ہا ــــ بے چارے ــــ

میں تو ایک CATALYST تھا ــــ جو اپنا کا[م] کر کے ویسے کا ویسا الگ ہو جاتا ہے ــــ

یار مرزا صاحب ۔ یہ قمر احسن صاحب کچھ سمجھ میں نہ[یں] آتے ۔ کچھ عجیب ــــ یعنی بہت عجیب سا لگتا ہے ۔ ان سے باتیں کر کے ۔ جیسے سارے کا سارا جھوٹ ہو یعنی کبھی تو قمر احسن کا ہونا ہی جھوٹ نظر آنے لگتا ہے ۔ آنکھیں کبھی ان کے چہرے کا ساتھ نہیں دیتیں ۔ بس کبھی کبھی وہ لمحہ آتا ہے جب ان کے چہرے اور آنکھوں میں مطابقت ملتی ہو ایسا لگتا ہے جیسے وہ کسی دھاگے سے باندھ دیے گئے ہ[وں] اور ہوا کے جھونکے سے کبھی کبھی وہ دھاگا ہل جاتا ہو ۔

سنا ہے آج کل فاروقی صاحب سے بڑا اٹھنا بیٹھ[نا] ہے ۔ دن میں اکثر انھیں فون کرتے ہیں اور شام کو د[فتر] چلے جاتے ہیں ــــ شاید ادب کا درس لینے لگے ہیں ۔

میاں یہ لوگ گمراہ کن ہیں۔ قمر احسن میں ویسے ہی قوت فیصلہ کی کمی ہے۔ فاروقی صاحب اسے اور لے ڈوبیں گے۔
سنا ہے فاروقی صاحب قمر کا افسانہ شب خون میں شائع کر رہے ہیں۔ دو ایک افسانے اور وہ لونڈا دے آیا ہے۔ جس پہ فاروقی صاحب باقاعدہ تبصرہ کرتے اور مشورہ دیتے ہیں۔ اب لڑکا ضرور مشہور ہوگا۔ بہت بڑے گروہ سے وابستہ ہو رہا ہے۔ C.I.A کا چکر ہی نرالا ہوتا ہے۔ نوجوانوں کی تو انھیں تلاش رہتی ہے۔
فاروقی صاحب آپ آخر میرے افسانے شب خون میں کیوں شائع کرتے ہیں۔ میرا مطلب مجھے میرے افسانوں کے بارے میں بتائیے۔
میں کیوں بتاؤں — آپ بتائیے۔
دراصل مجھ میں تنقیدی شعور..... بھئی دیکھیے آپ کا افسانہ صدیاں میں نے بہت پسند کیا تھا — دراصل میں افسانہ پڑھتے وقت سب سے پہلے طرز اظہار کو (طرز ادا نہیں) — دیکھتا ہوں۔ پھر زبان پر غور کرتا ہوں آپ نے اس میں کہنا کیا چاہا ہے یہ میں بہت بعد میں دیکھوں گا یعنی جب مجھے اول الذکر دونوں چیزیں گرفت میں لے لیں۔
فاروقی صاحب — میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ تخلیق پڑھنے کے لیے آدمی میں تنقیدی شعور ہونا ضروری ہے — ورنہ......

ہاں دیکھیے قمر صاحب دراصل یہ مسئلہ شعور کی بالیدگی کا ہے۔ مثلاً اگر آپ ظفر اقبال کو پڑھنا چاہتے ہیں تو آپ کو میر۔ غالب۔ اقبال۔ آتش۔ فیض اور ناصر کاظمی سے واقف ہونا ضروری ہی ہے۔ بالکل اس طرح جیسے سریندر پرکاش کو پڑھنے کے لیے منٹو اور بیدی سے واقفیت۔
فاروقی صاحب یہ ظفر اقبال تو مزاحیہ شاعر ہیں —
جی — ؟؟
یار فاروقی صاحب کا چہرہ غصہ سے سرخ ہوگیا تھا۔ اور بڑے سرد لہجہ میں انھوں نے شب خون کے دس بارہ شمارہ بھی دیے۔ کہ اسے پڑھ لیجیے۔ پھر بات کریں گے۔

بہت بور ہوا تھا اس دن —
اماں کاظم سنا — فاروقی صاحب نے ظفر اقبال پڑھنے کے لیے قمر احسن کو جتنے شب خون دیے تھے ان کی تمام غزلوں پہ قمر احسن نے مزاحیہ غزل لکھ کر واپس کر دیا۔
بات تیرے کی — یا غلد و ساقی اے جذب مستی
یا مکڑے ٹکڑے والا ہستی۔ ہر دن صبح ہی صبح جزیرہ کے کسی کونے سے ایک عقرب نکلتا اور سفید کورے کاغذ کی تلاش کرتا — ہوتے ہوتے وہ اسے پا جاتا اور سفید چکنے کاغذ پر ڈنک اٹھائے اترا اترا کر ناچتا رہتا — رات ہوتے ہی وہ کاغذ پر سے تھکا ماندہ اترتا اور سبک روی سے اپنے سوراخ میں چلا جاتا — پھر بڑی دیر تک اس کی سانس لینے کی بھاری بھاری آوازیں آتی رہتیں — اب سفید کاغذ پر لاتعداد سیاہ رنگ کی آڑی ترچھی لکیریں چمکنے لگتیں —
تمہارے یہاں کہانی پن یا داستانیت چھائی ہوئی ہے۔ اس سے پیچھا چھڑاؤ۔
دیکھیے۔ مرزا صاحب۔ استاد — شہنشاہ بھائی — آپ نے پچھلی بار یہ کہا تھا کہ میں دراصل ابھی تک اپنے آپ کے دائرہ سے باہر نہیں آسکا ہوں — آپ نے نہیں تو انیس اشفاق نے کہا ہوگا۔ استاد جی — مجھے رسالوں میں اپنی تصویر دیکھنے یا کسی صفحہ پر اپنا نام دیکھنے کی خواہش نے افسانہ نگار نہیں بنایا ہے۔ (ویسے کبھی کبھی اس کی خواہش ابھرتی ضرور ہے۔) نہ ہی راتوں رات شہرت کی خواہش رکھنے والا افسانہ نگار ہوں۔ میں سال میں ایک یا دو کہانیاں لکھتا ہوں۔ مرزا جی میں نقال نہیں جو صرف روشنی اور رسالوں کے صفحات پر موجود رہنے کے لیے ایڈیٹر کے نام خط سے لے کر تبصرہ تک کرتے رہتے ہیں۔ میں نقالی اور فلک الافلاک کا فرق جانتا ہوں — (جانتا ہوں یہی کیا کم ہے)
میں یہ جانتا ہوں کہ افسانہ ہمیں ہمارے ذہنی اور ارضی تجربات سے قریب رکھتا ہے اور اس میں تقدیس یا

ڈرامائیت ضروری ہے ورنہ وہ افسانہ نہ ہوگا یہاں گھڑنت کا عمل ضروری ہے۔ خود ساختہ اور خود پر طاری کردہ لمحاتی زیریم سے شاعری یا پراف صحافتی مواد تو ممکن ہے لیکن افسانہ نہیں۔ یہ ایک اتفاقی ہے۔ آپ کہیئے تو میں اپنے ہم عصر تمام نقال افسانہ نگاروں کے نام گنادوں لیکن رہنے دیجیے پیارے مرزا ——— میں نے دیکھا ہے۔ جھیلا ہے تب قلم اٹھایا ہے۔ میں تو اس کا قائل ہوں کہ وہ شخص فن کار ہو ہی نہیں سکتا جس کے اندر کے لباس میں پھوسٹرے نہ نکلے ہوں۔ اور قمیض اور کرتے کے دو چار بٹن نہ ٹوٹے ہوں۔ اور جس کے جوتے کے تلے میں جتنی چھوٹی چھوٹی نوکیلی کیلیں ہوں گی اتنا ہی اس میں ORIGINAL فن کار ہونے کی صلاحیت ہوگی ——— اسی لیے میں نے ہمیشہ دوسروں کے مقابل خود کو سفید کاغذ پر اکیلا ہی اتراتا پایا ہے۔

تمہیں تمہارے افسانوں کے بارے میں بتانے سے پہلے میں تم سے ہی پوچھنا ہوں کہ تم کیوں افسانے لکھتے ہو ———

فاروقی صاحب۔ بھائی۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے کیسی چیز کا بدل ہو۔ جیسے کچھ محرومیوں یا ناکامیوں کی تلافی ہو رہی ہو ——— بالکل وہی احساس جو ولیم ریمین کو ہوا تھا ——— لیکن کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بہت سے سوئے ہوئے عفریت جاگ بھی پڑتے ہیں۔ اور سر کا کاسہ یا ہڈیاں بجا بجا کر چیختے ہیں ——— چٹاخ ——— چٹاخ ———

لیکن قمر صاحب آپ افسانہ ہی کیوں لکھتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ آپ شاعری کر سکتے تھے ——— یا ڈرامہ لکھ سکتے تھے ———

در اصل میں زمین سے رشتہ نہیں توڑنا چاہتا ——— مجھے کہانی سننے سے سب سے زیادہ دلچسپی تھی لیکن مجھے ایسے مواقع بہت کم ملتے تھے جب میں نانی یا دادی کے پاس راتیں بیٹھ کر کہانی سُن سکوں ——— مجھے پریاں۔ شہزادیاں۔ شہزادوں کی باتیں بہت اچھی لگتی تھیں شاعری کو میں زمین سے اوپر کی چیز جانتا ہوں اور دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس لیے کہ جب شاعری اس ارضیت کو اپنائے گی تو خود کم تر ہو جائے گی ——— اور ———

لیکن تخلیقی عمل تو دونوں کا آپ کے یہاں ایک سا محسوس ہوتا ہے ———

بھائی ——— اے فاروقی صاحب۔ ایسا لگتا ہے جیسے میرے اندر اپنے آپ کوئی ایک ضخیم کتاب شروع ہو گئی ہو۔ اور مجھے لگتا ہے کہ کوئی مجھ سے کہہ رہا ہے۔ اسے پڑھو ——— پڑھو ——— اقرء ——— اقرء ——— سمجھو ——— یہ سب سے بڑا فرض ہے۔ میرا اس سے بچنے کو بھی دل چاہتا ہے اور بہت زیادہ دہشت سی محسوس ہوتی ہے۔ سچ ——— بہت زیادہ ——— بالکل پسینہ میں شرابور ہو جاتا ہوں ———

میرے گلے میں ادب سانپ اور چھچھوندر کی طرح کبھی نہیں رہا ——— بلکہ کبھی کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ جب غم اور محرومی کے کتنے شدت سے بھونکنے لگتے ہیں تو مجھے یہ سب ادب ودب ایک ڈھکوسلہ سا لگتا ہے ——— یہی وجہ ہے کہ آپ کے منع کرنے کے باوجود میں اپنے آپ سے نہیں بھاگ پاتا ہوں ——— میں دراصل ادب سے بہت پریشان ہوں ——— وہ نیش عقرب کی طرح مجھے ڈنک مارتا ہے ——— تڑپاتا ہے۔ یہ زہر نہ مرنے دیتا ہے نہ جینے دیتا ہے۔ میں اسے کہیں رکھ کر بھول جانا چاہتا ہوں ——— جی چاہتا ہے کہ سارا سفید کاغذ کہیں چھپا دوں تاکہ عقرب آئے تو ——— لیکن تلاش کر کے واپس چلا جائے۔ اور میں اس کی نیش سے محروم رہوں ———

میں نے کہا تھا نا کہ میں سب سے پہلے طرز اظہار دیکھتا ہوں ——— آپ کے یہاں فی الحال مجھے صرف یہی ایک امکان نظر آتا ہے۔ ویسے آپ پر انتظار حسین، قرۃالعین اور انور سجاد کے ملے جلے اثرات ہیں ——— کبھی کبھی آپ کے یہاں واقعاتی سطح بھی ——— آپ اپنے پچھلے سارے افسانے دیجیے تو میں کچھ اور عرض کروں ———

فاروقی صاحب ــــ میری زندگی ــــ خواہشات اور .... سوال یہ ہے کہ اب میں کروں کیا ــــ آپ جانتے ہی ہیں ــــ میرے تو گھر بھی نہیں ہے کہاں جاؤں۔

آپ ــــ قمر تم I.A.S. میں کیوں نہیں بیٹھتے ــــ

لیکن میری عمر ایک سال کم ہے۔

تو صرف I.P.S. میں بیٹھو ــــ میں کل فارم کے لیے آفس سے لکھ دوں گا ــــ فی الحال ــــ قمراحسن تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ شب خون سنبھال لو ــــ میری بھی فکر کم ہو گی ــــ بڑی بُری حالت ہے تم وہاں I.P.S. کے ساتھ P.H.D. بھی کر سکتے ہو ــــ اچھا آج شام کو تمھاری بھابی سے بات کروں گا۔ میرے خیال میں تم الہ آباد ہی چلے جاؤ ــــ

میں نے محسوس کیا کہ آج جزیرہ کی اُبھناہٹ میں کمی ہے ــــ اور آسمان بھی خاصا صاف اور چمکیلا ہے ــــ ہوا اپنے آپ نرم رو ہے اور سب آرام سے سو گئے ہیں۔

شورِ سکوت ایسا کہ مت پوچھیے
کان ہر اک ذرّے کے سن ہو گئے
بن کے شرر صوت و صدا اڑ گئے (باقی)

پگھلتا ہوا لمحہ (بقیہ صفحہ ۳۰)

"ہاں ــ ریکھا ــ" میں نے اُس کی حیرت زدہ آنکھوں میں دیکھا۔ اور کوٹھری سے وہی پھول لے آیا جسے ریکھا نے بہاری جھرنے پر تحفتہً دیا تھا۔ پھول خشک ضرور تھا۔ لیکن وہ میرے لیے ایک انمول شئے تھی۔ میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا ــ "میں ایک انسان ہوں۔ تم سے پیار کرتا ہوں تو اس پر تمہیں حیرت کیوں ہوئی ــ دیکھو اس پھول کو یہ تمہارا ہی دیا ہوا تحفہ ہے۔ اس سے پوچھو۔ میں نے کیسے اپنے دل کے زخموں کو زمانے کی نگاہوں سے چھپایا ہے۔ پیار کرنے والے صرف پیار کرتے ہیں ــــ اور میں اُس دن سے تمہیں پیار کر رہا ہوں جب تم سے پہلی ملاقات اسی جگہ ہوئی تھی۔ کیا تمہیں میرے پیار پر شک ہے ــ؟"

ریکھا نے اپنی موٹی سیاہ آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ سہمی ہوئی آنکھوں میں چمک سی آئی ــ پھر نمی اور وہ روہانسی آواز میں بولی ــ "تم ــ"

میں نے اپنی لرزتی ہوئی انگلی اُس کے ہونٹوں پر رکھ دی۔ اور خشک پھول کو ریکھا کی سیاہ زلفوں میں لگا دیا۔

جدید اُردو ادب کے لیے
سطور
تیسری جلد شائع ہوگئی ہے
قیمت فی جلد: ۳ روپے، سالانہ ۱۲ روپے
ترتیب: کمار پاشی
سطور پرکاشن، ۱/۲۳۳۷ دہلی گیٹ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

بیگم ممتاز مرزا کا غزلیہ کلام
یادوں کے سائے
"ان غزلوں میں نغمگی کے علاوہ زبان و بیان کی صحت اور پاکیزگی، سلاست، روانی اور شگفتگی ہر ورق پر محسوس ہوتی ہے۔"
ــــ ڈاکٹر یوسف حسین خاں
بڑا سائز، عمدہ کاغذ پر آفسٹ کی خوشنما طباعت۔ سرورق کا ڈیزائن اسلم کمال کے موقلم کا شاہکار ہے۔
قیمت: بیس روپے
نیشنل اکاڈمی سے طلب فرمائیں

چند تازہ مطبوعات

زبان اور قواعد

زبان کی ساخت، اس کے تشکیلی ضابطوں اور ارتقائی مرحلوں پر رشید حسن خاں کے عالمانہ مضامین۔ قیمت : ۱۷ روپے

تناظر

ایک اہم ادبی دستاویز جس کی تیاری میں ڈاکٹر عتیق اللہ اور بلراج ورما کا خونِ جگر صرف ہوا ہے بہم لکھنے والوں کے ہر حلقے کے ممتاز نمائندوں کی تازہ ترین نگارشات۔ قیمت : ۲۵ روپے

اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت

ڈاکٹر عنوان چشتی کی نئی کتاب جس میں ہند و پاک کے صدہا شاعروں کے کلام کا تجزیہ کر کے جدیدیت کی خصوصیات کا تعین کیا گیا ہے۔ قیمت : ۴۰ روپے

زاویے

اردو اکاڈمی گلبرگہ کا سالانہ ترجمان جسے حامد اکمل نے مرتب کیا ہے —— ادب کی ہر صنف کی بھرپور نمائندگی۔ قیمت : ۵ روپے

نیا ادب نئے مسائل

بشر نواز کے خیال انگیز مضامین۔ روایت اور جدت کے رشتوں کی بازیافت، نئے ادب کا معروضی جائزہ۔ قیمت : ۱۰ روپے

اردو شاعری میں سانٹ

اپنے موضوع پر پہلی بھرپور کتاب جسے حنیف کیفی نے کئی سال کی محنت کے بعد مکمل کیا ہے۔ قیمت : ۸ روپے

شاخِ لہو

شفیع مشہدی کے تیرہ ۱۳ افسانے
قیمت : ۱۲ روپے

لفظوں کی دھوپ

شکیل مظہری کا شعری مجموعہ
قیمت : ۱۰ روپے

(ہم سے طلب کریں)

نیشنل اکاڈمی، ۹ء انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دلی ۱۱۰۰۰۲

آج کا عنوان

آمنہ ابوالحسن

فکر کے خوش آیند راستے سے
ایک خوبرو خیال
میرے ذہن میں یوں آیا جیسے
دروازے پر کوئی دوست آیا ہو
میں خوش ہوا سواگت کو تو کوئی نظر نہ آیا
میں نے آواز دی
کیا بات ہے یار۔ رُک مت جاؤ۔ اندر آؤ مگر
میرے کہے کا جواب نہ آیا
آؤ — آبھی جاؤ — میں پھر بولا
چائے پی لیتا
تھوڑی سی گپ لگا کر پھر ہم یہ سوچیں گے
زندگی کے عنوان کتنے
بندگی۔ پائندگی۔ تابندگی
جینے کے ہیں نام کیا کیا
پر جب کوئی بولا ہی نہیں تو میں گھبرایا
پلیز یار —
مہندر — امتیاز — ہری کانت — کرپا سنگھ
جو کوئی ہو۔ جب آئے ہو تو آبھی چکو
خاموشی —
ہیں — کوئی آتا کیوں نہیں
میں اُٹھا۔ پھر نکلا میں نے باہر جھانکا
کیا کوئی دوست نہیں دروازے پر — ؟

تو پھر یہ آہٹ کیسی
اُف — !
میں ٹھٹکا سہما۔ میں کانپا
سانپ —
جس کی بابت سنا بہت تھا
کیا اب یہ میرے گھر تک بھی آگیا ہے۔ ؟
میری آواز اور میرے دوستوں کے درمیان
سمجھ گیا۔ ہر شخص سہما ہے ملکیوں ہے
اسی موذی کا ڈر ہے شاید
جو آج بھی ہر آدمی کے ذہن کی چوکھٹ پر
بغیر کچھ بولے کھڑا ہوا ہے
اور راستہ بند ہے
خوشی مفقود — فکر مسدود
ملک۔ مکان۔ دوستی۔ جان پہچان
کچھ بھی شاید زندہ نہیں
صرف ڈر ہے زندہ
آج کا عنوان

غزلیں

منظور ہاشمی

فصل پک جائے تو کاٹیں گے ہی بونے والے
ڈوب جائیں گے کسی روز ڈبونے والے

کچھ تو اس سادہ مزاجی کا صلہ دے ان کو
کس قدر جلد بہل جاتے ہیں رونے والے

لاش ابھری تو کئی نام لکھے تھے اس پر
کتنے حیران ہوئے مجھکو ڈبونے والے

وقت آواز پہ آواز دیے جاتا ہے
اور سوتے ہی چلے جاتے ہیں سونے والے

داغ مٹ جائیں مگر میرے لہو کی خوشبو
تیرے دامن سے کہاں جائے گی دھونے والے

جن کے ہونٹوں سے تبسم کی نمو ہوتی تھی
کیوں انھیں آج کہا جاتا ہے رونے والے

زندگی لاکھ سہی بارِ گراں کی مانند
پھینک دیں کیسے مگر بوجھ یہ ڈھونے والے

▲▲

عابد مناوری

میرے آنگن سے کبھی ہو کے نہ گزرا سورج
راستہ اپنا کسی دن تو بدلتا سورج

دن جو نکلا بھی تو چھائے رہے غم کے بادل
دل کی نگری پہ کبھی کھل کے نہ چمکا سورج

قہقہہ زن ہے مری ہار پہ دشمن میرا
پردۂ شب سے پھر اک بار نکل آ سورج

اک طرف رات کے شیدا مہ و انجم کتنے
اک طرف دن کا پرستار اکیلا سورج

غیر ممکن ہے شبِ غم کی سحر اے عابدؔ
کس نے مغرب سے نکلتے ہوئے دیکھا سورج

▲▲

ڈاکٹر فضل امام

یہیں قریب ہی اک اجنبی سی بستی ہے
خلوص و مہر و محبت کو جو ترستی ہے

گمان ہوتا ہے جیسے سحر نہ دیکھیں گے
ردائے شب ترے شانے سے یوں سرکتی ہے

بجھا دیے ترے دستِ ستم نے فن کے چراغ
اور اب تو دور تلک ظلمتوں کی بستی ہے

خطر پسند طبیعت کا شہر یار ہوں میں
رواں جو بحرِ حوادث میں میری کشتی ہے

وہ میر تھے جنھیں فاقے میں سر بلندی تھی
یہ تم ہو جن کو خوشامد ہی اصل ہستی ہے

▲▲

○ ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، یوپی　○ ۸/۶۱، محلہ گاندھی نگر جموں (توی)　○ استاد شعبۂ اردو، راجستھان یونیورسٹی، جے پور

ذکا صدیقی

گوری نامہ

طنز کی طرح رباعی بھی ایک دو دھاری تلوار ہوتی ہے۔ یا اپنا گریبان چاک یا دامن یزداں چاک۔ چار مصرعوں میں ایک جہانِ معنی کو سمیٹ لینا آسان کام نہیں ہوتا۔ اور ان چار مصرعوں میں بھی چوتھا مصرعہ جس پر مضمون کی اساس ہوتی ہے، اگر ذرا سست ہو جائے تو شاعر کی ایک عمر کی کمائی جنس کاسد بازار ہو جاتی ہے۔ اسی لیے شاعر اس وقت تک رباعی کہنے پر آمادہ نہیں ہوتا جب تک اس کی مشق ایک خاص معیار تک نہیں پہنچ جاتی۔ لیکن مشقِ سخن کا ایک خاص معیار تک پہنچ جانا بھی اس امر کی ضمانت نہیں دیتا کہ رباعی بہرحال کامیاب ہوگی۔ اس کے ۲۴ اوزان جو بظاہر رباعی گوئی کو آسان بناتے دکھائی دیتے ہیں۔ بڑے خطرناک ہیں۔ بڑے سے بڑا استاد رباعی کہتے وقت جیسے تلوار کی دھار پر چلتا ہوتا ہے۔

ہشدار کہ رہ بردم تیغ است قدم را

ظاہر ہے کہ اعلیٰ نازک اور لطیف مضامین و احساسات صرف چار مصرعوں میں ادا کرنے کے لیے کوزے میں دریا کو بند کرنے والی مہارت و استادی درکار ہوتی ہے۔ یہی وہ موقع ہوتا ہے جب اہلِ نظر شاعر کو پرکھتے ہیں۔ فارسی اور اردو کے ہر بڑے شاعر نے اس چیلنج کو قبول کیا ہے۔ بابا طاہر، عبداللہ انصاری، خیام، مولانا روم، سرمد، جیسے ہم کی رباعیاں فارسی میں اور میر انیس، حالی، امجد حیدر آبادی، جوش، فراق۔ وغیرہ کی رباعیاں اردو میں، ان شاعروں کی سرکش انا کی مظاہر ہیں۔ شعرا کی رباعیوں کو موضوع کے لحاظ سے چند اصناف میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

عرفانی، عشقیہ، طبیعی، خمریہ، فلسفیانہ۔

ایک میدان خالی تھا اس کو دریافت کرنا محشر عنایتی کے لیے مقسوم ہو چکا تھا۔

محشر صاحب رام پور کے ان نامور شاعروں میں ہیں جن کا کلام صاحبان ذوق کے لیے محتاجِ تعارف نہیں۔ ان کا عشقیہ کلام بہت سوں کی نظر میں ہے۔ فکاہیہ کلام سے ان کے احباب واقف ہیں۔ اور سیاسی شاعری سے اخبار بین حضرات لطف اندوز ہوتے رہے ہیں۔ ان کی رباعیاں جن کی ہم لوگ گوری نامہ کے عنوان سے فرمائش کرتے اور سنتے ہیں اردو شاعری میں ایک قابل قدر اضافہ ہیں گاؤں کی سادہ معصوم زندگی کی جتنی دلکش تصویریں محشر صاحب نے ان رباعیوں میں پیش کی ہیں وہ، بلا مبالغہ عرض کیا جا سکتا ہے کہ اردو میں شاذ کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان رباعیوں میں ہندوستان کا دل دھڑک رہا ہے۔ یہاں گوری ایک علامت ہے۔ مادرِ ہند کے لیے۔ بلاشبہ یہ علامت یہ SYM BAL ادب کو محشر صاحب کی دین ہے۔

محشر صاحب کی گوری اسی زندگی کی، اسی دھرتی پر بسنے والی، دیہات کے کھیتوں میں کام کرتی ہوئی، ایک البیلی، شوخ۔ زندہ دل گاؤں کی آزاد فضا کی پروردہ لڑکی ہے۔ فراق کے یہاں روپ کی رباعیوں میں وصال کے بعد جمال کی دوشیزگی نکھرتی ہے، جوش کے یہاں وصال کے بعد کی بے کیفی کی تصویریں نظر آتی ہیں۔ لیکن محشر صاحب کے یہاں گوری اپنے اندر وہ معصومیت

گھیر باز خاں، گنج قدیم، رامپور، یو۔پی

لیے ہوئے ہے جو مشرقی شرافت و تہذیب کا نمونہ ہے۔ فراق اور جوش کی ہیروئنوں میں ایک تصنع ہے۔ گوری میں وہ سادگی اور پرکاری ہے جو حسن کو تغافل میں جرأت آزما بنا دیتی ہے یہی وجہ ہے کہ گوری کی ان اداؤں کو جنھیں محشر صاحب نے الفاظ میں اسیر کر لیا ہے، ہم رباعی کے چار مصرعوں میں جھلکتا، چھلکتا، مچلتا، تڑپتا، دیکھ کر تڑپ جاتے ہیں۔ ایک تصویر ملاحظہ ہو۔

جاگے تو قیامت سی اٹھاتی جائے
چلی پیے تو گنگناتی جائے
بادل کی گرج میں جیسے دھیرے دھیرے
جوگن کوئی بانسری بجاتی جائے

کیسی بلیغ تشبیہ، ارضیت سے بھری ہوئی اور نادر۔ تین تشبیہیں اور ملاحظہ ہوں۔

تتلی اڑتے میں رک سی جائے جیسے
آندھی چلتے میں سرد جھونکے جیسے
کل صبح دہی بلو رہی تھی گوری
بارش کی جھڑ میں مور ناچے جیسے

محشر صاحب کا مشاہدہ اور اس مشاہدے سے پیدا ہونے والا صوتی تصور جو اس رباعی سے ظاہر ہو رہا ہے اپنے اندر وہ انفرادیت رکھتا ہے جس پر شاعر ناز کر سکتا ہے۔

اب یہ رباعی سنیئے اس میں قافیے کے انتخاب نے کس قدر موسیقیت پیدا کر دی ہے۔

موسل دھمکے ہر ایک چوڑی کھنکے
دانوں کو سمیٹنے میں پایل چھنکے
دھانوں کی کٹائی کا ترنم، توبہ
جس طرح پکھاوج پہ مجیرا جھنکے

دھمکے، کھنکے، چھنکے، جھنکے میں پکھاوج اور مجیرے کے بول منہ سے بولتے نظر آ رہے ہیں محشر صاحب نے التزام یہ کیا ہے کہ ان چاروں مصرعوں میں ہندی کے مخلوط حروف کھ، چھ، جھ سے بننے والے لفظ استعمال کیے ہیں۔ کھنکے، چھنکے، اور جھنکے کے الفاظ میں کھ، چھ، جھ کی آوازیں مجیرے کی آوازوں کو ظاہر کرتی ہیں اور دھانوں اور پکھاوج کے الفاظ میں واقعی پکھاوج کی گمک سنائی دیتی ہے۔ اب یہ رباعی پھر سماعت فرمایئے اور محشر صاحب کو حقیقی اور دلی داد دیجئے۔

موسل دھمکے ہر ایک چوڑی کھنکے
دانوں کو سمیٹنے میں پایل چھنکے
دھانوں کی کٹائی کا ترنم، توبہ
جس طرح پکھاوج پہ مجیرا جھنکے

کسی نے اہلِ دل کے متعلق کہا ہے۔

ہر آواز دولاب مستی کنند

محشر صاحب کی روح موسیقی کے زیر و بم کو بظاہر موسیقی سے غیر متعلق آوازوں میں کس طرح ڈھونڈ نکالتی ہے اس کا مزید ثبوت اس رباعی سے ملتا ہے:

گت بلند ہے ہوئے چھاج تھپکتی جائے
بانہوں کی ہر اک چوڑی کھنکتی جائے
کھڑتال کے ساتھ بج رہی ہے ڈھولک
گوری بیٹھی چنے پھٹکتی جائے

ملاحظہ فرمایئے کہ اس رباعی میں کتنے الفاظ ہیں جو کھڑتال اور ڈھولک کی آوازیں پیدا کر رہے ہیں، بلند، چھاج، تھپکتی، کھڑتال، ڈھولک، بیٹھی، پھٹکتی۔ چھاج پر جب چنے اچھل اچھل کر گرتے ہیں اور ان سے جو موسیقیت پیدا ہوتی ہے اس کو صرف ایک شاعر ہی محسوس کر سکتا ہے۔ الفاظ سے موسیقیت پیدا کرنا ایک بڑا نازک فن ہے۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ یہ الفاظ بے ہنگم اور مصنوعی طور پر ہی ایک جگہ اکٹھے نہ کر دیئے جائیں بلکہ شعر کے لطف اثر میں ممد و معاون بھی ہوں۔ اس جگہ مجھے حضرت امیر خسرو کی ایک رباعی یاد آتی ہے اس میں آپ نے ستار کے بول نہایت استادی اور مہارت کے ساتھ اور لطف یہ ہے کہ بامعنی طور پر نظم فرمائے ہیں۔ فرماتے ہیں:

آں روز کہ روح پاک آدم بہ بدن
گفتہ در آ، نمی شد از ترس بدن

خوانند ملائکہ بہ لحن داؤد
در تن در تن در آ در آ در تن در تن

الھڑ جوانی کی ایک توبہ شکن ادا ملاحظہ فرمائیے :

پاتی جو بھرے نغمہ کناں ہو جائے
بوڑھوں کی نظر نظر جواں ہو جائے
چبھ جائے جو خار لاتے لاتے گاگر
تلوے کی طرف دیکھے گماں ہو جائے

شریر و شوخ گوری کسی دوسرے کے کھیت میں چوری سے گھس گئی ہے اور غالباً اپنی گائے کے لیے گھاس اکٹھی کر رہی ہے۔ چوری کرتی جاتی ہے۔ اور اس کے انجام سے ڈرتی جاتی ہے۔ بار بار چونک پڑتی ہے، کس طرح؛ محشر صاحب سے سنیے :

ڈر ڈر کے چلے قدم بھی دھرتے چونکے
سن لے جو کسی کو بات کرتے چونکے
چوری چھپے یوں گھاس اکھاڑے گوری
ہرنی جس طرح چرتے چرتے چونکے

گاؤں میں کچی کٹیا ہے۔ اور یہی کٹیا گوری کے لیے تاج محل ہے۔ اپنے خوابوں کے اس تاج محل کو سجانے کے لیے گوری کے پاس زیادہ سے زیادہ اور کیا ہوگا۔ گیرو اور پینڈول۔ گوری انھیں سے اپنی کٹیا کو سجاتی ہے ان نقوش کے بارے میں محشر صاحب کی جو رائے ہے غالباً آپ سب کو اس سے اتفاق ہوگا!

آذر بھی اگر آئیں تو کیا کیا کترائیں
ہاں مانی و بہزاد بھی عش عش کر جائیں
گوری کی بنائی ہوئی کٹیا کے نقوش
دیکھیں تو الورا و اجنتا شرمائیں

آخر میں محشر صاحب کی چند رباعیاں بغیر تجزیے کے پیش کرتا ہوں :

آندھی میں لرزتی ہوئی بیلیں جیسے
ہم جولیں پانو ٹکتی کھیلیں جیسے
وہ دور مجھے دیکھ کے گوری بھاگی
ہرنی ڈر کے بھرے کلیلیں جیسے

چنری جو ہوا کی زد سے مڑتی جائے
مڑتی جائے دھنک سی جڑتی جائے
برسات میں یوں پینگ بڑھائے گوری
جس طرح پری فضا میں اڑتی جائے

بھوجن جو کبھی کھیت پہ لے کر آئے
تھریا کو اڑھنیا سے چھپاتی جائے
روٹی، بھاجی، مگر سلیقہ دیکھو
جیسے کوئی حور من و سلوائے لائے

دوشیزۂ نغمات کے گیسو چھو کے
جھونکے سے بہاروں میں چلے خوشبو کے
بھیڑوں کو چراتے ہیں وہ گاتی گوری
برسات میں جیسے کہیں کوئل کوکے

مٹکا جو نلا کے تو اکڑتی جائے
دھرتی بچھ بچھ کے پانو پڑتی جائے
ٹھہرے ہوئے تالاب میں پاتر جیسے
کھنچ کھنچ کے بڑھے اور سکڑتی جائے

مجھے یقین ہے کہ ان رباعیوں کو ملاحظہ فرما کر قارئین کی بھی وہی رائے ہوگی جو میری ہے کہ گوری نامہ اردو میں ایک قابل قدر اور اچھوتا اضافہ ہے۔ سنا ہے کہ یہ رباعیاں کتابی شکل میں اشاعت پذیر ہو رہی ہیں۔ اگر ایسا ہوا تو رام پور کی ادبی اہمیت پر گوری نامہ کی اشاعت سے ایک اور مہر تصدیق ثبت ہو جائے گی۔

(نوٹ، محشر عنایتی ۲۲ ستمبر ۱۹۷۶ء کو مرحوم ہو گئے یہ مضمون ان کی حیات میں لکھا گیا تھا)

تیشۂ نظر
ابوالفیض سحر
کے خیال انگیز تنقیدی مضامین۔ مختلف ادبی مسائل پر
سیر حاصل بحث اور جدید شاعروں میں خورشید احمد جامی،
مخمور سعیدی اور بانی کے تفصیلی مطالعے۔
قیمت : آٹھ روپے
خرابہ
نظم و غزل کے صاحب طرز شاعر
من موہن تلخ
کا
تازہ ترین مجموعۂ کلام
قیمت : دس روپے
صریر خامہ
مظفر حنفی
کی
تازہ ترین غزلیں جن میں ان کے اسلوب کا تیکھا پن
عروج پر ہے۔
قیمت : چھ روپے
شہپر
حرمت الاکرام
کا
منتخب کلام
ایک سوچتے ہوئے متحرک ذہن کا شعری اظہار
قیمت : آٹھ روپے
نام بہ نام
رضا نقوی واہی
کے منظوم خطوط، ادیبوں، شاعروں اور دوسری اہم شخصیتوں کے نام۔
اُردو میں اپنی نوعیت کا پہلا شعری مجموعہ۔
مرتب : پریم گوپال متل
قیمت : چھ روپے
صحرا کی پیاس
شباب للت
کی
نظمیں، غزلیں اور گیت جن میں روایت کا حسن بھی ہے
اور فکر و خیال کی تازگی بھی۔
قیمت : چھ روپے
نیشنل اکاڈمی۔ ۹/۴ انصاری مارکیٹ۔ دریا گنج۔ دہلی

پگھلتا ہُوا لمحہ

روشن آرا نیّر

سیاہ بادلوں نے آن واحد میں سارے آسمان کو ڈھک لیا۔ اور اُس کے ساتھ ساتھ تیز ہوائیں بھی چلنے لگیں۔ گھنے جنگل میں ہواؤں کے ٹکرانے سے شور بڑھتا جا رہا تھا۔ یخ بستہ ہواؤں سے بچنے کے لیے میں گیسٹ ہاؤس کی جانب تقریباً دوڑ پڑا۔ پورٹیکو تک پہنچتے پہنچتے کچھ بوندیں بھی پڑ گئیں۔ چوکیدار نے دیکھتے ہی کہا "سلام صاحب!"

"سلام" میں نے سلام کا جواب دے کر سر میں پڑی بوندوں کو رومال سے خشک کرتے ہوئے پوچھا "کیوں رام سنگھ سب ٹھیک ہے؟"

"ہاں صاحب" اُس نے جواب دے کر کہا "کمرہ کھول دوں ـــ؟"

"ہاں"

پہاڑی پہ بارش تیزی سے ہو رہی تھی۔ گھنا جنگل بارش کی نیلگوں چادر میں چھپ سا گیا تھا۔ اگری کلچر فارم پہاڑی کے دامن کو کاٹ کر بنایا گیا تھا۔ آب و ہوا بہت اچھی تھی۔ دوبارہ قدموں کی آہٹ ہوئی تو میں نے کہا ـــ "مجھے بھوک لگی ہے رام سنگھ۔ جلدی سے کچھ بنا لو اور ہو سکے تو پہلے ایک کپ چائے پلا دو ـــ"

"جی ـــ"

رام سنگھ کی بجائے ایک نسوانی آواز جیسے ہی کان سے ٹکرائی میں بے اختیار چونک کر مڑا۔ سامنے نگاہ پڑتے ہی مجھے بے حد حیرت ہوئی۔ ایک نوجوان لڑکی سُرخ ساڑی میں ملبوس میری طرف دیکھ رہی تھی۔ بلاشبہ وہ حسین تھی۔

میری تیز نگاہ سے وہ شرما سی گئی تو مجھے اپنی بے باکی کا احساس ہوا۔ میں نے جلدی سے پوچھا "آپ؟"

"مجھے ریکھا شرما کہتے ہیں" اُس کی مترنم سی آواز اُبھری۔ وہ کہہ رہی تھی "سوپر وائزر کی حیثیت سے یہاں میری پوسٹنگ ہوئی ہے!"

اشٹاف میں اضافہ کرنے کی چھٹی تو آئی تھی۔ مگر کوئی لڑکی آئے گی اس کی توقع مجھے نہیں تھی۔ پھر بھی اُس کے آجانے سے مجھے عجیب سی مسرت ہوئی۔ اپنا تعارف کراتے ہوئے میں نے کہا "میں ایم۔ شاہی ہوں پراجکٹ آفیسر ـــ!"

"ـــــــ"

"آپ نے ڈگری کہاں سے لی؟" میں نے پوچھا۔

"بھاگلپور اگری کلچر کالج سے ـــ"

"ارے واہ ـــ" میں واقعی خوش ہو کر بولا ـــ "میں خود اِسی کالج کا پراڈکٹ ہوں۔ آپ رہنے والی کہاں کی ہیں ـــ؟"

"چھپرہ"

"بھاگلپور اور چھپرہ کے درمیان کوئی خاص دوری نہیں" میں نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا "اس لیے ہمارے درمیان علاقائی تضاد کا کوئی سوال ہی نہیں اُٹھتا۔ کیوں ٹھیک ہے نا ـــ؟"

میری بات پر ریکھا شرما ہنس پڑی۔ ہنستے سے اُس کے سفید موتیوں جیسے دانت چمک اُٹھے۔ سُرخ عارض اور

معرفت۔ محمد منیر حمید صاحب رانی گنج کرسی براجکٹ۔ پوسٹ امیری گنج۔ پورنیہ۔ بہار

بھی گہرے ہوگئے۔ سیاہ آنکھوں میں چمک آگئی تھی۔ رام سنگھ کے بھاری قدموں کی آواز پر ہم دونوں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ ٹرے لیے ہوا تھا۔ اور اس پر چائے کے ساتھ ساتھ ناشتے کی چیزیں بھی ہوئی تھیں۔ میں نے تعجب سے پوچھا ـــــ

"اتنا سارا سامان تم نے کہاں سے مہیا کر لیا ـــ؟"

"میم صاحب اپنے ساتھ لائی ہیں!"

"میم صاحب ـــ" میں نے ریکھا شرما کی جانب دیکھا جو رام سنگھ کے جملے سے شرما گئی تھی۔ وہ جلدی سے بولی ـــ "ماں نے ساتھ لگا دیا تھا ـــ"

اور میں زیرِ لب مسکرا کر رہ گیا۔

ریکھا شرما کے لیے گیسٹ ہاؤس محفوظ نہیں تھا۔ اس کی رہائش کا انتظام گاؤں میں مکھیا جی کے یہاں کرنا پڑا۔ وہاں اُسے تحفظ کے ساتھ ساتھ ہر شئے کی سہولت تھی۔ مکھیا جی کا خاندان چھوٹا تھا اور بذاتِ خود وہ بے حد شریف انسان تھے۔ ریکھا شرما روز گاؤں سے آفس آتی اور شام ہونے کے قبل چلی جاتی تھی۔ ریکھا بہت دلچسپ ثابت ہو رہی تھی۔ وہ ایک سیدھی سادی اور محنت پسند لڑکی تھی۔ گاؤں والے اُس کی خوش اخلاقی سے بے حد متاثر تھے۔ حکومت کے بزنس کے سلسلے میں اس کا خلوص بہت سود مند ثابت ہو رہا تھا۔ اس کے علاوہ فارم کی فضا دھنک کے سات رنگوں میں بٹ گئی تھی۔ میں خود اپنے اندر تبدیلی محسوس کرنے لگا تھا۔ دن رات کی تنہائی کی بوریت نے ذہن کو چڑچڑا کر دیا تھا۔ اب جنس مخالف کی موجودگی سے جیسے ہوئے لمحے کھلتے جا رہے تھے شاید۔ وہ ذہین تھی اور ہر موضوع پر بہت سلجھے ڈھنگ سے باتیں کرتی تھی۔ میرے ساتھ اکثر وہ اُردو اور ہندی ادب کو لے کر اُلجھ پڑتی تھی۔ اُردو ادب کی خامیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالتی تھی۔ بہرحال وہ اپنی ذہانت اور حُسن سے مجھے متاثر کر چکی تھی۔ ہم دونوں سوالیہ نشان کی طرح ایک دوسرے کے مقابل کھڑے تھے۔ اور ریکھا میری فکر کی تاریک راہ میں جگنو بنی ہوئی تھی۔

میں آج صبح ہی سے بور ہو رہا تھا۔ شاید اس لیے بھی کہ چند دنوں سے ریکھا آفس نہیں آئی تھی ـــ اُس نے پہلے دن بیماری کی درخواست بھجوا دی تھی۔ اُس کی درخواست لے کر نوین آیا تھا۔ نوین مکھیا جی کا بڑا لڑکا تھا۔ وہ پٹنہ میڈیکل کالج کے فائنل ایر میں تھا۔ نوین ایک پُرکشش شخصیت کا مالک تھا۔ دوسرے کو فوراً متاثر کر لینے کی بہت بڑی خوبی اُس کے اندر تھی۔ گاؤں آتا تو وقت کا زیادہ تر حصّہ وہ میری صحبت میں گزارتا تھا۔ میں نے اُسے حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تم کب آئے نوین ـــ؟"

"تین چار دن ہوگئے ـــ" وہ بولا ـــ "آج ملیریا دور کر کے تم سے ملنے آیا ہوں ـــ!"

"وہ بھی کسی کی درخواست لے کر ـــ" میں نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

"ہاں ـــ" اُس نے میرا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا ـــ "کیسی لڑکی ہے یہ ریکھا ـــ؟"

"کیسی سے تمہارا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ ـــ" اُس نے ٹھہر ٹھہر کر پوچھا ـــ "اخلاق اور کردار ـــ؟"

"جہاں تک کردار اور اخلاق کا سوال ہے" میں نے کہا ـــ "بہت اچھی ہے۔ تم سے ملاقات ہوئی ـــ؟"

"ہاں ـــ کچھ دیر کے لئے ہم دونوں ملے تھے" وہ بولا اور پھر اُس نے پوچھا ـــ "اور بتاؤ کیسے گزر رہے تمہارے دن ـــ؟"

نوین نے بڑی خوبصورتی سے گفتگو کا رُخ موڑ دیا تھا۔ وہ جب تک میرے پاس رہا میں نے محسوس کیا کہ اُسے جانے کی جلدی ہے ـــ نوین کے جانے کے بعد میں بہت دیر تک سوچتا رہا ـــ اُس نے کچھ نہیں بتایا۔ مگر اُس کی جلد بازی اور ریکھا کے متعلق باتیں کرنے کے انداز سے میرے دل میں شک کی ایک پتلی سی دراڑ پڑ چکی تھی۔

شام ہونے میں کافی دیر تھی۔ میں برآمدہ میں کھڑا گاؤں جانے والی سڑک کو دیکھ رہا تھا۔ جو سیدھی گاؤں جاتی تھی

اور جس پر چل کر میں ریکھا کے پاس پہنچ سکتا تھا۔ مگر جانے کیوں میرا دل اُس کے پاس جانے کو نہیں چاہتا تھا۔ پھر بھی مجھے اُس کی عیادت کو جانا ہی چاہیئے تھا۔ ورنہ وہ میرے متعلق کوئی غلط رائے قائم کرے گی۔ میں کئی ایک روز سے اسی تذبذب میں تھا اور آخرکار ایک فیصلے کے تحت گاؤں جانے والی سڑک پر ہو لیا۔ میں اپنے خیالوں میں اُلجھا چلا جا رہا تھا کہ رستے میں ریکھا مل گئی۔ اس وقت وہ آسمانی رنگ کی ساڑی اور بلاؤز میں تھی۔ زلفیں لہرا رہی تھیں۔ ریکھا نے رک کر کہا —— "گاؤں جا رہے تھے —— ؟"

"ہاں —— میں آپ کی مزاج پرسی کے لیے جا رہا تھا" —— اُس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے پوچھا —— "اب طبیعت کیسی ہے ؟"

"بالکل ٹھیک ہوں ——"

"آپ شاید فارم جا رہی تھیں —— ؟"

"جی ہاں ——!"

"کیا جانا ضروری ہے —— ؟"

"ایسا ضروری بھی نہیں —— !"

"تو چلیے ——"

"کہاں —— ؟"

"وہ دیکھیے ——!" میں نے پہاڑ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا —— "وہاں دُور سے گرتا ہوا جھرنا ایک عجیب سا ماحول پیش کرتا ہے !"

ریکھا نے ایک بار میری طرف دیکھا اور بولی۔ —— "چلیے ——"

"شکریہ —— لیکن آپ کو اکیلے پن سے وحشت محسوس ہو گا ؟"

"مجھے اپنے آپ پر اعتماد ہے ——" وہ سنجیدگی سے بولی اور مسکرا کر کہنے لگی —— "اور آپ جو ساتھ ہیں۔ پھر ڈر کیسا ؟"

سورج غروب نہیں ہوا تھا۔ جنگل کے سایہ دار درختوں کی شاخوں میں کرنیں اُلجھ رہی تھیں۔ راستے میں ریکھا قدرتی مناظر کو دیکھ کر کچھ نہ کچھ کہتی جا رہی تھی۔ لیکن اس وقت میرے ذہن میں جانے کیوں رہ رہ کر نوین کی شکل اُبھر رہی تھی۔ آخرکار میں نے پوچھ ہی لیا —— "نوین کہاں ہے ؟"

"وہ اپنے کسی دوست سے ملنے شہر گئے ہیں —— !"

"بہت دلچسپ آدمی ہے ——" اُسے مشتاق نگاہوں سے دیکھتے ہوئے میں نے کہا —— "بہت جلد انسان کو اپنی طرف مائل کر لیتا ہے !"

"ہاں ! بہت ہنساتے ہیں ——" ریکھا کا چہرہ نوین کے تذکرے سے گلابی ہو گیا۔ اور وہ مسرت سے بولی —— "اُن کی گفتگو بڑی متاثر کن ہوتی ہے —— !"

میری نگاہوں میں یکایک نوین اور ریکھا کی تصویریں آئیں اور آپس میں مدغم ہو گئیں۔ جب ہم پہاڑی پر پہنچے تو وہ بولی —— "سچ مچ یہ تین پہاڑیاں تین ہمزاد بہنوں کی طرح سرگوشیاں کرتی لگتی ہیں۔ یہ پھیلا ہوا جنگل اور ان میں کھلے رنگ برنگ کے پھول ان کے دامن کو کتنا دیدہ زیب بنائے ہوئے ہیں ——"

"جی ہاں —— یہ حقیقت ہے" میں نے کہا —— "صنفِ نازک کی وجہ سے ہر شئے پر دلفریب نکھار آ ہی جاتا ہے !"

ریکھا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس کی آنکھوں میں بچے کی طرح مسرت رقص کر رہی تھی۔ جھرنے کو دیکھتے ہی وہ خوشی سے بولی —— "آہا کتنا سُندر ہے !"

"اور اس کی منظرکشی میں ——" میں بولا —— "آپ کے حسن کا ذکر رہ جائے تو پھر یہ کچھ بھی نہیں ——"

پہلی بار میں نے اُس کے حُسن کی تعریف اُس کے سامنے کی تھی۔ اُسے کچھ تعجب ہوا۔ پھر وہ زور سے ہنس پڑی۔ اور اُس کی ہنسی اُچھلتے، شور کرتے۔ پتھروں سے ٹکراتے پانی کی لہروں میں گم ہو گئی۔

میں ایک پتھریلی چٹان کی ننگی سطح پر لیٹا ہوا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ اب میرے پاس ریکھا کو کہنے کے لیے بھی کچھ نہیں تھا۔ اور جو کچھ کہنا چاہتا تھا اُس کی ہمت نہیں تھی۔

ریکھا کے ساتھ اس جگہ اس لیے آیا تھا کہ اُسے بتاؤں کہ میرے دل میں بھی پیار کا ایک ایسا ہی آبشار پھوٹ رہا ہے —— مگر اب یہ فضول سی بات ہوتی —— ریکھا کچھ دور تیزی سے جھرنے کو ایک ٹک دیکھ رہی تھی۔ وہ خاموش کیوں ہو گئی۔ کہیں اُسے یہاں لا کر میں نے اُس کی انا کو ٹھیس تو نہیں پہنچائی۔ کیا وہ اس مقام پر میرے ساتھ آنا نہیں چاہتی تھی؟ بہت سارے سوال میرے ذہن میں اُبھرے تو میں نے جھرنے کے شور سے بلند آواز میں پوچھا —— "آپ خاموش کیوں ہیں؟"

میری آواز پر وہ چونک پڑی۔ اس وقت اُس کے چہرے پر کافی بھولا پن تھا۔ اُس نے مسکراتے ہوئے زور سے کہا —"میں دراصل ایسے مقام پر پہلی بار آئی ہوں۔ اور کون ہے جو اس دلفریب منظر کو دیکھ کر مبہوت نہ رہ جائے؟!"

ریکھا میں ایک سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ عام لڑکیوں کی طرح بکواس کی عادی نہیں تھی۔ مختصر سے جملے میں مقصد کی ساری باتیں کہہ ڈالتی تھی۔ میں نے پوچھا —"ہمارے سماج کی عورتیں بہت کم نوکری کرتی ہیں —— اور جو نوکری کرتی ہیں اُن کا کوئی خاص نظریہ ہوتا ہے؟"

"زمانہ بدل رہا ہے —— اب عورتیں کسی بھی کمپیٹیشن میں مردوں سے پیچھے رہنا نہیں چاہتیں ——" وہ ہنس کر بولی۔ اور پھر سنجیدہ ہو کر کہنے لگی —— "لیکن میں کسی مقابلے کی ضد میں نہیں۔ بلکہ میں ایک غریب لڑکی ہوں۔ اور اس دنیا میں پیسے کی اہمیت بھگوان سے بڑھ کر ہے —— ایسی حیا سے کیا حاصل جس سے انسان قدم قدم پر ٹھوکریں کھائے اور اُس کی خود اعتمادی مجروح ہوتی رہے —— !"

ریکھا نے بغیر کسی جھجک کے وضاحت کے ساتھ اپنی مجبوریوں کو میرے سامنے کھول کر رکھ دیا تھا۔ اُس کے لیے میرے دل میں اور بھی احترام جاگ اٹھا۔ میں نے کہا —"ریکھا جی —— آپ کے اندر خلوص کا آبشار ہے —— خدا ہمیشہ آپ کو خوش رکھے!"

"شکریہ ——" اُس نے کہا اور قریب ہی سے ایک جنگلی پھول توڑ کر میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی —"لیجیے!"

"ٹھیک ہے ——" اُس کے ہاتھ سے پھول لیتے ہوئے میں نے کہا۔ پھول کا رنگ سفید تھا۔ اس میں کوئی خوبصورتی نہیں تھی۔ لیکن اس وقت وہ معمولی سا پھول مجھے دنیا کے سارے پھولوں سے حسین لگا۔ اور ہم دونوں واپس چلے آئے۔ وہ گاؤں چلی گئی اور میں دیر تک اُس کے تحفے کو لیے سنسان راستے کو دیکھتا رہا ——

ریکھا کا زیادہ تر وقت نوین کے ساتھ گزرتا تھا۔ اس بار نوین بہت دنوں تک رک گیا تھا۔ شاید ریکھا کی وجہ سے۔ اب اُن دونوں کا پریم ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ ہر شخص جانتا تھا کہ ریکھا بہت جلد نوین کی ہو جائے گی۔ ریکھا اس رشتے سے بہت خوش تھی۔ لیکن میرا دل اس رشتے سے خوش نہیں تھا۔ دل کے اندر اٹھنے والے وسوسوں سے محسوس ہوتا تھا کہ ریکھا میری عزیز ترین شے ہے۔ ہم دونوں سمندر کے دو کنارے تھے۔ اور دونوں کے درمیان ناممکن کا طویل فاصلہ تھا۔ میرا افسانوی ذہن جمالیاتی حس کے ساتھ حرفِ غلط کی طرح مٹتا جا رہا تھا۔ میں تنقیدی نگاہوں سے اپنی خود اعتمادی کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ لیکن میری خود اعتمادی پارے کی طرح آزاد تھی۔ میں اُف کیے بغیر انگاروں میں جل رہا تھا۔ اور یہ سوچ رہا تھا کہ کیا ریکھا کو بھگوان نے نوین ہی کے لیے اس مقام پر بھیجا تھا؟

سُرمئی شام کا عکس گھنے جنگل اور پہاڑوں پر پھیلتا جا رہا تھا۔ میں اس وقت برآمدے میں بیٹھا ریکھا ہی کے متعلق سوچ رہا تھا۔ جو اب چند دنوں کے اندر نوین کی ہونے والی تھی۔ گیسٹ ہاؤس کے لان میں رنگ برنگ کے پھولوں کو دیکھ کر میرے اندر سکون کے بجائے بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک ہلکی سی آہٹ پر میں چونک پڑا۔ میرے پیچھے نیم تاریکی میں ریکھا کھڑی تھی۔ شاید وہ پیچھے کے راستے سے آئی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں انگیٹھی تھی۔ میں نے تعجب سے پوچھا —"ریکھا —— تم اس وقت؟"

وہ کچھ بولی نہیں۔ خاموشی سے تاریکی کو گھورتی رہی۔ میں نے لیمپ روشن کرنے کے لیے رام سنگھ کو آواز دی۔

جب روشنی ہوئی تو مجھے اُس وقت ریکھا عجیب سی لگی۔ اُس کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ اور زلفیں بے ترتیب تھیں۔ آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ [illegible] وحشت [illegible] تھی شاید معلوم تھی۔ حسن سوگوار [illegible] ہو گیا۔ میں نے جلدی سے پوچھا — "ریکھا کیا بات ہے۔ تم خاموش کیوں ہو؟"

"میں یہاں سے جا رہی ہوں —" اُس نے کھو کھلی آواز میں کہا۔

"کہاں —؟"

"گھر —!"

"مگر — کیوں —؟"

"کیونکہ —" وہ بولی — "میری حیثیت اب ایک ٹوٹے ہوئے کھلونے کی طرح ہے!"

ریکھا نے ساری بات کہہ دی تھی۔ دنیا کی ہر لڑکی برباد ہونے کے بعد یہی کہتی اور سوچتی ہے۔ مگر نوین اتنا کمینہ ہو سکتا ہے۔ یہ تو میرے وہم میں بھی نہیں تھا۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ آج کی نسل ان آدرشوں کو نہیں مانتی —

"میں نوین کو اس کا دوش نہیں دیتی —" ریکھا نے کہنا شروع کیا — "اس میں سارا قصور میرا ہے — مجھے آگ سے بچ کر رہنا چاہیے تھا۔ میں آگ کو پھول سمجھ گئی —!"

یہ جملے ہزاروں بار دہرائے گئے تھے — ان کی صداقت بھر چکی تھی۔ لیکن مجھے ریکھا سے دلی ہمدردی تھی۔ میں نے کہا "— تم گھبراتی کیوں ہو — نوین تم سے شادی کرے گا۔ میں ابھی اس کے پاس جاتا ہوں اور اُس کے پتا سے —"

"نہیں —" وہ میری بات مکمل ہونے کے قبل چیخ پڑی اور بولی — "میں اب اُس ذلیل انسان سے بیاہ کرنے کے بجائے مر جانا بہتر سمجھوں گی —!"

ریکھا جیسی معصوم لڑکی کے ساتھ نوین نے جو ہوس کی پیاس بجھائی تھی اس سے ریکھا کے اعتماد کو زبردست ٹھیس پہنچی تھی۔ وہ بہت زیادہ [illegible] کے معاملے میں عورت تھی [illegible] —

پیار کرنا تو ایک پیدائشی حق ہے اور اب ہوس پرستی جرم نہیں، سماج کا فیشن بن چکی ہے۔ پھر چند دنوں کے بعد وہ اس کا شوہر ہونے والا ہے — ایسے میں کیا اُسے قصوروار کہنا جائز ہوگا؟

"لیکن —" میں نے کہا — "چند دنوں کے بعد وہ تمہارا پتی ہونے والا ہے۔"

"پتی —" وہ حقارت سے بولی — "ہوس پرست انسان۔ ایک تو مجھے برباد کیا اور پھر باتاں ردکہا —" اور وہ جملہ پورا کیے بغیر سسک کر رو پڑی —

ہم دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش تھے۔ آج ایک طویل مدت کے بعد ریکھا میرے ساتھ تھی۔ ریکھا کو ایسی حالت میں دیکھ کر نفرت کے بجائے میرے اندر ہمدردی پیدا ہو رہی تھی۔ ہم نفسیاتی طور پر من پسند چیز کو ہر حالت میں اپنانے کے لیے بے چین رہتے ہیں — یہ سچ ہے کہ میں ریکھا سے شدید محبت کرتا تھا۔ لیکن کبھی اپنی محبت کا احساس اُسے ہونے نہیں دیا۔ اس لیے کہ محبت غرض کا ڈھول نہیں تھی۔ میں نے پوچھا — "تو تم جانا چاہتی ہو —؟"

"ہاں —"

"لیکن کیوں —" میں نے اُس کے قریب جا کر اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا — "جسم کے کسی حصے پر گندگی لگ جاتی ہے تو ہمیں کتنی کراہیت محسوس ہوتی ہے۔ اور جب تک اُسے صاف نہیں کر لیتے ذہن پر ایک بوجھ سا رہتا ہے۔ یہ ایک نفسیاتی گتھی ہے۔ ذہن پر کوئی بوجھ نہیں ہوتا — تم سے کوئی بھول نہیں ہوئی۔ تم پوتر ہو —!"

"میں کیسے سمجھوں کہ میں پوتر ہوں —" ریکھا غصے سے بولی — "مجھے جھوٹی تسلی نہ دیں۔ اِس سے مجھے سخت نفرت ہے —!"

"یہ جھوٹی تسلی نہیں ریکھا" — میں نے اپنی آواز پر زور دے کر کہا — "تم میرے لیے ویسی ہی پوتر ہو جیسی کہ پہلے تھیں — اور [illegible] — میں تم سے شادی [illegible] چاہتا ہوں —"

"آپ —"

(باقی صفحہ ۱۶۱ پر)

آپ کی معلومات میں اضافہ کرنے والی بہترین کتابیں

کتاب	مصنف	قیمت
تین انقلاب	فریڈرک جینٹز	۰/۷۵ روپے
چین میں اسلام کا ماضی اور حال	——	۰/۴۰ ،،
ٹریڈ یونین کے بنیادی اصول	وکٹر فیدر	۱/۰۰ ،،
جمہوری انقلاب	برائن ماگی	۱/۰۰ ،،
روس کے انقلاب	ڈیوڈ فٹ مین	۱/۰۰ ،،
جمہوری سوشلزم	کاملس ریڈس	۱/۰۰ ،،
ٹریڈ یونینیں ــــ ان کا جائز اور ناجائز استعمال	آرتھر باٹرلی	۰/۵۰ ،،
ببول کے پیڑ	(ایک آپ بیتی)	۰/۵۰ ،،
دو انقلاب	آر۔ ایچ بروس لاک ہارٹ	۱/۰۰ ،،
سوویٹ سفارت خانے میں	الیگزینڈر کزنا چیف	۲/۰۰ ،،
آج کا مارکسزم	رابرٹ کنکوئسٹ	۰/۷۵ ،،
آج کا چین	ڈاکٹر ایس چندر شیکھر	۱/۰۰ ،،
روسی انقلاب کی کامیابیاں	ڈاکٹر جان کیپ	۰/۵۰ ،،
ایک روسی سائنسداں کے تجربات سرخ چین میں	مائیکل کلوچکو	۱/۰۰ ،،
ادیب اور کمیسار	مرتبہ جارج پلوکوی	۱/۰۰ ،،
چین کا بدلتا سماج	چو چائی اور ون برگ چائی	۱/۰۰ ،،
کمیونزم اور نوآبادیت	وکٹر کوررز	۱/۰۰ ،،
کمیونزم اور زراعت	لارڈ واسٹن	۰/۷۵ ،،
پُرامن حملہ	ڈوگلس ہائڈ	۱/۰۰ ،،
خوش حالی کی تلاش	برائن کروزیر	۰/۵۰ ،،
پتھر کے دیوتا (چھ آپ بیتیاں)	مترجم، گوپال متل	۱/۰۰ ،،
اتحاد ــــ ہماری ہار	ڈوگلس ہائڈ	۱/۰۰ ،،
تعلیم کی کھوج	——	۰/۷۵ ،،

شاہد کلیم | دو نظمیں

مناجات

صحنِ معبد کے ایک ایک پتھر پہ
میری جبیں کے اُگ گئے ہیں نقوش
ہر اذاں کی صدا پہ مرے پائوں
معبد کی جانب ہوئے ہیں رواں اب تلک
میرے دروازے پر کچھ دنوں سے
اذانِ سحر دستکیں دے کے واپس چلی جا رہی ہے
کہ آغوش میں رات کی ٹوٹ جاتا ہوں میں
اپنے ہی جسم کے خون میں ڈوب جاتا ہوں میں
میرے مالک!
مرے اچھے رب!!
مجھ کو دوزخ میں مت پھینکنا
صحنِ معبد کے ایک ایک پتھر پہ
میری جبیں کے اُگے ہیں نقوش

●●

آخری فیصلہ

ریت پر نقشِ پا
اب اُگانا نہیں ہے ——
کسی بھی سمے
گہرے کالے سمندر میں
کھو جائے گی یہ
کہاں کوئی ایسا نشاں ہے
کہاں کوئی ایسی علامت؟
گواہی جو اپنی مسافت کی دے
ریت پر نقشِ پا
اب اُگانا نہیں ہے

●●

سنٹرل ایکسائز آفس، گیا۔ (بہار)

حمید سہروردی

نثری نظمیں

منظر

یوں آنکھ پھری
پھر منظر بدلے
یعنی
سب پھول بکھریں
خاک ہوا
کیوں پاک ہوا
پھر آنکھ پھری
کلینڈر پہ جمی رہی
کعبہ یوں آنکھوں میں اُترا
شریر کے انگ انگ میں
جیسے
تقدیس کی بجلی دوڑی
رشتے ناتے خوب جچے
پھر دونوں آنکھیں بند ہوئیں
یعنی
بند آنکھوں نے دیکھا
آسمانوں کے اوپر ہی اوپر
تیرا میرا رشتہ ہے
پھر آنکھ کھلی
بنجر اور پتھریلی زمیں
اوبڑ کھابڑ راستے ہیں
پھر آنکھ پھری
اور
منظر بدلا

چہرہ

بند کمرہ میں آنکھیں
آنکھوں میں منظر
منظر میں ہے
بوسیدہ بستر
بستر میں ہلکا سا نشتر
خوابوں کے چہروں پہ خاکستر
نازک ہے چہرہ
مژگاں پہ برسات کا ہے بسیرا
کوئی تو پہچانے اس کو
چہرہ ہے کس کا
تیرا یا میرا
بند کمرہ میں چہرہ
بوسیدہ بستر پہ نشتر
اور
خیال مکمل

صدر شعبۂ اُردو نوگن کالج بیہٹر ۴۳۱۲۳

غزلیں

طاہر تلہری

چٹک گیا جو کوئی زخمِ دل کلی کی طرح
مہک اٹھا یہ خرابہ تری گلی کی طرح

لہولہان بدن زخم زخم احساسات
رواں دواں ہے بشر بیسویں صدی کی طرح

ہے قلب و روح پہ طاری مہیب سناٹا
سکوتِ شام ہے مرگھٹ کی خامشی کی طرح

یہاں جہاں بھی گئے ہم پہ انگلیاں اٹھیں
ہر اک گلی نظر آئی تری گلی کی طرح

سے بدن کی حرارت ہے میری یادوں میں
جھلس رہا ہوں کسی دشتِ تشنگی کی طرح

الٹ دی جائے گی اک روز یا الیقیں طاہر
یہ کائنات ہے ردی کی ٹوکری کی طرح

مہدی پرتابگڈھی

سنگ کی طرح نہ مجھ کو ٹھکراؤ
پھول ہوں سینۂ گیتی پہ سجاؤ

چہرے تک آئے نہ سینے کا دھواں
دل سے یہ درد کا احساس مٹاؤ

منصبِ حق سے ہٹا دے نہ مجھے
میرے احساس و عمل کا ٹکراؤ

منتظر کیوں ہو کسی سورج کے
کچھ دیئے اپنے لہو سے ہی جلاؤ

بھول کر عہدِ وفا یاد نہیں
ہاں مری سمت ہے کانٹوں کا جھکاؤ

خود تماشائی تماشا نہ بنے
تیز ہے اب کے سمندر کا کٹاؤ

ان دنوں تیز بہت ہے مہدی
فکر و احساس کے دریا کا بہاؤ

شید ادھمانی

جب تک مجھے وہ چھوڑ کے تنہا گیا نہ تھا
پیپل کی شاخ سے کوئی پتہ گرا نہ تھا

نوخیز لڑکیوں نے مسافر سمجھ لیا
میرے لیے تو گاؤں کا چہرا نیا نہ تھا

نکلا قطار سے تو بنا ایک مسئلہ
جب تک قطار میں تھا کوئی پوچھتا نہ تھا

آخر تری گلی سے گزرنا پڑا مجھے
اس راستے سے ہٹ کے کوئی راستہ نہ تھا

چاہا تجھے تو ہو گیا مشہور شہر میں
شیدا کو ورنہ پہلے کوئی جانتا نہ تھا

[illegible]

غزلیں

ست نام سنگھ خمار

آنکھوں سے جھلکتی ہیں لمحات کی تصویریں
چہروں کی لکیروں میں حالات کی تصویریں

یہ قافلے خوشبو کے اٹھ جائیں گے سستا کر
رہ جائیں گی نظروں میں باغات کی تصویریں

الفاظ کے خاکوں میں کچھ رنگ بھر و یارو
جذبات سے خالی ہیں جذبات کی تصویریں

تاریک منڈیروں پر کچھ اشک جلائے ہیں
مقصود ہیں خوشیوں کی بارات کی تصویریں

سورج تو نکل آیا لیکن ابھی ملتی ہیں
کرنوں کے تبسم میں ظلمات کی تصویریں

لگتا ہے خمار اب بھی ہم برف کے تودوں میں
چپ چاپ سلگتی ہیں جذبات کی تصویریں

▲▲

ساحل سلطان پوری

بام و محراب و در سا گرتا ہے
روز خوابوں میں گھر سا گرتا ہے

تیز آندھی صدائیں دیتی ہے
دور جیسے شجر سا گرتا ہے

یہ سیہ رات یہ تری آنکھیں
دل پہ رنگِ سحر سا گرتا ہے

شاخ در شاخ آگ روشن ہے
ابر تر سے شرر سا گرتا ہے

دامنوں کے نصیب جاگے ہیں
چشم نم سے گہر سا گرتا ہے

خشک شاخوں سے موسمِ گل میں
رنگِ رفتہ ثمر سا گرتا ہے

▲▲

وجیہہ ادیب

وقت نے پھینکے مری راہ میں پتھر کتنے
یہ نہ دیکھا مرے پیچھے ہیں سکندر کتنے

کل بزرگوں کے بیانات تھے کتنے سادہ!
آج ہر لفظ کے پہلو میں ہیں دفتر کتنے

مجھ سے آوارہ مسافر نے ہی احساں نہ لیا
یوں تو ہر موڑ پہ تھے خیر سے رہبر کتنے

لاکھ اک جسم پہ دو چہرے لگائے کوئی
دیکھنا یہ ہے یہاں ملتے ہیں ہمسر کتنے

بے گھری کا مجھے اپنی نہ رہے گا شکوہ
جب یہ سوچوں گا کہ دنیا میں ہیں بے گھر کتنے

▲▲

○ ہیڈ ڈیپارٹمنٹ آف سائیکلوجی ویش کالج - بھوانی ہریانہ ○ ہاشم منزل، سول لائن، سلطانپور ○ بچھرالیوں، مراد آباد - یوپی

نُوراں

دلیپ راج ڈوگرا
ساغر پالمپوری

مٹکا اُتار کر اُس نے آگ جلائی اور دُودھ کا پتیلہ چُولھے پر رکھ دیا۔ اپنے یخ بستہ ہاتھوں کو آگ پر سینکتے ہوئے اُس کی نظر سامنے پڑے صبح کے جُوٹھے برتنوں کے ڈھیر پر پڑی۔ اُسے انتہائی کوفت کا احساس ہوا۔ وہ دِل ہی دِل میں اپنی بوڑھی ساس کو کوسنے لگی۔ موئی بڑھیا اتنا بھی نہیں کر سکتی! سارا دن مویشیوں کی چاکری۔ گوبر اُٹھاؤ! گھاس ڈالو! پانی پلاؤ! پھر ان کے پیچھے دن بھر دوڑتے پھرو کہ کہیں ڈھلوان سے نہ گر پڑیں۔ پھر شام کو گھر لوٹ کر وہی قضیہ۔ کوٹھے کے دوسرے کونے میں سورمے کی بہو اپنے بچے کو استنجا کروا رہی تھی۔ نُوراں نے اُس سے پوچھا "میری ساس کہاں گئی؟"

"شونی شت گاؤں سے مکھن آیا تھا۔ کہتا تھا۔ میری گھر والی سخت بیمار ہے۔ بُوا! چل کر اُسے سنبھال لو! تیری ساس نے تو نہیں، مکھن نے ہی کہا تھا کہ نُوراں سے کہہ دینا کہ آج بُوا کا لوٹنا مشکل ہے"۔ سُورمے کی بہو نے بتایا۔

ابھی قاسم بھی نہیں لوٹا۔ صبح ہی بھدرواہ کو اناج لینے گیا تھا۔ کہتا تھا کہ دوپہر تک لوٹ آئے گا۔ لیکن اُس کا کیا بھروسہ؟ کہیں پھر بھیلیس گاؤں نہ جا پہنچا ہو۔ کہتا تھا وہاں میاں کے ساتھ اُس کی دوستی ہے۔ اور وہاں میاں کی لڑکی شینا جو ہے! اسی کے ساتھ میٹھی میٹھی باتیں کر رہا ہوگا۔ پچھلی بار جو وہاں سے آیا تھا تو کہتا تھا۔ بہت ہی اچھی ہے میاں کی بیٹی کہتی تھی اگلی بار بھابی کو بھی ساتھ لانا! موئی نند بنتی ہے! بے شرم!

اسی ادھیڑبن میں اُس نے پتیلہ جو زور سے پھینکا تو وہ اُچھل کر نیچے نالے کے دھارے میں بہہ گیا۔ نیچے بہت بڑا آبشار تھا۔ پتیلے کا کہیں پتہ تک نہ تھا۔ وہ ہانپتی ہوئی ذرا دم لینے بیٹھی۔ سامنے دیکھا تو لگا جیسے میدان میں کھڑی بھینسیں سر اُٹھا کر اس کا تماشہ دیکھ رہی ہوں۔

دُور نالے کے اُس پار دیواروں کے جھُرمٹ سے دو گوجر گوجری نکلے۔ سر پر پتیلے اور ہاتھوں میں ڈنڈے لیے ہوئے۔ وہ ٹھٹھکی۔ کہیں قاسم اور شینا تو نہیں ہیں! اُس کے اندر ایک کوندا سا لپکا۔ لیکن جب وہ دونوں نزدیک آئے تو پتہ چلا کہ یہ تو گلّو کی منڈی کے حسینا اور رپیارو ہیں۔ یہ بھی اناج لینے بھدرواہ گئے ہوئے تھے نُوراں نے اُن سے پوچھا "وہ نہیں ملا؟"

"ملا تو تھا۔ ہمارے ساتھ ہی لوٹا تھا لیکن راستے میں بھال بدہیری گاؤں میں رُک گیا۔ کہتا تھا کہ بہن کے گھر جانا ہے۔ کل صبح گھر پہنچے گا۔"

سُن کر نُوراں کے کلیجے میں ہوک سی اُٹھی اور من ہی من میں بڑبڑائی ——— بہن کے گھر کہاں گیا ہوگا۔ وہ جا پہنچا بھیلیس گاؤں مُوا! نہ مُجھے ہی چھوڑتا ہے نہ اُسے ہی لاتا ہے!

جھٹ پٹ سارے برتن وہ پرات میں ڈال کر کوٹھے کے اندر چلی گئی۔ دُودھ پتیلے میں اُبل کر آگ میں گر رہا تھا۔ گیلی لکڑیوں کا دھواں کوٹھے میں چاروں طرف پھیل گیا۔ ایسا ہی دھواں اُس کے دل میں بھی تھا۔ وہ کوٹھے سے باہر نکل گئی ———

ساغر پالمپوری - اشوک لاج، مرانڈا، ہماچل

سورج غروب ہو چکا تھا۔ لیکن اُس کی سُرخی سامنے سیا پہاڑی کے گھنے جنگل کے اوپر پھیلے ہوئے سیاہ بادلوں میں مل کر رنگ برنگی تصویریں بنا رہی تھی۔ گھاٹیوں کی ہریالی بھی اس کے عکس سے کھدرنگی سی ہو گئی تھی۔ لیکن نُوراں کے پاس ان مناظر سے لطف اندوز ہونے کے لیے وقت ہی کہاں تھا؟ وہ ایک مشین کی طرح بڑھی اور اُس نے بھینسوں کے کٹّے اور کٹیوں کو پکڑ کر اندر کھونٹوں سے باندھا اور بھینسوں کو دیوار کے جنگل میں چرنے کے لیے کھدیڑ دیا۔

پڑوس کے ڈیرے والی فرزاں نے اُس کی بھری بھری آنکھوں کو دیکھا اور اُسے جلدی جلدی کام کرتے دیکھ کر پوچھا "کیا بات ہے بہن؟ آج تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ قاسم نہیں لوٹا؟" ___ نُوراں نے کوئی جواب نہ دیا اور کٹھے میں گھس گئی۔

شورے کی گھروالی جو توے پر مکئی کے بڑے بڑے ٹکڑ پکا رہی تھی۔ نُوراں کو دیکھتے ہی بولی "آج تو اکیلی ہے۔ وہ ٹکڑ میرے ساتھ ہی کھا لینا" لیکن نوراں نے یہ بھی نہ سنا۔ اپنی اوڑھنی ایک طرف پھینکی اور تلائی چارپائی پر پھینک کر کمبل اوڑھ کر پڑ گئی۔

چولہے میں آگ بجھ چکی تھی۔ دودھ کے پتیلے میں بالائی کی موٹی تہہ جم گئی تھی۔ دوسری طرف تقیرے گوجر کی لڑکی اور لڑکا مٹکے سے مکھن نکال کر کھا رہے تھے۔ اُس کے پاس ہی بوڑھا رمضانی آگ کے انگیٹھے کے ایک طرف نماز پڑھنے میں مشغول تھا۔ جمن اور رستی آگ تاپ رہے تھے۔

لیکن اُس کی آنکھوں میں نیند کہاں تھی؟ اُس کا دھیان قاسم سے ہٹ کر ماضی کی بھول بھلیاں میں کھو گیا۔

وہ پانچ برس کی ہی تھی کہ اُس کی منگنی ہو گئی تھی۔ دس برس کی ہوئی تو اُس کی ماں یہ سنسار چھوڑ گئی۔ کوئی بارہ برس کی ہوئی تو اپنے ماموں کے یہاں کھنڈی مراں گئی تھی۔ وہیں اُسے یوسف ملا تھا۔ کتنا پیارا تھا یوسف ___؟ دونوں جنگل میں اکٹھے بھینسیں چراتے تھے۔ سارا سارا دن ہری بھری گھاٹیوں میں اکٹھے کھیلتے تھے۔ بھینسوں کے تھن پکڑ پکڑ کر ایک دوسرے کے منہ میں دودھ کی دھاریں چھوڑتے تھے۔ لمبی لمبی ڈھلانوں پر سے نیچے کو لڑھکتے تھے۔ ایک بار چاندنی رات میں آنکھ مچولی کھیلتے دونوں پہلی ندی کے کنارے جا پہنچے تھے۔ یوسف نے اُسے سینے سے چمٹا کر کہا تھا "نُوراں! تیرے ساتھ بہت پیار ہو گیا ہے۔ تو میرا ساتھ نہ چھوڑ لو! کھاؤ دودھ کی قسم؟"

نُوراں کیا کہتی؟ اُس نے شرما کر حامی بھر دی تھی....

......ایک بار میدانوں کو جاتے جاتے وہ نیرا میں دونوں مل گئے تھے۔ نُوراں جنگل سے ایندھن کے لیے لکڑی چُننے گئی تھی۔ وہیں یوسف آپہنچا تھا۔ "نُوراں!" بانہہ پکڑ کر یوسف گڑگڑایا تھا "میں تیرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ بول! کرے گی میرے ساتھ نکاح؟" نُوراں سے کوئی جواب نہ بن پڑا تھا۔ یوسف کی چھاتی پر سر ٹیک کر فقط روتی رہی۔ چھوٹی سلیمہ یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اُس نے جنگل سے لوٹ کر باپو کے کانوں میں پھونک مار دی تھی۔ بس پھر کیا تھا؟ رات بھر نُوراں کے جسم پر ڈنڈے برسے۔ باپو نے اُسے پھٹکارا "تو نے تو میری عزت مٹی میں ملا دی۔ میں نے تو اپنے سمدھی کو دودھ پلا کر تیرا رشتہ پکا کیا تھا۔ یہ دودھ کا رشتہ میں کیسے توڑ دوں؟"

نُوراں بہت روئی تھی اور من ہی من میں بولی تھی۔ باپو! تم نے تو اپنے کُڑم کو دودھ پلایا ہو گا لیکن میں نے تو خود یوسف کے منہ میں دودھ کی دھاریں مار کر قسم کھائی ہے۔ لیکن نُوراں کی کسی نے نہیں سُنی اور رجھاکو لاہڑی پہنچتے ہی نُوراں کا نکاح قاسم سے کر دیا گیا تھا......

الاؤ اب بھی جل رہا تھا جس کے پاس بیٹھا بوڑھا رمضانی حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ ایک کونے میں موسے اور اُس کی بیوی پر چھتے پر لیٹے آپس میں کھسر پھسر کر رہے تھے......

......گوبر کی تھپ تھپ ہوئی تو اُسے وہ باپو یاد آگیا جو ایک بار آکر ان کے ڈیرے میں ٹھہرا تھا۔ پہلے تو بڑا

منہ بند اور ناک چپک سا تھا وہ۔ ایک بار جو ٹھہرا تو بار بار آنے لگا۔ کبھی کہتا کہ اُس نے جنگل کا ٹھیکہ لیا ہے۔ کبھی کہتا کہ کٹوائے ہوئے شہتیر ڈھونے ہیں۔ چاول بھر مکھن بھی خریدتا تو پانچ پانچ روپے دے دیتا۔ نوراں کو کوئی روپیوں کی بھوک تھی؟ بابو اُسے ایسے دیکھتا جیسے وہ کوئی کھانے کی چیز تھی۔ بھلا وہ نوراں کو کیا سمجھتا تھا؟.......

پھر اُسے مولوی یاد آگیا...... پتہ نہیں کہاں سے آٹپکا تھا وہ؟ کہتا تھا لکھنؤ کا رہنے والا ہے۔ یہاں جو آیا تو ڈیرا ہی جما بیٹھا۔ کوئی بارہ دن ٹکا رہا۔ بڑی مکھی کھیر اڑائی اُس نے۔ پانچ وقت کا نمازی تھا۔ امیرو اور فضلو کو پاس بٹھا کر کہتا...... "دیکھو! مسلمان ہی اس کائنات کا سب سے پاک انسان ہے۔ اسلام اور شریعت کے اصولوں پر چل کر ہی بہشت حاصل ہو سکتی ہے۔" پھر نوراں کی طرف پیاسی نگاہوں سے تکتا کہ وہ بھی سن رہی ہے یا نہیں۔ موا مشٹنڈہ پیر! ایک بار آبشار کے پاس نوراں کو تنہا پا کر روک ہی بیٹھا۔ آہ بھر کر بولا ــــ "ہمارا بھی کچھ خیال کرو جانِ من! ہم تو تمہاری محبت میں جلے جا رہے ہیں اور تمہیں ہمارا ذرا بھی خیال نہیں ہے"

نوراں جھنجلاہٹ میں لکڑی کی ایک موٹی چھڑی پکڑ کر اُس کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھی ـــــ "اب بتا مشٹنڈے! تجھے کیا تکلیف ہے؟" ــ مولوی جو اُس دن ڈیرے سے گیا تو پھر نہیں لوٹا تھا.......

باہر کتے بھونک رہے تھے۔ اُس نے سوچا کہیں قاسم تو نہیں لوٹ آیا۔ اب اُسے قاسم پر رحم بھی آنے لگا تھا۔ کتنا دبّو قسم کا ہے وہ؟ کبھی سکینہ کے پیچھے بھاگتا ہے۔ کبھی شینا کی محبت کا دم بھرتا ہے ــــ بیاہ کیے چار برس ہونے آئے لیکن نوراں کا پیار نہ پا سکا ــــ ابھاگا!...... یہ سوچتے وہ بستر سے اُٹھ کر باہر دیکھنے نکلی۔

چاروں طرف چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ دُور اوپر برفانی پہاڑوں پر برف چمک رہی تھی۔ سامنے بھوج پتروں کا جنگل ایسے لگ رہا تھا جیسے سفید اور ہری [illegible] وردیاں پہنے کوئی فوج کھڑی ہو ــــ آبشاروں کا شور اور سائیں سائیں کرتی ہوا میں گیتوں کا سا طرب تھا۔ میدان میں بھینسیں متواتر چَر رہی تھیں۔ کچھ جگالی کر رہی تھیں۔ گھوڑے سر نیوڑھائے خاموش کھڑے تھے ـــ جنگل کی وہ حسین وادی دن کی نسبت رات کو زیادہ دلکش نظر آرہی تھی ـــ

کتے بھونکے جا رہے تھے۔ اُس نے دیکھا ایک دراز قامت بھالو کھراٹ کے جنگل سے اُتر کر نیچے کھوائی کے بن کی طرف آرہا تھا۔ وہ سہمی ہوئی ڈیرے کے اندر آکر چھپراٹے پر لیٹ گئی ـــ ایک بار اُسے بھی بھالو کا سامنا ہوا تھا لیکن تب یوسف اُس کے ساتھ تھا ـــ وہ پدہری کے بن میں سوکھی لکڑیاں بین رہی تھی اور پاس ہی یوسف گھاس کاٹ رہا تھا۔ وہ لکڑیوں کا بوجھ باندھ رہی تھی کہ ایک دیو قامت بھالو کو آتے دیکھ کر اُس کے جسم کا لہو جم گیا تھا ـــ بھالو کی انگاروں سی سرخ آنکھیں دیکھ کر اُس کی چیخ نکل گئی تھی۔ یوسف دوڑا آیا تھا اور بھالو ایک دم اُس پر پل پڑا تھا۔ آدھ گھنٹہ وہ یوسف اور بھالو کو گتھم گتھا ہوتے دیکھتی رہی تھی۔ پھر کٹے ہوئے دیوار کی طرح وہ بھالو نیچے نالے میں دھڑام سے گرا تھا اور یوسف لہو لہان وہیں کھڑا رہا تھا ـــ

اُس نے سوچا۔ کہاں یوسف جو بھالو سے لڑا تھا اور کہاں قاسم جو گیدڑ سے بھی خائف تھا ـــ! کیا ہی اچھا ہوتا! ـــ کیا ہی اچھا ہوتا اگر قاسم کے بجائے یوسف اُس کا جیون ساتھی ہوتا ـــ

یوسف کی ہو رہنے کے لیے اُس نے کن سے جتن نہیں کیے تھے؟ ایک بار دونوں بھاگ کر بیاس ندی کے کنارے بیر تھل گاؤں جا پہنچے تھے۔ وہاں وہ گاؤں کے چوہدری ملک سنگھ کے گھر چھ دن چھپی رہی تھی۔ وہاں بھی چوہدری کا لڑکا اُس پر لٹو ہو گیا تھا۔ ایک دن شام کو رفع حاجت کے لیے گئی تھی تو وہ جھاڑیوں سے نکل کر اُس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ پھر اُس نے اُسے چپٹا لینا چاہا تھا لیکن اُس کے دائیں ہاتھ سے [illegible] بلا کر بولا تھا "معاف

کرنا بہن! میں تو مذاق کر رہا تھا۔" وہ تو خیر ہوئی کہ نُوراں نے اُن کے گھر پناہ لی تھی ورنہ وہ اُس چھوکرے کا مورد ہی بنا دیتی۔

اُن کے فرار ہونے پر بڑا ہنگامہ ہوا تھا۔ دونوں طرف کی برادریاں اکٹھی ہوئی تھیں۔ یوسف نے بیس بھینسیں کی پیشکش کی تھی کہ قاسم نُوراں سے دستبردار ہو جائے، لیکن قاسم کا باپ نہیں مانا تھا، اُسی دن سے نُوراں قاسم کی دلہن کے اندر گھل رہی تھی۔

اُسے قاسم پر بہت غصّہ آیا —— اب مرا گھر گھر کی خاک چھان رہا ہے۔ پہلے ہی سوچ لیتا کہ نُوراں اُس کی کبھی نہ ہو سکے گی۔

سوچتے سوچتے اُس کی آنکھ لگ گئی۔ سپنوں میں بھی یہی سوچ اُسے گھیرے رہی —— اُسے سُنائی دیا۔ جیسے یوسف اُسے دُور سے صدا دے رہا ہو —— باہر نکلی تو یوسف اُسے بازو سے پکڑ کر بولا —— "چل"۔

دونوں ہی جنگلوں۔ گھاٹیوں اور ندیوں کو پار کرتے ہوئے راوی کے کنارے میدانی علاقے میں پہنچ گئے —— دونوں خوش تھے کہ راوی پار کرتے ہی جموں کشمیر کے قصبہ بسوہلی میں جا بسیں گے۔ پھر کاہے کا ڈر؟

دریا پہ بانسوں کا پُل کچھ کمزور تھا۔ یوسف بولا۔ "تو یہیں ٹھہر! میں پہلے جا کر دیکھ لیتا ہوں —" وہ ابھی آدھا ہی پُل پار کر پایا تھا کہ پیچھے سے "پکڑو پکڑو" کا شور ہوا۔ یوسف پلٹ کر نوراں کی طرف بھاگا اور نُوراں اُس کی طرف لیکن تبھی پل تڑاخ سے ٹوٹ گیا اور دونوں راوی کی خوفناک لہروں میں کھو گئے.....

نُوراں نے زور سے چیخ ماری۔ سارے ڈیرے کے گوجر جاگ اُٹھے۔ نُوراں بے ہوش تھی —— اُس کا جسم پسینے سے تر تھا اور دانت بھنچ گئے تھے.....

[پہاڑی کہانی]

ماں کی محبت کے بعد!
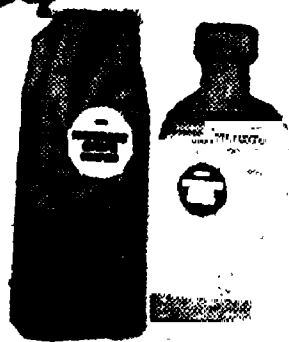
چندر بھان خیال | وجود سے لپٹا ہوا سانپ

سمندر کی سطح پر
تیرتے ہوئے پیپل کے ننھے منّے بے شمار پتّے
ہاتھیوں کے جواں سال بچّوں کو
اپنی نازک ترین چھاتیوں پر لادے ہوئے
مائلِ پیکار ہیں
کسی بھی ضربِ ناگہاں کے استقبال کے لیے تیار ہیں

خود کو ڈبو دینے کا لطف اٹھانے کو بیقرار ہیں
جنگی جہازوں کے قافلے
آبدوز کشتیاں
تہ میں کسی کھونٹی سے بندھ کر بیٹھ جانا چاہتی ہیں
حملہ آور لہریں
ہواؤں کے دوش پہ بیٹھ کر
کسی ویران جزیرے پر اُتر جانے کو بے چین ہیں
اور آبادیوں کا منتظر ہے
خاموش ٹاپو
جل پریوں کا قومی جلوس نکلا ہے
اپنے سر پہ لہروں کا تاج پہن کر
اپنی ہی لاج پہن کر

سرِ محفل اُترے گی سمندر کی سُندری
اُف! یہ ہاتھیوں کے جواں سال بچّے
آہ! یہ پیپل کے ننھے منّے بے شمار پتّے

ارے کوئی ہے!
میرے کیبن میں روشنی کچھ زیادہ ہے
ذرا اِن کھڑکیوں کو بند کر جانا
میرے پہلو میں لیٹی ہوئی اس زخمی [illegible]
میں آنکھیں بند کر لینا چاہتا ہوں
میں دیکھتے رہنا چاہتا ہوں
باتھ روم کے ٹب میں ایک ساتھ کھیلتے ہوئے
پیپل کے ننھے منّے پتّوں
ہاتھیوں کے جواں سال بچّوں
اور سمندر کی سُندری کو
جب تک مر نہ جائے میرے وجود سے لپٹا ہوا سانپ

غزلیں

عبد القادر نشاط

درد، تنہائی، ڈر، جاگنا رات بھر
حادثہ پر نیا حادثہ رات بھر

خواہشیں آخری سانس لیتی ہوئی
بے سبب کچھ نہ کچھ سوچنا رات بھر

جن کی خاطر اسیری مقدر ہوئی
ان پرندوں کے پر کاٹنا رات بھر

دونوں جانب نگاہوں سے شعلے بہیں
ایک ہنگامۂ بے صدا رات بھر

حسبِ مقدور راہِ مفر ڈھونڈنا
گھر کی دیوار کو چاٹنا رات بھر

مجھ پہ پھولوں کی برسات ہوتی رہی
جسم کانٹوں پہ رکھا رہا رات بھر

بے حسی پر بھی احساس کی یورشیں
کچھ نہ کہنے میں بھی التجا رات بھر

▲▲

نظام الدین نظام

چلچلاتی دھوپ میں کیوں بے سبب جھلسا کریں
بوڑھے برگد تک چلو۔ پرچھائیں کا سودا کریں

شہرتوں کے بام سے دنیا کا نظارا کریں
ایڑیاں اپنی اٹھا کر ہم بھی قد اونچا کریں

دوستوں کے درمیاں غزلیں، فسانے، تبصرے
رات ایسی ہو تو پھر سونے کی خواہش کیا کریں

غرق کر دیں آگہی کو جام کی گہرائی میں
اور سبب بربادیوں کا اپنی پھر سوچا کریں

آپ کو بھی لوگ گردانیں گے دانشور نظامؔ
آپ بھی اپنی زباں کو جیب میں رکھا کریں

▲▲

خورشید سحر

ہر طرف ایک نیا رنگ نکھاریں گے ابھی
وقت کی دھندلی قبا ہم ہی اتاریں گے ابھی

لذت آمیز سہی موت کا احساس مگر
زندگی تجھ کو بہرحال گزاریں گے ابھی

تم بھی دیکھو گے تو حیران سے ہو جاؤ گے
ہم تمھیں اتنے سلیقے سے سنواریں گے ابھی

پھر ترے قرب کا احساس ہوا ہے ہم کو
زندگی دور نہ جا تجھ کو پکاریں گے ابھی

شبِ تنہائی ہے دروازۂ دل بند رکھو
خوف کے سائے بہت ہاتھ پساریں گے ابھی

▲▲

○ سکریٹری انجمن ترقی اردو نہٹور ضلع بجنور　○ ۴۹۔ بی۔ اے ویرانی مارگ بمبئی نمبر ۸　○ مہادیوا محلہ ۔ آرہ ۔ بھوجپور

غمِ بسمل

ضیا فتح آبادی

غزل سو گئی

نہ فریاد و نالہ
نہ نغمہ، نہ شیون
نہ حرفِ شکایت
نہ خونیں حکایت
نہ مینا کی قلقل
نہ جاموں کی گردش
نہ شبنم کے موتی
نہ نکہت گلوں کی

طلسمی خموشی
اُداسی، اندھیرا
فضا سہمی سہمی
ہوائیں پریشاں
سیہ پوش شمعیں
نم آلود آنکھیں
بجھی بزمِ ماتم

جگاؤ نہ اس کو
غزل سو رہی ہے
غزل سو گئی ہے

▲▲

خار زتشی دھلوی

نوحہ

(مزیّن بہ صنعتِ توشیح)

ب: بسکہ اک دوست کی تصویر نظر میں اُبھری
ہُوک اِک دل میں اُٹھی ٹیس جگر میں اُبھری
س: ساز پر دل کے لگی جیف جو اک ضربِ شدید
صاف ظاہر ہوا آواز سے اک کربِ شدید
م: ماتم سخت ہے کیوں دشت و جبل میں یارو
کیسی تاریکی ہے یہ شہرِ غزل میں یارو
ل: لاکھ سمجھاتے ہیں دل چین کہاں پاتا ہے
چُپکے چُپکے کوئی گھُن جیسے اسے کھاتا ہے
س: سیلِ اشک اس لیے آنکھوں سے ہوا ہے جاری
سوزِ دل پھُونک نہ ڈالے کہیں محفل ساری
ع: عہدِ رفتہ کی روایات کا حامی نہ رہا
صاحبِ دیدہ و دل، ذاتِ گرامی نہ رہا
ی: یہ نوییں کیسے کہوں اب کوئی فنکار نہیں
حیف یاروں میں مگر یاروں کا وہ یار نہیں
د: درد تھا دِل میں فزوں آنکھ مگر نم نہ ہوئی
لذّتِ کام و دہن غم سے کبھی کم نہ ہوئی
ی: یادِ احباب اُسے خار کریں گے ہر دم
اہلِ ذوق اہلِ ہنر اُس کے ہیں مونس ہمدم

بسمل سعیدی

▲▲

رشمی پٹیالوی

آہ! بسمل سعیدی

حضرتِ بسمل سعیدی چل بسے
ہائے! کتنی غم اثر ہے یہ خبر
آہ! دُنیائے ادب سے چھن گیا
خُوش بیان و خوش کلام و خوش نظر
اپنے ہی اسمِ گرامی کی طرح
ٹونک کا بھی نام روشن کر دیا
فن کے لاتعداد موتی مدل کر
دامنِ شعر و ادب کو بھر دیا
ہر کسی سے تھا مُحبانہ سلوک
جو ملا وہ شخص گرویدہ ہُوا
اپنے ہنستے بولتے انداز سے
جس کو دیکھا اُس پہ جادو کر دیا
بھُول پائیں گے بھلا احباب کیا
یادِ بسمل مُدتوں تڑپائے گی
ختم پر ہے وہ کہانی اے رشمی
جس کو تاریخِ ادب دُہرائے گی

▲▲

قطعاتِ تاریخ

مغیث الدین فریدی

تاریخِ وفاتِ دردناک

۱۹۷۷ عیسوی

سحر بیاں بسمل سعیدی ٹونکی مرحوم

۱۳۹۷ ہجری

دولتِ فکر لٹی، چھن گیا سرمایۂ فن
ماتم حضرتِ بسمل ہے سرِ بزمِ سخن
جس کے دم سے تھا گدازِ سخن وسوزِ غزل
اُٹھ گیا بزم سے وہ "آئنہ افروزِ غزل"

۱۳۹۷ ہجری

▲▲

راز لائلپوری

زیست، جُود و سخائے ربانی
موت، حکم و رضائے یزدانی
آنا جانا لگا ہوا ہے یہاں
جس پہ قائم ہے بزمِ امکانی
انکسارِ گدائی ہے بے کار
ہے فضول، افتخارِ سلطانی
کل تھے بزمِ جہاں کی جو رونق
آج ہیں نُورِ بزمِ نُورانی
اِک سخن گوئے باکمال تھے وہ
دل پذیر اُن کی تھی غزل خوانی
اپنی رحمت میں دے جگہ اُن کو
چشمِ الطافِ ربِّ سبحانی
جب ہوئی رازؔ ذکرِ فوت
غیب سے یُوں ہوئی گُل افشانی
کہہ الم سے یہ مصرعۂ تاریخ
اب ہے بے کیف سب غزل خوانی

۱۹۷۷ء = ۷۱ + ۱۹۰۶

▲▲

بخشی اختر امرتسری

چھایا ہوا ہر دل پہ وہ ہے رنج و محن
گلشن میں سرافتادہ ہے ہر سرو و سمن
اخترؔ ہے یہ تاریخِ وفات آہ کے ساتھ
اب ہم میں کہاں خسروِ اقلیمِ سخن

۱۹۷۷ء = ۶ + ۱۹۷۱

▲▲

★ کوارٹر نمبر ۱۸، ملکہ گنج۔ دہلی ۱۱۰۰۰۷۔

تبصرے

زاویے

گلبرگہ میں اردو زبان و ادب کے چرچے بہت پرانے ہیں اور موجودہ دور میں بھی جسے ہندوستان میں اردو کا دور زوال کہا جاسکتا ہے، وہاں یہ چرچے ماند نہیں پڑے ہیں۔ اس سے اگر ایک طرف اردو کی اس صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ایک بار جہاں جا بسے وہاں سے پھر اپنے ڈیرے مشکل ہی سے اٹھاتی ہے تو دوسری طرف اہل گلبرگہ کا اس زبان سے بے غرضانہ لگاؤ اور محبت بھی ظاہر ہوتی ہے ــــ بحالات موجودہ اردو میں لکھنا لکھانا، اردو میں سنجیدہ ادبی کتابیں یا رسالے شائع کرنا ایک شوق فضول سے زیادہ نہیں اور اس شوق فضول کی پرورش میں گلبرگہ بھی پیچھے نہیں۔

زیر نظر مجلہ جو ڈیمائی سائز کے ۲۶۴ صفحات پر پھیلا ہوا ہے اردو اکاڈمی گلبرگہ کا سالانہ ترجمان ہے۔ اس کے مدیر نوجوان شاعر حامد اکمل ہیں، معاونین میں مظہر مبارک اور ولی احمد اور مجلس مشاورت میں سلیمان خطیب وہاب عندلیب، راہی قریشی، محمد معظم علی، معین محمود اور حکیم شاکر شامل ہیں۔ ان میں سے کوئی نام اردو ادب کے قاری کے لیے غیر معروف نہیں۔

رسالے کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک حصہ آٹھ مضامین، ایک ڈرامے اور تین انشائیوں پر مشتمل ہے، دوسرا سولہ افسانوں اور ایک ڈرامے پر۔ تیسرے حصے میں غزلیں اور چوتھے میں نظمیں شامل کی گئی ہیں اور پانچواں حصہ تبصروں کا ہے جس میں دس تازہ مطبوعات پر تفصیلی تبصرے کیے گئے ہیں۔ لکھنے والوں میں مشہور، معروف، کم معروف اور غیر معروف ہر طرح کے نام ہیں لیکن مشمولات میں بہ استثنائے چند کوئی ایسی چیز نظر نہیں پڑی جسے ساقط المعیار کہا جاسکے اور یہ بڑی بات ہے۔

پہلے حصے میں سرسید پر سید مبارز الدین رفعت کا مضمون اور تحریر کی شگفتگی اور دلچسپی کے لحاظ سے انگریزی کے ڈرامے کی موجودگی کے باوصف مجتبیٰ حسین اور سلیمان خطیب کے مضامین کو صریح فوقیت حاصل ہے اس حصے میں وہاب عندلیب کا انشائیہ نہیں، بھی خاص چیز ہے۔

افسانوں میں جوگندر پال اور آمنہ ابوالحسن کے افسانے بھی شامل ہیں لیکن ان کی شمولیت سے بلراج ورما، حمید سہروردی، اکرام باگ اور کچھ دوسرے نئے لکھنے والوں کے افسانوں کی خوبیاں ماند نہیں پڑیں، نمایاں ہی ہوئی ہیں۔

'زاویے' کی ایک کمزوری جو اس کے مشمولات کی عمدگی کے پیش نظر بہ طور خاص کھٹکتی ہے۔ ناقص کتابت ہے۔ امید ہے اگلا شمارہ مرتب کرتے ہوئے جس کا اعلان کیا گیا ہے، مرتبین اس پہلو کو بھی اہمیت دیں گے ـــــ رسالے کی قیمت پانچ روپے ہے اور یہ سلاتی پبلیکیشنز گلبرگہ کے علاوہ شالیمار پبلیکیشنز حیدرآباد اور مکتبہ تحریک دلی سے بھی طلب کیا جاسکتا ہے۔

ـــــ محمود سعیدی

شہنشاہ ایڈیپس

مترجم: سمیع الحق۔ قیمت: چھ روپے۔ ناشر: مظہر پبلشرز، نئی دہلی

شہنشاہ ایڈیپس، یونان کے مشہور ڈرامہ نگار سوفوقل کے ڈھائی ہزار برس پرانے المیہ ڈرامہ کا منظوم اردو ترجمہ ہے۔ کتاب کی ابتدا میں ڈرامہ کی مختصر تاریخ سوفوقل اور اس کے ڈرامہ کا تعارف نیز پلاٹ بیان کیا گیا ہے۔ درمیان میں شہنشاہ ایڈیپس سے متعلق مشہور ماہر نفسیات فرائڈ کے تاثرات بھی نقل کئے گئے ہیں۔ ڈرامہ کے پلاٹ کا خلاصہ یہ ہے:

"تھیبس کے شہنشاہ لائس کو فال کے ذریعہ پیشین گوئی ملی کہ تیرا بیٹا تجھے قتل کرے گا اور اپنی ماں سے شادی رچائے گا لائس نے اپنے نوزائیدہ بچے کو ٹخنوں میں میخ ٹھوک کر ایک چرواہے کے حوالے کر دیا کہ پہاڑ پر لے جا کر پھینک دے، چرواہا بچے کو پہاڑ پر لے گیا۔ جہاں "کورنتھ" کے لاولد بادشاہ پولی بس اور اس کی ملکہ نے چرواہے سے ــــــــ اس وعدہ پر بچہ لے لیا کہ یہ راز کبھی افشا نہ ہوگا۔ دونوں نے اس کو اپنا بچہ مشہور کر دیا اور ایڈیپس اس کا نام تجویز کیا۔ بچہ جوان ہوا تو ایک اور فال نکالنے والے نے اسے بتایا کہ وہ اپنے باپ کا قاتل اور ماں کا شوہر بنے گا اس فال سے وہ ایسا خوف زدہ ہوا کہ اپنے گھر (کورنتھ) جانے کا ارادہ ترک کر کے دوسری سمت چل کھڑا ہوا۔ راستہ میں چند لوگوں سے مڈبھیڑ ہوئی تو بات بڑھی اور اس نے سب کو قتل کر دیا۔ ایک شخص کسی طرح نکل بھاگا۔ پھر ایڈیپس تھیبس شہر جا پہنچا جس کے دروازے پر ایک دیوزنی سر آنے جانے والے سے چند سوالات کرتی۔ جواب نہ ملنے پر اسکو مار ڈالتی پورے شہر پر خوف و ہراس کی حکمرانی تھی ایڈیپس نے اس کے سوال حل کر دیئے، صحیح جواب ملنے پر دیوی نے پہاڑ سے گرا کر اپنے آپ کو ہلاک کر لیا۔ ایڈیپس شہر میں داخل ہوا شہریوں نے اسے نجات دہندہ کا شاندار خیر مقدم کیا۔ تھیبس کی ملکہ جوکاسٹا نے ایڈیپس سے شادی کی خواہش ظاہر کی۔ شادی ہوئی اور ایڈیپس تھیبس کا شہنشاہ بنا دیا گیا۔ بیس سال نہایت آرام سے گزر گئے۔ جوکاسٹا کے بطن سے ایڈیپس کے دو لڑکے اور دو لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ پھر اچانک شہر پر طاعون کی وبا نازل ہو گئی۔ کاہنوں نے کہا کہ جب تک شہنشاہ لائس کے قاتل سے انتقام نہ لیا جائے گا وبا دور نہ ہوگا۔ شہنشاہ ایڈیپس نے تلاش شروع کر دی تاکہ رعایا کو طاعون سے نجات مل سکے انجام کار یہ راز طشت از بام ہوا کہ ایڈیپس نے تھیبس پہنچنے سے قبل جن لوگوں کو قتل کیا تھا ان میں اس کا باپ لائس بھی تھا اور جوکاسٹا جو اس کی بیوی اور اس کے بچوں کی ماں ہے شہنشاہ ایڈیپس اسی کا بیٹا ہے۔ جوکاسٹا نے اس غم کی تاب نہ لا کر خودکشی کر لی اور شہنشاہ نے اپنی آنکھیں پھوڑ لیں۔"

ترجمہ کو چھ مناظر میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے منظر کو "تمہیدی باب" کہا گیا ہے۔ تمہیدی باب میں تھیبس کے باشندے طاعون سے عاجز آ کر اپنے بہادر، رحم دل اور ہر دلعزیز شہنشاہ ایڈیپس کے دربار میں فریاد کناں کر آئے ہیں اور شہنشاہ ان سے مخاطب ہے۔ پہلے منظر میں بھی شہنشاہ عوام سے گفتگو میں مصروف ہے اور شہنشاہ لائس کے قاتل کے سراغ کا مسئلہ زیر غور ہے۔ دوسرے منظر میں کتے کے بھائی اور شہنشاہ کے نائب قریون اور شہنشاہ ایڈیپس کا بحث و مباحثہ تکرار کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ منظر سوم میں کتے ایڈیپس سے مصروف گفتگو ہے۔ جیسے جیسے تفتیش آگے بڑھتی ہے نئی الجھنیں پیدا ہو رہی ہیں اور نئے نئے شکوک سر ابھار رہے ہیں۔ چوتھے منظر میں لائس کے قاتل کے سراغ کی جد و جہد پورے شباب پر ہے۔ ایڈیپس گواہوں سے بحث کر رہا ہے۔ چھٹے اور آخری منظر میں جس کو اختتامیہ کہا گیا ہے ڈرامے کا عبرتناک انجام ہے۔ ہر منظر کے آخر میں منظر سے متعلق بقدر ضرورت تشریحات نثر میں دی گئی ہیں جن میں منظر کو سمجھانے کی کوشش ہے

چھوٹی بحر کے ایک ہزار آٹھ سو چھیانوے مصرعوں پر مشتمل یہ کتاب شہنشاہ ایڈیپس کے ترجمے کا ترجمہ ہے۔ جیسا کہ مصرعہ تاریخ "کہہ ترجمے سے ہم نے کیا ترجمہ تمام" سے ظاہر ہے۔ اصل کتاب یا جس سے سمیع الحق صاحب نے ترجمہ کیا ہے دونوں موجود نہیں اس لئے یہ اندازہ کرنا تو مشکل ہے کہ یہ ترجمہ اصل سے کسقدر مطابقت رکھتا ہے مگر جہاں تک زبان و بیان کا تعلق ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ مترجم نے نہایت صاف ستھری سادہ سلیس شستہ اور شگفتہ زبان استعمال کی ہے۔ البتہ کہیں کہیں الفاظ کا

بے ترتیبی کے مصرعوں کو بے ترتیب بنا رہا ہے۔ مثلاً

۱ ۔ جو کیا ہے خدا را معاف ہو ۔ مصرع نمبر ۱۱۹۲

۲ ۔ نہ کیا جانو ہمارے باپ ماں کو ۔ مصرع نمبر ۱۱۹۹

——— خالد محمود

شاخِ گُل

شاعر: کالی داس گپتا رضا۔ قیمت: چھ روپے۔

ملنے کا پتہ: صبحِ اُمید۔ بلاسس روڈ ۔ بمبئی ۲۸

"شاخِ گُل" کالی داس گپتا رضا کا تیسرا مجموعۂ کلام ہے جو نظموں، غزلوں اور رباعیوں پر مشتمل ہے۔ نظموں کے موضوعات خاصے متنوع ہیں۔ ان میں رگ وید کے سوکتوں کے ترجموں سے لے کر قدیم مغربیوں کے ادب، اور "یاد کربلا" سے لے کر ہندوستان کے فرقہ وارانہ فسادات تک نظمیں شامل ہیں۔ یہ نظمیں شاعر کی امن پسندی، انسان دوستی اور حق پرستی کی مظہر ہیں۔ جہاں تک نظموں کی ہیئت کا سوال ہے، ایک مختصر آزاد نظم کو چھوڑ کر تمام نظمیں پابند ہیں۔ ان پابند نظموں میں سے کچھ میں مصرعوں کی ترتیب میں جدت سے کام لیا گیا ہے کہیں کہیں صوتی تجربے کی بھی مثالیں نظر آجاتی ہیں، بالخصوص ایک نظم "امرت منتھن" میں ONOMATOPOEIA کا اچھا استعمال ہے۔ ایک نظم "ترک دنیا کیوں" میں دو کرداروں کے مابین مکالمے کی تکنیک کے ذریعہ موضوع کی پیش کش کی گئی ہے، ان تمام باتوں کے باوجود "شاخِ گُل" کی نظمیں سیدھی سادی اور بیانیہ قسم کی ہیں۔ بیان میں وضاحت کی خاصی کارفرمائی ملتی ہے اور تمام تر خلوص کے باوجود ان نظموں میں دل کو چھو لینے اور ذہن پر کوئی نقش چھوڑ جانے کی کیفیت کم ہی پائی جاتی ہے۔

اس کمی کو غزلوں کے ان اشعار نے پورا کر دیا ہے۔ جن میں روایت کے پختہ شعور کے ساتھ ساتھ عصری تقاضوں کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ نمونے کے طور پر چند اشعار درج ہیں:

آہِ مظلوم پکار آئی گلی کوچوں میں
شہر تھا شہرِ خموشاں یہ خبر کس کو تھی

میں وہ صدا ہوں جو چاک دامنِ سنائے بغیر
اثر کی کھوج میں در در کی ٹھوکریں کھائے

یہ آج کے انسان الٰہی توبہ
چہروں کے چمن زار دلوں کے جنگل

اُگیں گے پھول خیالوں کے ریگ زاروں سے
خزاں کے گھر سے جلوسِ بہار نکلے گا

رباعیاں اس مجموعہ کا کمزور ترین پہلو ہیں۔ رباعی کی صنعت کے لئے جو قدرتِ کلام درکار ہوتی ہے وہ ان رباعیوں میں مفقود ہے۔

——— حنیف کیفی

فصیلِ شب

شاعر: خاطر غازی پوری۔ ناشر: مہر پبلشرز، لکھنؤ

قیمت: چھ روپے۔ صفحات: ۱۱۲

اس مجموعے میں ۳۶ نظمیں اور ۴۴ غزلیں ہیں۔ ایک نعتِ رسول ہے جو نہ شروع میں ہے نہ آخر میں بلکہ بیچ میں (ص ۵۷) ہے۔

یہ مجموعہ یقیناً اچھے اشعار سے خالی نہیں لیکن خاطر غازی صاحب نہ روایت سے دامن بھر سکے ہیں نہ جدیدیت کی تہہ در تہہ علامتوں سے ہی پوری واقفیت حاصل کر پاتے ہیں۔ ان کے مجموعے میں جنس اور جنس کا اظہار جگہ جگہ ہے چاہے وہ غزل ہو یا نظم۔ "ہر طرف" "جسم تیرا دلربا ہے" "پھول بدن" "بدن کی گپھائیں" "جوان بستروں پر گرم جسم جل رہے ہیں۔" "بلبلاتے ہوئے گنگناتے ہوئے بدن" نظر آتے ہیں۔ استعارے رنگا رنگ شکلیں اختیار کرتے ہوئے ملتے ہیں۔ جیسے "پرندے جو کچھ سے کچھ سونگھ رہے ہیں" "رات کی تنہا ہتھیلیاں" "سورج کا پہیہ" "درختوں کی انگلیاں" "دودھ کے کھیت" "خدا کی شعبدہ بازی" "ازدحام کے سانچے" "برف زدہ سڑک پر چلتی زندگی" وغیرہ

خاطر صاحب نے کچھ موضوعاتی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ جیسے "میرا وطن" "شہر بہار" "آج کا دن (۱۵ اگست)" "مولود آتا ہے"

یہ نظمیں بس سرسری ہیں جگہ جگہ فارمولے کا استعمال ہے لیکن کہیں کہیں تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ بہرحال یہ انکے ادبی سفر کا [illegible] میں ہے، منزل نہیں اور سفر کے اس پہلے پڑاؤ میں کچھ تقلیدی [illegible]، کچھ فارمولا بازی کے باوجود اُمید کے دامن کو ہاتھ سے نہ چھوڑنا چاہیئے اور ان سے بہتر اور اچھا اشعار کے لئے متوقع رہنا چاہیئے۔

—— اقبال مسعود

خراشیں

مصنف : رادھاکرشن سہگل : قیمت : دس روپے

ناشر : سہگل ہاؤس ۱۰۰ لاڈپورہ کوٹہ راجستھان

کتاب کے پیش لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ سہگل صاحب شاعری سے اصلاح و تبلیغ کے قائل ہیں، ان کے خیال میں انسان کے لئے شاعری ایک ایسا پیغام عمل ہے جو زندگی کا رخ بدل سکتی ہے۔ سہگل صاحب کی شاعری انکے مذکورہ خیال کی بازگشت ہوتے ہوئے بھی صرف انکی کی اسیر نہیں۔ چنانچہ انہوں نے جدید رجحانات کے زیر اثر جدید انداز فکر سے بھی اثر قبول کیا ہے۔ سچی سچی باتوں کو سیدھے سادے پیرائے میں بیان کرنے کا فن سہگل صاحب کو خوب آتا ہے انکی آواز میں نیاپن تو نہیں لیکن خلوص کا رنگ ضرور شامل ہے۔ مخمور سعیدی صاحب کی تحریر سے یہ جان کر کہ سہگل صاحب نے پختہ عمر کو پہنچ کر شاعری کا آغاز کیا۔ افسوس ہوا۔ اس طرح ہم ان کی جوانی کے دور کی شاعری سے محروم ہو گئے۔

خوبصورت ٹائٹل صاف ستھری کتابت و طباعت اور اچھے کاغذ کے ساتھ "خراشیں" ایک ایسا مجموعۂ کلام ہے جو جاذب نظر ہونے کے ساتھ جاذب توجہ بھی ہے۔

—— خالد محمود

▲▲

خط وکتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر لکھنا نہ بھولیے۔ جو کہ آپ کے نام کے ساتھ لکھا ہوتا ہے۔

نارتھ بک سنٹر کی پیش کش

گوپال متل

ایک مطالعہ ——

محمد عبدالحکیم کا تحقیقی اور تنقیدی مقالہ جو عثمانیہ یونیورسٹی کے ایم۔ اے۔ سال آخر کے لیے ڈاکٹر غلام عمر خاں کے زیر نگرانی قلمبند کیا گیا۔

گوپال متل کی صحافتی زندگی اور ان کے ادبی اور شعری کارناموں کا بھرپور جائزہ۔

آخر میں گوپال متل کی نثری اور شعری نگارشات کا انتخاب بھی شامل ہے۔ قیمت : پندرہ روپے

نیشنل اکاڈمی سے طلب کریں

ماہنامہ "محکمات" لکھنؤ

جمعیۃ مرکزیہ تبلیغ الاسلام کا نیدر کا دینی و دعوتی ماہنامہ ہے جو تین سال سے مسلسل شائع ہو رہا ہے۔

جس میں دینی، دعوتی تبلیغی، تاریخی، اور علمی مضامین ہوتے ہیں۔

جو اپنے مطالعہ کنندگان کو صحیح علم اور صالح مواد دیتا ہے۔

جو انفرادی اور اجتماعی زندگیوں پر دین و شریعت کو غالب کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

جو عام بنی نوع انسان کو اسلام کی دعوت اور فکر بخشتا ہے

جس کا سالانہ زر تعاون ان تمام خصوصیات کے باوجود صرف چار روپیہ ہے۔

خط وکتابت و ترسیل زر کا پتہ

مینیجر ماہنامہ "محکمات" رام چرن پارک مکارم نگر لکھنو — ۷

بزمِ احباب

● اگست کے تحریک میں اُردو کے مسئلے پر گوپال متل صاحب کا اداریہ غیر جذباتی منطقی اور معروضی نقطۂ نظر کی ایک روشن مثال ہے اور اردو کے اُن شیدائیوں کو جو اس زبان کی بقا اور ترقی کے لیے کوشاں ہیں، خلوصِ دل سے غور و فکر کا سامان مہیا کرتا ہے۔

اسی شمارے میں رشی پٹیالوی صاحب کا خط پڑھ کر قدرے حیرت ہوئی۔ وہ اس بات پر مُصر ہیں کہ تخلیقی ذہن کا رویہ بھی مروّجہ عقائد سے متعلق، عام لوگوں کے رویے سے مختلف نہیں ہونا چاہیے۔ اُنھیں یہ بات تو مدِ نظر رکھنی چاہیے تھی کہ یہی "انحراف" فن کار اور عام آدمی کے درمیان حدِ فاصل کا کام کرتا ہے۔ عقائد کا احترام اپنی جگہ پہ درست مگر شعر و ادب میں اُن کے علامتی اور استعاراتی استعمال پر فن کار سے بدظن ہونا شاید ہی درست مانا جائے۔ کیونکہ اُن کے استعمال سے عقائد کی نفی کے بجائے، عقائد کی دائمیت کا ثبوت ہی ملتا ہے۔

رشی پٹیالوی صاحب خود تخلیقی ذہن کے مالک ہیں۔ ہمیں تو اُن سے یہی امید رکھنی چاہیے کہ وہ اپنے شعور اور اپنے تجسس کی تلاش کردہ روشنی کو، ورثے میں پائی ہوئی روشنی سے کسی صورت میں کمتر نہیں سمجھتے ہوں گے۔

—— پرکاش فکری، ڈورنڈا، درزی محلہ، رانچی

● "تحریک" اگست ۷۷ء پیش نظر ہے "اُردو کا مسئلہ —— جنتا پارٹی اور کانگریس" کے ہر پیراگراف کو پڑھنے کے بعد میں غالب کے شعر کو قدرے تصرف کے ساتھ پڑھتا تھا ؎

دیکھنا تحریر کی ندرت کہ جو اس نے لکھا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

بعض باتیں تو ایسی ہیں کہ آج تک کسی اردو نواز نے ان کے کہنے کی جرأت نہیں کی تھی۔ اردو والوں کے داہموں کو بلکہ مجھے کہنے دیجیے کہ مسلمانوں کے احساس کمتری کو آپ نے بڑی خوبصورتی سے بے نقاب کیا ہے۔ میں تہہ دل سے آپ کا ممنون اور شکر گزار ہوں۔ اور آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

آزادی کے بعد ہندی مسلمان احساس کمتری کے مریض ہو گئے۔ شاید اس لیے کہ مسلم لیگی فرقہ پرستی اور اس کے عوامی اور سیاسی ردِّ عمل کی ایمرجنسی ان پر مسلسل نافذ رہی انہی حالات میں ملّا صاحب جیسے افراد اُبھر کر سامنے آگئے۔ جنھوں نے یو۔پی کو اردو کا پانی پت قرار دیکر اردو کے حق میں کانٹے ہی نہیں بوئے بلکہ اردو اکادمیوں کے "میفیر" (اجلاس منعقدہ ۶، ۷، نومبر ۷۶ء) میں سابق صدر جمہوریہ فخر الدین علی احمد مرحوم کی تنبیہہ اور شکایت کی برسرِ اجلاس تردید کرکے اردو کے لیے ہندوستان کے اقتدار اعلیٰ سے اٹھنے والی پہلی اور شاید آخری آواز کو بھی دیدہ دلیری کے ساتھ جھٹلا دیا۔ پھر بھی وہ اردو کے قائد بنے ہوئے ہیں اور صوبائی انجمنوں ترقی اردو کی راہوں میں روڑے اٹکا رہے ہیں۔

بہر حال میں اردو کے مستقبل سے مایوس نہیں اردو ایک زندہ زبان ہے یہ ختم نہیں ہو سکتی۔ ممکن ہے ہندوستان سے ختم ہو جائے لیکن بودھ دھرم کی طرح غیر ملکوں میں پرورش پائے گی۔ آج بھی عالمی زبانوں میں اس کا تیسرا

نہ ہے اور ہندی اپنے ہی علاقہ میں اتنی کمزور نظر آتی ہے کہ اس کے نادان دوست بغض معاویہ میں نامل کا سہارا لیتے نظر آ رہے ہیں ــــ آپ کو یاد ہو گا رام پرکاش گپتا صاحب یوپی کی سابق سنیکت ودھائک دل ہیں۔ نائب وزیر اعلیٰ اور وزیر تعلیم تھے۔ اُنھوں نے یوپی بورڈ کے طلبا کو ہائی اسکول اور انٹر میں انگریزی یا ہندی میں سے کوئی ایک زبان پڑھنے کی اجازت دے دی تھی۔ سارے طالب علموں نے جن میں ہندو مسلمان کی کوئی تخصیص نہ تھی ہندی کو خیرباد کہہ دیا اور ہندی اساتذہ کی ملازمت کا سوال پیدا ہو گیا۔ اس کے بعد انھیں ہندی کی کمزوری اور اپنی غلط فہمی کا احساس ہوا اور احکامات واپس لیے گئے۔

کیا شتر مرغ کی خود فریبی سے حقائق بھی بدل جاتے ہیں؟ کاش اُردو والوں کو اُردو کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا۔

ــــ ابو محمد شبلی معرفت دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

● اگست ۷۷ء کا تحریک زیر مطالعہ ہے۔ گوپال متل کا مضمون "اردو کا مسئلہ ــــ جنتا پارٹی اور کانگریس" اردو دستی کا بیّن ثبوت ہے اور اردو کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں پر ایک گہرا طنز ہے۔ خصوصاً یہ جملہ "بے عمل لوگوں کو صرف اس بنا پر تحریک کا قائد نہیں بنانا چاہیے کہ وہ غیر مسلم ہیں"۔ ان کے خلوص نیت کا ثبوت ہے اور ان لوگوں کے لیے ایک سبق ہے جو اردو کی ترقی کی راہ میں روڑے اٹکا رہے ہیں۔

تحریک میں جہاں اردو سے متعلق اس قدر پاکیزہ خیالات کا اظہار ملتا ہے، وہیں "مراجعت" جیسا افسانہ پڑھ کر دماغ پر جھنجھلاہٹ سی سوار ہو جاتی ہے۔ مراجعت اردو رسم الخط میں ہے مگر پڑھتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندی زبان کی کسی مذہبی کتاب کا کوئی ٹکڑا زیر مطالعہ ہے۔ دیومالائی اساطیر کا استعمال اردو میں ہونا چاہیے مگر اسی وقت جبکہ تخلیق بھی اردو میں ہو جیسے کمار پاشی کی نظمیں ــــ یا تہا تما پوری کا افسانہ "دھوپ کی لکیر" جس میں استعمال ہونے والے الفاظ ہندی ہیں مگر ذہن پر بار نہیں گزرتے۔ اردو میں غیر مانوس الفاظ جائز ہیں مگر اسی وقت جب ان سے شناسائی کا ہلکا سا تصور بھی اور زبان کی چاشنی بھی ملے۔ مگر "مراجعت" میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اس سے بہتر ہوتا کہ اس کہانی کا اُردو ترجمہ شائع کیا جاتا۔

"تحریک" میں اس طرح کی تخلیقات اکثر چھپتی ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ کچھ لوگوں نے تو اس کو شیوہ بنا لیا ہے۔ "تحریک" ہمیشہ سے میرے مطالعے میں رہا ہے اور اکثر یہی ایک بات کھٹکتی رہی ہے جس کا اظہار میں نے کر دیا۔ ہو سکتا ہے کہ دوسرے اس سے اتفاق نہ کریں۔

ــــ عنبر شمیم ۲۲/۱، مدار تلہ لین، پیلخانہ۔ ہوڑہ-۱

● اگست کا "تحریک" ملا۔ محترم گوپال متل کا مضمون "اردو کا مسئلہ ــــ کانگریس اور جنتا پارٹی" بہت حقیقت افروز ہے۔ ڈاکٹر انجمن آرا انجم کا مضمون ــــ "چند اردو الفاظ کی اصلیت اور تاریخ" بھی اچھا اور معلوماتی ہے۔ لیکن اس میں لفظ "بربریت" پر بحث کرتے ہوئے پشتو زبان کا ذکر نہیں کیا گیا جبکہ میرا خیال یہ ہے کہ یہ لفظ پشتو سے فارسی اور عربی وغیرہ زبانوں میں منتقل ہوا ہے۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ دنیا کے مختلف ملکوں میں آریہ نسل کے لوگ افغانستان سے ہی ہجرت کر کے پہنچے ہیں اور قدرتی ہے کہ ان کے ساتھ بہت سے الفاظ بھی وہاں پہنچے ہوں۔

مخمور سعیدی کا تبصرہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی کتاب "حافظ اور اقبال" پر خوب ہی نہیں بلکہ خوب تر ہے۔ ایک آفریدی افغان کی حیثیت سے ڈاکٹر یوسف حسین خاں کو "خوشحال خاں اور اقبال" کے نام اور عنوان سے بھی کتاب لکھنی چاہیے، کیوں کہ اگر اقبال کے کلام کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اقبال کے پردے میں .... کوئی "خوشحال خاں خٹک افغان" بول رہا ہے۔ خوشحال خاں خٹک کی طرح اقبال نے بھی اپنے کلام میں افغانوں کو مخاطب کیا ہے ــــ "اے اُٹھ غافل افغان اپنی خودی پہچان"

نظم مثالاً پیش کی جا سکتی ہے۔

——— خان غازی کابلی۔ کوچہ رحمان، دہلی

● تازہ تحریک میں رشی پٹیالوی نے فرحت قادری کی نظم "شو کی جٹا سوکھ گئی" کے عنوان پر اعتراض کیا ہے۔ شو کی جٹا سوکھنے کا جو مفہوم رشی پٹیالوی نے لیا ہے وہ نافہمی پر مبنی ہے۔ یہاں شو سے مراد صحت مند قدریں ہیں اور "جٹا کے سوکھنے" کی بات اقدار کی بحالی کی ناکامی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

——— رونق گیاوی، گول گھر، جھریا، دھنباد

● جناب حسن الدین احمد نے اپنی کتاب "اردو الفاظ شماری" کے مقدمہ میں "الفاظ تاریخ کی دین ہیں" کے عنوان کے تحت نہایت دلچسپ اور مفید بحث کی ہے اور پچاس سے زائد اردو الفاظ کا تاریخی پس منظر فراہم کیا ہے۔ اردو میں اس اہم موضوع پر بہت کم کام ہوا ہے۔ احمد دین کی کتاب "سرگزشت الفاظ" کے بعد اس موضوع پر پہلا کام ہے "الفاظ تاریخ کی دین ہیں" کتاب "اردو الفاظ شماری" کا ایک باب نہیں ہے جیسا کہ محترمہ انجمن آرا انجم نے اپنے مضمون میں لکھا ہے بلکہ ایک مستقل تحقیقی کام ہے اور مقدمہ اردو الفاظ شماری کا ایک جزو ہے۔

فاضل مضمون نگارہ نے اپنے طویل مضمون میں "الفاظ تاریخ کی دین ہیں" کے تحت دیئے ہوئے الفاظ کے منجملہ ۱۸ الفاظ سے بحث کی ہے۔ ابتدا میں محترمہ نے یہ واضح کیا ہے کہ صرف ۱۸ الفاظ سے بحث کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ بقیہ الفاظ کی حد تک وہ مقدمہ اردو الفاظ شماری میں دیئے گئے نتائج سے متفق ہیں حالانکہ جرح و تاویل علمی اقدار پر ہونی چاہیئے تھی جس کا تقاضہ یہ تھا کہ محترمہ جن الفاظ کی حد تک جناب حسن الدین احمد کے دیے ہوئے نتائج سے متفق تھیں ان کی بھی صراحت کر دی جاتی۔ ایسا کیا جاتا تو کم سے کم یہ تاثر تو نہ پیدا ہوتا جیسا کہ اب مضمون زیر بحث سے پیدا ہو رہا ہے کہ موصوفہ کا مقصد محض اختلاف ہے۔

زیر نظر مضمون میں غیر ضروری طور پر طولانی بحث کی گئی ہے۔ لیکن قاری محترمہ کے انداز بحث سے متاثر نہیں ہو پاتا بلکہ جناب حسن الدین احمد کی تحقیق اور ان کے اخذ کیے ہوئے نتائج سے خود کو متفق پاتا ہے اور مجموعی طور پر ان کی تحقیق نظر اور ذہانت کی داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ مثال کے طور پر بربر ایک قبیلہ کا نام ہے یا مصر کے مغرب میں شمالی افریقہ کا جو علاقہ ہے اس کے رہنے والے یا شندوں کا اصل بات جس کی جانب جناب حسن الدین احمد نے توجہ دلائی ہے وہ یہ ہے کہ بربریت کا لفظ بربر سے بنا۔ فاضل مضمون نگارہ نے یہ تو نہیں بتایا کہ بربریت کا لفظ بربر سے نہیں بلکہ فلاں لفظ سے بنا۔ جب تک وثوق سے یہ نہ بتلایا جائے جناب حسن الدین احمد کے نتائج کو قبول کرنا ہی ہوگا جس کا اشارہ موصوفہ نے اپنے مضمون میں بھی کیا ہے۔

اسی طرح پوست کندہ کے معنی جناب حسن الدین احمد نے ناقابل تردید بتلائے ہیں اور محترمہ انجمن آرا نے بھی لغات کے حوالے دینے اور طویل بحث کے بعد جو معنی بتلائے ہیں وہ یہ ہیں۔ صاف صاف، واضح بے لاگ لپیٹ ظاہر ہے کہ دونوں میں کوئی بنیادی اختلاف نہیں ہے۔

لفظ بے ہودہ کی تشریح میں فاضل مضمون نگارہ نے جو حوالے دیے ہیں خود ان سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ہودہ حوضہ کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ جیسا کہ وہ خود نتیجہ نکالتی ہیں اردو لغت نگار اس بارے میں کہ ہودہ کس لفظ سے بنا ہے دو مختلف رائیں رکھتے ہیں۔ ایک فریق کا کہنا ہے کہ یہ ہودج سے بنا ہے اور دوسرا یہ کہتا ہے کہ یہ حوضہ کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ یہاں تک تو جناب حسن الدین احمد کی تحقیق سے اختلاف کی گنجائش نہیں ہے۔ اس کے بعد یہ سوال کہ آیا لفظ بے ہودہ، ہودہ سے وجود میں آیا اگر آپ چاہیں تو ڈاکٹر انجمن آرا کے خیال سے متفق ہو جائیں لیکن جس بات کی طرف جناب حسن الدین احمد نے اشارہ کیا ہے وہ پھر بھی غور طلب ہی ہے۔

اسی طرح جہاں تک لفظ زنانہ کی تحقیق کا تعلق ہے ہم کو جناب انجمن آرا کی رائے سے اتفاق ہے لیکن جناب حسن الدین احمد کی تحقیق میں جو وزن ہے وہ اپنی جگہ باقی رہتا ہے۔

... عورت اور رفیقِ حیات کا تعلق اتنا عجیب اور واضح ہے کہ ان الفاظ کے کسی گورکھ دھندے کو درمیان میں لانے کی مطلق ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

فاضل مضمون نگار نے کفر کے معنی کسی چیز کو چھپانے ڈھک لینے اور مستور کرنے کے بتلائے ہیں۔ خود جناب حسن الدین احمد نے بھی اپنے مضمون "الفاظ تاریخ کی دین ہیں" میں کفر کے معنی ڈھانکنے چھپانے کے بتلائے ہیں اسی طرح لفظ کافور کی حد تک خود لائق مضمون نگار نے حوالہ دیا ہے کہ "عربی لفظ کافور کے بارے میں عرب لغویین اکثر و بیشتر یہی رائے رکھتے ہیں کہ یہ خالص عربی لفظ ہے۔ وہ اسے کفر (بمعنی پوشیدگی) سے مشتق بتاتے ہیں"۔ جناب حسن الدین احمد نے بھی کافور کو کفر سے مشتق بتایا ہے۔ لیکن کفر کے مرادی معنی یعنی غائب ہونے والی چیز سے تعلق ظاہر کیا ہے جو زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے

——— شمیم احمد، گلی تحفت والی، چوڑیوالان، دہلی

● سرشیدر موہن کا مضمون "سوویٹ روس میں ذہنی امراض کا معالجہ"، غور سے پڑھا۔ اطلاعاً عرض ہے کہ ذہنی امراض کے معالجین کی بین الاقوامی کانفرنس نے جو ہونولولو میں منعقد ہوئی تھی۔ سوویٹ طریق کار کی باضابطہ مذمت کردی ہے سرشیدر موہن اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ سوویٹ یونین چونکہ ساٹھ برس سے مارکسزم لینن ازم کی تبلیغ کا خوگر ہو چکا ہے۔ اور مارکس اور لینن دونوں کا یہ عقیدہ تھا کہ دونوں نے سماجی صداقتوں کو مکمل طور پر دریافت کر لیا ہے اور ان صداقتوں سے انکار کرنے والا کوئی پاگل ہی ہو سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ پاگل دراصل مارکس اور لینن تھے کیونکہ کوئی پاگل ہی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ سماجی معاملات کے بارے میں اس کی رائے حتمی ہے۔ دنیا بھر کے دانشوروں کو چاہیئے کہ وہ ایک بین الاقوامی کانفرنس کریں اور مارکس اور لینن پر باضابطہ مقدمہ چلائیں۔ ظاہر ہے کہ ان پر سزا کی تعمیل تو نہیں ہو سکتی لیکن انھیں مجرم قرار دیا جانا بہت ضروری ہے۔

۔ محمد عبد الحمید، اسلام آباد، کشمیر

● جناب شبل صاحب۔ آداب

آپ کے ۱/ ۱۹۷۷ء ... کا

حسب لگا تار مطلب نہیں آپ کے ادارئے "آپ کے حالات آپ کے بلنگٹ یانگ دھوے صاحب کیا کہنا ہے آپ کا ہندوستان میں کتنی خدمت آپ نے اردو زبان اور اردو ادب کی فرمائی ہے اس کا انعام آپ کو ادب اور زبان زندگی بھر بخشتے رہیں گے اللہ تعالیٰ بھی جنت میں آپ کو اس خدمت کا صلہ بخشیں گے

خدا کا شکر ہے کہ اردو زبان کو حضور ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان کا درجہ عطا کرتے ہیں جس کا واحد ثبوت یہ ہے کہ "تحریک" کے مدیر اور نائب مدیر ایک ہندو اور ایک مسلمان ہیں لیکن دونوں ہی ایک ہندو شاعر کے مجموعۂ کلام پر تبصرہ نظر کفر سمجھتے ہیں ورنہ ہو سکتا ہے کہ بسمل کرشن اشک کا مجموعہ لوگوں کی نگاہ میں آجائے۔ حقیقت شائد یوں ہے کہ اس مجموعے سے بہتر مجموعہ پچھلے تین سال میں ہر صورت میں بہتر رہا ہے کاش آپ کے جسم میں تنیس[2] ضرور ہوتی۔

آپ ٹنکلے کی چوٹ اتنا ہی تحریر فرما دیں کہ آئینہ اور پرچھائیں سے بہتر مجموعے ہی شائع ہوئے ہیں۔ ورنہ اردو ادب اتنا خوبصورت بامعنی عظیم کیسے ہوتا۔

کیا تحریک کے کسی رکن میں کوئی احساس، کوئی تمیز، کوئی ادبیت باقی ہے یا سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔

خدا آپ کو طویل زندگی عطا کرے اور اس کے ساتھ ہی اتنی تمیز بھی بخشے کہ آپ اُردو ادب کو ہندو اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان کا درجہ عطا کرسکیں۔

اور کہیے؟ کیا حال ہے آپ کا؟ آپ کب اُردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دیں گے اور خود مسلمان مذہب کو قبول فرمائیں گے[3]

خدا کرے آپ اور مخمور اور پریم تینوں ہی کم از کم انسانیت کا دعویٰ تو کر سکیں۔

کیا جناب اس خط کو تحریک میں شائع کرنے کی جرأت فرما سکیں گے۔

——— آپ کا: بسمل کرشن اشک، رہتک

[1]، مکتوب نگار غالباً بلند بانگ کہنا چاہتے ہیں۔

[2]، اُردو میں یہ لفظ غالباً مذکر ہے۔

[3]، اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں۔

پنجاب اور آندھرا کی لائبریریوں کے لیے منظور شدہ

ماہنامہ

تحریک

نئی دہلی

جلد : ۲۵

شمارہ [illegible]

نومبر ۱۹۷۷ء

ادارۂ تحریر :

گوپال متل ☆ مخمور سعیدی

پریم گوپال متل

سالانہ قیمت : پندرہ روپے فی کاپی : ایک روپیہ ۲۵ پیسے

بیرونی ممالک سے

سالانہ تین پونڈ فی کاپی : چھ شلنگ

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتا

منیجر ماہنامہ تحریک ۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر : گوپال متل

مطبع : نعمانی پریس، دہلی

مقام اشاعت : ۹ انصاری مارکیٹ ۔ نئی دہلی ۲-۱۱۰۰۰

DR. ZAKIR HUSAIN LIBRARY JAMIA NAGAR NEW DELHI-110025

مندرجات

امن کے لیے ۱۹۷۷ء کا نوبل انعام

انسانی حقوق کی عالمی تنظیم ایمینسٹی انٹرنیشنل (لندن) کو دیا گیا ہے

انسانی حقوق کیا ہیں؟

مشہور برطانوی دانشور موریس کرانسٹن نے اپنی اس کتاب میں ان بنیادی انسانی حقوق کی تفصیل اور ان کی تفسیر پیش کی ہے جن کے بغیر مہذب زندگی کا تصور ممکن نہیں۔

انسانی حقوق کیا ہیں؟

عالمی رائے عامہ ان کے بارے میں متفق ہے لیکن بعض ملکوں میں ایسی حکومتیں بھی قائم ہیں جو زبانی طور پر ان حقوق کو تسلیم کرنے کے باوجود عملاً ان کا کوئی احترام نہیں کرتیں۔ اپنے اس طرز عمل کی پردہ پوشی وہ جن طریقوں سے کرتی ہیں ان کی نشاندہی بھی اس کتاب میں کی گئی ہے۔

انسانی حقوق کیا ہیں؟

اس ضمن میں اقوام متحدہ اور کونسل آف یورپ کے جاری کردہ میثاق بھی کتاب میں شامل کر دیے گئے ہیں۔

پولیٹیکل سائنس کے طالب علموں کے علاوہ عام شہریوں کے لیے بھی اس کتاب کا مطالعہ بہت ضروری ہے تاکہ وہ اپنے حقوق اور ان کے حصول کے طریقوں سے بے خبر نہ رہیں۔

قیمت، عام ایڈیشن :- چار روپے

قیمت، لائبریری ایڈیشن :- سات روپے

ناشر

نیشنل اکاڈمی ۹ انصاری مارکیٹ۔ دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

دو انقلاب

گوپال متّل

کریملن میں وزیر اعظم مرارجی ڈیسائی کے اعزاز میں جو دعوت دی گئی اس میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے ووٹ شماری کے ذریعے پُرامن انقلاب پر زور دیا۔ انھوں نے لوک سبھا کے انتخابات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہ ہندوستانی عوام کے عزم اور ان کی بالغ نظری کا ثبوت ہیں اور ان لوگوں کے لیے انتباہ ہیں جو عوام کے ساتھ من مانی کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے روس کے انقلابِ اکتوبر کا ذکر بھی کیا جو ان کے نزدیک تاریخی اہمیت کا حامل تھا۔

شری مرارجی ڈیسائی خیر سگالی کے مشن پر گئے تھے اور ان کا مقصد روس سے دوستی کو استوار کرنا تھا اس لیے اس سے زیادہ کھل کر بات کرنا ان کے لیے ممکن نہیں تھا لیکن تاریخ کے طالبِ علموں کے لیے یہ بات پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ ووٹ شماری کے ذریعے ایک انتخاب روس میں بھی ہوا تھا اور جس جشن کی ساٹھویں سالگرہ روس میں منائی جانے والی ہے وہ اس پُرامن انقلاب کا استرداد تھا۔

روسی انقلاب کا ذکر کرتے ہوئے یہ بات لوگ بسا اوقات بھول جاتے ہیں کہ روس میں دراصل دو انقلاب ہوئے تھے۔ جو انقلاب لینن نے برپا کیا اس سے پہلے وہاں آئین ساز اسمبلی کے انتخاب ہوئے تھے جو روس کے اوّلین آزاد انتخاب تھے۔ انتخابات کے بعد جو حکومت روس میں اقتدار میں آئی وہ ایک سوشلسٹ حکومت تھی۔ روس کے پہلے آزادانہ انتخاب میں روسی عوام نے لینن کی انتہا پسندی اور جاگیردارانہ قدامت پسندی دونوں کو مسترد کر دیا تھا اور معتدل سوشلزم کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ تین کروڑ ساٹھ لاکھ ووٹ دینے والے افراد میں سے کمیونسٹ امیدواروں کے حق میں صرف نوّے لاکھ نے ووٹ دیا تھا اور تقریباً دو کروڑ دس لاکھ، یعنی کُل ووٹوں کی ۵۸ فیصد تعداد نے سوشلسٹ انقلابی پارٹی کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ اسمبلی کے کُل سات سو نمائندوں میں سے تین سو ستّر نمائندے اسی پارٹی کے منتخب ہوئے تھے جس کا مطلب یہ ہے کہ اسے واضح اکثریت حاصل ہوئی تھی۔ رجعت پسند کیڈٹ نمائندے اس اسمبلی میں صرف سترہ تھے۔ اگر لینن کے حملے کا ہدف صرف رجعت پسندی ہوتی تو جبر کے استعمال کی چنداں ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ تو انتخاب میں برملا شکست کھا چکے تھے۔ اگر پھر بھی لینن نے تشدد سے کام لیا تو ظاہر ہے کہ اس کا ہدف جمہوریت اور لبرل سوشلزم تھے۔

آئین ساز اسمبلی کے حق میں روسی عوام کا جوش و خروش بھی کچھ کم نہیں تھا۔ آئین ساز اسمبلی کے دفاع کی لیگ کو انقلابی سوشلسٹوں اور منشویکوں نے منظم کیا تھا۔ اس لیگ کا مقصد یہ تھا کہ اسمبلی کے افتتاح کا خیر مقدم ایک پُرامن جلوس نکال کر کیا جائے۔ یہ جلوس ۱۸ جنوری کی صبح کو تقریباً ۱۱ بجے نکلا۔ غیر مسلح مزدوروں کے ہجوم جو شہر کے مختلف حصّوں سے نکلے انھوں نے سرخ جھنڈے اور موٹو اٹھائے ہوئے تھے جن پر اس قسم کے نعرے لکھے ہوئے تھے ”تمام ملکوں کے پرولتاریو، متحد ہو جاؤ!“ ”زمین اور آزادی“ ”آئین ساز اسمبلی زندہ باد“۔ یہ ہجوم جب مارس میدان پہنچا تو کسانوں کی سوویٹ ایگزیکٹیو کے ممبر بھی ان میں شامل ہو گئے لیکن

جب مزدوروں اور کسانوں کا یہ جلوس ٹاریڈے محل (جہاں آئین ساز اسمبلی کا اجلاس ہونے والا تھا) کو جانے والی سڑک پر مڑا تو بولشویکوں نے رائفلوں اور مشین گنوں سے گولیاں چلانی شروع کردیں۔ آئین ساز اسمبلی کی طرف جانے والی تمام سڑکوں پر چیدہ چیدہ بولشویک یونٹوں کا پہرہ تھا جنھیں یہ حکم تھا: "گولی چلانے سے قطعی گریز نہ کرنا" اس روز پیٹرو گراڈ کے شہر میں ایک سو مرد اور عورتیں ہلاک اور زخمی ہوئے۔

لینن نے ہر قسم کے انتظامات کر رکھے تھے۔ اس نے لیٹاری نشانہ بازوں کے ایک دستے کو پیٹرو گراڈ بلا لیا تھا۔ اسے علم تھا کہ ان فوجوں کو روسی عوام کے ساتھ کوئی خاص جذباتی وابستگی نہیں اور جو احکام انھیں دیے جائیں گے وہ ان کی اندھا دھند پیروی کریں گے۔

اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا تو لینن نے اپنے چہرے پر عیارانہ مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا "چونکہ ہم اس حماقت کے واقعی مجرم ہیں کہ ہم نے اسمبلی کو طلب کرنے کا وعدہ کر رکھا ہے، اس لیے آج اس کا اجلاس شروع کرنا ہی پڑے گا لیکن اس کے خاتمے کا وقت کیا ہوگا اس بارے میں تاریخ ابھی خاموش ہے۔"

"ٹاریڈے محل عجیب و غریب نظارہ پیش کر رہا تھا۔ اسمبلی کا کمرہ سپاہیوں اور فوجی ملاحوں سے بھرا ہوا تھا جن کے پاس بے تحاشہ ہتھیار تھے۔ ہر دروازے پر رائفلوں اور دستی بموں سے مسلح سرخ محافظ بیٹھے ہوئے تھے اور پبلک گیلریوں میں بھی زیادہ تر بولشویک تنخواہیے ہی نظر آرہے تھے لیکن اسمبلی کا اجلاس پھر بھی شروع ہوا۔

رواج کے مطابق اس کا افتتاح اسمبلی کے معمر ترین نمائندے نے کیا۔ یہ فریضہ انقلابی صفوں کے معمر ترین رکن سوئٹروف نے انجام دیا جو "عزم عوام" کے دور سے اس وقت تک اسلامی تحریک سے وابستہ رہا تھا۔ وہ پلیٹ فارم پر پہنچا تو بولشویک نمائندوں نے اپنی ڈیسکوں کو بجانا شروع کر دیا۔ گیلری میں ایک کمیونسٹ سپاہی نے اپنی رائفل سوئٹروف کی طرف تان لی...

سوشلسٹ انقلابی پارٹی کا لیڈر وکٹر چرنوف بھاری اکثریت سے اسمبلی کا چیرمین منتخب ہوگیا۔ وہ اپنی تقریر بولشویکوں کی مسلسل رخنہ اندازی میں ہی پوری کرسکا۔ بولشویک نمائندے سکوورٹسوف نے سوشلسٹ انقلابیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "ہمارے درمیان ہر چیز کا فیصلہ ہوچکا ہے"۔ ٹسوف اور دوسرے بولشویک نمائندوں کی تقریروں... کو سوشلسٹ نمائندوں نے خاموشی سے سنا اور جب انھوں نے دشنام طرازی کی تب بھی ان کی تقریروں میں کوئی مداخلت نہیں کی گئی لیکن جب تسرٹیلی ان کا جواب دینے کے لیے کھڑا ہوا تو اس کے سر کی طرف رائفلوں کا رُخ کر دیا گیا اور فوجی ملاح اس کے چہرے کے سامنے پستول لہرانے لگے اور جب چیرمین نے نظم و ضبط قائم کرنے کی اپیل کی تو شور زور، سیٹیوں اور گندی گالیوں میں مزید اضافہ ہوگیا۔

دوسرے دن، جب اسمبلی کا اجلاس از سر نو شروع ہونا تھا تو نمائندوں نے دیکھا کہ ٹاریڈے محل کے دروازے پر فوجی بندوقیں اور مشین گنیں لیے بیٹھے ہیں اور اندر جانے کا راستہ مسدود ہے۔ ان کے پاس میدانِ جنگ میں استعمال ہونے والی دو توپیں بھی تھیں۔ اسی دن ۱۹ر جنوری ۱۹۱۸ء کو کمیونسٹوں نے ایک حکم کے ذریعے اسمبلی کو ختم کر دیا۔ جن اخباروں نے ۱۸ر جنوری کے اجلاس کی خبر شایع کی تھی انھیں بولشویکوں نے دکانوں اور اخبار فروشوں سے چھین کر جلا ڈالا۔

اب روس میں ڈکٹیٹرشپ کے لیے راستہ ہموار تھا۔ کمیونسٹ اور ان کے ہم سفر اس ڈکٹیٹرشپ کو پرولتاری ڈکٹیٹرشپ کا نام دیتے ہیں لیکن لینن نے اسے "ڈکٹیٹرشپ اور صرف ڈکٹیٹرشپ" کا نام دیا تھا۔ اس کی توضیح کے مطابق اس ڈکٹیٹرشپ کو ایک ایسا "لامحدود اور مکمل اقتدار حاصل ہونا چاہیئے جس کی راہ میں قانون اور ضابطہ حائل نہ ہوسکے اور جس کی بنیاد براہ راست طاقت پر ہو"۔ (ریاست اور پرولتاری ڈکٹیٹرشپ — ۱۹۲۰ء — مجموعی تحریریں، جلد ہفتم، صفحہ ۲۵۴، انٹرنیشنل

پبلشرز، نیویارک، ۱۹۴۳ء)

یہ صرف نظریاتی موشگافی نہیں تھی۔ لینن جو کہتا تھا وہ کرتا بھی تھا۔ ٹراٹسکی کا کہنا ہے کہ لبرل اور سوشلسٹ اخباروں پر پابندی لگانے کے خلاف جب بھی کوئی بات کہی جاتی لینن پکار اٹھتا: "کیا ان غنڈوں کے منہ میں لگام نہیں دی جاسکتی؟ مجھے بتاؤ کہ یہ کیسی ڈکٹیٹر شپ ہے؟"

جن غنڈوں کے منہ میں لگام لگا دی گئی ان میں میکسیم گورکی بھی شامل تھا۔ اس کے اخبار "نووا یا زیزن" پر ایک ناموافق خبر شائع کرنے کے جرم میں پچیس ہزار روبل جرمانہ کیا گیا اور بعد میں اسے بالکل ہی بند کر دیا گیا۔ گورکی نے لینن کے ساتھ صلح کر لی تب بھی اسے اپنا اخبار جاری کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔

جمہوری سوشلسٹ اگر چاہتے تو لینن کے خلاف بروقت کارروائی کرکے اپنے آپ کو اور اپنے ملک کو انجام بد سے بچا سکتے تھے اور یہ کچھ دشوار بھی نہیں تھا۔ لینن روس کے دشمن ملک جرمنی کی مہیا کردہ بند گاڑی میں سفر کرکے روس پہنچا تھا۔ اس قسم کے شواہد بھی موجود ہیں کہ لینن کو جرمنی سے مالی مدد ملی تھی اور کئی حلقوں کی طرف سے لینن کے خلاف جرمن ایجنٹ ہونے کا نعرہ بلند ہو رہا تھا۔ ایسے وقت میں اگر جمہوری سوشلسٹ چاہتے تو لینن سے چھٹکارا حاصل کرنا دشوار نہیں تھا، لیکن ایک تو وہ تشدد کے، جس میں قید و بند بھی شامل ہے نظریاتی طور پر خلاف تھے اور دوسرے وہ اس واہمے میں مبتلا تھے کہ لینن کی گرفتاری سے ترقی پسند طاقتوں کے اتحاد میں، جسے ہر قیمت پر برقرار رہنا چاہیے، پھوٹ پڑ جائے گی۔ اس طرح انھوں نے لینن کو اپنی سازش کی تکمیل اور روس پر ایک جابرانہ نظام مسلط کرنے کا موقع فراہم کر دیا جس کے اولین کشتے وہ خود تھے۔

لینن کے عقائد کی حامل پارٹی ہندوستان میں بھی موجود ہے، جس کے بارے میں وزیر اعظم مرارجی ڈیسائی نے انتخاب سے پہلے یہ کہا تھا کہ "کمیونسٹ ہمارے اندر ٹرائے کا گھوڑا ہیں۔" ٹرائے کا یہ گھوڑا کبھی بھی جمہوریت کی تباہی کا منصوبہ بنا سکتا ہے اور جیسا کہ چیکوسلواکیہ پر سوویٹ بلاک کے حملے نے ثابت کر دیا تھا، ان منصوبوں کو روس کی مسلح مدد بھی مل سکتی ہے۔ اس لیے اگر ہم جمہوریت کا تحفظ واقعی مقصود ہے تو ٹرائے کے اس گھوڑے کو تباہ کرنا بہت ضروری ہے۔ مسٹر مرارجی ڈیسائی نے اپنی تقریروں کے دوران روس اور ہندوستان کے نظام حکومت کے فرق کی پردہ پوشی ضروری نہیں سمجھی اور مشرق وسطیٰ بالخصوص مصر اور لیبیا کے واقعات گواہ ہیں کہ روس ایسے ملکوں کے ساتھ بھی دوستی نباہ سکتا ہے جو مقامی کمیونسٹوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ ہوں۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہندوستان میں مقامی کمیونسٹوں کا خاتمہ ہند اور روس کے درمیان خوشگوار تعلقات میں حائل ہو۔

▲▲

ڈاکٹر فضل امام کی چند کتابیں

بھوجپوری ادب کا تعارف: اُردو زبان میں اس موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے جو بھوجپوری زبان و ادب کا مکمل تعارف کراتی ہے۔ قیمت: چار روپے۔

امیر اللہ تسلیم، حیات اور شاعری: یہ وہ مقالہ ہے جس پر مصنف کو پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری دی گئی۔ قیمت: بیس روپے

نغمۂ مسلسل یا گوہر انتخاب: امیر اللہ تسلیم کی یہ مثنوی نایاب تھی۔ ڈاکٹر فضل امام نے اس کا ایک قلمی نسخہ دریافت کیا اور اب اسے اپنے مبسوط مقدمے کے ساتھ شائع کر دیا ہے۔ قیمت سات روپے۔

افکار و نظریات: تنقیدی مضامین کا مجموعہ۔ قیمت: ۱۲ روپے۔

نیشنل اکاڈمی سے طلب کریں

کرشن موہن　　غزل

نانا پچپن کا ہے، نانی انچاس کی
پھر بھی ہے تیز دھار اُن کے احساس کی

بات کرتے ہیں یاقوت و الماس کی
اپنی رُوداد ہے دِل کے افلاس کی

بھوگ کا روگ ہیں پالتے اب تلک
گرچہ یہ عمر ہے یوگ ابھیاس کی

گھر میں رہ کر بھی ہیں گھر سے باہر رہا
ایک یہ بھی کہانی ہے بن باس کی

کر گئی ہے رسیلی مری زیست کو
جاں فزائی تری بوئے انفاس کی

اب تو میکے ہی میں جا بسی ہے بہو
کیا غضب چپقلش تھی بہو ساس کی

مجھ کو غم کیوں نہ محسوس ہو مغتنم
یاد ہے میری خوشیوں کے اِجلاس کی

دو ہیں مطلعے غزل کے تو مقطعے بھی دو
قدرتِ فن ہے یہ قلبِ حساس کی

کرشن موہن ہمارا دلِ مُبتلا
بات کرتا ہے دِن رات سنیاس کی

کرشن موہن مِلن بھی ہے فُرقت اثر
زندگی کشمکش آس اور یاس کی

۵۵

شہریار | چار نظمیں

۱
یہ دُنیا کیسی ہے

ان آنکھوں نے دیکھا ہے
جب دھرتی پیاسی تھی
پانی کی بوندوں کا
پتھر بن جم جانا
بارش کا تھم جانا
ان آنکھوں سے پوچھو
یہ دُنیا کیسی ہے

▲▲

۲
نئے سفر کا عزم

سڑکوں پر آوارہ گردی ختم کرو
اُن گلیوں میں گھر ہیں
گھر ہیں سب خالی
دستک دینے سے لیکن کھل جاتے ہیں
تم آگے جاؤ
ہم پیچھے آتے ہیں

▲▲

۳
بے رنگی کے خلاف احتجاج

کُھلی چھت پر برہنہ سر اکیلے
کھڑے ہیں صف بہ صف افسردہ سائے
اندھیری رات کا یہ آخری پَل
کوئی صورت ہو ایسی، بیت جائے
کہ اس منظر سے ہم اُکتا چکے ہیں

▲▲

۴
سوچنا کتنا آسان ہے

دھند اور آنکھ کے درمیاں
کون ہے
ہونٹ، بازو، گریبان
کیوں ریت کو
مٹھیوں سے رہائی کا ارمان ہے
سوچیے، سوچنا کتنا آسان ہے

▲▲

شعبۂ اُردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

پہلا بچہ
چراغ خاندان ہے
اُسے توانا اور
صحت مند بننے کا
پورا موقع دیجئے۔
اس کے لئے لازم ہے کہ دوسرا بچہ مزید تین سال تک پیدا نہیں ہونا چاہئے ...
پہلے تین سال بچے کی ذہنی اور جسمانی نشوو نما کے
بڑے اہم ہیں۔ یہی وقت ہے جب بچے کو آپ کے پورے
پیار اور نگہداشت کی ضرورت ہے۔ یہ تبھی ممکن ہے اگر
آپ پر پہلے بچے سے چھوٹا ایک اور بچہ پالنے کی ذمہ داری نہ ہو۔
دو بچوں کی پیدائش کے درمیان تین سال کا وقفہ
ماں اور بچہ دونوں کی صحت کے لئے بڑا ضروری ہے
یہ وقفہ نرودھ، گولیاں یا آئی۔یو۔ڈی کے استعمال سے
یقینی بنایا جا سکتا ہے۔
مزید تفصیلات کے لئے اپنے قریب ترین صحت مرکز
سے رجوع کیجئے۔
پہلے بچے کا حق اور ادھیکار — پہلے تین سال تک پورا پیار
davp 77/100
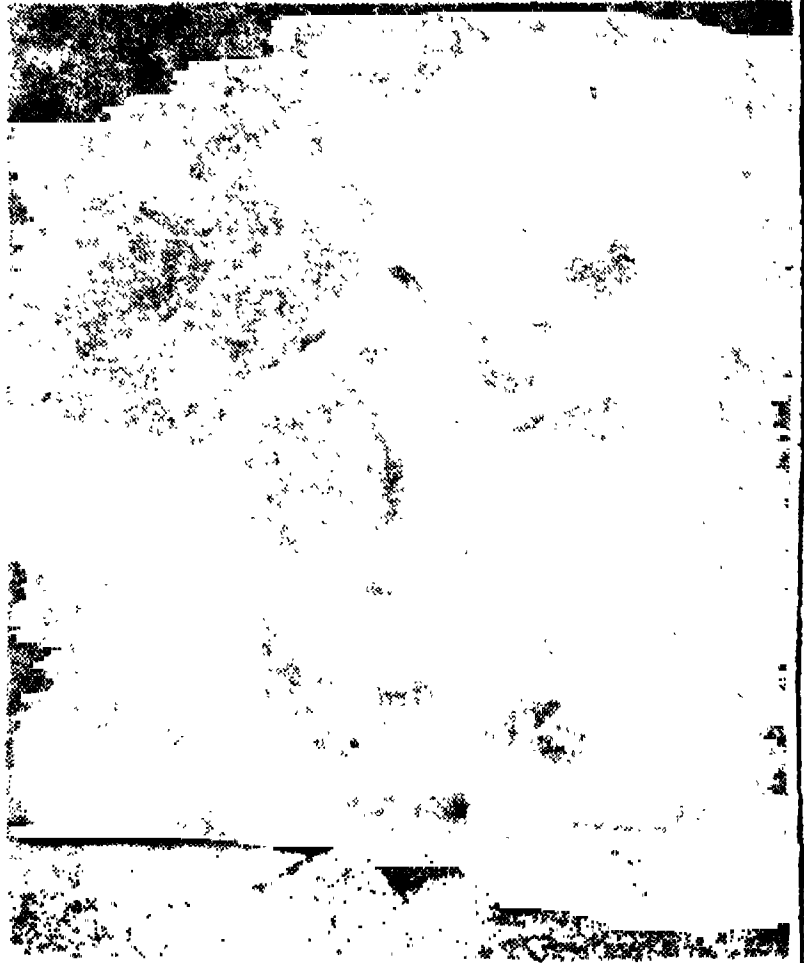
اُردو میں نثری شاعری کا مُستقبل

سلیمان اطہر جاوید

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید کا یہ مضمون نثری شاعری کی حمایت میں ہے۔ ایک سوال اس میں یہ اُٹھایا گیا ہے کہ کسی نثری شعر پارے کو نظم کہنا درست ہوگا یا نہیں؟ ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ لفظ نظم کا یہ استعمال غلط فہمی پیدا کرتا ہے اس لیے اسے ترک کر دینا چاہیے۔

منظر امکانی جو پاکستان کے ایک معروف ادیب ہیں، ان کا مضمون "کالی بلی اور نثری نظم" شاعری کی بعض عاصی توجیہات کے ساتھ ایک مختلف نقطۂ نظر کو سامنے لاتا ہے۔ ہم یہ دونوں مضمون ساتھ شائع کر رہے ہیں اور اپنے پڑھنے والوں کو بھی اس مسئلے پر اظہارِ خیال کی دعوت دیتے ہیں۔

— ادارہ

شعر میں وزن اور قافیہ کی اہمیت مسلّم، لیکن شاعری کی بنیاد صرف وزن اور قافیہ پر نہیں ہے کسی زمانے میں یہ بات چونکا دینے والی رہی ہو لوگ اب اس کو رد نہیں کرتے بلا تکلّف قبول کر لیتے ہیں۔ وزن اور قافیہ سے شعر میں آہنگ پیدا ہوتا ہے، غنائیت بھی، جو قاری کے لیے بھی دلکشی اور دلآویزی کا باعث ہے اور سامع کے لیے بھی! وزن اور قافیہ کی راہ سے شعریت بھی در آئے۔ ایسا ہوتا تو ہے لیکن ضروری نہیں۔

اردو شاعری کا بڑا حصّہ بلکہ تقریباً تمام تر شاعری مرصّع مقفّیٰ اور مردّف ہے۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہونا چاہیے کہ اس مرصّع مقفّیٰ اور مردّف شاعری کا ایک حصّہ بھرتی کا ہے۔

قدماء نے وزن، قافیہ اور ردیف سے انحراف نہیں کیا ہے لیکن انھوں نے ان چیزوں کو شاعری کے لیے لمزوم بھی نہیں بتایا ہے۔ ارسطو نے "بوطیقا" میں کہیں بھی شعر کے لیے وزن کو لازم نہیں قرار دیا ہے۔ شبلی نے قدماء کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

"شاعری صرف وزن اور قافیہ کا نام نہیں ہے"[1]

مولانا حالی کے مطابق ایک محقق نے شعر کی تعریف اس طرح کی ہے کہ:

"جو خیال ایک غیر معمولی اور نرالے طریقے پر لفظوں کے ذریعہ سے اس لیے ادا کیا جائے کہ سامع کا دل اس کو سن کر خوش یا متاثر ہو وہ شعر ہے، خواہ نظم میں ہو اور خواہ نثر ہو"[2]

اس سلسلے میں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ مولانا حالی یہ تحریر کرتے ہوئے کہ "نفسِ شعر وزن کا محتاج نہیں" قافیہ کے بارے میں رقمطراز ہیں:

"قافیہ بھی ہمارے ہاں شعر کے لیے ایسا ہی ضروری

---

[1] "شعر العجم" (حصّہ اول) طبع پنجم۔ ص ۹
[2] "مقدمۂ شعر و شاعری" مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ستمبر ۱۹۶۹ء۔ ص ۱۴

ریڈر شعبۂ اُردو۔ ایس وی یونیورسٹی۔ تروپتی (اے۔ پی)

کہا گیا ہے جیسے کہ وزن۔ مگر درحقیقت وہ بھی نظم
کے لیے ضروری ہے، نہ شعر کے لیے"۔[۱]

حالی نے یہاں "نظم" اور "شعر" کے فرق کو ملحوظ رکھا ہے۔ نثری شاعری کے بارے میں جاریہ مباحث کا منفی پہلو یہ ہے کہ اس اہم فرق کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ نثری شاعری کے تعلق سے غلط فہمی اور نامناسب ردّ عمل کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے۔ بیشتر حلقوں میں نثری شاعری کو "نثری نظم" سے موسوم کیا جاتا ہے "نثر" اور "نظم" دو علیحدہ چیزیں ہیں نثری شاعری ان دونوں کا آمیزہ یا مرکب نہیں۔ قافیہ، ردیف اور وزن سے بے تعلق ہونے کی وجہ سے اس کا "نظم" سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔ یہ "منظوم" نہیں "منثور" ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کو "نثری نظم" کہنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ نیز جب شاعر کا ادعا بھی یہی ہے کہ وہ کسی خیال کو منظوم نہیں کر رہا ہے تو پھر اس کی تخلیق کو نظم کہنے کا جواز ہی کیا ہے؟ خواہ "نثری نظم" ہی کیوں نہ کہا جائے! انگریزی میں اردو کی طرح کسی غلط فہمی یا نامناسب ردِّ عمل نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ انگریزی میں اس کو PROSE POETRY کہا گیا ہے جو اس کی صحیح پہچان ہے۔ ہمارے ہاں بھی اس کو "نثری نظم" نہیں "نثری شاعری" کہنا چاہیے۔

اُردو میں آزاد اور معرّیٰ شاعری کا رواج مدت سے ہے لیکن ان دنوں جب کہ نثری شاعری بھی رواج پاتی جا رہی ہے وزن اور قافیہ وغیرہ سے مزید بے اعتنائی کا رجحان ہے شاعری کے لیے ان چیزوں کی اہمیت اپنی جگہ۔ لیکن جیسا کہ سجاد ظہیر نے نثری شاعری کے اپنے مجموعہ "پگھلا نیلم" میں تحریر کیا ہے:

"میرا اپنا خیال یہ ہے کہ اصلی اور اچھی شاعری بحر،
وزن یا قافیہ کی پابندی کے ساتھ بھی کی جا سکتی ہے
اور کی گئی ہے اور اُن کے بغیر بھی"۔[۲]

ڈاکٹر محمد حسن نے، جنھوں نے نثری شاعری بھی کی ہے اور نثری شاعری پر مضامین بھی تحریر کیے ہیں، ایک جگہ لکھا ہے:

"خیال اور جذبہ اگر موثر ہو تو بیساکھیوں کی ضرورت
نہیں پڑتی اور وزن اور بحر دونوں سے بے نیاز
ہو کر بھی شاعری بن سکتا ہے"۔[۳]

ایک اور شاعر علی نے جن کا سارا شعری سرمایہ نثری شاعری پر مشتمل ہے، یہی بات قدرے کڑے لہجہ میں یوں کہی ہے:

"جدید شعراء اپنے زمانے کے زہریلے کوڑے
کھا کر اس تجربے کو بیان کرنا چاہ رہے ہیں۔ جو اُن
کو چین نہیں لینے دیتا۔ اور جو کوڑے کھا کر اپنی
تکلیف بیان کرتا ہے وہ اپنے بیان کی واہ واہ
نہیں طلب کرتا وہ بحر اور قافیے کے تکلف میں
پڑ کر اس تجربے کو ثانوی حیثیت بھی نہیں دینا چاہتا
جو نسل جسم و روح کی ناکامی سے دوچار ہو وہ
کیسے آپ کی تفریح کے لیے قافیے جمع کرتی پھرے
گی"۔[۴]

ارسطو سے علی تک کے جو خیالات اوپر پیش کیے گئے ہیں اُن سب میں شاعری اور وزن و قافیے کچھ ایسے لازم و ملزوم نہیں قرار پاتے۔ شاعری کے لیے بنیادی اہمیت مواد، فکر اور خیال کو دی جانی چاہیے۔ نثری شاعری میں ان کی اہمیت اور افزوں ہو جاتی ہے یہاں وزن، ردیف اور قافیے اور اس سے پیدا ہونے والے ترنم اور آہنگ سے "واہ واہ" حاصل کرنے کے سارے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ نثری شاعری کے لیے فنکار کو صاحبِ فکر اور صاحبِ شعور ہونے کی ضرورت ہے محض ردیف اور قافیہ کی شعبدہ بازی کام نہیں آ سکتی۔ نثری شاعری ذہن و فکر کی شاعری ہے۔ پیرایۂ اظہار کی شاعری نہیں۔ نثری شاعری ساخت

---

[۱] "مقدمہ شعر و شاعری"۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ستمبر ۱۹۶۹ء، ص۱۲۷
[۲] "پگھلا نیلم"۔ صفحہ نمبر ندارد
[۳] مضمون "نثری نظموں کی حمایت میں" ماہنامہ "کتاب" لکھنؤ اپریل ۱۹۷۳ء
[۴] "کاسۂ روح" نیشنل فائن پرنٹنگ پریس حیدرآباد۔ ۱۹۷۰ء، ص۲

STRUCTURE کی نہیں بافت TEXTURE کی شاعری ہے - جہاں تک شعری آہنگ اور غنائیت کا سوال ہے یہ سوچنا ہی لاحاصل ہے کہ آہنگ، وزن اور قافیہ ہی سے پیدا ہو سکتا ہے یا پیدا ہوتا ہے - آہنگ اور غنائیت ان سے ماورا بھی ہیں، وہ بجائے خود مواد، فکر اور خیال سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ بودلیئر نے جس کو نثری شاعری میں باوا آدم کی حیثیت حاصل ہے PETITS POEMS EN PROSE میں لکھا ہے کہ "ایک شاعرانہ نثر بغیر قافیہ اور وزن کے بھی غنائیت کی حامل ہو سکتی ہے"۔ بعض لوگوں کو گویا ان ساری باتوں سے اختلاف ہے - پاکستان کے معروف ادبی جریدہ "اوراق" میں ایک عرصہ تک اس خصوص میں بحث رہی کہ نثری نظم (شاعری) کا موقف کیا ہو؟ "اوراق" کا کہنا یہ تھا کہ چونکہ نثری "نظم" شعری آہنگ سے محروم ہے اس لیے اسے نظم کے زمرے میں شامل کرنا غلطی ہوگی - "اوراق" کے ایک شمارے میں ایسی نثر کے لیے جو شاعری کے قریب تر ہے لیکن ایک آنچ کی کسر سے نظم بننے سے محروم رہ گئی ہے، ڈاکٹر وزیر آغا نے "نثرِ لطیف" کا نام تجویز کیا ہے - [اس کا اشارہ انور سدید نے "۱۹۷۵ء کی بہترین نظمیں" (مکتبہ اردو زبان۔ سرگودھا) کے "پیش لفظ" میں کیا ہے - ملاحظہ ہو، ہفت روزہ "ہماری زبان" ۲۲ راگست ۷۶ء]

میں نثری شاعری کو "نثرِ لطیف" کہنے میں کوئی خوبی یا مناسبت نہیں پاتا - "ایک آنچ کی کسر" کہنا بھی عجیب سا ہے - "ایک آنچ کی کسر" اس وقت کہی جا سکتی ہے جب کہ شاعر نے نثری شاعری کی کوشش نہیں کی تھی لیکن اُس کے عجزِ زبان و بیان اور فن پر قابو نہ ہونے کے باعث اس میں نثریت در آئی اور ایک آنچ کی کسر رہ گئی - نثری شاعری تو وہ ہے جس میں کسی عجز کے باعث ایک آنچ کی کسر نہ رہ گئی ہو بلکہ شاعر نے ارادتاً نثریت پیدا کی ہو - یہ عجزِ فن نہیں کمالِ فن ہے -

نثری شاعری پر ایک اور اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ شاعر جب موضوع سے شخصی طور پر یا تجربے کی سطح پر ہم آہنگ نہیں ہوتا تو "نظم" عام طور پر نثری ٹکڑوں کی صورت میں بکھر جاتی ہے ممکن ہے بعض صورتوں میں ایسا ہو لیکن فنکار کا مقصود جب نثری شاعری ہو تو یہ کسی نوع کی ہم آہنگی کے فقدان کا نتیجہ نہیں بلکہ اظہار پر قابو اور موضوع سے تجربے اور شخصیت کی غیر معمولی ہم آہنگی کا نتیجہ ہوتا ہے - شعری آہنگ اور شعریت کے لیے ردیف - قافیہ اور وزن وغیرہ پر اصرار غیر ضروری ہے شعری آہنگ اور شعریت، تجربے، فکر، خیال، جذبے اور خلوص کی شدت سے پیدا ہوتے ہیں ورنہ کتنی ایسی غزلیں اور نظمیں ہیں جہاں سب کچھ ہے لیکن شعری آہنگ اور شعریت نہیں - اس کا مطلب یہ نہیں کہ نثری شاعری میں یہاں سے وہاں تک شعری آہنگ اور شعریت ناگزیر ہے - نثری شاعری سے ایسی مثالیں بھی دی جا سکتی ہیں جہاں اُن کا فقدان ہے تاہم اگر تجربہ، فکر، جذبہ، خیال اور خلوص کی شدت ہو تو عام منظومات ہوں یا نثری شاعری شعری آہنگ اور شعریت پیدا ہو ہی جاتے ہیں ——

نثری شاعری میں بظاہر خوبصورتی "محسوس" نہ کی جائے (اس کی وجہ بھی شاید یہ ہو کہ ہمارے یہاں بحر اور اوزان کے ساتھ شعری حسن اور خوبصورتی کا تصور وابستہ ہے) لیکن نثری شاعری میں فکر، جذبہ اور شاعرانہ احساس کے باعث داخلی خوبصورتی پائی جاتی ہے۔ شاعر نثر کو یوں بھی اختیار کرتا ہے کہ اُس کی فکر کی ترسیل روانی، صفائی اور سادگی سے اور بلا واسطہ ہو —— قطع نظر اس کے اگر کوئی نثری شاعری پر اصرار کرتا ہے اور اسی کو باعثِ خیر و برکت اور ذریعۂ نجات متصور کرتا ہے تو یہ بھی نامناسب ہے، بالکل اسی طرح جیسے کوئی صرف کلام منظوم ہی کو شاعری قرار دیتے ہوئے اسی کو ذریعۂ نجات متصور کرے!

ایسے لوگ پہلے بھی تھے جو وزن اور قافیہ وغیرہ کو سب کچھ نہ سمجھتے ہوئے وزن اور قافیہ کی پابندی کرتے تھے - اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ معاشرتی فضا پُر سکون تھی - معاشرہ پُر تصنع اور پُر تکلف زندگی کا عادی تھا - اور پھر لوگ شاعری کو زبان و بیان کی خوبصورتی اور فن سے لطف اندوز ہونے کی چیز سمجھتے تھے - آج معاشرہ بحران کا شکار ہے، حقیقت

پسندی عام ہے اور عام ہوتی جارہی ہے۔ آج کا فرد تکلفات اور رسم و رواج کو نہ تو برتنا چاہتا ہے اور نہ برت سکتا ہے۔ مسجع اور پُر تکلف تصنع زبان اب گئے وقت کی راگنی ہو چکی ہے۔ نثری شاعری مافی الضمیر کے سیدھے سادے اور راست اظہار کی ایک ارادی کوشش ہے۔ اس امر کا خیال کیا جانا چاہئے کہ اس کی نثری ترتیب میں تعقید نہ ہو۔ تعقید پیدا کرنا۔ الفاظ کو ادھر اُدھر کر دینا اور اپنی دانست میں آہنگ پیدا کرنے کی خاطر مصرعوں کی ترتیب کو پلٹ دینا، نہ صرف یہ کہ نثری شاعری کے آہنگ کو متاثر کرتا ہے بلکہ اس طرح نثری شاعری کی اساس ہی متزلزل ہو جاتی ہے۔ قطع نظر اس کے آہنگ دو طرح کا ہوتا ہے۔ خارجی اور داخلی، خارجی آہنگ لسانی اور عروضی ہوتا ہے۔ عروضی زیادہ! اسی وجہ سے یہ قافیہ اور ردیف وغیرہ پر منحصر ہوتا ہے۔ نثری شاعری میں اس سے صرفِ نظر کرنا پڑے گا نثری شاعری میں بنیادی اہمیت داخلی آہنگ کی ہے اور یہ جذبہ و احساس سے پیدا ہوتا ہے۔ نظم میں بھی جذبہ اور احساس کی اہمیت سے انکار نہیں لیکن اس کی اہمیت نظم کے مقابلہ میں نثری شاعری میں زیادہ ہے کہ یہاں قافیے اور ردیف جیسے سہارے نہیں ملتے۔

—— ان تصریحات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اگر یہ کہا جائے کہ وہ نثر جس میں شعری خصوصیات ہوں لیکن جو نثر نہ کہلائے نثری شاعری ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے نثری نظم (شاعری) کی تعریف یوں کی ہے:

"کوئی ایسا فن پارہ جس میں بحور او راوزان کی روایتی رسمیات سے قطع نظر کر کے زبان کا زندہ رہنے والا استعمال کیا گیا ہو اور خاموشی کے وقفوں سے مناسب قالب سازی کی گئی ہو نیز اس میں وہ معنیاتی وحدت بھی ہو جسے عرفِ عام میں نظم سے منسوب کیا جاتا ہے تو ایسے فن پارے کو نثری نظم (شاعری) کہیں گے"۔[1]

پروفیسر نارنگ اس تعریف کو جامع اور مانع قرار نہیں دیتے لیکن اُن کے بموجب اس سے نثری نظم کی پہچان ممکن ہے۔

نثری شاعری میں مصرعوں کا وہ موقف نہیں ہوتا جو کسی غزل یا نظم میں ہوتا ہے۔ یہاں مصرعے ہوتے ہیں لیکن ہر تحدید سے آزاد! اس کے باوجود یہ مصرعے آہنگ، تاثیر، امیجری، اظہار کی شدت، غنائیت اور اسلوب کی چاشنی اور رچاؤ سے مزین اور آراستہ ہو سکتے ہیں۔ لالہ کار!

اُردو میں نثری شاعری اُن شاعروں کے ہاں بھی ملتی ہے جن پر روایات کی گہری چھاپ ہے۔ اُن کے ہاں بھی جنھوں نے ایک طرح سے شعری روایات اور معاشرتی قدروں سے بغاوت کی اور اُن سے چھٹکارا حاصل کیا اور اُن لوگوں نے بھی نثری شاعری کی سمت توجہ دی ہے جنھوں نے شاعری کی سمت ہی توجہ کم کی تھی یا بالکل نہیں ——

نثری شاعری ایک طرح سے فکر و فن کا کاروبار ہے۔ یہاں "شاعری برائے شاعری" ممکن نہیں معجزۂ فن سے خونِ جگر کی نمود ہو سکتی ہے۔ ان سطور کا مطلب یہ بھی نہیں کہ نثری شاعری از اول تا آخر فکر و فن کی شاعری ہے۔ یہاں بھی بعض شاعروں نے یا بعض شاعروں نے اپنی بعض تخلیقات میں سہل پسندی اور تن آسانی کا مظاہرہ کیا ہے میرا کہنا یہ ہے کہ اور طرح کی شاعری میں اور طرح سے بھی دلکشی پیدا کی جا سکتی ہے۔ نثری شاعری میں "اس اور طرح" کی گنجائش ہی نہیں۔ اس میں فکر و فن کی کارفرمائی نہ ہو تو وقت اور صلاحیتوں کا ایضاع ہوگا کاغذ اور روشنائی کا بھی!

اُردو میں نثری شاعر عصری حسیت کے حامل ہیں۔ زندگی کی کڑی اور کڑوی حقیقتوں کو انھوں نے جھیلا ہے کشاکش زندگی سے وہ نبرد آزما رہے ہیں۔ خیر و شر کی کشمکش کا انھوں نے تماشا دیکھا ہی نہیں تماشا بنے بھی ہیں۔ یہ لوگ نئی نسل کے اس طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں جس نے خارج کی چکا چوند، دلکشی اور رعنائی کو سب کچھ نہیں جان

---

[1] دو ماہی "الفاظ" علی گڑھ۔ مارچ، اپریل ۱۹۷۷ء ص۱

یا۔ انھوں نے درونِ پردہ کا نظارہ بھی کیا ہے اور حالات و حوادث کے اسباب وعلل سے واقف رہے ہیں۔ اُن کا اپنا زاویۂ فکر اور زاویۂ نظر ہے۔ نہ تو اُن کی فکر مستعار ہے اور نہ نظر ——— علیؔ کی یہ تخلیق ہے معنویت سے کس قدر بھرپور ہے ؎

سرکاری لغت میں
بہت تلاش کیا
لیکن ان الفاظ کے
معنی نہ ملے !
جبل پور ، رانچی
احمد آباد

احمد ہمیش دھیمے لب و لہجہ میں لیکن وزن و وقار کے ساتھ اس کرب کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ان کی تخلیقات خصوصاً "تجدید ۱" "تجدید ۲" اور "تجدید ۳" میں اگر نثریت اپنے نقطۂ عروج سے ہمکنار ہے تو معاشرتی بحران کے انعکاس میں بھی وہ اپنا حق ادا کر جاتی ہیں۔ "تجدید ۲" کا اقتباس ہے ؎

۲ مارچ ۶۷ء
آج رات کے ٹھیک آٹھ بجے ایک آدمی اپنے ایوانی خاکداں میں
صفر صفر گر رہا
ہے یا،
وہ ان تمام ناتمام ایوانوں میں بسر ہو رہا ہے،
جن میں ہم سب کو بسر ہونا ہے اور نہ ایک عجیب اتفاق ہے۔

خلیل مامون نے "سانپ اور سڑک" میں معاشرتی بحران کو یوں آئینہ کیا ہے۔ کتنی عمدگی سے ہے ؎

میرے گھر کی سنگین دیواروں میں کوئی کھڑکی نہیں ہے
نہ کھڑکی پہ شفاف شیشہ ہے
رات بھر میری سنگین
دیواروں پہ اپنا سر پیٹ کر کوئی بھٹکتا ہے
اور پھر ہچکیوں کی صدا آتی ہے
میری سنگین دیواریں گھل جاتی ہیں ......

علی کے لہجہ میں تلخی بہت زیادہ ہے، کہیں زیادہ ! یہ شاعری، شاعری کہاں ؟ ایک چیخ، ایک احتجاج ہے ؎

ننگوں
اور بھوکوں کا
یہ انسانی کوڑا کرکٹ
سڑک پر
کس مجرم نے بکھیرا ہے ؟

خورشید الاسلام نے اپنے انداز میں بات کہی ہے ؎

خدا نے لوگوں کو
تخت اور تاج
دیا
اور مجھ سے کہا
کہ زمین اور آسمان
تیرے حوالے ہیں
ان پر نظر رکھنا

تفکر کی لئے بھی نثری شاعری میں کم نہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ نثری شاعری کا طرۂ امتیاز ہے تو خلاف واقعہ نہ ہوگا۔ ان شاعروں نے مسائل کی فلسفیانہ توجیہہ کی ہے لیکن ایسا نہیں کہ زندگی سے دور ہو چکے ہوں۔ تجربے کی وحدت، اور فہم و ادراک کے باعث نثری شاعری کی ایک اہم خصوصیت اس کا اختصار ہے۔ لفظ و بیان کا اختصار۔ یہاں فنکار طوالت سے کام نہیں لیتا، لے بھی نہیں سکتا۔ وہ مجمل اور مختصر طور پہ اپنی بات کو پیش کر دیتا ہے۔ دلنواز اور دلنشین انداز میں۔ علی کی یہ تخلیق ملاحظہ ہو ؎

اگر
انسان کی
آنکھ نہ ہوتی
تو
کائنات اندھی ہوتی

خورشید الاسلام کہتے ہیں ؎

پوری زندگی
کا حساب
کون دے سکتا ہے
حساب دینے کے لیے
پوری زندگی چاہیئے۔

نثری شاعری کے بارے میں ایک عام خیال یہ بھی ہے کہ چونکہ یہ ہماری روایتی شاعری کے خلاف ایک باغیانہ رجحان ہے اس لیے اس میں شعریت، رچاؤ، چاشنی اور رسرشاری نہیں پائی جاتی۔ یہ کھردرے، اکھڑے اکھڑے سپاٹ اور بے رنگ و رس اسلوب کی حامل ہے۔ یہ باتیں "ناشاعری" میں ممکن ہیں۔ نثری شاعری میں نہیں۔ نثری شاعری "ناشاعری" نہیں اس لیے شعریت اس کے دائرے سے خارج نہیں کی جا سکتی۔ جہاں تہاں شعریت نہ پائی جاتی ہو لیکن نثری شاعری سے ایسی بے شمار مثالیں دی جا سکتی ہیں جو شعریت سے بھرپور، رعنائی اور نکھار کی حامل ہیں۔

خورشید الاسلام کی نثری شاعری بسا اوقات تغزل سے رچی بسی لگتی ہے۔ مثلاً ؎

کیسا رنگیں گداز
ان ہونٹوں کو
بخشا گیا ہے
خالی جام بھی
انھیں دیکھ لیں
تو شراب سے
چھلکنے لگیں

ایک اور مثال احتشام اختر کے ہاں سے۔ عنوان ہے "جی چاہتا ہے" ؎

آج چاند کتنا قریب ہے
جی چاہتا ہے
ہاتھ بڑھا کر
اسے دل میں رکھ لوں

تاکہ اندھیری راتوں میں
اس کی روشنی کام آئے۔

ان مثالوں سے میرا مقصد یہ بھی ظاہر کرنا تھا کہ نثری شاعری نری اجتہاد یا بغاوت نہیں۔ یہ کچھ ایسے موضوعات اور مسائل کی بھی حامل نہیں کہ جو قبل ازیں اردو شاعری کے دائرے میں نہ آئے ہوں۔ نثری شاعری کو اردو شاعری میں ایک وسعت کے بطور قبول کرنا چاہیئے۔ ایک نئی وسعت! آج نثری شاعروں کی بڑی تعداد اپنا اظہار روانی، صفائی، سادگی اور رعنائی کے ساتھ کر رہی ہے اس کا ردّ عمل خوشگوار ہو رہا ہے۔ یہ تجرباتی منزلوں سے گزر کر ایک طرح سے اپنی حیثیت منوانے کے موقف میں آچکی ہے۔ آنے والے دنوں میں اس سے مزید شاہکاروں کی توقع کی جا سکتی ہے اردو شاعری میں گراں بہا، معتبر اور موقر اضافوں کی۔ بہر کیف مستقبل میں اردو کی نثری شاعری کے امکانات روشن اور امید افزا ہیں۔

نازش بک سنٹر کی پیش کش

گوپال متل

ایک مطالعہ

محمد عبدالحکیم کا تحقیقی اور تنقیدی مقالہ جو عثمانیہ یونیورسٹی کے ایم۔ اے۔ سال آخر کے لیے ڈاکٹر غلام عمر خاں کے زیر نگرانی قلمبند کیا گیا۔

گوپال متل کی صحافتی زندگی، ادوار ان کے ادبی اور شعری کارناموں کا بھرپور جائزہ۔

آخر میں گوپال متل کی نثری اور شعری نگارشات کا انتخاب بھی شامل ہے۔ قیمت: پندرہ روپے۔

نیشنل اکاڈمی سے طلب کریں

منظر امکانی

کالی بلّی اور نثری نظم

"نثری نظم" پر گفتگو سے قبل مَیں ایک اعتراف کرتا چلوں کہ مَیں نے دنیا کی بڑی شاعری تو نہیں پڑھی البتہ تھوڑا بہت جو ادب پڑھا ہے اس کے حوالے سے کہہ سکتا ہوں کہ ارسطو سے سلیم احمد تک تمام ناقدین کم از کم اس بات پر متفق ہیں کہ شاعری ہیئت کی پابند نہیں بلکہ شاعری تو ایک ایسا تخلیقی عمل ہے جو اپنی اعلیٰ سطح پر پہنچ کر الہامی کیفیت بن جاتا ہے۔ یہ الہامی کیفیت مذہبی کتابوں جیسی مقدس نہیں۔ مذہبی کتابوں کے الہام سے رشد و ہدایت ملتی ہے جبکہ شاعری ایک معلوم سے نامعلوم اور پھر اس نامعلوم سے ایک نئے معلوم تک کا سفر ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر شاعری ہیئت کے بغیر بھی ممکن ہے تو پھر نظم و نثر میں بنیادی فرق کیا ہے ؟ مجھے یہ تصور مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے کہ انسان ناچتا گاتا ہوا پیدا ہوا۔ مجھے قوتِ گویائی کی پہلی منزل نثر (گفتگو کا ذریعہ) معلوم ہوتی ہے۔ اظہار کے اس ذریعے نے فرد اور سوسائٹی میں ایک رشتہ قائم کر دیا تو فرد کو دیوتا یا نامعلوم قوت سے رشتہ پیدا کرنے کی جستجو ہوئی جو اسے سوسائٹی سے زیادہ قوی اور بلند محسوس ہوا۔ اس بلند ہستی کے لیے فرد نے اظہار کے اس ذریعے (عام گفتگو) کو کمتر سمجھا۔ دراصل فرد اس نامعلوم ہستی کی تعریف خوشنودی حاصل کرنے کے لیے چاہتا تھا لہٰذا اس نے خود سے بلند شخصیت کے لیے جو اعلیٰ ذریعۂ اظہار تلاش کیا وہ شاعری تھی (نظم کی وہ شکل جسے عام معنوں میں شاعری کہتے ہیں) شاعری کا یہ منصب یونانی عہد تک دکھائی دیتا ہے بلکہ اس کی بعض شکلیں تو تصوف میں آج بھی باقی ہیں۔

اسی یونانی سرزمین پر انسان اور کائنات کے بارے میں مختلف نقطۂ نظر سے سوچنے کا عمل دکھائی دیتا ہے۔ انسان نے پہلی بار معروضیت کو موضوعی بنا کر سوچا اور موضوعی احساسات کو معروضیت سے ملا کر دیکھا۔ یہی وہ منزل تھی جب شاعری آہنگ سے آزاد ہوئی اور نثر میں بھی شاعری کے امکانات پیدا ہوئے۔

مَیں ایک چھوٹی سی مثال سے اپنی بات کی مزید وضاحت کرتا چلوں۔ کائنات اپنے تمام حسن کے باوجود انسانی احساسات کو اسی وقت متاثر کرتی ہے جب انسان اسے ذات کے حوالے سے دیکھتا اور سمجھتا ہے۔ اس مشاہداتی عمل سے انسان اور کائنات میں جو رشتہ قائم ہوتا ہے اسی سے انسان میں رجائیت اور قنوطیت پیدا ہوتی ہے۔ (اس تصادم سے فرد کا جو کردار تشکیل پاتا ہے وہ دراصل دوسرا مرحلہ ہے فرد کا کردار اس کی پہلی تربیت گاہ میں تشکیل پاتا ہے جس کے اثرات پوری زندگی باقی رہتے ہیں) اس رجائیت اور قنوطیت کے اختلافات کے باوجود انسان میں ایک قدرِ مشترک پیدا ہوتی ہے۔ اس قدرِ مشترک کو کائنات سے ہم آہنگی کہہ سکتے ہیں۔ یہی ہم آہنگی داخلیت سے خارجیت کا رشتہ قائم کرتی ہے۔

نثر فطرت کے حسن کی طرح کائناتی شکل ہے اور نظم فطرت سے ہم آہنگی کا وہ ذریعہ ہے جو فرد ذات کے

۳۳۹/۵ لیاقت آباد، کراچی ۱۹ (پاکستان)

حوالے سے قائم کرتا ہے۔ نظم میں اس داخلی اور خارجی امتزاج
سے جو آہنگ پیدا ہوتا ہے۔ اس میں بقول ڈاکٹر وزیر آغا
خارجی آہنگ تو گویا دھڑکن ہی مہیا کرتا ہے اور داخلی آہنگ
توازن اور تناسب۔ نظم کی یہی خوبی اسے نثر سے الگ کر
دیتی ہے۔ احساس کو لفظوں کی صورت میں ڈھال کر مقررہ
ہیئت میں سمونا اس اعتبار سے بھی قابلِ قدر ہے کہ اس طریقۂ
کار سے فنکار میں تنظیم ذات کا شعور بھی پیدا ہوتا ہے۔ یہاں
ایک خطرناک مرحلہ یہ پیش آتا ہے کہ بعض اوقات فنکار خارجی
حسن سنوارنے میں داخلی احساس اور معنویت کو نظر انداز کر
دیتا ہے جس کی وجہ سے نظم میں آہنگ تو دکھائی دیتا ہے
مگر اس میں تنظیم باقی نہیں رہتی۔ اس کے برعکس جب فنکار
داخلی تنظیم کو سب کچھ سمجھ لیتا ہے تب بھی فن پارے میں
جامعیت پیدا نہیں ہوتی۔ فطرت سے پوری ہم آہنگی
کے بعد ہی فنکار میں یہ قوت پیدا ہوتی ہے کہ وہ اپنے فن
پارے میں الہامی کیفیت محسوس کرتا ہے۔

نثر اور نظم کا بنیادی فرق اپنے ابتدائی معنوں میں
ایک "اکائی" سے دوسری "اکائی" میں شامل ہونے کا رویہ ہے۔
جب یہ اکائیاں آپس میں مل جاتی ہیں تو ایک "کُل" کی
تلاش ہوتی ہے۔ اسی "کُل" میں پوری طرح شامل ہونے
کے بعد جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ یہی اعلیٰ شاعری ہے۔ اس
کی واضح مثال ادب کے وہ چھوٹے چھوٹے تجربے ہیں جو اعلیٰ
ادب کی تخلیق میں خام مال کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کسی بھی معاشرے
میں اعلیٰ ادب اسی وقت تخلیق ہوا ہے جب اس معاشرے میں
چھوٹے چھوٹے تجربے کیے گئے ہوں۔ ادب میں یہی تجربے
مختلف اکائیوں کے باوجود روحِ عصر کی گواہی بنتے ہیں۔

مجھے اس حقیقت سے انکار نہیں کہ ادب میں تجربے
زندگی کی علامت ہیں مگر اس سلسلے میں ایک بنیادی سوال
ذہن میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ ادب کس قسم کے تجربوں سے
پروان چڑھتا ہے ...... ؟ اگر صرف ہیئت کی تبدیلی
سے ادب عظمت پاتا ہے تو گزشتہ چالیس پچاس سال
میں جو ادب تخلیق ہوا ہے اس میں ہزاروں کوششوں کے
باوجود صرف دو نام ہی کیوں باقی رہے ؟ ایک میراجی اور
دوسرے ن۔ م۔ راشد۔ ادب میں حالی کا تجربہ داخلی
احساس کی تبدیلی کا رویہ کہلاتا ہے۔ حالی نے مقصدیت
کو اہمیت دی۔ جس میں بنیادی پہلو معاشی نقطۂ نظر تھا
جو آئندہ اصلاحی صورت اختیار کر گیا۔ حالی کے اس تجربے
میں منفی اثرات کے باوجود ایک قوت تھی ادب میں ایک
تجربہ میر کی شاعری میں دکھائی دیتا ہے۔ کلیاتِ میر
پوری اردو شاعری کا وہ زندہ شاہکار ہے جس سے
اسلوب کا ہر ذریعہ پیدا ہوا۔ دراصل کسی بھی فنکار کا
تجربہ اس کے REALITY PRINCEPLE کے
ردِ عمل سے وجود میں آتا ہے۔ غالب میں جو خارجی حقیقت
زندگی اور محبوب سے کشمکش پیدا ہوئی اس کی بنیادی
وجہ داخلی انانیت تھی جس کی بدولت غالب ہر چیز
کو خود سے کم تر محسوس کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے
برعکس میر نے ایک طرف تو عشق پر غور کیا اور دوسری
طرف زندگی کے بنیادی حقائق اور مجبوریوں کا قریب ہو کر
مطالعہ کیا۔

خیر چھوڑیئے میں عرض یہ کر رہا تھا کہ نظم آہنگ ہی
نہیں تنظیم ذات کا بھی ذریعہ ہے اسی تنظیم سے فنکار میں
وہ قوت پیدا ہوتی ہے جو اسے اعلیٰ تخلیق میں مدد دیتی
ہے جہاں تک اعلیٰ شاعری کا تعلق ہے تو یہ اپنے وسیع
معنوں میں نثر میں بھی ممکن ہے اور نظم میں بھی بعض اوقات
تمام پابندیوں میں بھی ممکن نہیں ہوتی۔

کسی بھی فن پارے میں اعلیٰ شاعری اس فن پارے
کا خارجی حسن سنوارنے سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ اعلیٰ شاعری
تو فن پارے کے وجود سے ابھرتی ہے۔ جس میں ایک
طرف تو داخلی حسن ہوتا ہے دوسری طرف یہ خارجی سطح
اور اظہار میں بھی متاثر کرنے کی بھرپور قوت رکھتی ہے۔
فن پارے کے اسی ظاہری حسن اور چمک سے بعض لوگ
یہ نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ سب کچھ خارجی شکل ہی ہے۔ فن پارے
میں اعلیٰ شاعری فنکار کے سوچے سمجھے ردِ عمل کا نام نہیں۔

دراصل فنکار کسی بھی تجربے سے گزرنے کے بعد اسے
اظہار کی صورت دیتا ہے تو اس کا مقصد یہ نہیں کہ فنکار
ادب اور شاعری سے تسکین چاہتا ہے۔ تخلیقی عمل سے تو
اذیت بڑھ جاتی ہے فنکار کو لاشعوری کرب شعوری
طور پر برداشت کرنا پڑتا ہے۔ جہاں تک اظہار کا
تعلق ہے تو اس کے بعد بھی پوری طرح تسکین ممکن نہیں
اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی بھی جذبے کے اظہار کو پوری
طرح سامنے لانے میں جو چیز سب سے پہلے رکاوٹ بنتی
ہے وہ زبان اور لفظ ہیں جن سے ٹکرا کر جذبہ کسی حد تک
مختلف صورت اختیار کر لیتا ہے اس کے بعد سماجی اور
معاشرتی اقدار ہیں جن کی پابندی بھی کسی حد تک ضروری
ہوتی ہے۔ جذبہ اس انداز کی پابندی کے بعد جب اظہار
کی شکل میں ڈھل کر سامنے آتا ہے تو اس کی کیفیت
اس ساز جیسی ہوتی ہے جس میں گلوکار کی آواز بھی
شامل ہوتی ہے۔ جس سے ایک نیا آہنگ اور تاثر
قائم ہوتا ہے۔

ادب میں سب سے بڑا مرحلہ تو شخصیت کی
پہچان اور انفرادیت ہے اس سے پہلے جو مرحلہ پیش
آتا ہے وہ کسی بھی تجربے کے بارے میں فنکار کا ذاتی
رویہ ہے۔ اس ذاتی رویے میں فنکار کی شخصیت کو
نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ایک زندہ انسان میں ہزاروں
انسان پوشیدہ ہوتے ہیں۔ اگر کسی بھی تجربے میں فنکار
نے اپنے اندر کی ان لاتعداد اکائیوں کو ایک "کل" میں
تبدیل کر کے تجربے کو محسوس نہیں کیا تو اظہار میں فنکار
کی شخصیت کے اس حصے کا بڑا اثر ہوگا جس نے تجربے
کے دوران زیادہ متاثر کیا ہے۔ فنکار کا اس اندرونی
کشمکش اور اکائیوں کو "کل" میں لانے کا عمل ہی تخلیقی
ادب میں اہم مرحلہ ہے۔

فنکار دیگر انسانوں کی طرح سوسائٹی کا ایک فرد
ہوتا ہے۔ ایک عام آدمی اور فنکار میں صرف یہ فرق
ہوتا ہے کہ عام آدمی زندگی اور معاشرتی احساسات
کے اظہار اور محسوس کرنے میں اپنی شخصیت کی کسی ایک
اکائی کو سب کچھ سمجھ لیتا ہے جبکہ فنکار تجربے کو ذات کے
"کل" میں شامل کرنے کے بعد اظہار کی صورت دیتا
ہے۔ فنکار کے اس رویے سے ایک طرف ادب
پورے عہد کی نمائندگی کرتا ہے اور دوسری طرف اس
میں نظریاتی انداز پیدا نہیں ہوتا۔

نظریات کی عظمت تو چھوٹے بھیوں سے کہیں بھی سن
لیجیے گا۔ ادب میں نظریات کے سہارے گاڑی نہیں چلتی۔ اس
کی ایک مثال تو ضیا جالندھری ہیں جو "سرِ شام" سے "نارسا" کے
بعد بھی تازہ دم ہیں اور انھوں نے غیر ترقی پسند ہو کر وہ کارنامہ
انجام دیا جسے ترقی پسند انجام نہ دے سکے دراصل نظریات
انسان میں تنگ نظری اور کھوکھلا پن پیدا کر دیتے ہیں۔ ادب
تو عام زندگی اور سوسائٹی سے بلند ہو کر سوچنے کا عمل ہے۔

ادب کی اس بحث سے میرا یہ مقصد نہیں ہے کہ نری
داخلیت ہی اعلیٰ تخلیق کا ذریعہ ہے میں خارجیت کی اہمیت
اور ضرورت کا تو قائل ہوں مگر تخلیقی عمل میں ان دونوں رویوں
کا توازن میرے نزدیک سب کچھ ہے۔ ادب فنکار کے
اندر سے اسی وقت ابھرتا ہے جب اس کا اپنے خارج سے
بھی رشتہ ہو۔ چنانچہ فنکار اپنی خودی کی کوٹھری سے نکل کر جس
سفر پر روانہ ہوتا ہے اس کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ وہ تو
بس چل دیتا ہے۔ اس بات کو یوں سمجھ لیجیے کہ فنکار تخلیق
کے لیے مجبور ہوتا ہے۔

نظم اور نثر میں بنیادی فرق صرف صوتی حسن کا نام نہیں۔
نظم میں جو آہنگ ملتا ہے۔ اس میں شعری آہنگ کے
ساتھ موسیقی ..... مصوری اور زندگی کا حسن بھی شامل ہوتا
ہے۔ نثر میں جو آہنگ پایا جاتا ہے اس کی نوعیت شعری
آہنگ سے مختلف ہوتی ہے۔ میں نے ابتدا میں بھی عرض
کیا تھا کہ اعلیٰ شاعری نثر اور نظم دونوں میں ممکن ہے مگر
اس سلسلے میں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ نثر کی شاعری نظم کی
شاعری سے صرف اتنی مختلف ہوتی ہے کہ وہ نثر ہی میں
ممکن ہے جبکہ نظم کی شاعری اپنی پابندیوں میں رہ کر اعلیٰ فنکار

پیدا کرتی ہے۔ اس نظم و نثر کے فرق کو ختم کر دینا ایک طرف تو
فنکار کی شخصیت گم کرنے کے مترادف ہوگا دوسرے ادب کی قسمت
ایک مسئلہ بن جائے گی۔ نثر کے لیے نئے تجربے معروضی اور موضوعی
تو ہونے ضروری ہیں مگر اسے نثر ہی میں رہ کر انجام دیا جائے۔
اسی طرح نظم میں جو بھی تجربات کیے جائیں انھیں شاعری ہی میں
رہ کر کیا جائے۔ اس سے فنکار کی تنظیمِ ذات کا وہ لاشعوری
سلسلہ بھی باقی رہے گا اور ادب میں بھی نئے امکانات پیدا
ہوتے رہیں گے۔

"نثری نظم" کے روشن امکانات پر تو گفتگو اس لیے
بھی لاحاصل ہوگی کہ یہ کوئی نیا تجربہ نہیں ہے۔ سجاد ظہیر نے
"پگھلا نیلم" میں اسے عشری نثر بنا کر پیش کیا، حکیم یوسف حسین
نے "ہینگھڑیاں" کی شکل دی۔ اس کے علاوہ بھی اس کے نمونے
ملتے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ یہ تجربہ اپنی ابتدا میں بلبلا کر رہ
گیا۔ آج کل اسے "نثری نظم" کا نام دے کر جس طرح پیش کیا
جا رہا ہے اس کا ایک تاثر تو یہ قائم کرنے کی کوشش کی جا رہی
ہے کہ یہ تجربہ بالکل نیا اور انوکھا ہے۔ دوسرے یہی آفاقیت
سے رشتے جوڑنے کا واحد ذریعہ ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ایک تجربہ کو معاشرے
اور سوسائٹی نے کئی بار رد کر دیا تو پھر اسے زندہ کیوں کیا
جا رہا ہے؟

ادب اور شاعری میں ہیئت اور آہنگ ختم کرنے
سے آفاقیت پیدا نہیں ہوتی۔ اعلیٰ تخلیق تو اپنے ہی طرزِ
احساس سے وجود میں آتی ہے جس سے فضا میں مختلف اکائیاں
بنتی ہیں جو ایک بڑے "کل" میں تبدیل ہو کر آفاقیت
کہلاتی ہیں۔ میر...... عرفی...... کالی داس...... گوئٹے اور
شیکسپیئر میں جو آفاقیت دکھائی دیتی ہے اس کی وجہ یہ نہیں ہے
کہ انھوں نے اس رتبے کو پانے کے لیے کوئی شعوری
سمجھوتہ کیا تھا۔ دراصل دنیا کے ہر بڑے فنکار نے اپنے
عہد اور سوسائٹی سے بلند ہو کر تو سوچا مگر ان کی فکر اور
طرزِ احساس میں ان کی سوسائٹی کا بھرپور خام مال تھا، سوسائٹی
سے گہری وابستگی کے بعد فرد میں یہ قوت پیدا ہوتی ہے کہ وہ
خارجی سطح پر توانائی محسوس کرتا ہے۔ وہی درخت تند و تیز ہواؤں
کے طوفان میں باقی رہ سکتے ہیں جن کی جڑیں زمین میں دور تک
پھیلی ہوئی ہوں۔ ادب سے جہاں فنکار اپنے بارے میں بتاتا
ہے وہاں ادب اس بات کو بھی ظاہر کرتا ہے کہ فنکار نے
ادب کی زمین میں اپنی جڑیں کہاں تک پھیلائی ہیں۔ مغربی
ادب میں تثلیث کی تحریک کو جزوِ ایمان بنانے سے پہلے
اس بات پر بھی سوچ لیا جائے کہ ہر معاشرتی توڑ پھوڑ کے
باوجود بھی فرانس...... امریکہ اور برطانوی ادب اپنے طرزِ
احساس کو قطعی گم نہیں کرتا۔ مغربی ادیبوں اور شاعروں کے نام
تو اردو کے پروفیسروں کو بھی یاد ہوتے ہیں مگر انھیں پڑھنا
اور سمجھنا بال بڑھانے کی طرح آسان نہیں ہے۔

"نثری نظم" کے بارے میں آخری بات مجھے یہ عرض کرنا
ہے کہ اگر اس تجربے کا مقصد معذوروں اور نادادروں کی
مدد کرنا ہے تو اس نیک قدم کو اٹھاتے ہوئے ان فنکاروں
پر بھی سوچ لیا جائے جو پابندیوں کی ہزاروں صلیبیں اٹھائے
ہوئے ہیں مگر جمیل الدین عالی کے درجے کو نہیں پا سکتے ہیں۔
پوری سوسائٹی کے شاعر بن جانے پر کہیں قدرت کو مالتھس
کے نظریۂ آبادی پر پابندی سے عمل نہ کروانا پڑے۔ اور
اگر یہ لوگ ادب کے سلسلے میں مخلص ہیں تو انھیں تجربے کرتے
ہوئے اپنے طرزِ احساس اور معاشرتی اقدار کی اس طرح تو بے وقتی
نہیں کرنا چاہیے۔

ادب اور شاعری سوسائٹی کے تعلیم یافتہ اور دانش ور تخلیق
کرتے ہیں۔ اگر ان کے رد یے میں سطحی پن پیدا ہو جائے تو دیگر
لوگوں سے کسی قسم کی شکایت کیسے ممکن ہے؟ البتہ اس شور و غل
پر اس انداز سے مختلف ہو کر سوچتا ہوں تو وہ جاہل اندھے
یاد آ جاتے ہیں جو ایک اندھیرے کمرے میں کالی بلی پکڑنے
کی کوشش کر رہے تھے مگر اب معلوم ہوا کہ وہ بلی پکڑ بھی
لی ہے...... آپ بھی غور کیجیے کہیں یہ بلی "نثری نظم" تو
نہیں ہے......؟؟؟؟

۵۵

خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ دینا نہ بھولیے

غزلیں

عروج زیدی

مجروحِ التفات سے کیا چاہتے ہیں لوگ
شاید مجھی سے دادِ جفا چاہتے ہیں لوگ

اپنی وفا کا اُن سے صلا چاہتے ہیں لوگ
کیا چاہتے ہیں لوگ، یہ کیا چاہتے ہیں لوگ

میری زباں سے شرحِ وفا چاہتے ہیں لوگ
کیوں سازبیں یہ طرفہ صدا چاہتے ہیں لوگ

"جو ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے"
اُس ہاتھ کو بھی دستِ گدا چاہتے ہیں لوگ

ہم کہہ رہے ہیں روئے خزاں پر بہار ہے
اس پر ہمارے ہونٹ سیا چاہتے ہیں لوگ

اب عزمِ خود روی کہیں پرچم کشا نہیں
اب ہر قدم پہ راہنما چاہتے ہیں لوگ

یہ اور بات سعیِ طلب بارور نہ ہو
سچ تو یہ ہے کہ اچھا۔ بُرا چاہتے ہیں لوگ

تہذیبِ عصرِ حال تو کاغذ کا پھول ہے
ناداں ہیں اس میں بوئے وفا چاہتے ہیں لوگ

اعلانِ "حق" ہے جُرم تو پاداشِ جُرم دار
اک بے خطا سے عذرِ خطا چاہتے ہیں لوگ

اب کام کر رہا ہے طلسمِ تصورات
اب میرے راستے سے ہٹا چاہتے ہیں لوگ

کتنی عجوبہ کار ہے یہ مانگنے کی شان
ہاتھوں میں اُن کا دستِ عطا چاہتے ہیں لوگ

شیرازۂ قرار ہے زیر و زبر، عروج!
ایسی گھٹن میں تازہ ہوا چاہتے ہیں لوگ

کرشن مراری

قربت کے حادثوں میں لغزش ہے بے کلی کی
چنچل سے اِس مِلن میں رنگت ہے تشنگی کی

جادو جگا رہی ہے اِک سوچ بولتی سی
جھنکار کیوں ہوئی ہے احساس و آگہی کی

اِک تیرا ہی تصور۔ اِک تیری ہی تمنا
مچلے ہے دُھن نرنتر چاہت کی بانسری کی

اِک دیپ جل رہا ہے احساس کا مُسلسل
ہر آن ہر قدم پر تابش ہے عاشقی کی

پلکوں پہ رُک گئی ہے مچلی ہوئی تمنا
لرزاں ہے آپ بیتی بے تاب خامشی کی

پیغام آرہے تھے پیغام جا رہے تھے
نظروں نے اس طرح ہی نظروں سے دوستی کی

یہ سوزِ ہوشمندی - یہ حسرتِ بُلندی
یہ ارتقا پسندی - مجبور آدمی کی

○ گہر سیف الدین خاں - رامپور - یو۔پی
○ ۴م-سی - اِروِن روڈ - نئی دہلی

غزلیں

حیات لکھنوی

زندگی کتنی شکستہ زلزلوں کے ساتھ ہے
اک نئی الجھن ہزاروں مسئلوں کے ساتھ ہے

کون کس کا رہنما ہو کون کس کا راہبر
آج ہر انسان اپنے مرحلوں کے ساتھ ہے

ہے فضائے نطق پر کیسا دھواں چھایا ہوا
حسرتِ آواز بجھتی مشعلوں کے ساتھ ہے

اس فضائے بے عمل پر اک بھروسہ ہے اُسے
اس لیے خود اعتمادی فیصلوں کے ساتھ ہے

کل بجھا تھا جس کو دانشور حیات
ہاتھ میں پتھر لیے پاگلوں کے ساتھ ہے

ظفر غوری

اپنے آپ سے سہما سہما لگتا ہے
شہر کا شہر ہی بہکا بہکا لگتا ہے

سبزوں سے خون کی خوشبو آتی ہے
درد کا موسم لہکا لہکا لگتا ہے

شاخِ بدن پر سپنوں کے کچھ پھول کھلے
گھر آنگن سب مہکا مہکا لگتا ہے

سزا ملے گی کن معصوم گناہوں کی
جسم کا دوزخ دہکا دہکا لگتا ہے

سناٹے میں پھول سا قہقہہ برسا دیں
چپ کا لہجہ دہکا دہکا لگتا ہے

خلیل تنویر

وہ بھی اک شام تھی مٹی کا نشہ ٹوٹا تھا
گھر کے آنگن میں اداسی تھی کوئی رویا تھا

دُور تک منظرِ نم، خواب دھواں پھیلا تھا
دُور تک روح کی تنہائی کوئی سویا تھا

فاصلے سمٹے تو رنگوں کا سفر ختم ہوا
تجھ کو پا کے بھی وہ اک درد جسے کھویا تھا

دل میں جو کھوٹ تھا آنکھوں میں اُبھر آیا ہے
اُس نے بیکار ہی ہاتھوں پہ لکھا دھویا تھا

اپنے دکھ، درد کا اظہار بھی کمزوری تھا
تو نے کس واسطے پلکوں پہ لہو بویا تھا

امامیہ ہال، پنچکوئیاں روڈ، نئی دہلی ۔ ۲۴۴۳ اعظم بلڈنگ، سرائے کائستھان، کوٹہ، راجستھان ۔ گورنمنٹ میوزیم، [illegible] راجستھان ۔

نظمیں

عزیز انددری

پتھر، اینٹ اور گارا
چار طرف بکھرا پڑا ہے
کوئی عمارت
شاید ———
بننے والی ہے
لیکن ———
لوگوں نے
اپنے چہروں کو چھپانے کا
ایک طریقہ یہ بھی سوچا ہے

۲

شاخ سے جس دن
آخری پتہ ٹوٹے گا
اس دن سمجھوں گا
دورِ خزاں ——— آپہنچا ہے

۳

"آج تو چھولو ———"
آسماں قدموں پر آکے گرا ہے
لیکن اپنے قدموں کو چھونا بھی تو
آسان نہیں ہے ———

۴

اب تو ——— اک جست
آخری جست اور لگالو
شاید ——— اس کے بعد
دیوار ٹوٹ ہی جائے

ماہر منصور

صفائی کا تصور

بہت مشہور تھی اُس کی صفائی شہر والوں میں
یہ سُنتا ہوں
قرینے کی ہوائیں اُس کے گھر سے ہی نکلتی ہیں
سلیقہ سیکھتے ہیں لوگ اُس کے ہی حوالے سے
مگر جب، صبحِ کاذب
مَیں نے اُس کو غور سے، نزدیک سے دیکھا
تو گھر کی گندگی ساری
بڑی پھُرتی سے، وہ
اپنے پڑوسی کے مکاں کے روبرو ہی پھینک دیتا تھا ———!!

○ بلاک نمبر ۱۲، فلیٹ نمبر ۱۰، لودھی کالونی، نئی دہلی
○ بالمقابل مسجد، دنوبانگر، تمکور ۵۷۲۱۰۱

شباب للت | تلقین

آرزوؤں کا گلا گھونٹ بھی دو
اپنی سب تشنۂ تکمیل تمناؤں کے
نرم سینے پہ تجرد کی چٹانیں توڑ دو
آتشِ نفس کشی دل میں کرو شعلہ فشاں
اپنی ہر خواہشِ رنگیں کو کرو بھسم اس میں
اور اس آگ کو تا زیست جلائے رکھو
یگیہ شالا کی ہو جیسے یہ اکھنڈت جیوتی
خوفِ پاداش کو سینے میں بسائے رکھو
وقت پھر بھی تمہیں چھوڑے گا نہیں
وہ ستم گر تمہیں بخشے گا نہیں

یہ نہ سمجھو کہ تمناؤں کو پہنا کے کفن
تم زمانے کے مظالم سے رہو گے محفوظ
کوئی دنیا میں نہ بدخواہ تمہارا ہوگا
تم پہ دنیا کے شدائد کی نہ ہوگی یورش
غم و تشویش کی یلغار سے بچ جاؤ گے

لاکھ تم خون کرو اپنی تمناؤں کا
پاپ اور پنیہ کو تم ذہن میں پل پل تولو
واسناؤں کو کرو قتل ہزار
غیر ممکن ہے غم و رنج و مصائب سے فرار

غم زمانے کے تمہیں پھر بھی نہیں بخشیں گے
فتنہ پرداز عداوت سے ٹلیں گے نہ کبھی
جادۂ خیر سگالی پہ چلیں گے نہ کبھی
تم زمانے کے عذابوں سے نہیں بچ سکتے

اِس سے بہتر ہے گناہوں سے کنارا نہ کرو
عیشِ امروز کی دعوت کو کرو دل سے قبول
دِل کے بے تاب تقاضوں کو عبث
ملتوی کر کے نہ خود پر ستم ایجاد کرو
عیشِ فردا کا یقیں کیا ہے ملے یا نہ ملے
اپنی تقدیر میں کل ہو کہ نہ ہو
غیر آسودہ تمناؤں کی تکمیل کرو
دل کے احکام کی تعمیل کرو

فیلڈ پبلسٹی آفیسر گورنمنٹ آف انڈیا، سول لائنز، دھرمسالہ، ہماچل پردیش

ڈاکٹر نریش | بند دروازہ

غریب داس نے جب اپنا آبائی مکان فروخت کر دینے کا فیصلہ کر لیا تو شمبھو دلال دوڑا ہوا میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔

"لے لیجیے جناب - آپ کی دیوار اس کے مکان سے ملی ہوئی ہے - دونوں کو ایک کر لینا۔"

مجھے تو اس سودے میں ایسی کچھ دلچسپی نہ تھی لیکن میری بیوی کے منہ سے رال ٹپکنے لگی - آٹے سے بھرے ہاتھ لیے باورچی خانے سے نکل آئی اور کہنے لگی -

"ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں شمبھو بھیا - اور پھر اب تک تو پڑوس اچھا تھا لیکن اب غریب داس نے بیچنے کا ہی فیصلہ کر لیا ہے تو جانے کون آ کر بسے گا یہاں - برا پڑوس تو جان .... کا وبال ہوتا ہے - ہم ہی کیوں نہ لے لیں - ہاں بس بھاؤ تاؤ ٹھیک ہونا چاہیئے۔"

"بھاؤ تاؤ کی فکر مت کرو بھابی - بھاؤ مجھے ہی تو کرنا ہے۔"

مشاق دلال نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"میں نے غریب داس سے صاف لفظوں میں پوچھا تھا کہ آپ کم از کم کتنے میں فروخت کرنا چاہیں گے، اس سے جتنا کوئی بڑھ سکے، پٹا لوں گا - اب آپ کے شوہر سے دیرینہ تعلقات ہیں اس لیے سچ کی بات بتا رہا ہوں - آٹھ ہزار کی اس کی مرضی ہے - آپ لینا چاہیں تو ساڑھے سات تک اُتار لاؤں گا - کسی دوسرے کو بیچے گا تو میں دس سے نیچے اُترنے کا نہیں۔"

شمبھو دلال سے میری واقفیت تو ضرور تھی مگر تعلقات کے دیرینہ ہونے کی بات اس نے مکھن لگانے کو ہی کہی تھی۔ میری بیوی اس کی پیشہ ورانہ گفتگو پر ریجھ گئی۔ شمبھو نے اپنے دھندے کی ہوشیاری کا ایک اور ثبوت دیتے ہوئے کہا۔

"ایسی جلدی بھی نہیں ہے بھابی - گھر میں صلاح مشورہ کر لیجیے - ایک آدھ دن تو میں کسی دوسرے کو راستہ ہی نہیں دوں گا - آپ انکار کریں گے - تو کسی اور سے بات کر دوں گا - اپنے لوگوں کا فائدہ نہ ہو تو ہم کس کے کام آئیں گے۔"

کہہ کر شمبھو دلال تو چلا گیا لیکن اس کا تیر کارگر نکلا - اس کے جانے کے بعد میری بیوی گویا میرے پیچھے ہی پڑ گئی - اور میں تقریباً تقریباً مان گیا۔

دو روز بعد شمبھو دلال پھر ہمارے گھر آیا - اس بار اس نے مجھ سے بات نہ کر کے سیدھی میری بیوی سے ہی بات کی -

"بھابی کیا سوچا آپ نے؟ چندو لعل کل آیا تھا میرے یہاں - بہت کہتا رہا کہ مکان مجھے دلا دو - اسے تو میں نے کچھ نہیں کہا لیکن دل میں سوچ لیا کہ پہلا موقع تو میرے بھائی صاحب کا ہے - وہ نہیں چاہیں گے، تب کوئی لے جائے - ہماری بلا سے - آخر ہمیں تو کمیشن سے ہی مطلب ہے۔"

یہ تیر اور بھی نشانے پر بیٹھا - چندو لعل ہماری برادری کا ہی تھا اور اسے اپنی دولت کا بہت زعم تھا - میری بیوی کسی طرح یہ برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ چندو لعل ہمارے پڑوس میں آ بسے - یا اس کی جائداد ہی ہماری بغل میں بن جائے -

"ہاں ہاں بھائی صاحب، ہم نے تو طے کر لیا ہے کہ مکان ہم ہی خریدیں گے۔ آپ سودا پٹا یئے۔"

"سودا تو پٹا پٹایا ہے۔ بس ساڑھے سات پکڑ دیں گے غریب داس کے سامنے اور آپ کے حق میں رجسٹری لکھوا دیں گے۔"

"بھائی کچھ اور کم کراؤ۔" میں نے دخل دیتے ہوئے کہا۔

"اب اس سے کم کیا دلادوں اسے بھائی صاحب۔ ایمانداری کی بات کہتا ہوں۔ آٹھ ساڑھے آٹھ سے کم کی چیز تو کسی حالت میں نہیں ہے۔ اتنا بھی میں آپ کی وجہ سے کر رہا ہوں ورنہ...... ہی ہی ہی...... آپ تو جانتے ہی ہیں آج کل پراپرٹی کا کیا ریٹ چل رہا ہے۔" شمبھو کو سودا پٹانے کی جلدی تھی۔

"لیکن ایک بار دکھا تو دو پورا مکان۔" میں نے کہا۔

"کمال کرتے ہیں آپ بھی چھبیس سال سے آپ اس مکان میں رہ رہے ہیں۔ پڑوس کا مکان آپ نے نہیں دیکھا؟ بیسیوں بار گئے ہوں گے آپ اس مکان میں۔ اب دیکھنے کو کیا باقی ہے۔"

"ہم کہاں گئے ہیں وہاں۔ ایک آدھ بار گئے تو غریب داس کی بیٹھک سے ہی لوٹ آئے۔ دیکھ لیں تو معاملہ طے کریں۔"

"یہ بات ہے۔ تو چلیے۔ ابھی دکھا دیتے ہیں۔"

اور میں اٹھ کر اس کے ساتھ ہو لیا۔

اپنے اس مکان میں آئے مجھے چھبیس برس ہو گئے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد ہم اپنی زمین جائداد گوجرانوالہ میں چھوڑ کر، شرنارتھی بن کر ہندوستان آ گئے تھے۔ جالندھر کے دفتروں میں بیسیوں دھکے کھانے کے بعد یہ مکان ہمیں الاٹ ہو گیا تھا۔ تب تو ہماری مالی حالت خستہ ہی تھی مگر پھر جو خدا نے ہاتھ دکھایا تو کسی بات کی کمی نہ رہی۔ پڑوس کا مکان بک رہا تھا اور اسے خریدنے کی گنجائش ہم میں تھی۔ اس لیے زیادہ پس و پیش کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ لیکن اسے دیکھے بنا میں سودا کرنے کو تیار نہ تھا۔ دلال کو بھی مکان دکھانے میں کچھ عذر نہ تھا۔

غریب داس اپنی بیٹھک میں چارپائی پر بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ ذرا سا اوپر کو اٹھا اور "آیئے" کہہ کر اپنی جگہ جما رہا۔ حقے کی نے جوں کی توں اس کے منہ میں رہی۔

"غریب داس جی انھیں مکان دکھا دیجیے۔"

"ضرور دیکھیے جناب۔" غریب داس نے اس تکلف سے کہا گویا وہ اپنا مکان نہیں، اپنا سب کچھ نیلام پر رکھ رہا ہو۔

"اچھا داتا تیری رضا۔" کہہ کر غریب داس نے حقے کی نے ایک طرف گھمائی اور چارپائی کے نیچے پڑا اپنا پیر دھا کھینچ کر پیروں میں پہن لیا۔ چارپائی پکڑ کر اٹھتے ہوئے اس نے "آف او" کہا اور اٹھ کر اندر والا دروازہ کھول دیا۔

"آیئے۔"

کہہ کر وہ آگے آگے چل دیا۔ ہم اس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔

"یہ صحن ہے۔ یہ برآمدہ اور......"

برآمدے میں کھلنے والے تینوں کمرے کھلے تھے۔

"یہ تین کمرے ہیں۔ وہ باورچی خانہ اور وہ غسل خانہ۔"

"جائداد تو سنبھال کر رکھی ہے غریب داس جی نے۔" شمبھو دلال نے کہا۔

"لیکن مرمت مانگتی ہے۔"

"وہ تو خیر...... ہی ہی ہی...... پرانی جائداد میں ٹوٹ پھوٹ تو رہتی ہی ہے۔ لیکن اس حویلی میں غریب داس جی نے معمار مزدور گھسیڑے ہی رکھے ہیں۔ بات بھی ٹھیک ہے صاحب۔ جائداد کو تو اولاد کی طرح پالنا پڑتا ہے۔"

"ہوں......"

برآمدے کی بغل سے اوپر جانے والے زینے کے سامنے رک کر غریب داس نے ایک بار ہماری طرف دیکھا اور اوپر چڑھنے لگا۔ ہم اس کے پیچھے پیچھے [illegible] چھت پر پہنچ کر اس نے کہا "دو چوبارے یہ...... اور وہ پاخانہ۔" نیچے والے برآمدے کے اوپر کا حصہ سیدھا سامنے کی

دیوار تک چلا گیا تھا۔ دیوار سے پرے ایک اور کھلی چھت
تھی۔ دوسری چھت پر کوئی چوبارہ نہ تھا۔ اس چھت سے
بھی ایک زینہ نیچے کو اترتا تھا۔ اس زینے سے مکان کے
دوسرے حصے میں جاتے ہوئے غریب داس کا چہرہ اس قدر
اداس ہو گیا تھا کہ محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ابھی پھوٹ پھوٹ
کر رو دے گا۔

زینہ اتر کر غریب داس آخری سیڑھی پر ہی بیٹھ گیا۔
"دکھا دو بھائی شمبھو لال"۔

اور مکان کا دوسرا حصہ شمبھو لال ہی مجھے دکھالایا۔
دوسرے حصے کی تمام عمارت بالکل اسی نقشے کی تھی۔ جو ہم
پہلے حصے میں دیکھ آئے تھے۔ ویسا ہی صحن، برآمدہ، برآمدے
میں کھلنے والے تین کمرے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ پہلے حصے کا
رخ شمال کی طرف تھا اور دوسرے حصے کا جنوب کی طرف۔
یہ حصہ اس حصے کی نسبت خستہ اور گندا تھا۔ دونوں حصوں
کے درمیان ایک دو خشتی دیوار تھی، جس کے درمیان میں
ایک بڑا دروازہ تھا۔ میں نے دیکھا کہ اگر دروازے کو
کھول دیا جائے تو دونوں حصوں کے صحن مل کر ایک ہو جائیں
اور پورا مکان چھ کمروں کا بن جائے۔

"یہ دروازہ دوسرے حصے میں کھلتا ہوگا؟" میں نے
شمبھو لال سے پوچھا۔

"جی ہاں۔ جی ہاں"۔

"تو ہمیں اوپر سے گھما کر کیوں لائے ہیں غریب داس؛
ادھر سے ہی لے آتے"۔

بات شمبھو لال کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ لیکن اس کے
اندر دروازہ کھلوانے کی خواہش ضرور پیدا ہو اٹھی تھی۔

"ممکن ہے دوسری طرف تالا پڑا ہوا ہو۔ چلیے ادھر
چل کر کھلوا لیتے ہیں"۔

اور ہم لوگ سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر پہنچے۔ پھر دوسری
چھت۔ پھر سیڑھیاں اترے اور پہلے حصے کے صحن میں آ گئے۔
اس بار غریب داس ہم سے آگے آگے نہیں، پیچھے پیچھے آیا۔
صحن میں پہنچ کر شمبھو لال نے کہا۔

"اس دروازے کو ذرا کھلوا دیجیے غریب داس جی"۔

غریب داس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے ہماری جانب
دیکھا اور کہا "میرے رہتے تو یہ دروازہ نہیں کھلے گا بھائی۔
مکان بک جائے تو خریدنے والا جو چاہے کرے"۔

"لیکن مکان تو دکھا دیں پوری طرح بھائی صاحب کو"۔
شمبھو لال نے وکالت کی۔

"نہ بھائی۔ یہ میرے بس کا نہیں۔ اس کے ادھر والا
حصہ آپ دیکھ آئے ہیں۔ دروازہ کھلے گا تو دونوں مکان مل
کر ایک ہو جائیں گے۔ اب دیکھنے کو کیا بچا ہے"۔

"لیکن دروازہ کھولنے میں خرابی کیا ہے؟" میں
نے پوچھا۔

ایک گہری سانس بھر کر غریب داس نے ایک بار پھر
انھی نگاہوں سے ہماری طرف دیکھا اور اپنی بیٹھک کو چل
دیا۔ ہمارے وہاں پہنچتے پہنچتے وہ اپنی جگہ پر بیٹھ چکا تھا اور
حقے کی نے اس کے ہونٹوں تک پہنچ چکی تھی۔ حقے کے دو تین
لمبے لمبے کش کھینچنے کے بعد اس نے ذرا سا اطمینان محسوس کیا۔
ہم لوگ بیٹھک میں پہنچے تو کہنے لگا۔

"بیٹھیے"۔

ہم دونوں دیوار کے ساتھ پڑی لوہے کی کرسیوں
پر بیٹھ گئے۔ غریب داس بولا۔

"ہمارے والد نے اصل میں دو مکان بنوائے
تھے، ایک جیسے۔ وہ کہا کرتے تھے، میں اپنے دونوں
لڑکوں کے لیے ایک جیسی جائداد چھوڑ جاؤں گا۔ ان میں
نبھے گی تو بیچ والا دروازہ کھلا رکھ لیں گے اور نہ نبھے گی
تو بند کر لیں گے، الگ الگ رہیں گے"۔

"لیکن آپ کے بھائی تو ...... لڑکپن میں ہی انتقال
کر گئے تھے ..... شاید آپ کے والد کے انتقال سے
پہلے ہی ....."، شمبھو لال نے کہا۔

"ہاں"۔

"پھر اس کے بعد شاید آپ نے بیچ والا دروازہ
بند کر دیا ہوگا"۔

"نہیں۔"

غریب داس نے کہا "دروازہ تو تب بند ہوتا تھا اگر ہم میں نہ بنتی۔ یہ سوال ہی نہیں اٹھا اور وہ ظالم لڑکپن ہی میں دغا دے گیا۔"

"پھر یہ دروازہ؟" میں نے کہا۔

چارپائی پر پڑے سرخ انگوچھے سے اپنی بھیگی آنکھوں کو پونچھ کر غریب داس نے کہا۔

"چاہتا تھا بغیر من کا بھید کھولے ہی مکان بک جائے مگر...." وہ لمحہ بھر کے لیے چپ ہو گیا۔ میں حیران کہ ماجرا کیا ہے۔ پھر تھوڑی دیر چپ چاپ حقہ گڑگڑا کر اس نے کہا۔

"بیچتا ابھی نہیں اگر لڑکا کینیڈا میں سیٹل نہ ہو گیا ہوتا۔ اب اکلوتی اولاد کا موہ نہیں جاتا۔ وہ بھی پیچھے پڑا ہوا ہے کہ گھر بار بیچ کر اس کے پاس چلا جاؤں۔ زندگی کا بھروسہ بھی کم ہوتا جا رہا ہے۔ کشنو کی ماں کے رہتے تو سونا پن محسوس نہیں ہوا لیکن اب تو پچھلے تین برسوں سے یہی مکان کاٹنے کو آتا ہے۔"

"اوہ!" میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"تو صاحب......" پھر ایک بار حقہ گڑگڑا کر اس نے ایک طرف کو گھما دی۔

"بات یہ ہے کہ بہت برس پہلے ہم نے وہ حصہ کرایہ پر اٹھا دیا تھا۔ اس میں رہنے کو ایک ماسٹر صاحب آئے تھے۔ ماسٹر خیر الدین صاحب۔ گنبے میں کل تین افراد تھے۔ ماسٹر صاحب، ان کی بیوی جسے ہم خدیجہ کہتے تھے اور ان کی لڑکی نادرہ آپا۔"

بات ختم کرنے سے پہلے ہی اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ کئی آنسو اس کی گود میں آ گرے۔ اسی سرخ انگوچھے سے ایک بار پھر اپنی آنکھیں خشک کر کے، اس نے حقے کی نے اپنی طرف کھینچی اور گڑگڑانے لگا۔ چلم کی آنچ کملا گئی تھی۔ اس نے بغیر ہماری طرف دیکھے حقے پر سے چلم اتاری۔ سیدھے ہاتھ کی چھوٹی انگلی چلم کے سوراخ میں ڈال کر گھمائی اور چلم اونچی اٹھا کر اس کے سوراخ میں پھونکا۔ چلم میں دبی راکھ کے ذرے بند کمرے کی فضا میں بکھر گئے تو اس نے دوبارہ چلم حقے پر چڑھا دی اور گڑگڑانے لگا۔ نیچے کے تمباکو کی تلخی سے اس نے نے پرے کر کے اپنے ہونٹوں کو سکوڑا اور کہا۔

"نادرہ آپا اور وہ دونوں ہم سے اس طرح گھل مل گئے کہ مجھے اپنے ہاں بہن کے نہ ہونے کا غم نہ رہا۔ خدیجہ چچی اور ماسٹر صاحب نے میرے ماں باپ کی کمی پوری کر دی۔ ساڑھے چار سال وہ اس مکان میں رہے۔ بیچ والا دروازہ صرف رات کے وقت بند ہوتا تھا اور سورج نکلنے سے پہلے کھل جاتا تھا۔ پو پھٹتے ہی خدیجہ چچی اس باہر والے برآمدے میں آ کر میری نو بیاہی بیوی کو آواز دے کر جگاتی۔

"اے بنّو۔ اے بنّو۔ جگ جا بیٹا۔ دن چڑھ آیا ہے۔"

کمرے میں میرے پاس سوئی ہوئی میری بیوی کہتی۔

"ابھی کہاں خدیجہ چاچی! ابھی تو نپٹ اندھیرا پڑا ہے۔"

"اے اللہ۔ فجر کی نماز کب کی ہو چکی۔ تیرے چچا مسجد سے لوٹ آئے اور تو ابھی نپٹ اندھیرے کو ہی جلا رہی ہے۔ اٹھ جا۔"

"اٹھتی ہوں۔" کہہ کر وہ پھر سو جاتی اور خدیجہ چچی اپنے گھر لوٹ جاتیں۔

"ہائے کیا دن تھے۔" شمبھو دلال نے اس کی آواز میں آواز ملاتے ہوئے کہا۔

"دن ہی تھے بھائی۔ بیت گئے۔ اب تو ان کی کانٹے سی چبھن باقی ہے کلیجے میں۔ چتا میں پڑوں گا تبھی یہ چبھن نکلے گی۔"

"کشنو پیدا ہوا تو چچی نے کسی عزیز رشتہ دار کو نہیں بلوانے دیا۔ ماں کی طرح خدمت کی میری بیوی کی۔ ننھے سے کشنو کو اپنے پیروں پر رکھ کر نہلاتی بدن پونچھ کر کپڑے پہناتی۔ آنکھوں میں کاجل ڈالتی کان کے پیچھے ذرا سی کالک لگاتے ہوئے کہتی۔

"چشم بد دور۔ ماں صدقے۔ اللہ کی رحمت شیطان کا سایہ

پڑے۔ بختاور ہو دے۔"

پھر اس کے پیٹ پر اپنے منہ سے پھپ، کر کے کہتی "یہ بول گیا رے۔ پٹاخہ بول گیا۔"

وہ ساتھ ساتھ مجھے اور کشنو کی ماں کو سمجھاتی رہتی۔ کاجل ڈالنے سے آنکھیں چوڑی ہو جاتی ہیں۔ سیاہی پکڑ لیتی ہیں۔ کچی آنکھ سیاہی پی لیتی ہے۔ پیٹ پر پٹاخہ بلانے سے بچے کے پیٹ کی ہوا خارج ہو جاتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اور وہ نادرہ آپا۔ مجھ سے عمر میں کئی سال چھوٹی تھی لیکن میں اسے بڑی مان کر آپا ہی کہتا تھا۔ اتنا پیار کرتی تھی ہم سے، کیا بتاؤں! یہ کشنو بھی جو پہلا لفظ بولنا سیکھا تھا وہ 'گوا' ہی تھا۔ کبھی کبھی تو پورا لفظ بول دیتا تھا لو آ۔ ہم سمجھ بیٹھے تھے کہ ان لوگوں کے آنے سے ہمارا کنبہ بھرا پُرا ہو گیا ہے۔ نادرہ کی شادی کی فکر میں کبھی کبھار خدیجہ چچی اور ماسٹر صاحب سر جوڑ کر بیٹھتے تو میری بیوی آکر مجھ سے کہہ دیتی۔ میں ان کے کمرے میں جاکر غصہ دکھانے لگتا۔

"کیا ماتم کرنے بیٹھ جاتے ہیں آپ لوگ ہر تیسرے دن۔ میں بچہ نہیں، بال بچے دار ہوں۔ کماتا کھاتا ہوں، نادرہ کی شادی نہیں کر سکتا؟ آپ سے کہا کس نے ہے اس فکر میں پڑنے کو؟"

"نہیں برخوردار۔ اللہ تمہیں سلامتی دے۔ تم جانو تمہاری آپا۔ ہم کیوں فکر کرنے لگے۔"

میں خاموش بیٹھا غریب داس کی باتیں سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا کتنی دور بیٹھے ہوئے ہم لوگ کیسی ایک سی ذہنی تکلیف میں جی رہے تھے۔ پاکستان میں سب کچھ لٹا کر بھی، اپنے والد کی زندگی کی بھینٹ دے کر بھی، آج تک میرے دل میں قریشی چاچا اور اس کے گھر والوں کی محبت قائم ہے اور یہ بڈھا......

"تو صاحب پھر مار کاٹ شروع ہو گئی۔ پاکستان بن گیا۔ قتل و خون کا بازار گرم ہوا۔ اِدھر اُدھر سے ہر روز خوفناک خبریں آنے لگیں تو خدیجہ چچی گھبرا گئیں۔ میں نے انھیں ڈھارس دی کہ "چچی جب تک میری لاش اس دروازے پر نہیں گرتی، تب تک کوئی اس گھر میں داخل نہیں ہو سکتا۔ بیٹھک کا تالا اندر سے بند کر کے ہمارے والے دروازے سے آیا جایا کریں۔ میں آپ لوگوں کو ہندوستان چھوڑ کر ہرگز نہیں جانے دوں گا کسی قیمت پر بھی نہیں۔"

ڈری ہوئی چچی ہماری محبت میں اپنے اندر کا خوف نہ کہتی۔

"اللہ رکھے۔ ہم کیوں جانے لگے۔ اپنے یہاں کا امن امان انشاءاللہ قائم رہے گا۔"

وہ پہلی رات تھی، جب میں نے یہ بیچ والا دروازہ بند کر کے اس پر تالا ڈال دیا تھا۔ یہ سوچ کر کہ کوئی آئے گا تو مجھ سے نپٹ کر ہی اندر جا سکے گا۔ کئی روز ایسا ہی رہا۔ روز رات کو میں تالا بند کر دیتا اور صبح کو کھول دیتا۔

لیکن ایک رات .....

محلے کی ساری خاموشی چیخوں میں بدل گئی۔ میں اپنی بیٹھک ہی میں سو رہا تھا۔ باہر کے شور و غل سے گھبرا کر میں نے فوراً بیٹھک کا دروازہ کھولا اور باہر گلی میں نکل آیا۔ گھوڑوں پر سوار بیس پچیس آدمی، ہاتھوں میں بندوقیں لیے ہوئے آگے نکل چکے تھے۔ ان کی پیٹھ ہی میں نے دیکھی۔ رونے چیخنے کی آوازوں میں نادرہ آپا کی آوازیں صاف پہچان رہا تھا۔ وہ آواز گھوڑوں کی ٹاپوں میں گم ہو رہی تھی۔ میں ننگے پاؤں پیچھے دوڑا۔ لیکن ......"

پھر ٹپ ٹپ برس پڑنے والی آنکھیں پونچھ کر، حقے کے دو تین کش لے کر، غریب داس نے کہا۔

"ساتھ والی بیٹھک کا دروازہ ٹوٹا پڑا تھا۔ اندر گیا تو ہولناک اندھیرا۔ بھاگ کر گھر سے ٹارچ لایا۔ خدیجہ چچی اور ماسٹر صاحب کی لاشیں خون میں لت پت پڑی تھیں۔"

اور وہ بے اختیار رو پڑا۔ ہچکی لگ گئی۔ شمبھو لال نے اٹھ کر ڈھارس بندھانا چاہی مگر نہیں۔ آخر کچھ دیر بعد

(باقی صفحہ پر)

عوام کے اپنے نئے انتظامیہ کا پختہ عہد

- باشندگانِ دلی کی زندگی کے ہر پہلو کی ترقی۔
- صاف ستھرا اور مستعد انتظامیہ کا بندوبست۔
- کم لاگت والے پروجیکٹوں کے ذریعہ روزگار کے زیادہ سے زیادہ مواقع مہیا کرنا۔
- گندی بستی، غیر مجاز بستیوں، نو آباد کالونیوں اور دیہی علاقوں کے باشندوں کو بہتر اور راحت والی سہولتیں۔

دوسرے خصوصی ترقیاتی پروگرام

- ہر سال ۷۰ - ۸۰ ہزار رہائشی اکائیوں کی تعمیر۔
- ہریجنوں کو معاشی طور پر خود کفیل بنانے کے لیے آسان شرحوں پر قرضے اور خام مال کا بندوبست۔
- سماج بہبود پروگراموں پر خصوصی زور
- عوام کی خواہشات اور ضروریات کے مطابق نظامِ تعلیم کی از سر نو تنظیم و تشکیل۔
- بہتر اور باقاعدہ ٹرانسپورٹ سروس۔
- سرکاری کام کاج میں ہندی کا زیادہ سے زیادہ استعمال۔
- پالیسی طے کرنے میں عوام سے صلاح مشورہ اور اشتراک۔

آئیے ہم سب مل کر دلّی کو ہندوستان کا ایک آدرش شہر بنائیں

جاری کردہ :- محکمۂ اطلاعات و اشاعت، دلی انتظامیہ۔ دلی

مجتبیٰ حسین

بلراج ورما نے تناظر نکالا

میرے عزیز دوست بلراج ورما کی عادت ہے کہ جب بھی کوئی کام کرتے ہیں تو دوستوں سے مشورہ ضرور کرتے ہیں۔ اگر دوستوں کا مشورہ ہوا کہ یہ کام نہیں کرنا چاہیئے تو بس اسی لمحے وہ اس کام کو کرنے کے لیے اپنی کمر کس لیتے ہیں اور جو لوگ ورما جی کی کمر سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس کو کسنا خود ایک مشکل کام ہے۔ انھیں شاید کسی جیوتشی نے بتا رکھا ہے کہ بیٹا! تمہارے دوست جس کام کے لیے منع کریں اسے ضرور کرنا۔ تمھیں اس کام میں ضرور سپھلتا ملے گی۔

میں ورما جی کی شخصی مجلسِ مشاورت میں ایک عرصہ سے شامل ہوں۔ پہلے پہل وہ مجھ سے چھوٹے چھوٹے مشورے لیا کرتے تھے۔ بعد میں بڑے مشوروں کی طرف راغب ہوئے۔ ایک بار مجھ سے اپنی کہانیوں کے بارے میں مشورہ مانگا۔ میں نے کہا "ورما جی کہانی مختصر لکھا کیجیے اور اس میں کرداروں کا جلوس نہ نکالیے۔ آپ کی کہانیوں میں کرداروں کی بڑی بھیڑ ہوتی ہے"۔ بولے "اس میں میرا کیا قصور ہے۔ ہمارے ملک کی آبادی اتنی زیادہ ہے کہ اس میں کردار خود بخود چلے آتے ہیں۔ میں کہانی کار ہوں۔ پریوار نیوجن کا افسر نہیں ہوں"۔ میرا مشورہ انہیں اتنا برا لگا کہ ورما جی نے اس کے بعد مختصر کہانی نہ لکھنے کی قسم کھالی۔ اس کا ایک فائدہ کم از کم میرے حق میں یہ ہوا کہ جب بھی ان کی کہانی کسی رسالے میں چھپتی ہے تو میں اس کی طوالت کے مدنظر اسے نہیں پڑھتا۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ورما جی مجھ سے ہر معاملہ میں مشورہ کرتے ہیں۔ ایک دن انھوں نے مجھ سے کہا "میں ایک رسالہ نکالنا چاہتا ہوں"۔ میں نے کہا "اچھا۔ رسالہ کا نام کیا ہوگا؟" بولے "تناظر"۔ میں نے کہا "بہت اچھا خیال ہے۔ یہ رسالہ عرب ممالک سے اپنے ملک کے تعلقات کو بہتر بنانے کا بڑا موثر وسیلہ ہوگا"۔

بولے "میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھا"۔

میں نے کہا "مطلب بہت صاف ہے۔ جب ہندوستان سے عربی زبان کا ایک رسالہ نکلنا شروع ہوگا تو اس سے عرب ممالک میں ہندوستان کے لیے خود بخود خیر سگالی کے جذبات پیدا ہوں گے۔ پھر عربوں کے تیل کے لیے ان سے ثقافتی تعلقات بڑھانا ضروری بھی ہے"۔

اپنا سر پیٹ کر بولے "بھائی صاحب! تم نے کیسے سمجھا کہ میں عربی زبان کا رسالہ نکال رہا ہوں"۔ میں نے کہا "عقلمند کو اشارہ کافی ہوتا ہے۔ رسالے کا نام خود بتا رہا ہے کہ یہ عربی زبان کا رسالہ ہوگا"۔ بولے "یہ عربی زبان کا رسالہ نہیں ہوگا"۔

میں نے کہا "تو پھر فارسی کا ہوگا"۔

بولے "یہ بھی نہیں"۔

میں نے اندھیرے میں تیر چلانے کے انداز میں کہا۔ "تب تو یہ ضرور اردو کا رسالہ ہوگا"۔ بولے "بالکل ٹھیک سوچا تم نے۔ بڑے عقلمند ہو، یہ اردو کا رسالہ ہوگا"۔

میں نے پوچھا "یہ تناظر کو اردو میں کیا کہتے ہیں"۔

اسسٹنٹ ایڈیٹر (اردو)، این سی ای آر ٹی - اربندو مارگ، نئی دلی - ۱۶

بولے "بھیا! تناظر کو اُردو میں بھی تناظر ہی کہتے ہیں"۔

میں نے لغاتِ کشوری نکال کر ان کے سامنے رکھ دی اور کہا "پہلے اس میں سے تناظر نکال کر بتائیے۔ پھر رسالہ نکالنا"۔ بڑی دیر لغاتِ کشوری کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتے رہے پھر اچانک بپھرے اور بولے "تمہاری اُردو لغاتِ کشوری سے آگے نہیں بڑھی ہے تم اردو زبان کو ابھی تک لغات کشوری میں جکڑنا چاہتے ہو۔ تم اردو کے دشمن ہو۔ تم اس زبان کی ترقی نہیں چاہتے۔ تمہارا تعلق دکن سے ہے تم کیا جانو کہ ہم پنجابیوں نے اُردو کو کہاں سے کہاں پہنچادیا ہے"۔ اپنی اردو دشمنی کا راز فاش ہوتا دیکھ کر میں نے پوچھا "یہ بتائیے کہ اس تناظر کو انگریزی میں کیا کہتے ہیں؟"

وہ دونوں ہاتھوں سے پان کی شکل کا نشان بناتے ہوئے بولے "پرسپکٹو (PERSPECTIVE)" میں نے کہا "وزیر آغا جی! میں یہ جاننا نہیں چاہتا کہ اُردو میں تناظر کو کیا کہتے ہیں۔ میں تو انگریزی میں اس لفظ کو کیا کہتے ہیں یہ جاننا چاہتا ہوں"۔

بولے "کہہ تو دیا پرسپکٹو"۔

میں نے کہا "وزیر آغا جی! میرے خیال میں پرسپکٹو اُردو کا لفظ ہے۔ آپ کہتے ہیں تو اسے انگریزی کا مان لیتا ہوں۔ آپ کو جاننا چاہئے کہ میں دوستوں کے لیے سب کچھ کر سکتا ہوں۔ جب پرسپکٹو اور تناظر ہم معنی الفاظ ہیں اور اگر آپ واقعی اردو کا رسالہ نکالنا چاہتے ہیں تو اس کا نام پرسپکٹو ہی رکھیے"۔

بولے "خیر نام کے بارے میں اب تم سے مزید بحث نہیں ہوگی۔ رسالہ نکالنے کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"
میں نے کہا "اگر آپ مجھے یہ بتادیں کہ اس رسالے کو بند کب کریں گے تو میں اس کے نکالنے کے بارے میں کوئی مشورہ دے سکتا ہوں"۔ بولے "تمہارا رویہ صحت مندانہ نہیں ہے۔ اس لیے اگر میں نے رسالہ شائع کر لیا تو سزا کے طور پر مجلسِ مشاورت میں تمہارا نام شامل رکھوں گا"۔

میں نے کہا "ضرور رکھیے، آپ تو جانتے ہی ہیں میں دوستوں کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کو ہر دم تیار رہتا ہوں"۔ میرے غیر صحت مندانہ رویے کے باوجود انھوں نے پھر مجھ سے پوچھا "یار سچ سچ بتا میں رسالہ نکالوں یا نہیں"۔ میں سمجھ گیا وہ جوتشی کے کہنے کے مطابق مجھ سے مخالفانہ مشورہ لینا چاہتے ہیں۔ تب میں نے کہا "وزیر آغا جی بربادی کے اور بھی کئی شریفانہ طریقے ہیں اردو رسالہ کے ہاتھوں ہی آپ اپنی بربادی کیوں چاہتے ہیں؟" بولے "اس لیے کہ مجھے اس زبان سے بے پناہ پیار ہے۔ میں اس پیار میں اپنے آپ کو نثار کرنا چاہتا ہوں"۔

میں نے کہا "ایسی بات ہے تو میں ایک مخلص دوست کے ناطے آپ کو ہرگز یہ مشورہ نہیں دوں گا کہ آپ رسالہ نکالیں"۔ جیسے ہی میں نے یہ مخالفانہ مشورہ انہیں دیا ان کی باچھیں کھل گئیں۔ بولے "ایسی بات ہے تو میں یہ رسالہ ضرور نکالوں گا"۔

اس بات چیت کو ہوئے دو برس بیت گئے۔ وزیر آغا جی نے پھر کبھی رسالے کے بارے میں مجھ سے بات نہیں کی۔ البتہ ان کی سرگرمیوں سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ بالا بالا ہی رسالہ نکالنے کی تیاریوں میں لگے ہوئے ہیں۔ ایک دن انہیں اس حالت میں دیکھا کہ ایک لیٹر بکس میں ہاتھ ڈال کر خطوں کو باہر نکال رہے ہیں۔ میں نے پوچھا "وزیر آغا جی! یہ کیا؟ خیریت ہے۔ یہ لیٹر بکس میں سے کس کے خط نکال رہے ہو!" بولے "بھیا! خط تو میرے ہی ہیں لیکن یہ لیٹر بکس بھر گیا ہے۔ خط اندر سے نکل کر باہر آنے لگے ہیں۔ سوچتا ہوں اپنی کچھ چٹھیاں اس میں سے نکال کر دوسرے لیٹر بکس میں ڈال دوں"۔ میرے سامنے وزیر آغا جی نے پچاس ساٹھ چٹھیاں نکال لیں۔ سب پر وزیر آغا جی کے ہینڈ رائٹنگ میں پتے لکھے ہوئے تھے۔ میں سمجھ گیا یہ سب کچھ رسالے کے لیے مواد اکٹھا کرنے کی تیاری ہو رہی ہے۔ دن بہ دن

وہ کچھ کھوئے کھوئے سے رہنے لگے۔ ایک دن میں نے پوچھ ہی لیا "ورما جی! آپ کی صحت دن بہ دن ایڈیٹروں کی سی ہوتی جارہی ہے۔ آخر بات کیا ہے؟" بولے "خبردار! رسالے کے بارے میں کوئی بات نہ کرنا۔ میں نے قسم کھا رکھی ہے کہ نہ تم سے اپنے رسالے کے لیے کچھ مانگوں گا اور نہ تم سے مشورہ کروں گا۔ بس چپکے سے مجلسِ مشاورت میں تمہارا نام دے دوں گا"۔ میں نے کہا " ذرہ نوازی کا بہت بہت شکریہ۔ مگر یاد رکھیے کہ اردو کے رسالے کم چلتے ہیں اور ان کے ایڈیٹر زیادہ چلتے ہیں۔ مگر آپ کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ آپ تھوڑی دور چل کر ہی ہانپنے لگ جاتے ہیں۔ رسالہ بھی نہ چلے اور ایڈیٹر بھی نہ چلے تو پھر رسالہ نکالنے کا کیا فائدہ؟"

بولے "میرے نفع نقصان کی فکر تم کیوں کرتے ہو۔ اگر تم نے پھر رسالے کو موضوعِ بحث بنایا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا"۔

دوسرے حملے میں ناکامی کے بعد میں انجان بن گیا۔ انجان کیسے نہ بنتا۔ کیا میں کوئی محمود غزنوی تھا کہ ان پر پے بہ پے سترہ حملے کر دیتا۔ اس کے بعد رسالے کے بارے میں جتنی معلومات بھی میں نے حاصل کیں وہ مسز ورما (Mrs Varma) سے حاصل کیں۔ مسز ورما کے بارے میں یہ بتاتا چلوں کہ جب بھی ان سے ورما جی کے بارے میں پوچھا جاتا ہے تو جواب "آپ کے ورما صاحب" سے شروع کرتی ہیں۔ کہیں گی "آپ کے ورما صاحب کا حال تو جی آپ کو معلوم ہی ہے۔ آپ کے ورما صاحب بھلا کس کی سنتے ہیں، آپ کے ورما صاحب کو جی کوئی کیا سمجھا سکتا ہے"۔ اس طرزِ تخاطب کے ذریعے وہ ایک اعتبار سے ورما جی سے اپنے آپ کو disown کرنا چاہتی ہیں۔ بے چاری ایسا نہ کریں گی تو اور کیا کریں گی۔ ورما جی حرکتیں بھی ایسی ہی کرتے ہیں پتہ چلا کہ DDA فلیٹس کے لیے انھوں نے جو رقم جمع کر رکھی ہے وہی رقم تناظر کی بنیادوں میں ڈالی جارہی ہے ایک دن مسز ورما نے بتایا کہ تناظر کے پندرہ سو صفحات کی کتابت مکمل ہو چکی ہے۔ میں نے حیرت سے پوچھا "پندرہ سو صفحات!" بولیں "اور کیا؟ آپ کے ورما صاحب ہمیشہ بڑی اور بلکی (bulky) چیزوں کو زیادہ پسند کرتے ہیں نا! اس لیے وہ رسالہ بھی بڑا نکالنا چاہتے ہیں"۔

میں نے مسز ورما کی طرف دیکھ کر کہا "کیا واقعی ورما جی بڑی اور bulky چیزوں کو ہی پسند کرتے ہیں؟" بولیں "سچی بات ہے۔ میں غلط نہیں کہتی۔ میں تو جی آپ کو کئی مثالیں دے سکتی ہوں؟" میں نے کہا "مثالیں دینے کی ضرورت نہیں۔ ایک مثال تو آپ خود ہیں"۔ مسز ورما بولیں "میں تو مثال بعد میں بنی۔ لیکن ان کی ابتدا ہی سے یہ عادت رہی ہے کہ ہمیشہ بڑی بڑی چیزیں اٹھا کر لاتے ہیں۔ یقین نہ آئے تو ہمارے ریفریجیٹر کو دیکھ لیجیے۔ اتنا بڑا ریفریجیٹر لے آئے کہ سارے محلے کی چیزیں اس میں رکھی جاسکتی ہیں۔ پلنگوں کو دیکھیے۔ ٹیلی ویژن کو دیکھیے۔ اور تو اور ہمارے ہاں ایک ایسا صندوق بھی ہے جسے کمرے میں نہیں رکھا جاسکتا بلکہ کمرے کو اس میں رکھا جاسکتا ہے"۔ میں نے کہا "مگر بھابی! صندوق اور ادبی رسالے میں کچھ تو فرق ہونا ہی چاہیے"۔ بولیں "کچھ زیادہ فرق نہیں ہوگا جی۔ ورما جی چاہتے ہیں کہ ان کا رسالہ ایسا صندوق بنے جس میں اردو کا سارا ادب بند ہو جائے"۔ میں نے بات کو آگے بڑھانا مناسب نہیں سمجھا۔

پھر ورما جی اور عتیق اللہ کے عشق کی داستانیں مشہور ہونے لگیں عشق کی داستان میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس داستان میں بار بار ہجر کی گھڑیاں آجاتی تھیں معلوم ہوا کہ یہ دونوں رات دیر گئے تک اس رسالے کی زلفیں سنوارنے میں مصروف رہتے ہیں۔ پھر ورما جی کرشن موہن کے ساتھ زیادہ سے زیادہ دکھائی دینے لگے۔ میں سمجھ گیا کہ اشتہارات کے حصول کی تیاری ہو رہی ہے۔

ایک دن یہ مژدۂ جانفزا ملا کہ تناظر کا کاتب کہیں غائب ہو گیا۔ واقعی کاتب اس طرح ادب کی بہت بڑی خدمت

انجام دیتے ہیں۔ میں اس کاتب کی ادبی خدمات کا اعتراف کرنا ہی چاہتا تھا کہ معلوم ہوا درماجی نے دوسرا کاتب ڈھونڈ لیا ہے پھر پتہ چلا کہ جس پریس میں ان کا پرچہ چھپ رہا تھا وہاں سے تناظر کی بتیں غائب ہو گئیں . . . .

. . . . . . میں اس پریس والے کی خدمات کا اعتراف کرنا چاہتا تھا کہ معلوم ہوا درماجی پندرہ سو صفحات کی بجائے چھ سو صفحات کا پرچہ نکالنے پر آمادہ ہو گئے ہیں ۔ میں بدستور ان سے کھچا کھچا ہی رہا۔

ایک دن انھوں نے مجھے فون کر کے کہا "بھئی آج شام کافی ہاؤس چلے آنا" میں کافی ہاؤس پہنچا تو دیکھا کہ درماجی کافی ہاؤس کے باہر بغل میں کوئی چیز چھپائے کھڑے ہیں۔ میں نے سوچا شراب کی بوتل ہوگی۔ میں نے کہا "باہر کیوں کھڑے ہیں آپ؟"

بولے "اندر بہت سے اردو والے جمع ہیں اور میں اس حالت میں اندر جانا نہیں چاہتا۔"

میں نے پوچھا "کیا بہت پی رکھی ہے؟" بولے "پینے کی بات نہیں۔ آؤ، تمہیں ایک چیز دکھائیں۔" پھر وہ مجھے ریگل بلڈنگ کے پیچھے والی گلی میں لے گئے۔ بار بار چاروں طرف دیکھتے کہ کہیں کوئی آ تو نہیں رہا ہے۔ پھر وہ گلی میں اتنی دور تک چلے گئے جہاں صرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اپنی بغل میں سے شئے مذکور کو نکال کر مجھے دینے لگے۔

"میں نے پوچھا "یہ کیا ہے؟"

بولے "تناظر" میں نے حیرت سے کہا "تناظر"!

بولے "ہاں ہاں! تناظر جسے اردو میں پرسپکٹو بھی کہتے ہیں۔"

اس دن وہ بہت خوش تھے اس لیے انگریزی میں مجھ سے مخاطب ہو کر بولے :

I tell you frankly, without the help of Krishan Mohan this magazine would not have been the light of the day."

میں نے اندھیرے میں تناظر کی کاپی اپنے ہاتھ میں لی۔ اس میگزین نے ابھی "لائٹ آف دی ڈے" تو کیا لائٹ آف دی نائٹ بھی نہیں دیکھی تھی۔ میں نے کہا "درماجی مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ صرف اتنا محسوس کر سکتا ہوں کہ میرے ہاتھ میں چبوترے کی قسم کی کوئی چیز رکھی ہوئی ہے۔"

بولے، اردو میں آج تک کسی ایڈیٹر نے چبوترہ نہیں نکالا ہوگا، وہ میں نے نکالا ہے۔

"Will you accept it or not?

میں نے کہا "درماجی! ذرا روشنی میں چلیے تاکہ میں اس چبوترے کا دیدار کر سکوں۔" بولے "نہیں! کوئی اردو والا آجائے گا اور میں فی الحال تناظر کی کاپی کسی کو دکھانا نہیں چاہتا۔" بڑی مشکل سے وہ اس بات کے لیے راضی ہوئے ہم گلی میں چل کر ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں دھیمی دھیمی روشنی آرہی تھی۔ اس دھیمی روشنی میں میں نے اپنے زور بازو کا استعمال کرتے ہوئے تناظر کے پہلے صفحے کو الٹا۔ بڑی مشکل سے کچھ پڑھنے کی کوشش کی۔ پھر درماجی سے پوچھا "درماجی! آپ نے تو بتایا تھا کہ اس رسالے کے ایڈیٹر عتیق اللہ ہوں گے۔ یہ کیا کہ آپ نے موہن داس کرم چند گاندھی کو اس کا ایڈیٹر مقرر کر لیا۔"

اپنی ادارتی کمزوری کو تسلیم کرتے ہوئے بولے "بھئی! یہ اصل میں مہاتما گاندھی کا ایک QUOTATION ہے مگر کاتب نے اس قول کے نیچے مہاتما گاندھی کا نام اس طرح لکھا ہے کہ لگتا ہے یہی اس کے ایڈیٹر ہیں۔"

اتنے میں گلی میں دور سے کوئی شخص آتا ہوا دکھائی دیا۔ درماجی نے بہ نظر احتیاط فوراً تناظر کو میرے ہاتھوں سے چھین لیا۔ جب یہ شخص گزر گیا جو اتفاق سے اردو

والا نہیں تھا تو پھر سے تناظر کا مطالعہ شروع ہوا۔ میں نے دیکھا کہ اس رسالے کی ایک مجلسِ مشاورت بھی تھی جس میں میرا نام بھی شامل تھا۔ میں نے کہا "ورما جی! آپ نے بالآخر دشمنی پوری کی۔ مجھ سے مشورہ تک نہیں کیا اور میرا نام مجلسِ مشاورت میں رکھ لیا"۔ بولے "میں نے دو سال پہلے تمہیں دھمکی تو دی تھی اور پھر تم تناظر کے بارے میں مخالفانہ مشورے لگاتار دیتے آئے ہو تمہیں مجلسِ مشاورت میں کیسے نہ رکھتا"۔ میں نے کہا "خیر چھوڑیے اب مجھے تو سچ سچ بتلایئے اس ادبی عیاشی پر کیا خرچ آیا ہے؟" کان میں بولے "پورے دس ہزار"۔ میں نے پوچھا "قیمت کیا رکھی ہے؟" دوبارہ کان میں بولے "پورے پچیس روپے"۔ پوچھا "تعدادِ اشاعت کتنی ہے؟" تیسری مرتبہ کان میں بولے "پوری ایک ہزار جلدیں"۔ پوچھا "رسالے کے کتنے صفحات ہیں؟" چوتھی مرتبہ کان میں بولے "پورے چھ سو صفحات"۔ میں نے پوچھا "کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ ساری کاپیاں بک جائیں گی؟" ورما جی جواب دینے کے لیے پانچویں مرتبہ میرے کان تک آتے آتے اچانک رُک گئے۔ پھر اپنی نظریں نیچی کر لیں۔ میں نے پوچھا "کیا آپ کو یہ دس ہزار روپے واپس مل جائیں گے؟" ورما جی نے اپنی نظریں مزید نیچی کر لیں۔ میں مزید کوئی سوال پوچھنا چاہتا تھا لیکن دیکھا کہ دو ہی سوالوں میں ان کی نظریں اتنی نیچی ہو چکی تھیں کہ اب اُن میں مزید نیچی ہونے کی سکت نہیں تھی۔ وہ مجلسِ مشاورت کے سامنے یوں نظریں جھکائے کھڑے رہے جیسے عدالت کے کٹہرے میں ایک ملزم اقبالِ جُرم کے بعد کھڑا ہوتا ہے۔ میں انہیں تھوڑی دیر غور سے دیکھتا رہا۔ میں نے تناظر کی کاپی ان کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا "ورما جی! اس بھاری بوجھ کو آپ ہی سنبھالیے۔ میرے تو ہاتھ شل ہونے لگے ہیں"۔

ورما جی نے جھٹ سے کاپی کو میرے ہاتھ سے لے لیا اور اسے اپنے سینے سے یوں لگا لیا جیسے ماں بچے کو چھاتی سے لگا لیتی ہے۔ پھر دبی زبان میں بولے "یار! اب کچھ نہ کہو۔ میں تمہاری جلی کٹی باتیں سننا نہیں چاہتا۔ تناظر کے لیے میں نے پورے ایک برس تک اپنی راتوں کی نیندیں دی ہیں۔ اپنا چین سکھ اور سب کچھ دیا ہے۔ اسے میں نے اپنا خونِ جگر پلا کر جنم دیا ہے۔ میں اس کے خلاف کچھ نہیں سننا چاہتا۔ یہ اچھا، بُرا جیسا بھی ہے میرا ہے۔ جدا آج کے بعد میں تم سے کسی بھی مسئلہ پر مشورہ نہیں کروں گا"۔ یہ کہہ کر انھوں نے تناظر کی کاپی کو اپنے سینے سے مزید چمٹا لیا۔ اس وقت ان کے چہرے پر وہ لمبا سکون دکھائی دے رہا تھا جو بچّہ کو جنم دینے کے بعد ایک عورت کے چہرے پر دکھائی دیتا ہے۔

اب سوال اوارت کا نہیں "ممتا" کا پیدا ہو گیا تھا اس لیے میں بھی خاموش ہو گیا کیونکہ میں جانتا ہوں "ممتا" اندھی ہوتی ہے۔ انھوں نے پھر کچھ نہیں کہا۔ چُپ چاپ تناظر کو سینے سے لگائے گلی سے نکل کر چلنے لگے۔ یہاں تک کہ وہ روشنی میں آ گئے۔ مجھے پلٹ کر نہیں دیکھا اور "مجلسِ مشاورت" بڑی دیر تک اندھیرے میں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

(رسالہ "تناظر" کے جلسۂ اجرا منعقدہ ۲۳ ستمبر ۱۹۷۷ء میں پڑھا گیا)

▲▲

ابراہیم جلیس کا انتقال

برصغیر کے ممتاز طنز نگار ابراہیم جلیس کا ۲۶ اکتوبر کو کراچی میں انتقال ہو گیا۔ وہ ۴۰ برس کے تھے۔ ابراہیم جلیس پاکستان پیپلز پارٹی کے اخبار "مساوات" کے ایڈیٹر تھے۔ ۱۹۴۸ء میں وہ حیدرآباد دکن سے پاکستان گئے تھے۔ عرصہ تک روزنامہ "جنگ" میں طنزیہ کالم لکھتے رہے پھر روزنامہ "انجام" کے ایڈیٹر بنے۔ ابراہیم جلیس کے طنزیہ مضامین اور افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

وہ ہندوستان کے مشہور مزاح نگار مجتبیٰ حسین کے بڑے بھائی تھے۔ ابراہیم جلیس کے سب سے بڑے بھائی محبوب حسین جگر حیدرآباد کے روزنامہ سیاست کے جائنٹ ایڈیٹر ہیں۔

Read & Subscribe to :

ART OF LIVING

INDIA'S FINEST SELF-IMPROVEMENT MONTHLY

Carries articles on culture, religion, philosophy, art, sports, films and other topical subjects contributed by eminent writers, well-known journalists and seasoned educationists.

Annual Subscription: Rs. 20- Single Copy: Rs. 2-

Editor: MUBARAK SINGH

Remit your subscription to:

Circulation Manager ART OF LIVING (Monthly)
M, Model Town Amritsar 143 001
Telephone : 45049

آپ کے پیار کی طرح قدرتی۔
اس میں پانچ قدرتی اجزا
شامل ہیں جو آپ کے بچے کے
نازک نظامِ ہضم کو ٹھیک
کرتے ہیں اور پیٹ کی خرابی،
قے، اپھارا اور دستوں میں
آرام دیتے ہیں۔

ماں کی محبت کے بعد!

غزلیں

اختر نظمی

کوئی سنتا نہیں کس کس کو صدا دی جائے
اپنے اندر کی ہر آواز دبا دی جائے

اس سے پہلے کہ ڈبو دے کوئی سیلاب بلا
گھر میں رکھی ہوئی تصویر بہا دی جائے

ہر صدا اپنے لیے راہ بنا لیتی ہے
اس کے دروازے کی زنجیر ہلا دی جائے

دل نہ چاہے بھی تو دنیا کے دکھاوے کو نہیں
یہ سزا سخت ہے، ایسی نہ سزا دی جائے

کتنے لفظوں سے ہے مفہوم کو شکوہ نظمی
کیسے جذبات کو کاغذ کی قبا دی جائے

▲▲

فاروق شفق

ہر اک در پہ مکڑی کے جالے ملیں گے
مکاں دوسروں کے حوالے ملیں گے

کوئی بھی کسی سے نہ پوچھے گا کچھ بھی
سبھی اک طرف جانے والے ملیں گے

یہاں کس کے گھر جاؤ گے کیا کرو گے
سبھی اپنی گٹھڑی سنبھالے ملیں گے

یہ بستی بھی نقشے پہ ابھرے گی اک دن
اسے بھی کبھی آنکھ والے ملیں گے

ابھی خامشی کے نہ پردے گراؤ
ابھی آہٹوں کے اجالے ملیں گے

▲▲

یوسف جمال

سر کو احساس کی چٹان سے پھوڑا تو نہیں
جان کے خود کو کھلونا کہیں توڑا تو نہیں

شکریہ تیرا ملیں قرض کی سانسیں تجھ سے
زندگی! ہاں ترا احسان یہ تھوڑا تو نہیں

دشمن جاں وہ یقیناً تھا مگر دے کے شکست
ایک قطرہ بھی مرے خوں کا نچوڑا تو نہیں

لے کے چلتا رہا چہرے پہ مسافت کا غبار
رخ مگر اور کسی سمت کو موڑا تو نہیں

ہوش کا قتل کیا، وہ تو ہے قاتل دیکھو
جرم کا کوئی نشاں خواب نے چھوڑا تو نہیں

دشمن جاں ہے وہ دونوں ہی مگر تم نے جمال
ایک رشتے میں دل و ذہن کو جوڑا تو نہیں

▲▲

غـــزل

شاہد عزیز

چاروں اور سمندر تھا
اور میں گھر کے اندر تھا

میری ہی پرچھائیں سے
میرے دل میں اک ڈر تھا

کس کو ڈھونڈ رہے تھے تم
میں تو اپنے اندر تھا

اس نے مجھ کو یوں پھینکا
جیسے میں اک پتھر تھا

اظہر ہاشمی

کوئی ہو کہیں کا ہو اگر ہے تو نظر آ
آنکھوں کے مقابل کسی منظر پہ ابھر آ

پھر پیاس سرابوں کی طلبگار ہوئی ہے
اک ریت کا دریا لیے اے دشتِ سفر! آ

دن رات یونہی کھینچتا رہتا ہوں لکیریں
کاغذ پہ کسی روز مرے خواب! ابھر آ

خاموش اندھیروں میں نہ گھٹ جائے مرا دم
اے صبحِ درخشاں تو کسی دن مرے گھر آ

خورشید سحر

گراں سفر تھا مگر خوشگوار رستے تھے
قدم قدم پہ صداؤں کے پھول بکھرے تھے

برہنہ جسم کی اس نے ہی آبرو رکھی
لباسِ خاک کہ جس پہ ہزار دھبے تھے

ہر ایک سمت اندھیرا تھا شہرِ دل میں مگر
تمھاری یاد کے دیوار و در چمکتے تھے

زمانہ بدلا تو روشن ہوئے سحر کی طرح
ہمارے شہر میں جو دھندلے دھندلے تھے

○ بچھو گھاٹی - اودے پور، راجستھان　○ ۳۱- روشن گولیڈ الین - بھوپال ۱　○ مہادیو احلہ - آرہ (بھوجپور)

میرے حصّے کا سکھ

مہدی ٹونکی

کلپنا کا خط آیا ہے ——

دل کو سکون یا راحت ملنے کے بجائے اُداسی اور بڑھ گئی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ مرد کو سب سے زیادہ خوشی دینے والی عورت —— بیوی ہوتی ہے۔ پندرہ سال قبل کلپنا کو بیوی بناکر میں بہت خوش تھا۔ واقعی سارے جہاں کی خوشی مجھے صرف اُس کے قرب سے ہی مل جاتی تھی۔ اُس کی جدائی مجھے بہت بُری معلوم ہوتی تھی۔ دُور رہنے پر اُس کے خط کا ایک ایک لفظ محبت اور چاہت میں ڈوبا نظر آتا تھا۔ ہر خط مجھے بے انتہا خوشی دیتا تھا۔ لمبے لمبے خط بھی مجھے بہت مختصر معلوم ہوتے تھے۔ مگر آج اُسی بیوی کا خط خوشی دینے کے بجائے دُکھ اور بڑھا رہا ہے۔ پندرہ سال میں محبت کس قدر کم ہوگئی ہے۔ اپنائیت کتنی گھٹ گئی ہے! کیا عمر بڑھ جانے سے انسان محبت یا چاہت کے قابل نہیں رہتا؟ ——

کلپنا نے لکھا ہے ——

پریتم

جب سے گئے ہو تم نے صرف ایک خط لکھا ہے وہ بھی اپنے پہنچنے کی اطلاع۔ تم تو وہاں آرام سے نوکری پر بیٹھے ہو، تمہیں کیا خبر کہ یہاں ہم پر کیا گزر رہی ہے؟ تم نے کہا تھا کہ جاتے ہی روپے بھیجوں گا مگر اب تک ایک پیسہ بھی نہیں بھیجا۔ ایک مہینہ ہونے کو آیا۔

بجلی کی فیس اسی مہینے جانی تھی۔ آخری تاریخ بھی گزر گئی۔ لیٹ فیس کی تاریخ کو بھی کچھ دن ہی باقی رہ گئے ہیں۔ پپّو تین دن سے بخار میں مبتلا ہے۔ دوا لینے جب پپّن کو دوا والے کی دُکان پر بھیجا تو دوا والے نے یہ کہہ کر دوا نہیں دی کہ پہلے ہی بہت سارے پیسے باقی ہیں۔ تین مہینے سے ایک پیسہ بھی جمع نہیں کرایا۔ مجبوراً تی کماری بہن جی سے روپے اُدھار لیے۔ بہت شرم آئی۔ دودھ والا روزانہ پیسوں کا تقاضہ کرتا ہے۔ کہتا ہے چار پانچ دن میں اگر پیسے نہیں دیئے تو میں دودھ بند کردوں گا۔ بہت پریشانی ہے۔ جلدی سے روپے بھیجو بہت انتظار ہے۔ گھر کے کام کاج نے اور اِن فکروں نے تو مجھے ادھ مرا کرکے رکھ دیا ہے۔

سردی شروع ہوگئی ہے، اپنی صحت کا خیال رکھنا۔

جواب بہت جلد دینا۔

تمہاری
کلپنا

لمبے لمبے، محبت سے بھرے خطوں کا آتاریہ خط! کانٹوں سے بھرا!

پورے خط پر نظر ڈالتا ہوں تو بس راحت کے دو مرجھائے پھول ملتے ہیں —— پریتم اور اپنی صحت کا خیال رکھنا! پورے خط میں میرے حصے کا سکھ —— بس یہی الفاظ! رواداری کے الفاظ!

مبارک منزل - پانچ بتی ٹونک (راجستھان)

جلیل تنویر | تلاش

پردیس میں کئی یگ گزارنے کے بعد میں نے اپنے قصبے کی دہلیز پر قدم رکھا۔

یادوں کے خاموش الاؤ پھر سے سُلگنے لگے۔ اطراف چنگاریاں سی رینگنے لگیں۔ پنگھٹ کی تلاش نے مجھے بے چین کر دیا۔ لیکن اب پنگھٹ کہاں تھا! حیرت کی انتہا نہ رہی جب میری آنکھوں نے قصبے میں بلند قامت عمارتیں کھڑی ہوئی دیکھیں۔ کشادہ سڑکیں، بسوں، موٹروں کی ریل پیل دیکھی۔ لوگ خوش نما لباسوں میں گھوم رہے ہیں۔ قصبے کی شکل ہی مختلف نظر آرہی ہے۔ تو کیا اب لوگ بھی بدل گئے ہیں؟ مجھے کوئی پہچان بھی سکے گا؟ ہاں۔ ہاں۔ ضرور پہچان لیں گے۔ میں تو اپنے محلے کا مقبول ترین انسان رہا ہوں۔ میرا چہرہ بڑا بابرکت رہا ہے۔ قصبہ کے تاجر اپنے سفر پر روانہ ہونے سے قبل میرے چہرے کو دیکھ لینا اپنی کامیابی کا باعث سمجھتے تھے۔ پنگھٹ پر جب میں جا نکلتا تو سانولی حسینائیں اپنے ہاتھوں سے گاگر چھوڑ دیتیں۔ اب کئی برس پردیس میں گزارنے کے بعد میں پھر یہاں آیا ہوں۔ اپنے بچھڑے احباب سے ملنے کے لیے بے چین ہوں۔ مسٹر آر، مسٹر ڈی، مسٹر ایس، سارے لوگ کتنے مخلص ہیں۔ یہ مجھے اپنے سامنے پاکر خوشی سے پھولے نہ سمائیں گے۔

میں مسٹر آر کے کمرے میں داخل ہو جاتا ہوں۔ بالکل وہی کمرہ ہے۔ یہ کتابوں کے بڑے عاشق ہیں۔ شیلف میں موٹی موٹی کتابیں نہایت سلیقے سے سجی ہوئی ہیں۔ میز پر کچھ انگریزی رسالے رکھے ہوئے ہیں۔ سرورق پر کسی مریلن منرو کی تصویر نے مجھے اپنی طرف بڑی دیر تک متوجہ رکھا ہے۔ ارے یہ ایش ٹرے۔ یہاں کیوں آگیا؟ حالانکہ مسٹر آر سگریٹ نہیں پیتے۔ شاید مہمانوں کے لیے رکھا ہوگا۔ ایک اور تبدیلی ہوتی ہے ان کے کمرے میں۔ دروازوں پر بجائے گلابی پردوں کے زرد رنگ کے پردے لٹک رہے ہیں۔ حالانکہ مسٹر آر صرف گلابی رنگ کا پردہ پسند کرتے تھے۔ بلکہ بیشتر اشیاء کے انتخاب میں گلابی رنگ کو ہی ترجیح دیتے تھے۔

لیکن اس تبدیلی کے کیا معنی؟ میں صوفے میں دھنسا مسٹر آر کا انتظار کرنے لگتا ہوں۔ کچھ ہی دیر بعد مسٹر آر کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ میں فرطِ مسرت سے بغل گیر ہونے کی کوشش کرتا ہوں لیکن وہ مجھے مصافحہ پر ہی ٹال دیتے ہیں۔ مسٹر آر کا چہرہ کتنا بدل گیا ہے۔ ان کے چہرے کی وہ روحانی طمانیت کہاں غائب ہو گئی۔ آخر چہرے کی اس تبدیلی کا سبب کیا ہے؟ اس سے قبل کہ میں کچھ کہتا۔ وہ خود کہہ اُٹھتے ہیں "کون ہو تم؟"

"میں۔ میں" میں ہکلانے لگتا ہوں۔ "کیا آپ مجھے بھول گئے۔ کہ میں!"

"دوپہر میں ہی میں یہ بھول جاتا ہوں کہ صبح ناشتے پر کیا کھایا تھا۔ بھول جانا ہی خوش حال زندگی کی علامت ہے یہاں کوئی کسی کو یاد نہیں رکھتا۔ وقت یادوں کے چہروں پر فراموشی کا دبیز غلاف چڑھا کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ اور پھر کچھ بھی نظر نہیں آتا۔"

"لیکن انسانیت کے ناطے میری کچھ مدد کیجیے۔ میں بہ

شعبۂ اردو۔ سہادری کالج۔ شیموگہ۔ ۵۷۷۲۰۱ (کرناٹک)

پریشان ہوں۔ پسمیں سے خالی ہاتھ لوٹتا ہوں۔"
"میں انسانیت پر یقین نہیں رکھتا۔ میں صرف وقت پر یقین رکھتا ہوں۔"

میں سوچنے لگتا ہوں کہ کہیں میں غلط جگہ پر تو نہیں آگیا۔ گھر میں داخل ہونے سے پہلے دروازے پر لگی نام کی تختی کو ضرور پڑھ لینا چاہیئے تھا۔ میں کمرے سے باہر نکل کر تختی پر نظر ڈالتا ہوں۔ مسٹر آر کا ہی نام ہے۔ تو پھر وہ مجھے پہچاننے سے انکار کیوں کر رہے ہیں حالانکہ یہ وہی مسٹر آر ہیں جو میرے چہرے کو بڑا بابرکت بتاتے تھے۔ اور سفر پر جانے سے قبل میرے چہرے کو دیکھ اپنا فالِ نیک تصور کرتے تھے۔ اب انھوں نے میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا؟ مسٹر آر کے اس غیر متوقع رویے سے میں مایوس ہو جاتا ہوں۔ دوسرے شناسا کے کمرے میں داخل ہونے سے قبل دروازہ پر لگی نام کی تختی کو غور سے پڑھ لیتا ہوں۔ اس کے علاوہ پڑوسی سے بھی دریافت کرکے پورے تیقن کے ساتھ مسٹر ایس کے کمرے میں داخل ہو جاتا ہوں۔ مسٹر ایس کا کمرہ ایک بالکل نئی دنیا کا منظر پیش کر رہا ہے۔ کئی نوجوان لڑکیاں اور لڑکے دراز بالوں والے لہک لہک کر باتوں میں منہمک ہیں۔ سگریٹ کے جلنے کی بو سے سارا کمرہ وحشت ناک ہو گیا ہے۔ "یہ مسٹر ایس کا کمرہ ہے نا؟" میں ایک لڑکے سے سوال کرتا ہوں۔ اثبات میں جواب پا کر میں خوش ہو جاتا ہوں۔ ایس کے انتظار میں کرسی پر بیٹھ جاتا ہوں۔ میری نگاہیں کمرے کا جائزہ اپنا شروع کر دیتی ہیں۔ بڑی حیرت انگیز تبدیلی ہوئی ہے ان کے کمرے میں دیواروں پر ننگی اور نیم عریاں لڑکیوں کی تصاویر کس قدر ہیجان انگیز ہیں۔ حالانکہ وہ تصویر کشی کو حرام سمجھتے تھے۔ لڑکے۔ لڑکیاں سگریٹوں کا مسلسل دھواں نیم مردہ قہقہے۔ یہ کیسی اجنبی دنیا میں آ گیا ہوں میں۔ یہ کیسے نوجوان ہیں۔ جنھیں کھل کر ہنسنا بھی نہیں آتا۔ ان کی گفتگو۔ گفتگو کا انداز اور موضوعات کتنے عجیب و غریب ہیں۔ یہ کبھی انگریزی بولتے ہیں اور کبھی اردو اور کبھی ہندی۔ کسی بھی زبان کو پوری طرح اپنے اظہار کا ذریعہ نہیں بناتے۔ اف۔ یہ کیسا شور مچا رکھا ہے ان لوگوں نے کیسی بے ہنگم آواز ہے اس ساز کی۔ یہ بے حیا لڑکی کیسی بے ہودگی کے ساتھ اپنے جسم کی نمائش کر رہی ہے۔ آخر کیا ہو گیا ہے ان لوگوں کو۔ آنکھ کا پانی مر گیا ہے۔ میرا پنگھٹ کہاں ہے۔ کہاں گئے وہ معصوم سانولے قہقہے۔ یہ سب کیا ہوا۔ کیسا انقلاب ہے یہ!!

اچانک مسٹر ایس کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ ان کی آمد سے کمرے میں کچھ سکون سا چھا جاتا ہے۔ میں بغلگیر ہونے کی بجائے صرف مصافحہ کے لیے اپنا ہاتھ ان کی طرف بڑھاتا ہوں۔ لیکن ادھر سے ہاتھ نہیں بڑھتا۔ میرا ہاتھ ہوا میں جھول جاتا ہے۔ "آپ کون ہیں" مسٹر ایس کہہ اٹھتے ہیں:

"میری کچھ مدد کیجیے۔ میں برسوں غریب الوطنی کی آگ میں جھلس کر وطن کی چھاؤں میں آیا ہوں۔"

"میں وطنیت پر یقین نہیں رکھتا۔ میں تو بین الاقوامیت پر یقین رکھتا ہوں۔ اس وقت میں ایک ضروری کانفرنس میں جا رہا ہوں۔ میرے پاس فضول باتوں کے لیے وقت نہیں ہے۔"

میں نیم مردہ حالت میں دروازے کی طرف پلٹتا ہوں۔ ایک نوجوان میرے قریب چلم لے کر آتا ہے۔ کہتا ہے "دم مارو گے؟ آؤ ہماری آزاد دنیا میں شامل ہو جاؤ۔ دیس اور پردیس کے چکر سے آزاد ہو جاؤ گے۔" پھر قہقہے قہقہے ——

میں کمرے سے باہر آ جاتا ہوں۔ ایک تیز رفتار بس میری آنکھوں میں دھول جھونک کر آگے بڑھ جاتی ہے۔ میرا ایک پرانا دوست اپنی موٹر سائیکل پر گزرتا نظر آتا ہے۔ میں اسے رکنے کا اشارہ کرتا ہوں۔ مگر وہ صرف مسکرا کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ آخر یہ لوگ مجھے پہچاننے سے انکار کیوں کر رہے ہیں۔ کیا تبدیلی آگئی ہے مجھ میں؟ میں تو بالکل نہیں بدلا۔ میرے دل میں سب کے لیے وہی خلوص ہے وہی پیار ہے۔ لیکن ... لیکن۔ یہ سب؟؟ میں پنگھٹ کی تلاش میں نکل پڑتا ہوں۔ لیکن پنگھٹ نہیں ملتا۔ برسوں پہلے جہاں فصلیں لہلہاتی تھیں آج وہاں اونچی اونچی عمارتیں

کھڑی ہنس رہی ہیں۔ ہر طرف دھواں ہی دھواں ہے۔ شور ہی شور۔ یہ کیسی زمین ہے جہاں میں نے قدم رکھا ہے۔ جہاں میرا کوئی ہمدرد کوئی غم خوار نہیں۔ میں سوچوں میں غرق آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا چلا جا رہا ہوں۔ اچانک نوجوانوں کا ایک گروہ مجھ سے ٹکرا جاتا ہے۔ شاید پی رکھی ہے ان لوگوں نے۔ ایک میری قمیص کا کالر پکڑ کر کہتا ہے۔ "اے کون ہو تم۔ کون سی بستی سے آئے ہو؟" میری حیران کن خاموشی اور بے بسی پر سارے نوجوان قہقہہ لگاتے ہیں "کوئی پاگل معلوم ہوتا ہے چھوڑ دو" قہقہے دور تک قہقہے۔ زمین سے آسمان تک قہقہے۔ چاروں سمت قہقہے۔ اچانک ایک نوجوان مجھے زور سے دھکیل دیتا ہے۔ میں سامنے ڈرینج میں گر جاتا ہوں۔ ڈرینج میں کافی دیر تک پڑا رہنے کے بعد دیکھتا ہوں کہ ڈرینج کا پانی ساکن ہو گیا ہے پھر میں نے پانی کو دیکھا اور یہ کیا؟ میرا چہرہ کیسے بدل گیا" میں چیخ اٹھتا ہوں۔ اپنے ایک بزرگ کی بات یاد آتی ہے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ انسان کو چاہیے کہ وہ ہمیشہ آئینہ دیکھتا رہے۔ جو لوگ آئینہ نہیں دیکھتے وہ ہمیشہ نقصان اٹھاتے ہیں۔ میں نے برسوں سے آئینہ نہیں دیکھا۔ آج میرا چہرہ کیسا ہیبت ناک ہو گیا ہے۔ قصور میرے اپنے چہرے کا ہے۔ مسٹر آر، مسٹر آئیں اور مسٹر آئین کا نہیں۔ دراصل مجھے آئینہ دیکھ کر ان سے ملنا چاہیے تھا۔ میرا چہرہ کہاں گیا۔ میں سر سے پاؤں تک چیخ بن جاتا ہوں۔ پھر سارے شہر میں میری ہی چیخیں گونجنے لگتی ہیں۔ میرا چہرہ کہاں ہے۔ میرا چہرہ ۔۔۔۔

▲▲

بند دروازہ (بقیہ صفحہ ۲۹)

وہ خود ہی اپنا جی کڑا کر کے کہنے لگا۔

"تب سے یہ دروازہ اسی طرح بند پڑا ہے۔ اسے کھولوں تو کلیجہ منہ کو آئے گا"

سورج کب کا ڈوب چکا تھا۔ غریب داس کی بیٹھک میں شام کے دھندلکے نے اپنے سیاہ پھن پھیلا دیے تھے۔ کمرے کی فضا غریب داس کے اشکوں سے نم ہو گئی تھی۔ دفعتاً گلی میں بچوں کے ہو ہو کرنے کا شور ہوا۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں موند لیں۔ مجھے محسوس ہوا جیسے یہ بچوں کی آوازیں نہیں ہیں۔ کسی نے اندر والا دروازہ کھول دیا ہے اور اُدھر سے زبردستی اٹھائی جا رہی نادرہ کی چیخیں، ماسٹر صاحب اور خدیجہ چاچی کی آخری کراہیں کے ساتھ مل کر ابھری ہیں اور میرے آس پاس خون کی ندی بہہ نکلی ہے۔

▲▲

نیا ادب نئے مسائل

بشر نواز کے خیال انگیز مضامین۔ روایت اور جدت کے رشتوں کی بازیافت نئے ادب کا معروضی جائزہ۔ قیمت ۱۰ روپے

زبان اور قواعد

زبان کی ساخت، اس کے تشکیلی ضابطوں اور ارتقائی مرحلوں پر رشید حسن خاں کے عالمانہ مضامین۔ قیمت: ۷ روپے

اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت

ڈاکٹر عنوان چشتی کی نئی کتاب جس میں ہند و پاک کے صدہا شاعروں کے کلام کا تجزیہ کر کے جدیدیت کی خصوصیات کا تعین کیا گیا ہے۔

قیمت: ۴۰ روپے

نیشنل اکادمی سے طلب کریں

غزلیں

منوہر لال ہادی

جہاں عزم کی رزم آرائیاں ہیں میاں
سرِ دار مشکل کی دارائیاں ہیں میاں

سمندر کی جانب چلا ہوں میں یہ جانچنے
تلاطم میں کتنی توانائیاں ہیں میاں

کوئی مجھ سے پوچھے کہ کیا ہیں یہ سرگرمیاں
بتانِ تمنا کی انگڑائیاں ہیں میاں

خلائے دلِ زار کی وسعتیں دیکھ کر
خجل آسمانوں کی پہنائیاں ہیں میاں

مجھے دوستوں کی رفاقت کی حاجت نہیں
سدا ہمنشیں میری تنہائیاں ہیں میاں

نہیں سہل بحرِ بقا کا عمق ناپنا
کہ پاتال سے بڑھ کے گہرائیاں ہیں میاں

ملامت کی اندھی گلی میں نہ جا بار بار
کہ خنجر بکف یہ شناسائیاں ہیں میاں

محبت ساعتِ بد کا سایہ سمجھتے ہیں لوگ
یہ ضعفِ طبیعت کی پرچھائیاں ہیں میاں

سخن سے تو ہادی چھلکتی ہیں بیباکیاں
تو کیوں کارِ دنیا میں پسپائیاں ہیں میاں

▲▲

خالد کفایت

سو سمندر پی چکا ہوں پھر بھی کیوں پیاسا ہوں میں
پتی پتی پہ سے شبنم چاٹتا پھرتا ہوں میں

تیری زلفوں کی مہک تیرے بدن کی بو ملی
اجنبی راہوں سے ہو کر جب کبھی گزرا ہوں میں

تو کہاں جائے گا مجھ سے دور میرے دل سے دور
تو مری قسمت ہے تیرے ہاتھ کی ریکھا ہوں میں

بن چکا ہوں اب پرانے موسموں کی یادگار
زندگی کی شاخ پر سوکھا ہوا پتا ہوں میں

بات کیا تھی کس لیے وہ مجھ سے برگشتہ ہوا
اب بھی تنہائی میں اکثر سوچتا رہتا ہوں میں

مل گیا جب راہ میں کوئی تو کہنا ہی پڑا
بس نوازش ہے، کرم ہے آپ کا، اچھا ہوں میں

ساغرِ جم جان کر رکھتا تھا وہ مجھ کو عزیز
توڑ ڈالا جب کھلا اس پر کہ آئینہ ہوں میں

▲▲

ظفر کلیم

دلوں پہ زخم لیے کیوں اسیرِ یاس ملے
مجھے سکوں نہ ملا لوگ جب اداس ملے

بھلے نہیں ابھی حالات شہر کے شاید
گلی کے موڑ پہ کچھ لوگ بدحواس ملے

دعا یہ مانگی تھی صحرا کی دھوپ میں میں نے
مسافروں کو سفر میں کبھی نہ پیاس ملے

بہت دماغ تھا جن کو جہاز رانی کا
وہ لوگ ٹوٹی ہوئی کشتیوں کے پاس ملے

اسے تلاش رہا ہوں کہ وہ نہیں ملتا
تری طرح مرے زخموں پہ جو اداس ملے

ظفر امیدِ کرم اور وہ بھی غیروں سے
یہی بہت ہے کہ اپنے لہو کی آس ملے

▲▲

○ ۱۲/۳ سیکٹر ۳، آر کے پورم نئی دہلی ۲۲ ○ عصمت منزل موتی بازار مالیر کوٹلہ (پنجاب) ○ مومن پورہ ناگپور ۱۸

بزمِ احباب

● "تحریک" نظر نواز ہوا۔ جس کی بے باکی اور آزادانہ تحریر قابلِ داد ہے اگست کے "تحریک" میں کملاپتی ترپاٹھی صاحب کا بیان جنھوں نے اپنے دورِ حکومت میں اُتر پردیش اُردو اکاڈمی کے جلسے میں دو ٹوک کہہ دیا تھا کہ اُردو کو ثانوی سرکاری زبان قرار دیے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ بات سرکار کے بے انصاف دلال کہہ سکتے ہیں لیکن یہ جان کر کہ پنڈت آنند نرائن ملّا صاحب نے بھی اُن کی تائید کی تھی مجھے بہت دُکھ ہوا۔ ملّا صاحب تو اُردو کے مصنف ہیں اور آپ کو اردو داں بہت چاہتے ہیں۔ اگر ایسے ہی اُردو کے تحفظ کرنے والے ہوں تو اُردو کی کہاں تک خدمت ہوسکتی ہے۔ ہماری فلمی دُنیا کے لوگ روپیوں کے چکر میں اس پیاری اور میٹھی زبانِ اُردو کی شیرینی کو ہندی کے نام سے بیچ دیتے ہیں۔ حال ہی میں تاہر حسین صاحب نے اپنی فلم کے لیے اُردو سرٹیفکیٹ حاصل کیا وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ کیوں کہ دوسرے جو فلم بنانے والے ہیں وہ صرف مسلم سوشیل فلم ہی کو اُردو سرٹیفکیٹ دیتے ہیں۔ ایسا کرنا کہاں کا انصاف ہے۔ کہانی۔ مکالمے۔ نغمے۔ یہ سب کچھ تو اُردو میں لکھے جاتے ہیں اور ہندی کی پبلسٹی کرتے ہیں۔ کیا ہمارے اُردو مصنف اتنے بے ہمت ہیں یا انھیں پیسے کا اتنا لالچ ہے۔ ڈرتے ہیں کہ اگر ان فلموں کو اردو فلمیں کہہ دیں تو کوئی غیر اردو داں ناراض نہ ہو جائے۔ پھر بھی ان میں سے اکثر خود کو نڈر کہتے ہیں۔ اور انقلابی تحریریں اور نظمیں لکھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو شرم آنی چاہیے۔ آپ نے کچھ کمیونسٹوں کے بارے میں لکھا تھا کہ انھوں نے اُردو کو دیوناگری رسم الخط میں لکھنے کی حمایت شروع کی تھی اور وہ اردو کے مصنف تھے۔ بہت افسوس ہوا، اُس سے کمیونسٹوں کی ذہنیت سے واقفیت ہوتی ہے۔ مسلمان اُردو زیادہ بولتے ہیں تو کیا اردو کے ساتھ انصاف نہیں کرنا چاہیے۔ ہندی کی تاریخ بھی مسلمانوں سے وابستہ ہے۔ کیا ہندی پورے ملک کی مادری زبان ہے۔ غیر لوگوں کی کثیر تعداد کی مادری زبان اُن کی علاقائی زبان ہے۔ گجراتی مرہٹی پنجابی۔ بہاری۔ بنگالی کنڑی۔ تلگو بیسیوں بھاشائیں ہیں۔ آپ ہی انصاف سے کہیے کشمیر سے لے کر کنیا کماری تک بولی اور سمجھی جانے والی اور لکھی اور پڑھی جانے والی زبان ہے تو وہ صرف اردو ہے جو بالکل ہندوستانی ہے۔ کمیونسٹ کیا یوں ہی دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ مذہب کا بھید بھاؤ نہیں رکھتے۔ کیا کوئی مسلمان ہونا جُرم ہے؟ اُردو کے حقائق پامال کیے جاتے رہے اسے مسلمانوں کی زبان کہہ کر، یہ انصاف نہیں ہے وہ کانگریسیوں کا حشر سامنے ہے۔ موجودہ حکومت نے بھی ناانصافی کی راہ اختیار کی تو اسی انجام کو پہنچے گی۔ اگر اُردو کو دیوناگری رسم الخط میں لکھیں تو بڑی گڑبڑ پیدا ہوگی: لفظوں کا تلفظ صحیح ادا نہ ہوگا۔ دیوناگری رسم الخط میں اب تک خط طوالت نہ ہو کیفیت، خُدا کو کُھدا، خزاں کو کھزاں، وقت ہوں — لسل لکھا جا رہا ہے۔

——— غوث پیر فیلق اشرفی۔ ٹریسرولی۔ ڈبلیو ڈی۔ ڈیوز آفس بلہاری۔ کرناٹک

● میرا خیال تھا کہ جناب بمل کرشن اشک نظم اچھی لکھتے ہیں لیکن اُن کے خط (مطبوعہ "تحریک" بابت ماہ اکتوبر ۷۷ء) کے مطالعہ سے اندازہ ہوا کہ اُن کی نثر نظم سے بھی اچھی ہے۔ بے ساختہ کسی کا یہ شعر یاد آگیا ؎

ختم ہوئی دُشنام طرازی
یا کچھ اور ارشاد کروگے؟

اُن کی برہمی کا سبب محض یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اُن کے کسی مجموعۂ کلام پر تبصرہ نہیں فرمایا اور اس کی وجہ آپ کے نزدیک یہ ہے کہ وہ "بندو" ہیں۔ موصوف کا الزام قطعاً

بے بنیاد ہے۔ "تحریک" کے زیر نظر شمارہ میں متعدد ہندو فن کاروں
کی تخلیقات شامل ہیں اور خود آشک صاحب کی تخلیقات بھی آپ
کے یہاں اشاعت پزیر ہوتی رہی ہیں۔ اُن کا خط تضادات کا مجموعہ
ہے۔ ایک جانب تو وہ فرماتے ہیں کہ آپ اُردو کو ہندوؤں اور
مسلمانوں کی مشترکہ زبان کا درجہ عطا کرتے ہیں اور دوسری جانب
آپ سے پوچھتے ہیں کہ آپ کب اُردو کو مسلمانوں کی زبان قرار
دیں گے اور خود کب مشرف بہ اسلام ہوں گے۔ ہندو اور
مسلمان کا سوال اُٹھانا قومی یک جہتی کے تقاضوں کے منافی
ہے اور یہ روش ہر اعتبار سے قابلِ مذمت ہے۔ موصوف
رقم طراز ہیں ——— "کیا تحریک کے کسی رُکن میں کوئی
احساس، کوئی تمیز، کوئی ادبیت باقی ہے یا سب کچھ ختم ہو چکا
ہے" ——— یادش بخیر، مرزا نوشہ کیا خوب فرما گئے
ہیں ؎

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

آشک صاحب غالباً اس نظریے کے عَلَم بردار ہیں کہ ادبی
گفتگو میں کچھ بے ادبی کے پہلو بھی ضرور شامل ہونے چاہئیں
"کاش! آپ کے جسم میں کہیں ضمیر ہوتی"۔ اِس قسم کے
جُملے زبان و بیان کا جنازہ اُٹھانے کے لیے کافی ہیں۔
اُردو میں "ضمیر" غالباً نہیں یقیناً مذکر ہے۔ یہ کوئی تحقیق طلب
بات نہیں۔ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ جسم کے اعضا مثلاً آنکھ،
ناک، کان کی طرح "ضمیر" جسم کا کوئی عضو نہیں جسے اشارے
سے یا چھو کر کہا جا سکے ——— "صاحب، یہ ضمیر ہے" صرف
اس قدر کہہ دینا کافی تھا "کاش! آپ کا ضمیر ہوتا"۔ غالباً آشک
صاحب شعر و ادب میں زبان و بیان کی صحت کو ضروری نہیں سمجھتے۔
لہٰذا اُن سے اس قسم کے تقاضے لاحاصل ہیں۔

آپ نے موصوف کے خط کو، جو سراسر ادارہ "تحریک" کے
خلاف ہے اور جس میں ادبیت کو پیشِ نظر نہیں رکھا گیا، اپنے
پرچے میں شائع کیا ہے۔ اسے آپ کی غیر معمولی فراخ دلی ہی
کہا جا سکتا ہے۔

——— پرکاش ناتھ پرویز۔ ۲۱۳۵، سیکٹر ۲۲ سی۔ چنڈی گڑھ

● تحریک کا تازہ شمارہ ابھی ابھی ملا۔ اس دفعہ "دو کرشنوں"
نے حیران کر دیا۔ ایک کرشن موہن ——— جن کے بارے میں پہلی
مرتبہ یہ معلوم ہوا کہ "دو رانوں" کی بجائے "دو چٹانوں" کے بیچ
اب اُن کا کلام گھٹا جا رہا ہے۔

بمل کرشن آشک کے خط سے آنکھیں اشک آلود
ہو گئیں۔ پہلی بار یہ معلوم ہوا کہ ایک اُردو رسالے کا ہندو
مدیر اگر کسی ہندو شاعر کے مجموعۂ کلام پر تبصرہ شائع نہ کرے
تو اُسے اعلانِ قبولیتِ اسلام کر دینا چاہیے۔

...... یہ باید گریست!

——— راہی قریشی۔ ۱۸، ودیا نگر۔ ملز روڈ، گلبرگہ (کرناٹک)

● تحریک کا شمارہ کل ملا ہے۔ اب کے اشک صاحب
خوب برسے ہیں آپ لوگوں پر "تبصرہ" نہ کرنے کی شکایت
بجا لیکن یہ ہندو، مسلمان والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی اگر
اپنے کو دانشور کہنے والے لوگ بھی اس قسم کی تنگ نظری کا
مظاہرہ کریں تو ہمارا اور ہمارے ادب کا خدا ہی حافظ ہے

——— نو بہار صابر، مٹیا آشرم، رگھو ناتھ ماجرا، پٹیالہ

● تحریک ماہ جون ۷۷ء میں چھپی فرحت قادری صاحب
کی نظم جو "شِو کی جٹا" سے شروع ہو کر "شِو کی جٹا سُوکھ گئی"
پر اختتام پذیر ہوتی ہے، کے سلسلے میں مَیں سمجھا تھا کہ میرا
مکتوب آپ کی طبعِ عالیہ پر گراں گزرا۔ مگر اُس خط کا اقتباس
تحریک ماہ اگست ۷۷ء میں دیکھ کر آپ کی انصاف پسندی کا
سکّہ میرے دل پر بیٹھ گیا اور آپ کے لیے احترام کا نقش اور
بھی گہرا ہو گیا۔ اس خط میں جسے آپ نے مشتہر فرمایا، میرے
اظہارِ خیال پر جناب پرکاش فکری صاحب نے اور جناب
رونق گیاوی صاحب نے اپنی اپنی رائے کا اظہار "تحریک"
کے حالیہ شمارہ میں فرمایا ہے۔ اس معاملے کو طول نہ دیتے
ہوئے میں صرف اتنا عرض کرنے کی جسارت کروں گا کہ
سوال یہ نہیں کہ نظم زیرِ بحث کا مفہوم کیا ہے سوال اِس نظم
کے عنوان اور اختتام کے لیے، اُن بے محل اور بے جوڑ
جملوں کے استعمال کا ہے جن کا تصرف، ایک دوسرے
فرقہ کی نظریاتی عقیدت کے پہلوؤں پر ہتک آمیز فقرہ بازی

کی غمازی کر رہا ہے ۔
ہاں! یہ بسمل کرشن آشک صاحب نے کیا مضحکہ خیز حد تک بہکی بہکی باتیں کی ہیں۔ مدیر اور نائب مدیر صاحبان کیوں مشترکہ طور پر اعلان نہیں فرما دیتے کہ "آئینہ اور پرچھائیں" ایک عہد آفریں تخلیق ہے اور اس کا مصنف دورِ حاضر کے سب نامور شعرا حضرات پر سبقت لے گیا ہے۔ اشک صاحب کے اس لمبے چوڑے شکایت نامہ سے تحریک کا نصف صفحہ مزین کرنے کی بجائے ایسا دو حرفی تبصرہ فرمانے میں کیا امر مانع تھا۔ اگرچہ اُن کی مشہور و معروف شخصیت کو ایسے ویسے تبصرات کی چنداں ضرورت نہیں۔ بقول شخصے ؎

جو اچھا شعر ہوتا ہے سخنور بول اُٹھتے ہیں

پھر نہ معلوم کیوں تبصرہ کے ضمن میں "آئینہ اور پرچھائیں" کو نظر انداز کرنے کے لیے انھیں آپ سے شکایت ہوئی۔ بہر حال احباب کو اور میرے ایسے اُن کے دیگر مداحوں کو آشک صاحب سے ضرور شکایت رہے گی کہ ایسا "تقاضا" اُن کی شان کے شایاں نہیں تھا۔ ایسے اقدام سے اُن کا وقار بڑھنے کی بجائے کم ہوا ہے۔

—— رشی پٹیالوی، ای ۱۷، آنند نکیتن موتی باغ ۔۲ نئی دہلی

● 'تحریک' بابت ماہ اکتوبر ۷۷ء نظر نواز ہوا۔ بزمِ احباب، کا مطلع و مقطع دو مختلف بحروں میں ہونے کے باوجود رنگ و آہنگ اور موضوع و مضمون کے اعتبار سے باہم خاصے مربوط ہیں۔ اس غزل کا ایک اور مصرع بھی مطلع کی قبیل سے ہی تعلق رکھتا ہے۔ لہٰذا ان اڑھائی شعروں پر اگر کوئی اپنے ایک ہی مکتوب میں اظہارِ خیال کرے تو غالباً بے جا نہ ہوگا۔ مطلع جناب پرکاش فکری کا نتیجۂ فکر ہے اور مقطع بسمل کرشن اشک صاحب کے افکارِ عالیہ کا نمونہ، جبکہ مطلع پر مصرع لگایا (یا اٹھایا) ہے حضرت رونق گیاوی نے۔ تکلف برطرف! جناب رشی پٹیالوی نے "شعور کی جٹا سوکھ گئی" کے سلسلہ میں جو اعتراض کیا تھا اس کا محرک موصوف کا ذاتی 'عقیدہ'، معلوم ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ عقاید کا مسئلہ بہت نازک ہے اس لیے اعتراض کے جواب میں اظہارِ معذرت ہی احسن و انسب تھا، یا پھر مصلحتاً خاموشی اختیار کی جاتی۔ جس پر زیرِ بحث نظم کے خالق نے عمل کیا ہے۔ پرکاش فکری صاحب نے ایسی بحث چھیڑ دی ہے جو طویل تو ہو سکتی ہے لیکن اس کا نتیجہ تلخی کے سوا کچھ نہیں نکلے گا۔ صاحب موصوف کا ارشاد ہے کہ عقاید سے متعلق ایک فنکار کا رویہ عام آدمی سے مختلف ہونا چاہیے۔ موصوف کے نزدیک یہ انحراف ہی فنکار اور عام آدمی کے درمیان حدِ فاصل ہے۔ گویا مروجہ عقاید سے انحراف کرتے ہی ایک عام آدمی فن کار بن جاتا ہے۔ یا فن کار کے لیے عقاید سے انحراف لازم ہے —— لیکن یہ نسخہ جتنا سہل ہے اتنا ہی خطرناک اور مضر بھی ہے۔ فکری صاحب نے غالباً اس کے مضرت رساں پہلوؤں پر قطعاً غور نہیں فرمایا —— بقول فکری صاحب، جب "عقاید کا احترام اپنی جگہ درست" ہے تو پھر رشی صاحب کی طرف سے احترام کا یہی مطالبہ درست" کیوں نہ "مانا جائے؟"

"عقاید کی نفی میں عقاید کی دائمیت کا ثبوت" ملنے کی بات فکری صاحب کے ذہنِ رسا کا ثبوت ضرور مہیا کرتی ہے۔ ورنہ حقیقتاً یہ دعوےٰ بے بنیاد ہے۔ رونق گیاوی صاحب نے جناب رشی پٹیالوی پر "نافہمی" کا طنز کرتے ہوئے "شعور کی جٹا سوکھنے" کی جو شرح فرمائی ہے وہ ان کی "خوش فہمی" کا بین ثبوت ہے۔ اور جب کوئی شخص اس قسم کی خوش فہمیوں میں مبتلا ہو کر خود کو بقراطِ دوراں سمجھنے لگے تو سمجھ لیجیے کہ وہ ایسے مرض میں مبتلا ہو چکا ہے جس کا ۔ ع
..... دارو نہیں لقمان کے پاس ۔ شعور کی جٹائیں، سے اُلجھنے والے ان بقراطوں کی خدمت میں نہایت ادب و احترام کے ساتھ یہ گزارش ہے کہ وہ جناب رشی سے معذرت کر کے اس بحث کو یہاں پر ہی ختم کر دیں تو بہتر ہوگا۔

مقطع پیش کرتے ہوئے بسمل کرشن اشک صاحب نے جو زبان استعمال فرمائی ہے وہ ان کے ضمیرِ مونث کی آئینہ دار ہے۔ اور اس آئینہ میں ان کی حقیقی صورت کے تمام... خط و خال، واضح طور پر نظر آ رہے ہیں جسے دیکھنے کے بعد

"زبان بگڑی تو بگڑی تھی" کہنے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ اشک صاحب کا یہ مراسلہ موصوف کا چیلنج قبول کرتے ہوئے آپ نے شاید اپنی 'جرات' کا ثبوت دینے کے لیے شائع کر دیا ہے —— یقیناً آپ کی جرأت اور ہمت قابل داد ہیں۔ ورنہ اس متعفن تحریر کا تو ناک پہ رومال رکھے بغیر پڑھنا بھی ممکن نہیں۔

—— سورج تنویر، ۳۳۴۹۔ سیکٹر ۱۲۔ ڈی، چنڈی گڑھ

● جون ۷۷ء کے تحریک میں فرحت قادری صاحب کی نظم "شنو کی جٹا" اور اس کے بعد اگست کے شمارہ میں رشی پٹیالوی صاحب اور اکتوبر کے شمارہ میں جناب پرکاش فکری اور جناب رونق گیاوی صاحب کے خطوط نظر سے گزرے۔ میری ذاتی رائے ہے کہ اگر ایک بھی شخص کے مذہبی جذبات و عقائد مجروح ہوتے ہیں تو فرحت قادری صاحب کو فراخدلی کے ساتھ اظہارِ معذرت کر دینا چاہیے اور اس بحث کو مزید طول نہیں دینا چاہیے[1]۔

—— راجندر ناتھ رہبر، ۱۱۹۶۔ سیکٹر ۲۳ بی، چنڈی گڑھ

● اگست کا شمارہ دیکھا۔ گوپال متل صاحب کی صدائے حق مالویوں میں امید کی کرن سے مماثل ہے۔ محترمہ ڈاکٹر انجم آرا انجم صاحبہ کا الفاظ شماری پہ جائزہ ادبی دستاویز سے کم نہیں۔

جناب عبدالرحیم نشتر اور جناب تنہا تماپوری صاحب کے افسانے چونکا دینے والے ہیں۔ جناب عبدالرحیم نشتر صاحب کے افسانے کے تعلق سے میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ شعبہ ہندی نظم کو فارسی رسم الخط میں چھپوا کر موصوف نے اردو قاری کے ساتھ مذاق کی بڑی اچھی کوشش کی ہے۔

اب تک علامات (بہ استثنائے چند) واحد طور پر استعمال ہوتی آئی ہیں جو پوری تخلیق کا احاطہ کیے ہوئے ہوتی ہیں۔ لیکن جناب تنہا تماپوری صاحب نے اپنے افسانے "دھوئیں کی لکیر" میں علامت کی تقسیم کی دلچسپ مثال چھوڑی ہے۔ اردو میں اس قسم کی سیکڑوں کہانیاں موجود ہیں۔ موصوف نے گنجلک انداز میں گھسے پٹے موضوع پر کہانی لکھ کر کوئی نیا تجربہ تو نہیں چھوڑا۔

انسانہ کی بنیادی علامتیں یہ ہیں۔ دھواں (مخالفین کا گروہ) سورج (بیٹا) شمع (عورت) باپ عورت کا پرانا عاشق ہے۔ دھواں (مخالفین کا گروہ) اُسے ناکام و نامراد کرتا ہے۔ سورج (بیٹا) باپ کی محبوبہ سے عشق لڑاتا ہے اور باپ حسد کی آگ میں جلتا ہے۔

لیکن جناب تنہا تماپوری صاحب نے علامت کے استعمال پر کبھی سنجیدگی سے غور نہیں کیا ہے۔ بیٹے کو جب سورج کی علامت میں پیش کیا گیا تھا تو انسانہ کے ابتدائی حصہ میں اُسے کرن کہنا نہ صرف یہ ظاہر کرتا ہے کہ بیان پر موصوف کو قدرت نہیں بلکہ موصوف کا علم جدیدیت کے تعلق سے مشکوک ہے۔ سورج کو اگر رقیب تسلیم کیا جائے تو کرن کا معاملہ نزاعی ٹھہرا۔ تحریر سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ کرن کو سورج کے بچپن کے روپ میں استعمال کیا گیا ہے۔ جبکہ کہانی دور رقابت میں متحرک ہے۔ اگر اس کہانی کو سیدھے سادے انداز میں لکھا گیا ہوتا تو ایسی اغلاط کہانی میں داخل نہ ہو پاتیں۔ لیکن کیا کیا جائے اس علامت نگاری کے فیشن کو —— سید مشتاق حسین بخاری شورا پور۔ ضلع گلبرگہ۔ ▲▲

جدید اُردو ادب کے لیے
سطور
چوتھا شمارہ : ایک ادبی دستاویز
جس کا ایک حصہ جدید اردو افسانے کے انتخاب پر مشتمل ہوگا۔
دسمبر ۷۷ء میں چھپ رہا ہے
سطور پرکاشن۔ ۱۷ ۳۳، دلی گیٹ
نئی دلی ۱۱۰۰۰۲

[1] رہبر صاحب کے خیال سے اتفاق کرتے ہوئے اب یہ بحث بند کی جاتی ہے۔
—— (ادارہ)

خبر نامہ

● ۱۲ستمبر ۷۷ء کو اردو کے ایک نئے رسالے "تناظر" کے اجرا کی تقریب بلراج ورما کی رہائش گاہ، اے ۲۲۵، پنڈارہ روڈ، نئی دہلی پر منعقد ہوئی اس کا اہتمام رسالے کے مرتبین بلراج ورما، عتیق اللہ اور شریمتی مکتی ورما نے کیا۔

تقریب کی صدارت ڈاکٹر قمر رئیس نے کی اور نظامت کے فرائض کنور سین نے سرانجام دیے۔ شمس الرحمٰن فاروقی مہمانِ خصوصی تھے محفل میں حضرات گوپال متل، شہباز حسین، مہدی عباس حسینی، فکر تونسوی، بلراج کومل، مخمور سعیدی، کمار پاشی، بانی، زبیر رضوی، محمود ہاشمی، عنوان چشتی، مجتبیٰ حسین، شمیم حنفی، کرشن مراری، شفیع مشہدی، انوار رضوی، ابوالکلام قاسمی اور دوسری بہت سی ادبی شخصیتیں شریک تھیں۔ اجرا کی رسم جناب کرشن موہن کے ہاتھوں عمل میں آئی۔

کنور سین نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایک مبارک شام ہے جب دلی اور بیرونِ دلی کے اہلِ علم و ادب اس بڑی تعداد میں جمع ہوئے ہیں۔ انھوں نے ان ادبی گروہ بندیوں کا ذکر کرتے ہوئے جو بعض صورتوں میں ذاتی مناقشوں کی صورت اختیار کر لیتی ہیں، امید ظاہر کی کہ "تناظر" اس روش سے دامن بچا کر چلے گا۔ اس کے بعد مجتبیٰ حسین نے اپنا انشائیہ "بلراج ورما نے تناظر نکالا" پڑھا جو "تحریک" کی اسی اشاعت میں شامل ہے۔

کنور سین کی درخواست پر بالترتیب ڈاکٹر عنوان چشتی، محمود ہاشمی، مخمور سعیدی، فکر تونسوی، گوپال متل، شمس الرحمٰن فاروقی اور ڈاکٹر قمر رئیس نے "تناظر" کے مندرجات پر مختصراً اظہارِ خیال کرتے ہوئے اتنا خوبصورت رسالہ شائع کرنے پر اس کے مرتبین کو مبارکباد دی اور اس تمنا کا اظہار کیا کہ یہ اسی خوبی اور خوبصورتی کے ساتھ شائع ہوتا رہے ——— آخر میں بلراج ورما نے بتایا کہ انھوں نے "تناظر" کے اجرا کا فیصلہ کن حالات میں اور اپنی طبیعت کے کن تقاضوں سے مجبور ہو کر کیا۔ انھوں نے اس جریدے کی اشاعت کا سہرا کرشن موہن کے سر باندھا اور کہا کہ ان کے مشفقانہ تعاون کے بغیر یہ کام سرانجام نہیں پا سکتا تھا۔

● ۲۴ستمبر کو دلی رائٹرز ایسوسی ایشن کی طرف سے کرشن موہن کو ان کے مجموعۂ کلام "گیان مارگ کی نظمیں" کا دوسرا ایڈیشن شائع ہونے پر مبارکباد پیش کرنے کے لیے ایک ادبی جلسے کا اہتمام کیا گیا۔ جلسے کی صدارت گوپال متل نے کی اور نظامت مخمور سعیدی نے۔ انھوں نے جلسے کا آغاز کرتے ہوئے کرشن موہن کی شاعری کے اس پہلو پر زور دیا کہ موضوعات کا جو تنوع اور اظہار کی جو رنگا رنگی ان کے ہاں ملتی ہے وہ بہت کم شاعروں کے ہاں نظر آئے گی۔ رام کرشن مضطر اور ساحر ہوشیارپوری نے کرشن موہن سے اپنی دیرینہ شناسائی کا ذکر کرتے ہوئے ان کے شخصی اوصاف اور شاعرانہ خوبیوں پر روشنی ڈالی۔ گوپال متل نے اپنی صدارتی تقریر اقبال کے اس شعر سے شروع کی:

بر آور ہر چہ اندر سینہ داری
سرودے، نالۂ، آہے، نغانے

اور کہا کہ کرشن موہن کا یہی انداز مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے کہ جو کچھ اُن کے مشاہدے میں آتا ہے، جو کچھ وہ محسوس کرتے ہیں، اس کا بے تکلف اظہار کر دیتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ شاعری میں جذبے اور اس کے

اظہار کے درمیان جتنا کم فاصلہ ہو، اتنے ہی بہتر نتائج کی توقع کی جاسکتی ہے۔ شاعروں یا ادیبوں کو اس طرح کے ہدایت نامے جاری کرنا کہ وہ کیا لکھیں کیا نہ لکھیں، ایک غیر ادبی فعل ہے۔ اس قسم کے ہدایت نامے جو دراصل ادب کے خلاف ایک طرح کی تحریکِ عدم اعتماد کی حیثیت رکھتے ہیں، صرف حقارت سے ٹھکرا دیے جانے کے مستحق ہیں۔ ایک شاعر یا ادیب کی کیا ذمہ داری ہے، یہ فیصلہ اسے خود کرنا چاہیے، کسی اور کو نہیں۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اس کی اصل ذمہ داری ایک ہی ہے: اچھے ادب کی تخلیق۔ ادب کے ساتھ کسی سماجی یا سیاسی مقصد کو الگ سے وابستہ کرنا صرف انھی لوگوں کا شعار ہے جو یا تو ادب کی ماہیت اور اس کے منصب سے ناواقف ہیں یا جو ادب کو اپنے خود غرضانہ منصوبوں کی تکمیل کا ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے ادیبوں اور شاعروں کو خبردار رہنے کی ضرورت ہے۔ یہ لوگ ہر بار ایک نیا بھیس بدل کر سامنے آسکتے ہیں لیکن اگر ہم چوکنا ہوں تو انھیں پہچان لینا کچھ مشکل نہیں ہے۔

اس محفل کا اختتام شعر خوانی پر ہوا جس میں کرشن موہن کے علاوہ کنور سین حسرت، سلیم شیرازی، باقی، کمار پاشی، امیر قزلباش، مخمور سعیدی، اوم پرکاش لاغر، راج نرائن راز، کرشن مراری، رام کرشن مضطر، ساحر ہوشیارپوری، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، اور گوپال متل نے اپنا کلام سنایا اور باذوق سامعین سے داد حاصل کی۔

● ۱۶ اکتوبر کو دلی میں اردو نیوز پیپرز ایڈیٹرز کانفرنس کی طرف سے بہار کی جنتا حکومت کے وزیر تعلیم جناب غلام سرور کو جو ایک مشہور صحافی بھی ہیں، عشائیہ دیا گیا۔ جن لوگوں نے ہار پہنا کر وزیر موصوف کا خیر مقدم کیا ان میں دلی کے ڈپٹی میئر مولانا امداد صابری، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، سلامت علی مہدی، تاز انصاری، بہار برنی، احمد مصطفٰے صدیقی راہی، پروانہ ردولوی، مخمور سعیدی اور ماہنامہ "بیسویں صدی" کے جنرل منیجر ایوب صاحب شامل تھے۔ سبھی حضرات نے خیر مقدمی کلمات بھی کہے اور غلام سرور صاحب نے اردو صحافت اور ملکی جمہوریت کی جو خدمات انجام دی ہیں ان کا ذکر کیا۔ گوپال متل نے موجودہ حالات میں اردو کی بقا کے مسئلے کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہا کہ میں جنتا پارٹی کا مخالف نہ ہوتے ہوئے بھی یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ اردو کے سلسلے میں اس پارٹی نے جو موقف اختیار کیا ہے وہ بنیادی طور پر وہی ہے جو کانگرس کا تھا۔ ایک فرق ضرور نظر آتا ہے، کانگرسی اردو والوں کے مطالبوں کا جواب ڈپلومیسی کی زبان میں دیا کرتے تھے اور یہ احتیاط برتتے تھے کہ ان کی دل شکنی نہ ہو لیکن جنتا پارٹی کے ذمہ دار وزرا نے حال ہی میں اردو کے مسئلے پر جو بیانات دیے ہیں ان میں یہ احتیاط بھی ملحوظ نہیں رکھی گئی ہے۔ اس سے اردو والوں کی مایوسی بڑھ رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کے مسئلے کا واحد حل یہی ہے کہ جن ریاستوں میں اردو بولنے والوں کی قابلِ لحاظ تعداد موجود ہے وہاں اسے ثانوی سرکاری زبان کی حیثیت سے تسلیم کر لیا جائے، اس طرح اس کا رشتہ معاش سے جڑ سکے گا جو اس کی بقا کا ضامن ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ انجمن ترقی اردو (ہند) ماضی میں اس مطالبے کی سرگرم موئید رہی ہے لیکن اب یہ محسوس ہونے لگا ہے کہ مرکز اس مطالبے پر زیادہ زور نہیں دینا چاہتا۔ انجمن کی یہ نئی روش افسوسناک ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اس مطالبے میں ضعف پیدا ہو گیا ہے۔ اردو کا ہر بہی خواہ اس مطالبے کی پشت پر ہے اور اسے تسلیم کیے بغیر کوئی حکومت اردو کے ادیبوں اور شاعروں کو انعام و اعزاز سے نوازتی رہے، اردو کتابیں چھاپنے کو مدد دیتی رہے کمیٹیاں اور اکیڈمیاں قائم کرتی رہے، اردو والوں کی تسلی نہیں ہوگی اور وہ اپنی جدوجہد رکھنے پر مجبور رہیں گے۔

غلام سرور صاحب نے جواباً کہا کہ متل صاحب نے جو کچھ کہا ہے اس میں وزن ہے جہاں تک بہار کا تعلق ہے، مجھے یقین ہے کہ وہاں اردو کو ثانوی سرکاری زبان بنانے کی راہ میں اب کوئی بڑی رکاوٹ حائل نہیں ہے اور وہاں کی حکومت جلد ہی ایک فیصلے پر پہنچ جائے گی جو ہماری

امیدوں کے مطابق ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ جمہوریت میں اپنا کوئی مطالبہ منوانے کے لیے زیادہ سے زیادہ عوامی تائید حاصل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اردو والے بھی اپنے مطالبات کے حق میں رائے عامہ کی جتنی تائید حاصل کرسکیں کرنی چاہیے اور اخبارات و رسائل اس سلسلے میں خاص رول ادا کرسکتے ہیں۔

● پچھلے دنوں ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے کمار پاشی پہلی بار پٹنہ پہنچے تو وہاں کے شاعروں اور ادیبوں کی طرف سے ان کا پُر جوش خیر مقدم کیا گیا۔ ۱۴ اکتوبر کو ارمان نجمی کے ہاں ان کے اعزاز میں ایک نشست ہوئی جس کی صدارت رضا نقوی واہی نے کی۔ شرکا میں احمد یوسف، سلطان اختر، ظہیر صدیقی، شمیم فاروقی، اسلم آزاد، رضوان احمد، شوکت حیات، شام رضوی، قدوس جاوید اور کچھ دوسرے حضرات شامل تھے۔ ایک اور نشست ۱۶ اکتوبر کو واہی صاحب نے اپنی رہائش گاہ پر رکھی جس میں مذکورہ بالا حضرات اور لطف الرحمٰن کے علاوہ جو بھاگلپور سے آئے تھے، اور بھی کئی مقامی شاعر اور ادیب شریک ہوئے۔ دوسرے شعرا کے بعد کمار پاشی نے اپنی طویل نظم "ولاس یاترا" کا ایک بند اور بہت سی مختصر نظمیں اور کچھ غزلیں سنائیں۔ آخر میں واہی نے ایک مزاحیہ نظم سنا کر محفل کو زعفران زار بنا دیا۔ یہ نشست ایک پُر تکلف ڈنر پر اختتام پذیر ہوئی۔

● یہ خبر افسوس کے ساتھ پڑھی جائے گی کہ ۳۰ ستمبر ۱۹۷۷ء کو بروز جمعہ صبح نو بجے اردو کے بزرگ شاعر آصف بنارسی ڈھاکے میں بعمر ۹۷ سال انتقال کر گئے۔ آصف صاحب رضا علی وحشت کے جانشین تھے اور سابق مشرقی پاکستان میں انھیں استادانہ حیثیت حاصل تھی۔ بنگلہ دیش بننے کے بعد بھی وہ وہیں رہے اور نامساعد حالات میں بھی اردو کی شمع کو روشن رکھا۔ ان کے انتقال سے جو جگہ خالی ہوئی ہے وہ آسانی سے پُر ہوتی نظر نہیں آتی۔ امید کی جانی چاہیے کہ ان کے شاگردوں اور عقیدت مندوں کا وہ حلقہ جو بنگلہ دیش میں اب بھی موجود ہے، ان کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اردو کے تحفظ اور اس کے فروغ کے لیے کوشاں رہے گا۔ ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ وہ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کے پس ماندگان کو صبرِ جمیل عطا کرے۔

▲▲

مارچ ۱۹۷۸ء میں

تحریک

اپنی اشاعت کے ۲۵ سال پورے کر رہا ہے

ایک سنجیدہ علمی ادبی رسالے کے لیے پوری چوتھائی صدی تک باقاعدگی سے جاری رہنا کم فخر کی بات نہیں، بالخصوص موجودہ ماحول میں جب اردو زبان خود اپنے وطن میں بے وطن ہو کر رہ گئی ہے۔

اپنے کرم فرماؤں اور دوستوں کے تعاون پر بھروسہ کرتے ہوئے اس موقع پر ہم نے "تحریک" کا سلور جوبلی نمبر شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ "تحریک" کے خاص نمبر جب جب شائع ہوئے ہیں ادبی حلقوں میں ان کی دھوم مچ گئی ہے ــــ ہماری کوشش ہوگی کہ سلور جوبلی نمبر سابقہ تمام نمبروں پر سبقت لے جائے ہم یقین دلاتے ہیں کہ "تحریک" کا سلور جوبلی نمبر ایک بے مثال ادبی تحفہ ہوگا۔

اس کی تیاریوں میں ہمارا ہاتھ بٹائیے ــــ اس کے لیے اشتہارات کی فراہمی میں ہماری مدد کیجیے۔

اور

اسے رعایتی داموں پر حاصل کرنے کے لیے تحریک کی سالانہ خریداری قبول کیجیے۔

ہم ہمیشہ کی طرح آپ کے مخلصانہ تعاون کے منتظر ہیں

DR. Z... JAMI... NEW D...

Price

Rs. 1/25

اردو کے سب سے بڑے رومانی شاعر
کا
پورا کلام
کلیاتِ اختر شیرانی
مرتب:
گوپال متل
قیمت: ــــ دس روپے
سخاروف نے کہا
نوبل امن انعام یافتہ سائنسداں الیگزنڈر ڈی سخاروف کا موجودہ سماجی اور معاشرتی مسائل پر اظہارِ خیال۔
قیمت: ــــ چار روپے
لائبریری ایڈیشن: سات روپے
نازش بک سنٹر کی پیشکش
گوپال متل ــــ ایک مطالعہ
گوپال متل کی صحافتی زندگی اور ان کے ادبی اور شعری کارناموں کا بھرپور جائزہ، آخر میں گوپال متل کی نثری اور شعری نگارشات کا انتخاب بھی شامل ہے۔
مصنف: محمد عبدالحکیم
قیمت: پندرہ روپے
نئی غزل میں کلاسیکی وقار
کی
از سرِ نو بازیافت
بانی کا مجموعۂ کلام
حسابِ رنگ
قیمت: پندرہ روپے
بسمل سعیدی
شخص اور شاعر
بسمل سعیدی کے فکر و فن پر ایک اہم کتاب۔ ممتاز اہلِ قلم کے مضامین، بسمل صاحب کا منتخب کلام اور ان کا طویل انٹرویو جو ماضی قریب کی ادبی تاریخ کے کئی مخفی گوشوں کو سامنے لاتا ہے۔
قیمت: اٹھارہ روپے
اردو غزل کے ارتقائی سفر
کا
نیا سنگِ میل
رو بہ رو
کمار پاشی کی غزلیں
قیمت: دس روپے
نیشنل اکادمی، ۹ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۔۱۱۰۰۰۲

DR. ZAKIR HUSAIN LIBRARY
JAMIA NAGAR
NEW DELHI-110025

پنجاب اور آندھرا کی لائبریریوں کے لیے منظور شدہ

ماہنامہ

تحریک

نئی دہلی

شمارہ : ۹ جلد : ۲۵

دسمبر ۱۹۷۷ء

مندرجات

ادارۂ تحریر :

گوپال متل ☆ مخمور سعیدی

پریم گوپال متل

سالانہ قیمت : پندرہ روپے فی کاپی : ایک روپیہ ۲۵ پیسے

بیرونی ممالک سے

سالانہ تین پونڈ فی کاپی : چھ شلنگ

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتا

منیجر ماہنامہ تحریک ۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دلی ۱۱۰۰۰۲

پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر : گوپال متل

مطبع : نعمانی پریس، دہلی

مقام اشاعت : ۹ انصاری مارکیٹ۔ نئی دلی ۱۱۰۰۰۲

مارچ ۱۹۷۸ء میں

اپنی اشاعت کے ۲۵ سال پورے کر رہا ہے

ایک سنجیدہ علمی ادبی رسالے کے لیے پوری چوتھائی صدی تک باقاعدگی سے جاری رہنا کم فخر کی بات نہیں، بالخصوص موجودہ ماحول میں جب اُردو زبان خود اپنے وطن میں بے وطن ہو کر رہ گئی ہے۔

اس موقع پر ہم نے تحریک کا سلور جبلی نمبر شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے ـــــ **تحریک** کے خاص نمبر جب جب شائع ہوئے ہیں ان کی دھوم مچ گئی ہے، ہماری کوشش ہوگی کہ سلور جبلی نمبر سابقہ تمام نمبروں پر سبقت لے جائے۔

ہمارا منصوبہ یہ ہے کہ اس نمبر میں اُردو زبان و ادب کے پچھلے ۲۵ سال کے بھرپور جائزے کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی دوسری زبانوں کے پچھلے ۲۵ سال کے شعر و ادب کا تعارف بھی پیش کیا جائے اور ان زبانوں کی منتخب تخلیقات کے تراجم بھی۔

ہندوستان میں اُردو زبان کے مستقبل پر ایک مذاکرے کی شمولیت بھی زیرِ غور ہے

اس ضخیم و عظیم نمبر کی تیاریوں میں جو ایک بے مثال اَدبی تحفہ ہوگا، ہمارا ہاتھ بٹائیے ـــــ اس کے لیے اشتہارات کی فراہمی میں ہماری مدد کیجیے اور اسے رعایتی داموں پر حاصل کرنے کے لیے تحریک کی سالانہ خریداری قبول کیجیے۔

ہم اپنے قلمکار دوستوں سے بطورِ خاص تعاون کی درخواست کرتے ہیں ہم ہمیشہ کی طرح آپ کی مخلصانہ مدد کے منتظر ہیں۔

گوپال متل | اُردو گھر کا افتتاح ـــ تصویر کے دو رُخ

پہلا رُخ

فارسی کے شاعروں کی طرح اُردو کے شاعروں کا شیوہ بھی خاکساری تھا، تمرّد نہیں۔ سودا فرماتے ہیں :

سودا قمارِ عشق میں خسرو سے کوہکن
بازی اگرچہ لے نہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز
اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

تمرّد کا رویّہ سب سے پہلے ترقی پسند شاعروں نے اختیار کیا لیکن ان کے دعاوی بھی اس سے زیادہ نہیں تھے کہ انھوں نے سر سے کفن باندھ رکھا ہے یا وہ سرِ مقتل کھڑے ہیں۔ بڑھ کر ہاتھ پنڈت آنند نرائن مُلّا نے مارا۔ انھوں نے اپنے مقتول ہونے کا بھی اعلان کر دیا۔ "جوئے شیر" کے صفحہ ۱۳۳ پر انھوں نے صرف قتل ہونے کے عزم کا ذکر کیا ہے "مٹتی ہوئی اُردو کے نام" کے عنوان سے فرماتے ہیں :

اک موت کا جشن بھی منا لیں تو چلیں
پھر پونچھ کے اشک مسکرا لیں تو چلیں
آ تجھ کو گلے لگا کے مٹتی اُردو
اک آخری گیت اور گا لیں تو چلیں

لیکن اگلے صفحے پر انھوں نے اپنے مقتول ہونے کا بھی اعلان کر دیا۔ "آئندہ تاریخ کا ایک صفحہ" کے عنوان سے فرماتے ہیں :

۱۹۴۹
یہ سانحہ سالِ چہل و نہ میں ہوا
ہندی کی چھری تھی اور اُردو کا گلا
اُردو کے رفیقوں میں جو مقتول ہوئے
مُلّا نامی سُنا ہے شاعر بھی تھا

دوسری رُباعی کو پڑھ کر ہم اس قدر مغالطے میں پڑ گئے تھے کہ کافی عرصے تک مُلّا صاحب کو آں جہانی سمجھتے رہے لیکن پھر معلوم ہوا کہ مُلّا صاحب بقیدِ حیات ہیں۔ انھوں نے قتل ہونے کا عزم ترک کر دیا ہے اور استخوان فروشی میں مصروف ہیں۔

ابتدا انھوں نے ایک آزاد امیدوار کی حیثیت سے پارلیمنٹ کا انتخاب لڑ کر کی جس میں وہ کامیاب ہوئے۔ کہتے ہیں کہ ان کی اس کامیابی میں اُردو والوں کی حمایت کو کافی دخل تھا۔ عام طور پر آزاد امیدوار کی حیثیت سے انتخاب لڑنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آپ کا موقف حکمراں پارٹی سے مختلف ہے اور آپ پارلیمنٹ میں اسی موقف کی تائید کے لیے جا رہے ہیں لیکن مُلّا صاحب نے کامیاب ہونے کے فوراً بعد حکمراں پارٹی سے ساز باز شروع کر دی۔ اس ساز باز کی بدولت وہ اردو اکاڈمی یوپی اور انجمن ترقی اردو کے صدر بھی بنے اور پھر کانگریس کے ٹکٹ پر راجیہ سبھا کے ممبر بھی۔

حکمراں پارٹی کا قرب حاصل کرنے کے بعد اُردو کے بارے میں مُلّا صاحب کا رویّہ کیا رہا، اس کا اندازہ ان واقعات سے لگایا جا سکتا ہے :

(الف) شری کملاپتی ترپاٹھی نے جب وہ یوپی کے وزیرِ اعلیٰ تھے اُتر پردیش اُردو اکاڈمی کے اجلاس میں برملا طور پر کہا کہ اُردو کو ثانوی سرکاری زبان بنانے کا

سوال پیدا نہیں ہوتا۔ مُلّا صاحب نے جو اسکا ڈمی کے چیرمین تھے اور اس اجلاس میں شریک تھے، نہ صرف اس پر احتجاج نہیں کیا بلکہ یہ کہہ کر اس کی بالواسطہ تائید بھی کی کہ جو لوگ اُردو کو ہندی کے مقابلے میں کھڑا کرنا چاہتے ہیں وہ اُردو کے دشمن ہیں۔

(ب) لکھنؤ میں اُردو اور ہندی کے ترقی پسند ادیبوں کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا اس میں مُلّا صاحب بھی شریک تھے۔ اس مُعاہدے میں یہ تسلیم کیا گیا تھا کہ ہندی واحد سرکاری زبان ہے۔ بعد میں جب اردو والوں نے مظاہرہ کیا تو یہ لوگ ہمت ہار بیٹھے اور آئیں بائیں شائیں کرنے لگے۔ لیکن جیسا کہ ڈاکٹر دھرم دیر بھارتی نے بعد میں "دھرم یگ" میں لکھا۔ معاہدے میں ہندی کو واحد سرکاری زبان ہی مانا گیا تھا۔

(ج) ایمرجنسی کے نفاذ سے قبل جب یو۔پی میں انتخابات ہونے والے تھے، انجمن ترقی اُردو (ہند) نے دلی میں اردو کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ کیا۔ مجلس استقبالیہ کی ممبرسازی کے بعد عہدیدوں کا انتخاب بھی ہوا جس میں راقم نائب صدر چُنا گیا۔ جب کانفرنس کے انتظامات پر بحث ہو رہی تھی تو مُلّا صاحب نے تجویز پیش کی کہ کانفرنس کا افتتاح اس وقت کی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی سے کرایا جائے۔ میں نے اس تجویز کی اس بنا پر مخالفت کی کہ اردو والوں کو جو شکایتیں ہیں وہ حکومت سے ہیں اس لیے اس کی وزیر اعظم کو کانفرنس کے افتتاح کی دعوت دینا سپر اندازی کے مترادف ہوگا۔ یاد پڑتا ہے کہ اس کے بعد بحث ابحثی ہوئی تھی جس کے دوران مجھ سے پوچھا گیا تھا کہ میں کیا کروں گا۔ میں نے جواب دیا تھا، صرف اتنا کروں گا کہ مجلس استقبالیہ کی نائب صدارت سے مستعفی ہو کر، اس وقت جب مسز گاندھی کانفرنس کا افتتاح کر رہی ہوں گی، پنڈال کے باہر مظاہرہ کرا دوں گا۔ اس پر ڈاکٹر قمر رئیس نے اُٹھ کر کہا تھا کہ کم از کم وہ میرا ساتھ ضرور دیں گے۔ آل احمد سرور صاحب نے یہ کہہ کر بحث کو تلخی سے بچا لیا کہ مُلّا صاحب آپ اور میں تو انجمن کے عہدیدار ہیں، کانفرنس کا انتظام تو مجلس استقبالیہ ہی کو کرنا ہے۔ اس کے بعد کچھ دن تعطل کی کیفیت رہی، پھر مُلّا صاحب کی کوٹھی پر چار پانچ لوگوں کی ایک میٹنگ ہوئی جس میں میں بھی شامل تھا۔ میرے رویّے کے بارے میں پوچھا گیا تو میں نے صاف کہہ دیا کہ اس وقت تک انجمن کا موقف یہ رہا ہے کہ جن صوبوں میں اردو بولنے والوں کی معقول تعداد موجود ہے، وہاں اسے ثانوی سرکاری زبان کا درجہ دیا جانا چاہیے۔ اگر انجمن اپنے اس موقف پر قائم رہے تو میں کانفرنس کے انعقاد کے سلسلے میں پوری سرگرمی سے حصّہ لے سکتا ہوں۔ اس پر آل احمد سرور صاحب نے کہا کہ جب تک وہ جنرل سیکرٹری ہیں انجمن اپنے اس موقف سے دستبردار نہیں ہوگی۔ اس کے تیسرے دن آل احمد سرور صاحب انجمن کے سیکرٹری نہیں رہے اور مجوزہ کانفرنس بھی نہیں ہوئی کیونکہ یو۔پی کے انتخابات ختم ہو چکے تھے۔ یہ اس کا کھُلا ثبوت ہے کہ کانفرنس کے انعقاد میں اُردو کے مفاد کو نہیں، سیاسی مصلحت کو دخل تھا۔

(د) ایمرجنسی کے دوران اُردو کے ایڈیٹروں کی کُل ہند جماعت کی اکزکٹو کمیٹی کا اجلاس ہوا جس میں مدعومہ کی حیثیت سے مجھے بھی شرکت کی دعوت دی گئی۔ تنظیم امور پر غور و خوض کے بعد اراکین کو مسز گاندھی سے ملاقات کرنا تھی اور اس کے بعد گیانی ذیل سنگھ کی دعوت پر سیر و تفریح کے لیے پنجاب جانا تھا۔ میں اکزکٹو کمیٹی کے جلسے میں تو شریک رہا لیکن مصروفیت کی بنا پر نہ تو مسز گاندھی سے ملاقات کے لیے جا سکا نہ پنجاب میں سیر و تفریح کے لیے۔ بعد میں پتہ چلا کہ مسز گاندھی سے ملاقات میں وفد نے اردو کو ثانوی سرکاری زبان کا درجہ دینے کا سوال اٹھایا تھا لیکن مسز گاندھی نے دو ٹوک لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ یہ مطالبہ اس لیے نہیں مانا جا سکتا کہ اس سے اکثریت ناراض ہو جائے گی۔ مُلّا صاحب اس سے

بے خبر نہ ہوں گے لیکن ان کا کوئی احتجاجی بیان نظر سے نہیں گزرا۔

خدمت اُردو کے سلسلے میں بھی انجمن ترقیِ اُردو (ہند) کی سرگرمیاں کچھ زیادہ قابلِ ستائش نہیں۔ ان دنوں یہ زیادہ تر ایسی کتابیں شائع کر رہی ہے، جنھیں عام ناشر بھی شائع کر سکتے ہیں۔ اگر انجمن ترقیِ اردو کی سرگرمیوں کا غالب اکاڈمی کی سرگرمیوں سے موازنہ کیا جائے تو انجمن ترقیِ اُردو بہت ہی حقیر ٹھہرے گی۔

اپنی مندرجہ بالا کارروائیوں کے پیشِ نظر ملا صاحب کو چاہیے تھا کہ جس طرح وہ اُردو اکاڈمی کی صدارت سے مستعفی ہوئے تھے، اسی طرح انجمن ترقیِ اُردو کی صدارت سے بھی مستعفی ہو جاتے لیکن اُردو کی قسمت میں لکھا ہوا ہے کہ اردو کا مقدمہ غلط وکیل ہی پیش کریں۔ اُردو گھر کے افتتاح کے موقع پر یہی ہوا۔

دوسرا رُخ

اوپر ہم نے برملا طور پر تسلیم کیا ہے کہ جو لوگ اُردو کے وکیل بن کر سامنے آتے ہیں وہ اس منصب کے حقدار نہیں ہوتے اور ان کے پیشِ نظر اکثر و بیشتر اُردو کے مفادات کی بجائے کچھ اور مصلحتیں ہوتی ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اُردو کا مقدمہ ہی جھوٹا ہے۔ پچھلے دنوں دلی کے چند اُردو صحافیوں کی طرف سے بہار کے وزیر جناب غلام سرور کو عشائیہ دیا گیا۔ بہت ممکن تھا کہ یہ تقریب بھی وزیر موصوف کو ہار پہنانے اور اُردو زبان کے حسن و لطافت کے ذکر پر ختم ہو جاتی لیکن مجھے چپ رہنا نہیں آتا اس لیے میں کچھ باتیں کہنے سے باز نہ رہ سکا۔ اپنی تقریر میں میں نے کہا تھا کہ اُردو کے سلسلے میں جنتا پارٹی نے جو موقف اختیار کیا ہے وہ بنیادی طور پر وہی ہے جو کانگریس کا موقف تھا۔ اتنا فرق ضرور نظر آتا ہے کہ کانگریسی اُردو والوں کے مطالبوں کا جواب ڈپلومیسی کی زبان میں دیا کرتے تھے اور یہ احتیاط برتتے تھے کہ ان کی دل شکنی نہ ہو لیکن جنتا پارٹی کے ذمہ دار وزرا نے اُردو کے مسئلے پر جو بیانات دیے ہیں ان میں یہ احتیاط بھی ملحوظ نہیں رکھی گئی ہے، اس سے اُردو والوں کی دل آزاری ہوئی ہے اور ان کی مایوسی بڑھی ہے۔

افسوس ہے کہ اُردو گھر کا افتتاح کرتے ہوئے شری مرارجی ڈیسائی نے جو تقریر کی اس کا لہجہ بھی دل آزارانہ ہی تھا۔ معلوم نہیں کہ اس موقع پر انھوں نے مسلم لیگ اور مطالبۂ پاکستان کے ساتھ اُردو کے مسئلے کو گڈمڈ کرنا کیوں ضروری سمجھا؟ چند برس ہوئے مجھے جرمنی جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ میرے ساتھ ایک اور ہندوستانی دوست بھی تھے۔ وہ موقع بے موقع ہٹلر کا نام لے بیٹھتے تھے اور مخاطبین کا جواب اکثر یہ ہوتا تھا کہ بھائی ہٹلر کے عہد میں تو ہم پیدا بھی نہیں ہوئے تھے اس لیے اس کے اعمال کے لیے ہم کیسے ذمہ دار ہو سکتے ہیں۔ ہندوستان میں بھی یہی صورتِ حال ہے۔ تقسیم کے بعد اردو بولنے والوں کی ایک نئی نسل وجود میں آ چکی ہے۔ ان کا مطالبۂ پاکستان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ پھر مسلم لیگ کی تحریک کے سلسلے میں بھی کچھ باتیں غور طلب ہیں۔ اگر ایمرجنسی کے ماحول کو ذہن میں رکھا جائے تو ان باتوں کو سمجھنے میں آسانی ہوگی ——— کچھ لوگ ایک طے شدہ سکیم کے تحت مطالبۂ پاکستان کی حمایت کر رہے تھے، بالکل اسی طرح جس طرح غیر معمولی اقتدار کا خواہاں ایک گروہ ایمرجنسی کی حمایت کر رہا تھا۔ کچھ لوگ صرف دیکھا دیکھی مسلم لیگ کی تحریک میں شامل ہو گئے تھے اور کچھ بادلِ ناخواستہ، اس خوف کی بنا پر کہ اڑوس پڑوس میں ان کی رسوائی نہ ہو۔ پھر ایک اور بات بھی اہم ہے بلکہ مندرجہ بالا تمام باتوں سے اہم تر۔ اُردو والوں کا ایک طبقہ نتائج سے بے پروا ہو کر مسلم لیگ کی مخالفت اور کانگریس کی حمایت کر رہا تھا اور ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ مسلمانوں کے حقیقی نمائندے یہی ہیں۔ اب تمام

مسلمانوں کو مطالبۂ پاکستان کا ذمہ دار ٹھہرا کر اور انھیں مستحق پاداش سمجھ کر، کہیں ہم ان لوگوں کے ساتھ جن میں مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسین احمد مدنی جیسے اکابر شامل تھے، بے انصافی تو نہیں کر رہے ؟

شری مرار جی ڈیسائی کا یہ شکوہ بھی قابلِ جواز نہیں کہ اُردو کے ساتھ جو بے انصافیاں سابق حکومت کے دور میں ہوئی ہیں، ان کا ذکر ان کے سامنے کیوں کیا جائے ؟ شری ڈیسائی کسی انقلاب کے ذریعے برسرِ اقتدار نہیں آئے بلکہ رائے شماری کے ذریعے برسرِ اقتدار آئے ہیں اور ان کی کامیابی میں اُردو والوں کا حصہ ملک کے باقی لوگوں سے کم نہیں۔ جمہوری نظام میں برسرِ اقتدار پارٹیاں بدلتی ہیں لیکن حکومت کا تسلسل قائم رہتا ہے۔ گزشتہ دور میں اردو کے ساتھ جو انصافیاں ہوئی ہیں، ان کے ازالے کے لیے اُردو والے ان کے سوا اور کس کا دروازہ کھٹکھٹائیں ؟

شری مرار جی ڈیسائی نے آسان اور مشکل اُردو کی بحث بھی چھیڑی۔ کون شخص مشکل اردو بولتا ہے اور کون آسان، اس کا فیصلہ کرنا سہل نہیں۔ بہر حال یہ یقینی ہے کہ آسان اور مشکل اُردو کا فرقہ پرستی یا قوم پرستی سے کوئی تعلق نہیں۔ مشکل ترین اُردو مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے تھے جن کا نام ہم قوم پرستی کے ستون کی حیثیت سے لیتے ہیں اور آسان اردو کے حامی مولوی عبدالحق تھے جنھیں بجا یا بیجا طور پر تقسیم کا حامی خیال کیا جاتا ہے۔

رسم الخط کے بارے میں خواہ کوئی کچھ بھی کہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہ اُردو زبان کا جزو لاینفک ہے اور اس کے بغیر یہ زبان زندہ نہیں رہ سکتی۔ گاندھی جی نے بھی اُردو اور ہندی دونوں زبانوں کے لیے دونوں رسم الخط استعمال کرنے کی بات کی تھی۔

مسٹر ڈیسائی اگر ٹھنڈے دل سے غور کریں تو محسوس کریں گے کہ کانگریسی حکومت نے، جس کے ایک مدت تک وہ خود بھی رکن رہے ہیں، اُردو والوں کے ساتھ جو وعدے کیے تھے — وہ ایفا نہیں کیے۔ اُردو کے ایک دو حامی اگر کوتاہی بھی کریں تو بھی ان وعدوں کو ایفا کرنا ضروری ہے۔ اس سے اُردو والوں کی تالیفِ قلب تو ہو گی ہی، خود شری مرار جی ڈیسائی اور ان کے وزیر رفقا کی نیک نامی میں بھی اضافہ ہو گا۔

ڈاکٹر فضل امام کی چند کتابیں

بھوجپوری ادب کا تعارف : اُردو زبان میں اس موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے جو بھوجپوری زبان و ادب کا مکمل تعارف کراتی ہے۔ قیمت : چار روپے۔

امیر اللہ تسلیم، حیات اور شاعری : یہ مقالہ ہے جس پر مصنف کو پی ایچ ڈی کی ڈگری دی گئی۔ قیمت : بیس روپے

نغمۂ سلسلے یا گوہر انتخاب : — امیر اللہ تسلیم کی یہ مثنوی نایاب تھی۔ ڈاکٹر فضل امام نے اس کا ایک قلمی نسخہ دریافت کیا اور اب اسے اپنے مبسوط مقدمے کے ساتھ شائع کر دیا ہے۔ قیمت : سات روپے۔

افکار و نظریات : تنقیدی اور تحقیقی مضامین کا قابلِ قدر مجموعہ۔ قیمت : ۱۲ روپے

نازش بک سنٹر کی پیش کش

گوپال متل

ایک مطالعہ

محمد عبدالحکیم کا تحقیقی اور تنقیدی مقالہ جو عثمانیہ یونیورسٹی کے ایم اے سالِ آخر کے لیے ڈاکٹر غلام عمر خاں کے زیرِ نگرانی قلمبند کیا گیا۔ گوپال متل کی صحافتی زندگی اور ان کے ادبی اور شعری کارناموں کا بھرپور جائزہ۔ آخر میں گوپال متل کی نثری اور شعری نگارشات کا انتخاب بھی شامل ہے۔ قیمت : پندرہ روپے

نیشنل اکاڈمی سے طلب کریں

جہاں عید منانا بھی سماج دشمن سرگرمی ہے

گوپال متل

کیا آپ کسی ایسے ملک سے واقف ہیں جہاں عید الضحیٰ کی تقریب کو سماج دشمن سرگرمی سمجھا جاتا ہو؟ جی ہاں! ایسا ملک موجود ہے، وہ ملک سوویٹ یونین ہے جسے ہندستانی کیمونسٹ جملہ اوصاف کا مجموعہ قرار دیتے ہیں عید الضحیٰ کو قربانی کی تقریب کا نام دیتے ہوئے ازبکستان کا کمیونسٹ اخبار "پراودا و وسٹوکا" لکھتا ہے: "یہ بہت ضروری ہے کہ ہم سوویٹ عوام سرمایہ داری کے جملہ باقیات سے نجات حاصل کرلیں۔ ان باقیات میں مذہب بالخصوص اسلام شامل ہے جو اپنی تقریبات اور دیگر رسوم کی وجہ سے عوام کے لیے مکمل طور پر ضرر رساں ہے۔"

اسلام سے عداوت مارکسی نظریہ کا جزو لاینفک ہے۔ غیر کیمونسٹ مسلم ممالک کو خوش کرنے کے لیے بسا اوقات روسی پروپیگنڈسٹ خوشگوار باتیں کہہ دیتے ہیں لیکن ان تحریروں میں بھی اسلام سے بنیادی دشمنی چھپائے نہیں چھپتی۔ پروفیسر کلیمووچ نے "اسلام" کے نام سے ۲۸۷ صفحات کی کتاب لکھی ہے جس کا مقصد بظاہر مسلم ممالک کو خوش کرنا ہے۔ اس کتاب میں وہ "اسلام کی ابتدا اور اس کی ترقیات" کا جائزہ لیتا ہے اور "اسلام کو جدید دور کے سماجی تقاضوں کے مطابق بنانے کی کوششوں" کا ذکر بھی کرتا ہے لیکن کتاب کا اختتام اس دوٹوک لہجے میں ہوتا ہے:

"اسلام بھی باقی مذاہب کی طرح سائنس دشمن نظریہ ہے۔ اس کا عوام سے کوئی خاص تعلق نہیں۔ یہ انسانی ترقی، انسان دوستی اور مارکسزم اور کیمونزم کے بلند نظریاتی اخلاقی اصولوں کے برعکس ہے۔ نوع بشر کی حقیقی مسرت کے لیے یہ ضروری ہے کہ مذہب کو جو ایک توہماتی مسرت کا مظہر ہے، ختم کیا جائے۔"

سوویٹ یونین غیر کیمونسٹ مسلم ممالک کو پھانسنے کی متواتر کوششیں کرتا رہتا ہے لیکن اپنی حدود میں مسلمانوں کے ساتھ سوویٹ یونین کا سلوک ایسا ہے کہ اس قسم کی کوششیں ہمیشہ ناکام رہتی ہیں۔

گزشتہ برس جب سپریم سوویٹ کا ایک وفد ترکی گیا تو اس ملک کے کریمیائی قومی مرکز نے وفد سے اپیل کی کہ کریمیائی تاتاروں کو از سر نو ان کی جنم بھومی پر آباد ہونے کی اجازت دی جائے۔ ستم ظریفی دیکھیے کہ جب سپریم سوویٹ کا یہ وفد ترکی کا دورہ کر رہا تھا تو سوویٹ یونین میں کریمیائی مسلم تاتاروں کے ایک ممتاز لیڈر مصطفےٰ ڈھمیلیو کو سوویٹ روس کو بدنام کرنے کے الزام میں ڈھائی برس قید کی سزا دی گئی جو اسے مشقت کیمپ میں کاٹنی تھی۔

ڈھمیلیو کو، جو ایک راسخ العقیدہ مسلمان ہے، سوویٹ روس کی خفیہ پولیس ۱۹۶۶ء سے متواتر پریشان کر رہی ہے جون ۱۹۷۴ء میں اسے بارہ مہینے کی قید کی سزا دی گئی اور جب اس کی قید کی میعاد ختم ہونے میں دو دن باقی تھے تو اس پر نیا مقدمہ قائم کر دیا گیا۔ سوویٹ یونین میں چار کروڑ پچاس لاکھ مسلمان آباد ہیں مسلم آبادی کے لحاظ سے روس دنیا میں چوتھے نمبر پر ہے مسلم ممالک بالخصوص مشرق وسطےٰ کے ممالک کے ساتھ رابطے بڑھانے کی بھی سوویٹ یونین سرگرم کوششیں کرتا رہتا ہے لیکن خود اپنے ہاں کی مسلم قومیتوں کے ساتھ وہ کسی قسم کی رواداری برتنے کو تیار نہیں۔ ان

قومیتوں پر اس کے جبر کا سلسلہ غیر مختتم ہے اور اس جبر کا مقصد یہ ہے کہ وہاں اسلامی روایات کو مکمل طور پر مٹا دیا جائے۔ لیکن ان باتوں کے باوجود مسلمان اپنے دینی شعائر سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں۔ روس کے مشہور "تحت الارض جریدے" "حالیہ واقعات کا کرانیکل" کی ۳۱ دسمبر ۱۹۷۵ء کی اشاعت میں درج ہے کہ کرپینیرا کے خطے میں حکام نے دو مسجدوں کو بند کر دیا تھا۔ یہ مسجدیں ۱۹۷۰ء سے بند ہیں لیکن جمعہ کے دن واحد باقیماندہ مسجد میں ہزاروں لوگ نماز کے لیے پہنچ جاتے ہیں حالانکہ ان سب کے لیے وہاں نماز پڑھنے کی جگہ نہیں ہوتی۔

سوویٹ روس اسلام اور مارکسزم یا اسلام اور سائنس میں ہم آہنگی کی تلاش کی کوششوں کا بھی مخالف ہے۔ خالد محی الدین مصر کا مشہور لیباری ہے۔ ۱۹۵۲ء میں شاہ فاروق کی حکومت کا تختہ اُلٹنے میں اُس نے نمایاں حصہ لیا تھا۔ اپنے ہفت روزہ اخبار "روضتہ الیوسف" کی ۱۹ فروری ۱۹۷۵ء کی اشاعت میں اس نے لکھا کہ آدمی خدا پر بھی ایمان رکھ سکتا ہے اور سائنس کا بھی قائل ہو سکتا ہے۔ اس نے لکھا تھا کہ مذہب کی دانشمندانہ انداز میں تشریح کی جائے تو یہ بات سامنے آئے گی کہ مذہبی آدمی اور ایک مارکسی کا موقف بنیادی طور پر ایک ہی ہے۔

لیکن ۶ نومبر ۱۹۷۵ء کے ایک سوویٹ جریدے "سوویٹ داغستان" نے واضح طور پر لکھا کہ یہ ثابت کرنے کی جتنی بھی کوششیں ہو رہی ہیں کہ مذہبی عقیدے اور سائنس میں ہم آہنگی موجود ہے اور دونوں ایک ساتھ ترقی کر سکتے ہیں، وہ صرف اس بات کا ثبوت ہیں کہ مذہبی نظریات کی بنیادیں متزلزل ہو رہی ہیں اور مذہب کا بحران نمایاں سے نمایاں تر ہوتا جا رہا ہے۔

لارج سوویٹ انسائیکلوپیڈیا کے تیسرے ایڈیشن میں جو ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا، درج ہے کہ سوویٹ یونین اور دوسرے سوشلسٹ ممالک میں مذہب کی سماجی جڑیں کھوکھلی کر دی گئی ہیں۔ باقی مذاہب کی طرح اسلام بھی ماضی کی یادگار بن کر رہ گیا ہے۔

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ دراصل ایسا ہوا نہیں ورنہ مذہب کے خلاف جہاد کو تیز سے تیز تر رکھنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ "کمیونسٹ تاجکستانیا" تاجکستان کا روسی زبان کا اہم ترین روزنامہ ہے۔ اس کی ۴ جنوری ۱۹۷۶ء کی اشاعت میں درج ہے کہ ملحد سکالروں نے ۱۹۷۵ء میں قصبات اور دیہی اضلاع کے چار سو دورے کیے۔ ایک سو ستائیس کانفرنسیں کیں، ملحدانہ شاموں کا اہتمام کیا اور دو ہزار لیکچر دیے۔ سنٹرل ایشیا کی ری پبلکوں کے افسران اس کے باوجود اس کے شاکی ہیں کہ نتائج توقع کے مطابق نہیں۔ ۲۷ جنوری ۱۹۷۶ء کو تاجک پارٹی کانگرس میں پارٹی کے اول سیکرٹری رسولوف نے شکایت کی کہ سب پارٹی کمیٹیاں، انتظامی ادارے، ٹریڈ یونینیں اور نوجوان کمیونسٹ لیگیں ملحدانہ تعلیم میں سرگرم حصہ نہیں لیتیں اور نہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتی ہیں کہ مذہب سے عوام کی وابستگی کس حد تک ہے اور اس کے اسباب کیا ہیں؟ ترکمانیہ کی پارٹی کی کانگرس میں، جو ۲۳ جنوری کو ہوئی پارٹی کے اول سیکرٹری کاپوروف نے شکوہ کیا کہ پارٹی کے کچھ ممبر اور کمیونسٹ نوجوان لیگ کے ممبر بھی مذہبی تقریبوں میں حصہ لیتے ہیں۔

زبان اور قواعد

زبان کی ساخت، اس کے تشکیلی ضابطوں اور ارتقائی مرحلوں پر رشید حسن خاں کے عالمانہ مضامین۔ قیمت : ۱۷ روپے

نیشنل اکادمی سے طلب کریں

جنسِ برآمد

کرشن موہن

کالے ریچھ کے پتے کا رس
خواہش خیز ہے، تیز دواؤں میں پڑتا ہے
کیسی چیز فائدہ زا ہے
چین کا علمِ طب کہتا ہے
یہ رس پینے والا شخص جواں رہتا ہے
بھارت ورش سے برسوں اس کی برآمد چین کو ہوتی آئی
چیز ہماری غیروں کے انگوں میں رنگ سموتی آئی
ہر میداں میں
اپنے علم نے اپنا جھنڈا لہرایا ہے
کام رسیلا، چھیل چھبیلا
اپنے دیش کا شہزادہ تھا
اپنے دیش کا شہزادہ ہے۔
اپنی سرمستی کا حیلہ، شوخ وسیلہ
علمِ جنس کہاں پہنچا ہے
کالے ریچھ کے پتے کا رس
کیسی جنسِ شوق فزا ہے

۵۵

غزلیں

عروج زیدی

اک اجنبی تو غم سے تعارف کرا گیا
لیکن مقامِ شکر ہے غم راس آگیا

سطحِ رہِ حیات کو ہموار جان کر
دھوکا تو کھا چکا تھا میں ٹھوکر بھی کھا گیا

یا حسنِ بے نیاز کے لمحے پگھل گئے
یا عشق اعتبار کی منزل میں آگیا

چاروں طرف سے اہلِ تعاقب کے باوجود
آنا تھا مجھ کو آپ کے قدموں میں آگیا

حدِ سکوتِ شوق میں وہ بے خبر سا تھا
نظریں ملیں تو دل کا ہر اک راز پا گیا

محفل رہی ہے، گرمیٔ محفل رہی، مگر
کس دُھن میں ایک شخص یہاں سے چلا گیا

اب سیلِ برہمی میں وہ شورش نہیں رہی
دریا سمٹ کے اپنے کناروں میں آگیا

توفیق ہر بشر ہے علی قدرِ سعیِ شوق
وہ کیا اُٹھے جو سایۂ دیوار پا گیا

تپتی ہوئی زمین ترستی رہی، عروج!
بادل اُٹھا تو دامنِ ساحل پہ چھا گیا

○ گھر سیف الدین خاں، رامپور، یو۔پی

ندا فاضلی

دُنیا جسے کہتے ہیں بچّے کا کھلونا ہے
مل جائے تو مٹی ہے کھو جائے تو سونا ہے

اچھا سا کوئی موسم تنہا سا کوئی عالم
ہر وقت کا رونا تو بیکار کا رونا ہے

برسات کا بادل تو دیوانہ ہے کیا جانے
کس راہ سے بچنا ہے کس چھت کو بھگونا ہے

غم ہو کہ خوشی دونوں کچھ دور کے ساتھی ہیں
پھر رستہ ہی رستہ ہے ہنسنا ہے نہ رونا ہے

یہ وقت جو تیرا ہے یہ وقت جو میرا ہے
ہر گام پہ پہرہ ہے پھر بھی اسے کھونا ہے

آوارہ مزاجی نے پھیلا دیا آنگن کو
آکاش کی چادر ہے دھرتی کا بچھونا ہے

○ بی ۳۴/۵ گورنمنٹ کالونی باندرہ ایسٹ، بمبئی ۵۱

ممتاز راشد

درد کی حد سے گزرنا تو ابھی باقی ہے
ٹوٹ کر میرا بکھرنا تو ابھی باقی ہے

قُربِ احساس کی حد تک نہیں تہذیبِ وفا
جسم کو تیرے سنورنا تو ابھی باقی ہے

کیسے سن لوں تری آنکھوں کے سمندر کی پکار
مجھ کو شعلوں میں اُترنا تو ابھی باقی ہے

سامنے ہے مرے پیمانِ رفاقت کا مآل
کیا کہوں تیرا مُکرنا تو ابھی باقی ہے

پاس آکر مرا دکھ درد بٹانے والے
مجھ سے کترا کے گزرنا تو ابھی باقی ہے

چند شعروں میں کہاں ڈھلتی ہے احساس کی آگ
غم کا یہ رنگ نکھرنا تو ابھی باقی ہے

○ درگاہ اسٹریٹ، ماہم، بمبئی

نظمیں

کے ایس ۔ نثار احمد

حمید الماس

پیڑ

یہی ہے ناریل کا پیڑ
جس کو میں نے بویا تھا
مری آنکھوں نے جس کو
دن بہ دن بڑھتے ہوئے دیکھا
مگر سوچا نہ تھا
اس ناریل کے پیڑ کا سایہ
نکل کر میرے آنگن سے
کبھی رستے پہ پھیلے گا
کسی نے جب وہاں سائے میں
اپنی کار رکوائی
کہا میں نے
سنو
یہ میرا سایہ ہے
فضا میں قہقہہ گونجا
وہ مجھ سے کہہ رہا تھا
"تم یقیناً ناریل کے پیڑ کے مالک سہی لیکن
کبھی اس پیڑ کے سائے کے مالک ہو نہیں سکتے"
(کنڑا نظم)

نارائینے وامن تلکے / بدیع الزماں خاور

رقص

زندگی میں وہ کوئی رنگ بھر نہیں سکتے
ہیں بڑے ابھاگے، جو رقص کر نہیں سکتے
کر رہی ہے سورج کے گرد رقص، دھرتی بھی
ہے کہاں یہ ساکت گو لگ رہی ہے ساکت سی
رات کو فلک پر جو ماہتاب ابھرتا ہے
وہ بھی اپنی دھرتی کے گرد رقص کرتا ہے
رقص کر رہے ہیں سب یہ خلا کے سیارے
رقص کر رہے ہیں سب یہ نجوم، یہ تارے
رقص کر رہی ہیں، یہ ڈولتی لتائیں بھی
رقص کر رہی ہیں، یہ جھومتی ہوائیں بھی
مرغزار رقصاں ہیں، رقص کر رہے ہیں بن
یہ چرند، یہ طائر، کر رہے ہیں سب نرتن
تتلیاں ہوں بھونرے ہوں پھول ہوں کہ پتے ہوں
رقص کر رہے ہیں سب پیڑ ہوں کہ پودے ہوں
ندیاں بھی رقصاں ہیں، جوئبار بھی رقصاں
آتے ہیں نظر ہر سو آبشار بھی رقصاں
رقص کر رہا ہے یہ بیکراں سمندر بھی
دیکھ لے ذرا اس کے رقص کا یہ منظر بھی!
ہو وہ جوار یا بھاٹا، کب یہ فکر کرتا ہے؟
رقص روک کر اپنا یہ کہاں ٹھہرتا ہے؟
رقص اس کی عظمت ہے، رقص اس کی فطرت ہے
رقص اس کی قوت ہے، رقص اس کی طاقت ہے
رقص ہے عمل اس کا، رقص ہی ہے کام اس کا
رقص اس کا نغمہ ہے، رقص ہے پیام اس کا
یہ پیام سن کر آ، رقص اب کریں ہم بھی
اپنی زندگی میں آ، رنگ کچھ بھریں ہم بھی
آ جہاں کو بتلا دیں، رقص ہی محبت ہے
رقص ہی میں پوشیدہ زندگی کی راحت ہے
(مراٹھی نظم)

○ حمید الماس، معرفت لیبر کمشنر، ۴۹ بیلس روڈ، بنگلور ۵۲
○ بدیع الزماں خاور ۔ ڈ منمکر کوارٹرس منڈن گڑھ روڈ، دابولی ۱۲/۵۷۱۲/۱۴ (مہاراشٹر)

غزلیں

سید فضل المتین

اپنی حد سے، جب کبھی آگے بڑھے
اپنے ہی سائے سے آخر لڑ گئے

یاس اور امید کے ملبے تلے
خواہشوں کے جسم پیلے پڑ گئے

یہ بدلتے موسموں کے گرد فر
نقش میرے دل پہ گہرے جڑ گئے

چل پڑیں تو پھر کہیں رُکتے نہیں
اور ٹھہرے ہیں، کہیں تو اڑ گئے

دھوپ کی شدت کے مارے قافلے
جس، جگہ بھی چھاؤں دیکھی پڑ گئے

▲▲

حکیم منظور

تھی دشت کو جو آس بہت بے اساس تھی
بادل تمام آگ تھے دریا کو پیاس تھی

ہر شخص مطمئن تھا کسی کو پتہ نہ تھا
ڈھانپے ہوئے بدن کی صدا بے لباس تھی

مجھ سے نہ کہہ سکا یہ گئی رات کا سکوت
خوشبو تمام ہو کے ہوا کیوں اداس تھی

تھی بے نمک مری ہی زباں ورنہ سچ ہے یہ
نمکین پانیوں میں غضب کی مٹھاس تھی

منظر کھلا تھا کیسا دریچے کی پشت پر
آوارہ رنگ رنگ نگاہِ قیاس تھی

توڑا گیا نہ اس سے سیہ رات کا حصار
حالانکہ روشنی کی سند اس کے پاس تھی

منظورؔ ڈھونڈ لاؤں گا وہ دن کہاں سے جب
بے آئینہ بھی آنکھ مری روشناس تھی

▲▲

عبد اللہ کمال

بہت خود سر تھا، آخر، ہوا خود سے جدا میں
بہت سرکش تھا، آخر، ہوا چہرہ ہُوا میں

بکھرتے منظروں کے تناظر میں نہ میں
نظر کے سامنے تھا، نظر سے ماورا میں

مری سنجیدگی پر ہنسی میری اُڑا لو!
وہ دن تم پر نہ آئیں کہ جن کو جی گیا میں

کوئی اندھا تصادم مجھے کب توڑ گزرا
کہ سارا زہر اپنا مزے میں پی گیا میں

بس، اتنا جانتا ہوں گزر جاؤں گا سر سے
کہ شہرِ خفتگاں میں ہوں اک سنگِ صدا میں

ہمارا دردِ کتنا قریب اور مشترک تھا
غزل بانی کی پڑھ کر بہت رویا گیا میں

▲▲

○ شرقی دروازہ، درگاہ شریف، اجمیر
○ سری نگر، کشمیر
○ شام جی بلڈنگ، دوسری منزل R-28 نور باغ، بمبئی

کمار پاشی | ایک لمبی کہانی کا اقتباس

میں ہر مقدس کتاب کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جو کچھ کہوں گا سچ کہوں گا اور سچ کے سوا کچھ نہ کہوں گا :

میں جس ملک میں رہتا ہوں ۔ وہ سیکڑوں چھوٹے بڑے نگروں میں بٹا ہوا ہے ۔ اس ملک کی تاریخ بہت پرانی ہے ۔ اگر کوئی شخص اس کا ترتیب وار مطالعہ کرے تو اسے یہ جان کر حیرت ہوگی کہ ابتدا سے اب تک اس ملک نے کتنے تہذیبی لباس بدلے ہیں لیکن اس کا پرانا پن اب بھی برقرار ہے ۔ دراصل اس ملک کی دھرتی ہی کچھ ایسی ہے ، جس کی مٹی سے اس کا پرانا پن کوئی چھین نہیں سکتا ۔

میں جہاں رہتا ہوں وہ ایک چھوٹی سی بستی ہے ۔ جس کی آبادی کبھی پانچ ہزار رہی ہوگی لیکن اب اس کی نفیل کے اندر ۸۰ ہزار لوگ آباد ہیں ۔ جس رفتار سے اس کی آبادی بڑھ رہی ہے اس سے لگتا ہے کہ آئندہ ۲۰ برسوں میں ہم لوگ دو گنے ہو جائیں گے ۔ ممکن ہے تب یہ پرانی نفیل نہ رہے کوئی اور فصیل بنا دی جائے — ویسے ہم لوگوں کو اب کسی فصیل کی ضرورت بھی نہیں حملہ آور اب باہر سے نہیں آتے یہیں سے ، اسی دھرتی کی مٹی سے پیدا ہوتے ہیں ۔ قتل و خون کرتے ہیں اور پھر ایک دن اسی دھرتی میں دفن ہو جاتے ہیں ۔

دراصل یہ دو قبیلوں کا ملک ہے ۔ ایک قبیلے کے لوگ خود کو عکسی کہتے ہیں اور دوسرے نقشی ۔ ان کے خدا الگ الگ ہیں اور رسول بھی ۔ عبادت کے ڈھنگ الگ الگ ہیں اور عبادت گاہیں بھی ۔ عکسی قبیلے کے معبد الگ وضع قطع کے ہیں ۔ یک منزلہ اور خاصے لمبے چوڑے ۔ انھیں دیکھ کر آپ کائنات کی وسعت کا اندازہ کر سکتے ہیں ۔ یہاں پہونچ کر آپ کو یوں لگے گا جیسے آپ پھیلے ہوئے آسمان کے عین وسط میں کھڑے ہیں ۔ اس حالت میں انسان خود کو حقیر نہیں سمجھتا بلکہ خلا کا ایک حصّہ سمجھنے لگتا ہے ۔ اسے لگتا ہے جیسے کوئی بھی شے اس کے باہر نہیں بلکہ وہ خود ہر شے کے اندر ہے ۔

اس کے برعکس نقشی قبیلے کے معبد چھوٹے مگر بڑے اونچے ہیں ۔ ان کے کلس اتنی اونچائی پر ہیں کہ بعض اوقات بادلوں میں گھر جاتے ہیں اور دھندلے دھندلے دکھائی دیتے ہیں ۔ ان کی ہیبت ناک بلندیوں کو دیکھ کر ایک نامعلوم سا خوف طاری ہونے لگتا ہے ۔ ایک ایسا خوف جو تاریکیوں میں گھر جانے سے پیدا ہوتا ہے اور اُجالوں کی طرف بڑھنے کے لیے اُکساتا ہے ۔

دونوں قبیلوں کے لوگوں کو اپنے خدا ، اپنے رسول اپنی مقدس کتابیں اور اپنے معبد بڑے عزیز ہیں ۔ اپنی آمدنی کا پانچ فی صد حصہ وہ اپنے پرانے معبدوں کی مرمت اور نئے معبدوں کی تعمیر کے لیے انتظامیہ کے حوالے کر دیتے ہیں ۔ دونوں قبیلوں کے درمیان تمام چھوٹے بڑے نگروں میں مذہب کے نام پر اکثر فساد پھیلا کرتے ہیں ۔ دونوں طرف کے بہت سے لوگ کاٹ دیے جاتے ہیں ۔ ہفتوں تک بازار بند ہو جاتے ہیں ۔ ہفتوں تک خطرہ تلواریں اور خنجر لیے لوگوں کے گھروں پر منڈلاتا

رہتا ہے۔ پھر ایک دن ایسا بھی آتا ہے جب بازار کھل جاتے
ہیں اور لوگ اپنے اپنے گھروں سے باہر نکل کر معبدوں کا رُخ
کرتے ہیں اور جلد وہی طرف وہی پرانی چہل پہل دکھائی دینے
لگتی ہے۔

اب میں تقریباً پچاس برس کا ہوں۔ شادی نہیں
کی لہٰذا تنہا ہوں اور اس بستی کے ایک چھوٹے سے دو کمروں
والے مکان میں اپنے ساتھ رہتا ہوں۔ میری ماں عکسی قبیلے
کی تھی اور باپ نقشی قبیلے سے تعلق رکھتا تھا دونوں کی
عشقیہ شادی ہوئی تھی۔ سُنا ہے تب بستی بھر میں کہرام مچ
گیا تھا۔ بستی کے آس پاس کے علاقے بھی اس فساد سے
متاثر ہوئے تھے۔ پورے دس روز تک بازار بند رہے تھے
اور گلیوں اور بازاروں میں ہتھیار بند نائیک ننگی تلواریں یا
بلم لیے گشت کرتے رہے تھے۔ پھر حسبِ معمول سب کچھ معمول
پر آ گیا۔

میں ان دنوں اپنی ماں کے پیٹ میں تھا اور نو گرہوں
کے ملے جُلے اثرات کو جسم پر قبول کرنے میں ابھی دو چار ماہ
باقی تھے کہ میری ماں بیوہ ہو گئی۔ سُنا ہے عکسی قبیلے کے کسی
آدمی نے میرے باپ کا قتل کر دیا تھا۔ مرنے سے پہلے
اسے عکسی قبیلے کی مقدس کتاب پڑھ کر سُنائی گئی تھی پھر
اس کے ننگے جسم پر کپاس لپیٹ دی گئی تھی اور پھر اسے جلا دیا
گیا تھا۔ لطیفہ یہ بھی ہے کہ اس کی آخری رسومات عکسی قبیلے کے
رواج کے مطابق ادا کی گئی تھیں۔

آپ یقیناً حیران ہوں گے کہ ماں کی موت کے بعد
میری پرورش ایک سرکاری یتیم خانے میں ہوئی تھی نہ تو
نقشی قبیلے والوں نے مجھے اپنایا اور نہ ہی عکسی قبیلے والوں
نے۔

میں پاک پروردگار کو حاضر ناظر جان کر کہہ رہا ہوں
کہ میں دونوں قبیلوں کے خداؤں، ان کے رسول اور
ان کی مقدس کتابوں پر ایمان رکھتا ہوں۔ اگرچہ جب
سے میں نے ہوش سنبھالا ہے کسی معبد میں نہیں گیا لیکن جب
جب خود کو مضطرب پاتا ہوں یا دور اپنی آنکھوں کے سامنے
اپنے باپ کو جلتا ہوا دیکھتا ہوں تو کوئی سی مقدس کتاب
اٹھا کر پڑھنے لگتا ہوں اور جیسے کئی کئی دن وسیع صحراؤں کی
ٹھنڈی ریت پر ننگے پاؤں چلتا رہتا ہوں یہاں تک کہ چاندنی
کی ایک ننھی سی بوند بن جاتا ہوں اور اپنے دل کے اندھیروں
میں جگنو کی طرح جلنے بجھنے لگتا ہوں۔

میں نے ان دنوں اپنی عمر کے لحاظ سے گرہستھ آشرم میں
قدم رکھا تھا کہ ہمارے پڑوسی ملک سے ایک ہولناک
خبر آئی۔ جس کسی نے یہ خبر سُنی سر سے پاؤں تک لرز گیا۔ مجھے
اچھی طرح معلوم ہے کہ ہماری بستی کے معبدوں میں مسلسل
کئی دن تک عبادتیں جاری رہیں۔ لگتا تھا کوئی قہر نازل
ہونے والا ہے جس سے شاید ایک بھی شخص زندہ نہ بچے۔

ہمارے پڑوسی ملک میں ایک ہی قبیلہ آباد تھا۔ ان
کا خدا، رسول، مقدس کتاب اور ان کے عبادت گھر ہم سے
بالکل مختلف تھے اور روح فرسا خبر یہ تھی کہ انھوں نے اپنے
رسول کو قتل کر دیا تھا ــــ

ہمارے ملک کے ہر چھوٹے بڑے نگر میں اور ہر چھوٹی
بڑی بستی میں مسلسل کئی دن تک عبادتیں جاری رہیں۔ لگتا
تھا جلد ہی کوئی قہر نازل ہونے والا ہے جس سے شاید
ایک بھی شخص زندہ نہ بچے۔ لیکن جلد ہی سب کچھ معمول
پر آ گیا۔

انہی دنوں پڑوسی ملک سے ایک سیّاح ہماری بستی
میں آیا۔ میں نے اس سے ملاقات کی اور اس کے ملک کے
بارے میں بہت سی باتیں دریافت کیں۔ جب میں نے ان
کے رسول کے قتل کے سلسلے میں سوال کیا تو اس نے اس
موضوع پر میرے کسی بھی سوال کا جواب دینے سے انکار
کر دیا لیکن میرے مسلسل اصرار پر وہ ذرا سا کھلا اور اس
نے کہا: بھائی ــــ میں نے رسول کو قتل ہوتے
نہیں دیکھا اور نہ ہی کسی اور نے دیکھا لیکن سُنا یہی ہے
کہ اس کا قتل ہوا ہے، اور سرکاری خبر ایجنسی نے بھی اس

خبر کی تصدیق کی ہے۔

—— کیا آپ کو اس خبر پر یقین ہے؟ میں نے اس سے پوچھا تو اس نے آنکھیں میچ کر جواب دیا:

—— میری بات چھوڑیئے —— لیکن ہمارے ملک کا ہر آدمی یہی سمجھتا ہے

یہ کہتے ہوئے اس کی آواز میں بڑا درد تھا۔

—— لیکن اس سلسلہ میں آپ کا کیا خیال ہے؟

میری بات سن کر وہ چونکا۔ اس نے پلکیں اٹھائیں اور کہا: مجھے یقین نہیں آتا بھائی کہ کوئی رسول کا قتل بھی کر سکتا ہے —— میرے خیال میں وہ آج بھی زندہ ہے ——

—— زندہ ہے ——؟

—— ہاں —— زندہ ہے —— اسے یقیناً کہیں چھپا کر رکھا گیا ہے۔

سیاح کی باتیں بڑی دلچسپ تھیں۔ وہ ایک ہفتہ میرے گھر رہا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے تھے میں نے محسوس کیا کہ وہ اپنے مذہبی عقیدے میں بڑا راسخ ہے۔ میں جب جب اس سے ان کے رسول کے بارے میں گفتگو کرتا تھا وہ تب تب اداس ہو جاتا تھا —— اتنا گہرا اداس، جیسے وہ ایک خزاں زدہ سوکھا سڑا درخت ہے اور تیز ہوا میں پتہ پتہ خود سے الگ ہو رہا ہے —— بکھر رہا ہے۔ اسے اس طرح ٹوٹتے ہوئے، بکھرتے ہوئے دیکھ کر میں مضطرب ہو جاتا تھا۔

جب وہ اپنے وطن واپس جانے لگا تو اس نے اصرار کیا کہ میں اس کے ساتھ چلوں اور ان کے رسول کی تلاش میں اس کی مدد کروں۔ میں انکار نہ کر سکا اور اس کے ساتھ ہو لیا۔

اس کا ملک آبادی اور رقبے کے اعتبار سے ہمارے ملک سے بہت بڑا تھا اور اس کا گھر ملک کے بہت اندر ایک چھوٹے سے گاؤں میں تھا۔

چند مہینوں میں ہم پورا ملک گھوم لیے۔ اس دوران میں سیکڑوں لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ ہر جگہ ایک عجیب بات میں نے دیکھی —— عبادت گاہیں بند پڑی تھیں۔ اور لوگ جیسے ایک دوسرے سے سہمے ہوئے تھے۔ حاکمِ ملک کے اعلان کے مطابق ہر آدمی اپنے اعمال کا خود ذمہ دار تھا۔ عدالتوں اور جیلوں کے دروازے بند کر دیے گئے تھے۔ صرف ایک ہی عدالت تھی جو عدالتِ عالیہ کہلاتی تھی اور اس عدالت کے منصفِ اعظم کے فرائض کی انجام دہی کے لیے حاکمِ ملک نے خود کو مقرر کیا تھا۔ وہ نہ صرف حاکمِ ملک یا منصفِ اعظم ہی تھا بلکہ رسول کے قتل کے بعد اس نے ایک طرح سے رسول کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔ ہر نگر کے ہر چوراہے پر اس کا بت نصب تھا۔ زندگی کے مختلف مسائل پر اس نے اظہارِ خیال بھی کیا تھا اور اس کا تمام فلسفہ کتابی شکل میں شایع کر دیا گیا تھا جس کی تعلیم کا پورے ملک میں انتظام تھا۔

لوگ اپنے اعمال کے لیے اگر جواب دہ تھے تو صرف حاکمِ ملک کے سامنے تھے۔ اور حاکمِ ملک کی دہشت سب کے سروں پر تلوار بن کر لٹک رہی تھی۔ ایک عجیب قسم کا ہراس تھا جو پورے ماحول پر چھایا ہوا تھا۔ غیر سرکاری خبر ایجنسیوں کی اعداد شماری کے مطابق رسول کے قتل کے بعد زنا، قتل، ڈکیتی اور دوسرے جرائم میں دن بدن اضافہ ہو رہا تھا۔ بظاہر ایک ہیبتناک سکون چھایا ہوا تھا لیکن یہ سکون کسی بڑے زلزلے کا پیش خیمہ معلوم ہوتا تھا۔ میرا اداس دوست بار بار مجھ سے پوچھتا تھا: اب کیا ہوگا؟

میں جانتا تھا کہ کچھ نہیں ہوگا۔ دھیرے دھیرے لوگ ایک دوسرے کے خوفناک چہروں کے عادی ہو جائیں گے اور زندگی کرنے کی کوئی نئی صورت نکال ہی لیں گے۔ میں اسے ہمیشہ تسلی دیتا: تلاش جاری رکھو۔

سب ٹھیک ہو جائے گا۔

گھوم پھر کر ہم دونوں تھک گئے تھے۔ لگتا تھا اب کچھ نہیں ہو گا لیکن یہ بات غلط نہیں کہ ہم جہاں جہاں بھی گئے لوگوں نے ہماری باتیں بڑی توجہ سے سنیں۔ اندر ہی اندر پورے ملک میں ایک انتشار سا پھیل گیا تھا۔ بظاہر یہی لگتا تھا کہ کہیں نہ کہیں کچھ ٹوٹنے والا ہے —— لیکن کہاں —— اور کب —— اس کے آثار پیدا ہوتے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ آخر کار ایک صورت پیدا ہو ہی گئی۔ میں بہت خوش ہوا —— رات بھر اپنے اداس دوست سے گفتگو کرتا رہا اور جب صبح ہوئی تو ہم نے دیکھا پورے ملک میں چپکے چپکے یہ خبر سائیں سائیں کر رہی تھی کہ رسول کا قتل نہیں ہوا بلکہ وہ زندہ ہیں اور بڑی ملک کے ایک شخص نے ہمارے ملک کے ایک شخص کی مدد سے انھیں تلاش کر لیا ہے۔ اس دن ہم اس ملک کی راجدھانی میں تھے۔ ہم نے دیکھا نگر کے سارے عبادت گھر کھل گئے تھے انھیں صاف ستھرا کر کے سجا دیا گیا تھا اور لوگ نئے نئے زرق برق لباسوں میں عبادت گھروں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اسی شام عبادت گزاروں کے ایک جلسے کو خطاب کرتے ہوئے میں نے صاف لفظوں میں اعلان کیا کہ رسول زندہ ہیں مگر وہ آپ کے اعمال سے ناراض ہیں۔ جب آپ اپنی زندگی کے راستے درست اور ہموار بنالیں گے تو وہ آپ پر ضرور رحمت فرمائیں گے۔ اسی شام حاکم ملک نے ہم دونوں کو خلائی جاسوس قرار دے کر گرفتار کر لیا اور ہمیں ملک بدر کر دیا گیا۔

میں ہر مقدس کتاب کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جو کچھ کہوں گا سچ کہوں گا اور سچ کے سوا کچھ نہ کہوں گا اور سچ یہی ہے کہ اس ملک میں رسول کو واقعی قتل کیا گیا تھا۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ قتل سے پہلے آسمان نے اسے اٹھا لیا تھا اور اب ہم پھر اسے زمین پر اتار لائے تھے لہٰذا ——

۵۵

شبیر علی خاں شکیب

حکیم غلام نبی خاں غربت رامپوری

رامپور کے دورِ اول سے متعلق جن دو شعرا حکیم غلام نبی غربت شاگرد شاہ رؤف احمد رافت اور حافظ غلام نبی خاں قربت شاگرد مستقیم خاں وسعت کا ذکر متعدد تذکروں میں آیا ہے، ان کے بارے میں عام خیال یہ رہا ہے کہ یہ دو شاعر ہیں۔ اس کا سبب تذکروں میں درج بیانات کا ناکافی ہونا ہے۔ دراصل غربت اور قربت ایک ہی شاعر تھا۔ مصحفی اور امیر مینائی نے غلط فہمی کی بنا پر غربت کو قربت سمجھ لیا۔ اور اپنے تذکروں میں قربت تخلص لکھا ہے۔ لیکن عبدالغفور نساخ کے تذکرے میں غربت ملتا ہے۔ چنانچہ نساخ لکھتے ہیں:

"غربت ـــــ حکیم غلام نبی رامپوری شاگرد حضرت شاہ رؤف احمد رافت۔ صاحبِ دیوان گزرے ہیں۔"

(سخن شعراء / صفحہ ۳۵۰)

نمونۂ کلام میں یہ شعر بھی پیش کیا ہے ؎

پس از پیامِ اجل یار کا پیام آیا
سلامتی گئی اپنی تو جب سلام آیا

مصحفی قربت کے بارے میں فرماتے ہیں:

"قربت ـــ غلام نبی خاں قربت تخلص ولد عمران خاں، حافظ قرآن۔ عمو زادہ و شاگردِ مستقیم خاں وسعت است در رامپور مولد و مسکنِ اوست۔ عمرش بست و ہفت سال خواہد بود"

(ریاض الفصحا مرتبہ مولوی عبدالحق / صفحہ ۲۶۳)

نمونۂ کلام کے طور پر جو اشعار دیے ہیں، ان میں یہ دو مقطعے بھی ہیں جن میں قربت تخلص ہے ؎

بن لیے بوسۂ دیا دل نہ اسے قربت نے
کام میں اپنے یہ ہشیار نظر آتا ہے

قربت ہمیں کیا کام رہا روزِ جزا سے
ہم پر تو ابھی یہ شبِ ہجراں ہے قیامت

امیر مینائی نے بھی قربت تخلص کے تحت حال لکھا ہے۔ غالباً انتخابِ یادگار کی ترتیب کے وقت ریاض الفصحا ان کے پیشِ نظر رہا کیونکہ بعض الفاظ دونوں کے یہاں مشترک ہیں۔ لیکن عمر اور تاریخ وفات کا علم ان کو دیگر ذرائع سے ہوا۔ قربت کے ضمن میں لکھتے ہیں:

"قربت ـ حافظ غلام نبی خاں ولد عمران خاں، عم زادہ و شاگردِ مستقیم خاں متخلص بہ وسعت۔ چون برس کی عمر ہوئی۔ شعبان کی نویں تاریخ بارہ سو چھپن ہجری میں قضا کی۔"

(انتخابِ یادگار / صفحہ ۳۰۴)

امیر مینائی نے حسب ذیل دو شعر بطور نمونۂ کلام دیے ہیں۔ جو ریاض الفصحا میں نہیں ہیں ؎

جوشِ وحشت کا جو ہر بار نظر آتا ہے
کیا گریباں میں کوئی تار نظر آتا ہے

معرفت رامپور رضا لائبریری، رامپور۔ یوپی

دیکھا نہ کچھ اے گردش افلاک جہاں میں
آتے ہی عدم سے ہوئے ہم خاک جہاں میں

مذکورہ بالا بیانات کو دیکھنے سے غربت اور قربت کو کس طرح ایک ہی شخص سمجھا جا سکتا ہے۔ نساخ نے غربت کا نام غلام نبی لکھا ہے جس سے وہ کوئی غیر افغان شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ نیز ولدیت درج نہ ہونے سے قربت کی ولدیت عمران خاں سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ غربت کو صاحبِ دیوان دکھایا گیا ہے جبکہ امیر اور مصحفی نے قربت کے دیوان کا کوئی ذکر نہیں۔ ورنہ اگر وہ دیوان دیکھتے تو ضرور لکھتے اور دیئے ہوئے نمونۂ کلام کے علاوہ بہتر اشعار پیش کرتے۔ اس کے علاوہ حکیم اور حافظ کا فرق بھی ہے۔ ان سب اختلافات سے بڑھ کر اصل سوال دونوں کے اساتذہ کا بیّن فرق ہے۔ یعنی غربت شاہ رؤف احمد رافت کے شاگرد ہیں اور قربت کو مستقیم خاں وسعت کا شاگرد بتایا گیا ہے۔ اتفاق سے سخن شعرا اور قطعۂ منتخب میں غربت کا جو کلام نساخ نے پیش کیا ہے وہ انتخاب یادگار اور ریاض الفصحا میں دیے گئے نمونۂ کلام سے قطعی مختلف ہے اور کوئی وجہ مماثلت پیدا نہیں ہوتی۔ ان تمام امور کی بنا پر اگر اب تک انہیں دو مختلف شاعر سمجھا جاتا رہا تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

تاہم تعجب اس بات پر تھا کہ امیر مینائی نے اپنے تذکرے میں غربت جیسے اہم شاعر کو جو صاحبِ دیوان بھی تھا کس طرح نظر انداز کر دیا۔

رام پور کی رضا لائبریری میں "دیوانِ غربت" کا قلمی نسخہ موجود ہے بعض قرائن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ مصنف کا ذاتی نسخہ ہے۔ اس کے اندر سخن شعرا میں درج شعر ؎ پس از پیام اجل الخ موجود ہے نیز نساخ کے اس بیان کی تائید میں کہ غربت، رافت کے شاگرد تھے۔ داخلی شہادت کے طور پر یہ دو مقطعے بھی ملتے ہیں:

غربت اک اور پڑھ غزل ایسی
جس میں ہو طرزِ رافتِ استاد

غربت نہ رکھ نگاہ باندازِ دیگراں
تو دیکھ طرزِ رافتِ استاد کی طرف

راقم الحروف نے اس خیال سے کہیں انتخاب یادگار اور ریاض الفصحا میں مذکور قربت اور غربت ایک ہی شخص تو نہیں، قربت کے ذیل میں دیئے گئے اشعار کو اس دیوان میں تلاش کیا۔ اور یہ دیکھ کر اُچھل پڑا کہ یہ اشعار غربت کے دیوان میں موجود ہیں۔ اس دیوان میں امیر مینائی کا نقل کیا ہوا یہ شعر ؎ دیکھا نہ کچھ اے گردش الخ بجنسہ اور دوسرا شعر ؎ جوشِ وحشت کا جو ہر بار الخ خفیف لفظی ترمیم کے ساتھ اس طرح درج ہے:

اے جنوں کس لیے ہر بار نظر آتا ہے
پھر گریباں میں کوئی تار نظر آتا ہے

اور اسی غزل کا مقطع جو ریاض الفصحا میں قربت کے تخلص کے ساتھ ہے، غربت کے دیوان میں اصل تخلص کے ساتھ اس طرح ہے۔

بن لیے بوسہ دیا دل نہ اُسے غربت نے
کام میں اپنے یہ ہشیار نظر آتا ہے

مذکورہ بالا شواہد کی روشنی میں یہ طے ہو گیا کہ غربت ہی کو مصحفی اور امیر مینائی نے قربت تحریر کیا ہے۔ اس کے بعد نساخ اور مصحفی و امیر کے بیانات کی رو سے غربت اور قربت میں جن اختلافات کی اوپر نشاندہی کی جا چکی ہے تفہیم آسان ہو گئی البتہ غربت اور قربت کے تلمذ کا اختلاف غور طلب ہے۔ میری رائے میں غربت نے شاعری کی ابتدا کی تو اصلاح کے لیے اپنے چچا زاد بھائی مستقیم خاں وسعت (متوفی ۱۲۴۶ھ = ۱۸۳۰ء) شاگرد میر ضیاء الدین عبرت سے رجوع کیا یہ امر قرین قیاس اس لیے ہے کہ شاہ رؤف احمد رافت کی شاگردی بہت بعد میں اختیار کی ہوگی۔ کیونکہ غربت اور رافت دونوں ہم عمر تھے اور رافت کو درجۂ استادی پختگی عمر کے بعد ہی حاصل ہوا ہوگا۔

جیسا کہ امیر مینائی نے لکھا ہے غربت نے چوّن برس کی عمر میں ۹ شعبان ۱۲۵۶ھ کو وفات پائی۔ اس حساب

سے ان کا سال پیدائش ۱۲۰۲ھ مطابق ۱۷۸۷ء ثابت ہوتا ہے۔ ریاض الفصحا کا آغاز ترتیب ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء میں ہوا اور ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۰ء میں اختتام کو پہونچا۔۔۔۔۔۔ مصحفی نے قربت (یعنی غربت) کی عمر بر وقت اندراج حال ۲۷ سال بتائی ہے۔ یعنی ان کا ترجمہ تقریباً ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۳ء میں داخلِ تذکرہ ہوا۔ رافت کی عمر اس وقت تیس برس کی تھی اور انہیں درجۂ استادی حاصل نہیں ہوا تھا۔ اس لیے مصحفی نے غربت کو شاگرد رافت نہیں لکھا، وسعت کا شاگرد بتایا البتہ سخن شعرا میں جو بہت بعد کی تصنیف ہے رافت کو غربت کا استاد ظاہر کیا ہے۔

غربت نے ہوش سنبھالا تو قائم چاند پوری (متوفی ۱۲۰۸ھ/۱۷۹۳ء) کے انتقال کو ابھی چند برس ہی کا عرصہ گزرا تھا۔ اور ان کا رنگِ سخن رامپور کی ادبی فضا پر چھایا ہوا تھا اس زمانے میں قائم کے شاگرد مولوی قدرت اللہ شوق اور عنبر شاہ خاں آشفتہ وغیرہ کا دور دورہ تھا۔ قدرتی طور پر غربت نے ابتدا میں قائم کے رنگ کو اختیار کیا۔ ان کی زمینوں میں متعدد غزلیں کہیں، مصرعوں پر گرہیں لگائیں اور اپنے اس جذبۂ پسندیدگی کا کھل کر اعتراف بھی کیا۔ غربت کے اس دور کے کلام میں وہی سادگی، خلوص اور دردمندی ملتی ہے جو شعرائے متقدمین بالخصوص قائم کا مخصوص انداز ہے۔

دیوانِ غربت میں مندرجہ ذیل غزلیات قائم کی زمینوں میں ملتی ہیں:

غربت اس بزم میں پھر لو گیا قائم کی طرح
"اسی مونھ سے تجھے دعوے تھا شکیبائی کا"

ضبطِ عشق اپنا ہے غربت دیکھ قائم کی طرح
"جان تک گزری پہ ظاہر دل کی بیماری نہ کی"

ہستی پہ مت ہو نازاں غربت بقولِ قائم
"آئے نہیں عدم سے یا پھر عدم نہ ہوں گے"

رکھتے ہیں مشکِ لالہ دل داغدار ہم
کب ہے ہوائے باغ کہ خود ہیں بہار ہم

بعض غزلیں بہ تبدیلی قافیہ یا جزو ردیف کے معمولی فرق کے ساتھ کہی ہیں۔ مثلاً:

ع سب سے بہتر ترے سخن کی طرح
ع نہ آشیاں نہ کوئی مہرباں کیا باعث
ع ہے کہاں قیس اور کہاں فرہاد
ع اے جنوں آ کہ ذرا دل کے تئیں یاد کریں

غربت کے کلام میں قائم سے استفادۂ مضمون کی مثالیں بھی ملتی ہیں جیسے:

قائم ع اے ابر اپنے گریے میں جس وقت جوش تھا
جو قطرہ اشک کا تھا سو طوفاں بدوش تھا

غربت ع اے ابرِ شوق رونے کا تھا ہم کو جن دنوں
وہ کون سی جگہ تھی کہ دریا رواں نہ تھا

قائم ع نہ دل بھرا ہے نہ اب نم رہا ہے آنکھوں میں
کبھی جو روئے تھے خوں جم رہا ہے آنکھوں میں

غربت ع چھٹا ہے عشق تو مدت سے پُر ہے غم اب تک
میں رو چکا ہوں ولے چشم میں ہے نم اب تک

غربت نے قائم کی زمینوں میں محض غزلیں ہی نہیں کہیں بلکہ جیسا کہ ان کے دورِ اول کے کلام سے پتا چلتا ہے انھوں نے زبان و بیان میں بھی قائم کا بھرپور تتبع کیا ہے راقم الحروف کی رائے میں غربت سے بڑھ کر رامپوری شعرا میں کوئی اور شاعر قائم کے اتنا قریب نہیں پہونچ سکا، اس کا اندازہ ایک ہی زمین میں قائم اور غربت کی مندرجہ ذیل غزل کے مطالعے سے ہوگا قائم فرماتے ہیں:

پاس ہیں تجھ غم کے ہم اپنی بھی غم خواری نہ کی
جان تک گزری پہ ظاہر دل کی بیماری نہ کی

دستِ ردکس مشتری نے اس کو مارا ہے کہ یاں
جنس کی دل کی کسو نے پھر خریداری نہ کی

دم بدم اس رنجش بیجا کو کیا کہتے ہیں شوخ
دل دیا تجھ کو تو کچھ ہم نے گنہگاری نہ کی

عذر چاہا بعد خط کے ان نے ہر یک سے ولے
اک دل ناشاد کی میرے ہی دلداری نہ کی
دیکھیے بھٹکاؤ کیا قسمت میں ہیں قائم کہ یار
لاد ٹاٹا تڈا چل بسے اب تک ہیں تیاری نہ کی

غربت کے اشعار ملاحظہ ہوں :

لے کے دل تم نے ہی کیا ایک اپنی دلداری نہ کی
آہ مجھ غم دیدہ کی غم نے بھی غم خواری نہ کی
تجھ سے ملتے ہی گئے مل خاک میں جوں نقش پا
آہ تیرے عشق نے ہم پر سزا داری نہ کی
کیوں خفا ہوتا ہے شیخ اس بت کو دیکھوں ہوں جو میں
ہوں گنہگار خدا تیری گنہگاری نہ کی
میں کہا قیمت دلِ سودا زدہ کی یک نگاہ
لے چکو سودے میں تم سے میں نے دشواری نہ کی
لیکن اس رشکِ مہِ کنعاں نے کچھ جی میں سمجھ
آنکھ اٹھا دیکھا نہ پھر یعنی خریداری نہ کی
ضبطِ عشق اپنا ہے غربت دیکھ قائم کی طرح
"جان تک گزری یہ ظاہر دل کی بیماری نہ کی"

اسی طرح بعض دوسری غزلوں کے اشعار مثال میں پیش کیے جاسکتے ہیں۔ جیسے ؎

اس بے وفا سے اے دل مت مِل وگرنہ تجھ پر
کیا کیا جفا نہ ہوگی کیا کیا ستم نہ ہوں گے

کس طرح پائیں یار کی خلوت میں بار ہم
ہیں اس کی آہ خاطر نازک پہ بار ہم

جفائے یار کی جی تن سے ہو خفا نکلا
میں با وفا جسے سمجھا تھا بے وفا نکلا

بحرِ جہاں میں ہم تھے مثال حباب آہ
اک دم کی زیست اپنی ہوئی پھر خبر نہیں

یہ چند مثالیں اس امر کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ غربت نے ابتدا میں قائم سے متاثر ہو کر ان کے رنگ کو اختیار کیا لیکن آہستہ آہستہ ان کے لہجے میں تبدیلی اور زبان و بیان میں صفائی پیدا ہوتی گئی۔ یہ سب کچھ خود بخود نہیں ہوا اس تبدیلی میں کئی مقامی اور بیرونی اثرات کو دخل تھا رامپور شہر اور لکھنؤ دونوں تقریباً ۱۷۷۴ء میں ریاست رامپور اور اودھ کی ریاستوں کے علی الترتیب دار الخلافے قرار پائے۔ اور دہلی کے رو بہ زوال ہونے کے باعث دونوں جگہ اساتذۂ دہلی اور دیگر اہل کمال بحیثیت مہاجرین پہنچے۔ لکھنؤ اودھ کی وسیع اور فارغ البال ریاست کا مستقر تھا۔ دلّی کی بالادستی کے خلاف شعوری کوشش کے نتیجے میں جہاں سیاسی آزادی حاصل ہوئی، شاعری میں بھی دلّی سے امتیاز پیدا کرنے کی سعی کی گئی۔ اور اس طرح ایک نیا دبستانِ شاعری وجود میں آیا۔ رامپور جغرافیائی اور لسانی طور پر دلی کے بہت قریب تھا اور شاعری میں لکھنؤ کی طرح آزاد روی کا قایل نہ تھا، لیکن کچھ تو پٹھانوں کی بستی ہونے کی وجہ سے اور کچھ وقت گزرنے کے ساتھ یہاں بھی شاعری کے رنگ میں دلی کے مقابلے میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور پیدا ہوا۔ مگر جنگ دوجوڑا (۱۲۰۹ھ/۱۷۹۴ء) میں شکست کھا جانے کے بعد ریاست رامپور پر اودھ کی بالادستی قائم ہوگئی اور نواب احمد علی خاں رندؔ (متوفی ۱۲۵۰ھ/۱۸۴۰ء) کو نواب آصف الدولہ نے نواب غلام محمد خاں کی جگہ نواب تسلیم کیا، اس بنا پر رامپور کے سیاسی و ادبی روابط دلی دربار کے مقابلے میں لکھنؤ سے زیادہ استوار ہو گئے۔

عام طور پر کہا جاتا رہا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد جب دلّی اور لکھنؤ کے اساتذہ وطن چھوڑ کے رامپور میں مجتمع ہوئے اور ان میں باہم معرکہ آرائیاں ہوئیں تو ایک نیا رنگ شاعری معرضِ وجود میں آیا جسے رامپور کے گنگا جمنی دبستانِ شاعری سے موسوم کیا گیا۔ یہی وہ نظریہ ہے جس کو رام بابو سکسینہ اور مولانا عبدالسلام ندوی نے پہلے پہل پیش فرمایا اور اسی نظریے نے مقبولیت حاصل کر لی۔ لیکن یہ رائے کلی طور پر درست نہیں کہی

جاسکتی۔ کیونکہ اسے تسلیم کرنے کے یہ معنی ہوں گے کہ رامپور میں ۱۷۷۵ء سے لے کر ۱۸۵۷ء تک یعنی تقریباً اسّی سال کی مدت میں کچھ ہوا ہی نہ تھا اور جب داغ، حیا، امیر مینائی، جلال، بحر، تلق وغیرہ دلی اور لکھنؤ سے رامپور آئے تو ان کی باہمی معرکہ آرائیوں کے نتیجے میں ایک نیا رنگِ سخن پیدا ہوا۔ دراصل اس مغالطے کا سبب رامپور کے دورِ اول کے شعرا سے عدم واقفیت اور ان کے کلام کا پیش نظر نہ ہونا ہے۔ غربت کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے کافی اہمیت کا حامل ہے۔ کیونکہ ان کے کلام میں جو تدریجی ترقیاں اور تبدیلیاں نظر آتی ہیں ان کو دیکھتے ہوئے بلاخوف تردید یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اس گنگا جمنی رنگِ سخن کے بنانے والوں میں ان کا نمایاں کردار رہا ہے۔

غربت نے رافت کی شاگردی کب اختیار کی؟ اس بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ البتہ ان کے دیوان کے مطالعے سے یہ ضرور پتا چلتا ہے کہ انھوں نے قائم کے رنگ میں کہتے کہتے، کچھ عرصے بعد رامپور میں جرأت کے انداز کی مقبولیت کے پیش نظر اس رنگ کو اختیار کرنا چاہا تو ان کی نظر انتخاب شاہ رؤف احمد رافت پر پڑی۔ رافت جرأت کے شاگرد تھے۔ اتفاق سے مستقیم خاں وسعت میر ضیاء الدین عبرت کے واسطے سے نواب محبت خاں محبت کے سلسلے میں تھے۔ محبت اور جرأت دونوں جعفر علی حسرت کے شاگرد تھے۔

رافت اگرچہ غربت کے ہم عمر تھے لیکن علم فضل اور مذہبی تقدس کی بنا پر لوگ ان کا بے حد احترام کرتے تھے اور شاعری کے میدان میں بھی ان کا اپنا ایک مقام تھا۔ غربت نے ان تمام باتوں کے پیش نظر ہی ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا ہوگا۔ مندرجہ ذیل اشعار میں غربت نے رافت کے رنگِ کلام کی خوبی کا جس انداز سے ذکر کیا ہے اس سے پتہ لگتا ہے کہ وہ قائم سے بڑھ کر رافت کو درجہ دیتے ہیں گو اسے شاعرانہ تعلی بھی کہا جاسکتا ہے۔ کہتے ہیں ؎

غربت نہ رکھ نگاہ بانداز دیگراں
تو دیکھ طرزِ رافتِ استاد کی طرف

میر اور سودا، درد اور قائم، اہل سخن تھے، سو ہو گزرے
اب تو شاعر دنیا میں اک رافت ہے یا غربت ہے

غربت نے جس طرح پہلے قائم کی زمینوں میں غزلیں کہی تھیں اب وہ اسی شد و مد سے رافت کی زمینوں میں طبع آزمائی کرتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً ؎

کرو جتنی کہ ہو سکے تم سے جفا تمھیں ظلم زدوں کی وفا کی قسم
ولے ہم تو پھریں نہ وفا سے کبھی ہمیں آپ کے جور و جفا کی قسم

کسی نے دیکھا نہ ہوئے مجنوں تو آکے صحرا میں ہم کو دیکھو
یہ جیب دیکھو، یہ سینہ دیکھو، یہ خار دیکھو، قدم کو دیکھو

جرأت کے رنگ کی مقبولیت اور رافت کی شاگردی کے نتیجے میں غربت اس قسم کے اشعار کہتے نظر آتے ہیں:

وصل میں وہ کیا ہوا بے اختیاری کے سبب
دونوں دزدیدہ نگہ ہیں شرمساری کے سبب

جو بات ہنسی نہ تھی سو وہ ہو گئی غربت
ہم جو مست ہوئے نشۂ شراب سے رات

وصل میں مزہ جب ہے یار اور گلابی ہو
اس کو ہووے بے ہوشی ہم کو بے حجابی ہو
خواب اس کو کب آوے لوٹتے ہی شب جاوے
چشم میں بسی جس کی چشم نیم خوابی ہو

ابر بھی گریاں نہ تھا آبی ڈوپٹہ دیکھ کر
برق بھی تڑپے تھی شب اس کی کناری کے سبب

اٹھائے وصل میں کیا کیا نہ شب مزے غربت
کبھی لبے ملایا لب کبھی اس کی زباں چوسی

اسی رنگ میں ایک قطعہ نساخ نے "قطعۂ منتخب" میں دیا ہے جو اس دیوان میں ہے۔ ملاحظہ ہو:

جب کہا سینہ بہ سینہ ہو جئے اس طور سے
جیسے رکھتے ہیں ملا کر آئینے پر آئینہ
بولے اس نازک سی چھاتی پر یہ سینہ تھر ہے
چاہیے پتھر پہ پتھر آئینے پر آئینہ

لکھنؤ سے گہرے روابط ہونے کی بنا پر بعض شعرائے رامپور نے اس شاعری پر ضرورت سے زیادہ توجہ مرکوز کر دی تھی جسے ادبی درزش کہنا بیجا نہ ہوگا۔ یہ وبا شاہ نصیر کے ذریعے سے دلی بھی پہنچی۔ لیکن رامپور میں متعدد شعراء نے اس انداز کو اختیار کیا۔ غربت کے دیوان میں بھی اس قسم کی غزلیں ملتی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

پھینکے ہے اکھاڑے میں وہ اس تاب کی لکڑی
جس کو نہ لگے رستم و سہراب کی لکڑی

اُلٹ کے چوٹی جو سینے پہ آپڑی ان کے
تو کیا ہی چونک پڑے وہ سمجھ کے خواب میں سانپ

اس نے بھی دیکھی ہے کیا وہ زلف اے غربت کہ آج
ہوش اُڑتے آتے نظر رنگت بھی فق ہے سانپ کی

کرتے ہیں نگہ یوں دل دلگیر کے ٹکڑے
جوں سنگ سے ہوں شیشے کی تعمیر کے ٹکڑے
غربت غزل اب اور اس انداز سے پڑھ تو
شنکر جیسے ہو دیں جگر میر کے ٹکڑے

مشکل قوافی و ردیف بطور امتحان مصرعہ ہائے طرح میں رکھے جاتے تھے اور اساتذہ اس چیلنج کو قبول کرتے ہوئے اپنی قادر الکلامی اور بسیار گوئی ثابت کرنے کے لیے طویل غزلیں کہتے۔ بعض اوقات ایک ہی مشاعرے میں دو غزلے سہ غزلے ہی نہیں پنج غزلے تک پڑھتے تھے۔

غربت کے یہاں بھی اس مماکشی مشاقی کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً

پڑھ اور بھی غزل تو غربت کہ شعرے میں
کہویں نہ غائبانہ تجھ کو کہ بے ہنر تھا
یا
غربت غزل اب پانچویں بھی پڑھ کے سنا دے
تقریر ہے کس کی تری تقریر سے بہتر

مذکورہ بالا معروضات سے یہ بات واضح کرنا تھی کہ غربت کی شاعری یکساں اور سپاٹ نہ تھی انھوں نے مختلف مرحلوں اور تجربوں سے گزرتے ہوئے ہر رنگ میں اپنی صلاحیت کا مظاہرہ کیا اور بالآخر وہ اپنی آواز پا لینے میں کامیاب ہو گئے۔ اس قسم کے اشعار میں دلی اور لکھنؤ دونوں کے محاسن یکجا نظر آتے ہیں۔

درج ذیل غزل ان کے رنگ کلام کا ایک خوبصورت نمونہ ہے ملاحظہ ہو:

ہم نشیں کیا ہے محبت کا مزا دیکھیں تو
ان دنوں ہم بھی کہیں دل کو لگا دیکھیں تو
گھر گئی چشم تصور میں تمہاری تصویر
چھوٹ کر جاؤ گے اب کیسے بھلا دیکھیں تو
ہم چلے پائے تصور سے چمن کو پہلے
تو پہنچتی ہے کہ ہم باد صبا دیکھیں تو
ہم سے جانباز دکھا دیں گے ابھی سیر تمہیں
آپ غیروں کی طرف آنکھ اٹھا دیکھیں تو
آگے مختار ہے وہ سننے نہ سننے کا آپ
حال دل اپنا اسے آج سنا دیکھیں تو
شب عجب حال تھا غربت کا کہ ہو یا وہ نہ ہو
آؤ اے یار اسے چل کے ذرا دیکھیں تو

اسی مخصوص رنگ میں ایک دوسری غزل کے اشعار ملاحظہ ہوں:

سوزِ جگر کی تم سے حکایات کیا کہوں
جوں شمع یاں جلے ہے زباں بات کیا کہوں

کیا کیا اُٹھے تھے دل میں خیالات کیا کہوں
کیا خواب آ گئے تھے مرے رات کیا کہوں

یاں تو ہزار باتیں بناتا ہوں دل میں آہ
پر دیکھیے کہ وقت ملاقات کیا کہوں

جیسا کہ ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے، غربت کے دور ہی میں لکھنؤ اور دلّی کے اثرات برابر اپنا کام کر رہے تھے، اور ان دونوں بیرونی اثرات اور مقامی ترقی پذیر رنگ شاعری کے امتزاج سے وہ رنگ شاعری معرض وجود میں آیا جسے بجا طور پر گنگا جمنی کہا جا سکتا ہے جس طرح دلّی اور لکھنؤ کے دبستانِ شاعری کو داخلیت اور خارجیت جیسے جامع الفاظ کے ذریعہ بآسانی متعین کیا جا سکتا ہے، رامپور کے رنگِ سخن کی تعریف اتنی سہل نہیں یہ کسی رنگ کی ضد نہیں بلکہ دونوں کی خوبیوں کا مجموعہ ہے جو اپنے مخصوص تیوروں کی بنا پر الگ پہچانا جاتا ہے۔ یہ موقع تفصیل میں جانے کا نہیں، اس بارے میں راقم الحروف نے اپنی زیر تصنیف کتاب "رامپور کا دبستان شاعری" میں بحث کی ہے۔

میں غربت کا ایک شعر خصوصیت سے پیش کروں گا جسے پڑھ کر داغ اور نظام کی یاد آتی ہے:

دیکھ آئینے میں وہ زلفِ دوتا کہتے ہیں
لوگ سچ کہتے ہیں اس کو جو بلا کہتے ہیں

لیکن غربت نے یہ شعر ان دونوں کے ہوش سنبھالنے سے پہلے کہا ہے۔ غربت کا ۱۸۴۰ء میں انتقال ہوا تو نظام ۱۷ سال کے اور داغ ۹ سال کے ہوں گے۔ اس طرح غربت داغ اور نظام کے پیش رو ہوئے۔ نظام تو خیر رامپور کے ساکن تھے۔ داغ کا تعلق بھی رامپور سے بچپن ہی سے رہا۔ وہ اپنی خالہ عمدہ خانم کے ساتھ ہر سال ۶ ماہ کے لیے نواب یوسف علی خاں کے مہمان کی حیثیت سے برابر آتے رہے۔ تا وقتیکہ ان کی والدہ دلی عہد مرزا فخرو کے حرم میں داخل نہیں ہو گئیں اور داغ کو قلعے میں رہنے کی اجازت نہیں مل گئی۔ یعنی داغ ۱۸۵۷ء سے بہت پیشتر رامپور سے متعلق رہ چکے تھے۔ اس لیے یہ کہنا کہ ہنگامۂ ۱۸۵۷ء کے بعد اساتذۂ دہلی و لکھنؤ یعنی داغ اور امیر وغیرہ رامپور میں جمع ہوئے اور باہمی معرکہ آرائیاں ہوئیں تو رامپور میں ایک نیا رنگ شاعری وجود میں آیا درست نہیں۔ فی الحقیقت امیر اور داغ دونوں نے رامپور کے ماحول شعر و سخن کو جہاں متاثر کیا خود بھی اس سے متاثر ہوئے۔ اور دونوں کے اندازِ کلام میں قیام رامپور کے دوران جو تبدیلی رونما ہوئی اس میں رامپور کے شعراء شریکِ غالب کی حیثیت رکھتے تھے، محض سامعین نہ تھے۔ یہ ایک دلچسپ موضوع بحث ہے اور تحقیقی کام کرنے والوں کی خاص توجہ کا مستحق ہے۔ راقم الحروف نے اس بارے میں اپنے مضمون نظام رامپوری میں تفصیلی گفتگو کی ہے۔

غربت کا مطالعہ نظام رامپوری اور جرأت کے کلام کا تجزیہ اور موازنہ کرتے وقت خاصا مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ نیز نیاز فتحپوری، پروفیسر عبدالشکور اور دیگر ناقدین ادب نے ان کے مخصوص رنگ شاعری کے بارے میں جن آراء کا اظہار کیا ہے ان پر از سرِ نو غور کیا جا سکتا ہے۔ راقم الحروف کی رائے میں غربت کی حیثیت نظام رامپوری اور جرأت کے درمیان ایک گم شدہ کڑی کی سی ہے۔ نظام داغ اور جرأت میں یکسانیت کے باوجود جو گہرا فرق نظر آتا ہے اس کا خاص سبب بھی یہی ہے کہ اول الذکر دونوں شاعر جرأت سے براہ راست متاثر نہیں ہوئے بلکہ یہ رنگ چھن کر ان دونوں تک پہونچا۔

٭٭

جدید اُردو ادب کے لیے
سطور
چوتھا شمارہ : ایک ادبی دستاویز
جس کا ایک حصّہ جدید اردو افسانے کے انتخاب پر مشتمل ہوگا۔
دسمبر ۷۷ء میں چھپ رہا ہے
سطور پبلی کیشنز۔ ۳۲۱، درگا (؟) ٹیٹ
نئی دلی ۱۱۰۰۰۲

مُرقّعِ اقبال
مرتبہ
جگن ناتھ آزاد
علامہ اقبال کی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور ادوار سے متعلق
131 تصویروں پر مشتمل البم
● اقبال کی متعدد نادر اور نایاب تصویریں
● ان کے خاندان کے افراد اور اساتذہ کی تصویریں
● اپنے عہد کی ممتاز شخصیتوں کے ساتھ ان کے گروپ فوٹو
● اقبال کی زندگی سے تعلق رکھنے والی درسگاہوں، اقامت گاہوں، تاریخی عمارتوں اور مرکزوں کی تصویریں
● ترانۂ ہندی سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا اقبال کی اپنی تحریر میں، خوبصورت رنگین ڈیزائن کے ساتھ
● اقبال کے کلام اور اردو و انگریزی خطوط کے عکس
● پانچ رنگوں میں نہایت خوبصورت اور دیدہ زیب سرورق جو ممتاز مصور اے۔ اے رانیسا کا شاہکار ہے
آرٹ پیپر پر آفسٹ کی عمدہ چھپائی۔ سائز 28X21.5 سینٹی میٹر
قیمت: -/50 روپے۔ (ڈاک خرچ ہمارے ذمے ہوگا)
ملنے کا پتہ:
نئی دہلی 110001
● بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس۔
● سیلز امپوریم، دوسری منزل، سپر بازار، کناٹ سرکس۔
● یوجنا بھون۔ پارلیمنٹ اسٹریٹ
کلکتہ 700001 ● 8۔ اسپلینڈ ایسٹ۔
بمبئی 400038 ● کامرس ہاؤس، دوسری منزل کریم بھائی روڈ، بیلارڈ پیئر۔
مدراس 600009 ● شاستری بھون، 35 ہیڈز روڈ۔
DAVP 77/311

نظمیں

شاھد کلیم

بے ننگ و نام

جگہ جگہ سے ٹوٹا پھوٹا
بے دروازہ میرا کمرہ
برسوں سے اس میں رہتا ہوں
تنہا تنہا
ساری چیزیں
اس کمرہ میں پڑی ہوئی ہیں
بنا حفاظت —— بے ترتیب
بے پروا میں سب چیزوں سے
تھکا تھکا دفتر سے آکر
سو جاتا ہوں
بے دروازہ میرا کمرہ
اک مدت سے دیکھ رہا ہے
رستہ —— لیکن
کوئی نہیں اب تک آیا ہے
کوئی سارق —— ؟
کوئی قاتل —— ؟
یہ بھی نہیں ۔

لطیف

پرندے تنہا رہ جاتے ہیں

رات کی حدوں میں
لازوال صورتوں کا ماتم
دھندلکوں کی چادروں میں
میری آنکھیں
اور وہ لب ......
میرے نہیں ہیں
آہستہ آہستہ چاند ......
بارش میں بھیگتا ہے
پھولوں کی سرگوشی
رات کی بھیگی چاندنی میں
عذاب ہے

میں نہیں چاہتا
پھولوں میں عذاب
چاند کا بھیگنا
رات کا بڑھنا
گناہ کا انحراف

) سنٹرل ایکسائز آفس ۔ گیا ۔ بہار

○ کھادی بھون ۔ گلبرگہ ۱ (کرناٹک)

غزلیں

توصیف تبسم

تمہیدِ عرضِ حال ابد پر اُٹھا رکھیں
خود آرزو ہو موج تو بنیاد کیا رکھیں

ہر چند ہر صدا کا ہے انجام خامشی
کچھ دیر اور شورِ تمنّا بپا رکھیں

جینا جو پڑ گیا تو سیاست بھی سیکھ لیں
آنکھوں میں پیار ہاتھ میں خنجر کھلا رکھیں

یکلخت ہم بھی توڑ کے زندانِ رنگ کو
خوشبو کی طرح رخصت بدوشِ ہوا رکھیں

اترے گی زینہ زینہ کرن ماہتاب کی
تا صبح یونہی دل کا دریچہ کھلا رکھیں

سب چل رہے ہیں عمرِ گریزاں کے ساتھ ساتھ
ٹکرا نہ جائیں خود سے اگر فاصلہ رکھیں

حاصل ہوا نہ کچھ بھی چھیالیس سال میں
جُز عمر کیا بچا ہے جو میشِ قضا رکھیں

▲▲

جمنا پرشاد راہی

غبار صحن میں ہے شور سائبان میں ہے
شکستِ دریخت کا منظر مرے مکان میں ہے

حصارِ سنگ سے نکلے تو جوئے شیر بنے
کہ تیشہ زن کا پسینہ ابھی چٹان میں ہے

نہ فاصلے نہ ہواؤں کی مسئلہ سازی
سفر گزار پرندہ ابھی اڑان میں ہے

ہر ایک نقشِ کفِ پا ہے انتشار لیے
سراغِ سمتِ سفر جانے کس نشان میں ہے

بجا کہ وقت نے سب کچھ بدل دیا لیکن!
لہو کا ذائقہ اب بھی مری زبان میں ہے

زمیں کی خاک کے ذرے ہیں کیوں حریف اس کے
وہ تابناک ستارہ تو آسمان میں ہے

▲▲

ساحل احمد

ساری رنگت لفظ کے باہر رہی
اک طرح کی سادگی اندر رہی

کس طرح عریاں بدن ہیں لوگ سب
زندگی بھی خوب ناٹک کر رہی

ہر خوشی اپنی دعا کے ساتھ ہی
بند گنبد کی صدا ہو کر رہی

زندگی کی چلچلاتی دھوپ میں
ہر خوشی اپنی تہِ خنجر رہی

منتظر تھا پھول کا اجلا بدن
تشنگی اندر رہی باہر رہی

اب وہی مٹھی میں اپنی نیند ہے
روشنی جو آسمانوں پر رہی

ساحلوں کی ریت اڑتی تھی جدھر
اس طرف کی کچھ ہوا بہتر رہی

▲▲

○ ۶۲۲ - بی - احمد بورہ - راولپنڈی (پاکستان) ○ ایکارڈ راج کمپنی، ایگزی بیشن روڈ، رگھوبیر پورہ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ ○ ۲۸ - ٹرنر، الہ آباد - ۲۱۱۰۰۳

نظمیں

خالد سعید

آنکھیں پھوڑا ہوئیں

دل سا آتش فشاں سرد ہے
بس سسکتا دھواں
تشنگی چاٹتے چاٹتے یہ زباں کٹ گئی
تشنگی چاٹتا ہی رہوں
کیا خبر دھند کی سخت دیواریں کب دریچہ کھلے

نفس در نفس سرسراتا ہوا
ایک برگد
دن کے ماندہ پرندوں کا اک آسرا
جس کی ہر شاخ پر ہے گھنی چپ کا نیلا دھواں
طائرِ گمشدہ اب تک آیا نہیں
کس نے باندھے ہیں پر
کہ کوئی پھڑپھڑاہٹ بھی آتی نہیں
اب کوئی پھڑپھڑاہٹ بھی آتی نہیں

چھاتیاں چاندنی کی ٹپکنے لگیں
خشک پلکوں سے قطرے چنوں کس طرح
آنکھیں پھوڑا ہوئیں
اب انھیں میں گنہ رنگ سڑکوں پہ چسپاں نہ کر دوں
کہ پیتے پگھل جائیں گے، عکس بہہ جائیں گے

○ نزد نیشنل ...اردو اسکول ۔ گلبرگہ ۔

احمد حسین شمسی

اضطراب اندر کا

سنسان اندھیری گلیوں میں
ہر رات مرے گھر کے پیچھے
اک چیخ تڑپتی رہتی ہے
جیسے ہر دو تین منٹ پر
برقی شاک کسی پاگل کو لگ جاتا ہو
چیخیں
پردۂ شب کو چیر کے میرے کان سے ٹکراتی ہیں
میں اس کی ہر چیخ پہ اکثر
چونک اٹھتا ہوں، کانپ اٹھتا ہوں
لیکن جب بھی باہر جا کر
میں نے ڈھونڈھا اس پاگل کو
پایا اک کالا سناٹا
دنیا و مافیہا سے انجان پڑا ہے
فرش ہوا پر۔
اک رات ذرا ہمت کی میں نے
اک پتھر مٹھی میں دبا کر
چوری چوری گھر سے نکلا
اور اپنے بازو کا سارا زور لگا کر
ٹھیک اسی آواز کی جانب دے مارا ——
مگر اچانک ....!
بڑے زور کا ایک جھناکا
اچھل پڑا تاریک فضا میں
اپنے کمرے کا قد آدم آئینہ
فرش پہ چکنا چور پڑا تھا
اور وہیں میں ہر کرچی میں سسک رہا تھا، بلک رہا تھا

○ کشن گنج ۔ پورنیہ ۔ بہار

غزلیں

زبیر شفائی

بہارِ باغ تھی میری، گلاب میرے تھے
سوال یہ ہے کہ اتنے جواب میرے تھے

طلسم کاریٔ بیم و امید تھی شاید
کہ دشت دشت قدم زیرِ آب میرے تھے

اُلٹ رہی تھی ہوا خاک کی تہیں جیسے
یہ منتشر ورق بے کتاب میرے تھے

اسیرِ دامِ تمنا تھا ہر نفس یعنی
جو مجھ پہ ٹوٹ پڑے تھے عذاب میرے تھے

یہ اب کھلا کہ تھی تعبیر کیوں جدا گانہ
زبیرؔ آنکھ پرائی تھی، خواب میرے تھے

مجید کوثر

بھری ہیں اب کے مرے دل میں وحشتیں کیسی
کہ خاک ہو گئیں ساری محبتیں کیسی

وہ قتل کر گیا ایسے میں چیخ بھی نہ سکا
دھری رہیں مری ساری ہی جرأتیں کیسی

یہ خاک سب سے الگ تھی تو ہاتھ کیا لگتی
لگائیں لوگوں نے بڑھ چڑھ کے قیمتیں کیسی

اب اور کیسی قیامت سروں پہ گزرے گی
ازل سے بھوگ رہے ہیں قیامتیں کیسی

جو سادگی و مروّت کی تھا مثال مجیدؔ
اُسی کے دل میں چھپی تھیں رقابتیں کیسی

امیت تابش

ہو چکے مسمار خوابوں کے نگر
چھوڑ دیتے اب ماہتابوں کے نگر

خواہشوں کے ریگزاروں کا سفر
ملتے جاتے ہیں سرابوں کے نگر

اپنے منصوبوں کا حاصل دیکھ لو
یہ رہے خانہ خرابوں کے نگر

سائباں سر پر تنا تھا دھوپ کا
زیرِ پا تھے آفتابوں کے نگر

اب ہے تعبیروں کی تابشؔ جستجو
خواب میں دیکھے تھے خوابوں کے نگر

۸۵/۱۰۵، لاٹوش روڈ، کانپور ۲۶ جونا بھٹی، مالیگاؤں، ناسک، مہاراشٹر ۱۷۸ اے جی۔ بی۔ روڈ، بمبئی ۵۰

کنٹھ مالا

عطیہ پروین

اس کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن بڑی بڑی مونچھوں سرخ آنکھوں اور سیاہ رنگت والے سپیرے کے بے حد اصرار پر مجبور ہو گئی ـــــ سپیرے نے اس کی توجہ اپنی طرف دیکھی تو جھٹ اپنی بین سنبھال کر اور میلی میلی ٹوکریاں زمین پہ رکھ کر بیٹھ گیا

"میم صاب کا اقبال بڑھے! ایک سے ایک جناور دیکھاؤں گا" وہ کھڑکی کی سلاخ پر ناک چپکائے کھڑی دیکھتی رہی۔ سپیرے نے ایک ٹوکری پہ بندھے کثیف کپڑے کی گرہ کھولتے ہوئے ہانک لگائی۔

"دیکھیے میم صاب! دنیا کا عجوبہ .... یہ ہے تو کھنی کے برابر مگر ڈس ڈالے تو آدمی پانی کبھی نہ پیئے ..." اس نے ٹوکری میں ہاتھ ڈال کر چھوٹا سا موٹا سا سفید و سیاہ ایک سانپ نکالا اور زمین پر ڈال دیا۔ سانپ نے تیزی سے بل کھایا اور ایک طرف نکل چلا۔ سپیرے نے جھپٹ کر اس کو پکڑا اور ٹوکری میں ڈال کر دوسرا سانپ نکالا۔

"یہ دیکھیے میم صاب اس کا ڈسا سانس نہ لے ..."

"اور یہ دیکھیے میم صاحب یہ کوڑیالا ... جس کو ڈس لے اس کا چہرہ بھی اس جیسا ہو جائے اور میم صاحب یہ ...."

اس نے بہت ہی لمبا سیاہ سانپ نکال کر زمین پر ڈال دیا" اس کی پھنکار منہ پر پڑے تو آدمی اوسان کھو بیٹھے ..... سشش شش!" اس نے سانپ کو ہٹکایا تو سانپ نے پھن کاڑھ کر اس زور سے پھنکار ماری کہ اوپر کھڑکی سے جھکی سلمہ جھجک کر پیچھے ہٹ گئی۔ پیچھے ہٹی تو امی جان سے ٹکرا گئی

"یہ موا سپیرا کہاں سے آ گیا؟" امی جان نے ڈر کر کھڑکی سے جھانکا اور پھن کاڑھ کر لہراتے ہوئے سانپ پر نظر پڑی ہی تھی کہ "اوئی!" کہہ کر کئی قدم پیچھے ہٹ آئیں ـــ سلمہ ہنس پڑی۔

"بڑا مزہ آ رہا ہے امی جان۔ دیکھیے تو سہی!"

"اللہ تجھے اسی طرح ہنستا ہوا رکھے میری جان! نا بھئی میں نا دیکھوں گی!"

وہ وہیں ایک کرسی پر بیٹھ گئیں اور ہنستی ہوئی سلمہ کو بڑے پیار اور بڑی حسرت سے دیکھنے لگیں۔

سلمہ! ان کی لاڈلی اکلوتی بیٹی! ۲۰ سال کی ایک خوبصورت نرم و نازک لڑکی جس کی بڑی بڑی آنکھوں میں ایک حسرت اور ایک گہری اداسی کھنڈی رہتی تھی۔ جس کے چہرے پر سرخی کی جگہ زردی چھائی رہتی تھی اور جس کی صراحی دار گردن .....

اف!

انھوں نے ایک جھرجھری لے کر آنکھیں بند کر لیں۔

سپیرا اب بین بجا رہا تھا اور سانپ اس کی مدھر دھن پہ جھوم رہا تھا۔

"امی ذرا دیکھیے تو ...." سلمہ نے بچوں جیسی خوشی سے کہا۔ وہ اس کا دل رکھنے کے لیے اٹھیں اور اس کے کندھے کے اوپر سے جھانکنے لگیں۔

سپیرے نے بین رکھ کر بے تکان بولتے ہوئے پھر ٹوکری میں ہاتھ ڈالا۔

لال گنج، رائے بریلی، یوپی،

یہ دیکھیے میم صاحب یہ وہ سانپ ہے جو ایک مرض کی دوا بھی ہے ...." اس نے سرخی مائل بھورے رنگ کا ایک لمبا سا سانپ نکالا۔ سانپ اس کے ہاتھ میں اکڑ اکڑ کر اپنا جسم لہرا رہا تھا جیسے مونجھ کی موٹی سی رسی کو بل دے کر دھیرے دھیرے کھلنے کے لیے چھوڑ دیا جائے۔

"ہائے غضب! اس کو ڈر نہیں لگتا؟" امی جان نے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔

"وہ مرض ہے کنٹھ مالا ...." سپیرا ہاتھ اونچا کیے بول رہا تھا اور سانپ اپنی پتلی زبان لپلپاتا ہوا بل کھا رہا تھا۔

"امی جان ...." سلمہ کے منہ سے ایک چیخ سی نکلی۔ دبی دبی لیکن پر جوش چیخ!

"کیا؟ کیا کہہ رہا ہے؟" امی جان نے اضطرابی کیفیت میں سلمہ کا شانہ جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

"کنٹھ مالا ...." سلمہ کے منہ سے نکلا اور اس کا داہنا ہاتھ اپنی گردن پر چلا گیا۔

اس موذی مرض نے اس خوبصورت لڑکی سے اس کا ہنستا بولنا اس کی تندرستی سب ہی کچھ چھین لیا تھا: اب .... اب اس کی زندگی بھی، تو ....!!!

کتنا علاج ہوا تھا مگر بے سود! روپیہ پانی کی طرح بہا۔ بیکار!!

جو روپیہ اس کی شادی میں لگنا چاہیے تھا وہ اس کے علاج پر لگ رہا تھا۔

"کیسا بھی کنٹھ مالا ہو کتنا بھی پرانا ہو اس سانپ کی ہڈی جلا کر ...."

امی جان اپنا ڈر اپنا پردہ اپنا حجاب ... سب توڑ کر سب بھول کر سلمہ کو ایک طرف ہٹاتی کھڑکی پر پہونچیں اور بولیں "سنو .... تم ذرا اوپر آجاؤ!"

"جی میم صاحب ...... بیگم صاب ...." سپیرے نے حیرت سے پوچھا۔

"اوپر آجاؤ ...." امی جان کا بس نہ چل رہا تھا کہ سانپوں کی ٹوکری اور سپیرے کو نظروں کی ڈور سے اوپر اٹھا لیں۔

سپیرا حیران حیران سا بار بار سر اٹھا کر اوپر دیکھتا ہوا سانپ ٹوکری کے اندر ڈالنے لگا۔

اور کچھ دیر بعد!

وہ خوشی سے چقندر چہرہ لیے میلے کرتے کی جیب میں بھرے نوٹوں کو بار بار تھپتھپاتا ہوا اوپر سے نیچے آرہا تھا۔ دو چار لڑکے اس کے پیچھے لگ لیے تو اس نے پلٹ کر ڈانٹ دیا۔

"کیا پیچھا کرتے ہو لڑکے لوگ .... آج بھاگ جاگ گئے اپنے۔ دوا بنانی ہے سرکار لوگ کے لیے اپنا راستہ لو...."

"میرا دل کہتا ہے اس دوا سے میری سلمہ اچھی ہو جائے گی۔" امی جان نے خوشی کے بوجھ سے ہانپتے ہوئے ابا میاں کو پورا قصہ سنایا تھا۔

"کیا کہتی ہو بیگم" ابا میاں نے ٹھنڈی سانس بھر کر بڑی حسرت کے ساتھ کہا "جس مرض کو بڑے بڑے ڈاکٹر نہ دور کر سکے آپریشن نہ اکھاڑ سکا اس کو یہ جاہل سپیرا کیا ٹھیک کر سکے گا!"

بیگم نے ایک بار جلدی جلدی پھر سپیرے کی کہی ہوئی باتیں دوہرائیں اور بولیں۔

"میں نے دوا بنوائی ہے پر سوں وہ سانپ کی ہڈی جلا کر لائے گا اس کو بکری کے دودھ میں گھول کر سلمہ کے گلے پر لگانا ہوگا ....."

"سانپ کی ہڈی ... سلمہ کے گلے پر ....!!" ابا میاں نے جھرجھری لی۔

"وہ کہتا ہے کئی کیس اس نے کیے ہیں ...."

"مجھے یقین نہیں آتا!"

"ناامیدی کے اندھیرے میں روشنی کی یہ کرن چمکی ہے اس کو ہاتھ سے نہ کھوؤ سلمہ کے ابا کیا پتہ میری بچی اچھی بھلی ہو جائے .... میری بچی .... میری بدنصیب بچی ...."

امی جان سسک اٹھیں تو ابا میاں کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔

"ٹھیک ہے یہ کر کے بھی دیکھ لیا جائے .... مگر بیگم ...."

بیگم ہمہ تن گوش ہو گئیں۔

"سنا ہے سانپ کی خوشبو پاکر دوسرے سانپ قریب آجاتے ہیں"
بیگم آنسوؤں کے درمیان ہنس پڑیں۔
"ائے بیٹے کیا بچوں کی سی باتیں کرتے ہیں یہ سب پرانے زمانہ کے قصے تھے محض دلچسپی اور پراسرار فضا قائم کرنے کے لیے۔"
ابا میاں کچھ سوچتے رہے سوچتے ہی رہے اور امی جان سلمہ کے کمرے میں چلی گئیں ـــ
سپیرا تیسرے ہی روز دوا بنا کرلے آیا۔ امی جان نے سو سو کے تین نوٹ اس کی جھولی میں ڈال دیئے۔ اور رقت آمیز لہجے میں بولیں۔
"اگر میری بچی اچھی ہوگئی تو تمھیں گود دو بھر کے دولت دوں گی چاہے اس کے لیے مجھے بک جانا پڑے!"
"بیگم صاحب کا اقبال سلامت رہے" سپیرے نے ہاتھ جوڑ دیئے "بٹیا صاب کو مالک شفا دے گا یہ ایک ایسی دوا ہے جو کبھی ناکام نہیں ہوتی ہیں نے ایسے دو مریضوں کو چنگا کیا ہے بیگم صاب دونوں بچپن کے مریض تھے اور ایک کے گلے کی گلٹیوں میں تو مواد بھی پڑ گیا تھا ...."
"وہ اچھا ہوگیا؟" ابا میاں نے بیتابی سے پوچھا۔
"ہاں سرکار صاب مالک آپ کا اقبال سلامت رکھے ایسا لگتا ہے کبھی بیمار ہی نہ رہا ہو ...."
اور اس رات دھڑکتے دل کانپتے ہاتھوں اور لرزتے لبوں پر نہ ختم ہونے والی دعاؤں کے ساتھ امی جان نے سانپ کی ہڈی کی دودھ میں گھلی راکھ کا لیپ سلمہ کی نازک گردن پر کیا: سلمہ کی اداس آنکھوں میں ستارے سے ٹوٹ رہے تھے۔ زرد چہرہ چمک اٹھا تھا اور وہ اتنی پیاری نظر آرہی تھی کہ امی جان کو ڈر لگنے لگا۔ انھوں نے اس کی نظر اتاری اور بڑی دیر تک اس کے سرہانے بیٹھی اس سے باتیں کرتی رہیں۔ جب سلمہ سوگئی تب وہ اٹھیں اور اس کے برابر بچھے پلنگ پر لیٹ گئیں۔
اس رات وہ کتنے پیارے خواب دیکھتی رہیں:
سونے آنگن میں ڈھولک بج رہی ہے زرتار لباس سرک رہے ہیں قہقہوں سے فضا جھوم اٹھی ہے۔:
سلمہ سرخ جوڑا پہنے بیٹھی ہے۔ ناک میں نتھ، ماتھے پر ٹیکا مانگ میں افشاں اور گلے میں ....
یہ موتیا یا تو تی ہار!
نازک نیلی گردن میں یہ ہار کتنا خوب صورت معلوم ہو رہا تھا ـــ بیگم خواب میں کھلکھلا اٹھیں۔
یہ لمبی موٹر دروازے پر آکے رکی ہے اسی میں سے دولہا اترا ہے۔ لمبا تڑنگا گیہواں رنگت کا خوب صورت مرد!
"بیگم! بیگم! بیگم!"
ابا میاں ان کو جھنجھوڑ رہے تھے۔
وہ گھبرا کر بیٹھ گئیں۔
"بیگم ...... وہ .... وہ .... سلمہ .... میں نے کہا تھا نا .... کہا تھا نا ...." ابا میاں لہرائے اور تڑاخ سے پکے فرش پر گر گئے۔
"سلمہ کے ابا ...."
امی جان کی طویل چیخ وسیع و عریض آنگن میں تیرتی چلی گئی۔ دوسرا لمحہ ان کو پتھر کی طرح ساکت کر دینے والا تھا:
ان کی نظر سلمہ پر گڑ کر رہ گئی تھی :
سفید بستر پر خوب صورت اور نرم و نازک سلمہ چت لیٹی تھی۔ بے حس و حرکت اس کے لمبے گھنے بال تکیے پر ہوتے ہوئے پلنگ کے نیچے چھوتے زمین کو چھو رہے تھے ـــ بھرپور چاندنی اور مدھم پاور کے بجلی کے بلب کی روشنی میں سلمہ کی نیلی اور صراحی دار گردن میں لپٹا ہوا وہ سانپ یوں چمک رہا تھا جیسے گلابی آب دار موتیوں کی مالا چمک رہی ہو اس کا سر بار بار اٹھتا اور لپلپاتی ہوئی زبان سلمہ کے نیلے ہوتے پتلے لبوں کو بار بار چوم لیتی۔ ●●

نیا ادب نئے مسائل
بشر نواز کے خیال انگیز مضامین
قیمت ۱۰ روپے

وہ اور میں

ایم مظہر الزماں خاں

میں صدیوں کی تھکن کو اپنی مٹھی میں دبوچ کر لیٹ جاتا ہوں اور آنکھیں موند کر اس کہر زدہ شخص کے متعلق سوچنے لگتا ہوں جس کے دو دانت سونے کے اور ایک آنکھ شیشے کی تھی۔

آج سے کوئی پچاس سال پہلے وہ' اور میں' ایک ہی تھے۔ اس کی اور میری' آواز' ایک ہی تھی میرے اور اس کے پاؤں' ایک ہی تھے ___ اور وہ میرے ساتھ ہی رہتا تھا۔ اور میں۔ اس کے ساتھ رہتا تھا۔ یعنی ہم دونوں ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ ساتھ ساتھ اٹھتے' اور ساتھ ساتھ بیٹھتے تھے۔

اور اس وقت اس کے دونوں دانت اور آنکھ اصلی تھی سونا اور شیشہ اس کے جسم کی زینت اور پیوند نہیں بنے تھے۔ اور پھر آج سے پچاس سال پہلے وہ بڑا سیدھا سادھا' بڑا بھولا بھالا بے حد معصوم اور مخلص تھا۔ اس میں ملاوٹ نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اور اس کی اسی معصومیت اور سچائی نے مجھے اس کا' اور اس کو میرا گرویدہ بنا دیا تھا۔ اور ہم دونوں ایک دوسرے کو دل کی عمیق گہرائیوں سے چاہتے تھے۔ کیوں کہ اس وقت وہ' بڑی عجیب اور چاہی جانے والی فطرت کا مالک تھا۔ صبح اٹھتا تھا ___ سورج کی ننھی ننھی کرنوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتا تھا۔ کبھی کبھی رنگ برنگی تتلیوں کو پکڑتا اور انھیں اپنے ہونٹوں سے لگا لیتا تھا۔ یا کسی پھول کو شاخ سے توڑ کر اس کی پتیاں الگ کر دیتا تھا اور ان پتیوں کو ہوا میں اچھال کر زور زور سے تالیاں بجا کر خوش ہوتا تھا۔ لیکن جب کسی بات پر مچل جاتا' تو گھنٹوں نہ سنبھلتا تھا۔ غرض کہ وہ بڑی عجیب و غریب حرکتیں کرتا رہتا تھا ___ ایسی حرکتیں جنھیں دیکھ کر بے ساختہ پیار کرنے کو جی چاہے۔ اور سبھی اس سے پیار کرتے تھے اور وہ بھی سبھی سے پیار کرتا تھا اور پھر چاہت کا یہ سلسلہ اس وقت ٹوٹا' جب کالے لمحوں نے اسے آگھیرا۔ اور وہ بری طرح ان کے نرغے میں پھنس گیا ___ شاید وہ آدھے جسم والے چاند کی رات تھی۔ اور اس وقت وہ ایک شناسا آگ کے پہلو میں لیٹا ہوا تھا اور ابھی اس نے شعور کی دہلیز بھی پوری طرح پھلانگی نہ تھی کہ اچانک کالے لمحوں نے اسے اپنے زہریلے پنجوں میں جکڑ لیا اور وہ پہلو میں لیٹی ہوئی شناسا آگ کو گھونٹ گھونٹ۔ پی گیا تھا۔ اور تبھی سے اس کی معصومیت' سچائی' خلوص' بھاپ بن کر جسم سے نکل گئے تھے۔ اور چہرہ کا پاکیزہ خول' اتر کر ایڑیوں میں آگیا تھا جو آتے وقت وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ چنانچہ اسی وقت سے وہ مجھ سے' اور میں اس سے' الگ ہو گئے تھے۔ مگر جدا نہیں ہوئے تھے۔ تاہم وہ اور میں' الگ الگ اور تن تنہا' رہتے تھے ___ اور تنہائی کا یہ کرب مجھے اکیلے پن میں ڈستا تھا۔ اور اندر سے کوئی چیز رہ رہ کر ڈنک مارتی تھی جس کی شدید تکلیف سے میں گھنٹوں تلملاتا تھا۔ لیکن وہ مطمئن اور پرسکون رہتا تھا۔ کیوں کہ وہ کالے لمحوں کا غلام تھا اور کالے لمحے اس سے وہ سب کام لے رہے

تھے جو وہ لے سکتے تھے چنانچہ وہ آگ کا اس قدر عادی بن گیا تھا کہ اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے وہ پتھروں کا پسینہ بھی چاٹنے لگا تھا۔ اور پھر اس میں آگ کو پرکھنے اور سمجھنے کا مادّہ بھی ختم ہو گیا —— بس جہاں کہیں کوئی دلفریب آگ دکھائی دیتی وہ بڑھ کر اسے پی جانا چاہتا تھا بلکہ پی جاتا تھا اور اپنی اسی خطرناک عادت کی وجہ سے جب ایک بار وہ پرائی آگ کو پی گیا تھا تو سارے شہر کو آگ لگا دی گئی تھی اور اسی آگ میں اس کے دو دانت اور ایک آنکھ ختم ہو گئی تھی جسے بعد میں اس نے سونے اور شیشے میں بدل لیا تھا کیوں کہ وہ پشت ہا پشت سے ہزاروں جیبوں کا مالک تھا اور جب کبھی اس پر کوئی آنچ آتی تھی وہ اپنی جیبوں کا منہ کھول کر اسے سرد کر دیتا تھا۔

"بہشت!" دفعتاً میں اس شخص کے خیالات کو اپنی بند مٹھی کھول کر آزاد کر دیتا ہوں اور کروٹ بدل کر ایک اجنبی بستر پر لیٹ جاتا ہوں اور پھر چند لمحوں کی نیند کے بعد اپنا جسم جھٹک کر اٹھ جاتا ہوں۔ اور اس اجنبی کی ہتھیلی پر بولتے ہوئے چند کاغذ کے ٹکڑے رکھ کر اسے اپنے کمرے سے باہر دھکیل دیتا ہوں۔ اور پھر ٹیوب لائٹ کی دودھیا روشنی میں قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر اپنا چہرہ دیکھتا ہوں تو مجھے صرف سونے کے دو دانت دکھائی دیتے ہیں جن کی شعاعیں منعکس ہو کر میرے چہرے پر پھیلی ہوئی تھیں

●●

بزمِ احباب

(بقیہ صفحہ ۴۹)

...ضرب المثل آویز فقرے اور مثالیں پائی جاتی ہیں جو عرب کی عام بول چال سے ...ت اور امتیاز رکھتی تھیں۔ یہی سبب تھا کہ جب قریش نے قرآنِ مجید کی ...ل اور عجیب عبارت سنی، تو جنھوں نے اس کو کلامِ الٰہی نہ مانا وہ رسول ...صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو شاعر کہنے لگے حالانکہ قرآن شریف میں وزن کا ...ن التزام نہ تھا۔" (مقدمۂ شعر و شاعری۔ ناشر کتب خانہ دہلی ۱۹۵۳ء ۳۶-۱۳۴) اردو شاعری پابندیوں کے ساتھ ساتھ، جو بجائے خود اپنا ...کتی ہیں، مختلف ادوار میں گوناگوں تجربوں سے گزرتی ہوئی اب ...نظم یا نثری شاعری تک آ پہنچی ہے۔ نومبر ۱۹۷۷ء کے "تحریک" میں

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید اور جناب منظر امکانی نے اپنے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے۔ آزاد شاعری تک تو شاعری کا تصوّر کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس میں بحور کے ارکان کا خلاقانہ استعمال شعری آہنگ اور موسیقیت ممکن ہے۔ اردو قارئین کے معتد بہ حصّے میں آزاد شاعری کو پسند بھی کیا جاتا ہے۔ نثری شاعری اس بھی آگے کا قدم ہے۔ "پگھلا نیلم" کے دیباچہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جناب سجاد ظہیر کے بعض احباب ایسی تخلیقات کو "نظم" کہنے کی بجائے "شعری نثر" یا "نثری شعر" کہنے کے حق میں تھے۔ یہ صحیح ہے کہ "شعریت" نظم میں بھی ممکن ہے اور نثر میں بھی۔ لیکن نثر بہرکیف نثر ہے۔ اگر نثری جملوں کو نظم کی صورت میں کاغذ پر پھیلا دینے سے شاعری وجود میں آسکتی ہے تو نثر اور نظم (شاعری) میں کیا امتیاز رہے گا۔ اور پھر نثر اور نثری شاعری کا امتیاز بھی ایک معمّہ بن جائے گا۔ اس بات کا کون فیصلہ کرے گا کہ یہ نثر ہے اور یہ نثری شاعری۔ کسی نثری ٹکڑے کو شاعرانہ لطافت، شعری آہنگ، غنائیت اور شعریت کی بنا پر نثری نظم یا نثری شاعری کہنے کی بجائے "نثرِ لطیف" یا "ادبِ لطیف" کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔

اگر ایک لمحے کے لیے جذبے کی لطافت و صداقت، فکر کی فسوں کاری، زبان کی رعنائی و زیبائی، شعری آہنگ اور خلوص کی فراوانی کو شاعری کی بنیاد مان لیا جائے تو مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط، نیاز فتح پوری، پروفیسر رشید احمد صدیقی اور پروفیسر آل احمد سرور کے مضامین اور کرشن چندر کے افسانوں کو شاعری تسلیم کرنے میں کیا قباحت ہے۔ ان حضرات کی نثری تخلیقات اکثر شعریت کی دولت سے مالا مال ہیں۔ یہاں نیاز فتح پوری کے مضامین سے دو اقتباس پیش کرنا غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

آہ! کون جانتا ہے / کہ اگر حسن کی کوئی زبان ہے / تو صرف موسیقی / اور ایک حسین عورت کی ہر حرکت / ایک نطقِ موسیقی ہے / جس کا ساز / نسائیت اور صرف نسائیت ہے / وہ ہاتھ ہلاتی ہے / گویا ہوا میں / نقشِ ترنم بنا دیتی ہے / چلتی ہے اور پاؤں سے / زمین پر نشانِ موسیقی چھوڑ جاتی ہے۔ (مضمون بعنوان "چند دن بمبئی میں")

تو ریشمی ساری میں / اپنے نازک جسم کو لپیٹ / اور اس کے تناسب کو نمایاں کر / لیکن ہر ہاتھ کو / وہاں تک / پہنچنے کی اجازت نہ دے / کہ مس کی تبدیلیاں / نزاکت کے لیے جراحت ہیں / تو اپنے لب ہائے میگوں سے / شرابِ تبسم چھلکا کر / ہر شخص کو / یہ شراب نہ چکھنے دے / کہ ذائقہ کا رد و بدل / اس صہبا کے لیے / کیف شکن ہے۔ (مضمون بعنوان "ایک رقاصہ سے") اب فیصلہ کیجیے کہ اگر نثری شاعری کوئی صنفِ اظہار ہے تو ان نثری اقتباسات کو شاعری کیوں نہ تسلیم کیا جائے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ نثر کو نثر ہی کہا جائے البتہ جس نثر میں شاعرانہ لطافت کی کارفرمائی ہو اسے "نثرِ لطیف" یا "ادبِ لطیف" کے نام سے تعبیر کیا جا سکتا ہے "نثر" کے ساتھ "شاعری" کا ہم رشتہ ... ڈاکٹر ...

نظمیں

حفیظ آتش امروہوی

گیلا کاغذ

کالے بادل
کل سے اب تک برس رہے ہیں
اور وہ لڑکا
جو کاغذ کے گندے ٹکڑے
اِدھر اُدھر چنتا پھرتا ہے
پیٹ کی خاطر
سڑکوں پر گھوما کرتا ہے
شام کو ننگے فٹ پاتھوں پر
سو جاتا ہے
رِستی ہوئی لاری کے نیچے
سکڑا ہوا اکڑوں بیٹھا ہے
اور کاغذ کے گیلے ٹکڑے
مایوسی سے دیکھ رہا ہے

●●

معصوم نظر

(۱)

تمہارے لیے
اب یہ موسم نیا ہے
کہاں تک یوں ہی چُپ پڑے تم رہوگے
ذرا اُس بلندی کو دیکھو جہاں سے
لڑھکتے ہوئے تم کہاں آ گئے ہو
اُٹھو،
اُن پہاڑوں سے جاکر کہو اب
ذرا تم ہٹو
ہم کو جانا ہے آگے

(۲)

نہ جانے ان کو کیا ہوا
کہ دفعتہً وہ ڈر گئے
وہ حسرتوں کے پھول بھی
نہ جانے سب کدھر گئے
شجر شجر سے ڈالیاں
وہ زرد زرد پتیاں
بکھر گئی ہیں راہ میں
کبوتروں کی ٹولیاں
اُڑی ہیں آسمان میں
ہوا چلی ہے چار سو
ہوا چلی ہے چار سو

●●

○ عبدالرحیم میکنیکل ورکس، مولانا شوکت علی روڈ، بمبئی۔ ۸ ○ لال پورہ۔ ڈونگر پور۔ ۳۱۴۰۰۱

غزل

اعجاز تالش

میں نے اُس کی آنکھ میں کل ہی اپنا سایا دیکھا تھا
آج مگر محسوس ہوا وہ میری آنکھ کا دھوکا تھا

خاموشی تھی ویرانی تھی اک گہرا سناٹا تھا
خوابوں کا آباد جزیرہ تم بن سونا سونا تھا

لوگ ابھی تک پہنے ہیں اُس بوسیدہ پیراہن کو
جس کو برسوں پہلے میں نے اپنے تن سے پھینکا تھا

آج نہ جانے بات ہوئی کیا گھور اندھیرا ہے دل میں
کل تو اُن کی یاد کا سورج ان پلکوں پر چمکا تھا

رک جاتے ہیں آج بھی میرے پیر یہاں کیوں آخر؟
شاید یہ وہ موڑ ہے جس پر کوئی مجھ سے بچھڑا تھا

یہ جتنے قاتل ہیں میرے یہ جتنے دشمن تالشؔ
یہ سب میرے یار تھے پہلے ان سے گہرا رشتہ تھا

○ ناگور، راجستھان

نجم عثمانی

داستانِ درد کرتا ہے رقم میرا قلم
خونِ دل سے ہر گھڑی ہے تازہ دم میرا قلم

مانتا ہوں آج اس کا سر قلم کر دیں گے لوگ
دورِ آئندہ میں پھر لے گا جنم میرا قلم

اس کو سچ کہنے کی جانے کیسے عادت ہو گئی
سہہ رہا ہے اس لیے لاکھوں ستم میرا قلم

وقت رُک جاتا ہے سانسیں روک لیتی ہے زمیں
جب بھی کاغذ پر اٹھاتا ہے قدم میرا قلم

منعکس ہیں نوک پر اس کی زمین و آسماں
جامِ جم ہے، جامِ جم ہے، جامِ جم، میرا قلم

نوچ لے گا دیکھنا مکروہ چہروں کے نقاب
توڑ دے گا تاجِ زریں کا بھرم میرا قلم

کون جانے کس لیے ہیں اس کی آنکھیں اشکبار
سر سے پا تک بن گیا تصویرِ غم میرا قلم

نجمؔ چیخ اٹھتے ہیں کیوں تنقید کے جھوٹے خدا
جب بھی لفظوں کے بناتا ہے صنم میرا قلم

○ معرفت سید ابوالقاسم سی ایم پی الف آفس
وجئے نگر (بہار)

ظفر اناوی

جس کو غم خوار سمجھتا تھا، ستمگر نکلا
جانے کس طرح سے میں جان بچا کر نکلا

ریت نے ڈھک دیا جب میرے بدن کو یکسر
تب مری پیاس بجھانے کو سمندر نکلا

چاندنی رات کے افسوں نے سُلایا تھا مجھے
جب کھلی آنکھ تو سورج مرے سر پر نکلا

بسکہ اس شہر کی تعمیر میں تھا ہاتھ مرا
ہر عمارت سے مرے نام کا پتھر نکلا

میں نے جس لفظ کو سینے میں چھپایا تھا بہت
آج وہ لفظ مری آنکھ سے باہر نکلا

سہل سمجھا تھا محبت کو ظفرؔ بھی، لیکن
ہو گیا خاک، جب اس راہ سے ہو کر نکلا

○ اناؤ، یو۔پی

تبصرے

سازِ مغرب (حصّہ دوم)

مرتب: حسن الدین احمد۔ ناشر: ولا اکیڈیمی، عزیز باغ سلطان پورہ۔ حیدرآباد ۲۴... ۵۰۰ ۔ قیمت بیس روپے

حسن الدین احمد صاحب نے انگریزی نظموں کے منظوم اردو ترجموں کو کتابی صورت میں مدون کرکے شائع کرنے کا جو سلسلہ شروع کیا ہے، یہ اس کی دوسری کڑی ہے۔ اس کے پہلے حصّے پر تحریک میں تبصرہ شائع ہو چکا ہے۔ پہلے حصّے میں ۳۳ شاعروں کی ۴۲ نظمیں شامل تھیں۔ اس دوسرے حصّے میں ۴۵ شاعروں کی ۸۰ نظمیں شامل کی گئی ہیں۔ جیسا کہ خود فاضل مرتب نے اپنے دیباچے میں کہا ہے شاعری کا شاعری میں ترجمہ بہت مشکل کام ہے۔ ہر زبان اپنا ایک مخصوص تہذیبی پس منظر اور ادبی مزاج رکھتی ہے جو لفظی ترجمے کے ذریعے کسی دوسری زبان میں منتقل نہیں کیا جا سکتا۔ اردو میں انگریزی سے کیے جانے والے اکثر منظوم ترجموں کی یہی کمزوری ہے اور ان میں کم ہی ایسے ہیں جنھیں ادبی حسن کا حامل کہا جا سکتا ہے لیکن ان کی یہ افادیت مسلّم ہے کہ ان کے ذریعے نئی تشبیہوں اور استعاروں اور اسلوب و بیان کے نئے نئے پیرایوں سے اردو والے آشنا ہوئے اور کچھ ایسے موضوعات بھی سامنے آئے جن تک ان کی نظر رسا نہیں تھی۔ کامیاب ترجمے بالعموم وہ ہیں جن میں ترجمے سے زیادہ ترجمانی سے کام لیا گیا ہے۔

کتاب کا دیباچہ علمی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت کا حامل ہے حسن الدین احمد صاحب نے ترجمے کے فن، اس کی مشکلات اور اس کی کامیابی یا ناکامی کی وجوہ سے تفصیلی بحث کی ہے اور ترجمے کی مختلف اقسام کے تعین اور ان کی تعریف کے ساتھ ساتھ اردو میں منظوم تراجم کی پوری تاریخ بھی بیان کر دی ہے۔ اس ضمن میں ان تمام شعرا کا ذکر آ گیا ہے جو اس فن میں امتیاز رکھتے ہیں انھوں نے ترجمے کی ضرورت اور اس کی اہمیت بھی واضح کی ہے اور ان کسوٹیوں کی نشاندہی بھی جن پر مختلف اقسام کے ترجموں کو پرکھا جانا چاہئے۔

پہلے حصّہ میں یہ اہتمام کیا گیا تھا کہ جہاں تک ممکن ہو اصل نظموں کے متن بھی دے دیے جائیں۔ اس حصّے میں یہ اہتمام جس کی افادیت ظاہر ہے نظر نہیں آتا البتہ اصل شاعروں کے نام ضرور دیے گئے ہیں۔ ترجموں کے نیچے ان رسالوں کے نام درج ہیں جن سے یہ دستیاب ہوئے ہیں لیکن بعض نظمیں اس حوالے کے بغیر بھی ہیں اور اس کی وجہ ظاہر نہیں کی گئی ہے۔ کتابت کی غلطیاں جگہ جگہ ملتی ہیں جن کے نتیجے میں مصرعے ناموزوں ہو گئے ہیں یا مہمل۔ کتابت کی غلطیوں کا پہلے حصّے میں بھی یہی حال تھا۔ ابھی اس سلسلے کی کچھ اور جلدیں بھی شائع ہوئی ہیں ان کی اشاعت کے دوران اس طرف کچھ زیادہ توجہ دی جا سکے تو قاری کو اس کوفت سے بچایا جا سکتا ہے۔

محمود سعیدی

فکر نامہ

مصنف اور ناشر: فکر تونسوی۔ تقسیم کار: انجمن ترقی اردو (ہند) راؤز ایونیو نئی دہلی ۔ قیمت سولہ روپے پچاس پیسے

ایسے اہلِ قلم کتنے ہوں گے جن کی زود نویسی مسلّم ہو جو بسیار نویس بھی ہوں بلکہ بسیار نویسی پر مامور کر دیے گئے ہوں اور پھر بھی ان کا قلم تازہ کاری کے جوہر دکھا رہا ہو

فکر تونسوی اردو کے ایک ایسے ہی فنکار ہیں۔ برسوں سے لکھ رہے ہیں اور مسلسل لکھ رہے ہیں۔ ایک اخبار کا ٹکا ہیہ کالم نہیں ہر روز لکھنا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کئی رسالے ہیں جہاں قسط وار ان کی تحریریں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن ان کی کوئی نئی تحریر ان کی کسی پرانی تحریر کی یاد نہیں دلاتی کہیں یہ گمان نہیں گزرتا کہ وہ خود کو دہرا رہے ہیں۔ ان کی اس ذہنی تازگی کا سرچشمہ کہاں ہے؟ جو لوگ ان کی تحریریں پڑھتے رہے ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ زندگی کو فکر صاحب نے ایک کھلی کتاب کی طرح دیکھا ہے۔ وہ کسی ذہنی تحفظ یا تعصب کے بغیر اس کتاب کے ورق الٹتے جا رہے ہیں اور جو کچھ انہوں نے لکھا ہے اسی مشاہدے اور مطالعے کا حاصل ہے۔ جب زندگی پیہم رواں ہردم جواں ہے تو ان کے قلم کی رفتار کیوں رکے اور ان کے ذہنی قویٰ پر بڑھاپا کیوں غالب آتے ؟

فکر تونسوی نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعر کی حیثیت سے کیا تھا آگے چل کر انہوں نے طنز نگاری کو اپنا فن ٹھہرایا۔ لیکن غور سے دیکھا جاتے تو ان کی طنزیہ تحریروں سے وہ شاعر صاف جھانکتا نظر آئے گا جسے وہ خود بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں لیکن جو اب بھی ان کا تعاقب کر رہا ہے۔ ان کے اسلوب میں جو معصومانہ سادگی ہے اور کبھی کبھی ان کے قلم سے سیاہی کی جگہ جو آنسو ٹپکنے لگتے ہیں، اسے اسی شاعر کی دین سمجھنا چاہئے، ان کے مزاج میں وہ سفاکی بہت کم ہے جو اکثر طنز نگاروں کے ہاں نظر آتے گی۔ تصویر کے بدنما پہلوؤں کے ساتھ ساتھ ان خوشنما رنگوں پر بھی ان کی نظر رہتی ہے جو اپنی چمک دمک کھو کر بھی حسن سے کلیتہً عاری نہیں ہیں۔ بدصورتی میں بھی خوبصورتی کی موجودگی کا یہ احساس جو انہیں تلخ کام نہیں ہونے دیتا، ان کے اندر نفرت اور حقارت کے جذبے کو بیدار نہیں کرتا اور اپنے ہدف کے لیئے بھی ان کے دل میں نرم گوشے پیدا کر دیتا ہے، ان کے اسی شاعرانہ رویے کی علامت ہے

فکر تونسوی ترقی پسندوں کی صفوں میں رہے ہیں لیکن اپنی تحریروں میں وہ ان نظریاتی حصار بندیوں سے دور ہیں جو اصطلاحی ترقی پسندی کی پہچان ہیں۔ ان کے طنز کا ہدف وہ سماجی نظام بھی ہیں جو اپنی بوسیدگی کے باوجود اپنی زندگی کو طول دیتے پھرتے ہیں اور ایسے نئے معاشی نظریات بھی جو اپنی کم عمری ہی میں عبرتناک انجام کو پہنچ گئے۔ ان کے طنز کا نشانہ خود ان کی ذات بھی ہے اس صورت میں جو بھی ان کی زد میں آ جائے، خواہ وہ کوئی فرد ہو یا جماعت اس کا حرف شکایت زبان پر لانا بیجا ہوگا۔

فکر صاحب سے ایک شکایت ضرور کی جا سکتی ہے کہ کتاب کے لیے کاغذ انہوں نے جتنا بڑھیا استعمال کیا کتابت اتنی ہی گھٹیا قبول کر لی۔

——— مخمور سعیدی

نایافت:

مصنف حامدی کاشمیری۔ ناشر، ادارۂ ادب ۳۹۶ جواہر نگر۔ سری نگر۔ کشمیر قیمت : سولہ روپے

ڈاکٹر حامدی کاشمیری سے میرا پہلا تعارف انکے افسانوں کے ذریعے ہوا تھا۔ پھر ان کے کچھ ناول بھی شائع ہوئے۔ یہ ان کی، اور میری بھی ادبی نوعمری کے دن تھے۔ ان کا قلم کاغذ پر شوخ رومانی رنگوں کی بارش کرتا ہوا چلتا تھا لیکن دھیرے دھیرے یہ رنگ ماند پڑتے گئے اور عصری آگہی کی تیز دھوپ ان کے چاروں طرف پھیلتی گئی۔ اب وہ اس دھوپ میں تنہا کھڑے ایک نئے پیرایۂ اظہار کی تلاش میں ہیں ”نایافت“ کو جو ان کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔ ان کی اس تلاش کا پہلا ثمرہ کہا جا سکتا ہے

حامدی کاشمیری کو اب اس عصری صورتِ حال کا پورا احساس و ادراک ہے جو ایک طرف انسان کی مادی فتوحات تو دوسری طرف اس کے اخلاقی زوال کا آئینہ ہے سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی جس نے قدرت کی تسخیر کے بے شمار راستے کھول دیے ہیں اور طاقت کے ان گنت مخفی خزانوں تک انسانی رسائی کو ممکن بنا دیا ہے روحانی سطح پر فرد کو زیادہ سے زیادہ بے بس اور کمزور بھی کرتی جا رہی ہے۔ فرد کی بے بسی اور بھری دنیا میں اس کے تنہا اور بے آسرا ہو کر رہ جانے کے اس احساس کی اپنے ہمعصروں کے ہاں نشاندہی اور نئی اردو شاعری پر

اس کے اثرات کی وضاحت وہ اپنی تنقیدی کتاب ،، نئی حسیت اور عصری اردو شاعری ،، میں کر چکے ہیں۔ خود وہ بھی اس احساس کی بھرپور گرفت میں ہیں۔ اس کا اندازہ "نایافت ،، کے مطالعے سے ہو جاتا ہے۔

کتاب کے دیباچے میں حامدی صاحب نے اپنے شعری معتقدات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے: "معاصر ادبی رویے کی تشکیل میں نئی حسیت کی ہمہ گیر کارفرمائی کے باوجود یہ حقیقت میرے نزدیک مسلّم ہے کہ اس کا شعری عمل سے براہ راست کوئی تعلق نہیں۔ شعر عصری آگہی کا معلوماتی اور قابلِ فہم منظوم بیان نہیں... شعر میں عصری حسیت شاعر کی شخصیت کے مختلف داخلی، حرکی اور ترکیبی عناصر سے مربوط و تحلیل ہو کر حد درجہ شخصی تجربے میں تشکل ہوتی ہے... میرا تخلیقی سفر اس نقطے سے شروع ہوتا ہے۔ جہاں میں موجود اور قابلِ شناخت معروضی حقیقت سے انقطاع کرتا ہوں۔ یہ سیّال پیکر میرے داخلی وجود کا ناگزیر حصّہ ہیں۔ انکی دریافت و تجسیم کے عمل میں میں دراصل اپنے وجود کی سیاحت کرتا ہوں"

دروں بینی کا یہ انداز اور اپنے داخلی محسوسات کے وسیلے سے خارجی حقائق کی شناخت کا یہ رویہ نئے شاعروں میں مشترک ہے۔ اس کی وجہ سے جدید شاعروں پر یہ الزام بھی لگتا رہا ہے کہ وہ آواز میں آواز ملا کر ایک ہی راگ الاپ رہے ہیں (اس کی طرف حامدی صاحب نے بھی انگشت نمائی کی ہے) لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہر شاعر کی داخلی دنیا دوسرے سے مختلف ہوا کرتی ہے اس الزام کے مستحق اگر تھے تو ترقی پسند شاعر تھے جو چند طے شدہ مفروضوں کو منظوم صورت میں پیش کر دیا کرتے تھے۔ جدید شاعری میں آوازوں کا جو تنوع نظر آتا ہے۔ اس کی ایک تازہ مثال کے طور پر "نایافت ،، کو پیش کیا جا سکتا ہے جس کے اچھے اشعار میں کسی ہمعصر شاعر کی صدائے بازگشت آپ کو سنائی نہ دے گی، یہ چند شعر دیکھیے اور حامدی کاشمیری کے الگ تھلگ لہجے کا لطف لیجے:

نکل کے کمرے سے ہم کھل کے سانس لیں تو کہاں
غبار اُڑاتی ہوا۔ گرد گرد موسم ہے

گلشن حشر گہ آواز پھول کی خاموشی تقریر
ساگر ساگر کالی چپ ساحل ساحل ہے کہرام

آکاش سے اتر کے وہ دریا میں رات بھر۔ لہروں کے ساتھ ابھرتا رہا ڈوبتا رہا

شاخ پھولوں سے جھکنے والی تھی۔ دل میں خنجر اترنے والا تھا

نظموں میں بھی حامدی کاشمیری اپنی جداگانہ پہچان کرانے میں کامیاب ہیں مگر ان کی بعض نظموں کے بارے میں میرا تاثر یہ ہے کہ وہ اپنے اختتام تک پہنچتے پہنچتے بے اثر ہو گئی ہیں اور اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ آخری مصرعوں میں غیر ضروری وضاحت در آئی ہے اور بعض جگہوں پر شاعر نے قطعیت کے ساتھ حکم لگانے کی بھی کوشش کی ہے اور اس طرح نظم کا معنوی افق سکڑ کر رہ گیا ہے۔ "گورکن ،، "خواب ،، اور کئی دوسری نظمیں اسی ذیل میں آتی ہیں جبکہ "چنار ،، اور کچھ دوسری نظمیں بھرپور تاثر کی حامل ہیں۔

بعض جگہ اوزان کی گڑبڑ ہے۔ نظموں میں شاید آج کا قاری اسے گوارا بھی کر لے لیکن غزل کا کوئی مصرعہ ناموزوں ہو تو بہت کھٹکتا ہے مثلاً یہ مصرعہ جس میں سنگسار کا لفظ "سنسار" کے وزن پر پڑھا جاتا ہے "وہ کس جرم سنگسار کراتا ہے مجھے" اس سے بے توجہی اور کم احتیاطی کا جو رویہ جھلکتا ہے میں حامدی صاحب سے اس کا متوقع نہیں تھا۔

—— مخمور سعیدی

ریاست ٹونک اور اردو شاعری

مصنف: مختار شمیم ناشر: نسیم بک ڈپو۔ لاٹوش روڈ۔ لکھنؤ
قیمت: پانچ روپے

ٹونک۔ راجپوتانے کی ایک چھوٹی سی مسلم ریاست تھی جو ۱۸۱۷ء میں قائم ہوئی۔ اس کے بانی ایک مہم جو سپہ سالار امیر خاں تھے۔ ریاست کے قیام سے ملک کی آزادی کے بعد راجستھان کے نوتشکیل صوبے میں اس کے انضمام تک وہاں امیر خاں کا خاندان ہی حکمراں رہا۔ امیر خاں سید احمد شہید بریلوی سے قریبی روابط رکھتے تھے اس لیے مزاج پر مذہبیت غالب تھی۔ دوسری طرف دہلی کے شاہی خاندان سے بھی ان کے روابط

نے جو اپنے زوال کی آخری منزل میں بھی کئی اعلیٰ تہذیبی قدروں کا پاسدار تھا۔ ریاست کے سبھی فرماں رواؤں کو ندہب سے جو تعلق خاطر رہا اور ساتھ ہی انہوں نے علم و ادب کی جس فراخدلی سے سرپرستی کی۔ اسے اسی پس منظر میں دیکھا جانا چاہیے۔

ریاست میں شعر و ادب کا چرچا امیر خاں کے دور ہی میں شروع ہو گیا تھا لیکن خود ان کی توجہ ریاست کے انتظامی امور پر زیادہ مرکوز رہی۔ ان کے جانشین نواب وزیرالدولہ کے زمانے میں یہ چرچے بڑھے۔ نواب وزیرالدولہ غالب اور مومن جیسے شاعروں کے ممدوح رہے۔ ان کے بعد نواب محمد علی خاں نواب ابراہیم علی خاں اور نواب سعادت علی خاں با اختیار حکمراں ہوتے۔ ان میں سے اوّالذکر نے ریاست میں مطبع قائم کیا اور ایک بہت بڑا کتب خانہ بھی۔ مطبع سے بہت سی علمی کتابیں شائع ہوئیں جن میں سے کچھ خود نواب صاحب کی تصنیف تھیں۔ آخرالذکر دونوں نواب شعر و ادب کی قدردانی کے ساتھ ساتھ شعرگوئی کا بھی ذوق رکھتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کے عہد میں بیرونی مشاہیر ریاست میں برابر آتے جاتے رہے، اور خود ٹونک کی سرزمین نے کئی باکمال شاعر اور ادیب پیدا کیے۔ نواب فاروق علی خاں اور نواب اسمٰعیل علی خاں ریاست کے انضمام کے بعد مسند نشیں ہوئے لیکن اپنے بزرگوں کی روایات کو انہوں نے بھی قائم رکھا۔ بیرونی شاعروں کو بھی ان سے کچھ نہ کچھ فیض پہنچتا رہا اور ان کی حوصلہ افزائی نے مقامی شاعروں کی صلاحیتوں کو بھی جلا بخشی۔

زیرِ نظر کتاب میں مختار شمیم صاحب نے اس اجمال کی تفصیل پیش کی ہے۔ کتاب پانچ ابواب میں منقسم ہے اور ہر باب کچھ ذیلی عنوانات پر مبنی ہے۔ پہلے باب میں ریاست کی مختصر تاریخ اور ساتوں نوابین کا تذکرہ ہے۔ دوسرے باب میں ریاست کے تہذیبی اور علمی ماحول کا تعارف ہے مدرسوں کتب خانوں۔ ادبی انجمنوں اور اخبارات و رسائل وغیرہ کا ذکر ہے۔ تیسرے باب میں ریاست میں اردو شاعری کی ابتدا سے بحث کی گئی ہے اور اس ابتدائی دور کے کچھ اہم شاعروں کے مختصر حالات دیئے گئے ہیں۔ چوتھے باب کا عنوان ہے "ٹونک میں اردو شاعری کا فروغ"۔ یہ نواب ابراہیم علی خاں کے دور کی معاشرتی فضا اور اس زمانے کے منتخب شعرا کے احوال پر مبنی ہے۔ پانچویں اور آخری باب میں اس نئی ذہنی بیداری پر روشنی ڈالی گئی ہے جو نواب سعادت علی خاں کے دور سے تعلق رکھتی ہے۔ اختر شیرانی بسمل سعیدی اور ان کے معاصرین نے اسی عہد میں شعور کی آنکھ کھولی۔ یہ باب موجودہ زمانے تک کا احاطہ کرتا ہے اور ان شاعروں سے بھی متعارف کراتا ہے جو آزادی کے بعد سامنے آئے ہیں

یہ کہنا تو درست نہ ہوگا کہ مختار شمیم صاحب نے اپنی اس کتاب میں ان تمام حالات و واقعات اور ان تمام قابلِ ذکر شخصیات کا احاطہ کر لیا ہے جن سے اس کم عمر ریاست کی ثقافتی۔ علمی اور ادبی تاریخ عبارت ہے لیکن یہ اس سلسلے کی پہلی باقاعدہ کوشش ہے اور اس نے وہ بنیاد فراہم کر دی ہے جس کے سہارے یہ کام صحیح خطوط پر آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔

ایک جگہ داغ کے سفرِ ٹونک کا ذکر ہے۔ میرے خیال میں یہ کسی غلط روایت پر مبنی ہے داغ ٹونک کبھی نہیں گئے مرحوم جوہر ٹونکی کے علاوہ ور دسعیدی اور زمانۂ حال کے شاعروں میں۔ جو ٹونک ہی میں موجود ہیں زین الساجدین بزمی اور فاخر اعجازی کا بھی الگ ذکر ہونا چاہیئے تھا۔ قمر ہاشمی کا ذکر بھی جو تقسیم کے وقت ترک وطن کر کے پاکستان چلے گئے تھے، چھوٹ گیا ہے۔ بسمل سعیدی صاحب کا نام محمد عیسٰی خان لکھا گیا ہے جو صحیح نہیں۔ ان کا نام سید عیسٰی تھا اس طرح کے کچھ اور تسامحات بھی ہیں مگر ان سے کتاب کی اصل قدر و قیمت کم نہیں ہوتی جو یہ ہے کہ علمی اور ادبی تاریخ کا ایک اہم باب جو بے توجہی کا شکار تھا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نقش و نگار طاقِ نسیاں بن کر آنکھوں سے اوجھل ہونا جا رہا تھا، اختصار کے ساتھ ہی سہی ان صفحات میں محفوظ ہو گیا ہے

——— مخمور سعیدی

پُرانوں کی کہانیاں

مرتب : پروفیسر گوپی چند نارنگ
ناشر : نیشنل بک ٹرسٹ، نئی دہلی

نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا نے ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی یاد میں کتابوں کی ایک سیریز کی اشاعت شروع کی ہے جس میں طلبہ کے لیے سہل اور عام فہم انداز میں لکھی ہوئی کتابیں شائع کی جاتی ہیں "پرانوں کی کہانیاں" اسی سیریز کے تحت چھاپی گئی ہے لیکن اس میں طلبہ کے ساتھ عام قارئین کی دلچسپی کی صورت بھی نکل آئی ہے دراصل اردو کے ناقدین اور فنکار عرصے سے اس کمی کو محسوس کرتے تھے کہ اردو والوں کے سامنے ایسی کوئی مائیتھولاجی نہیں ہے جیسی کہ مثال کے طور پر روم مصر یا

یونان والوں کے ہاں تھی اور جس سے وہاں کے ادیبوں اور فنکاروں نے تخلیق ادب میں بھرپور استفادہ کیا ہے یہ صحیح ہے کہ اسلامی طرزِ فکر کے تحت ضنمیات کی گنجائش نہیں لیکن اردو نے ہند آریائی تہذیب سے جو اکتساب کیا اس کو ملحوظ رکھا جائے تو یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ ہمارا ادیب ہندوستانی اساطیر کے ذخیرے سے کماحقہ مستفیض نہیں ہوا۔ بیشک کچھ فنکاروں نے قدیم داستانوں مثلاً

الف لیلہ اور طلسم ہوشربا وغیرہ سے اپنے ہاں اساطیری رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی مگر بات زیادہ بنی نہیں اس کا ایک اہم سبب یہ رہا کہ اردو والوں کی دسترس براہ راست قدیم ترین ہندوستانی اساطیر تک نہیں تھی سنسکرت کی کچھ کتابوں کے ترجمے اردو میں دستیاب تھے لیکن ان کی نوعیت ادبی کم مذہبی زیادہ تھی۔ ادھر گزشتہ دو دہائیوں سے اردو ادب میں جدیدیت کا جو رجحان پیدا ہوا ہے اس کے تحت فنکاروں نے تخلیقات میں مقامی عناصر اور ہندوستانی دیومالا سے زیادہ سے زیادہ اثرات قبول کیے ہیں۔ ایسے میں پروفیسر گوپی چند

نارنگ کی زیر تبصرہ کتاب کی اشاعت سے اردو والوں کی ایک بڑی ضرورت کی تکمیل ہو گئی ہے پرانوں کی کہانیوں کے ذریعے ہندوستانی اساطیر کے قدیم ترین آخذ تک اردو والوں کی رسائی ہو جائے گی اور توقع کی جا سکتی ہے کہ اس بظاہر اوسط درجہ کی ضخامت رکھنے والی کتاب کے بڑے دوررس نتائج اردو ادب پر مرتسم ہونگے کتاب میں پرانوں کی تقریباً تمام اہم کہانیاں یکجا کر دی گئی ہیں۔ چند ایک کے عنوانات ہیں۔ "سمندر منتھن" "دستیہ دان ساوتری" "شکنتلا" "لاکھ کا گھر"۔ "راجا ہرش چندر" "پرہلا دبھگت" پروفیسر نارنگ نے کتاب کے مقدمے میں پرانوں کی اہمیت اور ان کی نوعیت کے بارے میں بڑی مفید بحث کی ہے۔

کتاب مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے زیر اہتمام آفسیٹ کے ذریعے شائع ہوئی ہے۔ قیمت آٹھ روپے۔

——— مظفر حنفی۔

تنویر

مرتبین : مسعود ہادی، ظفر احمد ظفر اور شیخ محمد علی

راز۔ ناشر : تنویر پبلیشنز۔ جے/۱۲ بلاک ای۔ قاضی نذرالاسلام روڈ۔ محمد پور، ڈھاکہ۔ قیمت : پانچ ٹاکا

تقسیم کے فوراً بعد ہندوستان میں اردو جس بدگمانی اور نفرت کا شکار رہی تھی اس سے کہیں زیادہ نفرت اور تشدد کا ہدف یہ بنگلہ دیش کے قیام کے بعد وہاں بنی۔ ہندوستان میں اب حالات بدلتے جا رہے ہیں اور اردو دشمنی کی عام لہر کمزور پڑ گئی ہے لیکن بنگلہ دیش کے بارے میں شاید یہ بات زیادہ وثوق سے نہیں کہی جا سکتی۔ اس کی

ں وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ زبان کے مسئلے پر جو تلخی اور کشیدگی
دہاں پیدا ہوئی تھی اس کی یادیں ابھی نسبتاً تازہ
ہیں۔ ان حالات میں یہ جان کر اور دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ
ہاں اردو زبان و ادب کے نام لیوا اب بھی موجود ہیں
نہ صرف اس زبان کی سخت جانی پر بلکہ اسے اپنی زبان
ننے والوں کے جذبۂ فدائیت پر بھی ایمان لانا پڑتا ہے

"تنویر" ایک ادبی جریدہ ہے جو بنگلہ دیش کی
راجدھانی سے شائع ہوا ہے اپنے مندرجات کے معیار
در ترتیب و تدوین کی خوبی کے لحاظ سے یہ کسی بھی اچھے
رسالے کے مقابل رکھا جا سکتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ
ناشرین کو ان دشواریوں اور پریشانیوں کا احساس
ہو جو ان کی راہ میں حائل ہیں۔ احمد الیاس کا مضمون
رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف" صورت حال
کے حقیقت پسندانہ تجزیہ پر مبنی ہے۔ وہ بجا طور پر اس
اندیشے کا اظہار کرتے ہیں کہ اگر آنے والی نسلیں اردو سے
نابلد رہیں تو یہ ساری ادبی سرگرمیاں جن کی دوبارہ تنظیم
کی کوشش کی جا رہی ہے، بے نتیجہ ثابت ہوں گی لیکن
اصل مسئلے سے یہ باخبری کیا عجب کہ بنگلہ دیش میں اردو
کے مستقبل کے لیے نیک شگون ثابت ہو۔ مضمون نگار
کی یہ رائے پوری طرح قابل عمل ہے کہ بحالات موجودہ یہ
بنیادی مسئلہ ترجیحی توجہ کا مستحق ہے۔

"تنویر" یہ خوش آئند اطلاع بھی فراہم کرتا ہے کہ
بنگلہ دیش کے اردو دوست بنگالی زبان و ادب کے لیے
اپنے دلوں میں کوئی تعصب نہیں رکھتے۔ بنگلہ شعر و ادب
کے جو تراجم اس میں شامل کیے گئے ہیں وہ اس کا واضح
ثبوت ہیں۔ قاضی نذر الاسلام اور جسیم الدین کی نظموں
کے تراجم کے ساتھ ان کی تصویریں بھی دی گئی ہیں امید
کی جا سکتی ہے کہ یہ بے تعصبی دوسری طرف بھی خوشگوار
ردعمل پیدا کرے۔

——— محمود سعیدی

دھرتی کی خوشبو

مصنف:۔ نوبہار صابر قیمت پندرہ روپے
ملنے کا پتہ: انجمن ترقی اردو (ہند) مالیر کوٹلہ

ہریانہ سرکار کے مالی اشتراک سے شائع ہونے
والا زیر نظر مجموعۂ کلام جناب نوبہار صابر کی چھیاسٹھ
نظموں اور آٹھ قطعات پر مشتمل ہے ان میں پانچ وہ
نظمیں بھی شامل ہیں جنھیں بقول مصنف ۱۹۴۲ء میں حکومت
برطانیہ نے ضبط کر لیا تھا۔ مجموعہ چار حصوں میں تقسیم ہے
پہلا حصہ "روداد شب" ہے اس میں آزادی سے قبل
لکھی ہوئی جذبۂ حریت کی حامل بیس لظمیں شامل ہیں
دوسرا حصہ "حدیث سحر" حصول آزادی کے بعد لکھی
ہوئی انتیس نظموں کو محیط ہے اس حصہ کی نظمیں مسرت
افزا اور کیف پرور جذبات و احساسات کی حامل ہیں
اور ان میں ملک و قوم کو مخلصانہ مشورے بھی دیے گئے
ہیں نیز وطن کے عظیم سپوتوں کو خراج عقیدت پیش کیا گیا
ہے تیسرے اور چوتھے حصہ کے عنوانات علی الترتیب
"جہاں نما" اور "نئی فضائیں نئی صدائیں" ہیں تیسرے
حصہ میں تیرہ ۱۳ آزاد نظمیں ہیں ترقی اور کامرانی کی
بشارت اور نئی راہوں کی نشاندہی ان نظموں کا
امتیازی وصف ہے چوتھے اور آخری حصہ کے تحت
صرف چار نظمیں ہیں جن میں شکست خوردہ اور غلامانہ
ذہنیت کو ختم کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔

جناب نوبہار صابر کا جذبۂ حریت اور وطن سے
ان کی محبت قابل ستائش ہے اس قبیل کا شاعر عموماً شاعری
برائے مقصد کا قائل ہوتا ہے نتیجتاً شاعری کی حیثیت
ثانوی ہو کر رہ جاتی ہے لیکن بعض عظیم فنکار مقصد و فن
کے حسین امتزاج سے شعری لطافت کو برقرار رکھنے میں
کامیاب ہو جاتے ہیں جن میں اقبال کا نام سرفہرست
ہے نوبہار صابر کے یہاں فن کا رچاؤ تو نظر نہیں آتا
مگر فن کا صاف ستھرا مذاق رکھنے والوں میں ان کا

نام بہت نمایاں ہے اسلوب پر ان کی گرفت مضبوط ہے
کلام کی روانی پختہ مشقی کا احساس دلاتی ہے۔

—— خالد محمود

دربھنگہ میں اردو

مصنف :۔ ظہیر ناشاد دربھنگوی قیمت: دس روپے
ناشر :۔ مرجبیں کتاب گھر۔ دربھنگہ۔

اردو زبان میں تحقیق کی روایت خاصی مستحکم ہے محققین کی مختلف التنوع کاوشوں سے نت نئے گوشے سامنے آتے رہے ہیں زیر نظر کتاب کے مصنف ظہیر ناشاد دربھنگوی صاحب نے اردو زبان و ادب کی تاریخ وتحقیق میں نئے امکانات کو مطمح نظر بنا کر دربھنگہ کے کام کو اردو دنیا میں روشناس کرانے کی کوشش کی ہے۔

کتاب کے پہلے حصہ میں مصنف کا اپنا تعارف ہے اس کے بعد دربھنگہ کی مختصر تاریخ، وجہ تسمیہ اور دربھنگہ کے بانی دربھنگی خاں کے حالات زندگی سے بحث کی گئی ہے پانچویں حصہ میں دربھنگہ میں اردو کے نشو و نما کا مطالعہ کرکے وہاں کے ادیبوں اور شاعروں کی ادبی حیثیت کا جائزہ لیا ہے۔ اسی ذیل میں ایک الگ باب کے ذریعہ مسلم خواتین کی تعلیم و تربیت اور ادبی رجحانات پر روشنی ڈالی ہے۔ کتاب پڑھ کر کوئی صاحب نظر مصنف کی محنت جانفشانی کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ٹائیٹل۔ کتابت۔ طباعت اور کاغذ عمدہ

—— خالد محمود

نیا ہندوستان

مصنف: اندرجیت لال قیمت آٹھ روپے۔ ملنے کا پتہ لاجپت رائے اینڈ سنز۔ اردو بازار۔ دہلی ۶

اردو میں سائنسی موضوعات پر لکھنے والوں میں اندرجیت لال اب کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ان کی زیر نظر کتاب ہندوستانی ٹیکنالوجی اور سائنس پر معلوماتی مضامین کا مجموعہ ہے۔ جو مندرجہ ذیل پانچ مقالات پر مشتمل ہے۔ سائنس کی طرف۔ ۲۔ آج کی ہندوستانی سائنس ۳۔ ہند میں نیوکلیائی سائنس۔ ۴ سبز انقلاب اور گہرا ۵۔ ہمارا پہلا مصنوعی سیارہ۔

ڈاکٹر دولت سنگھ کوٹھاری سابق صدر انڈین نیشنل اکاڈمی۔ نئی دہلی کی رائے نیا ہندوستان کی اہمیت پر روشنی ڈالتی ہے لکھتے ہیں زیر نظر کتاب سائنس و ٹیکنالوجی کی روشنی میں واقعی نئے اور آزاد ہندوستان کی ایک واضح تصویر پیش کرتی ہے۔ میرے خیال میں اردو زبان میں یہ اپنے قسم کی بے مثل کتاب ہوگی اور اردو حلقوں میں اس کا احترام کیا جائے گا

خود مصنف کا یہ قول بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ نئی بات انوکھی بات نئی معلومات پر آدمی چاہتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ نئی باتیں دراصل سائنس کی جھلکیاں ہیں ان میں آپ کو سائنس کی کیا اور کیوں کا جواب ملے گا اور عام فہم زبان میں نئی انوکھی اور معلوماتی باتیں معلوم ہوں گی۔

مجھے یقین ہے کہ کتاب قارئین میں سائنسی نظریہ پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ لطف بھی دے گی اور ان کی معلومات میں اضافہ کرے گی

—— جاوید وششٹ

ماہنامہ محکمات لکھنؤ

جمعیۃ مرکزیہ تبلیغ الاسلام کانپور کا دینی و دعوتی ماہنامہ ۔۔ سال سے مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ اپنے پڑھنے والوں کو علم اور صالح مواد دیتا ہے، انفرادی اور اجتماعی زندگیوں دین و شریعت کے غلبے کا داعی ہے اور عام بنی نوع انسان کو اسلام کی دعوت اور فکر بخشتا ہے۔

سالانہ زرِ تعاون صرف چار روپے
منیجر ماہنامہ محکمات۔ رام چرن پارک، مکارم نگر، لکھنؤ

بزمِ احباب

● ابو محمد شبلی
معرفت دانش محل، امین الدولہ پارک، لکھنؤ

صدق جدید (۱۱ نومبر ۷۷ء) میں "ایک پرانی تقریر" کے عنوان سے پنڈت کیدار ناتھ صاحب بی۔اے۔ وکیل بنارس کی ۱۹ اگست ۱۹۰۰ء کی ایک تقریر کا اقتباس شائع ہوا ہے۔ قارئین "تحریک" کی دلچسپی کے لیے اس کا دوسرا پیراگراف حاضرِ خدمت ہے:

"حضرات اس قوم کشادہ میں ہندو اور مسلمان دونوں کی عمدہ ترین باتیں مناسب وزن میں پائی جاتی ہیں اور اسی شائستگی اسلام اور فارسی دانی کی بدولت اس قوم میں ایسے بزرگ ہو گئے ہیں جیسے کہ میرے رشتہ مند آنریبل جناب پنڈت گوبردھن کول صاحب جو سپریم کورٹ کلکتہ میں پہلے ہندو جج مقرر ہوئے تھے اُن کے بعد میرے معزز فخرِ قوم آنریبل پنڈت شمبھو ناتھ صاحب جج ہائی کورٹ کلکتہ و پنڈت رام نرائن صاحب مرحوم چیف کورٹ پنجاب نے فضیلت کے جھنڈے پورب اور پچھم میں گاڑے۔ اگر حضرات فارسی اور اردو دانی یا اس کے شوق کی وجہ سے کوئی شخص مسلمان کہا جائے تو بندہ اپنے کو نہایت خوشی سے مسلمان کہنے پر تیار ہے۔ علاوہ ازیں ہندو مسلمان اور عیسائی کی تخصیص کا خیال اس وقت محض بے جا ہے کیونکہ یہ اردو زبان سب کی مادری زبان ہے۔"

روداد جلسہ حمایت اردو صفحہ ۱۴۶

● ذکاء الدین شایاں
نزد ستی پوسٹ آفس۔ بکریا۔ پیلی بھیت۔ یو۔پی

اکتوبر ۱۹۷۷ء کا "تحریک" زیرِ مطالعہ ہے نظم و نثر کے تمام شمولات میں توازن اور حسنِ انتخاب کی کارفرمائی ہے۔

ذکا صدیقی کا "گوری نامہ" رام پور کے مشہور استاد شاعر محشر عنایتی کی رباعی گوئی کے مخصوص فن کو بڑی کامیابی کے ساتھ واضح کرتا ہے۔ ذکا صدیقی نہایت متوازن اور سلجھے ہوئے ذہن کے نقاد ہیں لیکن اپنے مضمون میں انھوں نے فراق اور جوش کی "ہیروئنوں" میں جس تصنع کا ذکر کیا ہے اور اس تعلق سے محشر عنایتی کو جو فوقیت دی گئی ہے ابھی اس سے متفق نہیں ہوں۔ اوّل تو فراق اور جوش کی شاعری میں "عورت" کو "ہیروین" کہنا ہی غلط ہے۔ جوش کی تمام شاعری میں جو عورت ہمیں نظر آتی ہے وہ ہر طرح ہندوستانی اور حقیقی ہے۔ اسی طرح فراق کے یہاں بھی جس عورت کا تصور ملتا ہے اُسے مصنوعی کہنا سراسر ناانصافی ہے۔ "روپ" کی رباعیاں شاہد ہیں کہ فراق نے اس میں جس عورت کو پیش کیا ہے وہ اپنے کردار اور نفسیات کے اعتبار سے پوری طرح زندہ اور حقیقی ہے۔ اصل میں محشر عنایتی کی رباعیاں صرف "دیہاتی عورت" کے گرد گھومتی ہیں اور اسی مناسبت سے اُن کی تمام فضا اور لفظیات پر ٹھیٹ دیہاتی یا "دہقانی" رنگ جھلکتا ہے جس سے ان کی رباعیوں کا سلسلہ اردو شعر کے منفرد آہنگ و ماحول سے الگ ہو کر "لوک گیت" کی فضا سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔

● دھرم سروپ
۸ منیر کا مارگ وسنت وہار۔ نئی دہلی ۷ ۵ – ۱۱

کچھ ناخوشگوار حالات میں تقریباً ۳ مہینے دلی سے باہر رہا۔ واپسی پر تحریک کا آزادی نمبر ملا بسمل سعیدی صاحب کی آخری غزل تو زینتِ تحریک ہوئی لیکن اُن کے حکم کی آپ نے تعمیل نہیں کی آپ نے اس غزل کے اشعار میں "ملتا جلتا مقطع اُن کے تخلص سے کہہ کر شامل غزل

نہیں کہا۔ کہتے ہیں (انگریزی مثل ہے) کہ جہاں فرشتوں کے پر کٹتے ہیں وہاں سادہ لوح لوگ کودپڑتے ہیں اس غزل کو پڑھنے کے بعد اور اُن کی موت کی خبر پڑھ کر میرے منہ سے بے ساختہ یہ شعر نکلا:

خُلدِ نشاطِ روح میں بسمل بفیضِ حق
آسودۂ جہانِ الم ہو کے آگیا

پیش خدمت ہے

نثری شاعری

● احمد حسین شمس
لائن کشن گنج۔ پورنیہ۔ بہار

نومبر ۱۹۷۷ء کے تحریک میں ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید کا مضمون نظر نواز ہوا ــ " اردو میں نثری شاعری کا مستقبل" اس مضمون میں جابجا شعر کی تعریف آپ نے خود بھی کی ہے اور دوسرے لوگوں کے حوالے بھی دیے ہیں۔ اس میں ایک حوالہ ڈاکٹر محمد حسن صاحب کا بھی ہے۔ محمد حسن صاحب فرماتے ہیں۔

خیال اور جذبہ اگر موثر ہوں تو بیساکھیوں کی ضرورت نہیں پڑتی اور وزن اور بحر دونوں سے بے نیاز ہوکر بھی شاعری بن سکتا ہے۔

یعنی وزن اور بحر موصوف کے خیال کے مطابق بیساکھی ہیں جس کا سہارا لے کر ایک شاعر اپنی تخلیق پیش کرتا ہے۔ سہارا اور پابندی دو مختلف المعنی الفاظ ہیں۔ لیکن اگر پابندیوں ہی کو ہمارے فاضل ڈاکٹر صاحب نے بیساکھی سے تعبیر کیا ہے تو ہم نہایت ادب سے ان کی خدمت میں عرض کریں گے کہ نثر ہو خواہ نظم دونوں پابندیوں سے جکڑی ہوئی ہیں۔ نثر نثر ہو ہی نہیں سکتی، اگر وہ نحو کی پابند نہ ہو ٹھیک اسی طرح جس طرح نظم عروض کی پابند ہے۔ اور ان دونوں کو صرف نے اپنے قبضے میں کر رکھا ہے۔ پابندیوں سے الگ ہوکر نہ نثر نثر ہو سکتی ہے اور نہ نظم نظم۔ آپ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ نثری شاعری کو عروضی پابندیوں سے مطلق سروکار نہیں۔ لیکن اگر آپ نظم میں شاعری کرنا چاہیں گے تو آپ کو ان پابندیوں کو جنھیں آپ بیساکھی جیسے تحقیری لفظ سے تعبیر کر رہے ہیں اپنے اوپر لازم کرنا ہی ہوگا۔ اور عروض کی پابندی وہی شاعر کر سکتا ہے جو

اس فن سے واقفیت رکھتا ہے۔

نثری شاعری یا تو ایک اجتہاد ہے یا اعترافِ شکست شاعر اپنے خیال کو جب نظم کے سانچے میں ڈھالنے سے معذور ہوا تو اس نے فرار کی بہت سی صورتیں ایجاد کیں۔ انھیں میں ایک نثری شاعری ہے۔

ہمارے محترم ڈاکٹر صاحب نے ایک جگہ ارسطو کا حوا[لہ] دے کر قاری کو مرعوب کرنے کی کوشش بھی کی ہے کہ ارسطو نے بو[طیقا] میں کہیں بھی شعر کے لیے وزن کو لازم قرار نہیں دیا ہے۔ مگر چونکہ حوالے میں ارسطو کے الفاظ نہیں اس لیے پتہ نہیں چلتا کہ شعر سے ا[س] کی مراد کیا تھی۔ آج بھی جب کوئی صاحب اپنی باتوں کو ذرا رنگین پیرا[ئے میں] بیان کرتے ہیں تو ہم بے ساختہ کہہ اُٹھتے ہیں کہ بھئی تم شاعری کر رہے ہو۔ ایسی شاعری کے لیے اوزان اور بحور کی قید نہیں۔ مگر ادبی دنیا میں ایسی تقریروں کا درجہ شعر کا نہیں ہوتا۔

اس کے بعد ہی آپ رقم طراز ہیں ــ شبلی نے قدما کے حوا[لے] سے لکھا ہے کہ ــ شاعری صرف وزن اور قافیہ کا نام نہیں ــ ک[یا] اس جملے کے یہ معنی ہیں کہ شاعری کے لیے وزن اور قافیہ کی مطلق ضر[ورت] نہیں؟ اس کے تو صاف معنی ہیں کہ شاعری صرف وزن اور قا[فیہ] کی منت پذیر نہیں بلکہ کچھ اور بھی چیزیں ہیں جو شاعری کو شاعر[ی] بناتی ہیں۔

بے شک شاعری میں بنیادی اہمیت مواد، فکر اور خیا[ل کو] دی جانی چاہیے۔ اسی مواد اور فکر کو جب ایک قادر الکلام شاع[ر شعر] کے پیکر میں ڈھالتا ہے تو میر، اقبال اور غالب بن جاتا ہے۔ اگر کسی کو اتنی بھی قدرت نہیں تو اسے اختیار ہے کہ اپنی شاعری جو بھی نام رکھ لے۔ یہی فکر اور خیال کی شدت جب موزوں الف[اظ] کا روپ دھار لیتی ہے تو اتنی اثر انگیز ہو جاتی ہے کہ لوگ [جھومتے] ہیں اور سر دھنتے ہیں۔ نثری شاعری لاکھ کوشش کے باوجو[د] وہ اثر پیدا نہیں کر سکتی۔

مثال میں ہمارے فاضل مضمون نگار نے جناب علی ک[ا] نثری شاعری کا ایک ٹکڑا پیش کیا ہے۔ اور فرماتے ہیں ــ [دیکھیے یہ نظم] کی یہ تخلیق ہے معنویت سے کس قدر بھرپور: ــ

سرکاری لغت میں

بہت تلاش کیا
لیکن ان الفاظ کے
معنی نہ ملے
جبل پور، رانچی
احمد آباد

اس ایک بات کو ٹکڑوں میں نہ لکھ کر علی صاحب یوں بھی لکھ سکتے تھے ـــ سرکاری لغت میں بہت تلاش کیا مگر ان الفاظ کے معنی نہ ملے۔ جبل پور، رانچی، احمد آباد۔ مگر علی صاحب نے اس ایک جملے کو چھ مختصر سطور میں لکھ مارا۔ وجہ؟ وجہ یہی کہ انھیں یہ ثابت کرنا ہے کہ وہ شاعری کر رہے ہیں اور نثر ہیں۔ اگر اس بیساکھی کا وہ سہارا نہ لیتے تو ان کی اس بات کو کوئی شعر مانتا ہی نہیں۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سرکاری لغت میں جبل پور، رانچی اور احمد آباد کے معنی انہیں کیوں نہیں ملتے؟ بلاشبہ علی صاحب کے ذہن میں ان شہروں سے کچھ خونیں داستانیں وابستہ ہیں۔ لیکن فرض کیجیے قاری ان واقعات سے واقف نہیں یا پچاس ساٹھ سال کے بعد وہ بھول گیا تو پھر ان شہروں کے معنی کیا رہ جائیں گے یہی کہ سرکاری لغت میں احمد آباد ایک کارخانوں کا شہر ہے۔ جہاں ایک جیل خانہ بھی ہے جس میں آزاد اور نہرو جیسے علم بردار آزادی قید تھے۔ کیا نثری شاعری اتنی وقتی چیز ہو کر رہ گئی ہے؟ اور اسی کو ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں معنویت سے بھرپور۔ ایک تو نظم پر قدرت نہیں تو آسان اور سیدھا راستہ اختیار کیا اس پر بھی معنی فی البطن شاعر۔

جناب اطہر جاوید صاحب نے نثری شاعری کی تعریف اپنے پورے مضمون میں جا بجا کی ہے۔ کہیں خود اور کہیں دوسروں کے حوالے سے۔ جو حسب ذیل ہیں:

نثر اور نظم دو علیحدہ چیزیں ہیں۔ نثری شاعری ان دونوں کا آمیزہ یا مرکب نہیں۔

شاعری کے لیے بنیادی اہمیت مواد، فکر اور خیال کو دی جانی چاہیے۔ نثری شاعری میں ان کی اہمیت اور افزوں ہو جاتی ہے۔

نثری شاعری ذہن و فکر کی شاعری ہے۔

ایک شاعرانہ نثر بغیر قافیہ اور وزن کے بھی غنائیت کی حامل ہو سکتی ہے۔

شعری آہنگ تجربے، فکر، خیال، جذبے اور خلوص کی شدت سے پیدا ہوتے ہیں۔

نثری شاعری میں فکر، جذبہ، اور شاعرانہ احساس کے باعث داخلی خوبصورتی پائی جاتی ہے۔

وہ نثر جس میں شعری خصوصیات ہوں لیکن جو نثر نہ کہلائے نثری شاعری ہے۔

اب حوالہ جات بالا کو مد نظر رکھ کر اپنے شاعرانہ خیال کو نثر میں لکھا جائے تو نثری شاعری کہیں گے ـــ ہاں اس امر کا خیال کیا جانا چاہیے کہ اس کی نثری ترتیب میں "تعقید" نہ ہو۔ (دیکھیے انھیں بھی بیساکھی کی ضرورت پڑ گئی)

اگر اسی کا نام نثری شاعری ہے تو براہ کرم شبلی نعمانی کی سیرۃ النبی کی جلد اوّل میں ظہور قدسی کو ایک دفعہ پڑھ جائیے اور خدا لگتی کہیے کہ مولانا نے نثر میں شاعری کی ہے کہ نہیں؟ پھر ایسی ویسی شاعری نہیں، بلکہ تغزل سے بھرپور۔ اب آپ ان کے جملوں کو توڑ توڑ کر کاغذ پر بکھیر دیجیے۔ تھوڑا سا کاغذ کا نقصان تو ہوگا مگر بہترین نثری شاعری وجود میں آجائے گی۔ کرشن چندر اور نیاز فتح پوری کے افسانے پڑھ جائیے مولانا آزاد کا الہلال وغیرہ نہیں تو کم از کم غبار خاطر ہی ایک نظر دیکھ لیجیے۔ کیا ان مضامین کو ہم نثری شاعری نہیں کہہ سکتے۔ حالانکہ ان بزرگوں نے کبھی یہ سوچ کر نہ لکھا ہوگا کہ وہ بھی شاعری کر رہے ہیں۔

ان بزرگوں کی باتیں چھوڑیے۔ وہ تو دقیانوسی ہستیاں تھیں، آیئے۔ ہم ذیل میں چند اقتباسات پیش کر رہے ہیں ان قلم کاروں کا جنھیں شاعری سے دور کا بھی لگاؤ نہیں اور جو ادبی دنیا میں شاعر کی حیثیت سے نہیں بلکہ افسانہ نگار کی حیثیت سے ابھرے ہیں۔

(الف)

اور انصاف
زنجیر لے کر
میرے پیچھے پڑا ہے
تو خلاف معمول
اس کی نزدیکی کی ضرورت
مجھے محسوس ہو رہی ہے
. . . .

دریمیانی آدمی
چلا گیا
مگر وہ
اپنی سوچوں کے انتدار کو
اٹھائے
اپنی آگ میں سلگنے لگی
آگ اپنے اندر کی
نشانات ۵۰ء

(ب)

جب مجھ پر
ضرورتوں کا دباؤ
چاروں اور سے پڑنے لگتا ہے
اور
حالات کی ڈھیلی رسیاں
بالکل تن جاتی ہیں
تب محسوس ہوتا ہے
میرا وجود
تین روپئے ساٹھ پیسے میں تبدیل ہو گیا
شیشے کی زبان
تحریک نومبر ۱۹۷۳ء

اوپر جو اقتباسات دیے گئے ہیں انھیں ٹکڑوں میں ترتیب دینے کا قصوروار میں ہوں۔ ورنہ یہ سارے کے سارے جملے کسی نہ کسی پیراگراف سے لیے گئے ہیں۔ اس قسم کی ترتیب دے کر انھیں شاعری کے سانچے میں ڈھال لیا گیا۔ مگر انھیں غور سے پڑھیے۔ کیا ان میں جذبات کی شدت اور فکر کی بلند پروازی آپ کو نظر نہیں آتی۔ اب جس قسم کی شاعری کو ہمارے شکست خوردہ شاعر نثری شاعری کے نام سے منسوب کر رہے ہیں کیا اس شاعری سے کسی طرح یہ کم ہیں۔ شعر کے لیے جن ضروریات اور لوازمات کی نشان دہی ہمارے محترم دوست نے کی ہے وہ سب کی سب ان اقتباسات میں موجود ہیں مگر افسانہ نگار نے کبھی یہ نہ سوچا ہوگا کہ اس کے ان فن پاروں کو چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بانٹ کر تھوڑا سا کاغذ برباد کر دیا جائے تو یہ نثری شاعری بھی ہو سکتے ہیں۔ عام طور پر جدید کہانیوں میں موصوف کی نثری شاعری کا بھرپور راقم ملتا ہے۔ اور پھر کہہ لیجئے دیکھیے کہ شاعری بڑی تیزی سے نثر کی طرف رجوع نظر آتی ہے۔ اگر یہی حال رہا اور نثری شاعری قبول کر لی گئی تو شاعری نثر کی مغلوب لونڈی ثابت ہوگی۔

شعر اگر اس کے اندر شعریت اور جذبے کی بھرپور فراوانی ہے تو اسے جس انداز میں لکھا جائے وہ شعر ہے مگر جب ہم شاعری کا لفظ اپنی تخلیقات کے لیے استعمال کرتے ہیں، تو شاعری چند پابندیوں کا نام ہے۔ ان پابندیوں کو آپ جیسا بھی کہہ لیجیے خواہ عروض، وزن اور بحر۔

منظر امکانی نے کتنی ٹھوس حقیقت بیان کی ہے کہ:
ادب اور شاعری میں ہیئت اور آہنگ ختم کرنے سے آفاقیت پیدا نہیں ہوتی۔ اعلیٰ تخلیق تو اپنے ہی طرز احساس سے وجود میں آتی ہے جس سے فضا میں مختلف اکائیاں بنتی ہیں جو ایک بڑے کل میں تبدیل ہو کر آفاقیت کہلاتی ہیں۔

شاعری کی ہیئت اور آہنگ ہمیشہ سے عروض کے پابند ہیں۔ یہی عروض کی پابندی ہے جو شعر میں غنائیت، رسیلاپن اور ایک لے پیدا کرتی ہے۔ اس کے بغیر شاعری شاعری نہیں ہو سکتی۔ عروض کی پابندی برتتے ہوئے آپ ایسا بھی شعر کہہ سکتے ہیں جو نحوی نقطۂ نظر سے بالکل نثر ہو ——— یعنی جس کی مزید نثر محال ہو۔ یا نثر سے قریب ترین ہو ——— تو ایسی شاعری ہی کو نثری شاعری سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ہم ایک جملہ لکھتے ہیں ——— سمندر موجزن تھا اور ساحل سے بہت دور ایک ننھا سا جزیرہ خوف کی دہلیز پر گم سم پڑا تھا ———

یہ جملہ نحوی ترکیب میں بالکل نثر ہے۔ مگر عروضی حیثیت سے دیکھئے تو ایک خاص وزن کے تحت بھی ہے مگر ایسی شاعری کے لیے دونوں فنون پر یکساں قدرت رکھتا ایک شاعر کے لیے ضروری ہے۔ مگر آج کے سہل پسند شاعر اس کی طرف توجہ کیوں دینے لگے۔
غالب کا ایک مشہور شعر ہے۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

یہ شعر ایک غزل کا مطلع ہے۔ مگر منظوم ہونے کے باوجود نثر سے کتنا قریب ہے۔ میر فرماتے ہیں۔

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

اس قسم کی مثالیں اساتذہ کے کلام سے بے شمار پیش کی جاسکتی ہیں۔ حال کے شعرا میں زیب غوری کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

پھر اپنی راہ میں سنگِ گراں نہ مل جائے
کوئی زمین سرِ آسماں نہ مل جائے
شکستہ جسم بچائے ہوئے نگاہوں سے
گزر چلو کہ کوئی مہرباں نہ مل جائے

ان شعروں کے ہر مصرعے کو دیکھئے نحوی قاعدے سے نثر یا نثر کے بہت قریب ہیں مگر پھر بھی کلام موزوں ہے اور وہ بھی قافیہ ردیف کے ساتھ۔

نثری شاعری جو آج ہو رہی ہے اور جس کی حمایت میں مضامین لکھے جا رہے ہیں وہ سرے سے شاعری ہی نہیں ہم بس اتنا کہہ سکتے ہیں کہ نثر کے فن پارے ہیں جن میں شعریت بھی موجود ہے اور جذبے کی شدت بھی محسوس کی جا رہی ہے۔ مگر ایسی نثر لکھنے اور بولنے والوں کو ہم غالب اور اقبال کے پہلو میں جگہ نہیں دے سکتے ہاں انھیں ہم مولانا آزاد اور شبلی کے پائے تانے کھڑا کر سکتے ہیں۔ اور یہی ان کی بہت بڑی عزت ہوگی۔ ایسی نثر تو برسوں سے لکھی جا رہی ہے۔ آج اسے شاعری کے خانے میں رکھنے کی کیا ضرورت ہے صرف نام بدل دینے سے کسی چیز کی ماہیت نہیں بدل جاتی۔

ادب میں نثر اور نظم دو الگ الگ صنفیں ہیں۔ مختلف نہیں بلکہ متضاد۔ ہمارے بزرگوں نے انہیں نحو اور عروض ہی کی حیثیت سے الگ نہ کیا بلکہ دونوں کے دائرے بھی الگ کر دیے۔ پھر بھی ایک زمانے تک قصے کہانیوں کو استادوں نے نظم کیا بڑی بڑی معرکۃ الآرا کتابیں تصنیف کر ڈالیں سکندر نامہ، گلزار نسیم، زہر عشق وغیرہ اسی قبیل کی کتابیں ہیں۔ مگر بعد کے ادیبوں نے محسوس کیا کہ داستان اور کہانیاں نظموں میں نہیں نثر میں لکھنی چاہئیں۔ اور پھر رفتہ رفتہ کہانیوں کو منظوم کرنے کا رواج ختم ہو گیا مگر آج بھی ہم اپنے بزرگوں کی تصنیف پر حیران ہیں کہ انہیں زبان و بیان پر کتنی قدرت حاصل تھی۔

انگریزی ادب میں بھی اس قسم کی بہت سی عظیم اور لافانی کتابیں تصنیف ہوئیں۔ مگر قافیوں کی کمی نے انہیں بلینک ورس لکھنے پر مجبور کیا۔ مگر یہاں کا اردو شاعر اگر وزن قافیہ اور ردیف سے الگ ہو کر شاعری کرتا ہے تو اس لیے نہیں کہ انگریزی کی طرح یہاں قافیوں کی کمی ہے بلکہ وہ انگریزی کی اندھی تقلید کرتا ہے یا اس لیے کہ اسے زبان و بیان پر وہ قدرت نہیں جس کا متقاضی اس کا مضمون ہے اب فرار کی صورت یہی تھی کہ اپنی شاعری کا ایک نیا نام تجویز کر لے۔ اسی کو ہم اعترافِ شکست کہتے ہیں۔

جس طرح کہانیاں نظم کے دائرے سے باہر نکل آئیں اسی طرح آج ہو یا کل شاعری بھی نثر کے دائرے سے نکل جائے گی نثری شاعری کا اٹھان بلبلے کی طرح ہے شعر کو بہر حال موزوں ہونا ہے۔ تجربہ یقیناً اہم ترین شئے ہے لیکن تجربہ برائے تجربہ انحراف بہ امید شہرت قابل قبول نہیں سمجھا جا سکتا۔

● پرکاش ناتھ پرویز
۳۵ ۱۲۔ سیکٹر ۲۲ سی۔ چنڈی گڑھ

مولانا حالی کا اپنا کلام اگرچہ پابند ہے لیکن شعر کے لیے وزن کی ضرورت سے متعلق اُن کے خیالات بڑی حد تک آزادانہ حیثیت رکھتے ہیں، فرماتے ہیں ——

"شعر کے لیے وزن ایک ایسی چیز ہے جیسے راگ کے لیے بول۔ جس طرح راگ فی حد ذاتہ الفاظ کا محتاج نہیں، اسی طرح نفسِ شعر وزن کا محتاج نہیں۔ اس موقع پر جیسے انگریزی میں دو لفظ مستعمل ہیں ایک پوئٹری دوسرا ورس، اسی طرح ہمارے ہاں بھی دو لفظ استعمال میں آتے ہیں ایک شعر اور دوسرا نظم، اور جس طرح اُن کے ہاں وزن کی شرط پوئٹری کے لیے نہیں بلکہ ورس کے لیے ہے، اسی طرح ہمارے ہاں بھی یہ شرط شعر میں نہیں بلکہ نظم میں معتبر ہونی چاہیے۔" (مقدمہ شعر و شاعری ناشر علمی کتب خانہ دہلی۔ ۱۹۵۳ء صفحہ ۳۶)

اگرچہ سب سے پہلے وزن کا التزام اہلِ عرب نے کیا لیکن اوّل اوّل اُن کے نزدیک شاعری کا تصور کیا تھا، اس سے متعلق مولانا حالی رقم طراز ہیں ——

"قدیم عرب کے لوگ یقیناً شعر کے یہی معنی سمجھتے تھے، جو شخص معمولی آدمیوں سے بڑھ کر کوئی موثر اور دلکش تقریر کرتا تھا، اسی کو شاعر جانتے تھے۔ جاہلیت کی قدیم شاعری میں زیادہ تر اسی قسم کی برجستہ

(باقی صفحہ ۵۰ پر)

خبر نامہ

● پچھلے دنوں نئی دہلی میں منعقدہ اقبال صدی تقریبات میں شرکت کے لیے جو غیر ملکی دانشور آئے ان میں چار پاکستانی ادیب ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، جمیل جالبی اور معزالدین بھی شامل تھے۔ ان کے اعزاز میں کرشن موہن نے ۳ر نومبر کو اپنے ہاں عشائیہ ترتیب دیا۔ جس میں چاروں بیرونی مہمانوں کے علاوہ جو ادیب اور شاعر شریک ہوئے ان میں گوپال متل، علی سردار جعفری، جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر قمر رئیس، مخمور سعیدی، کمار پاشی، زبیر رضوی، رحمٰن نیّر، اکبر علی خاں عرشی زادہ، پروانہ ردولوی، بلراج ورما، ڈاکٹر تارا چند رستوگی، رام پرکاش راہی، مسز عالیہ امام اور کچھ دوسرے حضرات شامل تھے۔ پاکستانی ادیب خود کو اپنے ہندوستانی دوستوں کے درمیان پاکر بہت خوش تھے۔ دورانِ گفتگو مشترک دلچسپی کے کئی موضوعات زیر بحث آئے۔ جن میں ایک موضوع اقبال اور اس کی شاعری بھی تھی۔ طے پایا کہ بلراج ورما کے رسالے "تناظر" کا آئندہ شمارہ اقبال نمبر ہوگا جس میں اقبال کی نظم مسجد قرطبہ کے لیے ایک الگ گوشہ مخصوص کیا جائے گا۔ جمیل جالبی نے وعدہ کیا کہ اس نمبر کے لیے پاکستانی اہلِ قلم کے مضامین وہ حاصل کر کے بھجوائیں گے۔

● رضا علی وحشت کلکتوی کے جانشین جنابِ آصف بنارسی کے انتقال پر، ڈھاکہ میں جو مرحوم کا وطنِ ثانی بن گیا تھا، ایک تعزیتی جلسہ ہوا۔ جلسے کا آغاز قرآن خوانی سے ہوا، جلسے کی صدارت مرحوم کے پرانے دوست جنابِ کامل کلکتوی نے کی اور نظامت کے فرائض نوشاد نوری نے انجام دیے۔ قرآن خوانی اور مرحوم کی روح کو ایصالِ ثواب کے بعد مرحوم کی ایک نعت محترمہ خدیجہ نور نے اپنی مترنم آواز میں پیش کی۔ اس کے بعد نوشاد نوری، ایوب جوہر، پروفیسر ہارون الرشید، قاضی محی الدین، عبدالرحیم شارق اور منظور عالم منظر نے آصف صاحب کی ادبی خدمات اور ان کے شاعرانہ کمال پر مضامین پڑھے اور احمد الیاس، سلطان احمد، سید حسن رضا دائردی، عطاء الرحمٰن جمیل، پروفیسر نجم الحسن نجم اور ماہر فریدی نے تقریریں کیں۔ تقریروں کے بعد شعرا نے جن میں نوشاد نوری، عثمان غنی شاداں، قدوس صدیقی، شاد آصفی، خدیجہ نور، جمال مشرقی، افقر شفیقی ہاشم آصفی، رضا دائردی، عطا آصفی، کامل کلکتوی اور ماہر فریدی کے اسمائے گرامی شامل تھے، مرحوم کو منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا۔ جلسے میں چالیس سے زیادہ ادیب اور شاعر شریک تھے۔

● اُردو کے ادبی حلقوں میں یہ خبر مسرت کے ساتھ سُنی جائے گی کہ جواں سال وجواں فکر شاعر زبیر رضوی جو آل انڈیا ریڈیو نئی دلّی کے اردو سروس پروگرام میں بہ طور پروڈیوسر کام کر رہے تھے، اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائرکٹر کے عہدے کے لیے منتخب ہو گئے ہیں۔ اپنا نیا عہدہ وہ سری نگر جاکر سنبھالیں گے۔ نئی دلی ریڈیو اسٹیشن پر زبیر صاحب کے حسنِ کارکردگی کا اعتراف سبھی کو تھا۔ امید ہے اپنی نئی ذمہ داریوں کو بھی وہ اسی کامیابی سے پورا کرتے ہوئے جلد ہی ترقی کے اگلے زینے پر قدم رکھیں گے

مندرجات

قارئینِ تحریک کو
نیا سال مبارک

پنجاب اور آندھرا کی لائبریریوں کے لیے منظور شدہ

شمارہ : ۱۰   جلد : ۳۵

جنوری ۱۹۷۸ء

ادارۂ تحریر :

- گوپال متل
- مخمور سعیدی
- پریم گوپال متل

سالانہ قیمت : پندرہ روپے۔ فی کاپی : ایک روپیہ ۲۵ پیسے

بیرونی ممالک سے

سالانہ تین پونڈ   فی کاپی : چھ شلنگ

خط کتابت اور ترسیلِ زر کا پتا

منیجر ماہنامہ تحریک ۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج، نئی دہلی ۲-۱۱۰۰۰

ایڈیٹر پبلشر و پروپرائٹر : گوپال متل

مطبع : نعمانی پریس، دہلی

مقام اشاعت : ۹ انصاری مارکیٹ۔ نئی دہلی ۲-۱۱۰۰۰

مارچ ۱۹۷۸ء میں

اپنی اشاعت کے ۲۵ سال پورے کر رہا ہے

ایک سنجیدہ علمی ادبی رسالے کے لیے پوری چوتھائی صدی تک باقاعدگی سے جاری رہنا کم فخر کی بات نہیں، بالخصوص موجودہ ماحول میں جب اردو زبان خود اپنے وطن میں بے وطن ہو کر رہ گئی ہے۔

اس موقع پر ہم نے تحریک کا سلور جبلی نمبر شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے ——

تحریک کے خاص نمبر جب جب شائع ہوئے ہیں، ان کی دھوم مچ گئی ہے، ہماری کوشش ہوگی کہ سلور جبلی نمبر سابقہ تمام نمبروں پر سبقت لے جائے۔

ہمارا منصوبہ یہ ہے کہ اس نمبر میں اردو زبان و ادب کے پچھلے ۲۵ سال کے بھرپور جائزے کے ساتھ ہندوستان کی دوسری زبانوں کے پچھلے ۲۵ سال کے شعر و ادب کا تعارف بھی پیش کیا جائے اور ان زبانوں کی منتخب تخلیقات کے تراجم بھی۔

ہندوستان میں اردو زبان کے مستقبل پر ایک مذاکرے کی شمولیت بھی زیرِ غور ہے

اس ضخیم عظیم نمبر کی تیاریوں میں، جو ایک بے مثال ادبی تحفہ ہوگا، ہمارا ہاتھ بٹایئے —— اس کے اشتہارات کی فراہمی میں ہماری مدد کیجیے اور اسے رعایتی داموں پر حاصل کرنے کے لیے تحریک کی سالانہ خریداری قبول کیجیے۔

ہم اپنے قلمکار دوستوں سے بہ طور خاص تعاون کی درخواست کرتے ہیں ہم ہمیشہ کی طرح آپ کی مخلصانہ مدد کے منتظر ہیں۔

گوپال متل　|　یہ اندازِ گفتگو کیا ہے؟

حال ہی میں Reminiscences of the Nehru Age کے نام سے ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس کے مصنف پنڈت جواہرلال نہرو کے اسپیشل سیکریٹری مسٹر ایم۔ او۔ متھائی ہیں۔ راقم الحروف کی پرورش ایک ایسے معاشرے میں ہوئی جس میں ذاتی وفاداریوں کو کافی اہمیت حاصل تھی اس لیے مجموعی طور پر یہ کتاب مجھے ناپسند ہے۔ پنڈت نہرو میں لاکھ ذاتی خامیاں ہوں، ان کا بیان ایک ایسے شخص کو زیب نہیں دیتا جو ایک طرح سے ان کا پروردہ تھا اور جسے انھوں نے اتنی اہمیت دے رکھی تھی کہ لوگ یہاں تک کہتے تھے کہ پنڈت نہرو کے بعد حکومتِ ہند میں اہم ترین آدمی متھائی ہی ہیں۔

مس مردلا سارابھائی کے بارے میں متھائی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اس کی عدمِ صحت کا ثبوت خود ان کے بیان کا تضاد ہے۔ ایک طرف وہ کہتے ہیں کہ مس سارابھائی پنڈت نہرو کو اپنے دامِ عشق میں گرفتار کرنے کی فکر میں تھیں اور دوسری طرف یہ کہ اس خاتون کو اپنی شکل بگاڑنے میں کمال حاصل تھا۔ جو خاتون کاروبارِ عشق میں مصروف ہو وہ خود کو بنانے سنوارنے کی فکر میں رہتی ہے اپنی صورت کو مسخ کرنے کی دھن میں نہیں۔ وضع قطع کو بگاڑنے کے سلسلے میں مسٹر متھائی نے اس کا ذکر کیا ہے کہ وہ جب ان سے ملے تو انھوں نے پٹھانوں کا لباس پہن رکھا تھا۔ غالباً ان کی مراد یہ ہے کہ وہ شلوار پہنتی تھیں۔ یہ صحیح ہے۔ لیکن شلوار وہ اس لیے نہیں پہنتی تھیں کہ انھیں اپنی ہیئت بگاڑنا مقصود تھی۔ ویسے اگر صوبائی تعصب سے کام نہ لیا جائے تو شلوار اتنا برا لباس ہے بھی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ شلوار وہ اس لیے پہنتی تھیں کہ وہ اغوا شدہ مسلمان عورتوں کی بازیابی کے کام میں مصروف تھیں اور ان کا خیال تھا کہ انھیں اس لباس میں دیکھ کر ان مظلوم عورتوں کے دل میں کچھ اعتماد پیدا ہوگا۔ اس اندازِ نظر کی صحت کو ایک جگہ خود متھائی صاحب نے تسلیم کیا ہے۔ ایک بار انھیں اطلاع ملی کہ ایک مسلمان لڑکی دلی کے کسی ہوٹل کے کمرے میں بند ہے اور اس کی جان خطرے میں ہے۔ متھائی صاحب جیب میں پستول ڈال کر اس ہوٹل کی طرف چل پڑے لیکن اپنے ساتھ انھوں نے ایک ڈاڑھی والے مسلمان کو بھی لے لیا۔ ان کا بیان ہے کہ ڈاڑھی والے مسلمان کو دیکھ کر اس لڑکی کے دل میں، جو بری طرح لرز رہی تھی، اعتماد پیدا ہوا۔

بہرحال اس کتاب کے کچھ حصے ایسے بھی ہیں، جن کا اگرچہ کوئی سیاسی مفہوم نہیں لیکن وہ بیک وقت دلچسپ بھی ہیں اور بصیرت افروز بھی۔ مثلاً اپنی کتاب کے صفحہ ۵ پر وہ لکھتے ہیں کہ ایک شخص کو جو مسلمان نظر آتا تھا غنڈوں کے ایک گروپ نے گھیر لیا۔ اس نے زبردست احتجاج کیا کہ وہ مسلمان نہیں ہے لیکن شرنارتھی اس کے غیر مسلم ہونے کا ثبوت چاہتے تھے اور ثبوت اسی طرح مل سکتا تھا کہ وہ اپنے کپڑے اتار دے۔ یہ سن کر اس شخص کو یقین ہو گیا کہ اب موت سے بچنا ممکن نہیں کیونکہ کسی وجہ سے بچپن میں اس کی ختنہ کر دی گئی تھی۔ اسے معجزہ ہی سمجھیے کہ عین اس وقت جنوبی ہند کا ایک برہمن وہاں پہنچ گیا جس کے ماتھے پر تلک بھی تھا اور سر پر لمبی جٹا بھی۔ اس نے گواہی دی کہ وہ اس شخص کو جانتا ہے اور وہ صرف ہندو ہی نہیں بلکہ برہمن بھی ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ متھائی صاحب نے جہاں

خواتین کا ذکر کرتے وقت ان کا نام پوشیدہ رکھنا ضروری نہیں سمجھا وہاں ایک وزیر کی بے اعتدالیوں کا ذکر کرتے وقت اس کے نام کو مخفی رکھنا ضروری خیال کیا۔ تفصیل انھی کی زبان سے سنیے: "۱۹۵۵ء کے آس پاس ایک منسٹر آف سٹیٹ اپنی حماقت کی بنا پر مصیبت میں پڑ گیا۔ اسے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں بطور ڈیلی گیٹ بھیجا گیا۔ وہ ایک امیر شخص تھا، شادی شدہ تھا اور اس کے کئی بچے تھے۔ لیکن اپنے ساتھ وہ ایک نوجوان خاتون کو بھی لیتا گیا اور نیو یارک، پیرس اور لندن کے ہوٹلوں میں وہ اپنا نام میاں بیوی کی حیثیت سے درج کرا کے ایک ہی کمرے میں رہتے رہے۔ کچھ دن بعد وہی خاتون اپنا سامان لے کر نئی دلی پہنچ گئی اور مطالبہ کیا کہ اسے وزیر موصوف اپنے گھر میں رکھیں، خواہ نوکرانی کی حیثیت ہی سے سہی۔ میاں بیوی دونوں بہت پریشان ہوئے۔ اسے گھر سے نکال دیا گیا لیکن وہ ویسٹرن کورٹ میں ایک کمرہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ وہ کئی اہم لوگوں سے ملی اور ان تک اپنی شکایات پہنچاتی رہی۔ آخر اس نے ایک دن وزیر اعظم کو راستے میں روک لیا اور اپنی بات کہہ کر ہی ٹلی۔ وزیر اعظم نے مجھ سے کہا میں اس وزیر کو گفتگو کے لیے بلاؤں۔ میں نے اس وزیر کو ٹیلی فون کیا اور دوپہر میں اپنے دفتر بلایا۔ اس نے ہر بات کا اعتراف کر لیا میں نے اسے کاغذ کا ایک ٹکڑا دیا اور کہا کہ وہ اس پر وزیر اعظم کے نام اپنا استعفیٰ لکھ دے۔ استعفے کے لیے میں نے اس سے مندرجۂ ذیل الفاظ تحریر کرائے: "میں ذاتی وجوہ سے وزراء کی کونسل سے استعفیٰ دے رہا ہوں۔ میں بہت ممنون ہوں گا اگر آپ اس استعفے کو منظوری کے لیے صدر محترم کو بھیج دیں"۔ استعفیٰ لکھوانے کے بعد میں نے وزیر سے کہا کہ وہ سوموار کے دن ایک مشترکہ دوست یو۔ ایس ملیتا ممبر پارلیمنٹ کے ساتھ جنھیں جملہ واقعات کا علم ہے، پارلیمنٹ ہاؤس میں میرے دفتر میں مجھ سے ملے۔ وہ دونوں مجھ سے ملے، میں نے وزیر سے کہا کہ جہاں تک جنسی معاملات کا تعلق ہے مجھے کوئی فیصلہ صادر کرنے کا حق نہیں پہنچتا لیکن تم نے یہ حماقت کی ہے کہ ہر ہوٹل میں اپنا اور اس عورت کا نام میاں بیوی کی حیثیت سے درج کرایا ہے۔ اب کچھ لوگوں نے اسے بھڑکا کر تمھیں بلیک میل کرنے کو یہاں بھیج دیا ہے۔ اب تم اسے کچھ دے دلا کر چپ کر دو۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارا دوست ملیتا اسے دلی چھوڑ دینے پر آمادہ کر لے گا۔ ملیتا نے طے کیا کہ وزیر کی مالی حیثیت دیکھتے ہوئے پچاس ہزار روپے کی رقم مناسب ہوگی۔ دو تین دن میں یہ ادائگی ہو گئی اور وہ عورت دلی چھوڑ کر چلی گئی۔ اس کے بعد میں نے وزیر اعظم کو استعفے کا خط بھی دے دیا اور تمام تفصیلات بھی بتا دیں۔ وزیر اعظم نے دو دن سوچنے کے بعد فیصلہ کیا کہ استعفیٰ منظور نہ کیا جائے۔ اس کے بعد اس وزیر کو بہت عروج حاصل ہوا۔ اندرا گاندھی کے دور میں وہ کیبنٹ منسٹر بنا اور سب وزیروں سے زیادہ اطاعت شعار ثابت ہوا۔ سنجے کو سیاست میں بھی پہلے وہی لایا تھا۔ وہ انہے اپنی ریاست میں لے گیا اور ایک پبلک میٹنگ میں جو سرکاری خرچ پر منعقد ہوئی تھی، تقریر کرتے ہوئے یہ انتہائی معنی خیز اعلان کیا: "میں نے تمھارے نانا کی بھی غلامی کی ہے، تمھاری ماں کی بھی، اب میں تمھاری غلامی بھی کروں گا۔"

پہچان کا درد اور فرمودات کے بعد
حمید الماس
کی تیسری کتاب
شب گرد
شائع ہو چکی ہے
قیمت: دس روپے

روسی انقلاب کی کامیابیاں

ستیہ پرکاش

لینِنی انقلاب کی ساٹھویں سالگرہ کے موقع پر روسی یا روس نواز حضرات اس انقلاب کی کامیابیاں ثابت کرنے کے لیے جتنا بھی پروپیگنڈہ کر رہے ہیں وہ اکارت جا رہا ہے۔

لینن نے عبوری حکومت کا تختہ الٹتے وقت جس بہیمانہ تشدد کا استعمال کیا تھا، اس کا جواز اس کے نزدیک یہ تھا کہ موجودہ نسل کی تباہی سے۔ روس کی آئندہ نسلوں کو فائدہ پہنچے گا اور وہ ان کے لیے ایک جنتِ ارضی تعمیر کر جائے گا، خدا جانے اگر اس کی ممی میں جان پڑ جائے اور وہ موجودہ روس کا نقشہ دیکھے تو اس کے دل پر کیا گزرے۔

لینن نے روسیوں سے امن کا وعدہ کیا تھا لیکن روس میں جنگ اس وقت بھی جاری رہی جب یورپ کے دوسرے حصوں میں ختم ہو چکی تھی۔ اس نے کسانوں کو زمین دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن وہ مشترکہ کاشت کے نام پر غلام بنا لیے گئے۔ اس نے روٹی کا وعدہ کیا تھا لیکن ہوا یہ کہ روس کے ان خطوں میں بھی، جو اناج کی پیداوار کے لیے دنیا بھر میں مشہور تھے، لوگ فاقہ کشی کا شکار ہو گئے۔ حالت یہ ہے کہ پچھلے برس جہاں روس نے ساڑھے پانچ ملین ٹن اناج درآمد کیا تھا وہاں اس سال اسے گیارہ ملین ٹن گندم درآمد کرنی پڑے گی۔ لینن نے آزادی کا بھی وعدہ کیا تھا لیکن کروڑوں روسی اب بھی جبری مشقت کے کیمپوں میں ہیں۔ اس نے قومی اقلیتوں کو حقِ خود اختیاری دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن ماسکو کے تخت زاروں نے جتنے وسیع خطّے پر اپنی حکومت قائم کر رکھی ہے، اتنے خطّے پر کسی بھی زار کی حکومت نہیں تھی۔

بالشویکوں نے اقتدار پر جبری قبضہ کرتے وقت یہ نعرہ بلند کیا تھا کہ سارا اقتدار سوویٹوں کے ہاتھ میں ہونا چاہیے اگر ایسا ہو جاتا تو منتخب نمائندوں کے ذریعہ کسانوں اور مزدوروں کو منتخب اداروں میں اپنی آواز بلند کرنے کا تھوڑا بہت حق ضرور مل جاتا لیکن بالشویک پارٹی نے اپنا ڈکٹیٹری اقتدار کبھی ختم نہیں کیا حالانکہ مزدور اجتماعی مظاہروں میں مسلسل مطالبہ کر رہے تھے کہ سوویٹوں کو کمیونسٹوں کے جبر سے آزاد رہنا چاہیے۔

نئی دہلی میں "ہندوستان میں سیاسی نشوونما اور امن پر سوویٹ یونین کے اثرات" کے موضوع پر مباحثے کا افتتاح کرتے ہوئے مارکس وادی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکرٹری مسٹر ای۔ ایس نمبودری پاد نے سوویٹ یونین کی طرف سے ایمرجنسی کی حمایت پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ سوویٹ یونین یہ نہیں سمجھ پایا کہ ہندوستان جیسے بورژوا ملک میں سوشلزم کی جدوجہد کے لیے ڈیموکریسی مزدوروں، کسانوں اور محنت کش عوام کے لیے ایک موثر ہتھیار ہے۔ یہ بات انھوں نے نہیں بتائی کہ اس ہتھیار کی مدد سے جب سوشلزم قائم ہو جائے گا تو اس میں جمہوریت کی کیا گنجائش ہوگی اگر وہ ایسا سمجھتے تو روسیوں کو بھی یہ مشورہ دیتے کہ وہ خود اپنے ملک میں جمہوری نظام قائم کریں اور حکومت سے اختلاف کرنے والوں کو پاگل قرار دے کر دماغی اسپتالوں میں داخل کر کے واقعی پاگل بنانے کا طریقہ اور جبری مشقت کے کیمپوں کا وجود ختم کر دیں۔

کرشن موہن | چار نظمیں

خواہشوں کے دریچوں سے

شبابِ درخشاں، شبستانِ رنگیں
شبستانِ رنگیں کی آسائشوں میں
ہمیں کیوں نہ سنسار گلزار لگتا
کہ ہم خواہشوں کے
دریچوں سے جھانکا کیے تھے

▲▲

چھ جانور

آدمی
بیس میں طاؤس ہے
شیر ہے وہ تیس میں
اونٹ ہے چالیس میں
سانپ ہے پنجاہ میں تو ساٹھ میں کُتّا ہے وہ
بوزنہ ہفتاد میں
کچھ نہیں، ہشتاد میں

(ماخوذ)

▲▲

چڑیا

داستاں کی شیرنی ہے
اِن دنوں مجبور، بے بس
چڑیا گھر کی ایک چڑیا

▲▲

اہلِ ہوس

مہاراجے پُرانے تھے بڑے ہی واسنا دھاری
غضب تھی اُن کی تیاری
رسیلی اور من موہن رکھیلوں کو
وہ شلغم اور چڑے کا بھجیا کھا کھا کر رجھاتے تھے
بدن کا لُطف اُٹھاتے تھے
عجب دُھومیں مچاتے تھے

▲▲

محمد علوی

نظم اور غزل (زبیر رضوی کے لیے)

"علی بن متقی رویا"

علی بن متقی رویا
عجب ناداں تھا
کیوں سویا!
چلو سویا تو اچھا تھا
مگر پھر خواب کیوں دیکھا!
یہاں تک بھی غنیمت تھا
مگر پھر خواب میں اُس نے
خدا کا نام کیوں بویا!
اُٹھا تو اُس کے کھیتوں میں
خدا پھیلا ہوا تھا
اُس نے گندم
سب کا سب کھویا!
علی بن متقی رویا!
عجب ناداں تھا
کیوں سویا!!

▲▲

دھوپ میں شجر چمکے
تتلیوں کے پَر چمکے

دُور اُفق کے کونے میں
اُونچے نیچے گھر چمکے

دِن میں کس کو دیکھا تھا
چاند رات بھر چمکے

کچھ نہیں تھا البم میں
پھر بھی کچھ کلر چمکے

سطحِ آب پر علوی
مچھلیوں کے سر چمکے

▲▲

۱۳ - پارس باغ - کوچرب - احمد آباد

بشیر بدر | غزلیں

ایک سواری آئے گی اک جائے گی
باری باری سب کی باری آئے گی

پھول اگر پیروں کے نیچے آئیں گے
آنکھوں کی بینائی کم ہو جائے گی

پانی کو گندہ کرنے سے کیا حاصل
تیری بھی پرچھائیں دھندلا جائے گی

بچے جب اسکول سے واپس آئیں گے
چڑیا شام کی چائے لے کر آئے گی

پڑھتے پڑھتے یہ بچے سو جائیں گے
تتلی ان کی پلکوں کو سہلائے گی

تھوڑی دیر میں ایک چراغوں کی تھالی
کالی بلی سر پر رکھ کر آئے گی

پت جھڑ کے پیلے سونے سے لدی ہوئی
پکے بالوں والی اک عورت آئے گی

سوکھے پھولوں سے سینے کو ڈھانپے گی
ٹوٹے پتوں کی پشواز بنائے گی

آہستہ چلنے میں اب دم گھٹتا ہے
ٹھہر و گا تو سانس مری رک جائے گی

جو دنیا کے آگے آگے جائے گا
دنیا اس کے پیچھے پیچھے آئے گی

▲▲

سوئے کہاں تھے آنکھوں نے تکیے بھگوئے تھے
ہم بھی کبھی کسی کے لیے خوب روئے تھے

انگنائی میں کھڑے ہوئے بیری کے پیڑ سے
وہ لوگ چلتے وقت گلے مل کے روئے تھے

ہر سال زرد پھولوں کا اک قافلہ رکا
اس نے جہاں پہ دھول اَٹے پاؤں دھوئے تھے

اک پُر سکوں پہاڑ کے بنگلے میں رات ہم
شبنم کی طرح پھول کی آنکھوں میں سوئے تھے

شملہ پہاڑیوں پہ دسمبر کی ایک رات
شیطان مر گیا تھا فرشتے بھی سوئے تھے

آنکھوں کی کشتیوں میں سفر کر رہے ہیں وہ
جن دوستوں نے دل کے سفینے ڈبوئے تھے

▲▲

ریشم کی چادر اوڑھی پگڑی باندھی
دامن میں دروازے کی مٹی باندھی

ریل کی پٹری پر میری شہرت رکھ دی
بس کے پہیوں سے روزی روٹی باندھی

آنگن میں جھلمل جھلمل ساون برسے
موسم نے بادل جیسی ساری باندھی

جس کے ساتھ بہاریں اکثر رہتی تھیں
آنچل میں اس نے سوکھی پتی باندھی

پہلے سے کچھ صاف نظر آتی ہے دنیا
جب سے ہم نے آنکھوں پر پٹی باندھی

▲

شعبۂ اردو، میرٹھ کالج، میرٹھ

غـــزلیں

مغنی تبسم

چھپا رکھا تھا یوں خود کو کمال میرا تھا
کسی پہ کھل نہیں پایا جو حال میرا تھا

ہر ایک پائے شکستہ میں تھی مری زنجیر
ہر ایک دستِ طلب میں سوال میرا تھا

میں ریزہ ریزہ بکھرتا چلا گیا خود ہی
کہ اپنے آپ سے بچنا محال میرا تھا

ہر ایک سمت سے سنگِ صدا کی بارش تھی
میں چپ رہا کہ یہی کچھ مآل میرا تھا

ترا خیال تھا تازہ ہوا کے جھونکے میں
جو گرد اُڑ کے گئی ہے، ملال میرا تھا

میں رو پڑا ہوں تبسم سیاہ راتوں میں
غروبِ ماہ میں شاید زوال میرا تھا

●●

مصوّر سبزواری

خواہشوں کے بھنور میں ہیں گرتا مکاں مُڑ کے کیوں دیکھتے جانے والے مجھے
میں گناہوں کی کشتی تھا کرتے گئے سب سیہ پانیوں کے حوالے مجھے

دُور آموں کے باغوں میں بور آگیا کچے مہوے کی پاگل مہک جاگ اُٹھی
جسمِ سیّال کی انتہا پر ہوں میں کھینچ کر بازوؤں میں بچا لے مجھے

اک وہ آتش نفس بوسۂ تیز تر جلد کے سب دُکھوں کی اُترتی تہیں
اک سفر خواب سا جسم سے جسم تک کوئی طوفانی بارش نہ آلے مجھے

پانی پانی جزیرے کا اک سانحہ میں اُجڑتے افق کا کوئی ماجرا
پارہ پارہ بدن لے کے جاؤں کدھر اب ہوا اپنا رستہ بنا لے مجھے

جس کو مہندی لگا ہاتھ سمجھا تھا میں وہ تو شب خون کی سازشِ سُرخ تھی
زلف سے غار تک کھینچ کر لے گئے مکڑیوں کے وہ رنگین جالے مجھے

●●

○ نوح ۔ ضلع گڑگاؤں ۔ (ہریانہ)　　　　○

انشائیہ

آنسو

کوثر چاند پوری

آنسو اور شبنم کے مروارید نما قطروں میں بڑی یکسانیت ہے آنسو نوکِ مژگاں پر مصروف لرزش رہتا ہے اوس کی بوندیں برگ گل و لالہ پر حسین جنبشوں کا خوش آیند تماشہ دکھاتی ہیں، شبنم رات کی خنکی اور تاروں کی خواب آلود چمک میں آسمان سے ٹپک پڑتی ہے گلاب، چنبیلی اور رات رانی کی ادھ کھلی کلیاں اس کے لیے منہ کھول دیتی ہیں ان کی ہری نقابیں آپ ہی آپ سرک جاتی ہیں سورج کی پہلی کرن اسے ہوا بنا کر اڑا دیتی ہے اور شاعر چیخ پڑتا ہے :

پرتو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
یاد رآیا مجھے پانی کا ہوا ہو جانا

آنسو پانی ہی کا بظاہر بے حقیقت سا قطرہ ہے لیکن اس کی چھاتی میں جذبات کا سمندر موجیں مارتا رہتا ہے وہ خشک ہو جائے یا کسی کے عطر بیز دامن میں جذب ہو جائے تو بھی فنا نہیں ہوتا صدیوں دلوں کی دھڑکنوں میں اضافہ کرتا رہتا ہے دریا کو زے میں نہیں بھرا جا سکتا مگر آنسو میں آسانی سے سما جاتا ہے آنسو خوشی کے بھی ہوتے ہیں۔ رنج و غم کے بھی دونوں میں بڑا لطیف فرق ہے ایک لمحاتی اور حباب آسا ہوتا ہے دوسرا ابدی بعض اوقات آدمی ہنستے ہنستے بے حال ہو جاتا ہے آنکھیں بھیگ جاتی ہیں اسی قسم کے آنسو میں رنگینی، رعنائی اور خوبصورتی نہیں ہوتی بے ڈھنگا پن ہوتا ہے غم کے آنسو میں تاثیر دلکشی ندرت اور عجیب طرح کی نشاط ہوتی ہے ایسے آنسو تاریخ ساز عصر آفریں ہوتے ہیں اُن سے دُنیا کے بڑے بڑے المیے وابستہ ہیں ان میں سقراط کی موت کا درد ہے جس نے زہر کا پیالہ پی کر جان دی تھی پیالہ زبردستی اس کے لبوں سے لگا دیا گیا تھا اس طرح دنیا ایک حکیم کی عقل و دانش اور اس کی روشنی سے محروم ہو گئی تھی محرومی کا زخم آج تک کائنات کے احساس میں ناسور بن کر رِس رہا ہے، پھر عیسٰی کی پھانسی کا کرب ہے اور حسینؓ کی شہادت کا دائمی نوحہ ہے اس پر زمین و آسمان مل کر گریہ وزاری کرتے ہیں غم کے آنسو میں رنج اور نشاط دست و گریباں رہتے ہیں کسی بہت بڑی ٹریجڈی پر غور کرتے وقت جب کوئی آنسو پلکوں پر لرزنے لگتا ہے تو شیشہ دیکھے بغیر انسان کو اس میں اپنے حسن کی تابانیاں نظر آنے لگتی ہیں دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے دل میں خوشی کی شہنائیاں بجنے لگتی ہیں جی چاہتا ہے کہ روتے ہی رہو آستین ہی کو نہیں دامن کو بھی بھگو لو جب کسی محبوب ہستی کی برسی پر آنکھ سے آنسو ٹپک جاتا ہے تو ایسا لگتا ہے کہ یہ حادثہ ایک سال اور آگے بڑھ گیا اور یاد کا فرض ادا ہو چکا برسی کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ دل کی جراحتیں تازہ ہو جائیں شعور میں وہ یادیں روشن ہو جائیں جو بیتے ہوئے سال کی اندھیری میں کھو گئی تھیں اور پلک پہ چمکتے ہوئے آنسو کا آبدار موتی اس بات کی علامت بن جاتا ہے کہ برسی کی رسم ناکام نہیں رہی سپھل ہو گئی آنسوؤں کی بہت سی قسمیں ہیں بچوں کے آنسو، عورتوں کے آنسو، بوڑھوں

ہمدرد نرسنگ ہوم۔ آصف علی روڈ۔ نئی دلی ۱۱۰۰۰۲

اور جوانوں کے آنسو اس میں ایک اور روایتی آنسو یعنی مگرمچھ کے آنسو کا اضافہ کر لیا جائے تو تعداد بڑھ جاتی ہے بچوں کے آنسوؤں میں ضد کی گھلاوٹ ہوتی ہے ان کو چاکلیٹ اور بسکٹوں سے خشک کیا جا سکتا ہے عورتوں کے آنسوؤں میں دغا اور جفا کا ایسا ہنر ہوتا ہے جس میں حلاوت ہی نہیں تلخی بھی ہوتی ہے بوڑھوں کے آنسوؤں میں آخرت کے خوف اور جنت کی آرزو کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا اس شعر کی گونج ضرور سنائی دیتی ہے۔

دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہے
عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

جوانوں کے آنسوؤں میں رومان کی مٹھاس ہوتی ہے کبھی ہجر و فراق کی کڑواہٹ گھل جاتی ہے۔ اسی کے ساتھ غمِ روزگار کے افسانے ہوتے ہیں مگر مچھ کے آنسو غیر صحتمندی، حرص و ہوس فریب اور لالچ کا آمیزہ ہوتے ہیں یہ کہنے کو مگرمچھ کے ہوتے ہیں مگر وہ مگرمچھ انسانوں ہی کا سمبل ہوتا ہے ایسے انسانوں کا جن کی فطرت اس سے ملتی جلتی ہوتی ہے

آنسو بہت بڑا تاریخی سمندر ہے اس میں دنیا کی ان گنت کروٹیں پوشیدہ رہتی ہیں اور نہ جانے کتنے انقلابات کی گونج ہوتی ہے آنکھوں کی صدف صادق کے یہ موتی سیپ میں بھرے ہوئے موتیوں سے زیادہ چمکیلے آبدار اور بیش قیمت ہوتے ہیں۔ ان میں خونِ جگر کی تابش اور امنگوں کے لہو کی رنگ آمیزی ہوتی ہے، جو رگوں میں دوڑتے دوڑتے آنکھوں کی کھڑکیاں کھول کر باہر آ جاتا ہے۔

▲▲

"کرشن موہن کو زندگی کے جنسی پہلوؤں سے خاص دلچسپی ہے۔ شاید اس وجہ سے کہ موجودہ زندگی میں جنس کے بے محابا اظہار نے اس کی وہ پراسرار لذت کم کر دی ہے جو شوق کے لیے مہمیز کا کام کرتی تھی۔ زندگی کے دوسرے مظاہر، خاص کر سماجی انسان کے مسائل، ان سے سبق آموزی کا رجحان بھی کرشن موہن کے یہاں موجود ہے۔ ان کا براہِ راست اسلوب اظہار مطلب کے لیے کافی اور اکثر جگہ اس تاثیر کا حامل ہے جو دو ٹوک بات کا خاصہ ہے۔
غزلوں میں فارسی اور ہندی الفاظ پر یکساں قدرت، غیر مردف اشعار کی کثرت، مشکل قافیے اور بے تکلف گفتگو کا انداز بیان انھیں دور حاضر کے غزل گو شعرا میں ایک منفرد مقام عطا کرتا ہے۔"
——— شمس الرحمٰن فاروقی

کرشن موہن کا تازہ ترین کلام

کفرستان

ضخامت: دو سو صفحات، ڈیمائی سائز، آفسٹ کی چھپائی ———
قیمت: بیس روپے

ناشر
نیشنل اکاڈمی، ۹ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

اُردو کی چند زندہ و پائندہ کتابیں

نسخۂ عرشی زادہ

غالب کے اپنے قلم کا نقل کیا ہوا اردو دیوان جس کے اعلیٰ ترین معیار ترتیب و طباعت کا شہرہ ہے اور جسے بہترین آرائش و تزئین کتب کا نیشنل ایوارڈ حکومت نے عطا کیا ہے۔
قیمت : سپر ڈی لکس ایڈیشن ۔/۱۰۰ روپلے

ٹیڑھی لکیر

عصمت چغتائی ہی کا نہیں اردو کا سب سے مقبول ناول، قیمت ۔/۱۶ روپلے

غم غلط

شوکت تھانوی کے مزاحیہ کلام کا مکمل مجموعہ جو قہقہوں کا خزانہ ہے۔ قیمت ۔/۵

شیر کیا سوچتا ہوگا

جنگلی جانوروں کے بارے میں سیّد رفیق حسین نے یہ افسانے برسوں کی شکاری کے تجربے سے لکھے ہیں اور یورپ کے لکھنے والوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ قیمت : ۔/۱۰ روپلے

نکات و رقعات

مرزا غالب کا ایک نادر مجموعہ جسے عرشی زادہ نے حسن و ترتیب سے پیش کیا ہے
قیمت : ۱۰ روپلے

چچا چھکن

امتیاز علی تاج کے لازوال بدحواس چچا چھکن کے کارنامے جو ضرب المثل بن چکے ہیں ۔ قیمت : ۔/۶ روپلے

رسوم دہلی

سید احمد دہلوی فرہنگ آصفیہ والے کی زبان سے سیکڑوں رسموں کا دلکش بیان وہ رسمیں جنھیں ہم بھولتے جارہے ہیں ۔ قیمت : ۔/۱۰ روپلے

پری خانہ

واجد علی شاہ رنگیلے پیا نے اپنے رنگین معاشقوں کی داستان خود ہی سنائی ہے ۔
قیمت : ۔/۱۰ روپلے

چھیڑ غالب سے

جوان ظریف غالب کی زندگی پر دلچسپ اور منتخب ڈرامے اور افسانے ۔
قیمت ۔/۱۴ روپے

جزیرۂ سخنوراں

ہمارے شاعروں کے کھوکھلے پن پر غلام عباس کا یہ طنزیہ ناول زبان و بیان کا شاہکار ہے۔
قیمت ۔/۵ روپے

بہو کی تلاش

کم سے کم تیاری کے ساتھ لیکن انتہائی کامیابی سے کالج اسٹیج پر کھیلے گئے مزاحیہ ڈرامے مجموعہ آپ کے بھی بہت کام کا ہے۔ قیمت ۔/۶ روپے

جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں

سنگ دل تیمور لنگ جراءت لچائی خاتون حسن و عشق کے سامنے سرنگوں ہو گیا عزیز کے اس ناول کا موضوع ہے ۔
قیمت ۔/۶ روپے

نگار رام پور کے فائل ۶۴-۱۹۶۳ء کے متفرق پرچے ایک ہی جلد میں ۔ اہم تنقیدی تحقیقی مضامین کے علاوہ فن تاریخ گوئی سے متعلق دو مستند کتابیں یعنی جلال لکھنوی کی افادۂ تاریخ اور نامور شعرائے اُردو کے قطعاتِ تاریخ ہائے وفات کا مجموعہ تاریخ لطیفہ بھی اس جلد میں شامل ہیں ۔ صرف چند کاپیاں ہی اسٹاک میں موجود ہیں ۔ قیمت ۔/۳۰ روپے

ہم سے طلب کیجیے

پہلا پھول

آمنہ ابوالحسن

سالی کے تھنوں پر ہاتھ رکھتے ہی اُسے اپنی انگلیوں میں ایک ٹیس سی محسوس ہوئی اور پھر یہ ٹیس دائروں کی شکل میں گھومتی اس کے سارے جسم میں پھیل گئی۔

سالی! اُس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا اور ہاتھ روک لیے۔ ایک بیڑی منہ میں رکھکر سلگائی اور پھر سالی کے تھن تھام لیے۔ سالی مزے مزے سے ہری ہری میٹھی میٹھی گھانس پر منہ مارتی رہی اور رمّوا کے ہاتھ تیزی سے چلتے رہے۔ جب بالٹی لس لس کرتے دودھ سے بھر گئی تب رموا نے اطمینان کی سانس لے کر بالٹی اپنے گھٹنوں سے نکال فرش پر دھری اور دوسری بیڑی سلگائی تب کالی کی پیٹھ پر ایک پیار بھری چُچکاری دے کر وہ تیز تیز قدم اٹھاتا سائبان الانگ تنگ کوٹھری میں داخل ہوا اور دودھ سے چھلکتی بالٹی دبلی کے سامنے رکھ دی۔ نیم اندھیری کوٹھری میں دبلی کی آنکھیں تاروں کی طرح دمکنے لگیں مگر ماں کی دمکتی آنکھوں سے بالکل ہی بے نیاز رموا نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا کر ایک زوردار انگڑائی لی جیسے ٹیس بھرے دائروں کو اپنے بدن سے باہر نکال رہا ہو تب گھوم کر اُس نے دوبارہ سائبان پار کیا اور کھلے میدان میں نکل آیا ——

آج صبح کی ستھری روشنی میں لکڑی کے ٹھیلے پر اُس نے چندن کو میٹھے گنا چباتے دیکھا۔ سُرخ انگیا میں اس کی کسی ہوئی چھاتیاں ہاتھوں اور دانتوں کے ہر جھٹکے کے ساتھ ہلکورے لے رہی تھیں اور منگل ہاتھ میں کلہاڑا تھامے چندن سے ذرا پرے گنگنا رہا تھا اور لکڑیاں چیر رہا تھا۔ رموا کو دیکھ کر چندن نے اپنی ایک آنکھ بڑی ادا سے دبائی اور گنے کی بچی ہوئی گنڈیری اُس کی طرف اُچھال دی۔

"لے۔ اب تو چبا ڈال۔ میرے تو دانت دُکھنے لگے"۔

رموا نے اُچھل کر آتی ہوئی گنڈیری پکڑی اور اپنے مضبوط دانتوں میں دبالی۔ رس کا ایک ریلا سا اُس کے منہ کو بھر گیا۔ جلدی سے ایک بڑا گھونٹ لے کر اُس کو نگلا اور مستانہ انداز میں بولا —— "سالی......!"

چندن مسکرائی۔ منگل نے کلہاڑا روک کر اُسے دیکھا۔ رموا نے گنڈیری ٹھیلے پر ڈال کر جیب سے بیڑی برآمد کی اور ہونٹوں میں لگالی پھر دوسری بیڑی منگل کو دیتے ہوئے بولا ——

"ارے منگلوا۔ دم بھر کو رُک جا۔ ایک بیڑی پی لے بھیا پھر لکڑی چیر لینا۔ اب اتنی محنت بھی کس کام کی —— !"

منگل نے کلہاڑا رکھکر رموا کی جلتی ہوئی بیڑی سے اپنی بیڑی سلگائی اور پوچھا ——

"دودھ لیا دودھ —— ؟"

"ہاں"

"بازار نہیں جا رہا —— ؟"

"آج ماں جائے گی"

"تو پھر لے میری تھوڑی لکڑی چیر ڈال ——" منگل نے کلہاڑا اس کی طرف سرکایا۔ رموا نے کلہاڑا تھام کر جب

لکڑی پر پہلا وار کیا تو اُسے لگا اُس نے لکڑی نہیں چیری ہے اپنے ہی جسم کا ایک حصّہ چیر ڈالا ہے۔ جانے کس اندرونی کرب سے وہ چلّایا ــــ ہائے ــــــ اور ٹھیلے سے اُچک کر چندن اُس کے بالکل قریب آ گئی ــ

"کیا ہوا رے ــــ کٹ گئی اُنگلی ــــ؟"

رموا نے چڑھی چڑھی آنکھوں سے چندن کی سُرخ انگیا کو دیکھا اور بولا ــــــ

"نہیں ــــــ گھاؤ تو کوئی نہیں پر . . . !"

"پر کیا ــــــ" چندن نے بھولپن سے پوچھا۔

"تیرا سر ــ" رموا نے کلہاڑا پٹخ دیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا آگے نکل گیا ــــــ

"کام چور کہیں کا" منگل نے غصّہ بھری آنکھوں سے اُسے جاتے ہوئے دیکھا اور چندن سے بولا ــ

"جا۔ جا کر چولھا گرم کر مجھے بھوک لگی ہے"

چندن نے ایک قلانچ بھری اور دوسرے ہی لمحے اپنی کوٹھری کے ملگجے میں غائب ہو گئی۔

"سالی!" منگل بڑبڑایا "بیاہ مجھ سے اور ورد دوسرے کا" ــــــ اُس نے کلہاڑا تھام کر لکڑی پر پے در پے وار کر ڈالے گیلی لکڑیاں چیخ چیخ کر ٹوٹتی رہیں اور رموا دھوپ کی پہلی پہلی کرنوں سے اپنے بدن کو سینکتا سوچتا رہا ــ

کاش ...... اے کاش ....

جس طرح شام پڑے گگن پر ایک ایک تارا نمودار ہونے لگتا ہے اُسی طرح اُس کے دل و دماغ میں آرزوئیں اُبھرنے لگیں چمکیلی چکاچوند آرزوئیں اور اُسے پتہ بھی نہ چلا کہ دُبلی دودھ کی بالٹی اُٹھائے کب اُس کے بازو سے گزر گئی اور روٹی بناتے بناتے چندن نے کتنی بار اپنی ملگجی کوٹھری سے جھانک جھانک کر اُس کے دھوپ میں نہاتے بدن کو محبّت کے غرور سے دیکھا جیسے اپنی بے زبانی کے باوجود کہہ دینا چاہتی ہو کہ میں تو پیدا ہی تیرے لیے ہوئی تھی رے مگر جانے کس طرح منگل درمیان میں آگیا۔

جب آرزوؤں کے ہجوم نے رموا کو پریشان کر دیا تو اُس نے اپنا سر جھٹکا اور اُسی دم لالو نے پیچھے سے آ کر ایک چپت اُسے لگائی۔

"ابے چلتا ہے کہ نہیں ــــــ دنگل تو شروع بھی ہو چکا ہوگا"

"نہیں یار ــــ" رموا بولا ــــ "آج میرا من نہیں"

"ہیں ــ یہ کیا بات ہوئی ــ" لالو پھسکڑا مار کر اُس کے پاس بیٹھ گیا ــــ "کیوں من نہیں آخر ــــ؟"

"بس کہہ جو دیا من نہیں۔ کیا رکھا ہے دنگل ونگل میں ــ"

لالو نے آنکھیں پھاڑ کر رموا کو دیکھا ــــ "اور جو اب تک کسرت کرتا رہا اُس کا کیا بنا" ــــ تب رسان سے پوچھا ــــ

"مگر ہوا کیا ــــ؟"

"کچھ نہیں ــــــ"

"تب ــــــ؟"

"ابے جاتا ہے کہ نہیں ــــــ" رموا نے بپھر کر لالو کو دیکھا۔

"کہہ رہا ہوں من نہیں پھر بھی اپنی ہی ہانکے جا رہا ہے ــ"

لالو چُپ ہو رہا۔ اُس نے دُھوپ کی کسی اُبھرتی کرن کو محسوس نہیں کیا بس ٹکٹکی باندھے رموا کو دیکھتا رہا اور اُس کی نظر تلے رموا کے جی میں آئی ایک بار اپنے جسم میں اُٹھتی ٹیسوں کے بارے میں اُسے بتا ہی دے لیکن ــــ لیکن رموا چُپ رہا اور بیڑی کے دھوئیں کے گول گول مرغولے بنا بنا کر ہوا میں بکھیرنے لگا ــ

لالو نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا۔ بالوں کی چکنائی کو تہمد سے پونچھ کر اُٹھا اور مری ہوئی آواز میں بولا۔

"اپن تو چل دیے یار ــــ بیکار بیٹھا نہیں جاتا ــــ"

"جا جا" رموا بے دلی سے بولا ــــ "مجھے بیٹھنے کے

لیے کہا کس نے ـــــ"

اور پھر جب اس کی رد کھائی سے حیران حیران لالو نظروں سے اوجھل ہو گیا تو رموا نے ہونٹوں میں دبی بیڑی انگلی کے جھٹکے سے پرے پھینکی اور بڑے بڑے قدم اٹھاتا کوٹھری کی طرف چلا۔ اس کے پیٹ میں بھوک سے چوہے پھدک رہے تھے۔ کوٹھری کی زنجیر اتار کر اس نے جیسے ہی اندر قدم رکھا ٹھٹھک گیا۔ لال انگیا میں مودکر کیسے چندن کوٹھری کے بیچوں بیچ کھڑی ہوئی تھی اور چھت کے چھیدوں سے چھنتی ہوئی روشنی بہت سی آنکھوں کی طرح ادھر اُدھر پھیلی ہوئی تھی۔

روشنی کی آنکھوں اور اپنی بے تحاشہ بھوک کو نظر انداز کر کے رموا متوالے انداز میں بولا ـــــ

"چندنوا تو ـــــ؟" اور بے خودی کی حالت میں بے اختیار آگے بڑھا "مگر سنگل تو ماں نے چڑھائی اور میں نے اُتاری پھر اس بیچ تو کوٹھری میں کہاں سے آگئی ـــ؟"

چندن کو لپک لینے وہ بے تابانہ بڑھا۔

"جانتا ہوں دادھیچ چلا کر منگل ہم دونوں کے بیچ ضرور ٹپک پڑا مگر دیکھ لینا ایک دن مَیں اُس کی لکڑی ہی کی طرح چیر کر پھینک دوں گا۔"

چندن پیچھے ہٹ گئی۔

"مسخری کرتی ہے" وہ ناز سے اٹھلایا "مگر جب میری کوٹھری میں آئی ہے تو ـــــ تو....؟"

وہ مسکرایا۔ چندن بھی مسکرائی۔ رموا پھر اس کی طرف لپکا۔ چندن پھر جُل دے گئی۔

"دیکھ چندنوا ـــ جیا مت ترڑپا۔ آئی ہے تو ذرا میری باہوں کی مضبوطی بھی دیکھ لے" وہ نچلا ہونٹ دبا کر پھر مسکرایا ـــ "تو تجھے پتہ چل ہی گیا نا کہ میرے جسم میں کیسی ٹیسیں اٹھی ہوئی ہیں ـــ؟"

اس نے اپنے ہاتھ حلقے کی طرح پھیلائے ـــ

"آجا ـــ بس آ بھی جا ـــ" مگر چندن پھر ہرے و گئی۔

"تو مسخری پھر آئی کیوں۔ پیاسوں کی پیاس بڑھانا کوئی اچھی بات ہے کیا ـــ؟"

چندن بس مسکراتی رہی۔

رموا نے نڈھال ہو کر سوچا ـــ وہ اتنی سی چھوکری کو پکڑ کیوں نہیں پا رہا ہے۔ کیا اس میں اتنا بھی کس بل نہیں ہے؟ اور تبھی گھانس چباتی کالی نے ممیا کر کہا ـــ

میں...... میں...... میں.....

رموا نے کالی کو ایک موٹی سی گالی دی اور سوچ لیا اس مرتبہ وہ چندن کو ہرگز چھوٹنے نہ دے گا۔ باہوں میں بھر کر کم از کم ایک پیار تو کر ہی لے گا تب پینترا بدل کر وہ اُچھلا اور پارے کی طرح مچل کر اڑان بھرتا سیدھا چندن پر جا پڑا ـــ

"اوہ ماں ـــ" دبلی نے خالی بالٹی چیخ کر اپنے پاؤں سے اس کی پیٹھ پر ایک دھپ جماتے ہوئے کہا۔

"ساری گھانس مسلے ڈال رہا ہے ـــ نگوڑے ـــ منہ جلے تجھے ہو کیا ہے آخر ـــ؟"

اور ماں کی آواز پر گھبرا کر رموا نے آنکھیں ملیں تو دیکھا کہ خالی کوٹھری میں وہ اکیلا ہی اڑن گھائیاں بھرتا رہا ہے اور کالی کی ساری کومل گھانس اس کی ٹھوکروں سے فرش پر ادھر اُدھر پھیل گئی ہے۔ اس نے ایک دم اپنی کنپٹیاں داب لیں اور کوٹھری سے باہر نکل گیا۔ اسی وقت دیکھا کہ سرسوں کے ساگ کے ساتھ گرم گرم روٹیوں کا تھال چندنوا منگل کے سامنے رکھ رہی ہے اور اس کے تیل سے چپڑے ہوئے کالے کالے بالوں میں ایک پیلا پھول ہنسے جا رہا ہے۔

رموا کے جلتے بدن پر پانی کی چھینٹیں سی پڑ گئیں۔ ایک گھٹی گھٹی آہ اس کے سینے میں بھالے کی طرح جم گئی ـــ یہ پھول جو میرے من میں کھلا تھا میرے جیون کی خوشبو کیوں نہ بن سکا ـــ؟

(باقی ص ۲۹ پر)

شروَن کمار ورما

خط

خط استوا سے لے کر خط رخسار تک خطوط کا ایک ایسا سلسلہ پھیلا ہوا ہے کہ بڑے بڑے راستہ بھول جاتے ہیں۔ کچھ اسکول کا کچھ گھر کا۔

خط استوا بھی معشوق کی کمر کی طرح ــــ ہر چند کہیں کہ ہے پر نہیں ہے۔ کچھ حضرات نے جنھیں ’ذرلیل جیوگریفی‘ میں صرف عورت کے جغرافیہ میں دلچسپی تھی ... ‘ ان خطوط کی تلاش ہی میں زندگی گذار دی‘ ــــ یعنی دو آرزو میں کٹ گئے‘ دو انتظار میں۔ جنھیں دھرتی کے گول ہونے کی فکر لاحق تھی‘ انھوں نے یہ خط نہ ملنے پہ نقشوں اور گلوب پر بنا لیے اور اس طرح بچوں کو ڈرانے‘ دھمکانے اور روزی کمانے کا باعزت طریقہ ایجاد کر لیا۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ اگر یہ خط نہ ہوتا تو دنیا کا جغرافیہ کچھ اور ہوتا۔ ویسے یہ سب مانتے ہیں کہ اس خط کی اہمیت سالانہ امتحانات اور اسکول میں جرمانہ وصول کرنے سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس کے بغیر بھی دنیا وہی ہوتی جو اللہ میاں نے تخلیق کی تھی۔

خط استوا کے چکر سے نکلتے ہی یہ لوگ خطِ رخسار کے چکر میں پڑ جاتے ہیں۔ خط استوا سے بازار گرم اور آب و ہوا مرطوب رہتی ہے یقین نہ ہو تو ان ممالک اور علاقوں کو دیکھ آئیے جہاں سے یہ ظالم خط گزارا گیا ہے۔ وہاں کی تہذیب اور بد تہذیبی میں بھی اس خط کا گہرا دخل ہے جہاں جہاں سے یہ خط گذارا گیا وہاں سے فوجیں گذارنا بھی لازم ہو گیا۔ اہلِ فرنگ کا کہنا ہے کہ انھیں ان علاقوں پر قبضہ کرنے کا سوال صرف اس خط کی وجہ سے آیا تھا۔ وہ ان تمام جگہوں پر قابض ہو گئے جہاں سے یہ خط گزرتا ہے یا جہاں اس کے اثرات پائے جاتے ہیں اور اب تک وہ اس خط سے حظ اٹھا رہے ہیں۔ معلوم نہیں صاحب یہ لقطے کی بات ہے یا مکتے کی۔

خط رخسار کا معاملہ الٹا ہے اس سے بازار سرد پڑ جاتا ہے اردو شاعر تو اس کے خاصے شکار رہے ہیں۔ مرزا غالب نے جب یہ دود شمع کشتہ دیکھا تو جھنجھلا کر ’پیش دستی کر بیٹھے‘ نوبت وصول دیے تک پہنچی میرؔ نے گھر اور عطار کی دوکان کے ریخ پر سوں چکر لگائے۔ کچھ نے پھیلا تنگ لگائی اور بند قبا سے الجھ گئے آسکر وائلڈ زندہ دل تھا۔ ہنستے کھیلتے جیل چلا گیا۔

جیل کا ہماری زندگی‘ ادب اور خطوط سے چولی دامن کا ساتھ ہے لیڈر بننے کے لیے جیل کا استعمال ضروری ہے۔ اب لوگ شاعر اور ادیب بننے کے لیے بھی جیل چلے جاتے ہیں جب سے جیلوں میں سہولیات مہیا کی جا رہی ہیں‘ غریب غربا اپنے بچوں کو پرورش اور تربیت کے لیے سیدھے ادھر ہی بھیج دیتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ باہر حالات زیادہ بہتر نہیں ہیں۔

جیل نے خطوط کو نیا رنگ بھی دیا ہے اور انداز بھی سنوارا بھی ہے۔ بگاڑا بھی ہے کچھ تو جیل کی آب و ہوا کے ایسے عادی ہو جاتے ہیں کہ باہر آتے ہی پھر وہاں جانے کا فوراً انتظام کر لیتے ہیں کچھ کے حکام عادی ہو جاتے ہیں اور جلدی ہی انھیں واپس منگانے کا بندوبست کر لیتے ہیں

کچھ لوگوں نے جیلوں سے ایسے ایسے خط تحریر کیے ہیں کہ اپنے ساتھ جیلوں کو بھی امر کر گئے۔ لوگ ان کوٹھریوں کے درشن کرنے جاتے ہیں۔ بہت سی بیگمات محض اس لیے مشہور

۱۸۰/۱۱ کوچہ لمبان امرتسر ۱۴۳۰۰۱

ہو گئیں کہ ان کے میاں جیل سے باقاعدہ خط لکھا کرتے تھے کبھی کبھی ان خطوں میں ایسا ڈھکا چھپا جملہ ہوتا تھا کہ حکومت اشارہ سمجھ کر بیرول پر رہا کر دیا کرتی تھی۔ اس رہائی کے وقفہ میں وہ ہاتھوں کی کھجلی کو شکار ہو رہا کرتے تھے۔

خدمتِ ادب کے لیے ہر شاعر و ادیب کو سال میں کم از کم تین ماہ کے لیے جیل ضرور جانا چاہیے لیکن دو شاعر اور ادیب کسی صورت میں کبھی ایک کوٹھری میں نہ رکھے جائیں ورنہ ان میں سے ایک یا تو خودکشی کر لے گا یا پھر نقاد ہو جائے گا۔

مرزا غالبؔ کے آم اور خط دونوں ہی مشہور ہیں انھوں نے یہ خط نہ تو نقاد حضرات کے لیے تحریر کیے تھے اور نہ ہی یونیورسٹیوں کے نصاب کے لیے۔ دراصل یہ طریقہ نکالا تھا انھوں نے نامہ بردوں کو سزا دینے کا۔ اکثر سلام بھی بھجوایا کرتے تھے۔ آخر آخر تو وہ صبح صبح کان پر قلم رکھ کر نکل جاتے اور گلی گلی آوازیں لگاتے پھرتے۔ خط لکھوا لو۔

خط کا سلسلہ جغرافیہ جیومیٹری سے ہوتا ہوا ایڈیٹری تک پہنچتا ہے۔ ایک مرنے سے پہلے اور دوسرا مرنے کے بعد کام آتا ہے۔ جیومیٹری میں خط مستقیم اور ایڈیٹری میں تعریفی خط خاص اہمیت رکھتے ہیں خط لڑکی کا ہو تو ایڈیٹر دفتر بند کر کے کوئی ہاؤس میں جا بیٹھتا ہے اور خط میز پر رکھ لیتا ہے۔ اکثر لوگ تو جائداد بیچ کر صرف اس لیے ایڈیٹر بن بیٹھتے ہیں کہ پردہ نشینوں کے خط آئیں گے۔ کچھ حضرات ادیبوں کی طرف سے اپنے آپ کو خود خط لکھنے کا لائسنس لے لیتے ہیں۔ ان خطوط سے دونوں کا شکریہ اور بھابی کو سلام ہوتا ہے۔ کچھ خط ایجنسی ناموں کی فہرست میں آتے ہیں یعنی۔ اپنے شہر میں پرچہ لگوائیے تو آپ کی تخلیق قابل اشاعت ہوگی ورنہ نہیں۔

کئی حضرات نہایت غیر رومانٹک اور سخت جان ہوتے ہیں۔ ان پر تعریفی خطوط کا اثر کم ہوتا ہے۔ آپ آندھی میں چراغ جلائے ہوئے ہیں میری اور میرے تمام عزیزوں کی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں اسی طرح گھر کا سامان بیچ کر پرچہ نکالتے رہیے۔ خدا نے چاہا تو ایک صبح آپ آسمان ادب پہ چاند جی نہیں، سورج بن کر چمکیں گے۔ ایک کہانی، ایک نظم، ایک غزل، ایک رباعی، ایک قطعہ، ایک مضمون (جواب مضمون نہیں) اور ایک درجن تبصرے بر کتبوں کی نہیں اپنی، بھیج رہا ہوں۔

خط کو تار سمجھنے کا رواج کم ہوتا جا رہا ہے۔ اب تو تار کو بھی خط سمجھا جاتا ہے۔ کچھ لوگوں کو ملکہ حاصل ہے کہ خط کا مضمون بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر۔ اکثر یہ ان لڑکیوں کے لیے کہا جاتا ہے جو اونچ نیچ کی پروا کیے بغیر کپڑے برائے نام پہنتی ہیں اور اکثر چار گرہ کپڑے کی قسمت پہ رشک اور افسوس ایک ساتھ ہوتا ہے۔

اسلوبیات پر پہلی مکمل، مفصل اور باقاعدہ کتاب
ڈاکٹر امیر اللہ خاں شاہین
کی تازہ تصنیف
اُردو اسالیبِ نثر
جو ۱۱ ویں سے بیسویں صدی تک کے اسالیب کا محاکمہ ہے۔
قیمت : ۲۵ روپے

محمود خاور کی اولین تنقیدی اور تحقیقی کاوش
آثر لکھنوی : حیات اور کارنامے
خوبصورت گٹ اپ، دیدہ زیب سرورق، معیاری کتابت وطباعت اور مضبوط جلد۔
قیمت ڈی لکس ایڈیشن = ۲۰/-، عام ایڈیشن = ۱۵/ روپے
نیشنل اکاڈمی
سے طلب کریں

غزلیں

ضیا فتح آبادی

نگاہِ شوق! رسوائی کا ڈر ہے
چمن کا غنچہ غنچہ خود نگر ہے

ہنر کی عیب جوئی، توبہ توبہ
عجب کوتاہیِ اہلِ نظر ہے

وہی فریاد ہو کیوں میرے دل کی
لبوں پر آکے بھی جو بے اثر ہے

اُفق سے تا اُفق رودادِ میری
مگر یہ قصہ کتنا مختصر ہے

گلی کے موڑ پر ملتا ہے اکثر
وہ دیوانہ جو تیری راہ پر ہے

میں تم سے دور ہی کتنا ہوں، دیکھو
وہ اُن پیڑوں کے پیچھے میرا گھر ہے

اُجالی ہیں کئی راتیں اسی نے
ضیائے خستہ اب شمعِ سحر ہے

کرشن مُراری

سوچ کو مل گئی ایک منزل نئی
خواب دلکش سجانے لگی زندگی

دل لُبھاتی رہی دل دکھاتی رہی
آس کی روشنی۔ یاس کی تیرگی

نخلِ غم کی نہ کچھ پرورش کر سکے
دھوپ چھاؤں میں اُلجھی رہی زندگی

کوئی گزرا ہواؤں کی شورش لیے
رہگذر ایک نقشِ صدا بن گئی

ایک لمحۂ عقیدت میں جو ڈھل گیا
بن گیا ہے وہی حاصلِ زندگی

شوخیاں موسموں کی نہ راس آسکیں
کس قدر تھک گئی تھی لگن اب مری

حادثے کچھ نئے مل گئے راہ میں
آگہی آگہی سے اُلجھتی رہی

سوچ کی اُنگلیوں نے ٹٹولا ہے
بات کچھ روشنی کی اندھیر وں میں تھی

یہ بھی اچھا ہوا اک بھرم رہ گیا
پھول کے ساتھ تھی پھول کی تازگی

J-5/21 ۔ راجوری گارڈن ۔ نئی دہلی
۴م ۔ سی ۔ اردن روڈ ۔ نئی دہلی

نظمیں

ابوالفیض سحر

پاسبانِ حرمِ گل کی طرح

یہ فطرت کی تجلی ہے
کہ کردار کی شفق
کہ روش روش، صحرا بہ صحرا
ایک سایہ سا سیاہ سا
بے نام و نشاں سا
سرخرو ئی کی خواہشِ سیاہ کے بغیر
زر پیرہنی کی گرمیِ طمع کے بغیر
اپنے سینے میں چھپائے
درد کی آگ
تڑپ کی روشنی
زاہد نفس، مسیحا صفت
راہبِ شب زندہ دار کی طرح
جلتا رہتا ہے رات بھر
مسکراتی کلیاں، مہکتے پھول
اجالوں کی انگلیوں سے

▲▲

گلیشیر

یہ ہجومِ رنگ و بو
یہ ہنگامۂ حیات
یہ تماشائے روز و شب
کوئی بازیچۂ اطفال ہو کہ نہ ہو
خواب کسی دیوانے کا ہو کہ نہ ہو
مگر
ایک گلیشیر ہے دیو قامت سا
پانیوں پہ سمندروں کے
تیرتا ہوا، آن سے شان سے
ڈوبا، ڈوبا سا
ابھرا، ابھرا سا
بے نام بستیوں سے آتا ہے
اور بہتا رہتا ہے دھیرے دھیرے
ان دیکھی منزلوں کی طرف
مگر
گرمیٔ قربِ نشانِ منزل سے
پگھل جاتا ہے
پگھل جاتا ہے
پھر پانیوں سے مل کر ہو جاتا ہے پانی پانی
بے رنگ و بو، بے نام و نمو

▲▲

عظیم اختر

مناجات

خدائے بزرگ و برتر
تو عظیم تر ہے، عظیم تر ہے
تیری ذات ہے لم یزل
ترا وصف ہے عز و جل
تری حمد ہو کس زباں سے
ترا شکر ہو کس طرح ادا
— میں، کہ ایک گدائے بے نوا
لیے دل میں ایک خلش
ترے در پہ سربسجود ہوں
میرے درد کو، میرے کرب کو
میری روح کے خلفشار کو
بدل دے تو سکون میں
یہی ہے میری التجا
خدائے ذوالجلال
تیرے حضور میں —!!

▲▲

○ ۲/۱۱ جنگ پورہ ڈی، نئی دلی ۱۱۰۰۱۴
○ رنگ محل خورد، پھاٹک حبش خان، دہلی

چندر بھان خیال　شہرِ تاریک

رات کی زلف معطر نہ بدن شعلہ فگن
سرد آغوشِ فضا، چاند کے ماتھے پہ تھکن
کوئی ہم رقص، کوئی ساز نہیں پہلو میں
صرف آواز سُلگتی ہے مرے کانوں میں

کھڑکیاں بند کیے لوگ سیہ خانوں میں
راحتِ قلب کو ڈھونڈیں گے اُن افسانوں میں
جن کی تحریر میں آغاز سے انجام تلک
حرف در حرف اُبلتی ہے اذیت کی شراب

گزرے لمحوں کا بھی رکھتے ہیں جو اُنگلی پہ حساب
وہ کسی غار میں دُبکے، لیے ہاتھوں میں کتاب
منتظر ہوں گے کہ سورج کے شرارے چمکیں
تاکہ الفاظ کے سینوں کی سیاہی پگھلے

کوئی ذی ہوش اگر ہے تو سنبھل کر نکلے
شہرِ تاریک میں دانا کی چلی ہے نہ چلے
تربتیں سانپ کی داڑھوں سے زیادہ مہلک
فاصلے دھند میں ملبوس بھیانک چہرے

زخم ہر راہ کی چھاتی پہ ابھی ہیں گہرے
روشنی قید یہاں اور نظر پر پہرے
راہرو سخت اندھیروں کے سیہ داغوں کو
اپنے عارض کے پسینے سے نہیں دھو سکتا

خوب اس حال پہ روتا میں اگر رو سکتا
لیکن افسوس کہ ایسا بھی نہیں ہو سکتا
مُردہ رُوحوں کا سکوں لوٹنے والا ڈھونگی
بربطِ عیش و طرب چھیڑ رہا ہے دیکھو

سامنے خوف کا آسیب کھڑا ہے دیکھو
شہرِ تاریک درختوں پہ ٹنگا ہے دیکھو
لاکھ چلّائے کوئی گر کے اب ان راہوں میں
کوئی دروازہ کھُلے گا نہ کوئی آئے گا

۵۵

بھائی پرمانند کالونی، کنگزوے کیمپ، دہلی

راجستھان میں اردو تحقیق

۱۹۶۶ء سے ۱۹۷۶ء تک

ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی

اسے راجستھان کے اہلِ قلم کی بے اعتنائی سمجھا جائے یا مورخین و محققین اردو کی نارسائی سے تعبیر کیا جائے کہ ملک کے جس خطے میں اٹھارویں صدی عیسوی سے اردو زبان وادب کی آبیاری کا سلسلہ جاری ہے زبان کے علمی و ادبی کارنامے عرصۂ دراز تک منظرِ عام پر نہ آ سکے حقیقت یہ ہے کہ راجستھان کی قدیم ریاستوں کے حکمرانوں کی علم پروری اور ادب نوازی کے باعث انیسویں صدی آتے آتے یہاں شعر و ادب کے خاصے چرچے ہونے لگے تھے خصوصاً ۱۸۵۷ء کے پر آشوب زمانے میں دہلی لکھنؤ اور دوسرے مقامات کے بہت سے پریشان حال اہلِ علم و فن فکرِ معاش میں اس خطے میں آکر سکونت پذیر ہوئے اور جا بجا چھوٹے چھوٹے ادبی مرکز نظر آنے لگے جہاں بڑے بڑے شعراء اور ادباء پیدا ہوئے۔ پروفیسر محمود شیرانی جیسے مورخ و محقق اور نقادِ ادب کا مولد یہی سرزمین تھی اور اسی کی خاک میں وہ دفن ہوئے۔

اس میں شک نہیں کہ دوسرے مقامات کی طرح راجستھان میں بھی نظم کے مقابلہ میں نثر کی جانب اہلِ قلم کی توجہ کم رہی چنانچہ بیسویں صدی کے ابتدائی زمانے تک یہاں کے نثری کارنامے برائے نام کہے جا سکتے ہیں خصوصاً تحقیق کا تو فقدان ہی نظر آتا ہے تاہم اس زمانے کے ادبی جلسوں کی مطبوعہ رودادوں اور اخبارات و جرائد کے مطبوعہ مضامین میں اس کے ابتدائی نقوش کی ایسی جھلک نظر آتی ہے جو محققین کے لیے معلوماتی مواد فراہم کرتی ہے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جو اہلِ قلم نے اس خطہ میں علم و ادب کی ترویج و اشاعت اور ادبی سرگرمیوں کو نمایاں کرنے کی کوشش ضرور کی لیکن حقیقت میں ان کا مقصد ادبی تحقیق نہیں تھا اور اس نوعیت کا کام ادبی تحقیق کے ذیل میں شمار بھی نہیں کیا جا سکتا البتہ "History of Urdu Literature" کے مصنف ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے اپنے قیام کوٹہ کے دوران "European & Indo European poets of Urdu & Persian" مرتب کر کے ایک تحقیقی کام انجام دیا۔ لیکن ان کی سکونت مستقل طور پر یہاں نہیں رہی اور پھر یہ کتاب انگریزی میں لکھی گئی البتہ اس کا ضخیم ضمیمہ جس میں شعراء کا کلام ہے اردو میں ضرور ہے۔

آزادی کے بعد اردو میں تحقیق کی رفتار تیز ہوئی راجستھان کے اہلِ قلم کی بھی ادھر توجہ بڑھی۔ دو اہم تذکرے "تذکرہ شعرائے جے پور" اور "بہارِ سخن" (تذکرۂ شعرائے جودھپور) شائع ہو کر منظرِ عام پر آئے نیز خوش نویسوں کا ایک ضخیم تذکرہ بعنوان "صحیفۂ خوش نویساں" بھی شائع ہوا اگرچہ اس کا براہِ راست تعلق اردو زبان و ادب کی تحقیق سے نہیں۔ تاہم اردو تحقیق کے سلسلہ میں اس کو شمار کرنا غیر واجب نہیں ہوگا۔ تحقیقی مضامین اور مقالات بھی لکھے گئے مختلف مقامات پر منعقدہ اردو کانفرنسوں، سمیناروں اور سمپوزیموں وغیرہ میں جو مقالات پیش کیے گئے ان میں سے بہت سے شائع بھی ہوئے نتیجۃً کچھ نئے لکھنے والے ابھرے اور مجموعی حیثیت میں اس خطے میں تحقیق کی رفتار بڑھی۔

لیکچرر شعبۂ اردو۔ گورنمنٹ کالج ٹونک

نوٹ: حاشیے اگلے صفحہ پر

اگرمذکورہ بالا تمام مواد کو یکجا کیا جائے تو خاصہ ذخیرہ فراہم ہوسکتا ہے لیکن تحقیقی اعتبار سے اس میں فروگذاشتوں کا ہونا غیر فطری نہیں جب کہ یہ سارا کام اصول تحقیق کے تحت نہیں کیا گیا اور کیا بھی کیسے جا سکتا تھا اس وقت تک راجستھان کی کسی بھی یونیورسٹی میں اردو کا باقاعدہ شعبہ تک قائم نہیں ہوا تھا۔ نہ وہ حضرات جدید اصول تحقیق سے واقف تھے۔ نہ وسائل تھے نہ مضامین ومقالات کی ترتیب کے سلسلے میں مواد کی فراہمی اور تلاش کے لیے وہ زیادہ وقت صرف کرسکتے تھے ایسی صورت میں اگر اس ذخیرہ کو محض نا معلوم حقائق سے آگاہی تک محدود رکھا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ تحقیق نامعلوم حقائق کو ماضی کے دھندلکوں سے روشنی ہی میں نہیں لاتی بلکہ ان کی توضیح وتصحیح کے ساتھ حدود علم کی وسعت میں اضافہ بھی کرتی ہے اس کے لیے مطالعہ کی وسعت کے ساتھ تاریخی، سماجی اور معاشرتی حالات کے علم اور قوت استدلال کی بھی ضرورت ہوتی ہے اس میں خطابت یا شاعرانہ رنگینی کی گنجائش نہیں ہوتی۔ نہ اس میں مبالغہ کو دخل ہوتا ہے نہ جذبات اور جانبداری کو۔

پچھلے دس سال کے دوران میں راجستھان میں اردو تحقیق سے متعلق جو سب سے اہم پہلو نظر آتا ہے وہ پی ایچ۔ ڈی کے لیے تحقیق کا اجرا ہے۔ راجستھان یونیورسٹی نے پہلی بار ۱۹۷۰ء میں راقم الحروف اور ڈاکٹر محمد علی زیدی صدر شعبہ اردو راجستھان یونیورسٹی کو اردو میں پی۔ ایچ ڈی کی ڈگریاں عطا کیں۔ زیدی صاحب نے مطالعۂ داغ کے عنوان سے اپنا تحقیقی مقالہ مرتب فرمایا تھا اور راقم کا موضوع تھا "راجستھان میں اردو ادب کے لیے غیر مسلم حضرات کی خدمات" اسی طرح اودے پور یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر ثاقب رضوی نے "دیوان بیان" ایڈٹ کرکے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اس وقت تک مذکورہ دونوں یونیورسٹیوں میں اردو میں ایم۔ اے کلاس جاری نہیں ہوئے تھے ریسرچ کی سہولتوں کا تو سوال ہی نہ تھا۔ اساتذہ کو خصوصی طور پر ریسرچ کرنے کی اجازت دی گئی تھی ایسی صورت میں ایک بڑا مسئلہ نگراں حضرات کے تقرر کا تھا۔ یونیورسٹیوں میں اردو کے شعبے نہ ہونے، ریسرچ

(بقیہ حاشیے صفحہ کے) ۱؎ اس سلسلہ میں جے پور میں مولانا محمد حسین متین، حافظ یوسف علی خاں عزیز، پروفیسر عبدالمغنی، مولانا ولایت احمد سندیلوی، پروفیسر حمید اللہ یوسف زئی، مولانا عبدالرشید فاضل قرولوی اور مولانا شاغل کے نام اور اجمیر میں مولانا عبدالباری معنی اور مولانا مضافاتی اور جودھپور میں قاضی معراج الدین وغیرہ کے نام پیش کیے جا سکتے ہیں۔

۲؎ تذکرہ شعرائے جے پور" مرتبہ مولانا شاغل مطبوعہ یونین پریس دہلی ۱۹۵۸ء

"بہار سخن" (تذکرہ شعرائے جودھ پور) مرتبہ شریف الدین یکتا جودھ پوری مطبوعہ محبوب پریس حیدرآباد (سندھ) ۱۹۶۳ء

"صحیفۂ خوش نویسان" مرتبہ مولانا شاغل مطبوعہ مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ ۱۹۶۳ء

۳؎ (۱) کل ہند اردو کانفرنس اجمیر منعقدہ مارچ ۱۹۵۳ء

(۲) روداد کل راجستھان اردو کنونشن جے پور مرتبہ مولانا شاغل مطبوعہ الجمعیتہ پریس دہلی ۱۹۵۶ء

(۳) روداد کل راجستھان اردو سمپوزیم جے پور مرتبہ مولانا شاغل مطبوعہ مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ ۱۹۶۳ء

(۴) روداد کل ہند اردو کانفرنس جے پور مرتبہ مولانا شاغل مطبوعہ محبوب المطابع دہلی ۱۹۶۴ء

(۵) روداد کل راجستھان اردو سمپوزیم جودھ پور مرتبہ وحید اللہ خاں مطبوعہ دہلی پرنٹنگ پریس رامپور ۱۹۶۴ء

(۶) کل راجستھان اردو سمپوزیم اودے پور منعقدہ ۱۹۶۶ء۔

اس سمپوزیم کی روداد ماہنامہ "شان ہند" دہلی کے خصوصی شمارے" (اردو سمپوزیم نمبر) بابت مئی ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی۔

کی سہولتوں کے فقدان اور نگراں حضرات کے مقامی نہ ہونے کی بنا پر کس قدر دشواریاں ہوئی ہوں گی اور مواد کی فراہمی کے لیے کیسی کیسی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا اس کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جو اس راہ سے گزرتے ہیں[1] یہی وجہ ہے کہ ان مقالات کو نہ حرفِ آخر کہا جا سکتا ہے نہ یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ان میں کوئی فروگذاشت نہیں۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے جب مقالات لکھے جاتے ہیں تو وقت مقررہ پر ان کو پیش کر کے ڈگری حاصل کرنے کی ایک فطری خواہش بھی ہوتی ہے چنانچہ عموماً ڈگری مل جانے کے بعد مقالہ کی طباعت کے وقت اس پر نظر ثانی کی جاتی ہے اس کے بعد بھی سقم رہنا ممکن ہے جو خود مقالہ نگار کی نظر میں آتے ہیں یا دوسرے حضرات ان کی نشان دہی کرتے ہیں۔

اس سلسلہ میں پروفیسر گیان چند جین صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی نے خود اپنے تحقیقی مقالہ کے دوسرے ایڈیشن میں اس کا سقم دور کرنے کا ذکر کیا ہے اور پی ایچ ڈی کے مقالات میں خامیاں رہ جانے کی وجہ پر روشنی ڈالی ہے[2]۔ بہرحال مذکورہ مقالات نے راجستھان میں تحقیق کی رفتار کو آگے بڑھایا ۱۹۷۳ء میں راجستھان یونیورسٹی جے پور میں شعبۂ اردو قائم ہوا اور صدر شعبۂ ڈاکٹر زیدی صاحب کی محنت اور کوشش کے باعث تھوڑے ہی عرصہ میں وہاں تحقیق کی جانب توجہ کی جانے لگی اور شعبہ میں ادارۂ تحقیق و اشاعت کی بنیاد ڈالی گئی، ورنہ راجستھان کی یونیورسٹیوں میں شعبۂ اردو نہ ہونے کی وجہ سے اس خطے کے باذوق طلبا کو مجبوراً دوسری یونیورسٹیوں میں جانا پڑتا تھا۔ نامناسب نہ ہوگا اگر ڈاکٹر یونس حسنی ٹونکی کا ذکر کیا جائے جنھوں نے بھوپال یونیورسٹی سے ایم اے کے بعد اختر شیرانی پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔

راجستھان یونیورسٹی اور اودے پور یونیورسٹی میں اردو کے شعبے قائم ہونے کے بعد جو حضرات باہر سے بحیثیت اساتذہ ان یونیورسٹیوں میں آئے وہ بھی تحقیقی ذوق رکھنے والے ہیں۔ ڈاکٹر فضل امام لکچرر شعبۂ اردو راجستھان یونیورسٹی کے بہت سے مقالات اور مضامین کے علاوہ مستقل تصانیف اور تالیفات راجستھان میں آنے کے بعد ہی شائع ہو کر منظر عام پر آئیں۔ اسی طرح فیروز احمد صاحب لکچرر شعبۂ اردو راجستھان یونیورسٹی کے نہ صرف تحقیقی مضامین شائع ہوئے بلکہ وہ پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے تحقیقی مقالہ بھی مرتب کر رہے ہیں[3]۔ اسی طرح گورنمنٹ کالج کوٹہ میں اردو کے لیکچرر احتشام اختر پاشا اور گورنمنٹ کالج سیکر میں محترمہ عارفہ سلطانہ لکچرر شعبۂ اردو پی ایچ ڈی کے لیے تحقیقی کام کر رہے ہیں اگرچہ ان حضرات نے راجستھان کی ادبی سرگرمیوں اور یہاں کے اہل علم و فن اور اصحاب فضل و کمال کی ادبی خدمات کو اپنی تحقیقات

---

[1] اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر کچھ دشواریوں کا ذکر نامناسب نہ ہوگا۔ میرے موضوع سے متعلق سرمایہ مختلف مقامات کی لائبریریوں، نجی کتب خانوں، سابق حکمرانوں کے محلوں، میوزیموں، سرکاری دفتروں، کتب فروشوں اور کباڑیوں کی دوکانوں، قدر ناشناس لوگوں کے گھروں کے کونے کھدروں میں بکھرا پڑا تھا۔ کہیں فہرستیں مرتب نہیں تھیں کہیں فہرست کے مطابق کتابیں مرتب نہیں تھیں کہیں اصل کتابوں کی جگہ نمبر پر دوسری کتابیں رکھی تھیں، کتابوں کے نجی ذخیرے ناقدر شناسی کی مرثیہ خوانی کر رہے تھے، کتابوں کے انبار میں بصد تلاش کوئی کتاب ملی تو ایسی بوسیدہ خستہ اور شکستہ کہ اس کا پڑھنا محال، رؤسا کے محلوں تک رسائی دشوار تھی، سرکاری ریکارڈ اور دستاویزات مختلف دفتروں میں ایسے منتشر ہو گئے کہ پتہ لگانا مشکل، مواد کی تلاش اور تحقیق کے لیے مختلف مقامات کا بار بار سفر کرنا پڑا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ موضوع سے متعلق کوئی کتاب ملی تو اس کو غیر معمولی اہم سمجھ کر کتاب کے مالک نے اس کے مطالعہ کی اجازت دینے میں تکلف سے کام لیا۔

[2] مقالات چوتھی کانفرنس انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند منعقدہ لکھنؤ یونیورسٹی مطبوعہ ۱۹۷۲ء ص ۱۵۱ تا ۱۶۴

[3] ڈاکٹر فضل امام کی تصانیف میں ان کا تحقیقی مقالہ "امیر اللہ تسلیم حیات اور شاعری" مطبوعہ ۱۹۷۲ء امیر اللہ تسلیم کی مثنوی نغمۂ عشق کی ترتیب و مقدمہ مطبوعہ ۱۹۷۴ء، بھوجپوری ادب کا تعارف مطبوعہ ۱۹۷۵ء جدید ہندی شاعری سمت اور رفتار مطبوعہ ۱۹۷۶ء اور احساس اور [illegible] تحقیقی و تنقیدی مضامین (مجموعہ)، قابل ذکر ہیں۔

کا موضوع نہیں بنایا جس کی وجہ غالباً یہ ہو سکتی ہے کہ ان حضرات کو اس خطے میں آئے ہوئے کچھ زیادہ وقت نہیں ہوا اور راجستھان کے ایسے مواد کے مطالعہ کا موقع نہیں ملا جس پر یہ حضرات تحقیقی کام کرتے لیکن یقیناً ایسے موضوعات پر بھی وہ کام کر سکیں گے۔

یونیورسٹیوں اور کالجوں سے باہر راجستھان میں تحقیقی سرمایہ فراہم کرنے والے حضرات میں ایک نام جناب مفتوں کوٹوی کا ہے۔ جن کی تحقیق کا دائرہ کوٹہ، جھالاواڑ اور بوندی کے اضلاع ہیں موصوف نے ان علاقوں کی ادبی سرگرمیوں اور یہاں کے شاعروں اور ادیبوں کی شخصیات اور ان کی ادبی خدمات پر جو کام کیا ہے یقیناً قابل ذکر ہے۔ راجستھان کی ادبی فضاؤں کی سیر کے عنوان سے ان کے مضامین کا ایک سلسلہ مختلف جرائد و رسائل میں شائع ہوتا رہا ہے نقوش کے نام سے مفتوں صاحب کے مضامین کا ضخیم مجموعہ دو حصوں پر منقسم، راجستھان ساہتیہ اکیڈمی کی جانب سے زیر طبع ہے اسی طرح مولانا سید منظور الحسن صاحب برکاتی خصوصی طور پر ٹونک سے متعلق کافی تحقیقی کام کر رہے ہیں موصوف کے بہت سے مضامین مختلف اخبارات و رسائل ..... میں شائع ہو چکے ہیں جن کا مجموعہ زیر ترتیب ہے مولانا ٹونک کے شعراء و ادباء کا ایک تذکرہ بھی مرتب فرما رہے ہیں۔ ٹونک کے ایسے ادبی شہ پاروں کو تلاش کر کے آپ نے یہاں کی ادبی تاریخ کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے جو وقت کے تاریک پردوں میں چھپتے جا رہے تھے۔ مولانا محمد عمران خاں صاحب اور صاحبزادہ شوکت علی خاں صاحب انچارج اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک کے نام بھی اس ذیل میں قابل ذکر ہیں جن کے مضامین اخبارات و جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں فضل المتین صاحب کے مضامین اجمیر کی ادبی تاریخ کو روشن کرتے ہیں اور وہاں کے شعراء و ادباء کی شخصیات اور علمی و ادبی سرگرمیوں کو منظر عام پر لاتے ہیں ان حضرات کے علاوہ کچھ اور نام بھی پیش کیے جا سکتے ہیں جن کے ایسے مضامین گاہے گاہے سامنے آتے ہیں جو تحقیق کے لیے سامان فراہم کرتے ہیں۔ ان میں مولانا سالک عزیزی، کلیم الدین تجلی عثمانی، زبیر برکاتی، ممتاز شکیب، مختار ٹونکی اور صالح محمد نائب وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

۱۹۶۹ء میں غالب صدی کے دوران "غالبیات" پر تحقیق نے ملک بھر میں ذوق تحقیق کو مہمیز کیا۔ راجستھان میں جا بجا تقریبات منعقد کی گئیں۔ مضامین و مقالات پیش کیے گئے ان میں سے بہت سے شائع ہو چکے ہیں۔

اس دوران راجستھان میں مختلف جگہ مختلف موضوعات پر کئی سمپوزیم اور سمینار وغیرہ بھی منعقد ہوئے جن میں تحقیقی مقالات پڑھے گئے ان میں سے بعض مقالات شائع بھی ہوئے[1]

اس عرصہ میں انجمن اساتذۂ اردو جامعات ہند کی مختلف یونیورسٹیوں میں منعقدہ کانفرنسوں میں راجستھان یونیورسٹی اور یہاں کے کالجوں کے اساتذہ نے اس صوبے کی نمائندگی کی اور تحقیقی مقالات پڑھے[2]

فروری ۱۹۷۱ء میں ٹونک میں بزم تاریخ و تحقیق کے نام سے ایک انجمن قائم کی گئی جس نے اپنے محدود وسائل کے ساتھ ایسے جلسے منعقد کرائے جن میں اچھے تحقیقی مضامین پیش کئے گئے۔ اس سلسلہ میں پروفیسر محمود شیرانی ڈے منعقدہ فروری ۱۹۷۲ء اور یوم برکات احمد منعقدہ مئی ۱۹۷۲ء خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ مختلف اداروں اور انجمنوں

---

[1] اس سلسلہ کی آخری کڑی ۱۲ر جنوری ۱۹۶۹ء کو جے پور میں منعقدہ تقریب شام غالب کو کہا جا سکتا ہے جس کا انعقاد غالب میوزیم دہلی کی امداد و تعاون کے لئے کیا گیا تھا اس موقع پر ایک یادگاری مجلہ زیر ادارت کلیم الدین تجلی شائع کیا گیا اس میں ہندی انگریزی اور اردو میں غالب سے متعلق مضامین شامل ہیں۔ ان مضامین میں حمیدہ سلطانہ صاحبہ کا مضمون "غالب اور نوابان لوہارو" اور "تلامذۂ غالب کی ریاست جے پور سے وابستگی" تحقیق کے ذیل میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔

(۲) کل ہند اردو سمینار گورنمنٹ کالج ٹونک منعقدہ مارچ ۱۹۷۲ء عنوان "اردو ادب عہد حاضر میں"۔ اس سمینار کی رپورٹ اور مقالات کے اقتباسات گورنمنٹ کالج میگزین کے خصوصی شمارے "آل انڈیا اردو سمینار نمبر" ۱۹۷۲ء میں شائع ہو چکے ہیں۔

[2] انجمن مذکور کی دہلی کانفرنس منعقدہ ۱۹۶۹ء، علی گڑھ کانفرنس منعقدہ ۱۹۷۱ء لکھنؤ کانفرنس منعقدہ ۱۹۷۲ء (باقی آگے)

... سے بعض مرحوم شعرا و ادبا کی یاد میں مختلف مقامات پر جلسے منعقد ہوتے رہے جن میں خراج تحسین کے ساتھ ان کی شخصیت اور ادبی خدمات پر مقالات پیش کیے گئے۔

پچھلے دس سال میں راجستھان میں جو اخبارات اور رسائل شائع ہوئے ان میں ایسے مضامین بھی چھپتے رہے جو تحقیقی مواد فراہم کرنے میں ممد ہیں۔ ملک کے بعض موقر و مشہور اخبارات و جرائد نے بھی راجستھان کے اہل قلم کی جانب خصوصی توجہ کی۔

ریڈیو اسٹیشن جے پور کے اردو پروگرام میں بھی گاہے گاہے علمی و ادبی موضوعات پر ایسی تقاریر نشر ہوئیں جن میں تحقیقی مواد ملتا ہے۔

اس طرح پچھلے دس سال کے عرصہ میں راجستھان میں نہ صرف علمی و ادبی سرگرمیوں اور یہاں کے شعرا و ادبا کی شخصیات اور ادبی خدمات پر تحقیقی کام ہوا بلکہ دوسرے موضوعات پر بھی تحقیقی مضامین اور مقالات لکھے گئے۔ تحقیقی ذوق بڑھا۔ مضامین کے موضوعات میں تنوع کے ساتھ معیار بھی بلند ہوا۔ تلاش و تحقیق میں محنت اور کاوش کا ثبوت دیا گیا لیکن اس کے باوجود یہاں کے اہل قلم ابھی ان محققین کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتے جنھوں نے سائنٹیفک اصول تحقیق کی روشنی میں اعلیٰ تحقیقی کارنامے انجام دیے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا یہاں کی یونیورسٹیوں میں تحقیقی شعبوں کا فقدان، ادبی ذخیروں کا انتشار اور تحقیقی رجحان کی کمی ہے جب کہ یہاں ایسا کافی ادبی سرمایہ فراہم کیا جا سکتا ہے جو ناقدری کا شکار ہوتا رہا ہے۔ یا لائبریریوں میں بند ہے اور محققین ادب کی توجہ کا منتظر ہے۔ اس سلسلہ میں مختلف ضلعوں کی لائبریریوں، میوزیموں، سرکاری دفاتر اور قدیم ریاستوں کے حکمرانوں کے ذخیرۂ کتب کے علاوہ راجستھان اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں جہاں عربی، فارسی اور اردو مخطوطات کا گرانمایہ خزانہ محفوظ ہے ان کے علاوہ نجی کتب خانوں کی نشاندہی بھی کی جا سکتی ہے۔ اگر راجستھان کی یونیورسٹیوں میں

(باقی صفحہ ۲۹ پر)

(حاشیہ بقیہ صفحہ ۲۷ کا) اورنگ آباد کانفرنس منعقدہ ۱۹۷۳ء میں ڈاکٹر شاذب رضوی، ڈاکٹر محمد علی زیدی، پروفیسر مظہر علی اور راقم الحروف شریک رہے نیز لکھنؤ یونیورسٹی کانفرنس کے مقالات کتابی شکل میں شائع ہوئے ہیں جن میں ڈاکٹر زیدی اور راقم الحروف کے مقالات شامل ہیں۔

(۱) سہ ماہی رسالہ "نخلستان" ادے پور (۲) پندرہ روزہ اخبار "بشارت" جے پور (۳) ماہنامہ "سلطان الہند" اجمیر (۴) ماہنامہ "لطافت" جھنجھنوں مجریہ ۱۹۶۷ء (۵) ماہنامہ "تراشے" سہ ڈھ مجریہ ۱۹۶۸ء اور ہفت روزہ اخبار "بدلا ہوا زمانہ" جے پور مجریہ ۱۹۷۱ء قابل ذکر ہیں (ان) میں سے رسالہ "نخلستان" اور اخبار "بشارت" جاری ہیں بقیہ ناقدری زمانہ کا شکار ہو چکے۔

۳۔ اس سلسلہ میں سہ ماہی "نوائے ادب" بمبئی اور ماہنامہ "تحریک" دہلی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ماہنامہ تحریک کا بسمل سعیدی نمبر بابت دسمبر ۱۹۶۵ء اس سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے جس میں حضرت بسمل سعیدی پر گراں قدر تحقیقی مضامین شائع کیے گئے ہیں۔

۴۔ مثال کے طور پر راقم الحروف کی حسب ذیل ریڈیائی تقریر کو اس ذیل میں شمار کیا جا سکتا ہے (۱) راجستھان میں غیر مسلم حضرات کی اردو خدمات نشریہ ۶ ربیع جون ۱۹۷۲ء (۲) جنگ آزادی اور اردو ادب نشریہ یکم اگست ۱۹۷۲ء (۳) ہندی ادب میں راجستھان کے مسلمان ادیبوں کا حصہ نشریہ ۱۳ اگست ۱۹۷۵ء

۵۔ جے پور میں (۱) پوتھی خانہ سٹی پیلس (۲) مہاراجہ جے سنگھ اردو ریڈنگ روم (۳) سری سنتی لائبریری (۴) کتب خانہ شاقل ٹونک میں حسب ذیل حضرات کے ادبی ذخیرے (۵) مولانا محمد عمران خاں صاحب (۶) مولانا منظور الحسن برکاتی (۷) حکیم سید یحییٰ میاں صاحب اودے پور میں (۸) برہانیہ لائبریری (۹) انجمن ماڈل اسکول لائبریری دھولپور میں (۱۰) کتب خانہ قاضی معراج الدین صاحب فتح پور شیخاواٹی میں (۱۱) جین لائبریری بیاور میں (۱۲) میونسپل بورڈ لائبریری کا بھرت پور میں (۱۳) جامع مسجد کا کتب خانہ (۱۴) اجمیر میں کتب خانہ معینی اور کوٹہ میں (۱۵) کتب خانہ مفتوں وغیرہ۔

بے چہرہ لوگ

آنند لہر

اور پھر جو لوگ چہروں کے بغیر واپس آئے ہیں، ان کو چہروں کے مقابلہ میں کیسے شریک کیا جا سکتا ہے۔ یہ دنیا چہروں کا مقابلہ ہے اور نظر اس آوارہ بادل کی طرح ہے جو ریت کے پہاڑ سے ٹکرا گیا ہو۔ چہروں کی پہچان سے ہی یہاں رشتے ناتے قائم ہیں سلسلے بنتے ہیں تعلقات جنم لیتے ہیں۔ دنیا کی لڑائیاں چہروں پر ہیں نقشوں پر ہیں خاکوں پر ہیں نقشے بسنے کے لیے جنگیں لڑی جاتی ہیں گھر اجڑتے ہیں۔ رشتے ٹوٹتے ہیں، بیماریاں پھیلتی ہیں پھر جا کر نقشوں کی لکیریں بدلتی ہیں۔

جب یہ عظیم سفر شروع ہوا تھا ہر ایک کے پاس ایک چہرہ تھا۔ ایک وجود تھا اور لوگ ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش میں دوڑنے لگے تھے اور راستے سے بھٹک گئے تھے کیوں کہ یہ راستہ دوڑنے کے لیے موزوں نہیں تھا پھر چاروں طرف سے مٹی اور ریت اڑی جس نے انھیں اندھا کر دیا اور وہ ریت ان کے پھیپھڑوں میں بھی چلی گئی جس کے علاج کے لیے یہ لوگ پہاڑوں پر جڑی بوٹیاں ڈھونڈنے کے لیے گئے لیکن بدقسمتی سے جنگل کو چھوڑنے والے اس میں آگ لگا کر گئے تھے پھر بھی سفر کی گرد نے ان کے روپ ضرور بگاڑے تھے لیکن چہرے تو وہی پڑے تھے۔

یہ بھی سچ ہے کہ ساتھ چلنے والے بنجاروں نے بے رنگ چیزیں خرید کر رنگ بیچے تھے اور ان میں سے کئی لوگوں نے کپڑے بیچ کر رنگ خریدے تھے اور کپڑوں کے بغیر جب رنگ بالکل بیکار ہو گئے تو انھوں نے انھیں ایک دوسرے کا منہ کالا کرنے کے لیے استعمال کیا تھا اور سب کے چہرے اس لیے کالے نہ ہو سکے کیوں کہ سب رنگ کالے نہ تھے اور آئینہ نہ ہونے کی وجہ سے سب ایک دوسرے کو کالا منہ والا کہتے رہے جیوں کہ آنکھیں دھول نے بیکار کر دی تھیں اس لیے ان کے دل میں بھی ہونی سیاہی نے ایک دوسرے کو کالا کہا اور یہ سیاہی ان کے دل میں اس وقت پیدا ہوئی تھی جب انھوں نے سورج کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا

جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ یہ ستارے جو ایک دوسرے کے قریب دکھائی دیتے ہیں ان کے درمیان کروڑوں میل کے فاصلے ہیں تو انھیں محسوس ہوا کہ گو وہ رشتوں ناتوں میں بندھے ہوئے ہیں لیکن وہ ایک دوسرے سے بہت دور ہیں۔ اور وہ پتھر جو انھوں نے آسمان پر خداؤں کو تنگ کرنے کے لیے پھینکے تھے وہ خلا میں اٹک گئے ہیں اور انھیں بد دعا دے رہے ہیں اور انھوں نے یہ بھی سنا۔ کہ ایک دن یہ تمام پتھر برسیں گے اور شیش محلوں کو توڑ کر پرندوں کو آزاد کر دیں گے۔

پھر کئی صدیاں یہ لوگ بند دروازوں کو کھٹکھٹاتے رہے کیوں کہ انھیں بتایا گیا تھا جو لوگ ان سے جدا ہوئے ہیں وہ ان ہی دروازوں کے اندر ہیں لیکن ان کی کوششوں کے باوجود یہ دروازے نہ کھلے پھر آخر کار ان کو توڑا گیا لیکن بدقسمتی سے کمرے اندر سے بالکل خالی تھے انھیں جب یہ معلوم ہوا کہ یہ دروازے باہر کھینچنے سے کھلتے تھے اندر کی طرف دبانے سے نہیں تو اپنی ناکامی سے مایوس ہو کر انھوں نے ایک دوسرے سے لڑنا شروع کر دیا اور مسافروں کا یہ کارواں بھیڑ میں بدل گیا۔ بھیڑ جس کی نہ زبان ہوتی ہے نہ تہذیب ——

جس کی بات نہ کوئی سن سکتا ہے۔ نہ جس سے بات کوئی کر سکتا ہے۔

بھیڑ جس کے لاکھوں کان ہوتے ہیں
لیکن یہ کچھ سن نہیں سکتی
بھیڑ جس کی لاکھوں زبانیں ہوتی ہیں
لیکن یہ کچھ بول نہیں سکتی
بھیڑ جس کی لاکھوں آنکھیں ہوتی ہیں
لیکن یہ کچھ دیکھ نہیں سکتی

اور پھر جس شخص نے ان دروازوں کے کھلنے کی حقیقت کھولی تھی اور یہ بتایا تھا کہ یہ دروازے تمھارے آرام کے لیے تھے اس کے جسم کو بھیڑ نے اپنے دانتوں سے نوچ ڈالا اور اس کی ہڈیوں کو پاؤں تلے روندا۔

اور جب تپسیا کے بعد دیوتا سانپ کی شکل میں نمودار ہوئے تو سپیرے بین لے کر آگئے اور انھیں قید کر کے لے گئے تپسوی خاموش تماشا دیکھتے رہے اس دن سے لے کر آج تک دیوتاؤں کی یہ نسل بھیڑ کو ڈستی ہے۔

سفر کے آخر میں جب انھیں بہت بڑا آئینہ دیکھنے کو ملا تو انھوں نے ایک دم چہروں کو دیکھنا شروع کر دیا۔ بے شمار چہروں میں یہ اپنا اپنا چہرہ پہچان نہ سکے اور اس وہم میں کہ کہیں دوسرے کا چہرہ نہ لے جائیں انھوں نے اپنے چہرے آئینے میں ہی چھوڑ دیے اور بے چہرہ واپس آگئے۔

▲▲

پیلا پھول (بقیہ ص)

اُس نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں اور خواہ مخواہ ہی گال کی پیٹھ سہلانے لگا۔
ڈیلی اُسے بڑا بھلا کہتی ہوئی گھانس سمیٹ سمیٹ کر یکجا کرنے لگی اِس احساس سے بالکل ہی بیگانہ کہ میرا کتنا بکھرا ہوا وجود اور کتنا بکھر گیا ہے ——

▲▲

خبرنامہ بقیہ ص۵

● ادبی سنگم فریدآباد کی ماہنامہ ادبی نشست ۴ دسمبر ۷۷ء کو زیر صدارت جناب سوتنتر سنگھ گولف کلب فریدآباد میں منعقد ہوئی۔ امر ساہنی نے گزشتہ نشست کی کارروائی پڑھ کر سنائی۔ پھر تنقیدی پروگرام میں خوش سرحدی نے اپنا مضمون "اقبال کی زندگی اور ادب" پیش کیا۔ ہرے رام نیمہ نے اپنی ہندی کویتا اور امر ساہنی نے "مشورے کی قیمت" افسانہ پیش کیا۔ تنقید میں حصہ لینے والے اصحاب میں درج ذیل لوگ شامل تھے۔ کے کے بہل ہنس لال ساہنی تارا سنگھ کومل۔ انجم زیدی اور امر ساہنی غیر تنقیدی پروگرام میں خوش سرحدی۔ مہر بھنڈاری۔ انجم زیدی اور تارا سنگھ کومل نے اپنے کلام سے حاضرین کو محظوظ فرمایا۔

▲▲

راجستھان میں اردو تحقیق۔ بقیہ صفحہ ( )

اردو کے تحقیقی شعبے قائم ہو جائیں اور محققین ادب ادھر توجہ کریں تو یقیناً ایسے گم شدہ یا نظروں سے پوشیدہ ادبی جواہر پارے تلاش کیے جا سکتے ہیں اور ایسے نامعلوم حقائق سامنے آسکتے ہیں جن سے ادبی خزانہ میں اضافہ کے ساتھ ساتھ ادب اردو کا نیا باب کھل سکتا ہے۔

▲▲

"خالی مکان" اور "آخری دن کی تلاش"
کے بعد
محمد علوی کا تیسرا مجموعہ
"تیسری کتاب"
بہت جلد شائع ہو رہا ہے

غزلیں

عقیل شاداب

لمحہ لمحہ مرگِ مسلسل ہے اپنا
جیون ناگ پھنی کا جنگل ہے اپنا

چھتوں کی آنکھیں روشن ہیں ہر جانب
دل آن دیکھے ڈر سے بوجھل ہے اپنا

استادہ ہوں حال کے تپتے صحرا میں
گزرا کل ہی آئندہ کل ہے اپنا

لاحاصل کو حاصل کرنا چاہے ہے
یہ بیراگی من ہی پاگل ہے اپنا

چھوڑ گیا جو ہم کو اندھی راہوں میں
اُس کا غم آنکھوں کا کاجل ہے اپنا

کیسے برسوں تیری پیاسی دھرتی پر
آندھی کے کاندھوں پہ بادل ہے اپنا

ہمیں تو اپنا کوٹہ کوتہ جیسا ہے
اور فرات کے بدلے چنبل ہے اپنا

قیدی ہوں کب سے اِس کی چاردیواری میں
اپنا گھر ہی اب تو مقتل ہے اپنا

تنہا پیڑوں میں شاداب بیاباں کا
گھرا ہوا سانپوں میں صندل ہے اپنا

▲▲

منظور ہاشمی

گردِ نواحِ کوہِ ندا کے سفر میں ہیں
سب لوگ ناشنیدہ صدا کے اثر میں ہیں

پتھراؤ کرنے والے بہت دور بین ہیں
کچھ پھل ضرور اب بھی ہمارے شجر میں ہیں

ہر موڑ پر ہے تازہ بلاؤں کا سامنا
کیا ہم طلسمِ ہوشربا کے نگر میں ہیں

نخلِ نوا سے پھوٹیں خموشی کی کونپلیں
کتنی عجیب آب و ہوا کے اثر میں ہیں

بچھڑے ہوؤں کی یاد بھلانا محال ہے
روشن یہی چراغ مری رہگزر میں ہیں

اکثر سنائی دیتی ہیں مانوس آہٹیں
آباد کون لوگ یہ ویران گھر میں ہیں

▲▲

رام پرکاش راہی

انا کی اوٹ میں آفاقیت کا راز ہوں میں
ترے وجود کا منہ بولتا جواز ہوں میں

ستم ظریف تناسخ کبھی میرے پیچھے ہے
یہی نہیں کہ عناصر کی ساز باز ہوں میں

مری شکست کی آواز بس یہی یعنی
ہوا کے دوش پہ لرزاں سکوتِ ساز ہوں میں

قدم قدم ہے مسافت قدم قدم منزل
نیاز و ناز کا افسانۂ دراز ہوں میں

تھکی تھکی سی سرِ راہ انتظار کی آنکھ
وہی سوال کا عقدہ کہ نیم باز ہوں میں

نگارِ شعر ہے راہیؔ وہ آئینہ جس میں
نظر، نظر ہے تو اک عکسِ امتیاز ہوں میں

▲▲

○ برج راج پورہ - کوٹا ۶ - راجستھان ○ ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ○ بی ۵۸ - پنڈارا روڈ - نئی دہلی -

غــــزلیں

ساجد اثر

چھاؤں کی عمر کا لہو پی کر
رقص کرتا ہے دھوپ کا خنجر

گفتگو میں نبات رکھتا ہے
نیم کی تلخیوں کا سوداگر

حادثے، روز پیش کرتے ہیں
زندگی کے زوال کا منظر!

بک گیا مصلحت کی منڈی میں
اِک مثالی خلوص کا پیکر!

اے اثر! قبر سے مماثل ہے
کس مپرسی کا گنبدِ بے در

مہدی پرتاپگڑھی

ورق ورق بکھر گیا ہو جس کا وہ کتاب ہوں
مگر غمِ حیات کا میں اک سنہری باب ہوں

نہ میری شخصیت پہ گرد پوش ہے نہ خول ہے
ورق ورق پڑھو مجھے کھلی ہوئی کتاب ہوں

حیات کی زکوٰۃ میں، مرا لہو نچوڑ لو
میں کیسے روک سکتا ہوں کہ صاحبِ نصاب ہوں

ہزار ہا ستارے مجھ سے کسب نور کرتے ہیں
مگر مجھے خبر نہیں کہ میں اک آفتاب ہوں

میں شہرِ فکر و فن میں اجنبی ہوں تہذیب آج کی
ہو میری قدر کیا یہاں کہ خانماں خراب ہوں

پروین کمار اشک

ابر گزرا ہے بے خبر کتنا!
زرد ہے آس کا شجر کتنا!

کبھی آنگن میں چاند اُترتے تھے
آج بے نور ہے یہ گھر کتنا!

چھوڑ کر اُس کو میں نہ جی پایا
مجھ کو پیارا تھا وہ نگر کتنا!

زندگی اب چلا نہیں جاتا
اور باقی ہے اب سفر کتنا!

پا کے زخموں کا میرے تن پہ لباس
کوئی رویا تھا پھوٹ کر کتنا!

پیڑ تو ہے ہرا بھرا لیکن
زہر آلود ہے ثمر کتنا!

اب تو ہر اک حسین صورت سے
اشک لگتا ہے ہم کو ڈر کتنا!

○ دیوان بازار، کٹک ○ معرفت گرگنو انجنئر اری گیشن ڈویژن [illegible] ○ معرفت کنول ہوشیارپوری [illegible]

نظمیں

رونق زیدی

بے بسی

برہنہ رات ——
بے داغ اندھیروں کو اوڑھ کر ——
مطمئن ہو گئی
سو گئی

اور تاروں بھرا آسماں ——
جسم کا لمس پاتا رہا ——
مسکراتا رہا

یاد

رات
تمہاری یاد کے جگنو
میری پلکوں سے اُبھرے
رخساروں پر اُترے
جگمگ جگمگ کرتے
ڈوب گئے ——
مایوسی کی سرد گپھائیں

آغا اختر

نپل

نپلیں منہ میں دے دے کے اولاد کو
اپنے بچوں کو ماؤں نے دھوکے دیے
شیر خواری کے دھوکے میں
معصوم وہ
نپلیں چوستے رہ گئے
چُپ رہے

جن کو بچپن میں دھوکوں کی نعمت ملے
وہ بڑے ہو کے دھوکا نہ دیں کس لیے

○ ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ ○ ۲۶ لیونارڈ روڈ۔ رچمنڈ ٹاؤن۔ بنگلور ۵۶۰۰۲۵

پولینڈ کی اقتصادی مشکلات

سلیمان اختر

پولینڈ کی حکومت کو مزدوروں کی کام سے غیر حاضری، ڈسپلن کے فقدان، ناقابلِ جواز بیماری کی چھٹیوں اور فالتو اوقات میں کام کی غیر معمولی ادائگیوں کی ہمیشہ فکر رہتی ہے، ایسا کیوں ہے؟ ان کمزوریوں کا، جن سے مُلک کی اقتصادی ترقی میں زبردست رکاوٹ پڑتی ہے، پولینڈ کے لیڈر برملا اعتراف تو کرتے ہیں لیکن ان کی موثر اصلاح کا کہیں کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ پارٹی کے پولٹ بیورو کے اجلاس میں جو ۷/ نومبر ۱۹۷۷ء کو ہوا، ۱۹۷۸ء کے اقتصادی منصوبے پر بحث بھی ہوئی اور اس کے مختلف پہلوؤں کا جواز بھی پیش کیا گیا۔ ان میں چند پہلو یہ ہیں کہ مکانوں کی تعمیر کو اوّلیت دی جائے، خوراک کے مسئلے کو اہمیت دی جائے اور اشیائے ضروریہ کی سپلائی میں اضافہ کر کے قیمتوں میں استحکام پیدا کیا جائے۔ عمومی طور پر اس منصوبے میں یہ بات مدِ نظر رکھی گئی تھی کہ آئندہ برس میں کارخانوں کے انتظام کی اصلاح کی جائے، جہاں کہیں ممکن ہو، کفایت شعاری برتی جائے اور ڈسپلن کا نفاذ زیادہ سختی سے کیا جائے۔

وارسا ریڈیو نے ۷/ نومبر ہی کو اپنی کمنٹری میں کہا کہ نئی ہدایتوں کا خصوصی مقصد یہ ہے کہ مزدوروں میں ہر سطح پر ذمہ داری کا زیادہ احساس پیدا کیا جائے تاکہ وقت کے غیر ضروری اتلاف کا ازالہ کیا جا سکے اور گھٹیا مال کی تیاری سے جو سامان ضائع ہوتا ہے اس کی بھی روک تھام کی جا سکے۔ عمارتوں کی تعمیر میں عدم احتیاط اور لاگت سے لاپروائی برتنے کے انسداد پر بھی زور دیا گیا۔ قومی اثاثے کو جن باتوں سے نقصان پہنچتا ہے، ان میں بیماری کا بہانہ کر کے چھٹی لینا، کچھ نہ کرتے ہوئے مصروفیت کا بہانہ اور "قومی ملکیت کو ذاتی اغراض کے لیے استعمال کرنا" شامل ہیں۔ فرض شناسی کے مطالبے کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا گیا کہ ایماندارانہ محنت کے لیے مناسب ماحول پیدا کیا جانا چاہیے۔ اس سے پہلے ۳/ اکتوبر کو سنٹرل کمیٹی کے پورے اجلاس کی جو میٹنگ ہوئی تھی اس میں پارٹی کے لیڈر ایڈورڈ گیریک نے کہا تھا کہ رشوت خوری، سٹے بازی اور چور بازاری موجود ہیں۔ ان کا باعث اشیائے ضروریہ کی کمیابی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کام کے لیے بہتر ماحول پیدا کرنا ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے حل کی کوئی صورت پولینڈ کے حکام کو نظر نہیں آ رہی۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، مکانوں اور عام استعمال کی چیزوں بالخصوص اشیائے خوردنی کی قلت بے چینی کا بہت بڑا سبب ہے۔ پولینڈ کے مزدور کو روپیے سے کہیں زیادہ اس بات سے دلچسپی ہے کہ اسے چیزیں دستیاب ہوں۔ اب حالت یہ ہے کہ روپیہ ہوتے ہوئے بھی وہ چیزیں حاصل نہیں کر سکتا اور یہ مسئلہ حل ہونے کی بجائے مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا ہے۔

جون ۱۹۷۶ء میں قیمتوں کے مسئلے کو حل کرنے میں ناکامی کے باعث جو فسادات ہوئے تھے، ان کے نتیجے میں گیریک نے ایک نئی اقتصادی حکمتِ عملی کا آغاز کیا تھا۔ یہ حکمتِ عملی یہ تھی کہ جو وسائل مشینوں وغیرہ پر صرف کیے جا رہے ہیں انھیں عام استعمال کی چیزیں تیار کرنے والے شعبوں میں منتقل کیا جائے۔ ۳/ اکتوبر کو اپنی تقریر میں اس نے تسلیم کیا کہ پیداواری نظام اور سرمایہ کاری کے نظام میں ضروری اصلاحات وقت کی

کیونکہ انھیں ایک نظام کے اندر رہی بروئے کار آنا ہے۔ اس نے پولینڈ کی اقتصادی صورتِ حال کی نزاکت کا اعتراف تو کیا اور عوام سے محنتِ شاقہ کا مطالبہ بھی کیا لیکن کسی قسم کی واضح تجاویز کا اس کی تقریر میں فقدان تھا۔

اکتوبر کی اطلاعات کے مطابق سیلیسیا کے علاقے میں گوشت کی کمیابی کے باعث ستمبر کے اواخر میں مزدوروں نے کوئلے کی کانوں میں کام کرنا بند کر دیا تھا۔ کاٹووائز کے آس پاس کی کانوں سے بھی کام بند کر دینے کی اطلاعات پہنچ رہی تھیں۔ حکومت نے کاٹووائز کی دکانوں پر گوشت بھیج دیا اور اتنا جو کھپت سے بھی زیادہ تھا۔ سرکاری طور پر ہڑتالوں سے انکار کیا جا رہا ہے لیکن پارٹی کے اخبار ٹرائی بونا لوڈو میں گیریک کی حمایت میں ایک خط شائع ہوا تھا جس میں ایک کان میں کام بند ہونے کا ذکر تھا اور یہ بھی کہا گیا تھا کہ ۱۲ اکتوبر کو گیریک بذاتِ خود وہاں گئے حالانکہ پہلے سے اس دورے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ گڑبڑ واقعی شدید ہو گی۔ ظاہر ہے کہ ملک کے دوسرے حصوں میں جو اور بھی کم ترقی یافتہ ہیں، صورتِ حال زیادہ خراب ہو گی۔ پولینڈ میں اناج کی فصل بہت ناقص رہی ہے اور ۱۹۷۶ء میں گوشت کی جو قلت تھی اس کی تلافی بھی اب تک نہیں ہوئی۔

اس صورتِ حال میں مزدوروں اور عام صارفین کی بے چینی کے انسداد کا ذریعہ یا تو یہ ہے کہ باہر سے اشیائے خوردنی درآمد کی جائیں اور یا یہ کہ مخصوص شعبوں مثلاً فوج کے لیے جو اسٹاک محفوظ رکھا گیا ہے اسے عوام تک پہنچا دیا جائے۔ درآمد کا مسئلہ آسان نہیں کیونکہ ادائیگیوں کے توازن کے معاملے میں پولینڈ کی حالت تسلی بخش نہیں ہے۔ اس سال پولینڈ زرِ مبادلہ کی قلت میں کوئی بہتری نہ لا سکا۔ اس کے باوجود اس نے امریکہ سے مطالبہ کیا کہ اسے قرض کی آسان شرطوں پر مزید اناج دے دیا جائے۔ سوویت یونین کی فصل خود اچھی نہیں ہوئی اس لیے پولینڈ کی مدد کے معاملے میں اس کی صلاحیت مشکوک ہے، لہٰذا آنے والے مہینوں میں اہلِ پولینڈ کے لیے ضروری ہو گا کہ وہ برآمدات میں اضافے کی ہر ممکن کوشش کریں اور درآمدات کو محدود رکھیں۔

گیریک کی حکومت اب خوش فہمی کے نتائج سے دو چار ہے جس کے باعث اس نے پولینڈ کی اقتصادی صورتِ حال کو پیشِ نظر رکھے بغیر اقتصادی پھیلاؤ کا غیر معمولی منصوبہ بنا لیا تھا۔ اس کی سب سے بڑی ناکامی یہ تھی کہ وہ مزدوروں کی بڑھتی ہوئی قوتِ خرید اور مناسب قیمتوں پر اشیائے ضروریہ کی فراہمی میں کوئی توازن پیدا نہ کر سکی۔ اشیا کی کمیابی کو اس بات نے اور بھی شدید بنا دیا کہ ریاست نے اشیائے ضروریہ کی فروخت کے لیے جو دکانیں قائم کی تھیں ان کا انتظام خراب تھا اور بعض اشیا مثلاً گوشت کی قیمت بہت ہی کم رکھ دی گئی تھی، اس کی فراہمی کا اطمینان کیے بغیر۔ اشیائے ضروریہ کی قلت سے جو بے اطمینانی ہوئی اس کے نتیجے میں مزدوروں میں ڈسپلن کی کمی بھی آئی، غیر حاضریوں کی تعداد بھی بڑھی کیونکہ مزدوروں کا زیادہ وقت کمیاب چیزوں کو ڈھونڈنے میں یا کوئی فالتو کام ڈھونڈنے میں [illegible] جاتا تھا۔

بالآخر جون ۱۹۷۶ء میں حکومت نے اعتدال پیدا کرنے کے لیے کچھ اقدامات کیے لیکن عوام اس کے مجموعی اقدامات کے لیے اتنے غیر آمادہ تھے کہ یہ کارروائیاں اگرچہ اقتصادی وجوہ سے قابلِ جواز تھیں لیکن وزیرِ اعظم کو انھیں واپس لینا پڑا کیونکہ صورتِ حال قابو سے باہر ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے بعد کے مہینوں میں اس کا کوئی ثبوت نہیں مل سکا کہ گیریک کی حکومت ان مسائل کو حل کرنے میں برائے نام کامیابی بھی حاصل کر سکی ہے۔

جنوری ۱۹۷۸ء میں کمیونسٹ پارٹی کی کانفرنس ہو رہی ہے۔ لیکن قیادت کے خلاف جس بے اطمینانی کا مظاہرہ جون ۱۹۷۶ء میں ہوا تھا، وہ اتنی ہی شدت سے اب بھی موجود ہے۔

شام کے بعد

نسیم محمد جان

"اللہ دے گا ــــــ اللہ ہی دے گا"

سائیکل پر جاتے ہوئے بابو نے پانچ پیسہ کا ایک سکہ پھینک دیا۔ فقیر کچھ دیر کے لیے چپ ہوگیا۔ سکے کو سنبھال کر میلے کچیلے کپڑے کے نیچے رکھنے لگا۔

"اللہ دے گا ــــــ اللہ ہی دے گا"

کچھ فاصلے پر بیٹھے بوڑھے دلّو نے بڑی حسرت سے اس فقیر کی طرف دیکھا جس کے ایک پیر کی انگلیاں غائب تھیں دونوں ہاتھوں پر پٹیاں بندھی تھیں جن پر خون اور پیپ کے دھبے۔ ہر گزرنے والے پر بڑی امید بھری نگاہ ڈالتے تھے۔ دلّو نے اندازہ لگایا کہ صبح سے بارہ بجے تک اس فقیر کو تین چار روپے تو ضرور مل گئے ہوں گے پھر وہ پاس پڑی تار تار قمیص کی جیب میں ہاتھ ڈال کر پیسے ٹٹولنے لگا ــــ لگ بھگ پچپن پیسے۔ دلو نے سوچا اور حسرت سے اپنے دونوں ہاتھوں کو دیکھا جن کی انگلیاں بالکل ٹھیک تھیں صرف بڑھاپے کی وجہ سے ان کی جلد سوکھ کر سکڑ گئی تھی اس نے اپنی کمزور ٹانگوں کو آگے کی طرف پھیلا دیا۔ پھر آواز لگانے لگا۔

"دینے والے کو اللہ دے گا ــــ دینے والے کو بھگوان دے گا۔ ہے کوئی دینے والا۔"

ــــ وہ گذرتے ہوئے گول ٹوپی والے بابو کو دیکھنے لگا۔ اچانک اسے وہ صبح یاد آگئی۔ تین دن سے وہ بخار میں پھنکتا رہا تھا۔ اس وقت وہ اینٹ ڈھونے کا کام کیا کرتا تھا۔ ڈیڑھ روپیہ روز مل جایا کرتا تھا۔ دونوں وقت پیٹ بھر کھانا کتنے اچھے دن تھے۔ اس نے سوچا۔ دوپہر کے وقت ستو، نمک اور ہری مرچ کے ساتھ کتنا اچھا لگتا تھا۔ منہ نمکین ہوگیا۔ نگاہ اٹھا کر اس نے پھر ٹوپی والے بابو کو دیکھا۔ وہ کچھ آگے بڑھ گیا تھا اس روز بخار جب کم ہوا تو بھوک سے پیٹ میں درد ہونے لگا تھا تین روز کے اندر ہی وہ بہت کمزور ہوگیا تھا۔ اپنے آپ کو گھسیٹتا ہوا پارک تک آیا اور صبح سویرے ٹہلنے والے بابو لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے لگا۔ اس ٹوپی والے بابو کے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا۔ بابو میدان میں کچھ تلاش کر رہا تھا جھک کر نہ جانے زمین پر کیا رکھ رہا تھا۔ ٹوپی والا دلو ہی کی طرف آ رہا تھا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے اس کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ قریب آکر پھر جھکا اور تھیلے سے شکر نکال کر چیونٹیوں کے بلوں پر رکھنے لگا۔ دلو کی امید بند ہوگئی۔

"بابو جی! دو روز سے بھوکا ہوں"

اس کی اپنی آواز بھی بہت اجنبی اور ٹوٹی ہوئی لگی۔

"صبح صبح کیوں تنگ کرتے ہو۔ حرام کھانے میں زیادہ مزہ آتا ہے کیا ــــ کوئی دھندا کیوں نہیں کرتے۔"

"بیمار ہوں"

"سب یہی کہتے ہیں۔"

اس سے پہلے کہ دلو کچھ کہتا ٹوپی والا جا چکا تھا۔

اس کے بعد جب بھی یہ گول ٹوپی والا نظر آتا، اسے وہ منحوس صبح یاد آجایا کرتی۔ اس روز انسان ہونے کا کتنا دکھ ہوا تھا اسے۔ کوئی جانور کسی دوسرے جانور کا محتاج نہیں ہوتا وہ سوچنے لگا۔ سامنے سے ایک عورت آتی ہوئی نظر آئی تو وہ

محلہ بہنی موتیہاری (بہار)

پھر آواز لگانے لگا۔

"دینے والے کو اللہ دے گا ——— دینے والے کو بھگوان دے گا ——— ہے کوئی دینے والا"

عورت کچھ قریب آئی تو اسے پہچان کر دلو خاموش ہو گیا پاس ہی کے اسکول میں کام کرتی تھی۔ روزانہ اسی وقت گذرتی تھی مگر کبھی ایک پیسہ نہیں دیا تھا اس نے۔ اس نے دیکھا کہ سامنے والے فقیر کے آگے کوئی شخص اپنی جیب ٹٹول رہا تھا۔ وہ اپنی قسمت کو کوسنے لگا۔ اس نے پھر اپنی سوکھی انگلیوں کو غور سے دیکھا۔ کاش یہ انگلیاں بھی آدھی ہو جاتیں ان سے بھی پیپ اور خون رسنے لگتا اور اس فقیر کو برا بھلا کہنے لگا جیسے ایک بار کچھ پادری لوگ علاج کے لیے لے گئے تھے۔ کچھ دن تو وہ بہت اطمینان سے رہا' بہت آرام تھا وہاں۔ اسے یقین تھا کہ زخم کبھی اچھے نہ ہوں گے مگر جب زخم بھرنے لگے تو وہ بہت پریشان ہوا وہاں سے فرار ہو کر اپنے پرانے اڈے پر آگیا۔ جب سے وہ لوٹ کر آیا تھا دلو اسے کوس رہا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ لوگ اس کے پیپ اور خون پر ترس کھاتے ہیں مگر میرے پیر کے درد اور بڑھاپے کی کمزوری کو نہیں سمجھتے جب وہ جوان تھا تو مزدور تھا۔ شہر کی بہت ساری عمارتوں کی تعمیر میں اس کا ہاتھ تھا۔ ان بڑی بڑی بلڈنگوں میں اس وقت تک آنے جانے کی آزادی رہتی تھی جب تک زیر تکمیل رہتیں مگر جیسے ہی بن کر تیار ہو جاتیں اس کے لیے وہ سارے دروازے .... ہمیشہ کے لیے بند ہو جاتے جن کو اس نے اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا جب تک وہ کام پر لگا رہتا عمارت کی بلندی دیکھتا اور خود کو بھی عظیم سمجھتا مگر جب عمارت مکمل ہو جاتی تو لگتا کسی نے چھت سے اٹھا کر اسے فٹ پاتھ پر پھینک دیا ہے۔ کچھ دیر درد سے کراہتا' رفتہ رفتہ اسے آرام مل جاتا پھر پیر گھسیٹتا اپنی طاقت کو سمیٹ کر کسی دوسری عمارت میں منتقل کرنے لگتا۔ اب بہت ساری عمارتیں اس کی جوانی کی قسمیں کھا رہی تھیں۔ مگر وہ خود بہت کمزور ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی اس کے پیر کانپنے لگتے' اسے چکر سا آتا آنکھوں کے سامنے سیاہ دھبے پھیل جاتے تھے۔ وہ پھر صدا لگا رہا تھا۔

"دینے والے کو اللہ دے گا ——— دینے والے کو بھگوان دے گا ——— ہے کوئی دینے والا"

جاڑے کا دن بھی کتنا مختصر ہوتا ہے بالکل جوانی کی طرح صبح ہوتے ہی شام ہو جاتی ہے اور رات کاٹے نہیں کٹتی۔ دلو یہ سوچتے ہوئے نفرت سے اس فقیر کو کوسنے لگا اور پھر آسمان کی طرف دیکھنے لگا جیسے وہ سیدھا خدا سے کہنا چاہتا ہو۔ کیا بگڑ جاتا اگر میری انگلیوں میں بھی خون اور پیپ بھر دیا ہوتا! دلو اس فقیر کی پھینکی ہوئی پٹیاں اپنے ہاتھوں پر کئی بار لپیٹ چکا تھا مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ کبھی ان انگلیوں میں زخم نہ ابھرا۔

پھر اسے بھگوتیا یاد آگئی۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچی۔ کون تھی وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔ ایک دن بس اسٹینڈ پر اچانک مل گئی تھی۔ پہلی بار دلو نے ایک گھر کی ضرورت محسوس کی تھی۔ رات تو اس نے جیوں تیوں اپنے دوست بھو کے کمرے میں کاٹی۔ مگر دوسرے دن ٹھیکیدار سے بڑی منت و سماجت کر کے اجازت حاصل کر لی۔ دن بھر بھگوتیا اینٹیں لا رہی۔ وہ ان اینٹوں کو صرف ایک دوسرے پر رکھتا گیا۔ شام تک ایک کمرہ تیار ہو گیا جس کی چھت کھجور کی چٹائی سے ڈھکی

سب جانتے تھے بھگوتیا دلو کی بیوی ہے اور دلو کو اس سے زیادہ اس کے متعلق کچھ علم نہ تھا۔ وہ کون ہے کہاں سے آئی ہے۔ یہ جاننے کی ضرورت اس نے کبھی محسوس نہ کی۔ کئی سال اس عمارت کے تیار ہونے میں لگ گئے جس احاطے میں اس کا ایک کمرے کا گھر تھا۔ دلو نے کئی بار سوچا کاش یہ عمارت کبھی مکمل نہ ہو مگر کہیں ایسا ہوا بھی ہے۔ آ وہ دن بھی آگیا جب ٹھیکیدار نے احاطے کو صاف کرنے کا حکم اور دیکھتے دیکھتے مزدوروں کی یہ بستی اجڑنے لگی۔ کتنا سکو ملتا تھا اسے جب وہ اپنی بیوی کو دیکھتا تھا اور پھر اپنے چھوٹے سے بچے کو۔ پھر اسے یاد آیا۔ بھگوتیا نے ایک بار کہا

بھولا ہے نا اچھا آدمی نہیں ہے، مجھے ڈر لگتا ہے۔ اس پر وہ خوب ہنسا تھا اور بعد میں اسے یقین دلا دیا تھا۔ بھولا ذرا چنچل ہے، دل کا نیک آدمی ہے۔ مگر اسی روز بھگو تیا غائب ہو گئی۔ بھولا کا بھی پتہ نہ تھا۔ دتو نے سارے شہر کا چکر لگایا مگر وہ کہیں نظر نہ آئی۔ اب وہ اپنے بچے رامو کو یاد کر رہا تھا جو نئی اٹھتی ہوئی کونپلوں کو سہارا دے رہا تھا۔ کتنے پیار سے پالا تھا دتو نے مگر رامو بھولے سے بھی اس کی طرف نہیں دیکھتا جی میں آیا کہ اسے خوب کہے مگر پھر اس نے سوچا۔ اس کا کیا قصور ہے۔ قصور تو اس کی بیوی کا ہے جو رامو کے ہر پیسے پر صرف اپنا حق سمجھتی ہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو صرف اپنا حق ہی وصول کرنا جانتے ہیں یہ کبھی نہیں سوچتے کہ ان کا کیا فرض ہے۔

وہ دھیرے دھیرے کھنڈر کی طرف بڑھ رہا تھا جس کے آس پاس صرف بڑے بڑے بوڑھے برگد کے پیڑ سر جھکائے کھڑے تھے۔ آبادی کا کچھ دور تک پتہ نہ تھا وہ ہر روز شام کو اندھیرا پھیلنے سے پہلے وہاں پہنچ جاتا تھا تاکہ دن کی روشنی میں یہ دیکھ لے کہ سونے کی جگہ پر کوئی کیڑا مکوڑا تو نہیں۔ رات کی تاریکی میں تو وہاں صرف چمگادڑوں کا راج تھا اگر وہ چاہتا تو آبادی کے قریب بھی کوئی جگہ ڈھونڈ سکتا تھا مگر اسے یہ جگہ بہت پسند تھی۔ اب وہ کھنڈر کے قریب آ چکا تھا جانا پہچانا دوست اس کا منتظر تھا۔ اس نے اپنے ساتھی کالے کتے کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور سوچنے لگا یہی تو ہے اس کے بڑھاپے کا دوست۔
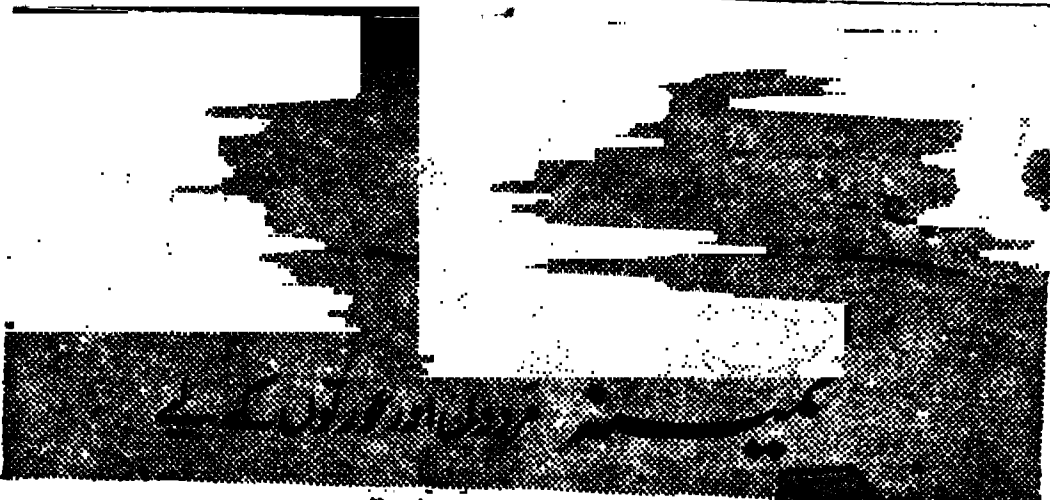
پھر وہ بستر پر چلا گیا روز کی طرح کتا اپنے پیروں کو سمیٹ کر ایک بچے کی طرح اس کی گود میں لیٹ گیا۔ سردی شباب پر تھی، ایک آدھ بوند بھی ٹپکنے لگی تھی اس نے پھٹے ہوئے گدڑے کو اپنے آپ پر اور کتے پر ڈال دیا۔ کتے کے کچھ اور قریب کھسک گیا۔ اس کا برف سا جسم کتے کی قربت سے حرارت محسوس کرنے لگا۔ شام گہری ہوتی گئی۔ رات کی سیاہ دیوی نے اپنے بازوؤں کو دور دور تک پھیلا دیا۔

⚪⚫

چار کہانیاں

سی۔ایچ۔ٹی کھانولکر
ترجمہ: بدیع الزماں خاور

(۱)

آسمان پر بادل اُمڈ آئے تھے۔

وہ شانے پر ایک گٹھری لیے ہوئے نکل پڑا تھا۔ اسے خود بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہا تھا۔ وہ نکلا ضرور تھا مگر منزل کے بارے میں اس نے اپنے دل میں کچھ سوچا تک نہیں تھا دیکھتے ہی دیکھتے دشائیں سیاہ پوش ہوگئیں۔ دور اُفق پر بجلی رہ رہ کر کوندنے لگی۔ اس نے پاؤں کے پاس دیکھا، اِردگرد دیکھا، اپنے آپ کو دیکھا اور وہ رک گیا۔

راستے کے کنارے ایک درخت کی ٹیڑھی میڑھی شاخ پر کوئی گمنام پرندہ طویل سیٹی بجا رہا تھا۔ اس نے اس پرندے سے پوچھا "کیوں ---؟"

پرندے نے پھر سیٹی نہیں بجائی۔ وہ آگے چل پڑا۔

سامنے سے ایک دوسرا آدمی آ رہا تھا جس سے اس کی کوئی شناسائی نہیں تھی۔ اس دوسرے آدمی نے اپنے ہاتھ کی ٹیڑھی میڑھی چھڑی اوپر اٹھائی اور پوچھا "کہاں جا رہے ہو؟"

وہ کوئی جواب دے نہ سکا۔ سامنے کا آدمی سائے کی طرح اس کے قدموں کے نیچے پھیل گیا۔ اس کے پاؤں اتنے بوجھل ہو گئے کہ اس کے لیے آگے چلنا مشکل ہو گیا۔ پھر بھی وہ چل رہا تھا، شانے پر گٹھری لیے ہوئے۔

آسمان پر بادل اور بھی گہرے ہوتے جا رہے تھے مگر ہوا تھی کہ چلتی ہی نہیں۔

(۲)

اس کے جی میں کیا آئی کون جانے؟ وہ دفتر سے چھوٹتے ہی سیدھا سمندر کے کنارے چلا گیا۔

وہ وہاں کیوں گیا، اس کا خود اسے بھی پتہ نہیں تھا۔ وہ جا کر دھکتے پر بیٹھ گیا۔ قرمزی شام، اُفق تک پھیلے ہوئے سمندر پر یوں بکھری پڑی تھی، جیسے اسے کسی نے سمندر میں ڈبو دیا ہو۔ کان کے دونوں سوراخوں میں بھیڑ کے شور کی بھیانک آواز چپک کر بیٹھ گئی تھی۔ اسے اس کی اب عادت سی ہو گئی تھی۔ وہ کسی کے ساتھ بات کرنے لگا کوئی اس کے ساتھ بات کرنے لگا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"بے شمار ناموں میں سے کوئی ایک سمجھ لو۔ آخر نام کیوں رکھا جاتا ہے؟ نام رکھنے سے کیا فائدہ ہوتا ہے؟"

"Muster پر دستخط کیے جا سکتے ہیں۔ اپنے بچے کے نام کے آگے اپنا نام جوڑا جا سکتا ہے۔"

"مگر اس سے ہمارا وزن تو بڑھتا نہیں ہے۔ ہم بچوں کو جنم دیتے ہیں۔ اور پھر خود سایہ بن جاتے ہیں۔"

"سر پر چھپر، ساتھ نبھانے کے لیے شریک زندگی، پھر بچے اور ڈھیر سارے بل۔"

"_ اور گھر میں قدم رکھو تو اُونی دُم پھیلا کر پاؤں
پیا ٹنے اور پاؤں کے اطراف چکر کاٹنے کے لئے سبز
آنکھوں والی کوئی بلی ہے۔"

"یہ گھنگھرو رکھ لو، اس بلی کے گلے میں باندھنے کے لئے۔"

وہ اچھا ... اس نے گھنگھرو اپنی جیب میں سنبھال کر
رکھا۔ وہ بار بار کوشش کرتا رہا کہ بستر میں سے چلتے
وقت گھنگھرو بجنے نہ پائے، اور گھنگھرو تھا کہ بار بار
بجتا رہا۔

وہ گھر آیا مگر دہلیز میں بلی آئی ہی نہیں۔ اس نے
سب سے پوچھا "بلی کہاں چلی گئی؟" مگر کوئی کچھ بولا
ہی نہیں۔

گھنگھرو جیب کے اندر ہی بجتے بجتے آخر نہ جانے
کب پگھل کر رہ گیا۔

(۳)

خواب گاہ کے اندر جلتا ہوا ایک رتن دیپ بجھ گیا
تب رانی نے ادھر ادھر دیکھا۔ رتن دیپ کی جوت
کھڑکی کے رنگین شیشے پر کسی فرشتے کی روح کی
طرح رینگ رہی تھی گھٹنوں تک کھلے بال اپنے سرخ
رخساروں پر پھیلائے ہوئے رانی نرم پنکھوں کے
بستر پر ویسی ہی پڑی رہی۔

کسی مُردہ شخص کی پیاسی خواہشوں جیسا اندھیرا
خواب گاہ میں بھر گیا تھا۔ اس نے کھڑکی کی طرف
دیکھا۔ رتن دیپ کی ڈنڈال سے ٹوٹی ہوئی جوت
اب تک وہیں تھی اور کھڑکی کے کواڑ بند تھے۔ رانی
نے کافی غور کیا۔ اس نے لیٹے لیٹے ہی اپنا ہاتھ
اندھیرے پر ڈال دیا اور اس کے اندر سے ڈبڈبائی
آنکھوں جیسے درد انگیز ستار کے بول نکل پڑے۔
قریب ہی راجہ گہری نیند سو رہا تھا۔ اس کی سانسوں میں
موسیقی بج رہی تھی۔ رانی پلنگ سے نیچے اُتری اور اس نے
کھڑکی کے پٹ کھول دیئے۔ اتنی دیر سے رینگتی ہوئی جوت اب
فضا میں تحلیل ہو چکی تھی اور شبنم کی چار بوندوں میں ڈھل کر
سامنے پھولوں کے پیڑ کے ایک نوکدار پتے پر ٹپک پڑی تھی۔
رانی نے کھڑکی بند کر دی وہ واپس پلنگ کے پاس آئی اور
پنکھوں کے نرم بستر پر لیٹ گئی۔ قریب سویا ہوا راجہ ختم ہو چکا تھا۔

صبح ہوئی تو کھڑکی کھول کر اس نے پھولوں کے پیڑ کے
نوک دار پتے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "آخر راجہ کس کا اور راج
کس کا! سب ہی شبنم کی چار بوندوں میں ڈھلتے ہیں اور مٹی میں
ٹپکتے ہیں۔"

(۴)

ایک تھا بھلا آدمی۔ بیچارہ سنسار میں ڈوبا ہوا تھا
پھر بھی وہ بھلا آدمی ہی رہا۔ بیوی کی باہوں کی گرفت سے چھوٹتے
ہی سب سے پہلے بھگوان کا نام لیا کرتا تھا۔

ایک بار اس نے اپنے پرانے سامان میں پڑا ہوا ایک صندوق
کھولا تو اس کے اندر اسکول کے زمانے کی ایک کاپی ملی۔ اس نے نہایت
صاف اور خوش خط لکھا ہوا اپنا نام پڑھا۔ کاپی میں شروع کے کچھ
صفحات بالکل کورے تھے۔ بعد کے صفحات پڑھتے پڑھتے وہ ایکدم چونک اٹھا۔

اس نے دل ہی دل میں کہا "نہیں نہیں، یہ سب میرا لکھا ہوا نہیں
ہو سکتا۔" اس کا بچپن اسے ترچھی نگاہوں سے گھورتے ہوئے زبان
نکال کر دکھانے لگا اور بولا "یہ گالیاں تیری ہی لکھی ہوئی ہیں۔
اچھا ہوا کہ تیرے ماسٹر جی نے یہ کاپی دیکھی نہیں ورنہ خوب مرمت ہوتی۔"

وہ ایک ایک گالی پڑھنے لگا اور دل ہی دل میں کانپ اٹھا۔

"نہیں۔ یہ میں نے نہیں لکھی ہیں۔"

"جھوٹ بولنا پاپ ہے" کوئی اندر سے بول اٹھا۔

اس پر اس نے کہا "مگر گالیاں دینا تو پاپ نہیں ہے نا؟"

"بالکل نہیں۔ ہم جو کچھ کرتے ہیں وہ اگر پاپ میں شامل
ہوتا رہے تو بھگوان ہی پاپی قرار پائے گا۔"

یہ الفاظ سنتے ہی اس نے اپنا سر کاپی پر ٹیک دیا اور
وہ مر گیا کیونکہ وہ بھلا آدمی تھا۔

نظمیں

سلمیٰ فردوس نقاش

صلیب

دِل کا کلیسا اِتنا ویراں ہے
بیوہ کی اُجڑی مانگ ہو یا ماں کی سونی گود
اور میرا وجود
میرے ہی جسم میں اِک قیدی بن کر رہتا ہے
احساس کی دراڑوں میں اب تک
بیتی یادوں کے کیچوے رینگتے ہیں
زخمی روح کی بے آواز چیخیں
جسم کی دیوار سے ٹکرا کے پاش پاش ہو گئیں
اب تو کچھ بھی نہیں
موت نہیں حیات نہیں
بیچ میں اٹکی سانسوں کی نازک ڈوری ہے
انجانی ڈگر کے اِس لمبے تھکے سفر میں
میرے اندر رہنے والا 'میں' کہیں کھو گیا
اب تم ہی بتاؤ
ارمانوں کی صلیب پہ کیسے چڑھاؤں !!

کفن

لے کے مُٹھی بھر خاک
اِک ہیولیٰ سا بنایا جو اُس نے
سونپ دیے پھر عجب سے نذرانے بھی
غم، فکر، انتشار، محرومی
بولا، صحراؤں کے سناٹے گونجے
یوں کی ہے تیری تخلیق میں نے
وہ ہیولیٰ بھٹکتا رہا یونہی بے نام ریگ زاروں میں
اور روشنی دیتا رہا
اِک دن لیکن
اُڑ گیا زندگی کا فیوز رہ گیا فقط لاشہ اِس سیہ خانے میں
تعفن زدہ ناسور لیے ہوئے
پھر
رواں رواں ترستا رہا اِک بے داغ سپید چادر کے لیے
آئی کہیں خلا سے یہ صدا
ایک کائنات لو ـــــ کفن پوش ہو گئی !!

۵۵

۴۶۸ - جواہر نگر - سری نگر، کشمیر

ایک پینٹنگ

قمر الحسن زیدی

کس انجان سی راہ پر
میں آج بھٹک کر آیا ہوں
جن رستوں کا میں راہی ہوں
جن راہوں سے میں ـــ گزرا ہوں

یہ تو میری وہ راہ نہیں
یوں ملتی جلتی لگتی ہے

برسوں سے چپکے پاؤں سے
کیوں اٹھی ہیں ٹیسیں
گھاؤ سے
کیوں مون ہے ٹپکا آہوں سے
کیوں اُگے ہیں کانٹے
راہوں سے

یہ تو میری وہ راہ نہیں
یوں ملتی جلتی لگتی ہے

انجانے
ان رستوں پر
رکو ذرا۔ ٹھہرو۔ سنو
پتھریلے سناٹوں کی
گونگی سی اس خاموشی میں
دبی دبی اور گھٹی گھٹی سی

کیسی افسردہ چیخیں ہیں

اور
عریاں پیڑوں کے نیچے
سوکھے سوکھے سہمے سائے
سایوں کی کالی چادر
سر سے گٹھری پھینک کر
تھکے تھکے اور تھمے تھمے سے
پل پل جیتے مرتے
لمحے
دم لینے کو لیٹ گئے ہیں

دھوپ کی تیز بارش سے
پیراہن روح بھیگ گئے ہیں
دور بہت دور
آسمانوں کے تلے
بادل اڑتے جاتے ہیں
جن کے سائے دھرتی تک
آتے آتے کھو جاتے ہیں

اتنا اونچا ہونا بھی کیا
اپنا سایہ کھونا بھی کیا

منزل ہے کدھر، منزل ہے کہاں

منزل کا نہیں ہے
کوئی نشاں
یہ رستے
چلتے راہی ہیں
یہ راہ جہاں تک جائے گی
وہ موڑ جہاں پہنچائے گی
کیا جانوں کب وہ آئے گی

یہ رستے
چلتے راہی ہیں
یہ کس انجان سی راہ پر
میں آج بھٹک کر آیا ہوں

کل جب
یہ راہیں انجان نہ ہوں گی
کل جب
ان سے پیار ملے گا
کل جب
دھوپ کی تپتی کایا
شیتل چھایا بن جائے گی

میں ان رستوں سے گزر چکوں گا

ایچ ۸۔ ماڈل ٹاؤن دلی ۱۱۰۰۰۹

بزم احباب

● م۔ق۔خاں
معروف گنج، گیا، بہار

جرأت مندانہ اداریہ کے لیے مبارک باد قبول فرمائیے

کون ہوتا حریفِ مے مرد افگن عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا مرے بعد

آپ نے مُلّا صاحب کی اردو دوستی اور اردو نوازی کا خوب پردہ فاش کیا ہے۔ یہ لوگ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ اسی اُردو کی وجہ سے وہ جانے جاتے ہیں انہیں عزت ملتی ہے اور اسی بیچاری کو تیاگ دیتے ہیں۔ آپ کے اداریے کے بعد جناب خوشونت سنگھ نے بھی السٹریٹڈ ویکلی کے ۱۱۔ دسمبر ۷۷ء کے شمارے میں خوب لکھا ہے —— صحافت صرف چاپلوسی نہیں بلکہ حق و انصاف کی آواز کو بلند کرنے کا نام ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ،

● طاہر محسن علوی
نور اللغات آفس، کاکوری، یوپی۔

آپ کی تحریر دسمبر ۷۷ء کے ماہنامہ تحریک میں دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ یہ نااہل کاکوری انجمن ترقی اردو کا سکریٹری مدت سے ہے۔ کہہ نہیں سکتا کہ اُس نے مُلّا صاحب کی صدارت میں کیا کیا پاپڑ بیلے ہیں نتیجہ کچھ نہیں۔ یہاں اس کے متعلق بہت سا مسالہ ہے۔

نور اللغات کے معاملے میں خاص کر ہمارے ملّا صاحب ہی نے ہم کو دھوکے میں رکھا یہاں تک کہ گورنر صاحب (اکبر علی خاں صاحب) کی تحریر پر جو ملّا صاحب نے ان کو جواب دیا، وہ گورنر صاحب نے مجھے ارسال فرمادی۔ اور اسی معاملے میں جناب مولوی عبدالماجد مرحوم دریابادی کی ملّا صاحب سے ناچاقی بھی ہوگئی تھی۔ انجمن ترقی اردو کو عرصہ ہوا، اور اُردو بورڈ۔ دہلی کو میں نے ایک خط لکھا تھا کہ ایسی ناپید و نادر کتابوں کے زندہ کرنے کا اہتمام کریں، نہیں تو آئندہ نسل ان کے نام سے بھی واقف نہ ہوگی۔ نگار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ یہ بھی آپ نے بجا لکھا ہے کہ کانگریس اور موجودہ سرکار کی منطق یکساں ہے۔ کیا بہوگنا جی جو یو۔پی کے سابق وزیر اعلیٰ تھے وہ اردو کو اس کے قانونی حقوق اپنے قلم سے نہیں دے سکتے تھے اور اب موجودہ سرکار جو بھی کر رہی ہے وہ حُبِ علی میں نہیں بلکہ بغض معاویہ میں۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ اردو کا مقدمہ انجمن ترقی اُردو۔ اور دیگر زر پرست حضرات نے اپنے عہدوں کی خاطر چوپٹ کر دیا بلکہ ہار دیا۔

● فاروق شفق
جی ۱۲ دھان کھیتی، گارڈن ریچ، کلکتہ

’تحریک‘ کا تازہ شمارہ ملا۔ گوپال متل صاحب کے دونوں مضامین فکر انگیز ہیں اور سوچنے سمجھنے کے بہت سے پہلوؤں کو سامنے لاتے ہیں۔ شعری تخلیقات میں زیادہ تر چیزیں بھرتی کی ہیں۔ مکتوبات کے باب میں احمد حسین شمس کے خط نے مسلسل مضمون کا لطف دیا۔ میں خود بھی سلیمان اطہر جاوید کے مضمون پر کچھ لکھنے والا تھا اور تھوڑا بہت لکھا بھی تھا لیکن شمس کے خط کو پڑھ کر ارادہ ترک کر دیا۔ کیونکہ نثری نظم کے سلسلے میں میرا جو مطمحِ نظر ہے اور میں اس باب میں جو بھی لکھتا احمد حسین شمس نے کم و بیش اپنے طویل خط میں اسے پیش ہی کر دیا۔

● ایوب جوہر

ڈیزائن سنٹر، ۷ ٹیپو سلطان روڈ ڈھاکہ، بنگلہ دیش

"تحریک" برابر موصول ہو رہا ہے، ہندوستان سے میرے نام جو رسائل آتے ہیں ان میں یہ واحد رسالہ ہے جس کی اشاعت میں بے قاعدگی نہیں —— نومبر کے شمارے میں نثری شاعری (نظم) سے متعلق آپ نے بڑی اچھی بحث کا آغاز کیا ہے۔ میں ذاتی طور پر ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید کی اس رائے سے متفق ہوں کہ "شعر میں وزن اور قافیہ کی اہمیت مسلّم، لیکن شاعری کی بنیاد صرف وزن اور قافیہ پر نہیں ہے" اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب نے جو حوالے دیے ہیں۔ ان سے اس خیال کو مزید تقویت ملتی ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ اندھیرے اور کالی بلی پر نظر رکھنے والوں کی بھی کمی نہیں ہے اور خوف ہے کہ ہم اسی اندھیرے میں ہی بھٹکتے رہے تو زندگی کا وہ نیا سورج کبھی طلوع نہیں ہوگا جو ہمیشہ تجربوں کی کوکھ سے ابھرتا رہا ہے۔ بہرحال مجھے توقع ہے کہ نثری شاعری سے متعلق تحریک کی یہ بحث بھی گزشتہ مباحث کی طرح نہ صرف دلچسپ ہوگی بلکہ نثری شاعری سے متعلق کسی خاص نتیجے تک پہنچنے میں ممد و معاون ثابت ہوگی۔ "تحریک" کی سلور جوبلی پر میری جانب سے پیشگی مبارکباد قبول فرمائیں۔ آپ کا یہ کہنا کہ "ایک سنجیدہ علمی ادبی رسالے کے لیے پوری چوتھائی صدی تک باقاعدگی سے جاری رہنا کم فخر کی بات نہیں" بالکل حقیقت پر مبنی ہے خصوصاً ان حالات میں جب زبان اردو خود اپنے وطن میں بے وطن ہو کر رہ گئی ہے۔

● خلیق الزماں سحر
دلسا گروارڈ، سیونی، ایم۔پی

تحریک کا شمارہ بابتہ نومبر ۷۷ء کافی انتظار کے بعد موصول ہوا۔ اس شمارہ میں افسانوں میں مہدی ٹونکی کا افسانہ "میرے حصے کا سکھ" اور مجتبیٰ حسین کا انشائیہ "بلراج ورما نے تناظر نکالا" بیحد پسند آئے حصہ نظم میں کرشن موہن ظفر غوری، شہریار، عروج زیدی اور راختر لکھنوی اچھے لگے۔ آپ نے کرشن موہن کی شاعری کے بارے میں بالکل درست فرمایا ہے کہ موصوف جو کچھ محسوس کرتے ہیں اسے جوں کا توں شعر کے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں۔

"نثری شاعری" پر آپ نے اپنے قارئین کو اظہارِ خیال کی دعوت دی ہے اس لیے میں یہ چند سطور سپردِ قلم کر رہا ہوں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے نثری شاعری کو بس سرے سے شاعری کے زمرے ہی میں رکھنے کا قائل نہیں۔ عام طور سے اس کی تعریف یوں کی جاتی ہے کہ ہر وہ فن پارہ جس میں غور و فکر، جذبہ اور شعریت ہو نثری شاعری ہے تو ہم دور کیوں جائیں کرشن چندر کی تخلیق کا مطالعہ کر لیں جس میں جابجا فکر و جذبہ کے ساتھ ساتھ شعریت بھری پڑی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہم ہر اس نثر پارے کو نثری شاعری مان لیں جس میں یہ خوبیاں (فکر، جذبہ اور شعریت) پائی جاتی ہوں۔ اگر جواب اثبات میں ملتا ہے تو پھر اس میں شک نہیں کہ جو جتنا اچھا نثر نگار ہو گا وہ اتنے ہی موثر ڈھنگ سے نثری شاعری کر سکے گا۔ ایسی صورت میں تمام شاعروں کو اس سے دست بردار ہو جانا چاہیے۔

سلیمان اطہر جاوید کے اس خیال کی میں قدر کرتا ہوں کہ نثری شاعری کو "منظوم" کہا جائے اس کے لیے ایک نام "شعر منثور" تو فال میں کھل ہی چکا ہے۔ میرے ذہن میں بھی کچھ نام ہیں جیسے نثر دلآویز، نثر مرصع وغیرہ۔ ویسے اقم الحروف کی رائے ہے کہ کچھ دانشور سر جوڑ کر بیٹھیں اور اتفاق رائے سے کوئی خوبصورت سا نام رکھ لیں تاکہ ہم ایسے ناقدوں (یا حاسدوں کہہ لیجیے) کا منہ بھی بند ہو اور نثری شاعری کے معتقدین نشچنت اور یکسو ہو کر اپنا کام کر سکیں۔

● ڈاکٹر بشیر بدر
سی ۵۶ تیج گڑھی، میرٹھ، یوپی

تین چار سال سے میں نے رسالے نہیں پڑھے تھے بس تحریک تک ایک نظر دیکھ لیا۔ میں اس گمشدگی پر ذرا بھی پشیمان نہیں ہوں۔ یہ عمل میرے لیے ضروری تھا۔ میں ایسا ہی سمجھتا ہوں۔ پندرہ بیس سال سے ہندوستان اور پاکستان کے ادب کے ساتھ تھا۔ کہانیاں پہلے پڑھتا ہوں پھر نظمیں، پھر غزلیں اور تنقیدی مضامین بھی۔ لیکن اس تین

چار سال کے بھی قابلِ ذکر رسائل کو میں نے محفوظ رکھا تھا سوائے اس کے ہر وقت انھیں پڑھتا ہوں۔ آپ امتحان لے لیں شاعر، معیار اور تحریک سے لے کر پاکستان سے آئے ہوئے بیشتر رسائل کو ان دنوں تسلسل میں پڑھا۔

(مشاعرے کی برائیوں کو میں حقیقی طور پہ جانتا ہوں جو لوگ جب مشاعرے میں بلائے جاتے ہیں تو جاتے ہیں لیکن اچھے سے اچھے شعر کا پہلا ہی مصرعہ پڑھ پاتے ہیں۔ ان کی مشاعروں سے دشمنی، ناداں دشمن کی دشمنی ہے ——— میں مشاعروں میں شعر کم سناتا ہوں ۔لیکن یہ سچ ہے کہ میں دس ہزار کے مجمع میں آج کی غزل کے آپ کے، دوسرے تمام لکھنے والوں کا وہ شعر جو مجھے پسند آجاتا ہے اسے اس کے نام سے سناتا ہوں اور اُردو تنقید جو اکثر اچھے شعر کا ذکر کرنے سے معذور ہے اگر وہ اس شعر کا ذکر کرتی ہے تو تنقید کے سہارے وہ شعر سو لوگوں تک پہنچ پاتا ہے اور میں چشمِ زدن میں اسے پانچ ہزار لوگوں کے دل میں اتار سکتا ہوں ۔تحت پڑھ کر ——— کیا یہ کام مجھے بہت اچھا آتا ہے۔ یا جیسے آپ اور ہم مشاعرے کے عوام کہتے ہیں وہ اس قدر اُلّو کے پٹھے نہیں ہیں ۔

آپ کو اتنی ساری غزلیں بھیج رہا ہوں ۔مجھے نہیں معلوم کہ آپ کو کیوں بھیج رہا ہوں ۔بس مجھے اتنا یاد ہے کہ میری ادبی زندگی کے ہر موڑ آپ نے ہمیشہ میرے لیے کچھ کیا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ موڑ ہو تب تو آپ کچھ کریں ۔

● شبیر علی خاں شکیب

ڈسٹرکٹ کورٹ رام پور ۔یوپی

تحریک کا تازہ شمارہ دیکھنے کو ملا جس میں آپ نے غربت رامپوری کے بارے میں میرا مضمون شائع فرمایا ہے اس کا شکر گزار ہوں ۔مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ میرا پتہ معرفت رضا لائبریری درج فرما دیا۔ اس میں یوں تو کوئی قباحت نہیں لیکن یہ خلافِ حقیقت ہے اس لیے از راہ کرم آئندہ شمارے میں سرنامہ پہ درج میرا پتہ شائع فرما کر مشکور فرمائیے تاکہ اگر کوئی صاحب مجھے کبھی یاد فرمانا چاہیں تو بلا واسطہ یاد فرما سکیں اور خط بغیر کسی تاخیر کے مجھے مل جائے ۔

● حیات جاوید

۱۶-۴-۴۶۵۱، باڑہ ہندو راؤ ۔دہلی ۱۱۰۰۰۶

ابھی ابھی تحریک کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ عمدہ مضامین اور اداریوں سے مستفید ہوتا ہوں ۔آپ نے اپنے ہاں ملک کے چیدہ چیدہ اہلِ قلم اکٹھے کیے ہیں بزمِ احباب کے عنوان سے جناب دھرم سروپ کا خط پڑھا حضرت بسمل کا مقطع انھوں نے فرمایا ہے میں نے اسی زمانہ میں اسی زمین میں غزل کہی تھی مگر چونکہ وہ رسالہ کوئی عاریتاً مانگ کر لے گیا اور مجھے واپس نہ مل سکا اس لیے اس غزل کا پورے تاثر کا احاطہ میں نہ کر سکا مقطع بھی کہا تھا اسے ترک کر کے کچھ شعر بھیج رہا ہوں :

شائستۂ نشاطِ الم ہو کے آگیا
اب بے نیازِ دستِ کرم ہو کے آگیا

غواصِ بحرِ غم، دُرِ شہوار کا امین
افسوس آج سنگِ الم ہو کے آگیا

وہ کج کلاہِ بزمِ سخن وہ ادا طراز
گردن کی کج ادائی سے خم ہو کے آگیا

گھبرا چکا تھا شورشِ ہستی سے اس قدر
دل میں صرفِ یاس و عدم ہو کے آگیا

اک جنس بے بہا تھا مگر شومیِ نصیب
پیکِ اجل کا نقشِ قدم ہو کے آگیا

کچھ میرے ہم زبان ہیں کچھ میرے ہم خیال
ماتم گسارِ اہلِ قلم ہو کے آگیا

روزِ ازل سے جس کا نہ پورا ہوا ہو قول
اُس حسنِ بے وفا کی قسم ہو کے آگیا

جدید اردو ادب کے لیے

سطور

چوتھا شمارہ : ایک ادبی دستاویز
جس کا ایک حصہ جدید اردو افسانے کے انتخاب پر مشتمل ہے
شائع ہو گیا ہے، قیمت چھ روپے، سالانہ بارہ روپے
سطور پبلی کیشنز ۔ ۳۲۷۱ ۔ دلی گیٹ نئی دلی ۲ - ۱۱۰۰۰

تبصرے

۱۔ قاعدہ ہندی ریختہ عرف رسالۂ گلکرسٹ

ناشر: ادارۂ المخدوم، ڈاکخانہ نندلور، ضلع کڑپہ (آندھرا پردیش)
سائز: ۲۰+۳۰/۱۶، صفحات: ۲۰۰ قیمت: سات روپے پچاس پیسے

۲۔ برہن کی کہانی

ناشر: ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ
سائز: ۲۰-۳۰/۱۶ صفحات: ۶۷، قیمت: پانچ روپے

۳۔ تلخیص معلّا

مرتب اور ناشر: ڈاکٹر محمد انصار اللہ، بیت الابصار، ۴/۵۸۵ سرسید روڈ، سرسید نگر، علی گڑھ
سائز: ۲۰+۳۰/۱۶ صفحات: ۲۳۰ قیمت: ۹ روپے

ان تینوں کتابوں کے مرتب ڈاکٹر محمد انصار اللہ ہیں جو اُردو زبان کی ابتدا اور اس کے تشکیلی مراحل کے تحقیقاتی مطالعے سے خاص شغف رکھتے ہیں۔ اپنے مطالعے کے دوران میں وہ کچھ ایسے نتائج تک پہنچتے ہیں جنھوں نے انھیں اُردو کی ابتدا کے بارے میں ایک نیا نظریہ قائم کرنے پر آمادہ کیا۔ ان کا خیال ہے کہ اردو کو صرف دہلی اور اس کے گرد و نواح کی بولیوں کی مہذب ترا اولاد قرار دینے اور پراکرت اور اپ بھرنش کے واسطے سے اس کا سلسلۂ نسب سنسکرت سے ملا کر مطمئن ہو جانے کی بجائے اس سوال پر بھی غور ہونا چاہیے کہ اس کا اودھی سے کیا رشتہ ہے۔ ان کی نظر میں یہ رشتہ بہت قریبی اور گہرا ہے اور اپنے اس نظریے کی تائید میں انھوں نے جو دلیلیں دی ہیں وہ واقعی غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں۔

پہلی کتاب ڈاکٹر گلکرسٹ کی تصنیف ہے جو "قواعد زبانِ اُردو" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ زیرِ نظر نسخہ اس کے ایک قدیم قلمی نسخے کو سامنے رکھ کر مرتب کیا گیا ہے۔ مطبوعہ اور قلمی نسخے میں نام کے اختلاف کے علاوہ، متن میں بھی کہیں کہیں عدم مطابقت موجود ہے جس کی نشاندہی ڈاکٹر صاحب نے حواشی میں کی ہے۔ حواشی کے علاوہ ان کا مبسوط مقدمہ نہ صرف کتاب کے بارے میں تمام ضروری معلومات کا احاطہ کرتا ہے بلکہ اردو قواعد کے بعض مسائل سے بھی جن میں مستثنیات کا مسئلہ بھی شامل ہے، خیال انگیز بحث کرتا ہے۔

"برہن کی کہانی" بارہ ماسہ ہے جو مقصود لکھنوی کی تصنیف ہے۔ ڈاکٹر محمد انصار اللہ بارھویں صدی ہجری کے اواخر کو اس کی شاعری کے شباب کا زمانہ قرار دیتے ہیں۔ مصحفی، شیفتہ اور قاسم کے تذکروں کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب نے اس کے بارے میں جو معلومات فراہم کی ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کا عوام پسند شاعر تھا مگر خواص میں اسے کچھ اعتبار حاصل نہیں تھا۔ مصحفی نے اس کے کلام کو خرافات کہا ہے اور لکھا ہے کہ وہ مشاعروں میں شریک نہیں ہوتا صرف میلوں ٹھیلوں میں اس کے شاگرد وغیرہ اس کا کلام سناتے پھرتے ہیں۔ شیفتہ نے اس کا شمار "سفیہان لکھنؤ" میں کیا ہے۔ قدرت اللہ قاسم نے بھی اچھی رائے کا اظہار نہیں کیا ہے لیکن یہ لکھا ہے کہ بازاری لونڈوں میں اس نے اپنی استادی کا جھنڈا بلند کر رکھا ہے اور خود کو سلطان الشعرا کہنے لگا ہے۔ غالباً اسی بیان کی روشنی میں ڈاکٹر صاحب نے اس کے ساتھ اس لقب کا اضافہ کر دیا ہے جو مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

اپنے مقدمے میں ڈاکٹر صاحب نے اُردو میں بارہ ماسے کی روایت اور اس کی صنفی خصوصیات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے اور اس بحث میں اردو کی ابتدا کے بارے میں اپنے مخصوص نظریے کے حق میں بھی شہادتیں فراہم کرتے گئے ہیں — بارہ ماسہ اس وقت کی عام بول چال کی زبان میں ہے اور اس میں ایک فراق زدہ گھریلو عورت کے جذبات کی موثر عکاسی کی گئی ہے۔ متن ڈاکٹر صاحب کو ایک قلمی بیاض سے حاصل ہوا ہے جس کا تعارف انھوں نے مقدمے میں کرا دیا ہے۔

"تلخیص معلاً" کلب حسین خاں نادر کی تصنیف ہے جو ناسخ کے ممتاز شاگردوں میں تھے اور پھر خود بھی رتبۂ استادی پر فائز ہوئے۔ ابتدا میں کچھ مدت تک وہ آتش سے بھی اپنے کلام پر اصلاح لیتے رہے تھے۔ اس طرح انھیں ان کے عہد کے دو بڑے استادوں سے فیض پہنچا — تلخیص معلا میں انھوں نے شاعری کے عیوب محاسن سے بحث کی ہے اور اردو زبان کے مزاج اور اس مزاج کی روشنی میں دوسری زبانوں سے ترکِ قبول کا تعین کیا ہے۔ اصلاحِ زبان کی جو کوششیں ناسخ اور ان کے تلامذہ نے کیں، یہ کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ کتاب مصنف کی زندگی میں چھپ کر مقبولیت حاصل کر چکی تھی، اس کا اندازہ صغیر بلگرامی کے نام ان کے ایک خط سے ہوتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ کتاب کی سات سو جلدیں فروخت ہو چکی ہیں۔ اسی خط میں اپنی تصنیف کی افادیت اور اہمیت کا ذکر نادر نے ان الفاظ میں کیا ہے :

"درخوبی و جذبِ کتاب شکے نیست کہ برلے شاعر بہرہ ازیں ہدایت بنا شد کہ از استاد مستغنی میکند و دریائے در کوزہ بند است"۔

ڈاکٹر انصار اللہ نظر نے ایک مبسوط مقدمے کا اضافہ کر کے کتاب کی اہمیت اور بڑھا دی ہے۔

تینوں کتابوں کی ترتیب و تدوین میں ڈاکٹر صاحب نے جس سلیقے سے کام لیا ہے ان کی کتابت و طباعت سے اتنی ہی بدسلیقگی ظاہر ہوتی ہے — بعض الفاظ کے املا میں تینوں کتابوں میں اہتمام کے ساتھ ہمزہ کی جگہ ی کے نقطوں سے کام لیا گیا ہے۔ مثلاً "گئے" "گئی" "یا گئی" کو ہر جگہ "گیے" "گیی" اور "کیی" لکھا گیا ہے۔ دوسرے بہت سے الفاظ میں بھی خواہ وہ اُردو کے اپنے لفظ ہوں یا عربی فارسی سے آئے ہوں، یہی صورت ہے۔ یہ التزام کاتب کا نہیں ہو سکتا، ایسا یقیناً ڈاکٹر صاحب کی ہدایت پر ہوا ہے۔ لیکن ہمزہ کو اردو املا سے اس طرح یکسر خارج کر دینے کا کوئی جواز راقم الحروف کی سمجھ میں تو آیا نہیں۔

————— محمود سعیدی

افکار و نظریات

مصنف : ڈاکٹر فضلِ امام، ناشر : دانش محل، امین الدولہ پارک، لکھنؤ،

سائز : ۱۸+۲۲، صفحات : ۱۸۴، قیمت : بارہ روپے

یہ ڈاکٹر فضلِ امام کے تنقیدی اور تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے۔ کل پندرہ مضامین ہیں۔ پہلا مضمون "تنقید اور اس کی ماہیت" ڈاکٹر صاحب کے تنقیدی نظریات کو سامنے لاتا ہے اور ایک طرح سے کتاب کے پیش لفظ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ اردو شعر و ادب یا ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ادب کے بارے میں صرف مغربی تنقید کے حوالوں سے گفتگو کرنا صحیح نتائج کی طرف نہیں لے جا سکتا۔ ہر زبان اپنا ایک ماحول اور مزاج رکھتی ہے جس کی پاسداری ضروری ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے مشرق کے علمائے ادب کے کئی اقوال بھی پیش کیے ہیں جو ان تنقیدی معیاروں کی نشاندہی کرتے ہیں جن سے ہمیں کام لینا چاہیے۔

میر، حفیظ جونپوری، نسیم دہلوی، جوش، اقبال سہیل اور دبیر پر مضامین تنقیدی نوعیت کے ہیں۔ حفیظ جونپوری، نسیم دہلوی اور اقبال سہیل ایسے شاعر ہیں جن کی طرف بہت کم ناقدوں نے توجہ کی ہے۔ یہ مضامین لکھ کر فضل امام صاحب نے اُردو تنقید کی طرف سے گویا ایک فرضِ کفایہ ادا کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب اُردو کے ساتھ ساتھ ہندی اور راجستھانی زبانوں سے بھی کماحقہ واقفیت رکھتے ہیں تلسی داس اور رید ماوت پر ان کے مضامین ہندی کے قدیم اسلوب

اور اس کے ادب سے ان کی قریبی شناسائی کی گواہی دیتے ہیں۔ ایک مضمون "ہندی شاعری میں جدید رجحانات" کے عنوان سے ہے جو اس صدی کی ابتدا سے موجودہ دہائی تک سامنے آنے والے شعری میلانات اور نمائندہ شاعروں کا مختصر تعارف کراتا ہے۔

راجستھانی لوک گاتھاؤں اور راجستھانی لوک گیتوں پر مضامین اس اعتبار سے خاص اہمیت کے حامل ہیں کہ یہ اردو والوں کو ایک بالکل نئی دنیا سے آشنا کراتے ہیں۔ راجستھانی تہذیب اور اس تہذیب کو زندگی دینے والے ان کرداروں کا تعارف جو وہاں کے عوام کے اجتماعی لاشعور میں آج بھی سانس لے رہے ہیں، اردو داں طبقے سے خاطر خواہ طور پر اب تک نہیں ہوا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے مضامین میں کئی مقامات ہیں، جن سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن کتاب کے شروع ہی میں ان کے اس بیان پر نظر پڑتی ہے "ان (مضامین) پر نظر ثانی کرنا ضروری تھا، کیونکہ ترک و قبول کے عمل کے پیش نظر میرے نظریات تبدیل ہوئے ہیں، لیکن اس خیال سے کہ میرے ہر دور کی تحریروں اور نظریات کے نقوش محفوظ رہیں، کسی تبدیلی سے کام نہیں لیا جا رہا ہے"، تاہم رام پرشاد بسمل کے ضمن میں یہ یاد دہانی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اب ان سے منسوب صرف وہ غزل ہی جس کا مطلع ہے:

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

متنازعہ نہیں، بسمل کا شاعر ہونا بھی متنازعہ فیہ ہے۔ کئی لوگوں کی رائے یہ ہے کہ وہ خود شعر نہیں کہتے تھے، صرف دوسرے شاعروں کا کلام پڑھا کرتے تھے۔

مخمور سعیدی

اقبال کی کہانی، کچھ میری کچھ ان کی زبانی

مصنف: ڈاکٹر ظہیر الدین احمد جامعی۔ ناشر: اعجاز پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۴۳ نابر خاں اسٹریٹ، دریا گنج، نئی دلی۔

سائز: ۲۲+۳۲/۱۶، ضخامت: ۱۳۲ صفحات، قیمت: دس روپے

یہ ایک پرانی کتاب ہے جو برسوں سے نایاب تھی۔ اعجاز پبلشنگ ہاؤس نے پرانے نسخے کا عکس لے کر اسے دوبارہ شائع کیا ہے۔ کتاب کے نام سے یہ خیال ہوتا ہے کہ اس میں اقبال کے سوانحی حالات بیان ہوئے ہوں گے لیکن ایسا نہیں ہے۔ مصنف نے اقبال کے سوانحی حالات کے بیان کی بجائے ان کے ذہنی سفر کی داستان بیان کی ہے اور اس داستان کا تانا بانا اقبال کے اشعار سے بنا ہے۔ مصنف کلامِ اقبال کے بارے میں ایک خاص نقطۂ نظر رکھتے ہیں، اشعار کا انتخاب اور ان کی ترجمانی اسی نقطۂ نظر کے تحت کی گئی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اقبال کی شاعری ایک پیغامِ عمل ہے جو پوری انسانیت کے لیے ہے، کسی ایک فرقے یا جماعت کے لیے نہیں۔ جو لوگ اقبال کا مخاطب صرف مسلمانوں کو سمجھتے ہیں، ان کی نافہمی پر مصنف بہت چراغ پا ہیں اور انھیں جگہ جگہ انھوں نے طنز و تشنیع کا ہدف بنایا ہے۔ ان کے اندازِ گفتگو میں جو ادّعائیت ہے وہ علمی متانت کے منافی ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ انھوں نے کلامِ اقبال کا غایر نظر سے مطالعہ کیا ہے اور اخذ نتائج میں بھی گہرے غور و فکر سے کام لیا ہے۔ کمی یہی ہے کہ وہ کچھ ذہنی تحفظات کے اسیر ہیں اور ان سے کہیں پیچھا نہیں چھڑا پاتے۔

مخمور سعیدی

دیوانِ ناطق

مرتب و ناشر: محمد عبدالحلیم، قدوائی روڈ، مومن پورہ، ناگپور (مہاراشٹر)

سائز ۱۸+۲۲، ضخامت: ۲۲۴ صفحات، قیمت: دس روپے

مولانا ناطق گلاؤٹھوی (ف: ۱۹۶۹ء) کا شمار اساتذہ میں ہوتا ہے۔ ان کے بزرگ گلاؤٹھی ضلع بلند شہر کے رہنے والے تھے لیکن خود ان کی پیدائش کامٹی میں ہوئی اور ان کی ساری عمر کامٹی اور ناگپور ہی میں گزری جہاں اردو زبان و

ادب کے فروغ میں ان کا ناقابلِ فراموش حصہ رہا ہے افسوس
ہے کہ ان کی زندگی میں ان کا کلام مرتب ہو کر شائع نہ ہو سکا۔
اس کی وجہ کچھ تو ان کی بے نیازی تھی اور کچھ زمانے کی ناقدری
کو بھی اس میں دخل رہا ہوگا۔ جیسا کہ محمد عبدالحلیم صاحب نے ان
کے حالات کے بیان میں لکھا ہے، ابتدا میں ناطق صاحب
اپنا کلام ایک بیاض میں جمع کرتے رہتے تھے لیکن یہ بیاض
ضائع ہو گئی اور اس سے وہ اتنے بددل ہوئے کہ پھر زندگی
بھر کلام یکجا کرنے کی طرف دھیان نہیں دیا۔ زیرِ نظر مجموعے
میں شامل لگ بھگ پونے تین سو غزلیں اور چند نظمیں
محمد عبدالحلیم صاحب نے پرانے اخبارات و رسائل اور خود
مولانا ناطق کے پرانے کاغذات سے جو ادھر ادھر منتشر تھے
جمع کی ہیں۔ اس محنت کی انھیں داد دی جانی چاہیے۔ یہ کام
محمد عبدالحلیم صاحب نے مولانا ناطق کی زندگی میں کر لیا تھا
اور جمع شدہ پورا کلام انھیں دکھا لیا تھا لیکن اس کی
اشاعت کی نوبت ان کے انتقال کے کئی سال بعد ہی
آ سکی۔ محمد عبدالحلیم صاحب نے ناطق کی دو نثری تصانیف
بھی مرتب کی تھیں اور ان کی زندگی ہی میں انھیں شائع
بھی کر دیا تھا۔

مولانا ناطق کا پورا کلام ان کی پختہ گوئی اور قادر
الکلامی کی گواہی دیتا ہے۔ اس میں جذبے اور احساس کی
کمی ہے لیکن فکرِ بلیغ کی کارفرمائی جگہ جگہ نظر آتی ہے۔

—— مخمور سعیدی

لفظوں کی دھوپ

مصنف: شکیل مظہری، ناشر: ہیرین پبلشرز،
آشیانہ، ڈانڈیلی (این۔ کے۔)
سائز: ۱۸×۲۲، صفحات: ۱۱۲، قیمت دس روپے۔

اردو کے جواں سال شاعروں میں شکیل مظہری کا نام
نمایاں ہے۔ "لفظوں کی دھوپ" ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے
جو نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہے۔ کتاب کی ابتدا میں انھوں
نے اپنے شعری نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے
کہ "اپنے کھوئے ہوئے وجود کی تلاش میں ہر دم سرگرداں
ہوں اور شاعری کو عرفانِ ذات کا ذریعہ مانتا ہوں ——
آج تک جو بھی اور جتنا بھی لکھا اسی لیے لکھا کہ اپنے آپ
کو پا جاؤں۔"

عرفانِ ذات کی یہ لگن ہر دور کے فن کاروں کے لیے
ایک زبردست تخلیقی محرک رہی ہے لیکن ہمارے دور کے
فن کار کے لیے اس کی اہمیت اور زیادہ ہے۔ ہر آن بدلتی
ہوئی دنیا میں اپنی پہچان کے بغیر انسان محض لمحوں کا غلام
ہو کر رہ جائے گا۔ اس غلامی سے بچ نکلنے کی اگر کوئی صورت
ہے تو یہی کہ وہ اپنے باطنی وجود سے ناآشنا نہ ہو اور اس
کے تحفظ پر بھی قادر ہو۔ اس عمل میں بعض بیرونی عوامل
سے تصادم ناگزیر ہے اور اس تصادم کی جھلکیاں شکیل صاحب
کے کلام میں صاف دیکھی جا سکتی ہیں:

اس بھرے شہر میں تنہا ہم تھے
یعنی خود اپنے شناسا ہم تھے

کاغذی ہے یہاں وجود اپنا
زندگانی ہے آگ کا دریا

لوگ جب لفظ لفظ کو ترسے
مجھ کو تب گفتگو کا حکم ہوا

بجھاتی جائے گی تعبیر کی حسیں شمعیں
جگاتی جائے گی آنکھوں میں خواب یہ دنیا

لیکن اس تصادم کے نتیجے میں شکیل صاحب دل شکستہ نہیں ہیں
ان کے لہجے میں جو خود اعتمادی ہے وہ گواہی دے رہی ہے کہ
زندگی کے بہتر امکانات پر ان کا یقین متزلزل نہیں ہوا ہے
وہ انسانیت کے مستقبل کو پُر امید نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔
چند سال پہلے میں نے "تحریک" میں ان کا تعارف کراتے ہوئے
لکھا تھا کہ "موجودہ ہیئتِ اجتماعی میں فرد کی بے بسی اور اس
کا وہ داخلی کرب جو نئے شاعروں کا خاص موضوع ہے

ںظہری اس سے آشنا تو ہیں لیکن اس کے اسیر نہیں ....
نھیں پرانی قدروں کی شکست و ریخت کا غم ضرور ہے
لکن وہ ان کے نوحہ خواں نہیں۔ انھیں یقین ہے کہ اسی ملبے پر
ئی تہذیبی اقدار کی پرشکوہ عمارت تعمیر ہو گی ..... مایوسی
در دل گرفتگی کے مقابلے میں وہ امید اور حوصلہ مندی
ے نقیب ہیں اور ان کی شاعری حزنیہ کی بجائے بڑی
حد تک آہنگِ نشاط کی حامل شاعری ہے،" ان کی شاعری
کا آہنگ اب بھی یہی ہے لیکن اب اس میں ایک ہلکی ہلکی
کسک شامل ہو گئی ہے جو غالباً کسی عشقیہ تجربے کی دین ہے۔
نظم کے مقابلے میں غزل کے اسلوب پر شکیل صاحب کی
گرفت زیادہ مضبوط ہے۔ زبان پر کہیں کہیں مقامی بول چال کے
اثرات غالب آ گئے ہیں۔ جیسے اس شعر میں:

کل شب کتنا ہنگامہ تھا کیا کیا رنگ جمایا چاند
میرے دل میں شور مچایا ان کے رُخ کو چوما چاند

متعدی فعلوں میں علامت فاعلی "نے" کا ترک جنوب
کے لکھنے والوں کے ہاں اکثر نظر آتا ہے۔ ترکیبِ مہند کے استعمال
میں کوئی مضائقہ نہیں مگر سلیقہ شرط ہے۔ شکیل صاحب کے ہاں
اس کا استعمال بے احتیاطی سے ہوا ہے:

دُنیا نے کر کے اس کے غموں سے الگ شکیلؔ
ہم کو عجیب مشغلۂ بے کلی دیا

ردفِ علت کے دبنے کی ناگوار مثالیں بھی نظر آتی ہیں، جو تھوڑے
غور و فکر سے دور ہو سکتی تھیں۔

——— مخمور سعیدی

شاخِ لہو

مصنف: شفیع مشہدی۔ قیمت: ۱۳ روپے۔
ملنے کا پتہ: بک امپوریم، سبزی باغ۔ پٹنہ ۔۴ (بہار)

ادھر کہانیوں کے جو نئے اچھے مجموعے منظرِ عام پر آئے ہیں
ان میں شفیع مشہدی کی کتاب "شاخِ لہو" قارئین کی خصوصی توجہ
کی مستحق ہے۔ شاخِ لہو میں تیرہ کہانیاں ہیں۔ اس میں نہ صرف
Theam کا تنوع ہے بلکہ قصہ گوئی کے فن کے ——
Creative Treatment کے مختلف
رنگ ڈھنگ، لہجے اور آوازیں بھی ملتی ہیں۔ شاید اسی وجہ
سے کہانیوں کے مطالعے کے دوران، ایک گونہ تازگی،
توانائی اور حرارت کا احساس ہوتا رہتا ہے۔ شفیع مشہدی
نہ صرف Effective Presentation کے ہنر
سے باخبر ہیں بلکہ "شاخِ لہو" کی کہانیوں میں Sublimity
of thought کی بھی کچھ جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ خاص
طور پر "زخم"، "ناخن"، "نیم کش"، "درد تہہ جام" اور
"خونِ جگر" کو کامیاب کہانیوں کے نمونے کہا جا سکتا ہے۔
"شاخِ لہو" کی بیشتر کہانیوں میں نفسیات کی مختلف
روئیں اور تہیں ملتی ہیں۔ تخلیقِ فن کے سفر میں مشہدی نہ تو
کورانہ تقلید کے قائل نظر آتے ہیں اور نہ غیر ضروری تجربوں کے
دلدادہ۔ ان کی کہانیوں میں کہانیوں کی فضا بھی ہے اور ماحول
بھی۔ پیرایۂ اظہار دلچسپ ہے۔ زبان شگفتہ —— احساسات و
جذبات کی ترجمانی بھرپور —— بہرحال "شاخِ لہو" کے مطالعے
کے دوران شفیع مشہدی کے حصے میں آئندہ آنے والی
فنکارانہ کامیابیوں کی منزلوں کی آہٹیں بھی سنائی دیتی
ہیں۔

——— ابوالفیض سحر

جذبۂ دل، شیشۂ دل،
اور ٹھوکریں کے بعد
معین شاہد اپنا ایک اور دلچسپ ناول
"شکستِ آرزو"
پیش کرتا ہے۔ جو ٹوٹے ہوئے دلوں اور
کچلی ہوئی آرزوؤں کی درد بھری
داستان ہے۔
قیمت: دس روپے

خبرنامہ

● اُردو ہندوستان کی وہ اہم قومی زبان ہے جو ملک کے گوشہ گوشہ میں بولی سمجھی اور پسند کی جاتی ہے۔ لیکن عرصہ سے یہ زبان سیاسی غلط فہمیوں کا شکار رہی ہے۔ ہر چند کہ پچھلے چند برسوں سے عوامی اور سرکاری حلقوں میں اردو سے متعلق بہت سی غلط فہمیاں دُور ہو گئی ہیں تاہم اس سلسلہ میں ابھی مزید کوششوں کی ضرورت ہے۔ ان خیالات کا اظہار اُردو اکیڈمی راجستھان کے چیرمین شری رام کشور ویاس (سابق اسپیکر راجستھان اسمبلی) نے ۱۶ دسمبر کی شام کو غالب اکیڈمی، نظام الدین نئی دہلی کے ایک استقبالیہ جلسہ میں کیا جس کی صدارت ترقی اُردو بورڈ کے چیرمین جناب حیات اللہ انصاری کر رہے تھے۔

صدارتی تقریر کرتے ہوئے جناب حیات اللہ انصاری نے فرمایا کہ راجستھان سے اردو کا نہ صرف تاریخی بلکہ تہذیبی اعتبار سے بھی بہت گہرا تعلق ہے۔ اردو کی سیکولر روایات کی ابتدا راجستھان اور دلی میں اکبر کے دور سے ہی ہو گئی تھی۔ راجستھان کو ہیرے اور جواہرات کی سرزمین قرار دیتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ راجستھان میں علم و فن کے ہیرے اور جواہرات بھی پائے جاتے ہیں وہاں اُردو کی ترقی کے لیے تیز کام کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے فرمایا کہ اردو اکیڈمی راجستھان کو ترقی اُردو بورڈ اور غالب اکیڈمی کا ہر ممکن تعاون حاصل رہے گا۔

اس موقع پر ایک شعری محفل بھی منعقد کی گئی۔ آخر میں اکیڈمی کی طرف سے مطبوعات کا ایک سیٹ جناب رام کشور ویاس صاحب کو بطور تحفہ پیش کرتے ہوئے اکیڈمی کے سکریٹری ذہین نقوی نے معزز مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

● انجمن ترقی اردو، ہمیر پور کی طرف سے ڈاکٹر امیر اللہ خاں شاہین صدر شعبۂ اردو میرٹھ کالج، میرٹھ کی تازہ تصنیف "اردو اسالیب نثر، تاریخ و تجزیہ" کی رسم اجرار کے سلسلے میں ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا جس میں ڈاکٹر صاحب موصوف کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی گئی اور آن کے بصیرت افروز مقالے پر خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔ "اردو اسالیب نثر" اپنے موضوع پر ایک جامع تصنیف ہے جس میں تاریخی نقطۂ نظر سے اردو کے مختلف اسالیب نثر کے آٹھ سو سالہ ارتقا کا تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے۔ مقالے کی سب سے بڑی خوبی اس کا شگفتہ اسلوب نگارش ہے جس کی وجہ سے تصنیف خود اچھے اسلوب کا نمونہ بن گئی ہے

محترمہ نسیم انور نے اپنا تحقیقی مقالہ بعنوان "مولوی عبدالحق حیات اور کارنامے" میرٹھ یونیورسٹی میں داخل کر دیا۔ یہ مقالہ میرٹھ یونیورسٹی کا اولین تحقیقی مقالہ ہے جو ڈاکٹر امیر اللہ خاں شاہین کی نگرانی میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اس مقالے میں مولوی عبدالحق کی حیات اور کارناموں کا بھرپور تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے۔

● ۲۹ اکتوبر ۷۷ء بروز سنیچر رات ۹ بجے "یوم نجمی" کے سلسلے میں "بزم سخن اڑلیسہ" کے زیر اہتمام ایک مشاعرہ راشٹر بھاشا ہال کٹک میں منعقد ہوا جس میں گورنر کے سکریٹری جناب بھوپندر سنگھ مہمان خصوصی تھے مشاعرہ کی صدارت ڈی۔ این شرما صاحب مُوز نے فرمائی اور نظامت کے فرائض ثقلین حیدر صاحب نے انجام دیے اس مشاعرہ کی خصوصیت یہ تھی کہ گزشتہ ۱۳ اگست کے آل انڈیا مشاعرہ کے سوونیر اور جناب کرامت علی کرامت کی کتاب "اضافی تنقید" دونوں کا اجرار بیک وقت مہمان خصوصی جناب بھوپندر سنگھ کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ جناب کرامت علی کرامت نے انجد نجمی مرحوم کی شاعری اور حیات پر روشنی ڈالی۔ جناب حفیظ اللہ نیولپوری نے کرامت صاحب کی کتاب "اضافی تنقید" پر اپنی رائے کا اظہار کیا۔ مشاعرہ نہایت کامیابی کے ساتھ چار بجے صبح کو اختتام پذیر ہوا۔ (باقی ص ۲۹ پر)

شہرۂ آفاق نوبل انعام یافتہ مصنف

الیگزنڈر سولژنسٹین

کے دو عظیم شاہکار

کینسر وارڈ

لفظوں کے کینوس پر اشتراکی روس کے سماجی نظام اور وہاں کے موجودہ معاشرے کی ایک زندہ متحرک اور مکمل تصویر جو بے شمار انفرادی کرداروں اور رویوں کو بھی سامنے لاتی ہے۔

انسان اور فطرت، زندگی اور موت کے وہ بنیادی مسائل بھی اس ناول کا موضوع ہیں جو کبھی پرانے نہیں ہوئے۔

ایک ایسا ناول جو ممتاز روسی ناول نگاروں کی حقیقت نگاری کی پُرشکوہ روایت کو اور آگے لے گیا ہے۔

یہ ناول پہلے دو الگ الگ حصوں میں چھپا تھا، اب دونوں حصے یکجا کر دیے گئے ہیں۔

ڈیمائی سائز۔

٦٦٨ صفحات۔

مضبوط اور خوشنما جلد۔

: قیمت :

اٹھارہ روپے

گلاگ مجمع الجزائر

مصنف کا کہنا ہے کہ "اس کتاب کے سبھی کردار اور واقعات حقیقی ہیں۔ نہ کوئی فرضی نام دیا گیا ہے نہ کہیں تخیل کی رنگ آمیزی سے کام لیا گیا ہے۔"

یہ کتاب ایک ایسی تاریخی دستاویز ہے جس پر یہ کہاوت پوری طرح صادق آتی ہے کہ حقیقت کبھی کبھی افسانے سے زیادہ دلچسپ ہوا کرتی ہے۔

یہ کتاب ماضی قریب کے اُن مخفی گوشوں کو سامنے لاتی ہے جو اب تک معرض تحریر میں نہیں آئے تھے، بالخصوص دوسری جنگ عظیم کے اتحادیوں کے باہمی تضادات پر نئی روشنی ڈالتی ہے۔

یہ کتاب روس کے جبری مشقت کے کیمپوں کے نظام اور اس نظام کے شکار لاکھوں مردوں اور عورتوں کی سرگذشت جزئیات کے ساتھ پیش کرتی ہے — یہ کتاب انسانی حوصلے اور برداشت کی خیال انگیز روداد بھی سناتی ہے۔

ڈیمائی سائز — ٦٠٠ صفحات — آفسیٹ کی طباعت — مضبوط اور خوشنما جلد۔

قیمت: لائبریری ایڈیشن: بیس روپے — عام ایڈیشن غیر مجلد: سات روپے

نیشنل اکاڈمی، ۹ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

NEW DELHI

پنجاب اور آندھرا کی لائبریریوں کے لیے منظور شدہ

ماہنامہ

تحریک

نئی دہلی

شمارہ : ۱۱ جلد : ۲۵

فروری ۱۹۷۸ء

ادارۂ تحریر :

○ گوپال متل

○ مخمور سعیدی

○ پریم گوپال متل

سالانہ قیمت : پندرہ روپے فی کاپی : ایک روپیہ ۲۵ پیسے

بیرونی ممالک سے

سالانہ : تین پونڈ فی کاپی : چھ شلنگ

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتا

منیجر ماہنامہ تحریک ۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر : گوپال متل

مطبع : نعمانی پریس، دہلی

مقامِ اشاعت : ۹ انصاری مارکیٹ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

مندرجات :

مارچ ۱۹۷۸ء میں

اپنی اشاعت کے ۲۵ سال پورے کر رہا ہے

ایک سنجیدہ علمی ادبی رسالے کے لیے پوری چوتھائی صدی تک باقاعدگی سے جاری رہنا کم فخر کی بات نہیں، بالخصوص موجودہ ماحول میں جب اُردو زبان خود اپنے وطن میں بے وطن ہو کر رہ گئی ہے۔

اس موقع پر ہم نے تحریک کا سلور جبلی نمبر شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

تحریک کے خاص نمبر جب جب شائع ہوئے ہیں، ان کی دھوم مچ گئی ہے، ہماری کوشش ہوگی کہ سلور جبلی نمبر سابقہ تمام نمبروں پر سبقت لے جائے۔

ہمارا منصوبہ یہ ہے کہ اس نمبر میں اُردو زبان و ادب کے پچھلے ۲۵ سال کے بھرپور جائزے کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ۲۵ سال کے شعر و ادب کا تعارف بھی پیش کیا جائے اور ان زبانوں کی منتخب تخلیقات کے تراجم بھی۔

ہندوستان میں اُردو زبان کے مستقبل پر ایک مذاکرے کی شمولیت بھی زیرِ غور ہے

اس ضخیم و عظیم نمبر کی تیاریوں میں، جو ایک بے مثال ادبی تحفہ ہوگا، ہمارا ہاتھ بٹائیے — اس کے لیے اشتہارات کی فراہمی میں ہماری مدد کیجیے اور اسے رعایتی داموں پر حاصل کرنے کے لیے **تحریک** کی سالانہ خریداری قبول کیجیے۔

ہم اپنے قلمکار دوستوں سے بہ طور خاص تعاون کی درخواست کرتے ہیں۔ ہم ہمیشہ کی طرح آپ کی مخلصانہ مدد کے منتظر ہیں۔

گوپال متّل

اُردو اور مہاتما گاندھی

اُردو کے مُلکی یا غیر مُلکی ہونے کی بحث پھر شروع ہوگئی ہے اور اس مرتبہ زیادہ شدّت کے ساتھ۔ پہلے اُردو کے مخالفوں کا کہنا صرف اس قدر تھا کہ یہ قیامِ پاکستان کے بعد غیر مُلکی ہوگئی ہے کیونکہ مسلمانوں نے جن بنیادوں پر مطالبۂ پاکستان کیا تھا ان میں ایک بنیاد یہ بھی تھی۔ لیکن اب اُردو کے مخالفوں کا کہنا یہ ہے کہ یہ زبان اصلاً ہی غیر مُلکی ہے جسے مسلم حکمرانوں نے زبردستی ہندوستان پر تھوپ دیا تھا۔

ان دنوں جب بال ٹھاکرے صاحب ڈھٹائی کے ساتھ یہاں تک کہہ سکتے ہیں کہ ترکمان گیٹ پر سختی کرنا اس لیے ضروری ہوگیا تھا کہ مسلمانوں نے پانچ ڈاکٹروں اور نرسوں کو زندہ جلا دیا تھا، غلط یا صحیح کی بحث کچھ زیادہ اہم نہیں رہی۔ پھر بھی بیانِ واقعہ کے طور پر عرض ہے کہ اُردو درباری اور سرکاری زبان اس وقت بنی جب مسلمانوں کی حکومت زوال کے آخری مرحلوں میں تھی ورنہ دفتری زبان فارسی تھی۔ اردو جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے ملی جلی زبان تھی جس میں مقامی زبانوں کا عنصر غالب تھا۔ جو زبان حکومت کی طرف سے لاگو کی جائے وہ یک رنگ ہوتی ہے، جیسے انگریزی زبان۔ لیکن اُردو کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا۔ اس نے ہندوستان کے مختلف خطوں میں مختلف رنگ اختیار کیا۔ اُردو کے مورخوں اور ناقدوں کی زیادہ توجہ اس اردو پر رہی ہے جو دلّی اور لکھنؤ میں مروج تھی۔ جب اس زبان کا عروج تھا تو دلّی اور لکھنؤ والوں میں معرکے بھی ہوا کرتے تھے۔ ان معرکوں کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے حقیقت یہ ہے کہ دلّی اور لکھنؤ کی بحث استادوں کی نوک جھونک سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ اُردو کی ہمہ گیری اور رنگا رنگی کا جائزہ لینے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ دکن میں اس نے کیا رنگ اختیار کیا۔ دکنی اُردو اور دلّی اور لکھنؤ کی اُردو میں اسلوب اور لہجے کا نمایاں فرق ہے۔ جن لوگوں نے حافظ محمود شیرانی کی کتاب 'پنجاب میں اُردو' پڑھی ہے وہ اُردو پر پنجابی کے اثرات سے بھی انکار نہیں کر سکتے۔ اس نہج پر اُردو کی نشو و نما اس کا واضح ثبوت ہے کہ اسے کسی منصوبے کے تحت مسلّط نہیں کیا گیا۔ یہ ایک خود رو زبان تھی۔ پہلے یہ عوام کی زبان بنی پھر باقی زبانوں کی طرح ترقی کرتے کرتے خواص کی بھی زبان بن گئی۔

اُردو کے عوامی زبان ہونے کا ایک ثبوت یہ فقرہ ہے جو دلّی والوں کی زبان پر رہتا تھا، یعنی یہ کہ اُردو سیکھنا ہو تو جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھو۔ اس فقرے کا اب کچھ لوگ غلط مطلب نکالنے لگے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک دوست نے مجھ سے کہا تھا کہ متّل صاحب جامع مسجد کی سیڑھیوں پر تو بھکاری بیٹھتے ہیں۔ خدا نہ کرے کہ مجھے یا آپ کو وہاں بیٹھنا پڑ جائے۔ لیکن یہ اس فقرے کا اصل مطلب نہیں۔ اصل مطلب یہ تھا کہ اُردو زبان سیکھنے کے لیے عوام سے رابطہ قائم کیا جائے۔ ایسی خود رو زبان کو مصنوعی اور اوپر سے ٹھونسی ہوئی زبان کہنا انصاف نہیں، سیاست ہو تو ہو اور سیاست بھی وہ جس کے بارے میں میرزا غالب کہہ گئے ہیں :

دل ہی تو تھا سیاستِ "دربان" سے ڈر گیا

سب سے بڑا ظلم یہ ہے کہ اُردو کی مخالفت

مہاتما گاندھی کے حوالے سے کی جا رہی ہے۔ مہاتما گاندھی کا اُردو کے بارے میں جو موقف تھا وہ ذیل کے اقتباسات سے بخوبی ظاہر ہے جو "ندائے ملت" میں شائع شدہ جناب عبدالسلام صدیقی کے ایک مضمون سے ماخوذ ہیں:

۱۔ "گاندھی جی نے "ہری جن سیوک" کے ہندی ایڈیشن کے ساتھ اس کا اردو ایڈیشن بھی جاری کیا تھا۔ بعد میں جب حالات کچھ ایسے ہو گئے کہ انھیں اُردو ایڈیشن بند کرنا پڑا تو انھوں نے منصفانہ طور پر ہندی ایڈیشن بھی بند کر دیا۔ یہ اس کا ثبوت ہے کہ انھیں دونوں رسم خطوں سے برابر کا پیار تھا۔ اس ضمن میں انھوں نے فرمایا: "مجھے اس بات کی وضاحت کرنے دیجیے کہ میں نے کیوں دونوں ایڈیشنوں کو بند کر دیا۔ اور کیوں نہ ایک ہی کو بند کیا۔ یہ صحیح ہے کہ جب "ناگری" "نوجیون" اور دیوناگری "ہری جن سیوک" شائع ہونا شروع ہوئے تو دونوں رسم خطوں کا کوئی تنازعہ نہیں تھا اور اگر رہا بھی ہو تو کم از کم میرے علم میں نہیں۔

دریں اثنا مرحوم سیٹھ جمنا لال بجاج کے ایما پر "ہندستانی پرچارنی سبھا" کا قیام عمل میں آیا اس بنا پر اُردو ایڈیشن نکالنا بے حد ضروری ہو گیا۔ اب اگر میں اُردو ایڈیشن بند کر دیتا اور صرف ناگری ایڈیشن جاری رکھتا تو یہ خود میری نظروں میں انتہائی غیر معمولی امر ہوتا۔ کیوں کہ ہندوستانی پرچارنی سبھا کی رو سے "ہندوستانی" کے معنی اس زبان کے ہیں جو دونوں خطوں میں تحریر کی جائے۔ نتیجے کے طور پر اگر یہ اخبار دونوں رسم خطوں میں طبع ہو رہا ہو تبھی اسے جاری رہنا چاہیے۔ بالخصوص ان حالات میں یہ بات اور بھی اہم ہو جاتی ہے جب چاروں طرف سے لوگ شور و غوغا کر رہے ہیں کہ ہندوستان کی قومی زبان ہندی ہونی چاہیے جو صرف دیوناگری رسم خط میں لکھی جائے۔ میرا یہ فرض ہے کہ میں یہ واضح کر دوں کہ یہ دعویٰ یا مطالبہ صحیح نہیں ہے۔ اگر میری دلیل ٹھیک ہے تو پھر مجھ پر یہ فرض اور بھی زیادہ عائد ہوتا ہے کہ یا تو میں "ہری جن سیوک" کے دونوں ایڈیشنوں کو جاری رکھوں یا دونوں کو بند کر دوں"۔

("مہاتما" مصنفہ ڈی۔ جی ٹنڈولکر جلد ہشتم۔ ایڈیشن ۱۹۵۴ء صفحات ۲۹۵۔۲۹۴)

۲۔ "(گاندھی جی) نے اخبار میں پڑھا کہ اب سے یوپی کی سرکاری زبان صرف دیوناگری رسم خط میں ہندی ہوگی۔ اس خبر سے انھیں صدمہ پہنچا۔ ان کے نزدیک بہتر بات یہ تھی کہ دونوں رسم خطوں کو برقرار رکھا جاتا اور تمام سرکاری کام کاج میں دونوں میں سے کسی کا بھی استعمال قابلِ قبول ہوتا۔ اس کے نتیجہ میں دونوں رسم خط سیکھنا ضائع ہو جانے والی کوئی چیز نہ ہوتی اس کے سیکھنے سے خود سیکھنے والوں کا بھلا ہوتا اور زبان بھی مالا مال ہوتی۔ ایسے اقدام پر کسی کو نکتہ چینی نہیں کرنی چاہیے۔۔۔۔۔ مساوی سلوک کا یہ تقاضا ہے کہ اردو رسم خط کا احترام کیا جائے"۔

(۱۵ اکتوبر ۱۹۴۷ء کی پرارتھنا سبھا میں گاندھی جی کی تقریر جو "دہلی ڈائری" میں پیارے لال نے درج کی ہے اور جسے نوجیون پبلشنگ ہاؤس احمد آباد نے مارچ ۱۹۴۸ء میں طبع کیا۔)

۳۔ "اسی مخلص دوست نے انھیں (گاندھی جی کو) پھر یاد دلایا کہ دونوں رسم خط (اُردو اور ناگری) کے لیے ان کا شدید اصرار بے محل ہے اور اس طرح رومن رسم خط کے لیے راستہ صاف ہو جائے گا۔ یہ دوست رومن رسم خط کے حق میں جانب دار تھا لیکن گاندھی جی اس سے متفق نہیں تھے اور نہ ہی انھیں یہ خوف لاحق تھا کہ رومن رسم خط ان دونوں کو ہٹا کر ان کی جگہ لے لے گا۔ وہ اس سوال پر کسی بحث میں پڑنا نہیں چاہتے تھے۔ انھوں نے نہایت ہی متانت سے اس مسئلے پر اتنا ہی اظہار خیال کیا کہ اگر آپ نے ان دونوں رسم خطوں کو اپنانے سے احتراز کیا تو آپ کی قومیت نادار رہے گی۔ آپ کی حب الوطنی کا تقاضا یہ ہونا چاہیے کہ آپ کے لیے دونوں رسم خط سیکھنا ایک پُرمسرت بات ہو"۔

(دہلی ڈائری ۱۸ اکتوبر ۱۹۴۷ء کی پرارتھنا سبھا کی تقریر ۔ پیارے لال)

۴۔ "یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ نہ تو ایک زبان کا اردو کیریکٹر اور نہ ہی اُردو فارم بلا شرکت غیرے مسلمانوں کی جائداد ہے ۔ ہندو، سکھ اور دوسرے لوگوں کی ایک کثیر تعداد ایسی بھی ہے جس کی مادری زبان اُردو ہے اور جو صرف اُردو حروف سے ہی واقف ہیں یہ بات آپ کو اور زیادہ ذہن نشین رکھنا چاہیئے کہ ۱۹۱۵ء میں جنوبی افریقہ سے واپسی کے بعد سے میں متواتر دونوں رسم خط (اردو اور دیوناگری) کی واقفیت پر زور دیتا آرہا ہوں۔"

"فرقہ وارانہ اتحاد" ۔ ایم کے گاندھی ۔ نوجیون پبلشنگ ہاؤس ۔ احمد آباد ۔ اگست ۱۹۴۹ء کا ایڈیشن ۔ صفحہ ۶۸۹)

۵ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قومی زبان کے متعلق یہ جھگڑا ہو گیا ہے کہ قومی زبان کیا ہو ۔ مجھ سے کہا گیا ہے کہ وہ ہندی ہو گی ۔ جو دیوناگری حروف میں لکھی جائے گی نہیں، تو کبھی اس پر رضامند نہیں ہو سکتا میں دو مرتبہ ہندی ساہتیہ سمیلن کا صدر رہ چکا ہوں میں ہندی یا اردو کا دشمن نہیں ہو سکتا لیکن میں یہ سمجھ چکا ہوں کہ عوام کی زبان صرف وہی ہو سکتی ہے جو اُردو ہندی کا مرکب ہو ۔ جو دیوناگری اور اُردو دونوں رسم خط میں لکھی جائے۔"

(۱۰ اگست ۱۹۴۷ء کی گاندھی جی کی تقریر)

۶ "میں دو دفعہ ہندی ساہتیہ سمیلن کا صدر رہ چکا ہوں ۔ اس وقت تو سمیلن قومی زبان کے متعلق میری کوششوں کا سوآگت کرتی تھی مگر اب کیوں وہ ان باتوں کو ناپسند کرتی ہے ۔ کیا اُردو اور ہندی کو ملا کر ایک زبان بنانے کی کوشش کر کے میں کم تر درجے کا ہندو یا ہندوستانی بن گیا کیا وہ ایک مکمل ہندوستان کی خدمت کر سکتے ہیں، اگر اُردو رسم خط اور اُردو زبان کو اس سے خارج کر دیا جائے۔"

(۱۸ دسمبر ۱۹۴۷ء کی گاندھی جی کی تقریر)

۸ "کچھ برسوں کے بعد گاندھی جی نے دونوں رسم خط یعنی دیوناگری اور اُردو (فارسی) کی واقفیت کے لیے وکالت کرنا شروع کر دی ۔ انھوں نے "راشٹر بھاشا" ہندی کو "ہندوستانی" کہنے پر بھی زور دیا اور بعد میں صرف "ہندوستانی" ہی کہنا شروع کیا وہ بابو پرشوتم داس ٹنڈن کے ساتھ بہت ہی طویل مراسلاتی بحث میں پھاند پڑے جو اس وقت ہندی ساہتیہ سمیلن کے صدر تھے آخر کار انھوں نے ہندی ساہتیہ سمیلن کی رکنیت سے مستعفی ہو جانے کا فیصلہ کر لیا اور وردھا میں ایک الگ تنظیم کی داغ بیل ڈالی جس کا نام "ہندوستانی پرچارنی سبھا" رکھا ۔ گاندھی جی کے استعفے کے ساتھ کاکا صاحب اور اور خود میں (شری مین نرائن) بھی "راشٹر بھاشا پرچار سمتی" سے علاحدہ ہو گیا ۔ بابو از خود اس بات کے لیے رضامند ہو گئے کہ وہ ہندوستانی پرچارنی سبھا کے صدر بنیں اور میں جنرل سکریٹری بن گیا۔"

(شری مین نرائن تزکِ گاندھی و نہرو ۔ پاپولر پرکاشن بمبئی نومبر ۱۹۷۱ء کا ایڈیشن صفحہ ۳۲)

اوپر کے اقتباسات سے گاندھی جی کا جو موقف ظاہر ہوتا ہے وہ کسی بھی شک شبہ کی گنجائش نہیں چھوڑتا اس کے بعد بھی گاندھی جی کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ صرف دیوناگری رسم خط باقی رکھنا چاہتے تھے اور اردو رسم خط کو خیرباد کہنے کے حق میں تھے، ان لوگوں کو ہرگز زیب نہیں دیتا جو اپنی صداقت شعاری کے ثبوت میں بار بار یہ کہتے ہیں کہ وہ گاندھی جی کے مسلک کے پیرو ہیں۔

اپنی پسند کی سبھی کتابیں
نیشنل اکاڈمی سے طلب کیجیے

گوپال متل | لال قلعے کا مشاعرہ

دِلّی کے لال قلعے میں منعقد ہونے والا اس برس کا جشنِ جمہوریت کا مشاعرہ بہت اہم تھا۔ اس سے پہلے جو مشاعرے منعقد ہوتے تھے ان میں شرکت کرنے والے بیشتر شعرا شرکتِ مشاعرہ کے صلے میں یہ ضروری سمجھتے تھے کہ حکمراں پارٹی کے قصیدے پڑھے جائیں اور حزبِ مخالف پر نیاز واحملے بھی کیے جائیں یہ روش گزشتہ برس تو بہت ہی مکروہ شکل میں سامنے آئی جب شاعروں نے گلا پھاڑ پھاڑ کر ایمرجنسی کی مدح خوانی کی۔ اس مرتبہ مشاعرہ کی صلاح کار کمیٹی کی پہلی میٹنگ ہی میں دلّی کے چیف ایگزیکٹو کونسلر شری کیدار ناتھ ساہنی نے مشورہ دیا تھا کہ شعرا کے لیے حکمراں پارٹی کی قصیدہ خوانی کسی طرح بھی ضروری نہیں، انھیں اپنے دلی جذبات کا اظہار ہی کرنا چاہیے۔ صلاح کار کمیٹی سے انھوں نے یہ بھی کہا کہ خوشامد پیشہ اور درباری قسم کے شاعروں کو حتی الوسع مشاعرے سے دُور رکھا جائے خواہ وہ سابقہ حکومت کے خوشامدی ہوں یا نئی حکومت کے خوشامدی بننے کے آرزومند۔ صلاح کار کمیٹی نے اس مشورے پر عمل بھی کیا۔

صلاح کار کمیٹی نے اپنی غیر جانبداری کا یہاں تک ثبوت دیا کہ اس کے ان ممبروں نے جو شاعر بھی تھے، رضاکارانہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ وہ بطور شاعر مشاعرے میں شریک نہیں ہوں گے۔ اس پر بھی پارلیمنٹ کے بیس موجودہ اور سابق ممبروں نے جن میں سے بعض کا سیاسی ماضی مشکوک ہے، یہ بیان دے ڈالا کہ مشاعرہ کمیٹی پر ایک خاص مکتبِ فکر کا قبضہ ہو گیا ہے۔ انھوں نے جن شاعروں کی عدم شمولیت کے خلاف خصوصی طور پر احتجاج کیا ان میں ایک آنند موہن زتشی گلزار دہلوی تھے جنھیں ادب کے کسی سنجیدہ طالبِ علم نے آج تک اہم شاعر تو کیا شاعر بھی تسلیم نہیں کیا۔ جس قسم کی شاعری وہ کرتے ہیں اس کا نمونہ انھوں نے ایک مشاعرے میں جو لال قلعے کے مشاعرے کے دوسرے ہی دن شری دھرم پال گپتا وفا کے زیرِ اہتمام منعقد ہوا تھا، مہیا کر دیا۔ یہ فراموش کرتے ہوئے کہ وہ ایک نیم سرکاری ادارے میں ملازم ہیں اور کسی سرکاری ملازم کے لیے سیاسی جانبداری کا برملا مظاہرہ ممنوع ہے، انھوں نے پھدک پھدک کر پڑھا:

> آیا یہ کون سبز قدم گھر کو روندنے
> للّٰلہ اب نہ ایسے ہیرو لے کے آئیو

اور اس پر بُری طرح ہوٹ بھی ہوئے۔

جہاں تک لال قلعے کے مشاعرے کا تعلق ہے اس کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ اسٹیج کا ماحول جتنا خوشگوار اس مرتبہ تھا، اس سے پہلے کبھی نہیں رہا پہلے جب کوئی شاعر کلام پڑھ رہا ہوتا تھا تو دوسرے شاعر سرگوشیوں میں مصروف ہوتے تھے اور فقرے بازی سے بھی باز نہیں آتے تھے۔ اس بار شاعروں کا مظاہرۂ اخوت مثالی تھا۔ سب نے ایک دوسرے کا کلام توجہ اور انہماک سے سُنا اور مشاعرے کے اختتام تک بڑی شائستگی سے اسٹیج پر بیٹھے رہے جہاں تک مشاعرے کے غیر جانبدارانہ ماحول کا تعلق ہے اس کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا

ہوسکتا ہے کہ حفیظ میرٹھی نے بھی جنھوں نے ایمرجنسی کے دوران قید و بند کی سختیاں برداشت کی تھیں، ایسی کوئی بات نہیں کہی جس کا روئے سخن کسی خاص طرف ہو۔ سبھی شاعروں نے اس حقیقت کو ملحوظ رکھا کہ جشنِ جمہوریت ایک قومی تقریب ہے۔

مشاعرے کی صدارت کے فرائض شری کیدار ناتھ ساہنی نے انجام دیے اور مہمانِ خصوصی ہندوستان کے وزیر خارجہ شری اٹل بہاری باجپائی تھے۔ دلّی کے لفٹیننٹ گورنر شری ڈی۔ آر۔ کوہلی بھی مشاعرے میں موجود تھے۔ بالعموم ممتاز شخصیتیں مشاعروں میں صرف رونمائی کے لیے ہی آتی ہیں اور کچھ دیر بیٹھ کر عالی مقام حضرات مشاعرے سے اٹھ کر چلے جاتے ہیں لیکن شری ساہنی شری باجپائی اور شری کوہلی آخر تک مشاعرے میں موجود رہے۔

شری باجپائی کی تقریر بڑی مدلل اور برمحل تھی۔ مشاعرے کے سووینیر میں بیگم خورشید قدوائی نے اپنی افتتاحی تحریر میں ایک بڑے پتے کی بات لکھی ہے کہ: "ماضی میں اردو کے مطالبات اور ان مطالبات کے جواب میں حکمرانوں کے وعدے محض سیاسی اور انتخابی نوعیت کے تھے۔" شری باجپائی کی تقریر کی خوبی یہ تھی کہ یہ نعرہ بازی سے دور تھی اور ان کے اخلاص کو ظاہر کرتی تھی۔ انھوں نے واضح طور پر اعلان کیا کہ اردو ایک ہندوستانی زبان ہے اور اسے یہاں پھولنے پھلنے کا پورا حق حاصل ہے۔ مشاعرے کے بارے میں انھوں نے کہا کہ اب عام ہندوستانیوں کی طرح شاعروں کو بھی اپنے دل کی بات کہنے کا اختیار ہے اور اس پر کوئی قدغن نہیں ہوگی۔

حاضری بھی اس مشاعرے میں گزشتہ مشاعروں سے زیادہ تھی اور اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ پہلے دعوت ناموں کی تقسیم کے جو مراکز قائم کیے جاتے تھے، وہ ان کی تقسیم میں مستعدی نہیں دکھاتے تھے۔ عام حاضرین کا رویّہ بھی مثبت تھا لیکن ایک منظم ٹولی جس کے سرغنے دلّی کے کچھ جانے پہچانے کمیونسٹ اور بیمار ذہنیت کانگریسی تھے، مشاعرے میں گڑبڑ پھیلانے کا شروع ہی سے تہیہ کیے ہوئے تھی اور جہاں تک ان کا بس چلا ان لوگوں نے گڑبڑ پھیلانے کی کوشش بھی کی۔ ان کی اس ہڑبونگ کا شاعروں کے کلام سے کوئی تعلق نہیں تھا جس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ گڑبڑ کی ابتدا انھوں نے اس وقت کی جب شری باجپائی تقریر کر رہے تھے، خاص طور پر ان کے اس فقرے پر کہ اب ہندوستانیوں کو تحریر و تقریر کی پوری آزادی حاصل ہے اور اس ضمن میں موجودہ حکومت کا رویّہ سابقہ حکومت سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ اس پر ہڑبونگیوں نے اس قسم کے نعرے بلند کیے کہ اب بھی وہی حالت ہے تو شری باجپائی نے کہا کہ اگر ایسا ہوتا تو آپ یہ کہنے کو یہاں موجود نہ ہوتے۔

لال قلعے کے مشاعرے اور دوسرے مشاعروں میں بھی ہڑبونگ اور ہوٹنگ نئی بات نہیں۔ لال قلعے کے مشاعرے کے اگلے دن شری دھرم پال گپتا وفا کے اہتمام میں جو مشاعرہ ہوا اس میں بھی کئی شاعروں کو جن میں سے کچھ پارلیمنٹ کے بیں سابق اور موجودہ ممبروں کے منظورِ نظر تھے، ہوٹنگ کا سامنا کرنا پڑا۔ لال قلعے میں جو ہڑبونگ ہوئی اس کا اہم پہلو یہ ہے کہ یہ ایک منظم سازش کے تحت تھی جس کے ڈانڈے عجب نہیں کہ ممبرانِ پارلیمنٹ کے بیان سے بھی ملتے ہوں۔

ہڑبونگ ایک وقتی چیز تھی، ختم ہوگئی لیکن اس کے دو پہلو ایسے ہیں جن پر دلّی ایڈمنسٹریشن ہی کو نہیں، مرکزی حکومت کو بھی سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے:

۱۔ کیا تحریر و تقریر کی آزادی کا جو حق ہندوستان کے ایک عام شہری کو حاصل ہے، وہ حکومت کے وزرا کو حاصل نہیں؟

۲۔ کیا سو دو سو آدمیوں کی آمادۂ شر ٹولی کو یہ حق دیا جاسکتا ہے کہ وہ ہزاروں لوگوں کو پریشان کرسکیں اور ان کی آزادی میں مخل ہوسکیں؟

(باقی صفحہ ...)

گوپال متّل | مشقِ سخن اور چکّی کی مشقّت

۲۲ جنوری کو دلّی کے ڈپٹی میئر اور اُردو کے مشہور مصنّف مولانا امداد صابری کی کتاب "دلّی کے مدرس اور مدارس" کی رسمِ اجرا غالب اکاڈمی، نئی دلّی میں ادا ہوئی۔ کتاب کا اجرا مرکزی وزیر جنابِ سکندر بخت نے فرمایا اور جلسے کی صدارت کے فرائض ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے انجام دیے۔

تقریباً سبھی مقرّرین نے مولانا امداد صابری کے اس وصف کو سراہا کہ وہ سیاسی سرگرمیوں میں مصروف رہنے کے باوجود علمی اور ادبی کام بھی کرتے رہے جس کا ثبوت ان کی تصنیفات کی تعداد ہے جو ۴۵ تک پہنچ چکی ہے۔ جناب سکندر بخت نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ سیاست ایک سنگلاخ زمین ہے جہاں پھول شاذ و نادر ہی کھلتے ہیں انھوں نے کہا کہ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ مولانا امداد صابری کی کوششوں سے اس سنگلاخ زمین میں بھی علم و ادب کے پھول کھلتے رہے ہیں۔

سکندر بخت صاحب کی تقریر سے مسعود حسین خاں صاحب نے غالباً یہ قیاس کیا کہ وہ سیاست اور ادب میں خطِ تقسیم کھینچنا چاہتے ہیں۔ اپنی صدارتی تقریر میں انھوں نے اس کی تردید کے لیے حسرت موہانی کے اس مصرعے کا ذکر کیا کہ:

ہے مشقِ سخن جاری چکّی کی مشقّت بھی

اس کے بعد دوسرے مقرّرین نے بھی اس مصرعے کو بار بار دہرایا جن میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے جنرل سیکرٹری ڈاکٹر قمر رئیس اور ڈاکٹر محمد حسن بھی شامل تھے۔

ترقی پسند اپنی تحریک کی ابتدا ہی سے اس مصرعے کو دہراتے رہے ہیں لیکن اس سے جو مفہوم وہ اخذ کرتے ہیں وہ درست نہیں ہے۔ حیرت ہے کہ مسعود حسین خاں نے بھی پرانی بات ہی دہرا دی اور شعر کے دوسرے مصرعے پر غور کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

ہے مشقِ سخن جاری چکّی کی مشقت بھی　　اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

گویا ان کے نزدیک چکّی کی مشقّت اور مشقِ سخن کا میل جول اس بات کا نتیجہ ہے کہ حسرت کی طبیعت میں وہ طرفگی ہے جو معمول سے مختلف ہے۔ اس سے سکندر بخت صاحب کے قول کی تصدیق ہوتی ہے، مسعود حسین خاں اور ان کے موئدین کے خیال کی نہیں۔

بعض مقررین نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ قدیم معاشرے میں مدرّسوں کی جو قدر ہوتی تھی وہ موجودہ معاشرے میں نہیں ہوتی لیکن حسرت کے سیدھے سادے شعر کو سمجھنے میں ممتاز مدرّسین نے جو دھوکا کھایا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مدرّسین کی ناقدری میں تھوڑا بہت ان کا اپنا بھی دخل ہے۔

کرشن موہن | کُھردری غزلیں

جو خیال آئے جکڑتا ہوں میں
اُڑتے پنچھی کو پکڑتا ہوں میں

حکمت و علم سے بے بہرہ ہوں
نشۂ زر میں اکڑتا ہوں میں

معنی و حسنِ بیاں کے موتی
اپنے اشعار میں جڑتا ہوں میں

لوگ بنتے ہیں بگڑنے کے بعد
اور بن بن کے بگڑتا ہوں میں

ارتقا، عجز، سکھاتا ہے مجھے
پھیلتا ہوں تو سکڑتا ہوں میں

وصل میں بھی یہ فراقِ صحبت
آپ سے مل کے بچھڑتا ہوں میں

لو شجر پھلتے ہیں پت جھڑ میں بھی
کیوں بہاروں میں اُجڑتا ہوں میں

∆∆

ہو کے اکھڑ ایسے مچلی ہے تمنّا
جس طرح مجھ سے کوئی فنکار گنّا

دوستوں کے روپ میں پھرتے ہیں دشمن
تجربے نے کر دیا مجھکو چوکنّا

زندگی ہے ننگ و ذلت بھوک افلاس
زندگی ہے لعل و گوہر، ہیرا پنّا

کس کے بس کی بات ہے ایثار ایسا
قافیے کی آبرو ہے پنّا انّا

کرشن موہن ساکھ کا سادھن تو ہے دھن
رو پیئے بن آدمی ہے اِک اٹھنّا

∆∆

شہریار | رات جدائی کی رات

کٹتی نہیں سرد رات
ڈھلتی نہیں زرد رات
رات، جدائی کی رات

خالی گلاسوں کی سمت
تکتی ہوئی آنکھ میں
قطرہ شبنم نہیں

کون رگوں میں چلے
میرے لہو میں بہے
تیز ہو سانسوں کا زور
جلنے لگے پور پور
آئے سمندر میں جوش
گر پڑے دیوارِ ہوش
سوکھی ہوئی شاخ پر
برگ و ثمر کھل اٹھیں

آؤ مری نیند کی
بکھری ہوئی پتیاں
آج سمیٹو ذرا
کب سے کھلا ہے بدن
اس کو لپیٹو ذرا
ایک شکن دو شکن
بستر تنہائی پر
پھر سے بڑھا دو ذرا
مجھ کو سلا دو ذرا
ایک پہر رات ہے
رات جدائی کی رات

۵۵

غزلیں

فضا ابن فیضی

نہیں کہتا، مرے زخموں کا صلا دے مجھ کو
سُرخ یاقوت کی بنیاد ہوں ڈھا دے مجھ کو

صورتِ بادِ صبا میں بھی ہوں آوارہ بہت
موجِ گل! تو کوئی زنجیر پنہا دے مجھ کو

اِک ذرا فاصلۂ روح و بدن تو کم ہو
ہیں کہ ہوں بیچ کی دیوار گرا دے مجھ کو

رمنِ شعلۂ نو میں تو وہ گرمی ہی نہیں
آتشِ رفتہ سہی، پھر سے جلا دے مجھ کو

ں بھی کاغذ کا سفینہ ہوں، قلم کی سوگند
لم و دانش کے سمندر میں بہا دے مجھ کو

رتے ہوں پاؤں تلک، دیدۂ بینا کی طرح
ندگی اب کسی چہرے پہ سجا دے مجھ کو

لگی مجرم ہوں جو پیچیدہ بیانی کا فضا
ئی ترسیل کی سولی پہ چڑھا دے مجھ کو

▲▲

مظفر حنفی

مری ہستی کا پیچیدہ مُعمّہ حل نہیں کرتا
بھری بستی میں آئینے کو کوئی صیقل نہیں کرتا

وہی صورت کہ آنکھیں تر ہیں سینہ آبلوں سے بھر
اگر سیلاب ریگستان کو جل تھل نہیں کرتا

بس اک احساس جیسے پر نکل آئے ہوں جذبے کے
خیال اُس کا مرے لمحات کو بوجھل نہیں کرتا

کبھی وہ ریشمی کرنیں ادھر مائل نہیں ہوتیں
کبھی رُخ اس طرف کر وہ سیہ بادل نہیں کرتا

ہمارے بے عقیدہ عہد کے جتنے بھی رہبر ہیں
کسی کی راہ میں سایہ کوئی آنچل نہیں کرتا

مری خود آگہی اس طرح آئینہ دکھاتی ہے
ان کا جذبۂ خودسر مجھے پاگل نہیں کرتا

مظفر دل بھی مجھ کو تابعِ مہمل نہیں سمجھے
اگر میں دل کو اپنا تابعِ مہمل نہیں کرتا

▲▲

ممتاز راشد

خوابوں کی جستجو نہ تمنا سفر میں ہے
وہ شکل ڈھونڈھتا ہوں جو اپنی نظر میں ہے

یوں کر رہا ہوں اُس کی رفاقت کی آرزو
منزل کا عکس جیسے مرے ہم سفر میں ہے

یونہی تو شعلہ زن نہیں آنکھوں کی سرزمیں
اُس کے دُکھوں کی آگ کبھی اس نگر میں ہے

کیسے بجھے گی وقت کے چہرے کی روشنی
لمحوں کے ساتھ اُس کی صدا بھی سفر میں ہے

ہر شب نئی کہانیاں کہتی ہے خامشی
راشد چھپا ہوا کوئی دیوار و در میں ہے

▲▲

مئو ناتھ بھنجن (یو پی) ○ شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ○ درگاہ اسٹریٹ، ماہم، بمبئی

نظمیں

شیو دنے کمار ورما

کالے دِنوں کے بعد کا اندھیرا

میں کوئی اندھا کنواں ہوں
کتنی آوازیں جو مجھ میں گونجتی ہیں
اجنبی بھی، غیر بھی، مانوس بھی ہیں
مجھ میں ہیں۔ میری نہیں ہیں
کتنے چہرے ہیں، مگر ان میں کوئی میرا نہیں ہے
ہاں، کبھی میری بھی اک آواز تھی،
جو مرے سر سبز جھکی شاخوں پہ بیٹھے آنگوؤں کے شور میں گم ہوگئی ہے
میرا چہرہ خشک پتوں کے بھٹکتے کارواں کے ساتھ خود کو ڈھونڈتا ہے
اور میرا آئینہ پرانے جسم سے آخر نکل کر
اک کھنڈر میں چیختی چمگادڑوں میں پھنس گیا ہے
اور وہاں الٹا لٹک کر،
زندگی کے سیدھا ہونے کی گھڑی کا منتظر سا
اس کنوئیں میں جھانکتا ہے

مگر مری آواز مل جائے تو میں
اپنے چہرے کو پکاروں
اپنے آئینہ کو ساتھ لے لوں
اور سورج کی طرف
روشنی کے گیت گاتا آؤ چلوں

⁂

شاہد کلیم

پسِ پرواز

میں بھٹکتا رہا نیلے آکاش پر
لمحہ لمحہ ہواؤں کی یلغار تھی
ریزہ ریزہ ہوا جسم بھی ٹوٹ کر

دور تک تھا پہاڑوں کا اک سلسلہ
میرے ٹھہراؤ کی کوئی صورت نہ تھی
اور میں اونچی ڈھلوان سے گر پڑا

میں نے دیکھا نہ پھر اور منظر کوئی
دور نیچے پہاڑوں کی آغوش میں
بہہ رہا تھا بھیانک سمندر کوئی

⁂

○ ۱۱/۱۸۰ کوچہ لمبان۔ امرت سر۔

○ سنٹرل ایکسائز آفس۔ گیا۔ بہار

مولانا امتیاز علی عرشی

گدائی، حیاتی، جمالی

(۱) گدائی کا نام عبدالرحمٰن تھا۔ محمد عارف بدخشی تاریخ محمدی (ج ۲) میں ۹۷۶ھ کے ماتحت لکھتا ہے :

"شیخ گدائی بن شیخ جمالی کنبوی دہلوی مدتے صدر اکبر بادشاہ بود، عبدالرحمٰن نام وبگدائی شہرت داشت، دباکثر علوم عالم بود"

(۲) حیاتی کی تاریخ وفات محمد عارف کے بیان کے مطابق ۹۵۹ھ ہے۔ چنانچہ وہ سال مذکور کے ذیل میں لکھتا ہے :

"شیخ عبدالحی بن شیخ جمالی کنبوی شاعر مشہور دہلوی متخلص بہ حیاتی ووی بفقر و آزادگی و حسن خلق متصف بود، عمرش ۳۶ سال۔ وپدرش در ۹۴۲ھ گذشت"۔

چونکہ محمد عارف کے نزدیک حیاتی نے ۳۶ سال کی عمر میں وفات پائی، اس لیے سالِ پیدائش بدستور ۹۲۳ھ رہتا ہے۔ یہی تاریخ وفات صاحب اخبار الاخیار نے لکھی ہے۔

(۳) محمد عارف نے حیاتی کے تذکرے میں جمالی کا ضمناً ذکر کیا ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا وہ نوٹ جو جمالی کے متعلق ۹۴۲ھ کے ماتحت تحریر ہوا ہے یہاں نقل کر دیا جائے۔

محمد عارف لکھتا ہے :

"شیخ جمالی کنبوی دہلوی شاعر مشہور از مشائخ طریقت، دہم ذی القعدہ در گجرات فوت شد وبدہلی نقل کردند "خسرو ہند بودہ" تاریخ است، نام اصلیش جلال خاں بود، وپسرانش شیخ عبدالحی در ۹۵۹ھ وشیخ گدائی در ۹۷۶ھ خواہند آمد"

شیخ کی تصنیفات میں سے سیر العارفین اور ..... مرآۃ المعانی نادر نہیں، لیکن دیوانِ جمالی کمیاب اور مثنوی مہر و ماہ نایاب ضرور ہیں۔

مثنوی مہر و ماہ کے کسی نسخہ کا پتا نہیں چلتا۔ احمد علی اکبر شاہی نے ۱۰۱۴ھ کے مابعد شجرۂ سہروردیہ ایک تذکرہ لکھا ہے۔ اس تذکرے میں وہ جمالی کو "جدی" کہتا ہے اور دیباچے میں مثنوی مہر و ماہ کے چند اشعار بھی نقل کرتا ہے۔ ناظرین کی دلچسپی کے لیے ان کا یہاں درج کرنا غیر مناسب نہ ہوگا۔ وہ لکھتا ہے :

"ودرین باب نکتۂ بلند وکلمۂ ارجمند بر آئینۂ زاکیہ قلوب (؟) صنوبری حقایق آگاہ معارف دستگاہ حضرت جدی شیخ جمالی قدس اللہ سرہ جلوہ گر شدہ، ودر دیباچہ کتاب مہر و ماہ کہ از جملۂ تصنیفات ایشان است ثبت فرمودہ بیت :

سخن گو گر ہزاران جان تراشد
ز عیب واز ہنر خالی نباشد

سخن دانا چو در انصاف کوشند
بزیر یک ہنر صد عیب پوشند

چہ باشد گر رود حاسد درین تگ
کہ دایم در پئے آہو دود سگ

اگر حاسد درین نخچیر باشد
سگے باشد کہ آہو گیر باشد

تذکرہ مذکور کا مصنف خود کنبوہ ہے۔ اس لیے وہ کہتا ہے کہ" چمے کم گو یان کہ بغلط عام کنبوہ شہرت یافتہ بدین خاندان عالیشان احکام پذیراست واز غایت کرم در ہمہ آوان واز مان بانواع رعایت و اصناف تربیت مخصوص وممتاز بودہ علی الخصوص آباد اجداد بندہ کہ از مریدان حق شناس ...... این خاندان سہروردیہ اند، بنا برضوابط حق گذاری کلمۂ چند بشرح و بسط مرقوم میگردد"

اور بعد ازاں اپنی ارادت میاں جمال خاں کنبوی مفتی دہلی سے ظاہر کر کے ان کا حال اور تفصیل کے ساتھ ان کے دادا شیخ سماء الدین شیخ جمالی شاعر کا حال لکھتا ہے خاندان کنبوہ کے حالات لکھنے والے کو اس کتاب کا مطالعہ لازم ہے۔

دیوان جمالی کے قصائد کا حصہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی مرحوم کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ جس کا اقتباس شروانی مرحوم نے اورنٹیل کالج میگزین لاہور نومبر ۱۹۳۳ء کے پرچہ میں دیا ہے۔ کتب خانۂ رام پور میں اس کا ایک غالباً مکمل نسخہ موجود ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہاں بعض غزلیات کا اقتباس دے دوں۔

اس دیوان میں قدیم صفحہ داغ کے مطابق ۲۵۶ اوراق اور فی صفحہ ۱۵ تا ۱۷ سطور ہیں، کتاب کا سائز ۹½×۵½ اور کتابت کا سائز ۷×۳½ ہے اس میں ۳۰ قصائد، ۲ ترجیع بند، ۵ مراثی ۲۱۸ غزلیات، ۱۷ قطعات ۴ چھوٹی چھوٹی مثنویاں اور ۳۴ رباعیاں ہیں، سنہ کتابت اور کاتب کا نام نہیں ملتا، لیکن گمان یہ ہے کہ گیارھویں صدی ہجری کے آغاز کا مکتوبہ ہے۔ میں نے اس کو غالباً مکمل یوں کہا ہے کہ مجھے آخری صفحہ مصنوعی معلوم ہوتا ہے۔ در اصل وہ صفحہ مکتوبہ تھا۔ لیکن جیسا کہ عموماً کتب فروشوں کا قاعدہ ہے، کہ وہ کتاب کو مکمل ظاہر کرنے کے لیے آخر میں سادہ ورق چسپاں کر دیتے ہیں، اس نسخہ کے ساتھ بھی اس کے فروخت کنندہ نے یہی سلوک برتا ہے۔

غزلیات کا آغاز ورق ۱۰۷ الف سے اور انجام ۲۳۸ الف پر ہوتا ہے نمونہ حسب ذیل ہے:

خواہم کہ ہمدم دل پرخون کنم ترا
حال دلم نمی نگری، چون کنم ترا
افسانہ ام نمی شنوی عشوہ می دہی
اے سنگدل بگو کہ چہ افسون کنم ترا
دل شاد گشت چون بجمالی طبیب گفت
زین درد کم مباش کہ افزون کنم ترا

O

جانان مپرس بے تو شب ما چسان گذشت
بار وز بد چنین برسید و چنان گذشت
تیر غمت کہ بر سپر سینہ ام رسید
دل را شگافت، بر جگر آمد ز جان گذشت
گفتی بگذر ز جان و جہان از برای من"
چون جان تو ئی ز جان و جہان میتوان گذشت
از چشم مردمان ہمہ خونابہ شد روان
در مجلسی کہ ذکر جمالی روان گذشت

O

مخندان لعل شیرین را کہ شوری در جہان افتد
مرا زان خندہ دل بگدازد و آتش بجان افتد
بمرگ خود شدم ہم شاد و ہم غمگین کزین محنت
رہائی ترسم جدائی در میان افتد
ز سوز سینہ گشتم خشک لب ای دیدۂ گریان
مدد فرما کہ از جوی تو آبم در دہان افتد

O

چہ نیکو میرود آن کبک رفتار
خدا و ندا ز چشم بد نگہدار
چہ شکل است اینچہ سادست این چہ شوخی
چہ قد است این چہ ناز...ت اینچہ رفتار

منہ پا بر زمین بر چشم ما نہ
کہ چشم ماست پایت را سزاوار
جمالیؔ کلکت آن طوطیِ ہند است
کہ آبِ خضر می ریزد ز منقار

○

اے نسیم صبح پیغامم دران درگاہ بر
یعنی احوالِ گدا در بارگاہِ شاہ بر
ناتوانم سوی او نتوان شدن باد صبا
بر مثالِ برگ خاشاکے مرا ہمراہ بر
آب و آتش در دو رخ داری نقاب از رخ کشا
آتش خورشید بنشان آبِ روی ماہ بر
یا بعمر کوتہ ام زلفِ درازِ خود بہ بند
یا بدان زلفِ دراز این رشتۂ کوتاہ بر

○

تو در درونِ منی از شوق سینہ پارہ کنم
کہ دل شگافم و بر روی تو نظارہ کنم
بزندگی نرسد دستِ من بدامانت
مگر لباسِ حیاتی کہ ہست پارہ کنم

من آن جمالیِ درویش کشم کہ زاہد را
بیک کرشمۂ ساقی شراب خوارہ کنم

○

ترا کہ شیوہ چنان ست و شکل و سار چنین
چرا دلم نبود در غمت گداز چنین
تو گر جفا کنی از ما بجز وفا ناید
کہ رسم ناز چنان باشد و نیاز چنین
دلم نواختہ از زخمہای خنجرِ تست
ہمیشہ باد مرا یارِ دلنواز چنین

○

ماہے بمیدان میرود تا شہ سوارِ کیست این
از دیدنش جان میرود یارب نگارِ کیست این
قوس از دو ابرو ساختہ، از غمزہ تیر انداختہ
ہر سو سمندش تاختہ بہرِ شکارِ کیست این
بالای او سرو روان، رخسارِ خویش گلستان
خط سبزۂ لعلش ارغوان، تا نو بہارِ کیست این

۵۵

○

"کرشن موہن کو زندگی کے جنسی پہلوؤں سے خاص دلچسپی ہے۔ زندگی کے دوسرے مظاہر، خاص کر سماجی انسان کے مسائل، ان سے سبق آموزی کا رجحان بھی کرشن موہن کے یہاں موجود ہے۔ ان کا براہِ راست اسلوب اظہارِ مطلب کے لیے کافی اور اکثر جگہ اس تاثیر کا حامل ہے جو دو ٹوک بات کا خاصہ ہے۔
"غزلوں میں فارسی اور ہندی الفاظ پر یکساں قدرت، غیر مردّف اشعار کی کثرت، مشکل قافیے اور بے تکلف گفتگو کا انداز بیان انہیں دورِ حاضر کے غزل گو شعرا میں ایک منفرد مقام عطا کرتا ہے۔"
——— شمس الرحمن فاروقی

کرشن موہن کا تازہ ترین کلام

کفرستان

ضخامت : دو سو صفحات، ڈیمائی سائز، آفسٹ کی چھپائی، قیمت : بیس روپے
ناشر: نیشنل اکاڈمی، ۹ء انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۲ ۰۰ ۱۱

گوپال متّل

کی

ادبی اور سیاسی یادداشتیں

لاہور کا جو ذکر کیا

"میں آپ کی کتاب "لاہور کا جو ذکر کیا" کو اردو میں اپنی قسم کی بہترین کتابوں میں سمجھتا ہوں"

——— قاضی عبدالودود

دوسرا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل رہا ہے۔ آپ بھی آج ہی طلب کریں۔

قیمت : دس روپے

نیشنل اکاڈمی ۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

کنور سین

اُوپر کا پانی

یگ پورا ہوتے ہی چاروں سادھو اپنی اپنی یاترا سماپت کر کے جٹا دھاری برگد کے نیچے آنکھیں موندے بڑی دھونی کے گرد آ کھڑے ہوئے۔ اُن کے وہاں آسن جمانے سے پہلے کتھا گھاٹ کے پتھر نے کہا "بس یگ بیتا تم سے یہاں آ کر کتھا سنانے والوں کو جو بتاتا آیا ہوں وہ تم چاروں بھی سن لو"

سادھوؤں کو اپنی طرف کان لگائے دیکھ کر وہ بولا "تم میں سے جو انتم کتھا سنائے گا مہاتما کہلائے گا۔ باقی تینوں اپنی جٹائیں اُس کے چرنوں میں رکھ دیں گے" انہیں دُبدھا میں پڑے دیکھ کر پتھر نے دیا کھیا کی۔

"تم میں سے کسی کی بھی کتھا انتم کتھا ہو سکتی ہے ہو سکتا ہے تم میں سے کوئی بھی ایسی کتھا نہ سنا سکے۔ اس دشا میں تم چاروں کو اپنی جٹائیں برگد بابا کی بھینٹ کرنی ہوں گی۔ اگلے یگ کے آرمبھ تک یہیں بیٹھے رہنا ہوگا تاکہ تم کسی اور کو یہ جٹائیں بھینٹ کرتے جاتے ہوئے دیکھ سکو"

پتھر کے چپ ہو جانے پر ایک سادھو نے کہا "انتم کتھا کا روپ ہم میں سے کسی کو معلوم نہیں"

"تمہارا من سب کچھ جانتا ہے" اب کی بار برگد بولا "یہ دھونی، یہ ندی، یہ گھاٹ اور اس کا آس پاس کتھائیں سننے کا مجھ میں وشواس رکھو۔ اپنی بات کہنا شروع کرو"

یہ سن کر سادھو نے کتھا گھاٹ کو ماتھا ٹیکا اور کہنے لگا۔

"تم تینوں سے بچھڑ کر میں دکشن کی یاترا پر چل پڑا۔ اپنے دیش کے تماشوں کو دیکھتا ہوا امربا تاں جا پہنچا۔ وہاں پہنچتے ہی سینکوں نے مجھے پکڑ لیا۔ دوسرے دن وہ مجھے راج دربار میں لے گئے۔ محل میں پہنچنے سے بہت کم عمر کی رانی کے ساتھ اپنے سنگھاسن پر بیٹھا راجہ مجھے دیکھ کر چونکا۔

"تم زور آکش کی مالا کا مطلب سمجھتے ہو۔ بدن پر ملی بھبھوت کی مہما کو جانتے ہو۔ تم کرنی والے سادھو اور سدھ پُرش ہو۔ میری اچھا پوری کرو" مجھے آنکھیں بند کر کے چپ چاپ کھڑے دیکھ کر وہ بولا۔

"مجھے وردان دو کہ میری واسنا اگنی سدا بھڑکتی رہے میری وِلاس یاترا کا کبھی انت نہ ہو" مجھے پھر بھی چپ کھڑا دیکھ کر وہ چلایا۔

"اگر تم نے میرے دس گنتے گنتے مجھے وردان نہ دیا میں تمہیں اپنے داس داسیوں کے ساتھ پتھر ڈھونے پر لگا دوں گا" میں پھر بھی نہیں بولا۔ سینکوں نے میرے پیروں میں بیڑیاں ڈال دیں۔ میں اس چنڈال کے بارے میں بہت کچھ سنتا ہوا پتھر ڈھونے میں جٹ گیا" دھونی کو چرچراتے سن کر سادھو پرسن چت ہو گیا۔

"راجہ کی یہ چوتھی رانی تھی۔ پہلی تین رانیوں کو اس نے اُبلتے تیل سے بھرے کڑاہے میں ڈال دیا تھا۔ اس کے

شر بر سے واسنا کی گندھ آنی بند ہو گئی تھی پھر اُس نے اپنی جوان کنیا کے ساتھ ترک بھوگ کر اُس کی جان لے لی۔ اس کے بعد اُس نے اپنے بیٹے پر نظر ڈالی جس نے بڑے جتن سے اپنی جان بچائی "۔ سادھو نے آس پاس نظر دوڑائی۔

" چوتھی رانی نے بوڑھے راجہ کو بس میں کر لیا۔ اُس نے اُسے اپنے لیے محل بنوانے کو کہا جو کسی مندر کی طرح کلا پُورن اور پوتر ہو" برگد کے پتوں کو سر سر لاتے دیکھ کر سادھو جھومنے لگا۔

" راجہ کے لیے یہ کام کٹھن تھا۔ مورتی کار اور کاریگر اُس کے لیے پاپ محل بنانے کو تیار نہیں تھے۔ لیکن اُس پاکھنڈی نے گھوشنا کر دی کہ وہ مندر بنوانا چاہتا ہے۔ اپنے پاپ دھونے کے لیے پُن کمانا چاہتا ہے۔ یہ سن کر سنسار کے سرو شریشٹھ کلا کار اُس کے پاس اکٹھے ہو گئے۔ راجہ نے اُنہیں بے شمار دولت دینے کا وچن دیا۔ اس کے بعد اُس نے دیش بدیش کے مندروں اور کلا استھانوں سے پتھر اور مورتیاں چُرانے کے لیے اپنے آدمی بھیجے۔ اُن میں سے ایک میں تھا۔"

"مندر بن گیا۔ راجہ ہنسا اور اُس نے کلا کاروں کے ہاتھ کٹوا دیئے۔ اُسی رات جب وہ رانی کے ساتھ محل میں گیا اُس کے بیٹے نے اپنی نئی ماں کے ساتھ مل کر اُس کی ہتیا کر دی۔ اب وہ ماں بیٹا پتنی پتی بن کر رہتے ہیں۔ راجہ کے مرنے کا مجھے یہ لابھ ہوا کہ میں یہاں آ کر تمہیں کتھا سنا سکا۔"

سادھو کے خاموش ہوتے ہی گھاٹ کے پتھر نے برگد کی طرف دیکھا۔ برگد بولا ـــــ

" یگوں پہلے بازی جیتنے والا مہاتما کہتا تھا ـــ انتم کھا منگ لگا نشتر چلتی رہتی ہے ـــ"

برگد کی بات سن کر دوسرے سادھو نے اپنے گورو کو یاد کیا۔ ندی کی مچلتی لہروں کو پرنام کر کے وہ کہنے لگا۔

" آخر دشائیں چلتے چلتے میں اُس دیش میں جا پہنچا جہاں کا راجہ لیش اور کیرتی کے لیے مشہور تھا۔ وہ دیاوان اور سادھو سنتوں کا سمان کرنے والا تھا۔ مجھے اپنے محل کے سامنے کھڑا دیکھ کر وہ ننگے پاؤں بھاگا آیا۔ اندر لے جا کر اُس نے مجھے سنگھاسن پر بٹھایا۔ میرے پیر دھو کر چرن امرت ... کی طرح سے پیا اور نمسکار کرنے کے بعد وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا ـــ

"پربھو مجھے دیکشا دو"

"راجن کیا کہتے ہو! تمہاری عمر راج پاٹ بھوگنے کی ہے۔ تم اپنی پرجا کا کلیان کرتے رہو۔ اسی میں تمہاری مکتی ہے"

"نہیں مہاراج ۔ مجھے اپنی شرن میں لیجئے۔ بندھن سے مکت کیجئے۔"

اُس کے نسچے کو دیکھ کر میں نے اُسے دیکشا دی۔ سُکھ دُکھ سے مکت ہونے کی بدھی بتائی" سادھو نے دیکھا ندی کی لہریں اُچک اُچک کر اُس کی بات سُن رہی ہیں۔ گھاٹ کا پتھر مسکرانے لگا ہے۔ اپنے آپ میں مست ہو کر وہ بولتا گیا۔

"راجہ سب کچھ تیاگ کر جنگل میں چلا گیا۔ گھور تپسیا کرنے کے بعد لوٹا۔ مجھے لگا وہ کام، کرودھ، موہ، لوبھ، اہنکار سے مکت ہو گیا ہے۔ میں نے اُس کا آخری امتحان لینے کی سوچی۔ اُسے ایک پھول دے کر کہا کہ وہ اسے تالاب والے مندر کے دیوتا پر چڑھا آئے۔ راجہ چل پڑا۔

"دھوپ تیز تھی۔ راستہ دھول سے اٹا ہوا تھا۔ تھوڑی دوری پر دھول میں کوئی لال رنگ کی چیز چمک رہی تھی۔ راجہ ٹھٹکا۔ انمول رتن ہے۔ وہ مسکرایا اور اپنے آپ کو لعنت ملامت کرنے لگا۔ میں نے ان گنت رتن تیاگ کر من کو جیتا ہے ـــ تھوڑی دور جا کر

وہ پھڑک گیا — ایسا رتن میرے پاس بھی نہیں تھا۔ اُس کے من نے اُسے دھوکا دیا۔ وہ لوٹا۔ رتن کو اُٹھانے لئے اُس نے ہاتھ دَھول میں ڈال دیا۔ اُس کی آتما سَن ہو گئی۔ وہ رتن نہیں پان کی پیک کا بلبلہ تھا جو سورج کی تیز روشنی میں چمک رہا تھا۔ اُس سے اپنی ہار سہی نہ گئی۔ بھاگا اور تالاب میں ڈوب کر مر گیا۔" سادھو نے آہ بھری۔

"بھَوساگر سے پار اُترنے کی اچھا میں لیکن اُس راجہ کو عین کنارے پر پہنچ کر ڈوبتے دیکھ میرا من اشانت ہو گیا اور میں کتھا گھاٹ کے لیے چل پڑا۔" سادھو خاموش ہو گیا۔

کتھا گھاٹ کے پتھر نے دوبارہ برگد کی طرف دیکھا۔

برگد بولا۔

"بہت پہلے آنے والا مہاتما کہتا تھا — انتم کتھا پار اپار کا بھید بتاتی ہے۔ دیش کال سے مُکت ہوتی ہے۔"

برگد کی بات سُن کر تیسرے سادھو نے اپنے گورو کا دھیان کر کے کہنا شروع کیا —

"پورب کے ایک دیش میں تھوڑا سمے بتانے کے بعد میں آگے جانے لگا۔ ایک پندرہ سولہ سال کا بالک میرے پاؤں سے لپٹ گیا — ہے ناتھ مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ میں نے اِس عمر میں ہی سب کچھ دیکھ لیا ہے۔ میں جیون کے نرک کُنڈ سے نکلنا چاہتا ہوں —"

"بہت سمجھانے پر بھی وہ نہیں مانا۔ میرے ساتھ گھومتے پھرتے اُس نے میری سیوا میں دِن رات ایک کر دیا۔ اُس کی بھگتی سے خوش ہو کر میں اُسے کایا مایا کا بھید سمجھانے لگا۔ وہ بُدھی مان بالک جلدی دویک اور گیان میں سِدّھ ہو گیا۔ میں نے اُسے اپنا اُتر ادھیکاری مان لیا۔ وہ میری آگیا لے گیان کا پرکاش پھیلانے کے لیے چل دیا۔" —

سادھو نے دیکھا ہوا اپنی چال بھول کر اُس کی بات سُننے لگی ہے۔

لیکن سمے بیتتے وہ اپنے آپ کو بھولنے لگا۔ اُس کا گرم لہو اُسے اپنی یاد دِلانے لگا۔

اور اُسے گناہوں کے اندھکار میں لے گیا۔

استری بھوگ اور مدیرا پان نے اُسے اندھا کر دیا۔

پرکاش پھیلانے کے لیے جو گیان اسے ملا تھا، اسے وہ واسنا کی بھوک مٹانے کے سادھن جٹانے کے لیے کام میں لانے لگا۔ اُس کی لگن اور شردھا میں درار آ جانے کے کارن جب اُس کی آتما پوری طرح نشٹ ہونے کو تھی اُسے اپنی بھول کا پتہ چلا۔ اب وہ اتنا پچھتایا کہ اُس نے چاول کی بھوسی کے ڈھیر کو آگ لگا کر اُس میں تِل تِل جل کر مرنے کا نشچے کیا۔ مجھے یہ سماچار ملا میں بھاگا بھاگا اُس کے پاس پہنچا۔ لیکن وہ آخری سانسوں پر تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا اور اُس نے پران تیاگ دیئے۔ اپنے کیے کرائے پر پانی پھیرنے کی کتھا سُنانے کے لیے میں یہاں آ گیا۔" سادھو نے دیکھا ندی اپنے آپ مگن ہو گئی ہے دھون پہلے کی طرح گونجنے لگی ہے ہوا اُس سے بے پروا ہو کر اپنی رفتار سے چلنے لگی ہے۔

اب کی بار پتھر نے برگد کی طرف دیکھا تو وہ بولا —

"پچھلے سارے مہاتما ایک بات پر سہمت تھے — شرم ہی انتم کتھا کا جنم داتا ہے —"

برگد کی بات سُن کر چوتھے سادھو نے سر پر لٹکتی اُس کی داڑھی کو نوچنا شروع کیا۔ پھر اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنے سے کہیں دُور وِچرنے لگا۔ یہ دیکھ کر تینوں سادھو چلائے — اپنی کتھا شروع کرو۔ رات کا یہ انتم پہر ہے —"

چوتھے سادھو نے آنکھیں کھولیں اور بولا — "رات کی عمر نہیں ہوتی۔ اِس کو پلوں میں بانٹنا ہماری بھول ہے۔ ساری بات رات ہی کی ہے۔ اندھے اور بہرے

مگوں سے بھیانک کچھ نہیں۔ انھیں پار کرنے میں کتھا ہماری سہائتا کرتی ہے۔" وہ برگد کی داڑھی کو دھونی میں ڈال کر جلانے لگا۔

"کتھا نہ ہو تو سب کچھ راکھ جیسا ہو جائے۔ دھونی ہوا میں بکھر جائے۔ ترت اپنے نکھار کو بھول جائے" برگد کی داڑھی کی راکھ کی ایک ایک چٹکی تینوں سادھوؤں میں بانٹنے کے بعد وہ بولا۔

"یہ میری انتم کتھا ہے۔ مجھے ایسا نہ لگتا تو میں یہاں نہ آتا" وہ اپنے اندر اترنے لگا۔

"تم سے بچھڑ کر میں نے آنکھیں بند کر کے اپنے آپ کو دائیں ایڑی پر گھمایا۔ رکنے کے بعد جس دشا میں میرا منہ تھا ادھر چل دیا۔ دشاہین ہوئے بنا بات نہیں بنتی۔"

اس بار میں سمندر سے ادھر کہیں نہیں رکا۔ ادھر نے پہلے بھی مجھے وہ کچھ نہیں دیا تھا جو میری پیاس بجھا سکتا۔ جگیا سا بہت بری ہوتی ہے۔ یہ آدمی سے انت تک کی یاترا کیے بنا چین نہیں لینے دیتی۔ انت کہاں ہوتا ہے یہ سب کی اپنی اپنی سمسیا ہے اور سمسیا ہماری شکتی کا ایک روپ۔" دھونی کو کروٹ بدلتے دیکھ کر وہ پاس بیٹھے بندر کی پیٹھ سہلانے لگا۔

"بندرگاہ سے چلنے والے انتم جہاز میں میرے چڑھتے ہی ملاحوں نے بادبان کھول دیئے۔ سب لوگ میرے آس پاس آ کھڑے ہوئے۔ وہ مجھے کہیں بھی لے چلنے کے لیے کہنے لگے۔ جس جگہ وہ رہتے تھے وہاں سوائے اکتاہٹ کے کچھ نہیں بچا تھا۔ منترو، بہتی ندی اور رمتے جوگی سے نرالا کچھ نہیں ہوتا" سادھو تاروں کو آنکھیں ملتے ہوئے دیکھ کر بتیا۔

"لیکن مجھے ادھر ہی جانا تھا جس دشا میں نہیں چل چکا تھا۔ اس لیے ان سب نے سمجھ لیا کہ یاترا کتنی کٹھن ہو اپنے اندر اک دیکھا سکھ رکھتی ہے۔" دھونی کو جاگتے دیکھ کر وہ رکا۔

"میں جھوٹ نہیں کہتا انھونی کو ہوتے ہوئے دیکھنے کی اچھا بڑی ورتیر ہوتی ہے۔ سمے کو کینچلی اتارتے اور ستھان کو پہلو بدلتے ہوئے دیکھنا کسی کسی کے مقدر میں ہوتا ہے۔" وہ ندی کی لہروں کو کتھا گھاٹ سے سر پٹکتے ہوئے دیکھ کر بولا۔

"لیکن میں نے کہا ہے کہ انتم بودھ ہر کسی کی اپنی شکتی کا نام ہے۔ دن پر دن بیتنے پر بھی کسی کو کچھ انوکھا دکھائی نہیں دیا تو سب نراش ہو گئے۔ ان کی آنکھیں میلی ہو گئیں۔ ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔ جب سمندر کا رنگ گدلا ہو گیا۔ اس میں ہر پل رنگ بدلتے آکاش کی چھایا پڑنی بند ہو گئی۔ چاروں دشاؤں میں کوئی ہلچل نہ رہی تو ملاحوں نے بادبان سمیٹ لیے۔ وہ میری طرف پیٹھ کر کے کھڑے ہو گئے۔" سادھو نے دھونی کی بڑھتی ہوئی آنچ کو محسوس کر کے کہا۔

"لیکن میں نے ساہس نہیں چھوڑا۔ واپس جانے کی بجائے اس سناٹے میں کھپ جانا اچھا سمجھا۔ چھوٹی سی کشتی پانی میں اتار کر اس میں کود گیا۔ کئی بار دنیا ایک ہی آدمی کے سہارے چلتی رہتی ہے۔"

"تھوڑی دور جانے کے بعد میں نے دیکھا سمندر کا پانی اور گدلا ہو گیا ہے۔ وہ نیل جیسا دکھائی دیتا ہے۔ میں نے پیاسے ہونٹوں کو بھگونے کے لیے چلو بھر پانی اٹھایا میرے اچرج کی سیما نہ رہی۔ پانی خشک تھا۔ لیکن میرا من مسکرا رہا تھا۔" گھاٹ کے پتھر کو خوش ہوتے دیکھ کر سادھو نے کہا۔

"جانتے ہو ایسی حالت میں کون ہماری سہائتا کرتا ہے!" تینوں سادھوؤں کی طرف دیکھ کر وہ ہنسا "کچھ نہ کرتے ہوئے بھی میں نے دیکھا کشتی چل رہی ہے۔ انت میں ایک دن میں اس ملیالے ٹاپو پر جا پہنچا۔ جہاں میں نے وہ دیکھا جو نہیں بتاؤں گا۔"

"ٹاپو پر اتر کر میں نے دیکھا دھرتی، سمندر اور آکاش

کا رنگ ایک ہے۔ دُور دُور تک راکھ ہی راکھ۔ جیسے گاؤں پہلے وہاں کا سب کچھ جل گیا ہو۔ جگہ جگہ اُبھرے ہوئے راکھ کے ٹیلوں میں سے ایک پر چڑھ کر میں نے آس پاس نظر دوڑائی۔ کہیں کوئی پیڑ پودا، جیو جنتو دِکھائی نہیں دیا۔ ہوا کو ٹھہرے ہوئے اور واتاورن کو بے رس دیکھ کر بھی میں نے دِل نہیں چھوڑا — اُکتاہٹ کیئے کرائے پر پانی پھیر دیتی ہے۔" وہ آگ کو سانپ کی طرح زبان لپلپاتے دیکھ کر مسکرایا۔

"دوسرے دِن میں ٹاپو کے اندر کی طرف چل دیا۔ کوسوں چلنے کے بعد مجھے دُور جیون کا پہلا نشان دِکھائی دیا۔ وہاں پہنچ کر میں نے دیکھا ایک ناری اور اس کا پتی کھڑے کالی دھرتی کو بڑی لاچاری سے دیکھ رہے ہیں۔ اُن کا قد ڈیڑھ فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ مرد کے چہرے پر گنتی کے تین بال تھے۔ اُس کی گنجی کھوپڑی پر گٹھلی جیسا اُبھار تھا۔ ناری کی ٹانگیں پیرش کی طرح ٹیڑھی تھیں۔ اُس کے ہاتھ مڑے ہوئے تھے۔ اُس کی بے نام چھاتی سے لٹکتا بچہ مینڈک جیسا تھا۔ اُس کا جسم چھپکلی جتنا تھا۔ یہ سب کچھ دیکھنا اور پاپ پن کا سوچنا! سادھو نے لمبی سانس لے کر آس پاس اکٹھے ہوئے چرندوں پرندوں پر نظر ڈالی۔

"اُنھوں نے مجھے اپنے سامنے کھڑے دیکھ کر بے جان سی چیخ ماری اور میرے پاؤں سے لپٹ گئے۔ میں نے اُنھیں اوپر دیکھنے کو کہا لیکن اُنھوں نے میرا کہا نہ مانا۔ وہ اُٹھے اور نظریں نیچی کر کے بازوؤں کو رانوں سے چپکا کر کھڑے ہو گئے۔ پھر وہ مجھے اپنے گاؤں لے گئے۔" برگد کو جھک کر اپنی بات سنتے دیکھ کر سادھو کہتا چلا گیا۔

"وہ گاؤں کیا تھا راکھ کا سپاٹ میدان تھا۔ اُس پر کھڑے سو ڈیڑھ سو نر ناری اور بچے ایسے دکھائی دیئے تھے جیسے کسی ناسور پر بھنبھناتی مکھیاں۔ مجھے دیکھ وہ دبی دبی چیخیں مارنے لگے۔ اپنی گھٹی گھٹی آواز میں ایک آدمی کو میرے بارے میں معلوم کرنے کے لیے کہنے لگے۔ وہ آدمی سر جھکائے میری ٹانگوں کو گھورنے لگا۔

"کیا یہ اس ٹاپو کی کل جن سنکھیا ہے؟" میں نے اُس آدمی کو پرے ہٹا کر پوچھا اور دُور دُور دور تک پھیلے بنجر واتاورن کو دیکھنے لگا۔ اُس نے آہ بھری اور سر ہلا دیا۔

"کیا اس دھرتی میں کچھ بھی پیدا نہیں ہوتا؟" میں نے پاؤں کے ناخن سے راکھ کو کریدا۔ سردار نے جھک کر زمین کو ہاتھوں سے کھودا اور اُس میں سے تنکے جتنی موٹی گانٹھ نکال کر میرے ہاتھ میں دے دی۔

"تم نے اس دھرتی کی کوکھ کو بانجھ کر دیا ہے۔ اِسی لیے تمھاری یہ دُردشا ہے" میں کرودھ سے بولا۔

میری بات سن کر اُس آدمی نے اپنے لوگوں کو اشارہ کیا۔ وہ سب مجھ سے منہ پھیر کر کھیتوں کو سنوارنے میں جٹ گئے۔ جیسے وہ اُنھیں بوائی کے لیے تیار کر رہے ہوں۔ میں نے تنکے کو منہ میں ڈالا وہ مردہ واتاورن کی طرح پھیکا تھا" ندی کو رُکے، گھاٹ کو آنکھیں کھولے، برگد کو آہیں بھرتے دیکھ کر سادھو نے آگے کہا۔

"کئی دن میں اُن لوگوں کو دیکھتا رہا۔ وہ بلا کے محنتی تھے۔ رات دِن راکھ کو اُپجاؤ بنانے میں جٹے رہتے۔ لیکن سوائے تنکے جیسی جڑ کے کچھ پیدا نہ ہوتا۔ اُن کی اس حالت کو دیکھتے اور اس کا کارن کھوجتے ہوئے میں چنتا میں ڈوبا رہتا — یہ لوگ کون سے پاپ کی سزا بھوگ رہے ہیں۔ کیا میں انھیں اِس نرک سے نکال نہیں سکتا۔ سب کچھ کرتے ہوئے بھی کچھ نہ ملنے سے زیادہ دُکھدائک بات اور کیا

ہو سکتی ہے ۔۔۔ یہی سوچتے ہوئے میری آنکھیں آکاش کی طرف اٹھ جائیں ۔ اندھے سورج کو دیکھ کر میرا دل کانپ اٹھتا ۔۔۔ ضرور کبھی نہ کبھی اس ٹاپو پر رہنے والوں نے کوئی گھور پاپ کیا اور پرلے نے انھیں پوری طرح نشٹ کر دیا ۔ یہاں بستے مجرموں کو مُردبھومی نکل گئی ۔ یگوں بعد پیدا ہونے والی یہ نسل بھی اندھی، بہری اور انتم سچ سے بیگانہ ہے ۔ یہ لوگ اوپر کو منہ کیوں نہیں اٹھاتے ! بازوؤں کو نیچے کیوں لٹکائے رکھے ہیں؟؟ یہ دھرتی محنت کا پھل کیوں نہیں دیتی؟؟؟ " اس نے برگد کو آنسو بہاتے دیکھا اور پوچھا ۔۔۔

" ایک رات مجھے وچار آیا کہ میں نے اس پانی کی طرف دھیان نہیں دیا جس سے یہ اپنے کھیت سینچتے ہیں ۔ میں سمندر کے خشک پانی کو یاد کر کے کانپ اٹھا ۔ اسی سمے پاس والے کنوئیں کا پانی چکھا ۔ وہ کھاری اور کڑوا تھا ۔۔۔ یہ تو دھرتی کو صرف نمک دے سکتا ہے ۔ جیون کا ناش کرنے والے اس پانی کے ہوتے ہوئے دھرتی کی کوکھ کیسے ہری ہو سکتی ہے ؟ میں دل ہی دل میں چلایا ۔۔۔ میرے من میں آئی کہ ان کے لیے پرارتھنا کروں ۔۔۔ پرارتھنا ۔۔۔ ان بے چاروں کو اس کا گیان نہیں ۔ پرکھاؤں کا پاپ ان کے سروں کو جھکائے رکھتا ہے ۔ نہیں یہ اوپر کی طرف دیکھ سکتے ! آکاش اور دھرتی کے رشتے کو سمجھ سکتے !! آکاش ہی دھرتی کی پیاس بجھا سکتا ہے اور آکاش ہی پرارتھنا کا بول سنتا ہے ۔۔۔ پرارتھنا ۔۔۔ ! "

" کانپتے ہاتھوں اور ہانپتی آواز میں میں نے ان گھنا مُنے لوگوں کو جگایا اور انھیں اپنی نقل اتارنے کا کہہ کر دونوں ہاتھ اور آنکھیں آسمان کی طرف اٹھا دیں ۔ میں نے دیکھا ایسا کرتے ہی پرارتھنا کے شبد ان کے ہونٹوں پر تھرکنے لگے اور ان کی آنکھوں کے ساتھ ساتھ آکاش کی آنکھیں بھی برسنے لگیں ۔ دیکھتے ہی دیکھتے واتاورن مسکرانے لگا ۔ دوسری صبح دور دور تک سبزہ پھوٹ رہا تھا ۔ ٹاپو ان گنت رنگوں کو پہن رہا تھا ۔ " مہاتما نے اپنے پاس ایک ساتھ بیٹھے نیولے اور سانپ کو دیکھ کر دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا دیئے اور بولا ۔

" کیا تم جانتے ہو کتھا کب شلوک کا روپ دھارن کرتی ہے " اس کے یہ کہتے ہی دھونی سے چھوٹتا ہوا دودھیا اجالا دور دور تک پھیلتا چلا گیا ۔

پہچان کا درد اور فرمودات کے بعد
حمید الماس
کی تیسری کتاب
شب گرد
شائع ہو چکی ہے
قیمت : دس روپے

اسلوبیات پر پہلی مکمل مفصل اور باقاعدہ کتاب
ڈاکٹر امیر اللہ خاں شاہین
کی تازہ تصنیف
اردو اسالیب نثر
جو گیارھویں سے بیسویں صدی تک کے اسالیب کا محاکمہ ہے ۔
قیمت : ۲۵ روپے

غزلیں

عروج زیدی

ہمارے دل میں کوئی فرقِ خاص و عام نہیں
ہم آفتابِ سحر ہیں، چراغِ شام نہیں

شعورِ فکر و بصیرت کی شرط لازم ہے
کہاں کہاں ترے جلووں کا اہتمام نہیں

یہ کائنات تو فردوسِ گم شدہ ہوتی
مگر مذاقِ محبت جہاں میں عام نہیں

جو آبروئے حیات و امینِ عظمت تھے
ہزار حیف وہی آج نیک نام نہیں

خدانخواستہ ٹھوکر لگے، یہ گر جائے
ہماری عمرِ رواں اتنی تیز گام نہیں

نئی نئی سی فضا میں محاسبہ ہوگا
اسی جہان میں قصہ مرا تمام نہیں

ہر ایک غم پہ تبسم بہ لب ہوں میں لیکن
یہ انتقام کا اک زخم ہے انتقام نہیں

تمہاری چشمِ سرور آفریں میں دیکھ لیا
وہ مے کدہ جہاں بادہ کشی حرام نہیں

براہِ راست ہوں میں اُن سے ہم کلام، عروج!
وہ مقتدی ہوں کہ جس کا کوئی امام نہیں

●●

محمد سیف الدین خاں، رامپور۔ یوپی ۔

رشی پٹیالوی

بے سبب کوچہ کوچہ تو نہ پھرتا ہوگا
کوئی تو اُس کا ترے شہر سے رشتا ہوگا

زندگی ہے کہ امیدوں پہ کٹے جاتی ہے
اِک نہ اِک دِن تو علاجِ غمِ دُنیا ہوگا

صبحِ فردا کی ضیاؤں پہ نظر ہے اپنی
حال و ماضی نہ سہی کل تو ہمارا ہوگا

دیکھ کر دیکھتے ہی جائیں بہ یک تارِ نظر
جس کی تصویر کچھ ایسی ہے وہ کیسا ہوگا

پردہ اُٹھا تو نظر اور بھی خیرہ ہوگی
مانعِ دید یہی نور کا پردا ہوگا

یہ نئی رُت کا ہے پیغام رشی سُن رکھو
زندہ رہنے کے لیے زہر بھی پینا ہوگا

●●

ای-۱۷، آنند نکیتن موتی باغ ۲- نئی دلی ۱۱۰۰۲۱

دو پیڑے اور نظم

کرشن مراری

جوگن روپ بنائے گوری پنگھٹ پنگھٹ گائے رے
گہری گہری سوچ کی ندیا نینن بیں بھر لائے رے
جیسے دھنک انگڑائی لے ہے۔ جیسے کوئل گائے رے
تیرے چنچل روپ کا گوری سونا پگھلا جائے رے
گونجے درد کے لمحے کتنے۔ غم صدیوں مسکائے رے
اِک البیلا پیت کا ناطا جنم جنم تک جائے رے
نین جھکا کر بدن چرا کر گوری جب مسکائے رے
چھلکا جائے روپ کا ساگر انگ انگ لہرائے رے
کیسا تھا وہ مان پیاسا۔ گوری درد چھپائے رے
چنچل سی اک بدل جیسے بن برسے اُڑ جائے رے
سادھو سنیاسی بیراگی کتنے روپ بنائے رے
جھوٹے سپنے من جوگی کے جیون راس نہ آئے رے
لپٹے جائیں ناگ البیلے۔ انگ انگ بل کھائے رے
ساجن کی چنچل نظروں سے گوری بدن چرائے رے

▲▲

۴م سی - اردن روڈ - نئی دہلی

فاروق شفق

ٹوٹی ہوئی دھنک

ہوا نے لباس اپنا بدلا
نئی رُت کی باہیں کشادہ ہوئیں پھر
بڑھا دستِ شفقت
کھرچ کر
درختوں کی سوکھی ہوئی سخت چھالیں
نئی اور ملائم پرت سے
شجر کا بدن کس دیا
گلابی ہیں سرخ
اور دھانی ہیں سبز
دھنک سات رنگوں کی پھیلی ہے

ہر اک شے کو چھو کر
نظر سے مناظر کے لب چوم کر میں
پھر اپنی جگہ آ گیا ہوں
مگر ایسا محسوس ہوتا ہے مجھ کو
جہاں میں کھڑا تھا
وہیں آج تک
پاؤں اپنے ٹکائے کھڑا ہوں
کسی شے پہ میرے گزرنے کی کوئی دھمک ہی نہیں ہے
عجب سانحہ ——
میرے اندر سے ہر شے گزرتی چلی جا رہی ہے
ہوا نے کہاں اپنا ملبوس بدلا
کہاں دستِ موسم کشادہ ہوا
دھنک سات رنگوں کی ٹوٹی ہوئی ہے

▲▲

120/A دھان کھیتی - گارڈن ریچ - کلکتہ ۷۰۰۰۲۴

غزلیں

ظفر غوری

رنگ و بو کے بیچ دخم میں کھو گئی جنگل ہوا
پھول سی بستی اُڑا کر لے گئی اندھی ہوا
اُجلے خال و خط کو سنولاتی رہی دوپہر یل دھوپ
گردِ بن کر پاؤں سے لپٹی رہی پگلی ہوا!
میں کسی زخمی پرندے سا تعاقب میں رہا
بادلوں کے پنکھ لے کر اُڑ گئی اونچی ہوا
اہلِ کشتی سے سفر کی سمت اوجھل ہو گئی
کس سمندر میں پہنچ کر ناگہاں بدلی ہوا
گھات میں تھا کون ان سرسوں بھرے کھیتوں کے بیچ
سرسراتے خوف سے پڑنے لگی پیلی ہوا
نرم تپتے ہولے ہولے پنکھیاں جھلنے لگے
سو گئی پیپل کی چھایا میں تھکی ماندی ہوا
خشک پتّوں کی کراہیں دیر تک اٹھتی رہیں
دل کی سونی راہ سے کل اس طرح گزری ہوا
دُور تک سنسان پٹری آنکھ میں چبھتی رہی
دیر تک اس گاؤں میں دیتی رہی سیٹی ہوا
میرے تیرے میل کا موسم ابھی آیا نہیں
میں بگولا بن سکا ہوں۔ تو بلغ کی ٹھنڈی ہوا
اب کہاں جا کر گزاریں زندگی اپنی ظفر
شہر میں ہر شے ہے مہنگی صرف ہے سستی ہوا

عبد الرحیم نشتر

بارش کی پہلی بوند گری اور میں کھِلا
شاخِ نہالِ درد اُگی اور میں کھِلا
اس نے کہا کہ مجھکو بکھیرے گی وہ ضرور
چلتی ہوئی ہوا نہ رُکی اور میں کھِلا
تھے خشک پات پاؤں پڑا تو پلک اُٹھے
کانوں میں چیخ گونج اُٹھی اور میں کھِلا
موسم تھا زرد اور ہوا بے لباس تھی
اس کے لہو کی چھینٹ پڑی اور میں کھِلا
چاروں طرف مہیب گھنی رات کا حصار
میری شعاع توڑ گئی اور میں کھِلا
پھر وہ کنارِ شرق گلابی ہوا تمام
پھر روشنی سی پھوٹ پڑی اور میں کھِلا
کرنوں کے سارے رنگ مرے تن سے آلگے
رودِ الق چمکنے لگی اور میں کھِلا
برگِ شجر ہرے نہ ہوئے تھے کہ یک بیک
بنتِ صبا قریب ہوئی اور میں کھِلا
نشتر میں سر سے پاؤں تلک تھا بجھا ہوا
اس کے بدن کی جرأت جلی اور میں کھِلا

اعجاز تابش

لفظوں کا بیوپار کریں گے
کالا کاروبار کریں گے
مبہم مبہم باتیں کہہ کر
اب دو طرفہ وار کریں گے
پھولوں نے مایوس کیا ہے
اب کانٹوں سے پیار کریں گے
اپنوں کی نیت پاتے ہو
ہم جھوٹی تکرار کریں گے
دشمن تو نا واقف ٹھہرے
رسوا اپنے یار کریں گے
اندھوں کی بستی میں تابش
کس سے آنکھیں چار کریں گے

○ غنی جنگل اسٹورس انصاری روڈ بھدرا اعظم گڑھ ○

اگلا بچّہ کب؟

کیا آپ بچّوں کی پیدائش میں وقفہ رکھنے کے لیے کسی معیاری طریقے کی تلاش میں ہیں؛ یا آپ ابھی سوچ ہی رہے ہیں کہ آپ کا اگلا بچّہ کب ہو؟ بچّوں کی پیدائش میں وقفہ رکھنے کے مسئلے کو حل کرنے کے کئی طریقے ہیں — جی ہاں۔

دس الگ الگ طریقے

کنڈوم (نرودھ)	جیلی
پیسری	ڈایافرام
لُوپ	رِدھم طریقہ
کاپر "ٹی"	مرد کی نس بندی
فوم گولیاں	عورت کی نس بندی

پہلا بچّہ ابھی نہیں
تین کے بعد کبھی نہیں

آپ تو یہ بات جانتے ہی ہیں۔ جی ہاں! براہِ کرم یہ بات ان کو بتا دیجیے جو نہیں جانتے لیکن جن کے لیے اس کا جاننا ضروری ہے۔ شکریہ۔

سُکھی پریوار کا منصوبہ بنائیے

راج شرما

منزل منزل

ابھی چار بجے ہیں۔ میرا دھیان گلی میں بکھر گیا ہے۔ گلی میں دھوپ کے پرچھائے ہوئے ہے۔ اسی گلی کے نکڑ پر کھڑے ہو کر اس مکان کی تیسری منزل کی طرف، جہاں کبھی تمہارا ابھی اسی طرح گھر تھا جیسے میرا آج بھی ہے۔ صرف میرا دیکھتے رہنا بہت دنوں سے، تمہاری عادت رہی ہے۔ کئی بار اس طرح غور سے دیکھتے، تمھیں میں نے انہی ترچھی نگاہوں سے پکڑا ہے۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ، مگر میرے احساس کا تعلق میرے جذبات سے نہیں، میں یہ نہیں سمجھتی کہ تم میرے عشق میں مبتلا ہو۔ مجھ سے پیار کرتے ہو، اب بھی، ابھی تک، یہ سب کچھ، اتنا کچھ، تمہارے اور میرے درمیان گزر چکنے کے بعد بھی۔

نگاہیں گھومتی ہیں تو کمرے کی دیوار پر آویزاں ایک تصویر پر پڑتی ہیں۔ ایک بہت پیاری پینٹنگ ہے۔ سسی پنوں کی! میں نے اس کی طرف یونہی گھورنا شروع کر دیا ہے۔ مجھے خیال آتا ہے کہ عشق، آخر یہ عشق ہوتا کیا ہے؟ لیلےٰ مجنوں، ہیر رانجھا، سسی پنوں اور مرزا صاحبان کے عشق کے قصے بہت مشہور رہیں مگر میں سمجھتی ہوں کہ ہیر نے رانجھا میں، سسی نے پنوں میں اور صاحبان نے مرزا میں یا یوں کہنا ٹھیک ہوگا کہ دونوں نے ایک دوسرے میں کوئی خصوصیت پائی ہوگی کہ ایک دوسرے کے ہمیشہ کے لیے گرویدہ ہو گئے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں تو کبھی بھی تمہارے عشق میں مبتلا نہیں ہوئی گو تم شاید اس خوش فہمی کے شکار رہے ہو گے۔

میں نے تو ایک تخمینہ لگایا تھا۔ ایک اندازہ، ایک حساب! میں حسین تھی۔ اس امر کا مجھے احساس تھا۔ ہر لڑکی جب وہ زندگی کے اس نازک دور سے گزرتی ہے جسے جوانی کی دہلیز کہتے ہیں، اپنے آپ میں ایک خود اعتمادی اطمینان اور تسکین سی محسوس کرنے لگتی ہے۔ اور اگر اس کا رنگ گورا، چہرہ گول، آنکھیں ہرنی جیسی، زلفیں گھنی، لانبی۔ نین نقش تیکھے اور جسم سڈول ہو تو وہ اپنے آپ کو کسی شہزادی سے کم نہیں سمجھتی۔ اور چونکہ مجھے آغاز سے ہی اس کا احساس تھا کہ میں حسین ہوں، خوبصورت ہوں۔ میں نے کسی نہ کسی طرح میٹرک امتحان پاس کر کے اپنے غریب والدین سے ایک طرح سے سارے تعلقات منقطع کر لیے تھے۔ اور چنڈی گڑھ آ کر رہنے لگی تھی۔ یہاں مجھے نوکری مل گئی تھی ایک سکول میں، استانی کے طور پر! اپنی نوکری، خوبصورتی اور جوانی کے بھروسے، میں نے ایک جوا کھیلا تھا۔ جان بوجھ کر، سوچ سمجھ کر میں نے ایک لائحہ عمل اپنایا تھا...... اور جب میں نے تمہیں دیکھا، تم جو اپنے کسی رشتے دار کے بچے کو سکول میں داخل کروانے آئے تھے تو میں نے محسوس کیا تھا کہ تم جوان ہو، لمبے قد کے، سڈول مگر گٹھیلے جسم نے تم میں ایک خود اعتمادی سی پیدا کر رکھی تھی۔ تم باتیں کرتے تو مسکراتے۔ تمہاری نگاہیں تمہاری چستی اور چالاکی کی غماز تھیں۔ اور پھر تمہاری رشتہ دار عورت نے جو ایک دن بچے کو چھوڑنے آئی تھی، باتوں ہی باتوں میں مجھے بتایا تھا کہ تم ہندوستانی فضائیہ میں ملازم ہو اور شام کمود کا لٹ پٹھ مد ہے ہو

مکان نمبر ۱۱۱۹ سیکٹر ۱۹ بی - چنڈی گڑھ

تب نہ جانے کیسے میں نے سوچا تھا کہ تم ایک دن بہت بڑے وکیل بنو گے، تمہارے پاس کار ہوگی۔ بہت بڑی کوٹھی ہوگی اور ایک شاندار زندگی ۔۔۔ میں تمہیں پسند کرنے لگی تھی۔ میں اسے عشق وشق نہیں سمجھتی، یہ تو ایک لائحہ عمل تھا جو میں نے اپنے من ہی من میں بنایا تھا۔ اور جس کو پورے کار لانے کے لیے میں تمہارے اس رشتہ دار کے گھر، اُس کے بچے کے بہانے آنے جانے لگی تھی۔ تم بھی تو وہیں رہتے تھے نا؟ میں نے تمہاری اُس رشتہ دار عورت کو اپنی منہ بولی بہن بنا لیا تھا۔ اُس نے میری شکل، میری معصومیت، اپنے بچے کی اُستانی ہونے کے ناطے اور چنڈی گڑھ میں میرے اکیلے رہنے کی وجہ سے، مجھ پر ترس کھا کر، یا کسی نامعلوم لالچ کے زیر اثر، یہ رشتہ قبول کر لیا تھا۔ اور اس بہانہ میں تمہارے نزدیک آ گئی تھی۔

میں اُسی پینٹنگ کی طرف دیکھے جا رہی ہوں اور سوچ بھی رہی ہوں۔ کسی نے پیسوں سے عشق کیا تھا یا ایک سودا، کیا تم اتنے برس گزر چکنے کے بعد کہہ سکتے ہو کہ ہم نے ایک دوسرے سے عشق کیا تھا۔ مگر نہیں ۔۔۔۔۔ نہیں ۔۔۔۔۔ یہ یوں تو نہ تھا۔ تم نے تو مجھ میں ایک پڑھی لکھی برسرِ روزگار خوبصورت لڑکی دیکھی تھی۔ اور جیسا کہ مجھے بعد میں علم ہوا تم اپنے آپ کو لیڈی کلر کہا کرتے تھے۔ تمہارا یقین تھا کہ کوئی بھی عورت تمہارے جال سے بچ کر نہیں نکل سکتی۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ تم نے بھی ایک چالاک شکاری کی طرح فریب بھرا ایک جال بچھایا تھا، مجھے پھنسانے کے لیے۔ میرے من میں میری اپنی غرض تھی۔ ایک خواہش، ایک تمنا، اوپر اٹھنے کی! اور تمہارے دل میں ہوس تھی! تم ایک اور شکار اپنی فہرست میں درج کرنے کا فخر حاصل کرنا چاہتے تھے۔

نظر بھٹکی ہے۔ سامنے شیلف پر تمہاری اور میری ایک مشترکہ تصویر ہے۔ یہ تصویر؟ بھلا، کب بنوائی تھی؟ جب ۔۔۔۔ جب میں تمہاری گود میں گر چکی تھی ۔۔۔۔ یہ اچھا ہوا تھا یا بُرا ۔۔۔۔۔ اِس کی خبر مجھے بہت دیر بعد ہوئی تھی۔

جب میں ماں بننے والی تھی۔ میں نے جان بوجھ کر تمہیں اس سے باخبر نہیں کیا تھا تاکہ وہ وقت نکل جائے جب تم اس سلسلے میں کچھ کر سکو یا مجھے مجبور کر سکو، جب وہ وقت نکل گیا، تب میں نے تمہیں صاف صاف بتا دیا کہ تمہیں مجھ سے شادی کرنی ہوگی۔ اب تمہارے لیے کوئی راہِ فرار نہیں تھی۔ تمہاری نوکری کو خطرہ تھا۔ تمہاری پہلی بیوی بھی تھی جو کہیں اپنے ماں باپ کے پاس رہتی تھی اور جیسی کہ مجھے بعد میں خبر لگی، دیکھنے میں یونہی سی تھی۔ وہ پڑھی لکھی بھی نہیں تھی۔ اور تمہاری شادی، تمہارے ماں باپ کی ضد کا نتیجہ تھی۔ تم نے ایک چالاک شکاری کی طرح میرے ساتھ سول میرج کر لی تھی تاکہ میرا منہ بند رہو جائے۔ تم اپنی پہلی بیوی سے علیحدہ ہونے کا دعوےٰ کرنے لگے تھے۔ وہ عورت بہت اچھی رہی ہوگی، جو خاموش رہی تھی۔ خاموش بیٹھی تھی اور اس بارے میں کچھ بھی نہیں کر رہی تھی! واہ ری ہندستانی عورت! تم نے وکالت پاس کر لی تھی اور قضائیہ سے فراغت حاصل کر چکے تھے۔ تم ایک وکیل کے ساتھ کام کرنے لگے تھے۔ میری تنخواہ سے ہم دونوں کا گذارہ ہو رہا تھا کیونکہ اب مجھے سرکاری نوکری مل چکی تھی۔ پھر ایک بچے کے بعد، دوسرے معصوم بچے نے اس جہانِ مکر و ریا میں اپنی آنکھیں کھولیں۔ اور میں اِس بھروسے پر کہ تمہاری وکالت آج چلتی ہے۔ کل چلتی ہے۔ تمہاری ہوس کا شکار ہوتی رہی۔ میں خوش آئند مستقبل کے خواب دیکھتی رہی اور تمہاری چکنی چپڑی باتیں سنتی رہی۔

تب اسی نکڑ پر میں نے تمہیں ایک اور لڑکی کے ساتھ دیکھا تھا۔ جس کے بارے میں نے طرح طرح کی باتیں سُن رکھی تھیں۔ اور مجھے وہم ہو گیا تھا کہ شکاری اب کسی اور شکار کے لیے جال بچھا رہا ہے۔ ہاں تم نے اسے میرا وہم ہی کہا تھا۔

ہاں، اسی نکڑ پر ایک دن، وہ جھگڑا بھی ہوا تھا جس میں تمہارے وکیل نے تمہیں سخت سست اور نکما کہا تھا اور اپنی بیوی کی آمدنی پر جینے والا کیکڑا بھی۔ یہ جھگڑا

اس لیے ہوا تھا کہ تم نے کسی متوکل سے کچھ رقم اینٹھ کر اپنے تللے اڑادی تھی۔

اور پھر اسی نکڑ پر، بازار سے لوٹتے ہوئے ایک بار تم مجھ سے اُلجھ گئے تھے۔ مجھے یاد ہے، میں نے کہا تھا کہ تمہاری وکالت تو چلتی نظر نہیں آتی —— تمہارا جواب تھا، تم نے شادی مجھ سے کی ہے یا میری وکالت کے ساتھ۔ میں نے بھی کھری کھری سنادی تھی۔ یہ دونوں کے ساتھ۔ تم نے ایک دم تلخ ہوتے ہوئے کہا تھا "تمہیں فیصلہ کرنا ہوگا۔ میں وکیل بنتا ہوں یا نہیں، تم میری ہو، جو کچھ بھی میں ہوں"۔

"میرے پیٹ میں تمہارا تیسرا بچہ تھا پھر بھی میں نے پورے اطمینان کے ساتھ کہا تھا" تمہاری اُن بڑی بڑی ٹھینگوں کا کیا بنے گا؟ میں تو تمہیں وکیل، ایک کامیاب وکیل دیکھنا چاہتی ہوں"۔

تب تم وہیں سے لوٹ گئے تھے۔

اور اس رات بہت دیر سے گھر لوٹے تھے شراب میں دُھت۔

پھر تم ہر روز شراب پینے لگے۔ پھر تم نے جُوا کھیلنا بھی شروع کر دیا۔

جُوا تو میں نے بھی کھیلا تھا مگر اپنی زندگی کے ساتھ —!

مگر تم تو شاید مجھے کسی بات پر مجبور کرنا چاہ رہے تھے۔

تم جُوا کھیلتے رہے اور ہارتے رہے۔ مگر تمہاری ہار صرف روپیوں کی ہار تھی!

مگر میں بھی ہاری تھی۔ اور میری ہار، میرے دل، دماغ اور میری زندگی اور اس کی تمام خواہشوں اور اُمنگوں کی ہار تھی۔ تم اب بیکار تھے اور جُوا کھیل رہے تھے۔ میں نوکری کر رہی تھی اور زندگی کا جُوا ہارتی جا رہی تھی۔

میری نگاہیں اب پھر اسی نکڑ کی طرف ہیں اور میں خیالوں کے تلاطم میں ڈوبی جا رہی ہوں۔ اب تم شکاری سے وحشی بنتے جا رہے تھے۔ تم مجھ سے روپیے مانگتے، چھینتے اور جُوئے میں ہار آتے۔ کبھی کبھی میرے انکار پر تم مجھے پیٹ بھی ڈالتے۔ میرا جسم تمہاری ٹھوکروں اور چوٹوں سے بے حال ہو جاتا مگر میں تمہیں روپیے پیسے دینے سے انکار کر دیتی تمہیں اس غلط راستے پر چلتے رہنے سے روکنے کے لیے! مگر تم نے گھر کا سامان بیچنا شروع کر دیا تھا۔ کبھی ٹرانسسٹر گم ہوتا تو کبھی کوئی اور چیز۔ اور پھر ایک دن، میں نے تم سے پوچھا تھا "کیا کر رہے ہو تم؟"

تمہارا جواب تھا "جو تم کر رہی ہو!"

میں نے تلخی سے کہا تھا "کیا مطلب؟ میں نے تو تمہیں شراب پینے اور جُوا کھیلنے کو نہیں کہا"۔

"تم تو مجھے دوسری عورتوں کے پاس جانے کے لیے بھی نہیں کہتیں"، تم نے بے دھڑک، بلا جھجک کہہ ڈالا تھا۔

تم اتنا بھی نہیں سمجھ سکے کہ عورتوں کے پاس مردوں کو راہِ راست پر لانے کے لیے ایک راستہ ہی تو ہوتا ہے۔

تمہاری بات سُن کر، میرے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ میں نے غصّے سے کہا تھا "تو نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے؟"

"ہاں"۔

"تو پھر یہاں کیوں آتے ہو؟"

"تم مجھے روک سکتی ہو کیا؟"

"ہاں!"

پھر تم کئی دنوں تک گھر نہیں آئے۔ ایک دن آئے بھی تو ایک اٹیچی کیس جس میں میرے زیور تھے، اُٹھا کر لے جانے کے لیے مگر میں عین وقت پر پہنچ گئی تھی۔ میں نے شور مچا دیا تھا تم اٹیچی کیس چھوڑ کے چلے گئے تھے۔

تب بڑے لڑکے کی عمر پانچ برس کی تھی۔ منجھلے کی تین برس کی اور سب سے چھوٹی لڑکی کی عمر ایک سال کی تھی۔ اسے ایک "بچہ گھر" میں چھوڑ کر میں پڑھانے جایا کرتی تھی۔

تب تم کبھی کبھی اس نکڑ پر آ کھڑے ہوتے اور اس مکان کی طرف دیکھتے رہتے۔

تبھی میں نے بچّوں کو سمجھانا شروع کیا تھا کہ اُن کا والد

کسی دور کے شہر میں گیا ہوا ہے۔ میری غیر حاضری میں، نہ تو گھر پر، اور نہ باہر ہی کسی بھی آدمی سے بات کریں۔ میں بڑے بچوں کو اپنے ساتھ ہی سکول لے کر جانے لگی تھی اور اپنے ساتھ ہی انہیں شام کو گھر لے آتی۔

تم نے طلاق کے لیے کوئی کارروائی نہیں کی۔ کر بھی کیسے سکتے تھے۔

میں نے سُنا تھا کہ تم نے اس عورت سے جو تمہاری رشتہ دار تھی اور جس کے گھر ہم کبھی ملا کرتے تھے میرے چال چلن کے بارے میں برا بھلا کہا تھا۔ اس نے کوشش بھی کی تھی کہ ہم پھر سے اکٹھے رہنے لگ جائیں۔

کیا تمہیں معلوم ہے میں نے اس سے کیا کہا تھا۔ اگر تمہیں علم نہیں تو سنو، میں نے کہا تھا ـــــ

"میں نے ایک وکیل بننے والے شخص کے ساتھ شادی کی تھی۔ ایک جواری، شرابی اور بدمعاش کے ساتھ نہیں"۔

"قسمت کی بات ہے"! اُس نے رائے دی تھی۔

"قسمت میں تو یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ اس ٹھوکر سے سنبھل جاتا اور اپنی زندگی کو پھر راہِ راست پر لے آتا"۔

مگر پھر مجھے خبر ملی کہ تم واقعی کسی اور شہر چلے گئے ہو۔

مگر بچوں کے جنم دن پر، تم نے کارڈ اور تحفے بھیجنے شروع کر دیے۔ انہیں میں نے بچوں کے ہاتھ کبھی بھی لگنے نہیں دیا۔

پھر بچے بڑے ہونے لگے۔

تم لوٹ آئے اور اُسی طرح اس نکڑ پر آکر کھڑے ہو کر اس طرف دیکھتے رہے، خاص طور پر بچوں کے جنم دنوں پر،

پھر تم نے سڑک پر بھی کئی بار، مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی مگر تمہیں شاید یہ خوف بھی تھا کہ میں تمہیں آوارہ

بدمعاش اور راستہ چلتی عورتوں کو چھیڑنے والا غنڈہ کہہ کر پکڑوا نہ دوں۔ تمہارا خوف ٹھیک تھا۔ میں ایسا کر بھی سکتی تھی۔ ہاری ہوئی عورت کیا کچھ نہیں کر گزرتی؟ وہ تو بھوکی شیرنی ہوتی ہی ہے!

میں اب بھی اسی گلی کی طرف دیکھے جا رہی ہوں۔ دھوپ کچھ کم ہو گئی ہے۔

میں آج بھی سوچ رہی ہوں کہ میں نے جان بوجھ کر تمہیں بھٹکنے کے لیے تو نہیں چھوڑ دیا۔ میرا اندازہ غلط تو نہیں تھا تم میرے لیے نہ سہی، اپنے بچوں کی خاطر ہی راہِ راست پر آ جاتے، کچھ بن جاتے۔ اور اس طرح میرے منہ پر ایک زنّاٹے دار تھپڑ رسید کر دیتے۔ مگر تم تو ضدی ہو ـــ!

یہ ضد، آخر کسی چیز کی کوئی حد بھی ہوتی ہے۔

اب تم کئی دنوں سے نظر نہیں پڑے۔

اب تو تمہاری رشتہ دار عورت بھی مجھ سے بات کرنا اپنی ہتک سمجھتی ہے۔ گو اب میری ترقی ہو گئی ہے اور میں مڈل سکول کی ہیڈ مسٹرس مقرر ہو گئی ہوں۔

بچے جوان ہو رہے ہیں۔

گلی میں شام کے سائے ہویدا ہو رہے ہیں۔ سورج ڈوب رہا ہو گا۔ سایے منڈیروں سے لٹک لٹک کر اب گلی میں پہنچ گئے ہیں۔ میں دیکھ رہی ہوں۔

میں بوڑھی ہو جاؤں گی۔ بچے بڑے ہو جائیں گے اور اپنے اپنے گھر بسا لیں گے۔

ہندوستان ابھی انگلستان تو نہیں بنا کہ بوڑھے لوگوں کے لیے آرام گھر بنے ہوں جہاں بوڑھے اور بوڑھیاں اپنے جھریوں بھرے چہروں کی لکیروں میں سے اپنے جوانی میں گم شدہ ساتھیوں کے نقش پہچاننے کی کوشش کرتے زندگی گذارنے کا بہانہ کر سکیں

مگر تم آج کل ہو کہاں؟

کیا تم نے اور شادی رچا لی ہے؟؟

تم اس نکڑ پر اب کیوں نہیں آتے ؟؟؟

میں تو ادھر دیکھتی رہتی ہوں۔ نہ جانے کیوں۔ معلوم نہیں کس امید پر ؟

کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ اگر تم اب بھی آجاؤ تو میں تمہیں معاف کردوں گی۔ گھر لے آؤں گی۔

مگر ؟

میں سوچتی ہوں کہ میں ایسا کیوں کردوں گی۔ کیا میں جذبات کی شکار ہو کر اس طرح کردوں گی۔ نہیں۔ کیا تمہارے لیے نفرت کی جگہ کسی اور جذبہ نے لے لی ہے۔ یہ بھی نہیں؛

میں تو سوچتی ہوں کہ جب میں بوڑھی ہو جاؤں گی۔۔۔۔۔

تب کوئی ساتھی ہو تو اچھا ہی ہے۔

مگر اب ! ابھی !!

میں اسی نکڑ کی طرف دیکھے جاتی ہوں۔ بچے آج سینما گئے ہیں۔ چھوٹی بچی کا جنم دن تھا نا ؛ میں نے جان بوجھ کر اُن کو بھیجا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ تم آج آؤ گے۔ چھوٹی کے جنم دن پر۔۔۔۔۔۔ اسی نکڑ پر ؟

مگر تم مجھے ابھی تک نظر نہیں پڑے۔

میرے ذہن میں اپنی ایک سہیلی کے الفاظ ابھرتے ہیں ”تم نے زندگی میں ہر قدم سوچ سمجھ کے اٹھایا ہے۔ اگر اب وہ بدل جائے تو کیا تم اُسے قبول کرلوگی ؟“

میں سوچنے لگی تھی۔

ہو سکتا ہے کہ تمہیں دیکھ کر میرے دل میں پرانی یادیں تازہ ہو جائیں۔ مگر بچوں کو دیکھ کر جن کے چہروں پر تمہارے نقوش صاف پہچانے جاتے ہیں، میں سب کچھ بھول جاؤں اور ان کے مستقبل کے لیے تمہارا اثر اُن کے لیے ٹھیک نہ سمجھوں۔ آخر اپنی زندگی کی طرح، وہ بھی تو اب میری ذمہ داری ہیں، مجھ اکیلی کی۔!

ہو سکتا ہے کہ تمہارا بد اثر۔۔۔۔۔

ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔ مگر ہونے کو تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔

تب ایسا کیوں نہیں ہو سکتا کہ تم وکیل بن جاؤ۔

ایک کار اس مکان کے نیچے آکر رکے، تم اپنے منشی کو میرے پاس بھیجو،

”بی بی جی، آپ کو نیچے بلایا گیا ہے۔“

”کون ہیں ؟“

”سپریم کورٹ کے مشہور وکیل“

”مجھ سے کیا سروکار ہے اُن کا ؟“

تب وہ مجھے کاغذات پکڑاتا ہے۔ یہ تمہاری وصیت کے کاغذات ہیں۔ تمہاری کوٹھیاں، تمہارے بنک بیلنس تم نے سبھی کچھ تو میرے نام کردیا ہے۔ میں تمہارے دستخط پہچان رہی ہوں۔ میں ایک عجیب سی حالت میں ہوں۔ میں تمہارے منشی سے پوچھتی ہوں ”کیا وہ اوپر نہیں آئیں گے ؟“

”جی“ وہ ابھی کچھ کہنے جا رہا ہے کہ میں بول پڑتی ہوں۔

”اُن کو کہہ دیجئے گا۔“

مگر میں یہ کیسی شیخ چلیوں کی سی باتیں کر رہی ہوں۔

میں تو اس کھڑکی میں بیٹھی ہوں۔

گلی خالی ہے۔

بچے ابھی تک نہیں آئے۔

گلی میں شام کا اندھیرا چھانے لگا ہے۔

اور تم ۔۔۔۔۔ تم ۔۔۔۔۔ ؟

دور سے کسی کار کی گونج سنائی دیتی ہے۔

اندھیرا بڑھ رہا ہے۔

میں بوڑھی ہوتی جا رہی ہوں۔

مگر میں ۔۔۔۔۔

آج بھی تخمینے لگا رہی ہوں۔ اندازے لگا رہی ہوں۔ خواب دیکھ رہی ہوں۔ مگر گلی کے نکڑ کی دوسری طرف کیا ہے ؟ کچھ نہیں جانتی !۔

ستیہ پرکاش　ایک علمی ادارے پر سوویٹ کمیونسٹ پارٹی کا کنٹرول

سوویٹ معاشرے کی ہر سطح پر کمیونسٹ پارٹی کا جس حد تک کنٹرول ہے اس کا ثبوت اکاڈمی آف سائینسز کے نظم و نسق میں اس کی مداخلت سے ملتا ہے۔ اکاڈمی سائینسی ریسرچ کا ممتاز ادارہ ہے۔ اس کے پیچھے ڈھائی سو سال کی تاریخ ہے۔ یہ واحد روسی علمی ادارہ ہے جسے تھوڑی بہت آزادی حاصل ہے۔ ضابطے کے لحاظ سے اس کی نگرانی وزراء کی کونسل کے سپرد ہے اور نگرانی کا یہ فریضہ نائب وزیراعظم کو انجام دینا چاہیئے جو سائنس اور ٹیکنالوجی کی کیٹی کا انچارج ہے لیکن عملاً اس پر پارٹی کا کنٹرول ہے اور اس کنٹرول کو وہ سیکرٹریٹ، مرکزی کمیٹی کے شعبوں اور ان پارٹی تنظیموں کے ذریعے بروئے کار لاتی ہے جو خود اکاڈمی کے اندر موجود ہیں۔

نومبر ۱۹۷۵ء میں اکاڈمی کے نئے صدر اور پریسیڈیم کا انتخاب ہونا تھا۔ انتخاب سے پہلے دو برسوں میں اس کے متعدد شواہد ملتے رہے کہ پارٹی جوڑ توڑ میں مصروف ہے اور ایسے امیدواروں کو کامیاب کرانے کے لیے کوشاں ہے جو پارٹی کی تابعیت کے لیے تیار ہوں۔

۱۹۷۳ء میں ایم۔ این کیلدش کی مسلسل خرابیِ صحت کی بنا پر، جو ۱۹۶۱ء سے مسلسل صدر چلا آتا تھا، اور اس کے متوقع جانشین اوّل نائب صدر ایم۔ ایم ملیونشوسکی کی موت کے بعد پارٹی آئندہ انتخابات کے لیے، جو مئی ۱۹۷۵ء میں ہونے تھے، تیاریوں میں مصروف ہو گئی لیکن جانشینی کا مسئلہ حل نہ ہو سکا اس لیے انتخابات کو نومبر ۱۹۷۵ء پر ملتوی کر دیا گیا۔ ان چھ مہینوں میں نائب صدر وی۔ اے۔ کوٹلنکو و ایکٹنگ صدر بنا دیا گیا لیکن یہ بات اس پر واضح کر دی گئی کہ اسے مستقل طور پر یہ عہدہ نہیں دیا جائے گا۔

اکاڈمی کے اندر ایسے کئی امیدوار تھے جنھیں عہدے کا مستحق سمجھا جاتا تھا۔ ان میں سے ایک یو۔ اے اوچینکو وتھا جو کیمیکل، ٹکنالوجیکل اور بیالوجیکل سائنسوں کے شعبے کا انچارج تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایکٹنگ چیف سیکرٹیری جی۔ کے۔ سکاریابن کو پسند نہیں تھا، جو پارٹی کی طرف سے نگرانی پر مامور تھا۔

جب صدارت کے لیے اُمیدوار کا آخری فیصلہ ہوا تو یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ اکاڈمی پر پارٹی کو پورا پورا کنٹرول حاصل ہے۔ بالکل ناگہانی طور پر پارٹی کے سیکرٹیری اور پولٹ بیورو کے ممبر مائیخل سوسلوف نے اکاڈمی کی جنرل میٹنگ کو خطاب کیا اور اعلان کر دیا کہ سائنسدانوں کے "مشوروں" اور ان کی خواہشات کا پورا پورا جائزہ لینے کے بعد پارٹی کی سنٹرل کیٹی نے انتخاب کے لیے اے۔ پی الیکزنڈروو کو امیدوار چن لیا ہے۔

بیشتر سوویٹ سائنسدانوں کو ۷۲ سالہ الیکزنڈرو کی نامزدگی سے، جو کرچاٹوف اٹامک انرجی انسٹی ٹیوٹ

کا ڈائریکٹر تھا، کافی حیرت ہوئی۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ ایک تو اس کی عمر اس قابل نہیں کہ اُسے صدر بنایا جائے، دوسرے وہ ایک ایسی انسٹی ٹیوٹ کا ڈائریکٹر تھا جو حکومتی وزارت کے ماتحت ہے۔ اس کی نامزدگی کا کوئی جواز ہو سکتا تھا تو یہ تھا کہ وہ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کا ممبر تھا اور کیلڈش کے علاوہ فزیکو ٹیکنیکل اور ریاضی سائنسوں کے شعبوں کا واحد ممبر تھا جو اکاڈمی کے پریسیڈیم میں بھی شامل تھا۔

صدارت کے لیے امیدوار کی نامزدگی کے ساتھ ہی سوسلوف نے یہ اعلان بھی کیا کہ پارٹی نے نئے پریسیڈیم کی منظوری دے دی ہے جس میں دو نئے نائب صدر تھے۔ ان میں سے ایک مارچوک تھا جو سائنس اور پیداوار میں گہرے رابطے کا حامی ہے اور بریزنیف کے اس نظریے کی تائید کرتا ہے کہ سوشلزمی مقابلے کو ٹیکنکی ترقی کا وسیلہ بنایا جانا چاہیے۔ فلسفے اور قانون کے شعبے کا نیا اکاڈمی سیکریٹری اے۔ جی۔ ایگیروؤ بنے جو پارٹی کا وفادار رکن ہے اور ۱۹۶۵ء سے پارٹی کے نظریاتی جریدے "کمیونسٹ" کا چیف ایڈیٹر اور ۱۹۵۰ء سے سرگرم پارٹی پروپیگنڈسٹ کے فرائض انجام دیتا رہا ہے۔

اس قسم کی انتخابی مداخلتیں اس بات کا ایک اور ثبوت ہیں کہ کمیونسٹ پارٹی سوویٹ یونین میں شخصی آزادیوں کو کس طرح محدود بلکہ ختم بھی کرتی رہتی ہے۔

سید احمد شمیم | نظمیں

(۱)

ہوائیں بھی ہونٹوں کو
چوما کریں گی
بہاروں کے بھی سبز میلے
لگیں گے ....

چمن در چمن
پھول کھلتے
بکھرتے رہیں گے ..... .
بہار و خزاں کا جو یہ سلسلہ ہے
سو قائم رہے گا
مگر میرے اندر کی ویرانیوں کا
مداوا نہ ہوگا ....!
کہ صبحِ ازل خود مرا عین ہی
میرا دشمن بنا تھا....
کہ میں شجرِ گریہ کی صورت
ہمہ وقت جلتا پگھلتا رہوں گا ——!!

(۲)

زمیں اپنے محور سے
لمحہ بہ لمحہ سرکنے لگی ہے
صدا "کن" کی پہلے جو گونجی
کبھی تھی
خدا جانے اب وہ
کہاں کھو چکی ہے ....

خلاؤں میں چاروں طرف
بے کراں خامشی —— تیرگی ہے
یہاں روشنی کا تموج بھی
تابوت میں سو چکا ہے

مقدر سیاہی
سیاہی کا گہرا سمندر بھی ——!!

غـــزلیں

راہی قریشی

سایا فقط فریب ہے دیکھو مسافرو
اِس دشتِ بے اماں میں نہ ٹھہرو مسافرو

روشن رکھو لہو کے دیے سے ضمیرِ شب
نقشِ قدم کی شمع نہ ڈھونڈو مسافرو

پامالِ جورِ گردشِ ایام ہم بھی ہیں
چپکے سے راستے کو بتا دو مسافرو

اِک دن یہ خاکِ دشت ہی کہہ دے گی داستاں
ہم سے ہمارا حال نہ پوچھو مسافرو

آسودہ ہم کو دیکھ کے آگے نکل نہ جائیں
رستے بھی چلتے رہتے ہیں دیکھو مسافرو

اہلِ وطن کے واسطے سوغات لے چلیں
تھوڑے سے زخم اور سمیٹو مسافرو

یہ منتظر ہے یا متنفر ہے آج بھی
اس رہگذر کو غور سے دیکھو مسافرو

عزمِ سفر، رفیقِ سفر تھے نہیں ہے کم
اب کون ساتھ دے گا، یہ سوچو مسافرو

راہوں کے پیچ و خم سے وہی آشنا ہے کچھ
راہیؔ کہاں ہے کچھ تو خبر لو مسافرو

▲▲

جمیل کلیمی

لب بہ لب یہ سوال کے سائے
خواب ہیں یا خیال کے سائے

آئینے میں بھی بکھرے بکھرے ہیں
تیرے عکسِ جمال کے سائے

اے قلم دیکھ کورے کاغذ پر
بولتے ہیں کمال کے سائے

میرے گھر کی ہر ایک شے میں ہیں
دوڑتے ماہ و سال کے سائے

آنکھ کی پتلیوں میں مہماں تھے
رات اک مہ جمال کے سائے

تیری غزلوں کی دھوپ میں تو جمیلؔ
چل رہے ہیں غزال کے سائے

▲▲

شاہد رسا

سکوں حاصل نہیں ہوگا مسرت کے خیالوں میں
اُلجھ کر رہ نہ جائیں لوگ ان مکڑی کے جالوں میں

جسے ہم نے لکھا تھا وقت کی دیوار پر پہلے
وہی تاریخ دہراتے ہیں لوگ اکثر مقالوں میں

مجھے سلجھانہ پاؤ گے مری ہستی معمّہ ہے
مجھے تم لاکھ رکھو ہر گھڑی اپنے خیالوں میں

مجھے اپنی تباہی کے بھی عنواں سوچنے ہوں گے
اُجالے قتل ہوتے میں نے دیکھے ہیں اُجالوں میں

مجھے عمرِ رواں کو اب نئی راہیں دکھانا ہیں
اُلجھ کر رہ نہ جائے پھر کہیں دنیا کی چالوں میں

▲▲

ڈبلیو ڈبلیو جیکبس

ترجمہ: علی بن ایاز

وہ لڑکی

ملاحوں میں بھی خامیاں ہوتی ہیں تھتب چوکیدار نے کشادہ دلی کے ساتھ کہا مجھے اس سے انکار نہیں۔ نوکری کے زمانہ میں مجھ میں بھی خامیاں تھیں لیکن مٹھی بند رکھنے کی علت ایک ایسی برائی ہے جو ملاحوں میں شاذونادر ہی پائی جاتی ہے۔

ایک بار میں نے بھی کچھ رقم بچائی ـــــ دو سونے کے سکے۔ اور وہ بھی یوں کہ کوٹ کی جیب کے استر میں سوراخ ہو گیا تھا۔ ایک جہاز پر نوکری ملتے ملتے مجھے دو راتیں ایک دروازہ کی چوکھٹ پر بسر کرنی پڑیں۔ بھوکا پیاسا۔ کوٹ کے استر میں ان اشرفیوں کا مجھے اس وقت پتہ لگا جب میں نزدیک ترین شراب خانے سے دو سو میل کے فاصلے پر تھا۔

سمندری ملازمت کے دوران مجھے صرف ایک ہی کنجوس سے سابقہ پڑا۔ اس کا نام تھا' تھامس گیری۔ گرینیڈا نامی جہاز پر ہمارے ساتھ تھا یہ جہاز سڈنی سے لندن جا رہا تھا۔

'میرا خیال ہے کہ اس کی عمر ۶۰ سال ہوگی یعنی عمر کے لحاظ سے پختہ کار۔ اس عمر میں اور کفایت شعاری۔ ہتھ! وہ ۴۰ سال سے پیسہ پیسہ جوڑ رہا تھا اور جہاں تک ہمیں معلوم ہے اس نے ۶ سو پاؤنڈ سے زیادہ رقم جمع کر لی تھی۔ وہ چٹخارے لے لے کر اس کا ذکر کیا کرتا تھا۔ کہتا تھا میں تم سب سے زیادہ مطمئن ہوں۔

ہم کو سڈنی سے روانہ ہوئے ایک مہینہ ہوا تھا کہ تھامس بیمار پڑ گیا۔ بل کس کا خیال تھا کہ ایک پنی کا حساب نہ ملنے کی فکر نے اسے بیمار ڈال دیا۔ لیکن والٹر جونس ـــــ جس کے کنبہ کے لوگ اکثر بیمار پڑتے تھے اور اسی لیے اسے بیماریوں کے بارے میں بہت کچھ معلوم تھا دعوٰی کر رہا تھا کہ اسے معلوم ہے تھامس کو کیا بیماری ہے۔ اگرچہ بیماری کا نام اسے یاد نہیں آ رہا تھا لندن پہنچنے کے بعد کسی ڈاکٹر سے معائنہ کرانے پر معلوم ہو جائے گا کہ اس کا خیال کس قدر صحیح ہے۔

بیماری جو بھی تھی مگر تھامس کی حالت روز بروز گرتی جا رہی تھی۔ کپتان اسے دیکھنے آیا اس کی زبان کا معائنہ کیا۔ پھر ہماری زبانیں دیکھیں کہ ہماری زبانوں اور تھامس کی زبان میں فرق معلوم کرے۔ پھر باورچی کو دیکھ بھال کا حکم دے کر چلا گیا۔ دوسرے روز تھامس کی حالت اور زیادہ ابتر ہو گئی۔ تھامس کے سوا سب جان گئے کہ اس کے چل چلاؤ کا وقت آ گیا۔ اور جب باورچی نے اس سے یہ بات کہی تو پہلے اسے یقین ہی نہ آتا تھا کہ اس کی کشتی کا لنگر اٹھنے ہی والا ہے بل ہکس نے اس سے یہ بات کہی اور والٹر جونس نے بھی کہا کہ اس کا دادا بھی اسی طرح چل بسا تھا۔

"میں ابھی نہیں مروں گا،" تھامس نے کہا۔ "میں یہ ساری رقم چھوڑ کر کیسے مر سکتا ہوں۔"

"تمہارے رشتہ داروں کے کام آئے گی تھامس"۔ والٹر جونس نے کہا۔

"میرا کوئی رشتے دار نہیں۔" بوڑھے نے کہا۔

"اچھا تو تمہارے دوست ہیں۔ والٹر نے نرمی سے کہا۔

"میرا کوئی دوست بھی نہیں۔" بوڑھے نے مکرر کہا۔

"نہیں بھئی ایسا نہ کہو۔ تمھارے کئی دوست ہیں۔" والٹر نے اداس مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "میں ایک دوست کا ذکر کر سکتا ہوں کم از کم۔"

تھامس نے اس کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں۔ رنجیدہ لہجہ میں رقم کی بات کرنے لگا جو اس نے گاڑھے پسینہ کی کمائی سے جمع کی تھی۔ پھر اس کی حالت اور خراب ہو گئی، اسے آدمیوں کی شناخت بھی نہیں رہی۔ لیکن اس کے خیال میں ہم سب لالچی تھے۔ اس کے نزدیک والٹر جونس شارک تھا اور اس نے یہ بات منہ در منہ کہی۔ والٹر نے تردید کرنی چاہی مگر اس کا خیال نہ بدل سکا۔

دوسرے روز اس کا انتقال ہو گیا۔ صبح میں بار بار اپنی رقم کی بات کرتا رہا اور بہت غصہ میں آگیا۔ بل سے اس نے وعدہ لیا کہ اسے اسی حالت میں دفن کیا جائے گا۔ بل نے اسے بغلوں میں ہاتھ دے کر اٹھایا تو بوڑھے کی کمر میں کینواس کے بیلٹ سے محسوس ہوا کہ بوڑھے کا مدعا کیا تھا۔

اس روز موسم خراب تھا۔ سمندر میں قدرے طوفان تھا جس کی وجہ سے سارے ملاح عرشے پر تھے اور ایک لڑکا جس کی عمر کم و بیش ۱۶ سال تھی اور جو اسٹیوارڈ (Steward) کی امداد پر مامور تھا، اس کو تھامس کی دیکھ بھال پر مامور کر دیا گیا تھا۔ میں اور بل دونوں نیچے گئے کہ بوڑھے کا آخری دیدار کر لیں۔

"بل میں اپنی رقم اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔" بوڑھے نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" بل نے کہا۔

"اب میرا دل مطمئن ہے۔" تھامس بولا "میں نے یہ رقم جمی کو دے دی ہے تاکہ وہ میرے لیے سمندر میں پھینک دے۔"

"کیا؟" بل نے گھورتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے بل۔" لڑکے نے کہا۔ "بنک کے نوٹوں کا ایک چھوٹا سا پلندہ تھا۔ پھینک دینے کی اجرت میں مجھے انھوں نے دو پنس دیے ہیں۔"

بوڑھا تھامس ہماری باتیں سنتا دکھائی دیتا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں جن سے مکاری ٹپکتی تھی۔ جیسے اس نے کوئی بڑی ہوشیاری کا کارنامہ انجام دیا ہو۔

"کوئی بھی۔ کوئی بھی۔ میری رقم۔ خرچ کرنے... نہ پائے گا۔" وہ بولا۔ "کوئی بھی..."

ہم لوگ اس کے بستر کے پاس سے سرک آئے اور اسے دور سے دیکھتے رہے۔ پھر بل لڑکے کی طرف مڑا۔

"جا کر کپتان کو اس کے مرنے کی اطلاع دو۔" اس نے کہا۔ "کسی اور کی نہیں۔ اپنی خاطر، نہ کپتان سے اور نہ کسی اور سے کہنا کہ تم نے رقم سمندر میں پھینک دی ہے۔"

"کیوں؟" جمی نے کہا۔

"کیوں کہ تم کو اس کے بدلے بند کر دیا جائے گا۔" بل نے کہا "تم کو ایسا نہ کرنا چاہیے تھا۔ یہ تم نے خلافِ قانون کیا۔ یہ رقم کسی کو دی جانی چاہیے تھی۔"

جمی کے چہرے سے سراسیمگی ظاہر تھی۔ اس کے جانے کے بعد میں بل کی طرف مڑا۔ اور اس کو گھورتے ہوئے پوچھا۔ "بل آخر تم کیا کھیل کھیلنا چاہتے ہو؟"

"کھیل؟" بل نے غراتے ہوئے کہا۔ "میں نہیں چاہتا کہ غریب کسی مصیبت میں الجھے بیچارا۔ تم بھی کسی زمانہ میں کم عمر تھے۔"

"تھا تو۔" میں نے کہا "مگر اب بوڑھا ہو چکا ہوں لیکن پہلے مجھے بتاؤ کہ تم کیا چال چلنی چاہتے ہو۔ ورنہ میں خود اس کی اطلاع کپتان کو دیتا ہوں، اور دوسروں کو بھی۔ بیچارے تھامس نے پھینکنے کے لیے کہا اور اس نے پھینک دیا۔ اس میں اس کا کیا قصور؟"

"کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ رقم جمی نے پھینک دی؟" بل نے ناک چڑھاتے ہوئے کہا "یہ ننھا سا رینگنے والا کیڑا اب سو پونڈ قیمت کا ہے۔ تم اپنا منہ بند رکھو تو تم کو معاوضہ ملے گا۔"

بل کا کھیل میری سمجھ میں آگیا۔ "ٹھیک ہے۔ میں اپنی زبان بند رکھوں گا۔ نصف حصہ کی خاطر۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

معلوم ہوتا تھا کہ غصہ سے وہ پھٹ پڑے گا۔ وہ ایسی زبان استعمال کرنے لگا جو مجھ سے سنی نہیں جاتی تھی۔

"خیر یوں ہی سہی۔" آخر وہ کہنے لگا۔ "نصف ہی سہی یہ

چوری نہیں۔ کیوں کہ کسی کا مال نہیں۔ . . . . ’اور لڑکے کا بھی نہیں کیوں کہ اس کو پھینک دینے کے لیے کہا گیا تھا۔‘

بیچارے تھامس کو دوسرے روز سمندر کے حوالہ کردیا گیا۔ واپس ہوتے ہوئے تو بل نے لڑکے کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”بیچارہ تھامس اپنی رقم کی تلاش میں گیا۔ میں نہیں جانتا کہ وہ اسے ملے گی بھی یا نہیں۔ کیا وہ بڑا بنڈل تھا جمی؟“

”نہیں“ جمی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”سو سو پونڈ کے چھ نوٹ تھے اور دو اشرفیاں۔ میں نے اشرفیوں کو نوٹوں میں لپیٹ دیا کہ وزن سے ڈوب جائیں۔ اس طرح رقم کے پھینک دینے کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ بل“۔

بل نے اسے جواب نہیں دیا۔ اس روز دوپہر کو دوسرے لوگ سو رہے تھے تو ہم نے جمی کے بستر کی تلاشی لی۔ مگر کچھ ہاتھ نہ آیا۔ بل تھک کر گالیاں بکتا بیٹھ گیا اور کہنے لگا رقم لڑکے کے پاس ہی ہوگی۔

ہم نے رات کا انتظار کیا۔ سب سو گئے اور خراٹے لینے لگے تو ہم نے اس کی جیبوں کی تلاشی لی اور اس کے کوٹ کا استر بھی دیکھ ڈالا۔ پھر ہم اپنے بستر پر آگئے اور بل نے کانا پھوسی کرتے ہوئے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

”اس نے رقم کمر میں باندھ رکھی ہوگی تھامس کی طرح“ میں نے کہا۔

ہم اندھیرے میں کانا پھوسی کرتے رہے اور پھر بل سے برداشت نہ ہو سکا۔ وہ دوبارہ لڑکے کے بستر کے پاس گیا۔ وہ جوش کے مارے تھرتھرا رہا تھا، اور میری حالت بھی کچھ ایسی ہی تھی کہ یکایک کوک اٹھ بیٹھا، بری طرح ہنستا ہوا اور چیخنے لگا کہ کسی نے اس کے گدگدی کی ہے۔

میں اور بل اپنے بستر میں دبک گئے اور کوک جیسے بری طرح گدگدی ہوتی تھی بستر پر بیٹھا آگے کی طرف جھک کر کہنے لگا کہ اگر پھر ایسا ہوا تو بری طرح پیش آئے گا۔

”بھئی سو بھی جاؤ“ والٹر جونس نے کہا۔ ”تو نے خواب دیکھا ہے۔ تجھے گدگدی کون کرے گا؟“

”میں کہتا ہوں“ کوک نے کہا۔ ”کوئی ادھر آیا اور مجھے گدگدی کی۔ اتنا بڑا سا ہاتھ تھا۔ میرا جسم ابھی تک سنسناتا ہے۔“

بل نے رات بھر کے لیے تلاش ختم کردی۔ لیکن دوسرے روز وہ کہنے لگا کہ جمی بہت موٹا دکھائی دے رہا ہے۔ یہ کہہ کر اس نے لڑکے کے پورے جسم کو ٹٹولا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی کمر کے گرد کوئی چیز لپٹی ہوئی ہے۔ لیکن وہ یقین سے نہ کہہ سکتا تھا۔ اور جمی نے وہ اودھم مچایا کہ دوسرے ملاحوں کو آگئے اور بل کو ڈانٹ دیا کہ لڑکے کو کیوں ستا رہا ہے۔

پورا ایک ہفتہ ہم نے اس رقم کی دستیابی کے لیے کوشش کی مگر ناکام رہے۔ بل نے کہا کہ یہ بڑے شک کی بات ہے کہ جمی پہلے کی نسبت اب اوپر زیادہ رہنے لگا ہے۔ اسے خیال ہوا کہ لڑکے نے وہیں کہیں رقم چھپائی ہوگی۔ اسی دوران جب کہ عملہ میں کمی ہوگئی تھی جمی کو بھی ملاحوں کی طرح کام پر لگا دیا گیا۔ اب صاف طور پر ظاہر ہونے لگا کہ وہ بل سے دور دور رہنے لگا ہے۔

آخر ایک روز ہم نے اسے پکڑ ہی لیا۔ بل نے اس کے گلے میں اپنا بازو حمائل کر دیا اور اسے الگ لے جا کر پوچھا کہ رقم کہاں ہے؟

”وہ تو میں نے سمندر میں پھینک دی۔“ وہ کہنے لگا۔ ”میں نے یہ بات پہلے بھی کہی تھی، تمھارا حافظہ کتنا خراب ہے بل۔“

بل نے اسے اٹھا کر بستر پر لٹا دیا، اور ہم نے اس کی پوری طرح تلاشی لی۔ اس کے بوٹ بھی اتار لیے اس کے جوتے پہنے پہنے ہم نے اس کے بستر کی دوبارہ تلاشی لی۔

”اب اگر تم قصوروار نہیں، تو چیختے کیوں نہیں“ بل نے پوچھا۔

”اس لیے کہ تم نے خود ہی کہا تھا کہ اس کے بارے میں کسی سے کچھ نہ کہنا۔“ لڑکے نے کہا ”پھر ایسا ہوا تو میں چیخوں گا ضرور۔“

”خیر یہ سب بیکار باتیں ہیں“ بل نے کہا ”تم ہمیں بتلادو کہ رقم کہاں ہے تو ہم تینوں برابر برابر تقسیم کرلیں گے۔ یعنی فی کس دو سو پونڈ۔ اور پھر ہم تم کو بتلائیں گے کہ تم اپنے نوٹ کہاں بُھنا سکو گے کہ پکڑے نہ جاؤ اور تم جانتے ہی ہو کہ ہم تم سے زیادہ ہوشیار اور سمجھ دار ہیں۔“

”ہاں میں جانتا ہوں“ لڑکے نے کہا ”لیکن مجھے جھوٹ

بولنے سے کیا فائدہ۔ میں نے رقم سمندر میں پھینک دی۔"

"بہت خوب" بل نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "تو میں کپتان سے یہ بات کہے دیتا ہوں۔"

"کہہ دو" لڑکے نے کہا۔ "مجھے کیا ڈر۔"

"تو پھر تمھاری تلاشی لی جائے گی۔ ساحل پر پہنچتے ہی" بل نے کہا "اور پھر تم کو جہاز پر نہ آنے دیا جائے گا۔ لالچ کی وجہ سے تم ساری رقم کھو دو گے۔ اگر تم ہم کو حصہ دیتے ہو تو تمھیں دو سو پاؤنڈ ملیں گے۔"

صاف معلوم ہو رہا تھا کہ لڑکے کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی تھی۔ اس نے بل کو برے برے نام دیئے اور مجھے بھی جو میں اب بھول گیا ہوں۔

"تم پھر سوچ لو۔" بل نے کہا "یاد رکھو۔ جہاز پر سے اترتے ہی پولیس تمھاری تلاشی لے گی" "اور وہ لوگ کوک کے گدگدی بھی کریں گے، شاید" جمی نے وحشیانہ انداز میں کہا "اور وہ رقم ان کے ہاتھ لگی تو تم کو جیل کی ہوا کھانی پڑے گی۔" بل نے کہا "اس کے تھپیڑ مارتے ہوئے "اور یہ ظاہر ہے تمھارے لیے برا ہے۔"

"جیل اچھی جگہ نہیں ہے بل؟" جمی نے اپنا کان کھجاتے ہوئے کہا۔ بل نے اس کو گھور کر دیکھا۔ اور پھر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

"میاں صاحب زادے اب تم کو نہیں سمجھاؤں گا۔ کپتان سے جاکر کہہ دیتا ہوں۔"

وہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ وہ عرشے پر قدم رکھنے ہی والا تھا کہ جمی نے اسے آواز دی۔ بل نے جیسے سنا ہی نہیں لڑکا دوڑ کر سیڑھی کے ذریعہ عرشہ پر پہنچ گیا اور اس کے پیچھے ہو لیا۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں نیچے آئے۔

"ہاں تو صاحب زادے تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہو" بل نے گردن اکڑاتے ہوئے کہا۔

"ہاں" لڑکے نے انگلیاں چٹخاتے ہوئے کہا۔ "تم اپنا یہ بندر کا سا منہ بند رکھو تو ہم رقم بانٹ لیں گے۔"

"اچھا جی" بل نے کہا "میں تو سمجھا تھا کہ تم نے رقم سمندر میں پھینک دی۔"

"میں یہی سمجھتا رہا تھا" جمی نے نرمی سے کہا "اور جب میں نچلے حصہ میں گیا تو یہ رقم مجھے اپنے پتلون کی جیب میں ملی۔"

"تو اب وہ کہاں ہے؟" بل نے پوچھا۔

"ہوگی کہیں بھی" لڑکے نے کہا "تم کو اس کا کیا فکر؟ اور اگر میں کہوں بھی کہاں ہے تو وہ تم کو ملنے سے رہی۔ خود مجھے بھی وہاں سے نکال لانے میں کافی دشواری ہوگی!"

"کہاں ہے؟" بل نے پوچھا "میں اس کی حفاظت کروں گا۔ مجھے تمھارا اعتبار نہیں۔"

"اور مجھے تمہارا اعتبار نہیں" جمی نے کہا۔

"اگر تم نے مجھے ابھی نہیں بتلایا" بل نے پھر سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کہا "تو میں ابھی جاکر کپتان سے کہہ دیتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ رقم ابھی میرے ہاتھ میں آجائے یا کم از کم میرے حصہ کی رقم۔ ابھی کیوں نہ تقسیم کر لیں ہم۔"

"اس لیے کہ وہ میرے پاس ہے نہیں" جمی نے پاؤں پٹکتے ہوئے کہا "اور یہ سب تمھاری حماقت کی وجہ سے ہوا۔ مجھے سونا سمجھ کر نہ تم میری تلاشی لیتے اور نہ میں اسے چھپاتا۔"

کہاں چھپایا؟" بل نے پوچھا

"سیکنڈ میٹ کی ٹرنک میں۔" جمی نے کہا "میں اس کمرہ کی صفائی کر رہا تھا۔ مجھے ٹرنک کے نچلے حصہ میں سوراخ نظر آیا۔ میں نے لوٹ اس میں رکھ کر ایک لکڑی سے نیچے سرکا دیا۔"

"تو پھر تم اسے نکالو گے کیسے؟" بل نے پوچھا سر کھجاتے ہوئے

"یہی تو میری سمجھ میں آ نہیں آرہا۔ کیوں کہ اب وہاں جانے کا کوئی موقع نہیں" جمی نے کہا "لندن پہنچنے پر ہم میں سے کسی ایک کو چھاپا مار کر اس ٹرنک کو اچک لینا چاہیے لیکن خیال رہے کہ میرے ساتھ چالبازی کی گئی تو میں خود بھانڈا پھوڑ دوں گا۔"

اسی اثناء میں کوک نیچے آیا تو ہم نے یہ گفتگو ختم کر دی میں دیکھ سکتا تھا کہ بل اس خیال سے باغ باغ ہو رہا تھا کہ رقم سمندر میں نہیں پھینکی گئی اور اسی خوشی میں اس نے بازیابی میں درپیش مشکل کو نظر انداز کر دیا تھا۔ بہرحال ایک

روز میں اسے اسی دشواری کا احساس ہو گیا جیسے مجھے اور جمی کو تھا اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کا اضطراب بھی بڑھتا گیا اور ہم دونوں کو جب بھی موقع ملتا اس بارے میں طرح طرح کے اندیشے ظاہر کرکے پریشان کیا کرتا تھا۔

سیکنڈ میٹ کا کمرہ جہاز کی چمنی کے عین اوپر تھا۔ اس لیے اس کمرہ میں چھپتے چھپاتے داخل ہونا اتنا ہی دشوار تھا جیسے کہ کسی کے منہ سے نقلی دانت اس کے علم اور اطلاع کے بغیر نکال لینا۔ ایک روز جمی اپنے چاقو کی تلاش میں اسی کمرے میں گیا مگر بل نے اسے فوراً ہی وہاں سے نکلتے دیکھا۔

ہماری سمجھ میں اس مسئلہ کا حل نہیں آرہا تھا۔ یہ سوچ سوچ کر ہمارا دل الٹ رہا تھا کہ سکنڈ میٹ جو عیال دار تھا اور جس کی جیب ہمیشہ خالی رہا کرتی تھی اب اسی تو شک پہ بسرام کر رہا تھا جس میں چھ سو پاؤنڈ کی کثیر رقم تھی۔ جب بھی ہم کو موقع ملتا ہم اس موضوع پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ اور بل اور جمی ایک دوسرے سے سیدھے منہ بات نہ کرتے تھے۔ جمی اس کا الزام بل کے سر رکھتا تھا اور بل جمی کے۔

"میری سمجھ میں تو ایک ہی بات آرہی ہے" جمی نے ایک روز کہا "کہ بل کو چمنی پر سے جاتے ہوئے کسی روز لو لگ جائے اور وہ وہاں سے سر کے بل گرے اس طرح کہ اسے وہاں سے اٹھالے جانا مناسب سمجھا جائے تو ایسی حالت میں اسے اس کمرہ میں رکھا جائے گا اور مجھے تیمارداری پر مقرر کیا جائے گا۔"

"خیال تو ٹھیک ہے بل" میں نے کہا۔

"اچھا جی" بل نے کہا "مجھے ایسے گھورتے ہوئے جیسے۔ ہڑپ ہی کرے گا" تو پھر تم ہی کیوں نہ ایسا کرو۔"

"میرا خیال تھا بل کہ تم ہی ایسا کرو" لڑکے نے کہا۔ "بہر حال کوئی ہو۔ کیوں نہ سکہ اچھال کر اس کا تصفیہ کر لیا جائے۔"

"دور ہو میرے سامنے سے" بل نے غصہ سے کہا "ورنہ میں بری طرح پیش آؤں گا۔ خونی کہیں کا۔"

"مجھے ایک تدبیر سوجھی ہے" لڑکے کے جانے کے بعد بل نے آہستہ سے مجھ سے کہا "اگر اور کوئی تدبیر مناسب سمجھ میں نہ آئے تو اسی پر عمل کروں گا مگر لڑکے کو اس کی ہوا نہ لگنے پائے۔"

کوئی اور تدبیر اس کے ذہن میں نہیں آئی۔ چنانچہ ایک روز جب کہ ہم آبنائے انگلستان عبور کر رہے تھے تو اس نے اس پر عمل کرنا شروع کیا۔ سیکنڈ میٹ کے عملہ میں اس کی باری تھی۔ چمنی پر سے جھک کر اس نے سیکنڈ میٹ کو آہستہ سے مخاطب کیا "جناب یہ میرا آخری سفر ہے"

"اچھا؟" سکنڈ میٹ نے کہا وہ سادہ طبیعت کا آدمی تھا اور ماتحتوں سے گفتگو میں مضائقہ نہیں سمجھتا تھا "کیسے؟"

"مجھے ساحل پر کام مل گیا ہے" بل نے کہا "میں آپ سے کچھ مہربانی کا طالب ہوں"

سیکنڈ میٹ ہوں ہاں کہتے ہوئے ٹہلنے لگا۔

"اس جہاز پر میرا وقت بہت اچھا گزرا ہے" بل نے کہا "سب کا یہی خیال ہے۔ کل رات ہم یہی بات کر رہے تھے سب کا خیال ہے کہ یہ سب آپ کی بدولت ہے۔ آپ کا ہم سب سے سلوک بہت اچھا رہا ہے۔"

سکنڈ کھنکارا۔ بل سمجھ گیا کہ مچھلی کانٹا نگل گئی ہے۔

"اسی لیے مجھے خیال ہوا" بل نے کہا "جب میں سمندر کی نوکری کو خدا حافظ کہوں تو آپ کی کوئی نشانی ساتھ لے جاؤں۔ چنانچہ مجھے آپ کی توشک کا خیال آیا اگر وہ آپ مجھے عنایت کر دیں تو میں زندگی بھر آپ کو یاد کیا کروں گا ممنونیت کے ساتھ۔"

"میری کیا؟" سکنڈ میٹ نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"آپ کی توشک" بل نے کہا۔ "میں اس کے معاوضے میں ایک پونڈ آپ کی نذر کردوں تو کچھ مضائقہ تو نہیں؟ میں کوئی ایسی چیز چاہتا ہوں جو آپ کے استعمال میں رہی ہو۔ مجھے یادگاریں جمع کرنے کا شوق ہے۔"

سیکنڈ میٹ نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے افسوس ہے بل" اس نے نرمی کے ساتھ کہا "میں اس معاملہ میں تو شک تو نہیں دے سکتا"

"تو جناب میں تیس شلنگ نذر کردوں گا" بل نے

عاجزی سے کہا:

"اس نوشک کے لیے میں نے کافی رقم خرچ کی ہے" میٹ نے کہا۔ "مجھے یاد نہیں کتنی مگر بہت زیادہ۔ تمھیں نہیں معلوم وہ کتنی قیمتی ہے۔"

"ہاں جناب میں جانتا ہوں، بہت اچھی نوشک ہے۔" "ورنہ آپ اسے استعمال میں نہ رکھتے۔ تو جناب: دو پونڈ ہی سہی نذر کے طور پر قبول کر لیجیے۔"

سیکنڈ میٹ پھر بھی آنا کانی کرتا رہا۔ لیکن بل نذرانہ بڑھانا نہیں چاہتا تھا کیوں کہ جمی سے اسے معلوم ہوا تھا کہ اس کی قیمت اٹھارہ پنس سے زیادہ نہیں تھی۔

"میں اس نوشک پر برسوں سے سوتا آیا ہوں۔" سیکنڈ میٹ نے اسے چور نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "خیر اسی معاوضہ میں تمھیں دے دوں گا مگر صرف اسی وقت جب کہ ہم سب ساحل پر اترنے والے ہوں۔"

"شکریہ جناب" بل نے کہا، خوشی سے پھولوں نہ سماتے ہوئے۔ "اور میں یہ رقم آپ کو تقسیم کے موقع پر گزران دوں گا میں زندگی بھر اسے اپنے سے جدا نہیں کروں گا۔ یہ آپ کی مہربانی کی یادگار رہے گی۔"

"اور ہاں یہ خیال رہے کہ یہ بات کسی اور کو نہ معلوم ہونے پائے۔" سیکنڈ میٹ نے کہا: جو نہیں چاہتا تھا کہ یہ معاملہ کپتان کے کانوں تک پہنچے "کیوں کہ میں نہیں چاہتا کہ دوسرے بھی میری اور چیزیں یادگار کے طور پر مانگنے لگیں"

بل نے مستعدی سے وعدہ کر لیا اور جب اس نے مجھے یہ بات سنائی تو خوشی کے مارے جیسے ناچ رہا تھا۔

"اور خیال رہے" بل نے کہا۔ "میں نے یہ توشک خریدی ہے جیسی ہے اسی حالت میں۔ اس کا جمی سے کوئی تعلق نہیں ہے ہم دونوں ایک ایک پونڈ دیں گے اور جو اس میں ہے وہ لے لیں گے۔"

اس نے مجھے تو اس بات پر آمادہ کر لیا مگر لڑکا مجھ پر ایسے نظریں لگائے رہا جیسے بلی چڑیا کو تاکتی رہتی ہے۔ میں سمجھ گیا

کہ اس کی نظر سے بچا لینا فولاد کے چنے چبانا ہے۔ وہ مجھ سے بھی زیادہ بل سے مشتبہ تھا اور وہ ہم سے روز پوچھتا رہتا تھا کہ ہم کیا کرنے جا رہے ہیں۔

آبنائے انگلستان میں ہمیں چار روز تک طوفان سے لڑنا پڑا۔ پھر ایک بڑے جہاز نے ہم کو لندن تک پہنچا دیا۔

یہ آخری موقع بڑے معرکہ کا تھا۔ سب سے پہلے تو ہمیں توشک حاصل کرنی تھی اور دوسرے کسی حیلے جمی سے پیچھا چھڑانا۔ میں چاہتا تھا میں جمی کو ساحل پر لے جاؤں اور وہاں اس سے کہوں کہ بل ہم سے بعد میں آن ملے گا۔ اور پھر میں کسی طرح بھیڑ میں اس سے الگ ہو جاؤں لیکن میں نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ جب تک میں اپنا حصہ نہ لے لوں اس وقت تک بل کے امانت شعار چہرہ سے نظریں ہٹانے کے لیے آمادہ نہیں۔

اس کے علاوہ جمی کا راضی ہونا بھی مشکل تھا۔ وہ آبنائے قطع ہونے تک بل کا دنبالہ بنا رہا، اور بار بار پوچھتا تھا کہ کیا کرنے جا رہے ہو۔ اس کی بسورتی صورت دیکھ کر بل کو یہ خدشہ پیدا ہو گیا مبادا دوسروں کو اس کی خبر ہو جائے۔

خیر خدا خدا کر کے ہمارا جہاز ساحل سے جا لگا۔ لنگر ڈالنے کے بعد ہم لوگ نچلے حصہ میں آ گئے کہ منہ ہاتھ دھو کر ساحل پر جانے کے لیے لباس بدل لیں۔ جمی اس دوران ہمیں تاکتا رہا۔ پھر وہ بل کے پاس اپنے ناخن کترتا آیا اور کہنے لگا۔

"اب کیا کیا جائے بل؟"

"دوسروں کے جانے کے بعد بھی جہاز پر رہو اور قسمت پر تکیہ کرو۔" بل نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا: "اجرت کی رقم ملنے کے بعد دیکھیں گے کہ صورت حال کیا ہے۔"

ساحل پر جانے کے لیے فی کس دس دس شلنگ لینے کے لیے ہم سب نچلے حصہ میں جمع ہوئے۔ بل اور میں نے اپنی اجرتیں سب سے پہلے حاصل کر لیں اور پھر سیکنڈ میٹ جس نے بل کو اشارہ کر رکھا تھا ہمارے ساتھ باہر آیا جیسے بالکل بے تعلق ہے اور ایک تھیلے میں توشک بل کے حوالہ کی۔

"لو بھئی یہ تمھاری امانت" اس نے کہا۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ جناب" بل نے کہا لرزتے ہاتھوں سے توشک لیتے ہوئے۔ وہ جمی کے آنے سے پہلے ہی کھسک جانا چاہتا تھا۔

لیکن سیکنڈ میٹ ___ احمق کہیں کا ___ ہمیں باتوں میں الجھا لیا۔ دو مرتبہ بل چلنے ہی کو تھا مگر دونوں بار میٹ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے روک لیا اور کہنے لگا کہ اس نے کس طرح اپنے ماتحتوں میں ہر دلعزیزی حاصل کی اور کیسے اس میں کامیاب ہوا اور اسی اثنا میں جمی وہاں آ پہنچا۔

تھیلے کو دیکھ کر جمی چونک گیا اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ جب ہم چلنے لگے تو اس نے بل کے بازو سے اپنا بازو ملا لیا اور اس کو کھری کھری سنائی۔

"تم بلی کا دودھ چرانے سے بھی دریغ نہیں کروگے۔" اس نے کہا۔ "مگر یاد رکھنا تم اس جہاز سے باہر قدم نہ رکھ سکوگے جب تک مجھے میرا حصہ نہ دے دیتے۔"

"جمی! ارے بھئی میں تو تمھیں خوشگوار طور پر حیران کرنا چاہتا تھا۔" بل نے کہا' مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے۔

"میرے لیے تم اس قدر تکلف نہ کرو' بل" لڑکے نے کہا۔ "تم اس توشک کو کہاں کھولنا چاہتے ہو"

میں اسے اپنے پلنگ پر کھولنا چاہتا تھا۔" بل نے کہا "گودی پر سے اسے ایسے ہی لے جائیں گے تو پولیس اسے کھول کر دیکھے گی۔ اچھا آؤ۔"

"نہیں یہیں ٹھیک ہے" جمی نے کہا' اس کی طرف دیکھ کر سر ہلاتے ہوئے "میں یہیں اوپر ہی رہوں گا۔ تمہارے ساتھ نیچے آؤں گا تو ممکن ہے تم اپنے آپ کو بھول جاؤ۔ تم میرا حصہ یہیں اوپر اچھال دو۔ پھر مجھ سے پہلے تم جہاز سے جا سکتے ہو۔ سمجھ گئے نا؟"

"جہنم میں جاؤ" بل نے کہا اور یہ دیکھ کر کہ آخری موقع ہاتھ سے نکل گیا ہم دونوں نیچے گئے اور بل نے توشک پلنگ پر پھینک دیا۔ یہاں صرف ایک شخص رہ گیا تھا۔ وہ کوئی دس منٹ تک اپنے بال سنوارتا رہا اور پھر اس کے بعد وہ بھی چلا گیا۔

دو منٹ بعد بل نے توشک ادھیڑ ڈالی اور روئی میں تلاش شروع کی اور میں دیا سلائی جلا جلا کر اسے روشنی پہنچاتا رہا۔ توشک کچھ بڑی نہ تھی۔ مگر رقم کا کہیں پتہ نہ تھا بل بار بار روئی کی تہوں کو کھول کھول کر دیکھتا رہا۔ پھر وہ اٹھ کر کھڑا ہو کر میری صورت دیکھنے لگا۔ وہ زور زور سے ہانپ رہا تھا۔

"کیا میٹ کو رقم مل گئی۔ تمہارا کیا خیال ہے؟" اس نے پوچھا بیٹھی ہوئی آواز میں۔

ہم لوگوں نے پھر تہوں کو ادھیڑا پھر بل نے سیڑھی پر چڑھ کر جمی کو آہستہ آہستہ آواز دی' تین بار اور پھر جیسے اس کا دل بیٹھ گیا' وہ غش پڑ گیا۔ میں اس کے عقب ہی میں تھا۔ لڑکے کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ہم نے صرف یہ دیکھا کہ بلی بیٹھی اپنا منہ صاف کر رہی تھی اور کپتان جہاز کے مالک سے گفتگو کر رہا تھا۔

وہ لڑکا پھر ہم کو کہیں دکھائی نہ دیا۔ نہ وہ سامان لینے آیا اور نہ اپنی تنخواہ لینے۔ تقسیم کے موقع پر ہر شخص موجود تھا۔ میں تنخواہ لے کر نکلا تو بل کو ایک دیوار سے ٹیک لگائے سیکنڈ میٹ پر نظریں گاڑے دیکھا' جو اس کی طرف شفقت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا کہ رات کیسی نیند آئی۔ بل کو میں نے آخری بار دیکھا تو بے چارہ اپنی پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے مسکرانے کی زبردستی کوشش کر رہا تھا۔

زبان اور قواعد
زبان کی ساخت' اس کے تشکیلی ضابطوں اور ارتقائی مرحلوں پر
رشید حسن خاں
کے عالمانہ مضامین
۱۲ روپے
نیشنل اکاڈمی سے طلب کریں

تبصرے

اُردو شاعری میں جدیدیت کی روایت

مصنف : ڈاکٹر عنوان چشتی

قیمت : ۲۰ روپے ڈی لکس ایڈیشن ۴۰ روپے

ملنے کا پتا : نیشنل اکاڈمی ۹ انصاری مارکیٹ ، نئی دلی

انتہا پسندی کے جذبے کو ذہن سے الگ کیے بغیر فن کی پرکھ کا دعویٰ بے سود سا لگتا ہے لیکن عام طور پر ہوتا یہی ہے کہ جب کوئی قلم کار آگے بڑھتا ہے تو وہ انتہا پسندی سے فیصلے کرتا ہے اور جن امکانات کی تلاش میں نکلتا ہے وہ انتہا پسندی کے اندھیرے میں چھپ جاتے ہیں ۔

ڈاکٹر عنوان چشتی نے اپنی تازہ تصنیف "اُردو شاعری میں جدیدیت کی روایت" میں جس رویے کو اپنایا ہے وہ معقول اور معتدل رویّہ ہے۔ انھوں نے شعر و ادب کی ان تمام اقدار کو جن کا تعلق سماجی، تاریخی اور اخلاقی پہلوؤں سے ہے ، فنی ، عروضی ، تکنیکی اور تجزیاتی آگہی کے ساتھ پرکھنے کی کوشش کی ہے ۔ قدیم و جدید کی اس روایتی بحث کو انھوں نے پوری طرح نظر انداز کر دیا ہے جو انتہا پسندی کے جذبے کو اُبھار کر غلط فیصلوں کو مروّج کرتی ہیں ۔

ڈاکٹر عنوان چشتی غیر ضروری بحث میں اُلجھنے کی جگہ "جدیدیت" کی زندہ صورتوں اور حقیقتوں کو سامنے لاتے ہیں ۔ نیز ان کی فنی ، تکنیکی اور عروضی جہتوں کو نمایاں کرتے ہیں ۔ شاعری ایک جمالیاتی عمل ہے ۔ ڈاکٹر عنوان چشتی نے شعری جمالیات کی روشنی میں جدیدیت کا تجزیہ کیا ہے ۔ انھوں نے لکھا ہے کہ :

"فن کی طرح روایت بھی ایک نامیاتی حقیقت ہے۔ جس کی دو سطحیں ہیں ایک شعری جمالیات کی اور دوسری فکری و جذباتی معنویت کی سطح ۔ شعری جمالیات کے دائرے میں زبان ، زبان کی مختلف شکلیں (مفرد اور مرکب الفاظ تراکیب ، استعارہ ، پیکر ، علامت ، اسطور ، تلمیح اور تمثیلی اشارے وغیرہ) اسلوب ، تکنیک ، بنت اور ہیئت تو شامل ہے ہی۔ اس میں تخلیقی عمل کے وہ تمام پُر اسرار گوشے ، داخلی و خارجی رشتے اور حسن و آرائش کے تمام ذریعے شامل ہیں جن سے فن میں جمالیاتی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور معنویت کو لباسِ جمال حاصل ہوتا ہے ۔ فکری معنویت کے دائرے میں افکار و اقدار نیز جذبہ و خیال کی ہر جہت اور ہر رنگ شامل ہے ۔"

ڈاکٹر عنوان چشتی نے اسی نقطۂ نظر سے جدید اُردو شاعری کا تجزیہ کیا ہے ۔ انھوں نے اگرچہ شعری جمالیات کو غور و فکر کا محور بنایا ہے لیکن معنویت کو بھی فراموش نہیں کیا ہے ۔

"اُردو شاعری میں جدیدیت کی روایت" میں آٹھ ابواب ہیں ۔ پہلا باب "جدیدیت : روایت کا تخلیقی اظہار" ہے ۔ جس میں انھوں نے "جدیدیت" کی نظریاتی بنیاد سے بحث کی ہے ۔ دوسرا باب "قدیم شاعری : روایت اور تجربے کی نوعیت" ہے ۔ جس میں انھوں نے ۱۸۵۷ء سے قبل کی شاعری کا تجزیہ کر کے ان تجربوں کی نشاندہی کی ہے جو جدید اُردو شاعری میں بہت نمایاں ہیں ۔ یہ باب تحقیقی نوعیت کا ہے ۔ اس کے بعد پانچ باب جدیدیت کے تجزیے سے متعلق ہیں ۔ جن میں ایک "جدید اُردو گیت : تشکیل سے تکمیل تک" ہے جس میں جدید اردو گیت کی ہیئت کا تعین کرنے کے ساتھ ساتھ جدید گیت کا روپ

کے گیتوں کا تجزیہ کرکے گیت کی تکنیک، اسلوب زبان اور خصوصیات کی نشاندہی کی ہے۔ اس باب میں انھوں نے ہندی گیت اور لوک گیت کے تقابلی مطالعہ سے بعض اہم نتیجے نکالے ہیں ”جدید اردو نظم وضاحت سے رمزیت تک“ میں ڈاکٹر عنوان چشتی نے نظم کے اسلوب اور پیرایۂ بیان کے ارتقائی سفر سے بحث کی ہے اور واضح کیا ہے کہ جدید نظم کو جو خصوصیت قدیم نظم یا اپنی پیش رو نظم سے ممتاز کرتی ہے وہ اس کا رمزیہ انداز ہے۔ جدید اردو غزل پر دو ابواب ہیں۔ ایک ”جدید اردو غزل لسانی تجربے سے تخلیقی حرکیت تک“ اور دوسرا ”جدید اردو غزل: عروضی تجربے“ ان ابواب میں غزل کی زبان اور بیان کے ساتھ عروضی تجربوں سے بحث کی گئی ہے۔ ڈاکٹر عنوان چشتی نے تجزیاتی تنقید کے اصولوں کی روشنی میں پہلی بار ان ہندی چھندوں کی نشاندہی کی ہے جو اردو غزل میں برتے جا رہے ہیں۔ لیکن قدیم عروض میں جن کا کوئی نام نہیں ہے۔ اسی طرح انھوں نے جدید اردو غزل میں استعارہ سازی پیکر تراشی اور علامت نگاری کا تجزیہ کیا ہے۔ آخری باب ”نثری نظم“ پر ہے۔ جس میں انھوں نے اردو شاعری کے مخصوص آہنگ کی تاریخ بیان کرتے ہوئے بعض ایسی تجاویز پیش کی ہیں جو ”نثری نظم“ کے لیے ان کی نظر میں ناگزیر ہیں۔ آخر میں خلاصۂ بحث اور اشاریہ ہے۔

——— عزیز اندوری

دھوپ کی سرحد

شاعر: اسعد بدایونی۔ ناشر: روشن پبلیکیشنز۔ روشن محل سوتھ، بدایوں۔ قیمت: تین روپے۔

پچھلے دو تین برس میں جن نوجوان شاعروں نے شاعری کے سنجیدہ قارئین کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے، ان میں اسعد بدایونی کا نام نمایاں ہے۔ وہ غزل کہتے ہیں اور غزل ایسی صنفِ سخن ہے جس میں اپنی آواز کی الگ پہچان کرانا آسان نہیں۔ اسعد بدایونی کی فکر میں ندرت ہے اور اپنے اظہار میں بھی وہ تازہ کار نظر آتے ہیں مگر کم عمری کے باوجود ان کے ہاں تجربات کا تنوع ملتا ہے لیکن شاید مشق کی کمی کے باعث کہیں کہیں ان تجربات کا اظہار پُر اثر نہیں ہو سکا ہے۔ مثلاً یہ دو شعر دیکھیے:

کب تلک جیتے وصالوں کی تمناؤں میں لوگ
زندگی سے ایک دن بیزار ہونا تھا، ہوئے

اوروں کا ذکر زور کے لہجے میں تھا مگر
میری ہی بات صرف وہاں زیرِ لب چلی

دونوں شعر اچھے ہیں مگر دونوں کے پہلے مصرعوں میں خط کشیدہ الفاظ تاثر کو کمزور کر رہے ہیں۔ جہاں ایسا نہیں ہے، شعر زیادہ اثر انگیز ہیں۔

غزلوں کا یہ مجموعہ اب بھی پُرکشش ہے لیکن کچھ تاخیر سے شائع ہوتا تو شاید اور بہتر ہوتا۔

——— مخمور سعیدی

گستاخی معاف

مصنف: ایم اے حنان، ناشر: زندہ دلان حیدرآباد ۲۷۔ حجرہ درگاہ معظم جاہی مارکیٹ۔ حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۰۱

گفتگو کے لیے مزاح کا پیرایہ بہت مشکل ہے۔ ایم۔ اے حنان صاحب نے زندگی کے ناقابلِ انکار حقائق میں مزاح کے جو پہلو تلاش کیے ہیں اور انھیں پیش کرنے میں جس ادبی چابکدستی کا ثبوت دیا ہے وہ قابلِ قدر ہے۔ زبان و بیان اگرچہ مزید مشق کا تقاضہ کرتے ہیں۔

حنان صاحب نے اپنے مضامین میں مزاح کے ایسے گوشے پیدا کیے ہیں کہ ان میں حقیقت کے خوبصورت اظہار کے ساتھ زیرِ لب تبسم سے خوشگوار قہقہوں تک کی تمام منزلیں پائی جاتی ہیں۔ رہتے ہیں جس گلی میں ——— نیند کیوں رات بھر نہیں آتی ——— الیکشن یا درہم ——— بے کار مباش کچھ کیا کر ——— وغیرہ اچھے مضامین ہیں ——— کتابت گوارہ ہے لیکن کاتب کی غلط نویسی کی علت سے نہیں بچ سکی ہے۔ گیٹ اپ خوبصورت ہے۔ گرانی کے اس دور میں اس کی قیمت چھ روپے کچھ زیادہ نہیں۔

——— باذل عباسی

رات کے ہزار ہاتھ

مصنف : سید علی ظہیر ، پبلشر : اردو اکیڈمی آندھرا پردیش حیدرآباد
صفحات : ۵۴ ، قیمت : ۱۵ روپیہ ۔

"رات کے ہزار ہاتھ" سید علی ظہیر صاحب کا پہلا شعری مجموعہ ہے ۔ جس میں تقریباً سب کی سب نظمیں ہیں ۔ اور ان میں سے آدھی بلا کسی عنوان یا پھر صرف نظم کے نام سے ہیں ۔

سید علی ظہیر کی نظموں میں تازگی ، اور شعر کے موضوعات میں رنگا رنگی کی کمی نظر آتی ہے ۔ دوسری بات یہ کہ ان کی شاعری میں تجربے کو عام ، غیر مختص اور تقریباً نثری زبان میں بیان کرنے کا انداز پایا جاتا ہے ۔ مثلاً "رات کے ہزار ہاتھ" ، "یہ سورج ہی شکستی ہے" ، "دعا" ، "منظر" ، "میں تمہاری آنکھ کی پتلی میں رہتا تھا" ، "کبھی" ، "شام" اور تقریباً آدھ درجن بلا عنوان کی نظمیں بھی اس زمرے میں شامل ہیں ۔

دیباچہ میں ڈاکٹر حسن عسکری نے سید علی ظہیر کی شاعری کے لیے ٹیکنک اور نظریات و عقائد کا جو اعلان کیا ہے اس کی جڑیں ان کی شاعری میں بہت ہلکی نظر آتی ہیں کاش جو چیز سید علی ظہیر کے لیے "بے معنی عمل" ہے (مشق سخن کے طور پر سیکڑوں نظمیں لکھنا اور پھر ان کا سخت نقاد بن کر انتخاب کرنا میرے نزدیک بے معنی عمل ہے ۔ "پیش لفظ") وہ اس پر عمل کرتے تو ان کی شاعری بہت اوپر اٹھ سکتی تھی ۔ ۔ ۔

اقبال مسعود ——————

جاگتی آنکھوں کا خواب

مصنف : نازاں جمشید پوری ۔ ناشر : پسندیدہ معنوتی لہر تحصیل پورہ ، امرتسر ، سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ ، صفحات : ۸۰ ، قیمت : پانچ روپے ۔

یہ ایک نوجوان شاعر نازاں جمشید پوری کی نثری شاعری کا مجموعہ ہے ۔ جیسا کہ انھوں نے "کچھ اپنے بارے میں" بتاتے ہوئے لکھا ہے ، نازاں صاحب آٹھ نو برس سے لکھ رہے ہیں ۔ نثری شاعری کرنے کے ساتھ وہ غزلیں بھی کہتے رہے ہیں اور این ۔ ایم ۔ انصاری کے نام سے انھوں نے افسانے بھی لکھے ہیں ۔ مختصر پیش لفظ میں جو ایک صفحے پر مشتمل ہے جناب رام سرن آخر نے نازاں صاحب کی شاعری کے بارے میں ان تاثرات کا اظہار کیا ہے :

"روایتی شاعری سے قطع نظر انھوں نے تجرباتی شاعری میں طبع آزمائی کی ہے ۔ ان کا کلام ، تخیل کی پیداوار نہیں بلکہ ہمارے ماحول کی جانی پہچانی لطیف خوشبو ہے جس کا احساس ہمیں اس وقت ہوتا ہے جب ہم نوجوان شاعری کی تجربی نظموں کی آواز سنتے ہیں ۔"

آخر صاحب کا یہ کہنا صحیح ہے کہ نازاں صاحب نے تخیل سے زیادہ مشاہدے سے کام لیا ہے لیکن ان کی شاعری کو تجربی کہنا درست نہیں معلوم ہوتا ۔ نازاں صاحب کا انداز بیان بہت سادہ اور عام فہم ہے اور ان کے مشاہدات بھی سامنے کے ہیں ۔

—————— رزاق ارشد

ماہنامہ ذکری رامپور کا عظیم الشان سالنامہ

پسندیدہ نگارش نمبر

★ —— ترتیب : محمد یوسف اصلاحی

انشاء اللہ مارچ ۷۸ء کے آخر میں منظر عام پر آرہا ہے

ممتاز اہل قلم کی پسندیدہ نگارشات کا ایک دلآویز مجموعہ

سالانہ زر تعاون : ۲۵/- سالانہ خریداروں کو یہ نمبر اسی زر تعاون میں پیش کیا جائے گا ۔ البتہ خاص نمبر رجسٹرڈ ہی بھیجا جائے گا اس لیے رجسٹری فیس ۲/- بھی ارسال کریں ۔

آج ہی اپنے مقامی ایجنٹ کے یہاں اپنی کاپی محفوظ کرائیں یا براہ راست ہمیں لکھیں ۔

پتہ : ادارہ ذکری رامپور ۲۴۴۹۰۱ (یو پی)

ہریانہ کی کامیابیوں کی شاندار رزمیہ داستان

پچھلے تقریباً چھ مہینوں میں جنتا سرکار کی طرف سے چلائے جا رہے سماجی اور اقتصادی پروگرام سے عوام میں امید و اعتماد کا ایک نیا جذبہ جاگا ہے۔ مندرجہ ذیل اعداد و شمار اس امر کی گواہی دیتے ہیں کہ ترقیاتی کاموں نے ایک نئی سمت اختیار کی ہے۔

زراعت

خوردنی اجناس کی پیداوار کا نشانہ 57 لاکھ ٹن مقرر کیا گیا ہے۔ زرعی خدمات کی توسیع، اور فصل تحفظ کاموں سے دو نئی سکیمیں شروع کی جا رہی ہیں۔ کسانوں کو زرعی خدمات سے متعلق امداد باہمی سوسائٹیوں کی وساطت سے فصل ربیع کے لیے 46،50 لاکھ روپے کے قرضہ جات دیے جائیں گے۔ مزید برآں زرعی اصلاحات، ٹیوب ویل لگانے اور ٹریکٹر وغیرہ خریدنے کے لیے بینکوں کے ذریعے برس 1977-78 میں 1700.28 لاکھ روپے کے قرضہ جات دیے جائیں گے۔ گذشتہ 9 مہینوں میں 11,000 ایکڑ رقبہ کا زرعی سدھار ہوا جو ایک نیا ریکارڈ ہے۔

آبپاشی

آبپاشی کی سہولیات میں توسیع لانے کی غرض سے آئندہ سال ایک نئی پانسالہ سکیم شروع کی جا رہی ہے۔ پانی کے وسائل کو رواں کرنے کے لیے کیے گئے اقدامات سے مزید 35,000 ہیکٹر رقبہ کو آبپاشی سہولیات مہیا ہوں گی۔ جس کے نتیجے کے طور پر 20 کروڑ روپے کی مالیت کی سالانہ فصل میں اضافہ ہوگا۔

چھوٹی آبپاشی

چھوٹی آبپاشی کے زیر آبپاشی 12.50 لاکھ ہیکٹر رقبہ بڑھ کر 13.13 لاکھ ہیکٹر ہو جائے گا۔

بجلی

گذشتہ چھ مہینوں میں بجلی کی یومیہ سپلائی 65 لاکھ یونٹ سے بڑھ کر 75 لاکھ یونٹ ہو گئی ہے۔ بجلی سپلائی میں زراعت کو ترجیح دی گئی ہے۔ اس وقت بجلی سے چلنے والے ٹیوب ویلوں کی تعداد 1,64,000 ہے اور چالو مالی سال میں 18000 نئے ٹیوب ویلوں کو بجلی مہیا کی جائے گی۔ بجلی کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے نئے تھرمل پلانٹوں کی تعمیر کا کام تیزی سے عمل میں آ رہا ہے۔

صنعتیں

دیہی، گھریلو اور چھوٹی صنعتوں کے قیام کے لیے نئی سکیمیں جاری کی گئی ہیں جن سے 79-1978ء میں 47,000 بے روزگاروں کو روزگار فراہم کرائے جانے کی توقع ہے۔

پینے کے پانی کی بہم رسانی

چالو مالی سال کے آخر تک 116 نئے گاؤں میں پینے کے پانی کی سپلائی کی جائے گی جو کہ اس قلیل مدت میں ایک نیا ریکارڈ ہے۔ مارچ 1978ء کے آخر تک اس اسکیم سے فیض یاب ہونے والے گاؤں کی تعداد 1046 تک پہنچ جائے گی۔

سڑکیں

مالی سال رواں کے دوران 210 گاؤں پکی سڑکوں سے ملائے جائیں گے۔ ریاست میں 5310 دیہاتوں کو پکی سڑکوں سے ملایا جا چکا ہے۔

سیلاب کی روک تھام

78-1977 میں سیلاب کی روک تھام اور نالوں کے کام پر 1.95 کروڑ روپے کی بجائے 10.45 کروڑ روپے خرچ ہوئے۔ ریاست آئندہ پانچ برسوں میں باڑھ کی آفت سے پوری طرح نجات پا جائے گی۔

جاری کردہ
محکمہ تعلقاتِ عامہ
ہریانہ

خبرنامہ

● ڈاکٹر امیر اللہ خاں شاہین صدر شعبۂ اُردو میرٹھ یونیورسٹی میرٹھ کی چوتھی کتاب "اُردو اسالیب نثر" کا اجرا، میرٹھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر بی۔ ایس۔ ماتھر کے ہاتھوں ۴ جنوری کو ۳ بجے میرٹھ کالج کے اولڈ ہال میں ہوا۔

پروفیسر ماتھر نے اس کتاب کو ایک کارنامہ قرار دیتے ہوئے بیکن، بٹلر، کارڈنل نیومن، موڈ نے اور ورڈس ورتھ کے حوالے سے اس کتاب کی قدر و قیمت کے تعین پر زور دیا۔ ہمیر پور گورنمنٹ کالج کے پرنسپل اُردو کے کہنہ مشق ادیب جناب محمد مشتاق شارق نے ڈاکٹر شاہین کی ادبی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی چاروں تصنیفات کا دل پذیر انداز میں تعارف کرایا اور کہا کہ "صاحب موصوف کی یہ کتاب نہ صرف اپنے موضوع پر محیط ہے اور اسلوبیات میں اہم اضافہ ہے بلکہ جس اسلوب میں پیش کی گئی ہے وہ مصنف کو صاحبِ طرز ادیب ٹھہراتا ہے۔"

اس تقریب کے مہمانِ خصوصی پروفیسر محمد حسن راستے میں کار خراب ہونے کے سبب شرکت نہ کر سکے مگر ان کی عدم موجودگی میں ان کا پیغام جلسہ گاہ میں سنایا گیا۔ ڈاکٹر قمر رئیس، صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی دہلی نے اس تقریب کی صدارت کی۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے ڈاکٹر شاہین کی علمی لگن کو سراہتے ہوئے بتایا کہ "ڈاکٹر شاہین نے کس طرح سالار جنگ میوزیم حیدرآباد، خدابخش لائبریری پٹنہ نیز علی گڑھ، رام پور اور دہلی کی لائبریری سے اپنے مفیدِ مطلب اجزا چن کر اس ہار میں گوندھے ہیں جس کا نام اُردو اسالیب نثر ہے۔"

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی۔ سابق صدر شعبۂ اُردو دہلی یونیورسٹی کے اظہارِ خیال کے بعد ڈاکٹر شریف احمد ریڈر دہلی یونیورسٹی دہلی نے ڈاکٹر شاہین کا ایک لفظی خاکہ پیش کیا۔ میرٹھ کالج میرٹھ کے شعبۂ ہندی کے صدر ڈاکٹر رام پرکاش اگروال نے ہندی ادب کے حوالوں سے ڈاکٹر شاہین کی اس کتاب کو پرکھنے کی کوشش کی۔ میرٹھ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر رام کمار نے اپنی دوسری اہم مصروفیات کو چھوڑ کر کچھ وقت دیا اور اپنی تقریر میں ڈاکٹر شاہین کو مزید الفاظ میں مبارکباد پیش کر کے رخصت چاہی۔ ڈاکٹر انجم جمالی نے "شاہین بلند پرواز" کے عنوان سے اپنا مقالہ پڑھا جو اردو اسالیب نثر کا تفصیلی جائزہ تھا۔ پروفیسر خالد حسین خاں نے اپنے مقالے "دام ہم رنگ زمیں برائے شاہیں" میں ڈاکٹر شاہین کی رفاقت و محبت کی تصویر کھینچی اور کتاب کی ایک ایک خوبی کا اشاروں میں بیان کیا۔

سب سے آخر میں ڈاکٹر بشیر بدر کی فرمائش پر ڈاکٹر شاہین نے تقریر کی۔ انھوں نے اردو کی اہمیت اور ہندوستان میں اس کے مستقبل پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ آردو کا مستقبل اگر کہیں ہے تو وہ ہندوستان میں ہے اس لیے کہ مائیں اسی خطے میں اپنے بچوں کو اسی زبان میں لوریاں سناتی ہیں اس کو کاروباری طبقہ اس لیے اپنائے ہوئے ہے کیونکہ اس کی جڑیں عوام میں ہیں اس لیے چاہے حکومت اس سے کتنا ہی تغافل برتے اُردو کو کوئی مٹا نہیں سکتا۔ آگے چل کر ڈاکٹر شاہین نے

کہا کہ تحقیقی کاموں میں محنت اور جاں کاہی کوئی نئی بات نہیں۔ "میں نے اس کام کے ذریعہ جو کچھ سیکھا ہے وہ یہ ہے کہ جس نے لفظوں کی قدر کی ہے اس کی قدر کی گئی ہے نثر شاعری سے کسی طرح ہیٹی یا کم رتبہ نہیں بلکہ کئی ایسے مقام آتے ہیں جہاں شاعری کا قافیہ تنگ ہو جاتا ہے مگر نثر نگار ہر کیفیت اور ہر جذبے کو بے کم و کاست پیش کر دیتا ہے۔ رہی شاعری میں اثر انگیزی تو سماوِرے سے جو خالص نثر کی چیز ہیں وہ اشعار اور مصرعوں سے بھی زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔"

تقریب ڈاکٹر بشیر بدر کے انتظام و انصرام میں ہوئی۔ انھوں نے ہی اس تقریب کی نظامت کے فرائض انجام دیے۔ شروع میں انھوں نے ہی اس کتاب اور ڈاکٹر شاہین کا تعارف کرایا۔ پہلی کاپی موہن میکنز کے لیزن آفیسر جناب دیپ قمر (مسٹر ایچ ایل مہتا) نے مبلغ ۱۰۱ روپے میں خرید فرمائی۔ جلسہ چار گھنٹے جاری رہا۔ آخر میں اردو ایسوسی ایشن کے سکریٹری فاروق بخشی کے شکریے کے ساتھ جلسے کی برخاستگی کا اعلان کیا گیا۔

مرسلہ: محمد فاروق بخشی متعلم۔ ایم۔اے اردو میرٹھ کالج میرٹھ

لال قلعے کا مشاعرہ (بقیہ صفحہ ۹)

اس قسم کے آثار موجود ہیں کہ کچھ لوگ گلی کی سیاست کو پھر سے واپس لانا چاہتے ہیں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ اس طرف صدر جمہوریہ نے قوم کے نام اپنے پیغام میں اشارہ بھی کیا ہے اور واضح طور پر کہا ہے کہ آمادۂ شر چند افراد کو گڑبڑ کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ ضرورت اس کی ہے کہ اس پر عمل بھی ہو۔ آزادی کا مطلب یہ ہے کہ آدمی دوسروں کی آزادی کا بھی احترام کرے، یہ نہیں کہ اکثریت کو اپنی بات کہنے سننے کے حق سے محروم کرنے کے لیے، ایک مختصر سی فسادی ٹولی جب چاہے ہڑبونگ کا سہارا لے سکے۔

...... شیطل تینوں لوگوں کو ناپ سکتا ہے۔
رؤف اپنے شارٹ کٹ سے ہوکر گزر جاتا ہے۔
لیکن وہ کیا کریں جن کے راستے مسدود ہو چکے ہوں ——— ؟

رضوان احمد
کے افسانوں کا مجموعہ
مسدود راہوں کے مسافر

ان افسانوں میں کرب و کسک بھی ہے اور عصری آگہی بھی ———
خوبصورت کتابت و طباعت، خوشنما سرورق
اور گلیزڈ کاغذ ——— صفحات ۱۲۸
قیمت۔ دس روپے (بارہ روپے مع محصول ڈاک)
آج ہی ہم سے طلب کریں
زیور پبلی کیشنز۔ باقر گنج۔ پٹنہ ۸۰۰۰۰۴

حیات لکھنوی کی پہلی شعری پیشکش
حصارِ آب
غزلیں جن میں روایت کا حسن بھی ہے اور اپنے عہد کی گونج بھی
عمدہ گیٹ اپ، ڈیمائی سائز
قیمت: دس روپے
نیشنل اکاڈمی سے منگوائیے

مدن موہن تلخ کا نیا شعری مجموعہ
تکمیل
عنقریب شائع ہو رہا ہے

پنجاب اور آندھرا کی لائبریریوں کے لیے منظور شدہ

ماہنامہ

تحریک

نئی دہلی

شمارہ: ۱۲ جلد: ۲۵

مارچ ۱۹۷۸ء

مندرجات:

ادارۂ تحریر:

- گوپال متل
- مخمور سعیدی
- پریم گوپال متل

سالانہ قیمت: پندرہ روپے، فی کاپی: ایک روپیہ ۲۵ پیسے

بیرونی ممالک سے

سالانہ: تین پونڈ فی کاپی: چھ شلنگ

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتا

منیجر ماہنامہ تحریک ۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دلی ۲

پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر: گوپال متل

مطبع: نعمانی پریس دہلی

مقامِ اشاعت: ۹ انصاری مارکیٹ نئی دہلی

اِس شمارے کے ساتھ

اپنی اشاعت کے ۲۵ سال پورے کر رہا ہے

اس موقع پر ہم نے تحریک کا سلور جبلی نمبر شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے

تحریک کے خاص نمبر جب جب شائع ہوئے ہیں، ان کی دھوم مچ گئی ہے، ہماری کوشش ہوگی کہ سلور جبلی نمبر سابقہ تمام نمبروں پر سبقت لے جائے۔

ہمارا منصوبہ یہ ہے کہ اس نمبر میں اردو زبان و ادب کے پچھلے ۲۵ سال کے بھرپور جائزے کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ۲۵ سال کے شعر و ادب کا تعارف بھی پیش کیا جائے اور ان زبانوں کی منتخب تخلیقات کے تراجم بھی۔

اس ضخیم و عظیم نمبر کی تیاری میں جو ایک بے مثال ادبی تحفہ ہوگا ہمارا ہاتھ بٹائیے — اس کے لیے اشتہارات کی فراہمی میں ہماری مدد کیجیے اور اسے رعایتی داموں پر حاصل کرنے کے لیے تحریک کی سالانہ خریداری قبول کیجیے۔

سلور جبلی نمبر کی قیمت ۲۵ روپے ہوگی لیکن "تحریک" کے سالانہ خریداروں کو ڈاک خرچ سمیت یہ صرف ۱۵ روپے میں پیش کیا جائے گا — نئے خریدار "تحریک" کی سالانہ قیمت شامل کر کے کل ۳۰ روپے منی آرڈر سے ارسال کریں۔

ہم ہمیشہ کی طرح آپ کی مخلصانہ مدد کے منتظر ہیں

منیجر ماہنامہ "تحریک" ۹ انصاری مارکیٹ، دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰

گوپال مِتّل | چہ دلاورست...

شاہِ ایران کے خیر مقدمی جلوس میں کچھ لوگوں نے، جن میں ہندوستان میں مقیم ایرانی طلبا اور لیساری پارٹیوں سے تعلق رکھنے والے کچھ ہندوستانی شامل تھے، گڑبڑ ڈالنے کی کوشش کی تو قدرتی طور پر پولیس کو کارروائی کرنی پڑی۔ مظاہرین کے خلاف کارروائی کے بارے میں ایک سرکاری ترجمان سے پوچھا گیا تو اس نے بجا طور پر کہا کہ قانون کا اطلاق بہر حال ناگزیر ہے، اس سے کوئی مفر نہیں۔

حکومتی کارروائی پر جس پارٹی نے خاص طور پر احتجاج کیا وہ دلّی کی سی۔ پی۔ آئی۔ ایم۔ ہے، جس نے اس کارروائی کو غیر جمہوری اور غیر مہذبانہ قرار دیا اور یہ بھی کہا کہ یہ "ہندوستان اور بیرونی ممالک میں فاشیزم اور ڈکٹیٹر شپ کی حوصلہ افزائی کے مترادف ہے۔"

ہمیں یہ تسلیم ہے کہ کسی ملک میں انسانی حقوق اور شہری آزادیوں کا مسئلہ خالصتہً مقامی نہیں۔ جہاں کہیں بھی افراد پر حکومتی جبر ہوتا ہے اس کے خلاف احتجاج ہونا چاہیے لیکن احتجاج کرنے والوں کا رویّہ ایمنسٹی انٹرنیشنل کی طرح ہونا ضروری ہے جو اس معاملے میں کبھی بھی سیاسی جانبداری کا ثبوت نہیں دیتی۔ جہاں کہیں بھی انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہوتی ہو، یہ تنظیم احتجاج کرتی ہے، خواہ اس ملک کا سیاسی نظام کچھ بھی ہو۔ لیکن کمیونسٹ پارٹیوں کا رویّہ، خواہ وہ سی۔ پی۔ آئی۔ ہو یا سی۔ پی۔ آئی۔ ایم۔ اس سے مختلف ہے۔ انھیں صرف غیر کمیونسٹ ممالک ہی میں انسانی حقوق کے تحفظ کی سوجھتی ہے اور اس پردے میں وہ اپنے ساتھی کمیونسٹوں کی سازشانہ سرگرمیوں کی حمایت سے بھی باز نہیں رہتیں۔

کمیونسٹ ملکوں میں انسانی حقوق کی پامالی کتنی ہی متشددانہ اور ہمہ گیر کیوں نہ ہو، ان پارٹیوں کو احتجاج کرنے کا خیال نہیں آتا۔ روس میں انسانی حقوق کی پامالی جس حد تک ہوتی ہے، اس کا سبھی کو علم ہے۔ وہاں حکومت کے نکتہ چینوں کو صرف قید و بند کا سامنا ہی نہیں ہوتا بلکہ انھیں پاگل قرار دے کر پاگل خانوں میں بھی بھیج دیا جاتا ہے جو اسپتال نہیں، تعذیب گھر ہیں۔ یہ غلط ہے کہ سوویٹ حکومت نے اس معاملے میں اپنے رویّے میں کوئی اہم تبدیلی کر لی ہے۔ انسانی حقوق کے دن پر ماسکو کے ایک پبلک جلسے میں سوویٹ ٹریڈ یونینوں کی مرکزی کونسل کے صدر الیکسی شیبائیف اور سپریم سوویٹ کے چیئرمین الیکسی شٹیکوف نے، سوویٹ یونین میں انسانی حقوق کی پاسداری کے بڑے بلند بانگ دعوے کیے اور انسانی حقوق کے سلسلے میں سوویٹ یونین کے سر پر اوّلیت کا تاج بھی رکھ دیا۔ لیکن شٹیکوف اپنی تقریر میں ایک ایسی بات بھی کہہ گئے جس سے ان کے تمام دعووں کی تکذیب ہو گئی۔ انھوں نے کہا کہ انسانی حقوق کے مسئلے کا طبقاتی کردار سے گہرا تعلق ہے۔ یہ ایک بہت ہی مغالطہ آمیز لفظ ہے۔ کمیونسٹ اصطلاح میں طبقاتی کردار سے یہ مراد نہیں کہ کس شخص کا تعلق پرولتاری طبقے سے ہے اور کس کا غیر پرولتاری طبقے سے۔ نہ لینن پرولتاری طبقے سے تعلق رکھتا تھا نہ سوویٹ حکومت کے موجودہ ارکان پرولتاری طبقے کے رکن ہیں۔ پرولتاری طبقے سے مراد سوویٹ یونین

میں صرف کمیونسٹ پارٹی ہے لہٰذا جہاں تک انسانی حقوق کے عام تحفظ کا سوال ہے وہ اس صورتِ حال میں ممکن نہیں ۔ وہاں یہ حقوق صرف ان لوگوں کو حاصل ہیں جو کمیونسٹ پارٹی سے متعلق ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ حکمراں ٹولی کے حاشیہ بردار ہیں ۔ حکمراں ٹولی سے انحراف کرنے والوں کا ٹھکانہ یا تو مشقتی کیمپ ہیں یا پاگل خانے ۔

دوسرے کمیونسٹ ملکوں کا بھی یہی حال ہے ۔ مثال کے طور پر چین کو لیجیے ۔ وہاں سیاسی مخالفوں کو جس طرح پھانسیاں دی جاتی ہیں یا دوسری سزائیں ملتی ہیں انھیں تو چھوڑ دیجیے چینی حکمرانوں نے ابھی تک ماؤسی تنگ کے اس نظریے کو خیر باد نہیں کہا ہے کہ چینی آبادی کا ۵ فیصد حصّہ رجعت پرستوں پر مشتمل ہے اور یہ لوگ انسانی حقوق سے بہرہ ور ہونے کا حق نہیں رکھتے ۔ چین کی کل آبادی ۹۰ ہزار ملین ہے ۔ اس نظریے کی رُو سے وہاں ۴۵ ملین لوگ ایسے ہیں جنھیں انسانی حقوق نہیں دیے جا سکتے ۔ ۳۰ ملین چینیوں کو وہاں اب تک امیر کسان سمجھا جاتا ہے ۔ یہ دوسرے درجے کے شہری ہیں جنھیں ایک ہی نوعیت کا کام کرنے پر بھی ، دوسرے مزدوروں کے مقابلے میں ۱۰ فیصد تک کم اُجرت ملتی ہے ۔ ۲۰ ملین رجعت پرست وہاں اب تک اصلاحی مشقت کے کیمپوں میں ہیں ۔

حیرت ہے کہ سی ۔ پی ۔ آئی ۔ ایم ۔ کو ان لاکھوں لوگوں کی کوئی فکر نہیں اور اس نے ان مظلوموں کے حق میں کبھی آواز نہیں اُٹھائی ۔ اس صورت میں شاہ ایران کے خلاف اس کے مظاہرے کو جانبداری پر تو محمول کیا جا سکتا ہے ، انسان دوستی پر نہیں ۔ اس پارٹی کی ڈھٹائی پر بے ساختہ یہ مصرعہ یاد آتا ہے :

چہ دلاور است دزدی کہ بکف چراغ دارد

گوپال متل
کی
ادبی اور سیاسی یادداشتیں
لاہور کا جو ذکر کیا

”میں آپ کی کتاب ”لاہور کا جو ذکر کیا“ کو اُردو میں اپنی قسم کی بہترین کتابوں میں سمجھتا ہوں“
● —— قاضی عبدالودود

دوسرا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل رہا ہے ۔ آپ بھی آج ہی طلب کریں ۔

قیمت : دس روپے

نیشنل اکادمی ۹ء انصاری مارکیٹ دریا گنج ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ستیہ پرکاش | مارکس کی خیالی جنت اور سوویٹ حقیقت

کمیونسٹ اپنے پروپگنڈے سے ہمیں یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہماری تمام اخلاقی اور سماجی برائیاں ہمارے موجودہ سیاسی نظام کا نتیجہ ہیں، جیسے ہی موجودہ سماج کی جگہ کمیونسٹ سماج قائم ہو جائے گا، ہندوستان کی سماجی اور اخلاقی بیماریاں از خود ختم ہو جائیں گی - یہ پروپگنڈہ مارکس کے نظریاتی نظام کے عین مطابق ہے - مارکس نے ایک خیالی جنت تعمیر کی تھی۔ سوویٹ یونین، جس کا نظام اس کے نظریات کے مطابق وجود میں آیا ہے، اس خیالی جنت سے بالکل مختلف منظر پیش کرتا ہے - ساٹھ سال تک سوشلزم کی راہ پر گامزن رہنے کے باوجود اس ملک میں وہ آدرش شہری پیدا نہ ہو سکا جو مارکس کی پیشگوئی کے مطابق لازماً وجود میں آجانا چاہیے تھا۔

خود سوویٹ پریس کے مطالعے سے سوویٹ شہری کی جو تصویر ابھرتی ہے اس کے مطابق وہ اب بھی ووڈکا کا ضرورت سے زیادہ رسیا ہے، ازدواجی وفاداری کا کچھ زیادہ قائل نہیں اور ریاستی ملکیت میں خرد برد کرکے عیش اڑانے سے بھی اسے چنداں گریز نہیں۔ سوویٹ یونین میں وہ تمام مسائل موجود ہیں جن سے غیر کمیونسٹ ملکوں کو سابقہ ہے لیکن ان کے علاوہ وہاں کچھ ایسی برائیاں بھی ہیں جو کمیونسٹ نظام نے پیدا کی ہیں -

سوویٹ یونین میں جرائم کے اعداد و شمار شائع نہیں کیے جاتے لیکن یہ بات پھر بھی ظاہر ہو جاتی ہے کہ کثرت شرابنوشی کی وجہ سے سرزد ہونے والے جرائم اور غنڈہ گردی سے سوویٹ حکام کو خاصی تشویش ہے - "ہیرالڈ آف ماسکو یونیورسٹی" کے ۱۹۷۷ء کے تیسرے شمارے میں بتایا گیا ہے کہ اس صدی کے دوسرے دہے کے مقابلے میں شراب پی کر جرم کرنے والوں کی تعداد اب دوگنی ہو گئی ہے - ایک عدالتی افسر اے - یوڈکن نے ۲۴ جولائی ۱۹۷۷ء کو ماسکو ریڈیو سے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "پچاس فیصد سے زیادہ جرائم جن میں لوگ زخمی ہو جاتے ہیں اور اسی فیصد قتل ایسے لوگ کرتے ہیں جو شراب میں دھت ہوتے ہیں تیس سے پینتیس فیصد تک موٹر حادثے جن میں لوگ زخمی ہو جاتے ہیں، ڈرائیور کی مدہوشی کی وجہ سے ہوتے ہیں. شراب کی حالت میں جو جرائم کیے جاتے ہیں، ان کے پیچھے بالعموم کوئی مقصد نہیں ہوتا لیکن وہ انتہائی ظالمانہ اور وحشیانہ ہوتے ہیں"

سوویٹ یونین کی شرابوں میں جو الکوہل استعمال ہوتی ہے، اس میں پچاس فیصد بہت تند و تیز ہوتی ہے، برطانیہ میں استعمال ہونے والی الکوہل صرف اکیس فیصد تند و تیز ہوتی ہے اور اٹلی میں صرف نو فیصد - سائبریا کی اکاڈمی آف سائنسز کے اندازے کے مطابق اگر مزدور شرابنوشی کم کردیں تو پیداوار میں دس فیصد اضافہ ہو سکتا ہے - کثرت شرابنوشی کے خلاف ریڈیو اور پریس میں پروپگنڈہ تو بہت ہوتا ہے لیکن تحت الارض جریدوں کے مطابق حکام اس مسئلے پر سنجیدگی کے ساتھ توجہ دینے کے لیے تیار نہیں کیونکہ اگر وہ ایسا کریں تو شراب سے جو ٹیکس وصول ہوتے ہیں، ان میں کمی ہو جائے گی - یہ ٹیکس دوسری تمام اشیائے خورد و نوش سے حاصل ہونے والے ٹیکسوں کی مجموعی مالیت سے زیادہ مالیت کے ہیں - مشہور غیر مقلد سائنس داں اینڈری سخاروف نے اپنی کتاب "میرا ملک اور دنیا" میں دعویٰ کیا ہے کہ سوویٹ حکومت شرابنوشی کو بڑی

حد تک اس بنا پر بھی نظر انداز کر دیتی ہے کہ اس کی بدولت لوگوں کی توجہ اقتصادی اور سماجی مصیبتوں سے ہٹ جاتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ روسی ریپبلک میں دس ہزار سے زیادہ اشخاص ہر برس نشے کی حالت میں راستوں پر گر پڑتے ہیں اور سردی سے اکڑ کر مر جاتے ہیں۔

سوویٹ وزیر داخلہ نکولائی شچیلوکوف نے "سوشیالوجیکل ریسرچ، ۳، ۱۹۷۷ء" میں گزشتہ سات برس میں جرائم کی تعداد میں کمی کا دعویٰ کیا ہے۔ وہ مدعی ہے کہ پیشہ ورانہ اور منظم جرائم کا خاتمہ ہو چکا ہے اور نسل اور قومیت کی بنا پر ہونے والے جرائم بھی ختم ہو گئے ہیں۔ لیکن سوویٹ پولیس کے مطالعے سے ہر طرح کے جرائم کی موجودگی ثابت ہوتی ہے۔ حالت یہ ہے کہ بعض جرائم جن میں اقتصادی جرائم بھی شامل ہیں، ان کے لیے اگرچہ موت تک کی سزا موجود ہے لیکن ان کا خاتمہ نہیں ہوتا اور بسا اوقات یہ جرائم منظم طور پر بھی کیے جاتے ہیں۔ خود شچیلوکوف شاکی ہے کہ سوشلسٹ جائداد کی حفاظت نیز جائز اور ناجائز آمدنیوں کے سلسلے میں مناسب ریسرچ نہیں ہوئی۔ اس کے علاوہ اقتصادی عوامل کا جرائم سے جو تعلق ہے اس کی چھان بین کی طرف بھی خاطر خواہ توجہ نہیں کی گئی۔

۳۰ نومبر ۷۷ء کو ماسکو ریڈیو کی ایک کمنٹری میں کہا گیا کہ بہت سے اقتصادی جرائم "قلت اور بدانتظامی کا نتیجہ ہیں" ایک زیر سماعت قیدی کے ساتھ انٹرویو کا ذکر کیا گیا جو عادی چور تھا۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ وہ خوفزدہ ہے تو اس نے کہا "کچھ زیادہ نہیں۔ ہر شخص چوری کرتا ہے لیکن سبھی پکڑے نہیں جاتے۔ تو پھر مجھی پر کیوں عذاب نازل ہو؟" بد دیانتی کی ایک اور مثال بھی دی گئی جو سوویٹ صنعت اور پبلک اداروں میں عام ہے۔ یہ دلالوں کا وجود ہے، جن کا کام اپنی فیکٹری کے لیے ہر ممکن ذریعے سے پیداواری وسائل اور سامان حاصل کرنا ہے۔ ایک دلال نے بتایا کہ وہ یہ کام کس طرح انجام دیتا ہے: "اس شخص سے رابطہ قائم کرو جو پرزے مہیا کرتا ہے۔ اسے شراب کی ایک بوتل یا مٹھائی کے پیکٹ دو۔ لیکن وقت کم ہے اس لیے حاصل شدہ پرزوں کا ہوائی جہاز سے پہنچنا ضروری ہے۔ ہوائی اڈے پر بھی تحفے تقسیم کرنا نہ بھولو ورنہ وہ لوگ یہ بھول جائیں گے کہ تمہارا سامان آج ہی روانہ ہونا ہے۔ جب مجھے میرے کارخانے میں ایک شعبے کا ہیڈ بنا دیا گیا، جہاں بہت سے امور مجھی پر منحصر تھے تو مجھے رشوت کا عادی بننے میں کچھ زیادہ وقت نہیں لگا اور میں نے یہ بھی سیکھ لیا کہ یہ کام سلیقے سے کس طرح کیا جاتا ہے۔"

سوویٹ حکام اخلاقی مسائل پر سخت گیرانہ رویے کے دعویدار ہیں۔ شہریوں کو عریاں تصویریں یا فلمیں دیکھنے کی ممانعت ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ فحاشی وہاں اب بھی عام ہے۔ ازدواجی زندگی میں بے وفائی بڑھتی جا رہی ہے اور حکام کو اس بات سے تشویش ہے کہ جنسی امراض بہت پھیل رہے ہیں۔ سوویٹ روس میں مانع حمل اشیا کچھ تو ناقص ہیں اور کچھ کمیاب، لہٰذا ضبط تولید کا مقبول طریقہ حمل کو ضائع کرنا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق سوویٹ یونین میں ہر سال جتنے بچے پیدا ہوتے ہیں، اس سے دوگنی تعداد میں اسقاط کے واقعات ہوتے ہیں۔

۸۸

اِنسانی حقوق کیا ہیں؟

اس کتاب میں ان بنیادی انسانی حقوق کی تفسیر پیش کی گئی ہے جن کے بغیر مہذب زندگی کا تصور ممکن نہیں۔ پولیٹیکل سائنس کے طالب علموں کے لیے بالخصوص اور عام شہریوں کے لیے بالعموم اس کتاب کا مطالعہ بہت مفید ثابت ہوگا۔

عام ایڈیشن : چار روپے

لائبریری ایڈیشن : سات روپے

نیشنل اکادمی سے طلب کیجیے

غزل

کرشن موہن

موسم نے اُداسی دُونی کی — حد ہے سوزِ اندرونی کی
دُنیا نہ حکایت سُن پائی — میری قسمت کی زبونی کی
یارو ہم کیا توصیف کریں — شہروں کی بوقلمونی کی
اپنا تو حال ہوا ابتر — سنگت نے رنگت خونی کی
روداد ہے اپنی ہستی تو — رنج و غم کی افزونی کی
یہ یاس کی بے حس دھندلاہٹ — مستی ہے کسی افیونی کی
ہیں من کی اُداسی کا درپن — رنگیں باتیں باتونی کی
جوبن تصویرِ دلکش ہے — چاہت کی گونا گونی کی
بنیاد ہے میرا کربِ دروں — میرے کیفِ بیرونی کی
پردیس میں بس کر ساجن نے — چاہت کی بستی سُونی کی
ہے سوزِ دروں بھی اک صورت — آب و تابِ بیرونی کی

ہیں بیر د جواں بھوکے، برہم
رُت آئی لاقانونی کی

غزلیں اور نظم

محمد علوی

بانی کے لیے مذاقاً

ابھی جگہ دل میں آس بھر تھی
کہ اس کی آمد قیاس بھر تھی
اُفق اُفق شام مر رہی تھی
شراب کہ بس گلاس بھر تھی
گھرا ہوا تھا میں دشمنوں میں
بچاؤ کی جا حواس بھر تھی
بجھا بجھا سا ہے جسم اس کا
چمک دمک سب لباس بھر تھی
سیاہیاں دل میں کھیت بھر تھیں
کہیں سفیدی کپاس بھر تھی
کتاب بھر ہم نے پی تھی بانی
غزل تمہاری مٹھاس بھر تھی

▲▲

گجرات گورنمنٹ کے نام

شراب ملتی ہے بمبئی میں
چلو پئیں اور بھول جائیں
کہ ہم کو جانا ہے
کل وہاں پھر
جہاں بہت سے فضول کاموں کا سلسلہ ہے
شراب پینا جہاں منع ہے
چلو پئیں اور بھول جائیں
کہ ہم پہ پابندیاں لگا کر
کسی نے اچھا نہیں کیا ہے!

▲

نازش پرتاپگڑھی

برچھیاں حرف کہے جاتے ہیں بھالے الفاظ
کیوں کر ایسے میں کوئی منہ سے نکالے الفاظ

یوں تو یاروں نے ہر اک طرح اُچھالے الفاظ
نہ ملے پر نہ ملے نور کے ڈھالے الفاظ

جیسے اب کوئی اُجالوں کا پیمبر ہی نہ ہو
جیسے اس دور کی تقدیر ہوں کالے الفاظ

یوں تو خوشبو کی طرح نرم ہیں لیکن یارو
وقت پڑتا ہے تو بن جاتے ہیں بھالے الفاظ

چار سو چپ ہی کا ڈیرا تھا، اندھیرا تھا مگر
میری تہذیبِ غمِ دل نے اُجالے الفاظ

زندگی روپ بدلتی ہی چلی جاتی ہے
اے غزل اپنے لیے اور بنا لے الفاظ

کتنی عجب چاپ ہیں بدلی ہوئی قدریں نازش
سرِ قرطاس لکھو بولنے والے الفاظ

▲▲

○ ۱۳ پارس باغ۔ کرچ اب، احمد آباد
○ بیگم وارڈ۔ پرتاپ گڑھ (یوپی)

وہ لوگ

حبیب کیفی

وہاں مدھم روشنی تھی۔ ماحول پراسرار اور قدرے طلسمی تھا۔ میری طرف کسی کی توجہ نہ تھی۔ میں بڑھتا چلا گیا —— ان کی تلاش میں۔

ادھر قہقہوں کے شور نے مجھے چوکنا کر دیا۔ اشتیاق قدم بڑھانے لیے جا رہا تھا اور خوف روک رہا تھا۔

میاں! کسی نے اگر پکڑ کر پوچھ لیا کہ کون ہو؟ کیا چاہتے ہو؟ تو؟...... کہہ دوں گا کہ ان سے ملنا ہے!

چھوٹے سے ہال کے قریب پہنچ کر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں کسی عجیب دنیا میں چلا آیا ہوں۔ وہاں کافی لوگ تھے۔ لیکن میں ان میں سے کسی ایک سے بھی واقف نہیں تھا۔ انھیں پہچاننا بھی مشکل تھا۔ میری طرف ان کی پشت تھی۔ سامنے اسکرین تھا۔ پروجیکٹر پھڑ پھڑا رہا تھا۔ سب لوگ فلم کا مزہ لے رہے تھے۔

مجھے اپنا وجود وہاں اجنبی اور غیر لگا۔ جی میں آیا کہ لوٹ پڑوں لیکن تیاجی کی ہدایت بھی مجھے یاد تھی —— تم آج ہی ان سے مل لو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اگلی صبح ہی نتیجہ کا اعلان کر دیں......

ہمّت کر کے میں نے گردن آگے بڑھائی اور اسکرین کا منظر دیکھنے لگا۔ سولہ ایم۔ ایم کی یہ ڈوکومینٹری فلم جنگلات سے متعلق تھی۔ میں وہاں کھڑا رہ گیا۔ سوچا کہ فلم ختم ہونے پر ان سے مل لوں گا۔

شانے پر کسی نے ہاتھ رکھا تو سہم کر میں نے اسکرین سے نگاہ ہٹا لی۔

"ماچس تو دے۔" اندھیرے میں کسی نے اپنائیت سے مجھے مخاطب کیا۔ اس کا سر نیچا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ کون ہے؟ جان نہ پایا۔ زیادہ کچھ سوچنے کا موقعہ نہ تھا۔ اگلے ہی پل ماچس نکال کر میں نے اس کے حوالے کر دی۔

"ماچس ہے تو بیڑی بھی ہوگی ہی!" اس نے اسی لہجے میں ترنگ کے ساتھ کہا تو میں نے جیب سے نکال کر سگریٹ کا پیکیٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔

"آج سگریٹ ہے تیرے پاس!" اس نے تعجب سے کہا "تو تو خوب مزہ لے کر دیکھ رہا ہے...... دیکھ میں ادھر جا کر تیری سگریٹ کے کش لگاتا ہوں۔ اور سن، پروجیکٹر کے بند ہونے سے پہلے ہی اِدھر اُدھر ہو لینا ورنہ صاحب کچا چبا جائیں گے۔ اور سن، کچن میں سب ٹھیک ہے نا؟"

"ہوں"

وہ گیا تو میں نے راحت کی سانس لی۔

اب تک میں سمجھ چکا تھا کہ اندھیرے میں اس نے مجھے وہاں کا نوکر ہی جانا تھا۔ ظاہر ہے کہ خود وہ بھی گھریلو نوکر ہی تھا۔

اور جب راز کھلے گا تب؟ خود سے میں نے پوچھا تو میں گلی تلاش کرنے لگا۔ اسی عالم میں میری نگاہ پھر اسکرین پر چلی گئی۔

کھجوراہو اور کوتارک کے مندروں کی مورتیاں زندہ ہو کر حرکت میں آ چلی تھیں۔ اب جنگلات سے تعلق رکھنے والی ڈوکیومنٹری فلم نہیں تھی۔ مجھے اس گھریلو نوکر کی ہدایت کا فوراً خیال آ گیا —— اِدھر اُدھر ہو جانا ورنہ صاحب کچا چبا جائیں گے! تو اس کی اصل وجہ یہ تھی۔

بلو فلم کا رنگین منظر تھا۔ ایک عورت دو مردوں کے بیچ میں تھی تینوں مادر زاد برہنہ تھے۔ میں نے کے کیتوں کو

... ۱۰۰۰ ... ارجمند ہنومان بھنڈار، جودھپور ۔ ۱۹

دیکھا ہے۔ وہ بھی ایسا نہیں کرتے۔ منظر بدلا۔ تالاب کے کنارے گوری چمڑی والی جوان اور خوبصورت عورت موٹر سائیکل کی سیٹ پر آنکھیں موندے ہوئے لیٹی ہے اور مرد اپنی زبان استعمال کر رہا ہے۔ کھجوراہو کے زمانے میں موٹر سائیکلیں کہاں تھیں۔؟

اگلا منظر — عورت چوپایہ بنی ہوئی ہے۔ ایک مرد پیچھے اور دوسرا منہ کی طرف ہے۔ اس سے اگلا سین، عورت اور کتا۔ اس کے بعد عورت اور عورت....

گلا خشک ہو گیا۔ پسینہ آ گیا۔ پیر کانپنے لگے۔

احساس جرم کے تحت میں نے اپنے اطراف کا جائزہ لیا۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ کانوں میں پروجیکٹر کی پھڑپھڑاہٹ گونج رہی تھی۔ میری نگاہ پھر اسکرین پر چلی گئی۔

کھجوراہو اور کونارک کے مناظر کو بھی مات کر دینے والے سائے تھے۔ لمحہ بہ لمحہ ہیجان کو بڑھانے والے سین نگاہوں کے سامنے تھے۔ اور اپنی جگہ پر کھڑا ہوا میں حیرت میں ڈوبا جا رہا تھا۔ میری جیب میں سفارشی چٹھی تھی۔

حرکت قلب کو نارمل کرنے کی غرض سے میں نے ہال کا جائزہ لیا۔ وہاں کرسیوں پر لوگ جمے ہوئے تھے۔ عورتیں بھی تھیں۔ کل بارہ تیرہ لوگ تھے۔ دھوئیں کے ساتھ دھیمے دھیمے قہقہوں کا شور اٹھ رہا تھا۔ ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ کوک ٹیل کی تیز مہک پھیلی ہوئی تھی۔

یہ کیا تماشہ ہے؟ خود سے میں نے پوچھا، کون لوگ ہیں یہ؟ کیا انھیں عام حالت میں ہیجان پیدا نہیں ہوتا؟ اور یہ عورتیں!.....

"آپ کون ہیں؟" مانوس سی آواز نے مجھے مخاطب کیا۔ ذہن پر زور دیا تو یاد آیا کہ یہ وہی گھریلو نوکر ہے، جس نے ابھی کچھ دیر قبل اچھی اور بیڑی طلب کی تھی اور جس نے مجھے اپنی ہی طرح گھریلو نوکر سمجھا تھا۔ مجھے لے کر اب اسے شک ہو چلا تھا۔

"میں ہوں" میں بولا۔

"جناب، آپ کا نام کیا ہے؟" اس نے شائستگی سے پوچھا۔ غالباً اس نے مجھے بھی ان معزز مہمانوں میں سے ایک سمجھا تھا جو اندر ہال میں بیٹھے ہوئے بلو فلم سے محظوظ ہو رہے تھے۔

"میں آشیش دتا ہوں.... دراصل مجھے سنہا صاحب سے ملنا ہے" میں نے کہا۔

"صاحب نے آپ کو بلایا تھا؟" اس نے مزید پوچھا۔

"نہیں ..... پر....."

"تو تم فوراً یہاں سے ہٹ جاؤ۔" اس کا سلوک یکسر بدل گیا۔ اس نے کہا "سمجھ میں نہیں آتا کہ تم یہاں تک آ کیسے گئے ہو؟"

حسرت سے ایک نظر اسکرین پر ڈالنے کے بعد میں وہاں سے ہٹ گیا۔ پردے پر بڑا ہی ہیجان انگیز منظر تھا۔ اس وقت مجھے اپنی عزت کا پاس ہو آیا تھا۔

وہاں سے کچھ دور نکل آیا تو مجھ پر عجیب کیفیت طاری ہو گئی۔ سنہا صاحب کے نام سفارشی چٹھی میری جیب میں تھی۔

"اس طرح چوری چھپے اندر گھس آنے کی تمہیں ہمت کیسے ہوئی؟" اب اس نے قدرے سخت آواز میں مجھے مخاطب کیا۔

"میں نے بتایا نا کہ صاحب سے ملنا ہے.... اس میں ہمت کی کیا بات ہوئی؟" میں بولا۔

"اس کا انجام جانتے ہو؟" اس نے میرے جواز کی طرف دھیان نہیں دیا۔ وہ اپنی رو میں بولا "تم پولس کے حوالے کیے جا سکتے ہو!"

میں کچھ نہ بولا۔ چپ رہ گیا۔ اس اثنا میں میں نے سوچا، میں نے ایسا کیا جرم کیا ہے جس کی بنا پر مجھے پولیس کے حوالے کیا جا سکتا ہے؟ اور وہ لوگ جو ناجائز اور غیر قانونی طریقے سے بلو فلم دیکھ رہے ہیں؟

مجھے پتا جی یاد آ گئے — امتحان کا رزلٹ آ چکا تھا۔

یں کامیاب رہا تھا۔ اس کامیابی کے نتیجے میں مجھے انٹرویو کے لیے بلایا گیا۔ میں پوری تیاری کے ساتھ وہاں گیا بھی۔ وہاں اچھے اچھوں کے چھکے چھوٹ جانے کا اندیشہ تھا۔ لیکن مجھے کوئی گھبراہٹ نہیں تھی۔ میں اس طرح کے انٹرویو کا عادی ہو چلا تھا کیونکہ سرکاری اور غیر سرکاری دفتروں میں ہو آیا تھا۔ اسی سے مجھ میں ایک خود اعتمادی آ گئی تھی۔ اب میرے سامنے ایک پرائیوٹ کمپنی تھی۔

سوالات مشکل تھے تاہم مجھے کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ کوئی ڈر نہیں تھا۔ نروس نیس بھی نہیں تھی۔ مجھ میں خود اعتمادی تھی۔

وہاں سے اٹھ آنے سے قبل میں نے ان سب کو دیکھا تھا۔ ان کے چہروں پر کوئی پریشانی نہیں تھی۔ اسی سے اپنے تیئں میں نے یہ سمجھ لیا کہ اب کوئی بے انصافی ہی مجھے بیروزگار رکھ سکتی ہے۔

لیکن جب گھر پر پتاجی سے سامنا ہوا تو انھوں نے مجھے فوراً مخاطب کیا۔

"کیسا رہا؟" ان کی آنکھوں میں اشتیاق تھا۔

"جی، فرسٹ کلاس!" میں نے جوش کے ساتھ کہا۔

"سو تو ٹھیک ہے، لیکن ...." وہ رک گئے۔

"آپ کیا سوچنے لگے۔؟"

"سوچنا کیا ہے برخوردار؟ یہ تو تم ہر انٹرویو کے بعد کہتے رہے ہو اور نتیجہ یہ ہے کہ ....." انھوں نے جملہ پھر ادھورا چھوڑ دیا۔

اس وقت تک میں بارہ چودہ انٹرویو دے چکا تھا اور ہر انٹرویو کے بعد پتاجی سے میں نے فرسٹ کلاس ہی کہا تھا۔ پہلے پہل انھیں امید بھی بندھی تھی۔ وہ یہ سمجھنے لگے تھے کہ ان کا بیٹا اب بے روزگار نہیں رہے گا۔ لیکن ہر بار کے طویل انتظار نے انھیں مایوس کرنا شروع کر دیا تھا۔ اب انھیں میری یہ بات بالکل رسمی اور اوب پیدا کرنے والی لگتی تھی۔ یہ فطری بھی تھا۔ اس کی وجہ تھی۔ ایم۔ ایس۔ سی۔ میں فرسٹ ڈویژن میں کامیابی اور پھر بھی بے روزگاری .....

"اب کیا کرنا ہے؟" ان کی آواز دھیمی تھی۔ میں نے ان کی طرف دیکھا۔ ایسا لگا کہ وہ خود سے کچھ پوچھ بیٹھے ہیں ورنہ ہر کوئی جان سکتا تھا کہ نتیجے کے انتظار کے سوا کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔

"تم ایک کام کرو۔" اس دفعہ ان کی آواز صاف تھی۔ میں ان کی طرف متوجہ ہوا۔ تو انھوں نے آگے کہا "میں یہ ایک سفارشی چٹھی لایا ہوں۔ تم آج ہی سنہا صاحب کے بنگلے پر چلے جاؤ .... امید تو ہے کہ اس دفعہ تمہاری محنت اور انٹرویو ضائع نہیں ہوگا۔"

"سمجھے؟" وہ بولا تو میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اب ہم کافی روشنی میں تھے۔ وہ مجھے حقارت سے گھور رہا تھا۔ میں نے سر سے پیر تک اسے دیکھا۔ وہ خاصہ تگڑا اور صحت مند تھا۔ خیال گزرا کہ اس سے اگر میری ہاتھا پائی ہو گئی تو یقیناً اس کا نتیجہ میرے حق میں نہیں جائے گا۔

"تم میرے ساتھ ایسا سلوک کر رہے ہو! میں کوئی چور اچکا تو ہوں نہیں" میں نے کہا۔

"چور ڈاکو کا کیا مطلب؟ کیا ایسے لوگ ہی پولیس کے حوالے کیے جاتے ہیں؟ تمہارے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ تم شریف اور عزت دار ہو؟"

"میری صورت اور حلیے سے تمہیں کیا لگتا ہے؟"

"اس حلیے کے لوگ ہی تو آج کل اٹھائی گیرے ہوتے ہیں۔ خیر، مجھے اس سے کوئی بحث نہیں، میں بہت مصروف ہوں۔ تم اپنی راہ لگو۔"

وہ میرا ردعمل جانے بغیر تیز قدموں سے وہاں سے چلا گیا۔

میں نے اپنے اطراف کا جائزہ لیا۔ بے عزت سا میں گیٹ کے پاس کھڑا تھا۔ وہاں ایک جیپ کے علاوہ

(باقی صفحہ [illegible] پر)

ہماری کتابیں

مرقع اقبال (مجلس ناشر آزاد) قیمت: پچاس روپے

(علامہ اقبال کی زندگی کے اہم واقعات، شجرہ نسب، نادر و نایاب تصاویر اور تحریروں کا البم)

سر سید احمد خاں (پروفیسر خلیق احمد نظامی) قیمت: پانچ روپے

(ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی، تعلیمی اور ثقافتی زندگی پر سر سید اور ان کے رفقاء کے کارناموں کا زبردست اثر پڑا ہے۔ پروفیسر نظامی نے بڑے معالمانہ انداز میں ان کی شخصیت اور کارناموں کا جائزہ لیا ہے۔)

ہندوستانی تہذیب پر مسلمانوں کا اثر

(ڈاکٹر محمد عمر) قیمت: بیس روپے

(ڈاکٹر تارا چند نے اپنی مشہور تصنیف میں ہندوستانی تہذیب پر مسلمانوں کے اثرات کا جائزہ لیا تھا۔ ڈاکٹر محمد عمر نے اپنی اس محققانہ کاوش میں دکھایا ہے کہ ہندوستانی تہذیب مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبے میں پیوست ہو گئی ہے۔)

(عرش ملسیانی)

ہم ایک ہیں قیمت: دس روپے

(ہندوستان مختلف مذاہب، عقیدوں اور طور طریقوں کا ملک ہے۔ اور جس طرح کسی اختلاف سے تہذیب و زینت حاصل ہے بہرنگ رنگ کے پھول ایک گلدستے میں بندھے ہوتے ہیں اور ہماری قومی زندگی کو تاب و توانائی بخشتے ہیں۔)

ابوالکلام آزاد (عرش ملسیانی) قیمت: پانچ روپے

(ابوالکلام آزاد جدید ہندوستان کے معماروں میں ہیں۔ جدوجہد آزادی کی کوئی بھی تاریخ مولانا آزاد کی خدمات کے اعتراف کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔)

روشنی کے مینار (شہباز حسین) قیمت: ایک روپیہ پچاس پیسے

(سماجی مصلحین، مذہبی رہنماؤں اور سماجی قائدین کے سوانحی خاکے جو آسان زبان میں ہائی اسکولوں کے طلبا کے لئے لکھے گئے ہیں۔)

یہ ہندوستان (شیلا دھر) قیمت: دس روپے

(اس باتصویر کتاب میں سادہ اور سہل زبان میں بچوں کو ہندوستان کی تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ تاریخی، معاشی اور سماجی حالات سے آگاہ کیا گیا ہے اور انھیں بڑے دلچسپ انداز میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس ملک کی دنیا میں کیا اہمیت ہے۔

عمدہ کتابت و طباعت اور رنگین تصاویر سے مزین یہ ایک ایسی کتاب ہے جسے بچوں کے لئے ضرور خریدنا چاہئے۔)

جواہر لال نہرو کی کہانی

تصویروں کی زبانی

قیمت: تین روپے پچاس پیسے

(محبوب رہنما اور ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم شری جواہر لال نہرو کی زندگی کے دلچسپ واقعات رنگین تصویروں میں۔ بچوں اور طالب علموں کے لئے ایک عمدہ تحفہ۔)

پھلوں اور سبزیوں کو محفوظ رکھنے کے طریقے

قیمت: دو روپے پچاس پیسے

(گھریلو عورتوں کے لئے جام، جیلی، مربّہ، مارملیڈ، چٹنی اور اچار وغیرہ بنانے کے متعدد طریقے تصویروں کے ذریعہ بتائے گئے ہیں جن سے بڑی آسانی سے آپ گھر بیٹھے اپنی من پسند چیزیں بنا سکتے ہیں۔)

"آج کل" کے سالانہ خریداروں کو بیس فیصدی رعایت۔ محصول ڈاک ہمارے ذمے

طلب کیجئے۔ بزنس منیجر پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

عروج زیدی

شاد عارفی کا آخری سفر

اے ہم نفسانِ محفل ما
رفتید ولے نہ ازدل ما (فیضی)

ولادت : ۱۹۰۳ء وفات : ۱۹۶۴ء

جنوری ۶۴ء کے آخری دو ہفتوں سے مقامی اخبارات میں شاد عارفی کی تشویشناک علالت کی خبریں چھپ رہی تھیں۔ میں ہجوم کارِ سرکار اور دوسری مصروفیتوں کے باعث بذاتِ خود تو عیادت کے لیے نہ جا سکا البتہ مختلف ذرائع سے ان کی مزاجی کیفیت اور خیریت معلوم کرتا رہا۔ ماہ فروری کے پہلے یکشنبہ کی تعطیل میں وقت نکال کر میں جب ان کی مزاج پرسی کے لیے حاضر ہوا تو ان کی صحت کی سقیم حالت دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ طویل علالت نے انھیں چراغِ سحری بنا دیا تھا۔ چہرے پر قدرے ورم تھا۔ اٹھنا بیٹھنا دوبھر تھا اور بیماری خطرناک دور میں داخل ہو رہی تھی، ان کی جسمانی اور مادی قوتیں مضمحل ہوتی جا رہی تھیں۔ ان کے گلشنِ زندگی پر چھائی ہوئی خزاں کے سائے لمبے اور لمبے ہوتے جا رہے تھے، مجھے رہ رہ کر یہ خوفناک خیال سانپ کی طرح ڈسنے لگا کہ لمحوں کی راکھ تلے یہ شعلہ جلد ہی دب کر نہ رہ جائے کیونکہ میں دیکھ رہا تھا کہ رفتہ رفتہ شاد صاحب پر موت کا سایہ گہرا اور گہرا ہوتا جا رہا ہے اور ان کی زندگی موت کے غار کے منہ پر کھڑی ہے۔

مرحوم غالباً نفسیاتِ انسانی کے نباض تھے انھوں نے میرے دل کی کیفیت کا میرے چہرے سے اندازہ کر لیا اور فرمایا :

"موت اچھے آدمیوں کو پسند کرتی ہے اور برے آدمیوں سے دور بھاگتی ہے"۔

میں نے گھبرا کر پوچھا کہ میرے آتے ہی یہ "موت و حیات" کا فلسفہ کیوں بحث میں آگیا؟ وہ فوراً بات کا رُخ بدلتے ہوئے بولے "تو یہ شعر سنو" ؎

بے ہنر مسند نشیں، اہلِ خرد خانہ خراب
عقلِ انساں سے خدا کا کارخانہ دور ہے

میں نے عرض کیا "مفہومِ شعر تو حقیقت پر مبنی ہے اور لائقِ داد ہے لیکن مصرعۂ ثانی میں "کا" کی تکرار (کا کا) پسند نہیں"۔ اس معروضہ پر مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے فرمایا :

"خدا کا شکر ہے کہ شعر میرا نہیں ہے"

اتنے ہی میں انھیں رہ رہ کر کھانسی نے ستانا شروع کیا۔ ابھی سانس پر مشکل سے قابو پایا تھا کہ میں نے یہ قطعہ سنایا ؎

سانس پھولے گی کھانسی سوا آئے گی
لب پہ جانِ حزیں بارہا آئے گی
دارِ فانی سے جب شوق اُٹھ جائے گا
تب مسیحا کے گھر سے دوا آئے گی

چونکہ قطعہ حسبِ حال تھا اس لیے بہت محظوظ ہوئے اور کہنے لگے کہ شاید آپ نے یہ دونوں شعر ابھی گھڑ لیے ہیں۔ چوتھے مصرع میں لفظ "مسیحا" کے استعمال نے مجھے بڑا

دیا۔ واہ۔ واہ۔ سبحان اللہ۔

میں نے عرض کیا :

بندہ نواز! تیسرے مصرع میں تو شاعر کا تخلص موجود ہے۔ آپ نے قطعہ کو میرا نتیجۂ فکر کیونکر سمجھ لیا؟ یہ اشعار جناب شوق بہرائچی کے ہیں۔ جواباً ہنستے ہوئے بولے۔! "صاف فرمایئے۔ میں نے تو "شوق" کو "شاد" سمجھا ؎

دارِ فانی سے جب "شاد" اٹھ جائے گا

مستقبل حال میں ابھرتا اور حال ماضی میں ڈوبتا رہا۔ رت بدلی، موسم بدلے مگر نہ بدلے تو شاد عارفی کے حالات مجھے ذاتی طور پر معلوم ہے کہ ان پر ایسے وقت بھی گزرے جب وہ نانِ شبینہ تک سے محروم رہے اور بے گانے تو بے گانے اپنوں نے بھی دستِ تعاون دراز نہیں کیا حالانکہ بعض استفادہ کرنے والے اس حالت میں بھی ان کی رہائش گاہ پر ڈیرا ڈالے نظر آتے تھے۔ اقتصادی بدحالی کا مسئلہ بڑا اہم تھا۔ دورانِ علالت ان کے دماغ پر اس اہمیت کی گرفت روز بروز مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ ان کی زندگی تلخیوں کا عجیب و غریب نمونہ تھی —— آہ اس ناقد بے باک و حقیقت پسند فن کار کی زندگی!

شاد عارفی آزاد خیال شاعر ہونے کے باوجود بڑے دیندار اور پابند صوم و صلوٰۃ تھے۔ میں نے ایک مرتبہ جب ان کے گلے میں لٹکنے والے تعویذوں کے بارے میں استفسار کیا تو فرمایا کہ کسی آئندہ موقع پر اس بارے میں تفصیل سے بتاؤں گا سرِدست یہ شعر سن لیجئے ؎

میں فدائے پنجتن ہوں شاد! لیکن میرے دوست
اس عقیدے پر اڑے ہیں پانچویں کالم میں ہوں

شاد عارفی اعتکاف پسند نہ تھے۔ اگرچہ مشاعروں کی شرکت سے گریزاں تھے کیونکہ ان کی آواز میں نہ لوچ تھا نہ مٹھاس، نہ رس، دوسرے کبرسنی، روز افزوں نقاہت اور رجحان لیوا علالت نے چلنے پھرنے سے معذور کر دیا تھا بایں ہمہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ آخری سفر کے لیے تیار ہیں۔ اسی ملاقات میں انھوں نے فرمایا تھا کہ موت کوئی گالی نہیں ہے، موت کا آنا برحق ہے، ہم تیار ہوں یا نہ ہوں وہ وقت مقررہ پر ضرور آئے گی۔

فرانس کے ایک دانشور کا قول ہے کہ مفلس کے دماغ میں دانائی کا گلا گھٹ جاتا ہے، مگر ہم نے دیکھا کہ شاد عارفی کی دماغی توانائی میں کوئی فرق نہیں آیا اور ان کی شعری صلاحیتیں مفلوج ہونا تو درکنار متاثر تک نہیں ہوئیں۔ آغوشِ اجل میں ابدی نیند سونے تک وہ اپنی غزلوں اور نظموں میں تیکھی تیکھی باتیں کہتے رہے، اگرچہ وہ ہڈیوں کا ایسا ڈھانچہ تھے جس پر کھال چڑھی تھی۔ عسرت زدگی، تنگ دستی اور کس مپرسی کا یہ عالم تھا کہ مرض الموت میں بھی انھیں مناسب طبی امداد نہیں مل سکی مگر کیا مجال کہ آخر وقت کے کلام میں بھی یاس اور قنوطیت نے جگہ پائی ہو۔ وقت نے ان کی دنیا کو جہنم بنا دیا تھا۔ ان کی زندگی سے تمام مسرتیں چھین لی تھیں بایں ہمہ ان کی شاعری میں آنسوؤں اور آہوں کا پتا نہیں چلتا۔ ان کے اشعار جینے کا حوصلہ بڑھاتے ہیں۔

شاد عارفی کسبی نہیں، وہبی شاعر تھے، ان کے کلام میں جدت اور ندرت کے ساتھ ساتھ نتیجہ انگیز پہلو ہیں۔ ان کی شاعری کا موضوع سماج اور ان کی اپنی دنیا کے چلتے پھرتے انسان ہیں۔ آدمی کتنا ہی صاحب ذوق ہو مگر شاعری میں یکسانیت اکثر بور کر دیتی ہے اس نقطۂ نظر سے اگر ان کا کلام دیکھا جائے تو ان کے ہاں متنوع مضامین کی فراوانی ملے گی۔ ان کا ہر شعر اپنے ساتھ تاثر لے کر چلتا ہے۔ رہ نوردانِ ادب میں انھوں نے اپنے لیے حسین ڈگر کا انتخاب کیا تھا اس پر چل کر انھوں نے نہ صرف اپنی منزل کو پا لیا بلکہ اہل نظر سے اپنی انفرادیت کا بھی اعتراف کرا لیا۔

وہ آراستگیٔ خیال و زبان پر زور دیتے تھے، ان کی شاعری فی الاصل تنقیدِ زندگی ہے۔ ناپسندیدہ بات سن کر، پڑھ کر یا آنکھوں سے دیکھ کر ان کے ذہن میں ایک "چھناکا" سا ہوتا تھا جیسے شیشہ کا گلاس پختہ فرش پر گر کر ٹوٹ جائے اور پھر ایک آگ —— سیال آگ ان کی رگ رگ میں

دوڑنے لگی تھی۔ ایسے مواقع پر ان کے ذہن میں بڑی بے ترتیبی اور ہنگامہ ہوتا تھا اور وہ اپنے خیالات کو فوری طور پر کسی ایک نقطہ پر مرکوز نہیں کر سکتے تھے۔ میری اس بات کے تو آج بھی بہت سے گواہ موجود ہیں کہ تلخ احساسات ان کے دماغ و دل میں اکثر ہلچل مچائے رہتے تھے۔ وہ عموماً نرالی بات کہتے تھے۔ الفاظ کی صوتیاتی تاثیر پر ان کی نظر تھی۔ انھوں نے پرانے اسلوب کو نئی معنویت دینے کی کامیاب کوشش کی ہے اُن کا فن یہ تھا کہ وہ فرسودہ انداز بیان سے محترز تھے۔ اور اُن کے اختیار کردہ طریق فکر اور انداز ادا سے مضمون کا چہرہ دمک اُٹھتا تھا۔ انھوں نے ابرٹ لوئی اسٹیونسن (STEVENSON) کی طرح جو دیکھا اور جو محسوس کیا اپنے انداز میں وہی لکھا۔

بھرتری ہری کا مقولہ ہے کہ دُنیا میں پھول دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جو سر چڑھتے ہیں دوسرے وہ جو جنگل میں کھل کر خود بخود مرجھا جاتے ہیں یہی حال انسانوں کا ہے۔ میرے خیال میں شاؔد عارفی موخر الذکر قسم کے پھول تھے جن کے انقلابی اندازِ فکر اور کھرے تیز نوکیلے طنز نے انھیں کسی کے سر چڑھنے کا موقع نہ دیا۔ انھوں نے زندگی بھر اپنوں اور بے گانوں کے امتیاز کے بغیر لوگوں کے کردار میں کیڑے نکالنے کی کوشش کی اور غزنی کا محمود بن کر بت شکنی کی بجائے دل شکنی کرتے رہے یہی وجہ ہے کہ انھیں تا حیات ناموافق اور نامساعد اسباب کا سامنا کرنا پڑا۔

یہ کہنا تو بے محل ہے کہ "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" کیونکہ ملک کے دارالحکومت میں مناسب دوا اور پرہیز کا تصور ایسا خواب تھا جو شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔ ہاں غلاظت کے باعث بیماری نے پاؤں پھیلا دیئے اور بیماری کی وجہ سے نقاہت میں اضافہ ہوتا گیا۔ علالت بڑھتی گئی اور قوت مدافعت کم ہوتی گئی مگر زندگی اور موت کی یہ کشمکش بھی کب تک قائم رہتی۔ آخر وقت نے کروٹ لی اور حالات کی مجبوریوں کے سامنے انھوں نے گھٹنے ٹیک دیئے اور

آہستگامی کے ساتھ خانہ خرابی کے عالم میں ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ بہ الفاظ دیگر اس جنگ میں موت کو غلبہ نصیب ہوا چنانچہ ۸ فروری ۱۹۶۴ء مطابق ۲۳ رمضان المبارک ۱۳۸۳ھ کی سہ پہر کو شاؔد عارفی نے کس مپرسی کے عالم میں سسک سسک کر دم توڑ دیا۔

۹ فروری ۱۹۶۴ء بروز اتوار (مطابق ۲۴ رمضان المبارک ۱۳۸۳ھ) مرحوم کا جسد خاکی بعد تکفین بوقت ظہر سابق تحصیل کے میدان میں جامع مسجد کے دروازہ پر نماز جنازہ کے لیے لایا گیا۔ جہاں نماز کے بعد جنازے کے فوٹو لیے گئے۔ اگرچہ کم تعداد میں تھے مگر پھر بھی عینی شاہد ہے کہ ہر مذہب و ملت اور ہر فرقہ کے لوگ ان کے جنازے میں شریک ہوئے۔ بیشتر کی آنکھیں پُر آب تھیں۔ آخر منزل بہ منزل یہ دنیوی سفر ختم ہوا اور بستر علالت پر کی ہوئی وصیت کے مطابق اُس فلک بوس ادبی گنبد کو جو دُنیا کو جو دُنیائے شعر میں شاؔد عارفی کے نام سے پہچانا جاتا تھا احاطہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ میں بوقت سہ پہر سپردِ خاک کر دیا گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

راہِ عدم کا مسافر جو "تغافل کمال فن" کو منزلِ آرام پور کہتا تھا ممکن ہے اس کی روح میت کے سفر کا منظر دیکھ کر اس انداز سے سوچ رہی ہو ؎

آئے ہیں تا قبر، دوستاو دفنِ احباب لیے روتن!
کچھ نہ کچھ عزت تو کی یاروں نے مر جانے کے بعد

وہ دُنیا کی نظر میں سمانے کے لیے خود اپنی نظر سے گرنا نہیں چاہتے تھے انھوں نے زندگی بھر اس امر کی کوشش کی کہ ان کی "انا" مجروح نہ ہو وہ اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوئے یہ علیحدہ بات ہے۔ ایک بار میرے خلف اکبر عرفان میاں سلمہ سے دورانِ گفتگو میں میری موجودگی میں فرمایا:

یہ دُنیا بڑی سنگ دل اور جابر ہے اس میں عزت کے ساتھ جینا لوہے کے چنے چبانے کے مترادف ہے۔ اس دور میں تو صرف وہ لوگ کامیاب ہوتے ہیں جن کو

کھری کہنے کی بجائے مصلحتِ وقت کے ماتحت چمکتی ہوئی چیز کو سونا کہہ دیں۔ جو گناہ کو ثواب کا نام دے سکیں۔ جو زردار مگر بے تار اور سماج دشمن عناصر کو اپنے ضمیر کی آواز کو دباتے ہوئے "عالی جاہ" اور "والا مرتبت" کہہ سکیں۔

ان کی اُفتادِ طبع پر روشنی ڈالنے کے لیے ایک مقامی واقعہ کا دہرانا بے محل نہ ہوگا۔

زراعتی نمائش رام پور کے پنڈال میں ۱۲ اور ۱۳ مارچ ۱۹۴۵ء کی درمیانی شب میں ایک آل انڈیا غیر طرحی مُشاعرہ ہونا تھا جب اس کا دعوت نامہ شاد مرحوم کے ہاتھوں میں پہونچا تو آپ نے مرسلہ دعوت نامہ کی پشت پر یہ سطور لکھ کر فوراً واپس کر دیا۔

جناب چیرمین صاحب مشاعرہ کمیٹی

"جلی ہوئی رسّی کے بل" اور "گھڑے کی چکناہٹ"

ان دونوں میں

مجھے کیا پسند ہے سب جانتے ہیں، سب کیا پسند کرتے ہیں مجھے خبر نہیں۔

شاد عارفی

مذکورہ بالا دعوت نامہ مرحوم کی تحریر کے ساتھ آج بھی برادرم ساز سیمابی صاحب کے پاس محفوظ ہے۔

وہ لوگوں کی ظاہری شرافت، نام و نمود اور شخصیت کی سطح سے مرعوب تو کجا متاثر تک نہیں ہوتے تھے، وہ ہمہ وقت دلوں کے اندر جھانکنے کی کوشش کرتے تھے، اُن کا طنز خود اپنی شخصیت کی سطحی نمود کی خاطر نہ تھا۔ اُن کا مقصودِ نظر کسی کا دل توڑنا بھی نہ تھا وہ تو اپنے اشعار کا ایک آئینہ لوگوں کے سامنے پیش کر دیتے تھے تاکہ وہ اس میں اپنے اصلی خد و خال دیکھ سکیں اور اپنی اصلاح کر لیں۔ میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ شاد صاحب نے کبھی بالکل ہی حیثیت سے کوئی مضمون شعر میں نظم کیا ہے لیکن اس کے عام ہوتے ہی بعض لوگوں کو اس طرح بلبلاتے اور شکایت کرتے ہوئے دیکھا گیا ہے گویا مرحوم نے ان کی کسی دُکھتی ہوئی رگ کو مسل دیا تھا۔

ایک مُلاقات میں شاعرانہ طنز پر گفتگو ہو رہی تھی۔ شاد صاحب نے کہا کہ معاف فرمایئے آپ کو اس بارے میں ذاتی تجربہ نہیں ہے کیونکہ آپ اس میدان کے مرد نہیں ہیں ——— فی زمانہ تنقید اور طنز کا انعام "سب و شتم" کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ جب کل آپ اپنے ہمسایہ کی کوئی غلطی نکالیں گے وہ یہی کہے گا کہ اللہ اتنا بُرا ایٹم دیں کسی کو نہ دے میں نے عرض کیا کہ یہ الگ بات ہے کہ لوگ اپنی کمزوریاں اور خامیاں سُن کر ان کو دُور کرنے کی کوشش نہیں کرتے اور اس کے برخلاف ناقد سے ناراض ہو جاتے ہیں مجھے تو حسن بصریؒ کا یہ قول یاد ہے :

"جو تمہاری عیب جوئی کرے تم اس کو "خوش آمدید" کہو کیونکہ اس نے اپنی نیکی تم کو بطور ہدیہ پیش کی ہے۔"

یہ سُن کر شاد صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا تھا کہ اب اس ظرف کے لوگ کہاں ہیں ؟ عملی تجربہ کے لیے کل آپ عمومی حیثیت سے کسی مقامی اخبار میں میرے اس نظریہ کا اعلان کر دیں :

" دولت کی زیادتی اور ایمان کی کمی کے باہمی ملاپ سے "فرعونیت" کا جنم ہوتا ہے" اور پھر دیکھیں کہ رام پور میں اس کی اشاعت سے کتنی پیشانیاں خواہ مخواہ شکن آلود ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی بتا دوں کہ اس کی دو وجوہ ہوں گی اوّل تو یہ کہ پانی نشیب میں مرتا ہے چنانچہ حالات کی مطابقت سے اپنی پوزیشن کا اذیت ناک احساس ہوگا۔ دوم الحق مرٌ (سچی بات کڑوی ہوتی ہے)

شاد عارفی کے کلام میں غیر سنجیدہ شوخ نگاری، آشفتہ گفتاری، کم عیاری و سبک مقالی کی مثال بمشکل ملے گی سخن سنجی کے معاملہ میں ان کو مجتہدانہ بصیرت حاصل تھی۔ اُن کے مذہبِ فکر (SCHOOL OF THOUGHT) میں بڑا نیاپن ہے۔ انھوں نے دُنیا اور دُنیا والوں کو مختلف زاویوں سے دیکھا، وہ روشنی پر اندھیرے کی یورشوں، سماج اور معاشرت کی روز افزوں خرابیوں اور مکدر فضا اور مسموم ماحول کو بہ نظر غائر دیکھ رہے تھے چنانچہ یہی وجہ

ہے کہ جیتے جی ان کے قلم کی پوری توانائی ان تخریبی حالات کے خلاف جہاد میں مصروف رہی۔ وہ کہتے تھے کہ کیا میں دیوانہ ہوں کہ اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھوں مگر کچھ نہ سمجھوں، میرے ہوش و حواس قائم ہیں، میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں، میرے کان سن رہے ہیں میرا دماغ سوچ رہا ہے۔ پھر بھی اگر میں خاموش رہوں تو اس کی وجہ بزدلی کے سوا کچھ نہ ہوگی خواہ اپنے طور پر آپ اسے مصلحت کا نام دے دیں شاید یہی وجہ ہے کہ ان کا قلم کوہ آتش فشاں بنا ہوا تھا جس میں آگ ہی آگ تھی اور اس سے ہر وقت آتش ریز، آتش افروز اور آتش انگن لاوا پھوٹ پھوٹ کر نکلتا رہتا تھا۔

شاد عارفی سے ان کی زندگی اپنا حق مانگتی تھی اور اس کے لیے انھوں نے ہاتھ پاؤں مارنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ انھوں نے راہی دارالبقا ہونے سے قبل کم و بیش ۹۰ روپے محبی سلطان اشرف صاحب کے پاس اپنی تجہیز و تکفین کے لیے جمع کر دیے تھے تاکہ ان کی روح گور و کفن کے معاملے میں کسی کی زیر بار احسان نہ ہو۔

شاد عارفی اب اس دنیائے فانی میں نہیں ہیں۔ یہ پہاڑ وقت کی چکی میں پس پس کے ختم ہو گیا لیکن مجھے لگتا ہے کہ آج بھی بہت سے بندگان خدا کے ذہنوں میں مرحوم کی محبت کے گہرے نقوش ہیں اور بعض حضرات کے دلوں میں ان کے نشترِ قلم کے گہرے زخم بھی ہیں مگر اب ان باتوں کا تذکرہ عبث ہے۔ ع

آں قدح بشکست و آں ساقی نہ ماند

کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

ہوئے نامور بے نشاں کیسے کیسے
زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

ربِّ کریم بڑا ستار العیوب ہے اس نے رمضان المبارک کے مقدس و متبرک مہینہ میں ..... شاد عارفی سے آخری سفر کرایا ہے تو "جادۂ منزل" کی جملہ آسانیوں کا بھی وہی ضامن ہے۔

کرشن موہن کو زندگی کے جلتے پہلوؤں سے خاص دلچسپی ہے۔ زندگی کے دوسرے مظاہر، خاص کر سماجی انسان کے مسائل، ان سے سبق آموزی کا رجحان بھی کرشن موہن کے یہاں موجود ہے۔ ان کا براہِ راست اظہار مطلب کے لیے کافی اور اکثر جگہ اس تاثیر کا حامل ہے، جو دل کی بات کا خاصہ ہے۔

"غزلوں میں فارسی اور ہندی الفاظ پر یکساں قدرت، غیر مردّف اشعار کی کثرت، مشکل قافیے اور بے تکلف گفتگو کا انداز بیان انہیں دور حاضر کے غزل گو شعرا میں ایک منفرد مقام عطا کرتا ہے۔"

—— شمس الرحمن فاروقی

کرشن موہن کا تازہ ترین کلام

کفرستان

ضخامت: دو سو صفحات، ڈیمائی سائز، آفسٹ کی چھپائی، قیمت: بیس روپے

ناشر: نیشنل اکاڈمی، ۹ء انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دلی ۲۔۔۔۱۱

شراب نے کئی گھر اُجاڑے ہیں

اپنے کنبے

کی خوشحالی

کے لئے

اِس سے بچئے

غزلیں

کرشن مراری

رقصِ خیالِ خام کا عالَم وہ دِلرُبا
تُربت کے حادثات میں ڈھلتا چلا گیا

اِک بے سکوں تکان کی شورش میں گم ہُوا
بہری عقیدتوں کا وہ گونگا سا قافلہ

اِک تازگیٔ فکر کا آئینہ دار ہے
لمحوں کی مستیوں کا یہ نغمہ تھکا تھکا

رُوٹھے ہوئے خیال کی دھڑکن کے ساتھ ساتھ
میں چلتے چلتے سوچ کے جنگل میں آ گیا

ہنگامہ ہائے زیست نہ جانے کہاں گئے
سناٹا ایک سوچ کی وادی پہ چھا گیا

جینے کے سَو حسین بہانے بنا لیے
مرنے کی شوخ دشنگ تمنا کو کیا ہوا

اُس حُسنِ خوش خرام کی عشوہ گری نہ پوچھ
اِک بہجتِ خیال کا جادو تھا جا بجا

●●

حیات لکھنوی

حصارِ آب میں اُبھرا ہوا جزیرہ تھا
فرات زیرِ قدم تھی مگر وہ تشنہ تھا

سمجھ کے زہر مجھے عمر بھر وہ چھو نہ سکا
کسی کے لب پہ مرے نام کا عطیہ تھا

فضائے سرد ملی جب تو یہ ہوا احساس
برستی آگ کا شعلہ بھی ایک سایہ تھا

نہ جانے کتنی مرادیں لیے تھا دامن میں
وہ زندگی کو ترستا ہوا جو لمحہ تھا

میں خال و خط بھلا اُس کے بیان کیسے کروں
بس ایک دُھند میں ڈوبا ہوا سا چہرہ تھا

مرے وجود کو کوئی سمیٹتا کیسے
میں ایسا ٹوٹ کے بکھرا کہ ریزہ ریزہ تھا

زمیں تو کھِل گئی ذوقِ چمن طرازی سے
خود اپنی ذات کا ویرانیوں میں نوحہ تھا

اُسی سے فاش ہوئی موسموں کی بے کیفی
جو سبز شاخ پہ اک زرد زرد پتہ تھا

حیاتؔ بحرِ انا میں وہ غرق ہو کے رہا
سمندروں کے مقابل جو ایک قطرہ تھا

●●

بدنام نظر | تجسیم

(۱)

روشن روشن
کندن کندن
شعلہ شعلہ
سانپ کے منہ کی
نمی زہر آلود زباں
اک اک منظر چاٹ رہی ہے

(۲)

پانی کے اوراق نہ الٹیں
زخموں کا اک لمبا کیو
آب نمکیں
بارش ـــ ایک مسلسل بارش
باہر باہر خیریتوں کے اندیکھے الفاظ
اندر اندر
کیڑوں کے ناخن پیوست

(۳)

مٹی گیلی ہوتی تو گھر بنتا
سوکھا برادہ
دیدوں کے آگے پردے
پردوں کے پیچھے سب منظر
خواہش کی میّت
میّت کا گہوارہ خاک

(۴)

آسماں چھونے کی خواہش
دم بہ دم قد کو بڑھاوا دے رہی ہے
پاؤں دھرتی پر جمے رہنے کی خاطر
کھنچ کے سائے بن رہے ہیں
میں کشاکش کی اسیری میں گھرا مجبور
ہوا کے دوش پر بادل کی صورت اپنے ـــ
ـــ گھر کی خوشبو ڈھونڈے پھر رہا ہوں
اور ہوا مجھ کو کہیں رکنے نہیں دیتی

روفی انٹرپرائزز ۶۷ لارڈ بڈھم برج - گیا - بہار

غزلیں

عبداللہ کمال

خالی ذہنوں میں کیا ہے
دن بھر کا ہنگامہ ہے

باہر سے بازو شل ہیں
اندر سرکش گھوڑا ہے

کل، جو اس نے دکھلایا
وہ کل کس نے دیکھا ہے

جنت کے دروازے پر
دوزخ کا داروغہ ہے

اس کی مٹھی میں پارہ
ہم لوگوں کا سینا ہے

پانی پانی چاروں اور
پیاسا پھر بھی پیاسا ہے

سورج شب میں نکلے گا
پرچم اس کا کالا ہے

اندھوں کی اس نگری میں
وہ اک کانا راجا ہے

کاغذ پر کچھ دکھلاؤ
باتوں میں کیا رکھا ہے

▲▲

ارمان نجمی

خواب و خیال منظر و وہم و گماں بھی تھا
یعنی اُفق کے پار کوئی آسماں بھی تھا

تحریر اُس کی آنکھوں کو نمناک کر گئی
لفظوں کے پیرہن میں سلگتا دھواں بھی تھا

اُن بستیوں کو جانے کہاں لے گئی ہوا
کیا ڈھونڈتے کہ خاک پہ کوئی نشاں بھی تھا

دیوار خوف راہ میں حائل تو تھی مگر
خواہش کا زہر اُس کی رگوں میں رواں بھی تھا

کیا سحر تھا کہ ختم نہ ہوتے تھے فاصلے
لمحہ بہ لمحہ وہ مری جانب رواں بھی تھا

▲▲

ڈاکٹر سخاوت شمیم

راتوں کا کیف شہر کی گلیوں پہ چھا گیا
بستر کو گرم چھوڑ کے سڑکوں پہ آ گیا

بے رنگ فاصلوں کی مسافت کو جھیل کر
بڑھتا ہوا جلوس شفق بن کے چھا گیا

آہٹ پہ چونکتے ہوئے صدیاں گزر گئیں
ہر پل پہ یہ گمان ہوا، تو ہی آ گیا

تیرے بدن کی آنچ ہے یا دوپہر کی دھوپ
زلفوں کے سائے میں بھی پسینہ سا آ گیا

کیا نیند میں، میں چونک پڑا تھا کہ چونک کر
گھر کا ہر ایک فرد مرے پاس آ گیا

کچھ دور میرے ساتھ رہی زندگی شمیم
پھر مجھ میں کائنات کا نقشہ سما گیا

▲▲

کل کا منظر نامہ

فاروق شفق

ہواؤں کے سینے پہ کب تک
میں انگلی سے لکھوں
میں کب تک زباں اپنی خاموش رکھوں
میں کب تک سمندر کی پرشور گہرائی میں ڈوبنے اور ابھرنے کا کرتب دکھاؤں

زمینوں کے اور
آسمانوں کے وہ رازِ پنہاں
ازل میں جنھیں مجھ کو سونپا گیا تھا
انھیں اب اٹھانے کی مجھ میں سکت کچھ نہیں ہے

ہوا کی یہ تندی
ہوا کی یہ تیزی
کڑکتی ہوئی دھوپ کی تیز برچھی
بدن کے مساموں میں چبھتی ہوئی برف کی تیز سوئی

کڑی بارشوں میں
ہر اک لمحہ گھلتی بدن کی یہ مٹی

ہمیں سب کی زد پہ
ہمیں سب کا لقمہ

خلا لمحہ لمحہ
مرے سوکھے سینے کا بڑھتا چلا جا رہا ہے

میں وہ راز اب تک
جنھیں اپنے سینے میں محفوظ رکھے ہوئے ہوں
بہت مضطرب ہیں نکلنے کو باہر
اب اس بوجھ سے
میرے بچنے کی صورت یہی ہے
میں گزرے ہوئے خشک موسم کی یتی
آنے والی رتوں کو تھما دوں
زمیں، آسماں، چاند، سورج
سمندر، پہاڑوں کے یہ سلسلے
سب کے کانوں میں اک دوسرے
کا میں ہر راز کہہ دوں
پھر آپس میں اک دوسرے کو لڑا دوں
اور سالم نکل جاؤں میں درمیاں سے

▲▲

ایکسرے

ساجد رشید

(لیاقت خاں کے نام)

ٹپ ——— ٹپ ——— ٹپ !
گلوکوز کا پانی بوتل میں سے قطرہ قطرہ
ٹپ ——— ٹپ ——— ٹپ !!
وقت بھی لمحہ لمحہ،
ٹک ——— ٹک ——— ٹک

میں نے تقریباً پچھلے چھتیس گھنٹوں سے اپنی رسٹ واچ پر نظر نہیں ڈالی ہے کیونکہ میری نظریں تو سامنے بیڈ پر پڑے میرے بزنس مین دوست (ہاں اب میں اُسے دوست کہہ سکتا ہوں کیونکہ اب یہ لفظ بہت عام ہو گیا ہے) کی رسٹ پر جمی ہوئی ہیں جسے تھوڑے تھوڑے وقفے سے سرجن ڈاکٹر تشویش آمیز نظروں اور انگلیوں سے ٹٹولتا رہتا ہے۔

وہ جب بھی نبض دیکھ کر سر اٹھاتا ہے تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے وہ کہے گا: "اب آپ لوگ سو سکتے ہیں۔" مگر وہ ایسا کچھ نہیں کہتا اور سامنے دیوار پر ٹنگی اس تصویر کو گھورنے لگتا ہے جس میں ایک نرس اپنے ہونٹوں پر شہادت کی انگلی رکھے چپ رہنے کا اشارہ کر رہی ہے۔

میں ایمرجینسی وارڈ کی بھیانک خاموشی کو اپنے کان کے پردوں پر شور مچاتا محسوس کرتا ہوں اور گھبرا کر اپنے خشک الجھے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے باہر کوریڈور میں نکل آتا ہوں۔ سامنے دیوار میں لگی لفٹ کے ذریعے تندرست آدمیوں اور کمزور مریضوں کو نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے آتے جاتے دیکھنے لگتا ہوں ——— میرا وہ بزنس مین دوست پرسوں اسکوٹر سے گر پڑنے کے بعد اس سرکاری اسپتال میں پہنچایا گیا تھا اور دماغ پر گہری چوٹ اور دماغ کی رگوں میں خون جم جانے کی وجہ سے دماغ کے خطرناک آپریشن کے بعد سے بے ہوش پڑا اپنے خاندان کے افراد اور دوسرے دوستوں کے صبر و ضبط کا امتحان لے رہا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ وہ مجھ سے اور اپنے خاندان کے افراد سے انتقام لے رہا ہو کر "کھڑے رہو کمبختو! اگر میں آج سے دو روز قبل تم لوگوں سے اپنے انتظار میں دو گھنٹے کھڑے رہنے کو کہتا تو شاید تم لوگ کبھی نہ کھڑے رہتے مگر اب کھڑے رہو میری موت کے انتظار میں!"

کھڑے کھڑے میرے گھٹنوں میں درد ہونے لگا ہے۔ میں سامنے پڑی بنچ پر بھی بیٹھا ہوں مگر دس منٹ سے زیادہ نہیں، اس لیے نہیں کہ مجھے اپنے دوست کے حادثے کا غم بے چین کیے ہوئے ہے۔ بلکہ اس لیے کہ سرکاری اسپتال کے بنچ کے کھٹمل آدمی کو بیٹھنے ہی نہیں دیتے اور غم اور پریشانی کی اداکاری میں معاونت کرتے ہیں۔ مجھے تو حیرت ہے کہ میرے دوست کا بڑا بھائی اس بنچ پر اتنے اطمینان سے کیسے سو رہا ہے! اتنے اطمینان سے تو وہ شاید اپنے چھوٹے بھائی کی گھر میں موجودگی پر بھی اپنے ڈنلوپلو کے بیڈ پر نہیں سویا ہوگا۔ دوسرے لوگ بھی اونگھ رہے ہیں۔ ٹھنڈے فرش پر بچھے سنسنی خیز خبروں والے شام کے اخبار پر بیٹھے۔ میرے دوست کی کمزور بوڑھی ماں اسی ٹھنڈے فرش پر سر ٹیک کر عرش پر بیٹھے ان کروڑوں انسانوں کے خدا سے گڑگڑا کر اپنے جوان بیٹے کی زندگی مانگ رہی ہے! کیا اس بڑھیا کی آواز پہنچے گی اس تک، جبکہ کروڑوں انسان اسی طرح فرش پر سر رکھ کر

۲۰/۸۰۰ باپو را دجگتاپ مارگ بمبئی۔ ۱۱

اپنی اپنی خواہشات کے لیے دعاگو ہوں گے اور پھر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ میرے اس دوست کے ہزاروں روپوں کا کوئی مقروض اسی طرح سر ٹیک کر گڑگڑا کر خدا سے اس کی موت مانگ رہا ہو ــــ تو ــــ تو پھر کیا ہوگا؟ پھر خدا کس کی سنے گا؟ میں خفیف سا مسکرا کر چارمینار سلگا کر ایک لمبا کش کھینچ کر دھواں پھیپھڑوں کے سپرد کر دیتا ہوں۔ اچانک ہی مجھے خیال آتا ہے کہ مجھے اس طرح مسکرانا نہیں چاہیے میں جلدی سے اپنے چاروں اور خوف زدہ نظروں سے دیکھتا ہوں کہ کسی نے مجھے اس طرح مسکراتے دیکھ تو نہیں لیا۔ مجھے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ اس طرح مسکراتے مجھے کسی نے بھی نہیں دیکھا۔ اچھا ہوا کہ اسپتال کا وہ چوکیدار بھی اوپر نہیں ہے ورنہ اس نے بھی مجھے اس طرح مسکراتے دیکھ لیا ہوتا تو بہت برا ہوتا کیونکہ یہاں وارڈ کے باہر دس بارہ اشخاص کے بیٹھنے کی اجازت حاصل کرنے کے لیے میرے دوست کی ماں نے اس چوکیدار کو جو دس روپے دیئے تھے اُن دس روپوں نے اُس پر اتنا اثر ضرور کیا ہے کہ وہ نیچے گیٹ پر بیڑی پیتے ہوئے تو اپنے ساتھیوں سے ہنس بول لیتا ہے مگر یہاں اوپر آتے ہی ایک دم سے اداس نظر آنے لگتا ہے۔ جیسے میرے بے ہوش دوست سے اس کے گہرے دوستانہ مراسم رہے ہوں۔ خیر مجھے اداس نظر آنے کی اداکاری میں خود کو تنہا نہیں محسوس کرنا چاہیے جب کہ وہ چوکیدار بھی میرا رول ادا کر رہا ہے۔

میں باہر کی اداسی سے گھبرا کر اندر وارڈ میں چلا جاتا ہوں جہاں دو زیر تربیت ڈاکٹر جنھوں نے میرے دوست کے دماغ کے آپریشن میں اپنے غیر مشاق ہاتھوں کو اس کی کھوپڑی پر صاف کیا تھا، میز کے قریب کھڑے اس کے جسم کا معائنہ ایسی نظروں سے کر رہے ہیں جیسے بھوکا کتا قصائی کی دکان پر ٹنگی ہوئی بکرے کی ران کو تاکتا ہے۔ میں دیوار کے قریب پڑی میز پر جھک کر رجسٹر پر کچھ لکھتی ہوئی گہرے سانولے رنگ کی ساؤتھ انڈین نرس کے پاس پہنچ کر انگریزی میں پوچھتا ہوں۔

"اس کے بچنے کی کوئی امید؟"

"ہم کچھ بولنے کو نئی سکتا" وہ اپنے ساؤتھ انڈین لب و لہجے میں جواب دیتی ہے۔

وہ جب لفظ "بولنے" کی ادائیگی کے لیے ہونٹ سکوڑتی ہے تو اس کے سیاہ موٹے ہونٹ نہ جانے کیوں مجھے اچھے لگتے ہیں۔ جب کہ اس کے چہرے پر جابجا کیل مہاسوں کے داغ پڑے ہوئے ہیں۔ مجھے بعد میں خود اپنے اس غیر جمالیاتی جذبے پر حیرت ہوتی ہے۔ آخر میں کر بھی کیا سکتا ہوں جب کہ پچھلے دو روز سے میں اسی اسپتال کی سفاک سرد چھت کے نیچے رہ رہا ہوں، کھا رہا ہوں، سو رہا ہوں اور اپنے دوست کی زندگی سے زیادہ موت کا انتظار کر رہا ہوں۔ اگر وہ صحتیاب ہونے بھی لگے تو مجھے پھر سات آٹھ روز اسی حبس زدہ ماحول میں گزارنے ہوں گے اور ہر وقت اپنے چہرے پر تشویش اور اداسی کا لیپ کیے رہنا ہوگا۔ میرا سگریٹ دھیرے دھیرے ختم ہو رہا ہے اور عیادت کو آئے ہوئے لوگ خراٹے بھر رہے ہیں۔ سونا تو میں بھی چاہتا ہوں مگر اسپتال کے ٹھنڈے فرش پر نیند نہیں آتی یا پھر میرے دوست کے مردہ جسم میں زندگی کی رمق باقی رکھنے کے لیے دل کو حرکت میں رکھنے والا جو Respirator چل رہا ہے اس کی سانس لینے جیسی سوں سوں یہاں تک پہنچ کر میرا سکون درہم برہم کر رہی ہے۔ یہ ڈاکٹر بھی بڑے فراڈ ہوتے ہیں آدمی کی تسلی کے لیے انھوں نے عجیب عجیب قسم کے INSTRUMENT بنا رکھے ہیں کہ مریض کا جسم اور دماغ تو مر چکا ہے مگر دل کو چلا رہے ہیں تاکہ مریض کے عزیز و اقارب دھیرے دھیرے اس کی موت کی خبر سننے کے لیے اپنے آپ کو تیار کر لیں! جی چاہ رہا ہے کہ جا کر RESPIRATOR کی وہ نلی کھینچ لوں جسے میرے دوست کے گلے کے نیچے اور سینے سے اوپر سوراخ کر کے داخل کیا گیا ہے۔ مجھے خدا پر غصہ آ رہا ہے جو ستیہ جیت رے کی آرٹ فلموں کے کرداروں کی طرح Slow Motion میں سارے کام انجام دے رہا ہے۔ کوئی فیصلہ ہونے ہی کا

نہیں آرہا ہے۔ اگر میرے دوست کی موت کا کوئی دن معین ہے تو وہ اسی معینہ روز کو ایکسی ڈنٹ کرواکے اسے ختم کر دے!

سلسلے، خیالوں کے سلسلے ـــــ میں گھبرا کر پھر وارڈ میں چلا جاتا ہوں RESPIRATOR بدستور لمبی دوڑ لگا کر تھکے ہوئے گھوڑے کی طرح ہانپ رہا ہے۔ سوں۔ سوں ـــــ سوں! وہ دونوں زیرِ تربیت ڈاکٹر ساؤتھ انڈین نرس کے قریب کرسی پر بیٹھے میرے دوست کے سر کے ایکسرے میز پر پھیلائے بیٹھے ہیں اور ان میں سے ایک ایک کو اٹھا کر روشنی میں دیکھتے ہیں۔ میں آگے بڑھ کر میز پر سے ایک ایکسرے شیٹ اٹھا کر دیکھنے لگتا ہوں۔ ایک کھوپڑی ـــــ نہ جانے کیوں یہ سوچ کر کہ یہ میرے دوست کی کھوپڑی ہے مجھے جھرجھری آجاتی ہے۔ کیوں کہ میرا دوست خوبصورت نہ سہی بدصورت نہیں کہا جاسکتا۔ مگر ـــــ مگر یہ ایکسرے والی کھوپڑی، یہ بھیانک کھوپڑی کیا اسی کی ہے۔ ایکسرے میں صرف ہڈیوں والی کھوپڑی نظر آرہی ہے اور دماغ کا ہلکا سا عکس بھی نہیں ہے۔ دماغ جو سوچتا ہے۔ جو جسم کے سارے نظام کا کنٹرولر ہے۔ وہی غائب ہے۔ میں گھبرا کر ایکسرے شیٹ میز پر رکھ دیتا ہوں۔

"See it" ڈاکٹر اپنے ساتھی ڈاکٹر سے کہہ رہا ہے۔ "ایکسرے میں ساری کھوپڑیاں ایک جیسی ہی نظر آتی ہیں مگر ان کے اندر جو دماغ ہوتے ہیں وہ کتنے مختلف ہوتے ہیں۔ ان کی فکریں ان کی سوچیں کتنی مختلف ہوتی ہیں ـــ ہے نا۔"

یہ سن کر مجھے پھر جھرجھری سی آجاتی ہے۔ جیسے سربازار مجھے چوری کرتے ہوئے پکڑ لیا گیا ہو۔

"ڈاکٹر جس طرح X-Ray اور Screening مشینیں ہیں کیا سائنس آدمی کے دماغ کی سوچ کو منعکس کرنے والی کوئی مشین بھی بنائے گی؟" میں دل کی بات پوچھ لیتا ہوں جیسے کسی بات کا خدشہ ہو۔

"It is dificult but not Impossible" نوجوان زیرِ تربیت ڈاکٹر مسکرا کر میری طرف اپنی خوشنما عینک کے پیچھے سے تاکتے ہوئے کہتا ہے: "مگر شاید ایسا نہیں کیا جائے گا یا پھر اس کی سخت مخالفت ہوگی کیوں کہ ایسی کوئی مشین وجود میں آگئی تو آج کم ز ور سہی مگر رشتے ناطوں کی جو ڈور باقی ہے وہ ایک دم سے ٹوٹ جائے گی، لوگوں کا ایک دوسرے پر سے اعتماد قطعی اٹھ جائے گا اور قدرت کا سارا نظام درہم برہم بھی ہوسکتا ہے۔"

میں اپنے اندر قدرے اطمینان محسوس کرتا ہوں اور اپنے دوست کی حالت کا صحیح علم حاصل کرنا چاہتا ہوں مگر ڈاکٹر نرس کی خاموش رہنے کی تلقین کرنے والی تصویر کو گھورنے لگتا ہے اور دھیرے سے کہتا ہے۔

"ہم اپنے تئیں پوری کوشش کر رہے ہیں باقی خدا کے ہاتھ ہے۔"

میرا جی چاہتا ہے کہ وہ نرس کی تصویر نوچ کر کھڑکی سے نیچے اچھال دوں یا پھر اس ڈاکٹر سے پوچھوں کہ "خدا کے ہاتھ کیوں تمھارے ہاتھ کیوں نہیں؟!" مگر میں کچھ نہ کرا اور پھر نرس کی اس تصویر کو گھورنے لگتا ہوں۔

وارڈ سے باہر نکل آنے کے بعد میں نے دیوار سے پیٹھ ٹیک کر دونوں پیروں کو فرش پر پھیلا کر سگریٹ سلگا لیا ہے اور اپنے ذہن میں وہ تمام جملے یکجا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں جو اس کی موت کے بعد پرسہ دیتے ہوئے اس کی غم زدہ ماں سے کہنے ہوں گے! وارڈ کی دیوار گیر گھڑی کی ٹک ٹک ـــ Respirator کی سوں سوں اور میرے دل کی دھڑکن ہم آہنگ ہوگئی ہیں۔ وقت فضا میں نہیں میری رگوں میں پگھل کر سرایت کرتا جا رہا ہے۔ میرے دوست کی بوڑھی ماں خدا سے اپنے بیٹے کی زندگی مانگتے مانگتے نڈھال ہوکر سو گئی ہے۔ "دھڑ" سے وارڈ کا دروازہ کھول کر ڈاکٹر میرے قریب آتا ہے اور دھیرے سے کہتا ہے۔ "وقت بہت کم ہے وہ دھیرے دھیرے Dead line کی طرف جا رہا ہے" وہ واپس لوٹ گیا ہے۔ میرے اندر جیسے اینٹیں سی گرنے لگتی ہیں۔ میں اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہوں۔ اپنے دوسرے دوستوں کو جگا کر یہ خبر سناتا ہوں۔ وہ نندا سے چہروں پر حیرت لیے مجھے گھورنے

لگتے ہیں گویا میں نے انھیں چھت پر بم گرنے کی اطلاع دی ہو۔

"پھر ـــــ پھر کیا ہو سکتا ہے؟ ان میں سے ایک چونک کر پوچھتا ہے۔

"اب ہمیں اس کی باڈی کو پوسٹ مارٹم سے بچانا ہوگا" میرا لہجہ تھکا ہوا ہے۔

"تو؟"

"تو کیا، آپ لوگ جا کر کسی میونسپل کارپوریٹر سے رابطہ قائم کیجیے شاید وہ لاش کو پوسٹ مارٹم سے بچا سکے۔"

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے مگر ہم میونسپل کارپوریٹر سے کہیں کیا؟" سوال کرتا ہے۔

"یہی کہ ہمارا دوست مر گیا ہے اور ......" میں کہنا چاہتا ہوں۔

"مگر وہ ابھی مرا کہاں!" دوسرا پریشانی سے بات کاٹتا ہے۔

"مرا نہیں ہے تو مر جائے گا" میں جھلا جاتا ہوں۔

اور ان میں سے چار سیڑھیاں اتر کر کسی میونسپل کارپوریٹر کو اتنی رات گئے تلاش کرنے نکل گئے ہیں ـــــ بڑی عجیب بات ہے کہ ہم مریض کی زندگی ہی میں اس کے جسم کو پوسٹ مارٹم سے بچانے کی فکر کرنے لگے ہیں اور آخر کیا بھی کیا جا سکتا ہے۔ ایک بار لاش وارڈ سے نکل جائے تو اس کا پوسٹ مارٹم ہو کر ہی رہتا ہے اور پھر جس مریض کا پولیس کیس بن جائے اُسے پوسٹ مارٹم سے بچانے کی فکر اس کی زندگی ہی میں کرنی پڑتی ہے، ہم ایک دوست کے لیے اس سے زیادہ اور کر بھی کیا سکتے ہیں کہ اس کی باڈی کو چیر پھاڑ سے بچا لیا جائے۔

انھیں کارپوریٹر کی تلاش میں گئے دو گھنٹے بیت چکے ہیں۔ نیند کا خمار آنکھوں میں سوئیاں چبھونے لگا ہے۔ دفعتاً میں اچھل کر کھڑا ہو جاتا ہوں، کیوں کہ گھڑی کی ٹک ٹک اور میرے دل کی دھک دھک سے ہم آہنگ ہونے والی Respirator کی سوں سوں ایک دم سے رک گئی ہے۔ یعنی ـــــ یعنی کہ ـــــ وہ ـــــ میں دوڑ کر اس کی

ماں کو اٹھاتا ہوں اور چیخ کر سو رہے دوستوں کو بیدار کرتا ہوں۔

"وہ ـــــ وہ ـــــ ختم ہو گیا!" اور پھر نہ جانے کون سے جذبے کے تحت میں پھوٹ پھوٹ کر رو پڑتا ہوں۔

ڈاکٹر وارڈ کے دروازے پر کھڑا سپاٹ چہرے سے ہمیں تکے جا رہا ہے۔ دوسرے مریضوں کے عزیز و اقارب سے بار ہا کہا گیا گھسا پٹا جملہ "very Sorry ہم اسے نہیں بچا سکے!" اس کے منہ میں پھنسا ہوا ہے اور میں رو رہا ہوں پھوٹ پھوٹ کر رو رہا ہوں ـــــ کیوں ـــــ آخر کیوں؟

▲▲

اطلاع نامہ بابت ماہنامہ تحریک

از روئے فارم نمبر ۴

وقفۂ اشاعت	ایک ماہ
ایڈیٹر اور مالک	گوپال متل
قومیت	ہندستانی
پتہ: ۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲	
پرنٹر پبلشر	گوپال متل
قومیت	ہندوستانی
پتہ: ۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲	

میں گوپال متل تصدیق کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا اطلاعات میرے علم کے مطابق درست ہیں۔

گوپال متل، پرنٹر

بقلم خود

۲۵ فروری ۱۹۷۸ء

ہمراز

عبدالمتین

جب چودھویں کا چاند نظر آیا تو وہ پہاڑ کے اوپر چلی گئی۔ پہاڑ کی چوٹی پر ایک گھنا اور قدآور درخت تھا۔ اس کے نیچے ایک مستطیل نما بڑی اور چکنی چٹان تھی۔ چٹان پر ایک سادھو آلتی پالتی مارے آنکھیں بند کیے دھیان گیان میں مگن تھا۔ درخت کی شاخوں سے چاندنی چھن چھن کر اس کے جسم کو چھوتی ہوئی چاروں طرف نور کا جال سا بچھا رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ وہاں گئی اور جھٹ سے پھلوں اور مٹھائیوں سے بھری ایک تھالی اس کے سامنے رکھ کر درخت کی اوٹ میں ہو گئی۔ پھلوں اور مٹھائیوں کی خوشبو جیسے ہی سادھو کے نتھنوں سے مس ہوئی وہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا اور تھال اٹھا کر پورب کی جانب دوڑ پڑا۔

سادھو کے چلے جانے کے بعد اس نے چٹان پر لکڑی کے کوئلے سے ایک بہت بڑا دائرہ بنایا اور اس کے بیچ میں کھڑی ہو گئی۔ اس کے بعد اس نے چاند کی طرف دیکھا اور کچھ لمحے اسے گھورتی رہی۔ پھر اس نے اپنے جوان جسم کو کپڑوں سے بے نیاز کر دیا اور آہستہ آہستہ کچھ گنگناتی ہوئی رقص کرنے لگی۔ اتنے میں ایک سبز رنگ کا سانپ قریب کی جھاڑی سے نکل کر آیا اور دائرے کے باہر بیٹھ گیا۔ رقص کرتے کرتے وہ زمین پر گر گئی اور بے سدھ ہو گئی۔ پھر ایک جھاڑی سے گھنگھرو بجنے کی آواز آئی اور چند لمحوں بعد ایک کالی کلوٹی بوڑھی عورت سفید ساڑی میں ملبوس اس سے نکلی۔ اس کے سر پر ایک ٹوکری تھی۔ اس نے ٹوکری زمین پر رکھی اور اس میں سے دودھ سے بھری ایک کٹوری نکال کر سانپ کے سامنے رکھ دی۔ سانپ دودھ پی کر جھاڑی میں واپس چلا گیا۔ پھر اس نے ٹوکری سے لال ململ کی ایک ساری، چند جنگلی پھول اور پانی سے لبریز ایک لوٹا نکالا اور جوان عورت کے منہ پر پانی کا ایک چھینٹا مارا۔ چھینٹا پڑتے ہی وہ کلبلانے لگی اور چند لمحوں بعد اٹھ کر بیٹھ گئی۔ بوڑھی عورت نے لال ساری اس کی طرف پھینکی اور اس نے اپنے بدن پر لپیٹ لی۔ پھر بوڑھی عورت نے جنگلی پھول اس کے بالوں میں لگا دیے اور اس کے ہاتھ تھام کر رقص کرنے لگی۔ رقص کرتے کرتے جوان عورت لڑکھڑانے لگی۔ بوڑھی عورت نے اسے سنبھالتے ہوئے دائرہ کے باہر سے دودھ کی کٹوری اٹھائی۔ سانپ نے اس میں نصف دودھ چھوڑ دیا تھا۔ بوڑھی عورت نے کٹوری اس کے لبوں سے لگا دی اور جوان عورت غٹاغٹ اسے پی گئی۔ دودھ پیتے ہی اس نے سارے جسم میں نشے کی سی کیفیت محسوس کی اور اس کی آنکھیں چڑھ گئیں۔ جوان عورت نے بڑھیا سے کہا۔

"مجھے آئینہ دو"

کچھ سوچنے کے بعد بڑھیا بولی:

"آئینہ تو نہیں ہے"

"تو پھر تم نے مجھے کیوں جگایا"

"میں نے نہیں جگایا، تم تو خود ہی جاگ رہی تھیں"

"تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟"

"ہاں میں ٹھیک کہہ رہی ہوں، تم جاگ رہی تھیں۔ میں نے تو......"

"تم باتیں نہ بناؤ، مجھے آئینہ دو"

اس کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بڑھیا نے کہا:

"اچھا تو چلو"

اور دونوں اس جگہ سے چل پڑیں۔ صبح میں ایک ٹیلا پر

سی۔ایم۔پی۔ایف آفس، آسنسول (بنگال)

ایک عالی شان مکان نظر آیا۔ بڑھیا اس جگہ رک گئی اور جوان عورت سے کہا:

"جاؤ، اندر جاؤ، تمہیں یہاں آئینہ مل جائے گا۔"

"اور تم؟"

"میں؟" بڑھیا نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور پھر کہا:

"بہت دن ہوئے کہ میں اس مکان سے نکال دی گئی ہوں۔ یہ تمہارے لیے ہے، جاؤ۔"

نوجوان عورت جیسے ہی صدر دروازہ کی جانب بڑھی، بڑھیا نے کہا:

"اس مکان کی خواب گاہ میں ایک سیاہ رنگ کی الماری ہے، اُسے تم کبھی نہ کھولنا۔" یہ کہہ کر بڑھیا لوٹ گئی اور جوان عورت مکان میں داخل ہو گئی۔

وہ خواب گاہ میں پہنچی تو وہاں ایک کونے میں بہت بڑی اور خوبصورت سنگار میز نظر آئی۔ پاس ہی ایک سرخ رنگ کی الماری تھی۔ غیر ارادی طور پر اس نے الماری کھول دی۔ یہ بہت عمدہ ملبوسات سے پُر تھی۔ اس نے ایک زرق برق ساڑی اور میچنگ بلاؤز نکال کر زیب تن کیا۔ پھر سنگار میز پر بیٹھ کر آئینے میں اپنے جسم اور حسن کا جائزہ لیا اور آرائش میں محو ہو گئی۔ آرائش کر چکی تو اس کی نظر ایک ستار پر پڑی اور وہ اسے بجانے لگی۔ نغمہ ہر سو پھیلنے لگا اور فضا سحر آگیں ہو گئی۔ معاً دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ اُس نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے ایک خوبصورت جوان بہت ہی قیمتی لباس میں کھڑا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر مبہوت ہو گئی۔ جوان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی۔ اس نے کہا:

"تم آگئیں؟"

"کیا تمہیں میرا انتظار تھا؟"

"انتظار اس کا ہوتا ہے جو آنا نہیں چاہتا۔ تمھیں تو آنا ہی تھا۔"

"کیسے؟"

جوان نے اس کی انگلی پکڑ کر کہا "چلو آؤ، اتنا وقت نہیں ہے۔"

پھر وہ اس کی انگلی پکڑے ہوئے کمرے میں آگیا اور کمرے کے وسط میں بچھی ہوئی مسہری پر بیٹھ گیا۔ جوان سے عورت نے کہا:

"اب؟"

"تم ستار بجاؤ اور میں سنوں گا۔"

"کب تک؟"

"جب تک رات نہ آئے۔"

"اور جب رات آجائے گی تب....."

"تب چاند نکلے گا....."

"اور جب چاند نکلے گا؟"

"اس وقت ایک چاند میری گود میں ہوگا۔" یہ سنتے ہی عورت مسحور ہو گئی اور ستار بجانے لگی..... پھر دوپہر ڈھلی، شام آئی اور جب شام، شب میں تبدیل ہو گئی تو دریچے سے چاند نے سر نکالا۔ جوان ایک الماری کی طرف لپکا، اس سے مئے ارغوانی کی ایک بوتل نکالی اور جام میں ڈھال کر پینے لگا۔ جب پی کر مدہوش ہو گیا تو اس نے عورت کو اپنی آغوش میں بھر لیا پھر اس نے مسہری کے پردے گرا دیے اور اس کی زلفوں سے کھیلنے لگا۔

صبح ہوئی تو جوان سویا ہوا تھا۔ عورت بہت دیر تک اس کے جاگنے کا انتظار کرتی رہی۔ مگر وہ خراٹے لیتا رہا۔ آخر وہ اکتا کر اٹھی اور سیاہ الماری کے پاس آئی اور غیر شعوری طور پر اسے کھول دیا۔ اس میں پھلوں اور مٹھائیوں سے بھری ہوئی ایک تھالی تھی۔ اس نے اسے اٹھا لیا اور باہر کی طرف چل پڑی۔ اتنے میں جوان کی نیند ٹوٹ گئی اور وہ چلاتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ عورت نے اپنی چال تیز کر دی۔ جوان نے دوڑ کر اسے پکڑ لیا اور کہا:

"تم مت جاؤ۔"

"میں جاؤں گی۔"

"اگر تم نے میری بات نہ مانی تو تمہارا خون کر دوں گا۔"

"کر دو۔"

یہ سنتے ہی جوان نے دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن پکڑلی۔ اور تھالی اس کے ہاتھ سے گر گئی۔ تھال کے گرتے ہی چھت سے ایک سبز رنگ کا سانپ جوان کے کندھے پر گرا اور اسے ڈس لیا۔ جوان چیخ مار کر اسی جگہ ڈھیر ہوگیا۔ اور عورت دوڑ پڑی۔

دوسری صبح کو وہ اسی پہاڑ کی چوٹی پر پہنچی، جہاں سے چلی تھی۔ درخت کے نیچے چٹان پر ایک شخص چادر اوڑھے پڑا تھا۔ وہ اس جگہ کھڑی ہوگئی اور اس کے اٹھنے کا انتظار کرنے لگی۔ سورج سر پہ آگیا، مگر وہ شخص اسی طرح پڑا رہا۔ آخر اکتا کر جوان عورت نے چادر ہٹا دی۔ چادر کے نیچے سادھو تھا اور اس کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ عورت کی نظر جیسے ہی اس کی آنکھوں پر پڑی، اس کے منہ سے ایک ہیبتناک چیخ نکلی۔

وہ اسی جگہ بیٹھی رہی۔ لمحے بیتتے رہے اور شب و روز اور ماہ و سال کے جال بنتے رہے۔ پھر ایک دن دوپہر میں وہ اٹھی اور ایک چشمہ کے پاس آئی اور اس میں جھانکا۔ پانی میں وہ بڑھیا نظر آئی، جو اس کی ہم راز تھی۔ ▲▲

(بقیہ صفحہ لوگ سے صفحہ ۱۳)

چار کاریں اور پانچ اسکوٹر تھے۔ مجھے غلط جگہ اور وقت پر اپنی موجودگی کا احساس کچوٹ رہا تھا، میں وہاں سے گھر کے لیے چل پڑا۔

میری جیب میں سنہا صاحب کے نام سفارشی چٹھی تھی۔ ▲▲

نگار رامپور

کے فائل ۶۴-۱۹۶۳ء کے متفرق پرچے ایک ہی جلد میں۔ اہم تنقیدی و تحقیقی مضامین کے علاوہ فن تاریخ گوئی سے متعلق دو مستند کتابیں یعنی جلال لکھنوی کی افادۂ تاریخ اور نامور شعرائے اردو کے قطعات تاریخ ہائے وفات کا مجموعہ تاریخ لطیف بھی اس جلد میں شامل ہیں۔ صرف چند کاپیاں ہی اسٹاک میں موجود ہیں۔

قیمت : ۳۰ روپے

نیشنل اکاڈمی سے طلب کیجیے

پہچان کا درد اور رفتہ مودات کے بعد

حمید الماس

کی تیسری کتاب

شبِ گرد

شائع ہو چکی ہے

قیمت : دس روپے

اسلوبیات پر پہلی مکمل مفصل اور باقاعدہ کتاب

ڈاکٹر امیر اللہ خاں شاہین

کی تازہ تصنیف

اردو اسالیبِ نثر

جو گیارھویں سے بیسویں صدی تک کے اسالیب کا محاکمہ ہے۔

قیمت : ۲۵ روپے

نازش بک سنٹر کی پیشکش

گوپال متّل ـــ ایک مطالعہ

مصنف : محمد عبدالحکیم ایم اے (عثمانیہ)
ضخامت : ۱۲۴ صفحات ، قیمت : پندرہ روپے
ناشر : نازش بک سنٹر ترکمان گیٹ دہلی ۱۱۰۰۰۶

اُردو ادب میں ترقی پسند تحریک کو جس سرعت سے عروج حاصل ہوا، اسی تیزی سے وہ زوال پذیر بھی ہو گئی چنانچہ آج کی جدید نسل کے ادیبوں میں اس تحریک کے کئی مخالف آپ کو مل جائیں گے۔ لیکن گوپال متّل وہ پہلے ادیب ہیں جنھوں نے اس تحریک سے اختلاف کیا۔ اور اپنی تحریروں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ یہ تحریک اُردو ادب کے لیے ایک منفی تحریک ہے۔ گوپال متّل نے صرف ترقی پسند تحریک کی مخالفت ہی نہیں کی بلکہ ایک نڈر صحافی، بے لاگ .... نقاد، بالغ نظر ادیب، کامیاب مترجم اور مقبول شاعر کی حیثیت سے اُردو ادب میں اہم جگہ بنالی ہے وہ اپنے رسالے "تحریک" کے ذریعہ اُردو کی بے لوث خدمت کر رہے ہیں۔ ادبی دیانتداری کا تقاضہ ہے کہ ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا جائے۔ خوشی کی بات ہے کہ عثمانیہ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل ذہین نوجوان جناب محمد عبدالحکیم نے اس کام میں پہل کی ہے۔

یہ کتاب دراصل حکیم صاحب کا وہ تحقیقی مقالہ ہے جس کو انھوں نے ایم اے (اُردو) کے امتحان میں ایک پرچہ کی حیثیت سے لکھا تھا اور ہمیں علم ہے کہ سالِ آخر کے پانچ چھ ماہ کی مختصر مدت میں اس مقالے کو دوسرے مضامین کی تیاری کے ساتھ لکھنا ہوتا ہے اس لیے کسی طالب علم سے موضوع کے ساتھ پورا پورا انصاف کرنے کی توقع رکھنا اس کے ساتھ زیادتی ہے لیکن ہمیں حیرت ہے کہ حکیم صاحب نے اپنے موضوع یعنی گوپال متّل کی شخصیت کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ہے اور ان کی شخصیت کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ جس کی ایک کامیاب مصنف سے توقع کی جا سکتی ہے۔

زیرِ نظر کتاب کو چھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا باب حالاتِ زندگی پر مشتمل ہے۔ دوسرے باب میں متّل صاحب کی صحافتی خدمات کا تذکرہ کیا گیا ہے جس کے مطالعہ سے متّل صاحب کے اس میدان میں گوناگوں تجربات کا علم ہوتا ہے۔ باب سوم میں متّل صاحب کی ادبی خدمات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ متّل صاحب اپنے خاص طرزِ تحریر اور اسلوب بیان کے لحاظ سے اُردو ادب میں ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ باب چہارم میں متّل صاحب کو شاعر کی حیثیت سے متعارف کیا گیا ہے۔ باب پنجم میں مجموعی طور پر ادب میں متّل صاحب کی حیثیت کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ باب ششم میں متّل صاحب کے ادبی پارے اور منتخب کلام شامل کیا گیا ہے جس کے مطالعہ سے متّل صاحب کی شخصیت کے مختلف پہلو پوری طرح سامنے آ جاتے ہیں جو پڑھنے والوں پر ایک خاص تاثر چھوڑتے ہیں۔ کتاب کے آغاز میں مشہور شاعر جناب محمود سعیدی صاحب کا مضمون "مت سہل انھیں جانو" کے عنوان سے شاملِ کتاب ہے جس میں انھوں نے متّل صاحب کے بارے میں تفصیلی طور پر اپنے تاثرات کا اظہار دلچسپ پیرائے میں کیا ہے۔

کتاب کی چھپائی عمدہ اور گٹ اپ دیدہ زیب ہے۔ کتاب کا سرورق نفیس ہے زبان میں اختصار کے باوجود روانی ہے۔

محمد عبدالرحیم۔ پندرہ روزہ "نئی دھارا" حیدرآباد دکن

غزلیں

نصیر پرواز

تلاشِ سایہ میں جو ہے برہنہ سر ہوگا
شعاعِ مہر کی رحمت سے بے خبر ہوگا

گلی گلی ہے مری بازیافت کی کوشش
مجھے جو ڈھونڈ نکالے گا دیدہ ور ہوگا

ہر اک قدم پہ ہے مانوس آہٹوں کا ہجوم
مرے تعاقبِ پیہم میں میرا گھر ہوگا

کبھی تو خود پہ مجھے اعتماد آئے گا
کبھی تو تجھ پہ مری بات کا اثر ہوگا

کوئی تو سمجھے گا آخر مری نوا کا گداز
دیارِ شب میں کوئی صاحبِ نظر ہوگا

▲▲

سحر سعیدی

دل میں احساس کی کو رات کو تھرائی بہت
پھول مہکے تو لبِ سرخ کی یاد آئی بہت

ڈوب کر پار نکلنا کوئی آسان نہ تھا
نیلی آنکھوں کے سمندر میں تھی گہرائی بہت

یہ الگ بات کہ ہم اس کے تعاقب میں رہے
زندگی ہم سے مگر راہ میں کترائی بہت

تیز اتنی نہ تھی پہلے کبھی احساس کی لے
میرے احباب نے کی حوصلہ افزائی بہت

وہ جو اک بات سمجھ لینے کی ہوتی ہے سحرؔ
ہم نے وہ بات بھی اُس شخص کو سمجھائی بہت

▲▲

ہوش نعمانی

جب تک کہ نیلے پانی میں مچھلی چھپی رہی
کشتی ہر ایک موج کا منہ چومتی رہی

اندھے کنویں میں ڈال دو اب سیکس کی کتاب
وہ برف جیسی آئی تھی اور برف ہی رہی

سگرٹ نہ تھے شراب نہ تھی آپ بھی نہ تھے
اک رات تھی جو میرا لہو چاٹتی رہی

آغوش وا کیے تھی ہر اک مالوے کی شب
لیکن اودھ کی شام مجھے ٹوکتی رہی

اے ہوشؔ میں کبھی ڈھونڈ رہا تھا راہِ فرار
تقدیر بھی نگاہ جمائے کھڑی رہی

▲▲

○ بھارت سعید ہیوی الیکٹریکلز لمیٹڈ کمانلر جھانسی ○ ۱۷۔۱۸ ا، ٹولی کی مسجد جیل پورہ، اورنگ آباد ○ اشتر خانہ، رامپور، یوپی۔

نظمیں

ڈاکٹر فضلِ امام

مینڈک اور آدمی

ہم نے لیبارٹری ہیں،
خوب چیر پھاڑ کر دیکھ لیا،
تو یہی حاصلِ تجزیہ ٹھہرا،
کہ مینڈک اور آدمی میں کوئی فرق نہیں،
تعمیر، تشکیل، ساخت اور نشو و نما میں،
اندازِ فکر ـــ اور زیست کے طریقۂ کار میں،
سوا اس کے کہ:
مینڈک تفریح کے لیے آدمی پر پتھر نہیں پھینکتا!

زندگی

معلوم نہیں،
آج تک کیوں جیتا رہا اور کیوں کر جیا،
جو بھی جی لیا،
جس طرح بھی، جیسے بھی
بس یہ کہ جی لیا!
کوئی خواہش نہیں ـــ اور کوئی حسرت نہیں
افسوس! ـــ صد افسوس؟
یہی کہ ـــ بھیڑ بکریوں کے درمیان جیتا رہا،
مسرت! ـــ لازوال مسرت؟
یہی کہ ان کی طرح نہیں جیا

ش ـ ک ـ نظام

اندھا کنواں

آمد و رفت کی آواز میں ـــ
کیا چھپا ہے!
سُنا ہے؟

ٹھٹھکتی ہوئی گھنٹیوں کی صدائیں ـــ
مسلسل صدائیں!
سُنی ہیں؟

بجھنے کی خاطر
کبھی ڈول ـــ
تم نے بھی
پانی کے سینے پہ پھینکا ہے "دھپ" سے
چرخی کی آواز میں کیا چھپا ہے؟
سُنا ہے؟

مرا، بارہا ایک ایسے پرندے سے پالا پڑا ہے
جو پچھلے دنوں سے
کنوئیں میں
پڑا ہے

اُسی نے کہا ہے ـــ
"سفر سلسلہ ہے"...
وہ اک حلقۂ نور کو کھوجتا ہے
کنوئیں میں صدا ہے!!

○ اُستاد، شعبۂ اُردو، راجستھان یونیورسٹی۔ جے پور ○ کلّا اسٹریٹ، جودھپور۔

غزلیں

نجم عثمانی

میرے شہر میں رہتے ہیں کچھ ایسے چھیل چھبیلے لوگ
من کے اندر گھور اندھیرا تن کے ہیں چمکیلے لوگ

جانے ان کے جسم کے اندر کونسا موسم رہتا ہے
اوپر سے ہیں آگ کے جیسے اندر سے برفیلے لوگ

یہ کمزور طبیعت تیری میرے لیے اک بوجھ بنی
جیسے جیسے موم ہوا میں اور ہوئے پتھریلے لوگ

آج تلک میں سمجھ نہ پایا جانے اس میں بھید ہے کیا
جب جب موسم سبز ملا ہے اور ہوئے ہیں پیلے لوگ

عیاری کے دور میں آخر نجم یہ کیونکر جان سکوں
کہاں کہاں سے کیسے ہوئے ہیں کہاں کہاں سے ڈھیلے لوگ

▲▲

اسعد بدایونی

پوچھو اگر تو کرتے ہیں انکار سب کے سب
یہ سچ کہ ہیں حیات سے بیزار سب کے سب

اپنی خبر سے کوئی بھی واقف نہیں مگر
پڑھتے ہیں اب بھی شہر میں اخبار سب کے سب

پاگل ہوا سے دیر تلک لڑ نہ پائیں گے
مفروضِ بادِ شہر میں اشجار سب کے سب

تھا ایک میں جو شرطِ وفا توڑتا رہا
سچ ہے کہ باوفا تھے مرے یار سب کے سب

سوچو تو گالیوں کا ذخیرہ ہر ایک دل
کرنے ہیں یوں تو پیار کا اظہار سب کے سب

زنداں کوئی قریب نہیں اور نہ رقص گاہ
سنتے ہیں کیوں عجیب سی جھنکار سب کے سب

ذہنوں میں کھولتا تھا جو لاوا وہ جم گیا
مفلوج ہو کے رہ گئے فنکار سب کے سب

▲▲

اشہر ہاشمی

کوئی ہو کہیں کا ہو اگر ہے تو نظر آ
آنکھوں کے مقابل کسی منظر پہ ابھر آ

اس سے بڑی الجھن ہے مجھے آگ کے طالب
لے میری ہتھیلی پہ ہے اک شعلہ، ادھر آ

پھر پیاس سرابوں کی طلبگار ہوئی ہے
اک ریت کا دریا لیے اے دشتِ سفر آ

دن رات یونہی کھینچتا رہتا ہوں لکیریں
کاغذ پہ کسی روز مرے خواب ابھر آ

خاموش اندھیروں میں گھٹ جائے کہیں دم
اے جوئے درخشاں! تو کسی دن مرے گھر آ

▲▲

○ کیراف: سید ابوالقاسم سی ایم پی۔ ایف آفس دھنباد (بہار) ○ احمد بلڈنگ سرائے چودھری، بدایوں ۲۴۳۶۰۱ (یوپی) ○ ۳۱۔ روشن گولڈن لین۔ ۱۱۱۰۱۷۔ مہوڑہ۔

نظمیں

جبار جمیل

ایک جنازے کے ساتھ

ذہن ذہن یاسیت
روح روح خامشی
قلب قلب بے کراں اداسیوں کے قافلے
چشم چشم بے ثبات دہر کا تصورِ سیاہ فام
لفظ لفظ ناامیدیوں کے پر کٹے پرند
اور پھر بوقتِ واپسی
وہی زر و زن و زمین کی حکایتیں
تغیراتِ کاروبار کی وہی شکایتیں
زیاں و نفع کے وہی مذاکرے
وہی کمینہ مشغلے
زندگی اے زندگی
تو بھی کیا عجیب ہے

٭٭

نئے اصحاب کہف

فرصت ہی فرصت ہو اس پر
جیب میں کافی پیسہ بھی ہو
سرکس، ہوٹل، بار، تھیٹر
سارے سو ویرے سر میں لیکر
گھر سے نکلیں
اور پھر عجب بازار میں آئیں
لوگ ہمیں حیرت سے دیکھیں
پھر ہم کو معلوم کرائیں
ہم جو سکے لے آئے ہیں
وہ تو صدیوں پہلے کے ہیں
کاش کسی دن ایسا بھی ہو

٭٭

ماہر منصور

سمندر کی ایک شام

مچھلیاں آگئیں کنارے پر
دل کو بہلا رہی ہیں پانی میں
کروٹیں لے رہی ہیں پانی میں
مچھلیوں پر ہیں سانپ کی نظریں

لوگ ہنس ہنس کے دیکھتے ہیں مگر
تھی نہ سورج کو تابِ بینائی
چھپ رہا ہے پہاڑ کے پیچھے

٭٭

○ معرفت تشہلاتی ای بی بی مسجد، مومن پورہ، گلبرگہ۔ کرناٹک ○ وائرلیس لائسنس انسپکٹر۔ ٹمکور۔

ویرانے کا تنہا درخت

اختر واصف

یہ اس وقت کی بات ہے جب اس کے جسم پر صرف دو پتے سایہ کیے ہوئے تھے۔ سامنے والی حویلی کا تمام رنگ و روغن غائب ہو چکا تھا۔ بیشتر دیواریں گر چکی تھیں اور جو رہ گئی تھیں وہ ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہی تھیں۔ حویلی کے سامنے والا تالاب جس کے کنارے وہ پودا اگ رہا تھا، خشک ہونے پر تھا۔

کبھی یہ جگہ آباد رہی ہوگی۔ حویلی کے دروازوں پر دبیز پردے لٹکا کرتے ہوں گے۔ شاید سامنے والی جگہ میں ایک باغ بھی رہا ہوگا جس میں خوش رنگ غنچے کھلا کرتے ہوں گے تتلیاں اپنے رنگین پروں کو پھیلا کر اڑا کرتی ہوں گی۔ کبوتر آزاد فضا میں اڑانیں بھرا کرتے ہوں گے اور شام کو اپنے ڈربوں میں گھس کر پیار بھری باتیں کیا کرتے ہوں گے۔

....

....

لیکن اب تو کچھ بھی نہیں۔ صرف وہ ننھا سا پودا بڑھ کر ایک درخت بن گیا ہے جس کی شاخوں پہ کچھ ہرے کچھ زرد پتے سہمے سہمے سے، ہوا کے رخ سے آنکھیں چرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

—— اے درخت، تو کتنا بدنصیب ہے۔ کیسے گزارے ہیں تو نے یہ پچیس برس۔؟

—— پچیس برس! لگتا ہے صدیاں گزر گئیں۔ پرانی حویلی کی صرف ایک دیوار رہ گئی ہے جو آدھی گر چکی ہے اور تالاب تو جانے کب کا خشک ہو چکا۔

یہ ویرانہ، یہ تنہائی۔ اکثر سوچتا ہوں میں پیدا ہی کیوں ہوا۔ کبھی کبھی مجھ پہ دیوانگی کا دورہ پڑ جاتا ہے اور میں چیخ چیخ کر پوچھتا ہوں..... میں کیوں پیدا ہوا.....؟

کیوں.....؟!

لیکن کوئی جواب نہیں دیتا۔ صرف یہ ویرانہ بہت دیر تک میرا سوال دہراتا رہتا ہے اور میں پاگل ہو جاتا ہوں۔ جی چاہتا ہے اپنے وجود کو پاش پاش کر دوں۔

یہاں کوئی کبھی آتا بھی نہیں۔ سوائے ان دو کے۔ وہ بوڑھا نحیف و نزار شخص جس کی پیلی پیلی آنکھیں اپنے حلقوں سے باہر نکلی سی لگتی ہیں۔ گال دھنس کر مسوڑوں سے جا ملے ہیں۔ لمحہ دو لمحہ درخت کے نیچے ٹھہر کر اسے حیرت سے دیکھتا ہے اور چھاؤں نہ پا کر آگے بڑھ جاتا ہے تو میں رو پڑتا ہوں۔ میری خواہش ہوتی ہے، دیکھو تو، تمہارا عکس کیسا ہے؟

یا پھر، کبھی کبھی وہ لڑکی آ جاتی ہے جو درخت سے سٹ کر، بیٹھی بیٹھی گھنٹوں حویلی کی اس ادھ گری دیوار کو دیکھا کرتی ہے۔ پاگل لڑکی! جانے کیا تلاشتی ہے اس ویرانے میں —— گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے بیٹھنے کے بعد اپنی گیلی آنکھوں کو رومال سے خشک کرتی ہوئی وہ بھی چلی جاتی ہے۔

ہائے، میں اسے ایک نرم چھاؤں بھی نہیں دے سکتا۔

پھر یوں ہوا کہ ایک دن وہ لڑکی بڑی دیر تک، اس درخت کے نیچے بیٹھی، حویلی کی اکیلی دیوار پر جانے کون سی تحریریں پڑھتے پڑھتے اچانک ہی رو پڑی —— خدایا...... ویرانے میں کھڑا یہ درخت کب تک تنہائی کا کرب جھیلتا رہے گا۔ یہ خاموشی..... یہ سناٹا..... اسے نگل کیوں نہیں جاتا؟

خدایا..... مجھے بتا کہ میں کس لیے ہوں۔ یہ بے سایہ درخت کس لیے ہے؟ یہ خشک تالاب کس لیے ہے۔؟

معرفت این۔ ایم۔ انصاری، ایمپلائمنٹ ایکسچینج، بیلی روڈ، پٹنہ

یہ عذاب ہم پہ کیوں مسلط کیا گیا ہے۔؟
نہیں خدایا..... میں نہیں سہہ سکتی یہ عذاب کہ ہر لمحہ برسوں میں تبدیل ہو جائے۔

لڑکی بہت دیر تک پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔
پھر اٹھی اور آہستہ آہستہ دور کہیں دھندلکوں میں کھو گئی۔
درخت اسے اپنی بے آواز صداؤں سے روکتا رہا..... روکتا رہا۔ لیکن وہ نہ رکی۔ کھو گئی..... دور کہیں دھندلکوں میں۔

تب درخت جیسے پاگل ہو گیا۔ بہت دیر تک چیخ چیخ کر روتا رہا اور ویرانہ بھی اس کا ساتھ دیتا رہا۔

..... اور اسی دن، جیسے ہی شام ڈھلی آسمان پہ بادل امڈ امڈ کے آئے۔ ہوائیں دیوانی ہو گئیں۔ بجلیاں تلواروں کی طرح چمکنے لگیں۔ خوب زور زور سے پانی برسا۔ درخت کے بہت سارے پتے اس سے چھوٹ کر پانی کے ساتھ بہہ گئے۔ اور درخت ہواؤں کی زد پہ اس طرح دائیں بائیں لہرانے لگا کہ اب گرا اب گرا۔ ایک بار بجلی زور سے کڑکی اور حویلی کی آدھی دیوار بھی منہدم ہو گئی۔

تب وہ درخت گڑگڑا گڑگڑا کے خدا کے حضور میں دعائیں کرنے لگا۔

— خدایا شاید فیصلے کی گھڑی آ پہنچی۔ آج شاید قصہ پاک ہی ہو جائے۔ کہ یہ صدیوں کا کرب..... یہ پیاس اب برداشت بھی نہیں ہوتی۔

خدایا۔ کل کو جب یہ طوفان ختم جائے گا تو شاید میں نہ رہوں گا۔ لیکن خدایا..... خدایا..... تو اس حویلی کو پھر سے آباد کر دینا۔ اس کے دروازوں پر دبیز پردے لٹکا دینا، سرخ مومی شمعیں جلا دینا۔ خشک تالاب کو پھر سے لبریز کر دینا۔

خدایا..... اس حویلی کے سامنے پھر سے ایک خوش رنگ باغ لگا دینا۔ جہاں رنگ برنگی تتلیاں اڑا کریں گی۔ فاختاؤں کے جوڑے پیار بھری باتیں کیا کریں گے۔

..... اور یہاں، میری جگہ تو ایک سر سبز و شاداب تناور درخت لگا دینا۔ کہ پھر کوئی ویرانے میں کھڑے کسی درخت سے سٹ کر رویا نہ کرے..... رویا نہ کرے خدایا..... خدایا.......

زبان اور قواعد
زبان کی ساخت، اس کے تشکیلی ضابطوں اور ارتقائی مراحل پر
رشید حسن خاں
کے عالمانہ مضامین
قیمت : ۱۷ روپے

نیا ادب نئے مسائل
بشیر نواز کے خیال انگیز مضامین
روایت اور جدت کے رشتوں کی بازیافت
نئے ادب کا معروضی جائزہ۔
قیمت : دس روپے

حیات لکھنوی کی پہلی شعری پیشکش
حصار آب
غزلیں جن میں روایت کا حسن بھی ہے اور اپنے عہد کی گونج بھی،
عمدہ گیٹ اپ، ڈمائی سائز
قیمت : دس روپے
نیشنل اکادمی سے طلب کریں

اندر کی بات

احمد تنویر

یہی ہے کہ ہم نے جو اس پار جانے کی خواہش کی تھی اس کا انجام اپنی آنکھوں کے سامنے ہی دیکھنا مقدر میں لکھا تھا۔

وسعتوں کے پھیلے ہوئے دائرے نیم خوابیدہ مسلول کے آہنی تیروں کی ضرب کاری سے تڑپ تڑپ اٹھے۔ نیم شفاف پردے آنکھوں کے سامنے لہرا رہے تھے اور اس پار ناخنوں کا زہر ہوا کے سینے میں دھیرے دھیرے اترتا جا رہا تھا۔

کمرے میں زندگی کی ساری نسیں کٹی پڑی تھیں۔ خون پھیل پھیل کر سیاہی میں تبدیل ہونے لگا تھا۔ پیلی دیوار سے چپکی سفید سفید لکڑی کے چوکور میں دودھ پیتی ہوئی بلی اس کے خشک ہونٹوں کو تقویت پہنچانے لگی۔ دوسرے پل تلخ دوا کا آخری گھونٹ اس نے حلق میں اتار کر مجھے عجیب نظروں سے گھورا۔ ایک جلن اس کی آنکھوں میں رینگ رہی تھی اور اس کی انگلیاں ہوا میں کچھ لکھنے اور غرغراتی آواز میری سماعت پر بوند بوند گرنے کے لیے بے چین تھی۔

اور یہ حقیقت تھی کہ جب خشک ہواؤں کی لپلپاتی زبان جسم کی تمام نرمی چاٹ گئی اور پانی کا ایک قطرہ بھی اس کے جسم میں باقی نہ رہا تو پھر ایک چرچراہٹ کے ساتھ اس کی جلد پرا گئے ہوئے تمام بجھاتے زخموں کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ تب اس کی آنکھیں اندر بہت اندر اور باہر بہت باہر آنے جانے لگیں۔ زخموں سے شگاف جسم کے اندرونی حصے تک پہنچ گئے اور تب درد کی شدت گوشت کے ریشوں سے گزرتی ہوئی ہڈیوں تک کو محسوس ہونے لگی —— پھر میں اپنے حواس کی لہروں پر پھیل کر اس نتیجے پر پہنچا کہ جب تک اس کے زخموں کی درازوں کو پانی کے قطروں سے بھرنے کا انتظام نہیں ہوگا یہ عمل جاری رہے گا اس طرح میں پانی کی تلاش میں نکل پڑا —— ایک خبر بہت ہی معتبر ذریعہ سے معلوم ہوئی تھی کہ بچے ہوئے پانیوں کا کچھ حصہ صرف انھیں کے پاس ہے جو شیشے کی دیواروں میں مقید ہیں۔

—— لیکن ایک جان لیوا مرحلہ یکا یک دہشت پھیلانے لگا —— میں جب اسے کمرے میں چھوڑ کر شیشے کی دیواروں میں مقید لوگوں کی تلاش میں نکلا تو سارے جنگل میں آگ پھیل چکی تھی اور سیاہ دھوئیں کے درمیان ایک چہرہ ابھر آیا تھا اور جنگلی جانور آہ و بکا میں مصروف تھے۔ تبھی کچھ لوگوں نے اپنی جانوں پر کھیل کر اس کی گردن جلتی لکڑیوں کے شعلوں پر رکھ دی اور اس کی زہریلی مسکراہٹ کھرچ کھرچ کر صاف کر ڈالی —— امید کی کئی کرنیں قدموں کے نزدیک آ گریں۔

میں دھیرے دھیرے نشیب کے تسکم میں اترنے لگا کہ اونچائی پر دھوپ کافی سخت تھی۔ مگر نشیب میں سوکھی ہوئی جھاڑیاں ناخنوں سے مجھے زخمی کرنے لگیں —— زخموں کی چرچراہٹ کی آواز میرے تعاقب میں تھی اور میں اس کی تکلیف کی انگلیاں تھامے اونچی نیچی ڈگریوں پر بھٹکتا رہا۔

جلد پر خراشیں ابھر آئیں۔ حواس کی رگیں سکڑنے لگیں اور سورج کی انگلیوں سے روشنی کا ایک قطرہ چھوٹ کر گرا اور میرے دماغ کے منجمد گودے میں اندر دھنستا چلا گیا اور میں چنگاریوں کی تمازت اپنی شریانوں میں محسوس کرنے لگا۔

علی مرزا روڈ، پکی سرائے، مظفر پور ۱

تیرگی فضا کے ساکت جسم پر دم توڑ گئی۔

میں بھی خود کو سوکھے ہوئے زخموں کی طرح اس کی تکلیف کا حصہ بنتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ بدنیت سایوں کا ہجوم محو رقص تھا — کاش میں بھی مسدود راہوں کی دھول کا حصہ بن گیا ہوتا۔

خشک درختوں کی چھال اور کوہستانوں کے چلتے ہوئے جسم میرے چہرے کی جلن پر افسردہ ہو گئے مگر سیاہ بادلوں کی بدزبانیاں پھر بھی کم نہ ہوئیں۔ اور تب آخر میں اس جانب چل پڑا جس طرف سے مدھم مدھم روشنی آنکھوں میں منعکس ہو رہی تھی۔ چھوٹے بڑے گڑھے میرے تلوؤں میں ابھرتے اور دھنستے جا رہے تھے۔ جھاڑیوں کی خاردار نوکیں جسم کے تمام نرم حصوں میں پیوست ہوتی جا رہی تھیں۔ اور ایک المیہ یہ بھی تھا کہ میں اب تک داہنے شانے پر رکھے کنگال آدرشوں کی چتا کی راکھ بہتے ہوئے پانی میں نہیں چھوڑ سکا تھا اور بائیں شانے پر اسے اٹھائے پانی کے چند قطروں کی تلاش میں ابھرتی ڈوبتی مدھم مدھم روشنی کی جانب بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اور ایک خبر یہ بھی تھی کہ پرندہ پکڑنے والی گاڑی شہر میں داخل ہو چکی ہے۔

دوسرے لمحے کے مقدر سے بے خبر روشنی کی جانب میرے قدم رواں تھے اور روشنی بھاگتی رہی..... میں تعاقب کرتا رہا.... روشنی بھاگتی رہی .... میں تعاقب کرتا رہا — طویل سفر کے بعد جب میں اس روشنی کے قریب پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک جلتی ہوئی چتا اپنے آخری مرحلے میں سسک رہی ہے۔ جلتے ہوئے گوشت کی بدبو نتھنوں میں داخل ہونے لگی۔ چتا سے اٹھتے ہوئے شعلے آنکھوں پر جالے بننے لگے اور عذاب کی جلن ہتھیلیوں کو مزید جھلسانے لگی۔ اس طرح ایک اور چتا کی راکھ کا بوجھ میرے شانوں پر رکھ دیا گیا میں اپنے حلق سے تھوک کھینچنے کی ناکام کوشش کرنے لگا — زبان تالو سے رگڑ کھا کر چنگاریاں پیدا کرنے لگی۔

وہ تکلیف کی شدت سے بے حال ہوا جا رہا تھا۔ اور تب پہچان کی ایک لکیر تاریک فضا کے جسم پر اجاگر ہوئی۔ ایک گھنے درخت کے نیچے نیم برہنہ سادھو دھیان میں غرق تھا۔ اس نے انگلیوں سے اشارہ کیا کہ ریت کی سرحد کے اس پار شیشے کی دیواریں ہیں اور مقید لوگ میں نے بابا کے چرنوں میں اس کی تکلیف کا کچھ حصہ رکھنا چاہا مگر دوسرے لمحہ ہی پہچان کی لکیر معدوم ہو چکی تھی — اپنی اپنی تقدیر کی صعوبتیں خود ہی جھیلنی تھیں۔

ریت میں پاؤں دھنستے رہے الجھتے رہے اور جب سرحد ختم ہوئی تو عجیب ہولناک منظر آنکھوں کے سامنے تھا — ہوا یہ تھا کہ شیشے کی تمام موٹی موٹی دیواریں ٹوٹ پھوٹ چکی تھیں اور وہ سب بچے ہوئے پانیوں کا ایک ایک قطرہ پی کر ابدی نیند سو رہے تھے۔

اس کی آنکھیں زخموں کے شگافوں میں اندر بہت اندر دھنستی چلی گئیں۔

▲▲

من موہن تلخ کا نیا شعری مجموعہ
تکمیل
عنقریب شائع ہو رہا ہے

محسن زیدی کا نیا شعری مجموعہ
رشتۂ کلام
عنقریب
شائع ہو رہا ہے

نظمیں

ناظم خلیلی

معمول

رات کے جسم پر
رینگتا
چاند بالکل کسی چیونٹی کی طرح
اپنے منہ میں
دبائے
بڑی احتیاط اور حفاظت سے
بے روح اور مُردہ
لمحوں
پلوں
ثانیوں، کو، چلا جا رہا ہے
ابھی دن تھا
اور دن کے اُجلے بدن پر
وہ سُرخ اور لہو سے بھرا
موٹا تازہ مکوڑا
یہی کام
بالکل یہی کام
کچھ دیر پہلے بڑی تندہی سے سرانجام دیتا چلا آ رہا تھا
میں جب بھی ہراساں تھا
اب بھی بہت بدحواس اور سہما ہوا ہوں ــــ!

احمد حسین شمس

جزیرہ تنہائی کا

سمندر موج زن تھا
اور ساحل سے بہت دور
ایک ننھا سا جزیرہ
خوف کی دہلیز پر گم سم پڑا تھا
حباب ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے
کٹ رہے تھے
مر رہے تھے
مست ہاتھی ہر طرف چنگھاڑتے تھے
چٹانیں محوِ حیرت
کوہ لرزاں
ستارے دم بخود
سورج ہراساں
پسینے چھوٹتے تھے آسمانوں کی جبیں پر ــ
تو میں نے
آگ اُگلتے پانیوں میں
ڈال دی کشتی تجسس کی ــ
زباں پر حرف
بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا
وہ دن بھی تھا کہ تنہا اکیلا تھا
ایک یہ دن ہے
کہ میں تنہا کھڑا ہوں
ایک ننھے سے جزیرے میں
جہاں
میرے سوا
اب دوسرا کوئی نہیں ہے

○ سعید منزل بیرون قلعہ ـ رائچور ـ ۵۸۴۱۰۱ ـ کرناٹک ـ
○ کشن گنج ـ پورنیہ ـ بہار ـ

غزلیں

شفق طاہری

زیست کے پل پر کوئی بیٹھا ہوا
لمحہ لمحہ سوچ میں ڈوبا ہوا

اس طرح مجھ کو ہوائیں لے اڑیں
جیسے پتہ شاخ سے ٹوٹا ہوا

ذہن میں خاکے بناتی حسرتیں
جیسے پانی پر کوئی لکھتا ہوا

بام و در پر سنسناتی دوپہر
مقبروں میں آدمی دبکا ہوا

مجھ کو بھی مرنے کی فرصت مل گئی
وہ بھی یکسو ہو گیا اچھا ہوا

پتے پتے سے ابھرتی سسکیاں
گرم لو میں ہر شجر جلتا ہوا

اڑتے اڑتے تھک گئیں آنکھیں شفق
سرحدوں تک آسماں پھیلا ہوا

باذل عباسی

میں آب آب جلا آگ آگ سرد ہوا
جب اپنے جسم سے نکلا افق نورد ہوا

زمیں پہ تھا تو پہاڑوں کا عزم تھا مجھ میں
خلا میں پاؤں جو رکھا تو گرد گرد ہوا

بھرا تھا زہر رگ و پے کی شاہراہوں میں
میں اپنے جسم کے صحرا میں لاجورد ہوا

چھپا ہوا تھا مری ذات ہی میں میرا حریف
میں اپنے سائے سے آمادۂ نبرد ہوا

شکستگی تھی مگر اپنے پاؤں پر کب تھی
میں اپنے نقشِ قدم سے ہی فرد فرد ہوا

اظہار مسرت اعجازی

اس شہر میں لگتا ہے ابھی تک وہ نیا ہے
اک شخص جو چوراہے پہ برسوں سے کھڑا ہے

اک کوہ کی چوٹی پہ سے دیکھا تھا زمیں کو
اس روز سے یہ دل ہے کہ بس ڈوب رہا ہے

تاریخ کے اوراق میں مدفون ہوں میں تو
انسان خلاؤں میں کسے ڈھونڈ رہا ہے

مشرق سے ابھرتا ہوا یہ زرد سا سورج
جیسے کوئی بیمار جو بستر سے اٹھا ہے

اعجاز ہے کیسا یہ مسرت کی غزل کا؟
قرطاس کے دامن سے دھواں اٹھنے لگا ہے

○ صدر مدرس درس گاہ اسلامی میران پور کٹرہ ○ معرفت جناب احسان الدین، ۲۸ بی کرزن روڈ — نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱ ○ برکاتی دواخانہ۔ رام گنج بازار۔ جے پور ۳۰۲۰۰۲

اذیت کا سفر

ملکہ خورشید

ابھی اس کو بے جان ہوئے چند ہی لمحے گزرے تھے کہ اس کی روح دوبارہ اس کے مردہ جسم میں داخل ہوگئی۔ تب اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے چاروں طرف تاریکیوں اور مبہم پرچھائیوں کا حصار تھا۔۔۔۔ تاریکیاں ۔۔۔۔۔ پرچھائیاں جو رقص کررہی تھیں ۔۔۔۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور اپنی چتا سے اتر آیا۔ پھر وہ تاریکیوں کے درمیان خود بھی رقص کرنے لگا۔ اس نے پرچھائیوں کو پکڑنا چاہا، تب ہی جانے کہاں سے وہ اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔۔۔۔

"تم کون ہو ــــ؟" اس نے پوچھا۔ تاریکیاں، پرچھائیاں اس کا منہ چڑانے لگیں اور وہ خاموش اس کی آنکھوں میں گھورتا رہا۔ اس کی آنکھوں سے نفرت کی ہلکی ہلکی بھاپ اٹھ کر فضا میں تحلیل ہو رہی تھی۔

"تم ۔۔۔۔ تم کون ہو" اجنبی نے پوچھا۔ تب ہی اس کے منہ سے گرم گرم دھواں ابلا، جیسے کہیں بارود جلی ہو، اس نے گہری سانس لی۔ بارود کی بو اسے شروع سے ہی پسند تھی۔ بڑی دیر تک وہ اس بو سے لطف اندوز ہوتا رہا۔۔۔۔۔

دفعتاً روشنی کا ایک کوندا لپکا۔ دوسرے ہی لمحے بارود بھڑک اٹھی۔ شعلوں کا یہ رقص اس کے لیے نیا تھا۔ پیش منظر کو وہ سہمی سہمی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ شعلے جب اس کی طرف لپکے تو اسے بھاگنا پڑا۔۔۔۔۔ دیوانوں کی طرح وہ بھاگتا رہا۔ سڑکیں ویران تھیں اور زمین سورج کے سوا نیزے پر آنے سے پہلے ہی سلگ اٹھی تھی۔ شعلوں کا سیل بڑی تیزی سے اس کی جانب بڑھ رہا ہے، اس کا احساس اسے تھا۔ وہ دوڑتا ہوا اپنے مکان کے کھلے دروازے سے اندر داخل ہوگیا۔ ٹیبل پر پڑا ہوا خنجر اس نے ہاتھوں میں مضبوطی سے تھام لیا۔ اس نے اتنا لمبا فاصلہ دوڑتے ہوئے طے کیا تھا کہ اب وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ باہر چیخ کراہ سے ہجوم کی آواز وہ صاف طور پر سن سکتا تھا۔ دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ اس کا دل اس کے سینے میں بہت اودھم مچا رہا ہے۔ غصے سے وہ بپھر گیا، اپنے ہاتھوں میں پکڑے خنجر سے اس نے سینے پر وار کیا اور دل نکال کر وہیں کمرے میں پڑے اسٹول پر پھینک دیا۔ پھر دروازہ باہر سے بند کرکے انہی راستوں پر دوڑ پڑا۔ اپنی آنکھیں بھی نکال کر اس نے کھڑکی سے اندر کمرے میں پھینک دیں اور مطمئن ہوکر دوڑتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کی ٹانگیں چرچرانے لگیں۔ اس نے نفرت سے اپنی سوکھی چرمرائی ٹانگوں کو دیکھا جن میں اب درد ہونے لگا تھا۔ لیکن اس سے بے پروا وہ بے تحاشہ دوڑتا رہا۔ جلتی بارود کے دھوئیں کی تیز بو وہ محسوس کررہا تھا اور بھڑکتے شعلوں کا شور بھی اسے سنائی دے رہا تھا۔ جس کے آگے زمین و آسمان کی خوف زدہ چیخیں دب کر رہ گئی تھیں۔ خنجر اب بھی اس کے ہاتھوں میں تھا اور اس سے سرخ سرخ گرم خون بوند بوند ٹپک رہا تھا، جسے وہ کبھی کبھی زبان پر رکھ لیتا تھا۔ اب وہ ایک آباد علاقے سے گزر رہا تھا۔ اس کا خنجر مسلسل ہوا میں لہرا رہا تھا۔ اس کی ہر حرکت سے خون کی ٹپکنے والی بوندوں کی رفتار کچھ اور تیز ہو جاتی تھی۔ جسے دیکھ کر اسے یک گونہ سکون مل رہا تھا۔ شعلوں اور دھوئیں کا سیل اب بالکل قریب آچکا تھا۔ لیکن وہ گھبرایا نہیں۔ ایک گہری مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ دوسرے ہی لمحے وہ اس سیل کے ساتھ اس کے آگے آگے چل رہا تھا۔ زخموں سے

ملکہ خورشید، معرفت روفعہ نحر اللہ [illegible]، محلہ گراہنا [illegible]

چورکراہتی ہوئی کائنات کو وہ دیکھ نہیں سکتا تھا کیوں کہ دیکھنے والی آنکھیں وہ گھر پر چھوڑ آیا تھا لیکن اپنے گرد وپیش سے بلند ہونے والی گھٹی گھٹی چیخیں وہ اچھی طرح سُن رہا تھا چیخوں کی موسیقی کی لے پر اس کی روح جھوم رہی تھی۔ وہ بے خود ہوکر شعلوں کے دوش پر بہتا ہوا آگے بڑھتا رہا چیخیں ابھرتی رہیں، خنجر سرخ سرخ لہو اگلتا رہا تشنگی بڑھتی رہی تبھی جانے کیسے ایک باغی شعلے نے اس کے سارے وجود کو سمیٹ لیا، وہ سارا کا سارا سلگ اٹھا۔ کرب کی لکیریں اس کے چہرے پر ابھر آئیں۔ وہ چیخا بھی مگر اس کی آواز شعلوں کے قہقہوں میں ڈوب گئی۔

اور پھر چند لمحے بعد جب وہ دوبارہ زندہ ہو اٹھا، آنکھیں کھول کر اس نے دیکھا۔ تاریکیوں میں لپٹا وہ اس کے عین سامنے کھڑا بڑی گہری نظروں سے اس کی آنکھوں میں گھور رہا تھا۔ اور وہ سحر زدہ سا معلق کھڑا تھا جب قطرہ قطرہ ہوکر وہ سارا کا سارا اجنبی کی آنکھوں میں اتر چکا تب وہ اس کے قریب آیا اور گردن پر دانت جما کر جب اس نے خون کا آخری قطرہ بھی چوس لیا تب ایک بھیانک چیخ اس کے منہ سے باہر آگئی۔ اس کے کھوکھلے جسم کو واپس چتا پر رکھ کر وہ مطمئن انداز میں تاریکیوں میں گم ہوگیا۔ ▲▲

میں

نوجوان شاعر عبداللہ کمال کی منتخب غزلیں اور نظمیں جو ایک خاص فکری آہنگ کی حامل ہیں

ڈمائی سائز، دیدہ زیب گیٹ اپ

قیمت : بیس روپے

مسدود راہوں کے مسافر

رضوان احمد کے افسانے۔ ان افسانوں میں کرب اور کسک بھی ہے اور عصری آگہی بھی۔ خوشنما کتابت وطباعت۔ گلیز ڈ کاغذ۔ صفحات ۱۲۸

قیمت : دس روپے

متاعِ واہی

معتبر طنز نگار رضا نقوی واہی کے پچھلے مجموعوں کا جامع انتخاب اور ان کا نیا کلام۔

ڈمائی سائز، ضخامت ۳۲۸ صفحات

قیمت : بیس روپے

اضافی تنقید

کرامت علی کرامت کے تنقیدی مضامین جو ادبی مسائل پر غور وفکر کے نئے راستے کھولتے ہیں۔

ڈمائی سائز، بہترین کتابت وطباعت

قیمت : بیس روپے

نیشنل اکاڈمی سے طلب کریں

تبصرے

الفاظ کا سفر

مصنف: ظہیر غازی پوری، ضخامت: ۱۶۰ صفحات، قیمت: دس روپے، ناشر: مکتبہ آدرش - ابگلہ۔ بنیاد گنج رگیا، بہار۔

"الفاظ کا سفر" میں ایک پیش لفظ اور تین آرا ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی ظہیر کی شاعری کو سمجھنے کے سلسلے میں زیادہ معاون ثابت نہیں ہوتا۔ وحید اختر، فضا ابن فیضی، عنوان چشتی یا کرامت علی کرامت کسی کی رائے کو بھی دیکھ لیں سب نے ظہیر کی شاعری پر اپنے مسالے اور اپنا رنگ و روغن چڑھانے کی کوشش کی ہے اب کم از کم ایسا دور آگیا ہے کہ خالق کسی حد تک قاری پر بھروسہ کرے اور اپنی تخلیق کے ساتھ ساتھ اسے بیساکھیاں نہ دے۔ بغیر کسی حاشیہ آرائی کے تخلیقات اس کے سامنے رکھ دے تاکہ قاری اور تخلیق دونوں ایک دوسرے کے قریب آسکیں ایک دوسرے سے حظ اٹھا سکیں یا ایک دوسرے کا امتحان لے سکیں اور خود کسی نتیجے پر پہنچ سکیں۔

میرے خیال میں ظہیر غازی پوری کی شاعری دو حصوں میں تقسیم کی جاسکتی ہے۔ پہلا حصہ وہ ہے جہاں روایات، اقدار تہذیب، نسل، مذہب، ملت اور عقیدے وغیرہ ہیں اور دوسرا حصہ وہ ہے جہاں حرف، لفظ، فن، شعر اور تنقید وغیرہ ان کا موضوع ہیں اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے علاوہ ان کی شاعری کا کوئی اور پہلو نہیں ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ انھوں نے پوری کائنات کو انھیں دو وسیلوں سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ جہاں کہیں ان دونوں وسیلوں سے الگ ہوئے ہیں ان کی شاعرانہ حیثیت پر ٹھیس لگی ہے۔ ویسے اس علیحدگی کی حیثیت پورے مجموعے میں ضمنی سی ہے۔ یہ الفاظ دیگر یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ ان کی شاعری "نظریے" کی شاعری ہے۔ اسی ایک نقطے کے ساتھ ہی مسئلہ COMMITMENT کا اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ مگر اس بحث میں الجھے بغیر میں خورشید الاسلام کی "وابستگی" کے خانے میں ظہیر کی شاعری کو رکھنا پسند کروں گا۔ اس فیصلے پر پہنچنے کے بعد اب دیکھنا یہ ہے کہ ظہیر اپنے نظریات کو شعری پیکر میں ڈھالنے میں کس حد تک کامیاب ہیں۔

"اپنی تہذیب کی عظمت کبھی نظر آئے گی
کبھی دیواروں پہ لکھے ہوئے فقرے پڑھیے

کل کی قدروں سے اگر آئے تفاوت کا خیال
دیمکیں جن میں لگی ہیں وہ جریدے پڑھیے

بے صدا سے پیکر ہیں لفظوں کی اڑانیں ہیں جسم جیسے
پتھر کے پھول جیسے کاغذ کے فکر پیاسی پیاسی ہے فن سراب آلودہ

راہ فن سے آج اکثر بے نیاز گذر رہے ہیں ناقدانِ شعر و فن اب قلم کی
ناقدری خون تھوکنے والو خود ادب نوازی ہے۔

یہ عہد چاہتا ہے گرد گرد ہوجاؤ
دیارِ زیست میں صحرا نورد ہوجاؤ"

درج بالا اشعار مجموعے کے مختلف صفحات سے لیے گئے ہیں۔ ان میں شاعر کی وابستگی کا نظریہ اظہر من الشمس ہے۔ یہ وابستگی زندگی اور فن کی مٹتی ہوئی قدروں سے ہے۔ شاعر ہر جگہ گرتی ہوئی دیواروں کو سنبھالنا چاہتا ہے لیکن ناکام ہو جاتا ہے نتیجتاً کہیں اس پر جھنجھلاہٹ سوار ہوتی ہے کہیں بلکنے لگتا ہے اور کہیں سینہ کوبی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اوپر کے پہلے سے تیسرے شعر تک میں احتجاج، طنز اور جھنجھلاہٹ نمایاں کر

کس طرح اشعار کو نئے مزاج کا ترجمان بنا دیا ہے۔ ان کے علاوہ بھی مجموعے میں بہتیرے ایسے اشعار ہیں جو ہمارے احساسات، تجربات اور مشاہدات کو فنی چابکدستی کے ساتھ چھوتے ہوئے گزرتے ہیں اور ذہن و دل کے تاروں کو جھنجھنا کر رکھ دیتے ہیں۔ ظہیر کے اشعار بظاہر کھردرے، جمالیاتی قدروں سے عاری اور غنائیت سے مبرا ہوتے ہیں۔ لیکن اشعار کی اندرونی تہوں میں اس طرح یہ تمام قدریں آپس میں جڑی ہوتی ہیں کہ کم شاعروں کے یہاں اس کی مثال ملے گی۔

ان کی غزلوں کے سرسری مطالعے کے بعد جب ہم ان کی نظموں پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کی اکثر نظمیں ان کی غزلوں کے مختلف اشعار کا ENLARGEMENT معلوم ہوتی ہیں۔ دوسری بات یہ کہ ظہیر کی پوری شاعری کا اسلوب وضاحتی ہے۔ یہ عیب غزلوں میں تو چھپ بھی جاتا ہے لیکن نظموں میں اپنی پوری برہنگی کے ساتھ نظر آنے لگتا ہے۔ مستقبل کا بہتر شاعر بننے کے لیے انھیں اپنے اس انداز سے انحراف کرنا ہوگا۔ ویسے تو وہ خود کہتے ہیں

"ابھی تلاش کا جذبہ ہے۔ نیم پختہ سا"

اُمید ہے کہ جیسے جیسے وہ اپنا سفر طے کرتے جائیں گے۔ یہ نیم پختگی پختگی میں بدلتی جائے گی کہ یہاں سے تو ان کے سفر کی ابتدا ہے۔ کتاب کی کتابت و طباعت دیدہ زیب ہے۔ صادق کے سرورق کو رنگوں کے انتخاب نے رسوا کر دیا ہے۔

——— بدنام نظر

شاد عارفی شخصیت اور فن

مصنف: ڈاکٹر مظفر حنفی، پبلشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۲۵

اردو میں خالص طنز کی روایت عام نہیں۔ نثر و نظم دونوں میں اس کا فقدان رہا ہے۔ شاد عارفی سے قبل مختلف شعرا کے کلام میں خالص طنزیہ اشعار کہیں کہیں نظر آ جاتے ہیں لیکن طنز کو مزاح سے الگ کر کے دیکھنے کی باقاعدہ تخلیقی یا تنقیدی کوشش اردو میں نہیں کی گئی چنانچہ طنزیہ شاعری مستقلاً مزاحیہ انداز بیان کے دائرۂ اختیار میں رہنے کی وجہ سے دوسرے درجہ کی شاعری ہو کر رہ گئی۔ شاد عارفی پہلے شاعر ہیں جنھوں نے خالص طنز کو اپنا فن بنایا اور اس خلوص سے اس پر محنت کی کہ غزل کے مزاج سے ہم آہنگ کر دیا۔

زیر نظر کتاب "شاد عارفی شخصیت اور فن" مظفر حنفی کی ان کوششوں کی تازہ کڑی ہے جو وہ اپنے استاد کی شخصیت اور فن کو صحیح طور پر متعارف کرانے کے لیے کر رہے ہیں۔ اس سے پہلے انھوں نے شاد پر لکھے گئے مختلف مضامین کو "ایک تھا شاعر" میں جمع کر دیا تھا اس پر قناعت نہ کرتے ہوئے انھوں نے شاد پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی راہ سے باقاعدہ تحقیقی کاوش کی۔

کتاب کے پیش لفظ میں پروفیسر مسعود حسین خاں نے شاد عارفی کی شخصیت پر جامع انداز میں اظہارِ خیال کیا ہے ایک مقام پر مظفر حنفی کے کام کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میرا خیال ہے اس مقالے کی اشاعت کے بعد اہل نقد و نظر دیکھیں گے کہ ابھی چند دہے قبل ہمارے درمیان سے جو سخن در خاموشی سے اٹھ گیا ہے اس کی شخصیت اور فن کس قدر تہہ دار تھے جو تمام عمر "دارالسرور" میں مقیم رہا لیکن اس کے نصیب میں لذت خمار بھی نہ آئی اس کی زندگی مسلسل دیوانے کا خواب رہی وہ ہمیشہ مر مر کر جیا کیا لیکن اپنی فنکارانہ انفرادیت کا سودا نہ کیا۔ نامساعد حالات کے نیش کو اس نے فن کے ذریعہ گوارہ بنا لیا اس کی غیور و خوددار انفرادیت نے کبھی ان سے پیار کیا کبھی ان پر تلوار بن کر ٹوٹ پڑا لیکن ہار نہ مانی اور مانی تو اس طرح کہ اس کی شکست کی آواز گلبانگ شعر بن گئی۔"

کتاب نو ۹ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے دو باب "سماجی اور ادبی پس منظر" نیز "سوانح حیات اور شخصیت" پر روشنی ڈالتے ہیں وہ ماحول جس میں شاد عارفی پروان چڑھے اور ان کی شخصیت کا ارتقا ہوا۔ انھوں نے مختلف اصناف سخن میں بہ اعتبار مقدار و معیار جو ورثہ چھوڑا ہے اس کا تجزیہ ہے بعد کے پانچ ابواب میں سابقہ بحثوں سے اخذ کردہ نتائج کی روشنی میں شاد عارفی کے ادبی مقام کے تعین کی کوشش کی گئی ہے آخر میں فہرس تلامذۂ شاد، ان کی غیر مطبوعہ تخلیقات کی فہرست اور ان کتب و رسائل کے اشاریے بھی شامل کر دیے گئے ہیں جن سے اس مقالے کی تکمیل میں استفادہ کیا گیا ہے۔

کم و بیش چار سو صفحات پر مشتمل معیاری سائز کی یہ کتاب اردو تحقیق کی دنیا میں ایک اضافہ ہے شاد یا شاد کی شاعری سے قطع نظر صرف طنز و مزاح

(باقی صفحہ پر)

بزمِ احباب

● ابو محمد شبلی
معرفت دانش محل، امین الدولہ پارک۔ لکھنؤ۔

تحریک جنوری ۷۸ء کا شمارہ قدرے تاخیر سے ملا۔ بڑی بے چینی سے انتظار تھا " افکار و نظریات " پر جناب مخمور سعیدی کا تبصرہ نظر نواز ہوا۔ اس کتاب کے کئی مضامین تحقیق طلب ہیں۔ فی الحال میں کسی اور مضمون کے بارے میں کچھ نہ کہہ سکوں گا۔ لیکن ایک مضمون " شہیدِ آزادی پنڈت رام پرشاد بسمل " (صفحہ ۶۱) جس کا ذکر تبصرہ کے آخری پیراگراف میں آیا ہے۔ ایک ہندی کتاب " کرانتکاری رام پرشاد بسمل " مصنفہ ڈاکٹر ایشور پرشاد ورما۔ شائع کردہ ہندی پاکٹ بکس دہلی سے ماخوذ ہے۔ یہ ہندی کی کتاب بسمل کی آتم کتھا کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے شعر و شاعری کا ذکر دوسرے مصنفوں کی طرح ورما صاحب نے زیبِ داستاں کے لیے اپنی طرف سے بڑھا دیا ہے۔ ورنہ آتم کتھا میں بسمل نے کہیں بھی اپنے شاعر ہونے کا ذکر نہیں کیا ہے بسمل کے مداحوں نے اُن کے مزاج اور لفظ بسمل کے سہارے بہت سے اشعار اُن سے منسوب کر دیے ہیں۔

پنڈت رام پرشاد بسمل کی آتم کتھا کی بنیاد پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ صرف ۳۰ سال زندہ رہے۔ ۱۶/۱۷ سال کی عمر میں محض اُردو میں کمزوری کی بنا پر ساتویں درجہ میں دو بار فیل ہوئے اور مجبوراً اُردو چھوڑ کر مشن ہائی اسکول شاہجہاں پور کے پانچویں درجہ میں داخل ہوئے دسویں تک تعلیم پائی۔

رضوی صاحب نے اپنے مضمون میں جتنے اشعار ان سے منسوب کیے ہیں اُن میں پہلی غزل " سرفروشی کی تمنا " تو سید شاہ محمد حسن بسمل عظیم آبادی کی ہے ہی میں یہ بھی یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ پنڈت رام پرشاد بسمل ۱۶ ر دسمبر ۱۹۲۷ء (پھانسی سے تین دن پہلے) تک اس غزل سے واقف ہی نہ تھے۔ ورنہ وہ اسے اپنی پسندیدہ نظموں میں ضرور شامل کرتے۔ یا کوئی حسب حال شعر آتم کتھا میں لکھتے۔

رضوی صاحب کے پیش کیے ہوئے باقی اشعار بھی تحقیق طلب ہیں مثلاً :

۱۔ دوسری غزل میں علامہ اقبال کا ایک شعر (شمع اور شاعر، بانگ درا) ؎

آخر شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

بطور مقطع استعمال کیا گیا تھا جو غالباً ناشر کی نشاندہی پر کتاب زیرِ تبصرہ میں محذوف ہو گیا لیکن

۲۔ حضرت امیر مینائی کی ایک غزل (مرآۃ الغیب ۲۱۲) کا مطلع ؎

بہے بحرِ فنا میں جلد یارب لاش بسمل کی
کہ بھوکی مچھلیاں ہیں جوہر شمشیر قاتل کی

لفظ بسمل کی وجہ سے جگہ پا ہی گیا۔

۳۔ درج ذیل اشعار پنڈت بنارسی داس چترویدی صاحب نے بسمل کی آتم کتھا کے اڈیٹوریل میں ان لفظوں کے ساتھ پیش کیے ہیں :

" اور ۱۹ ر دسمبر کو بندے ماترم اور بھارت ماتا کی جے کہتے ہوئے وہ پھانسی کے تختے کے قریب گئے چلتے وقت وہ کہہ رہے تھے ؎

مالک تری رضا رہے اور تو ہی تو رہے
باقی نہ میں رہوں نہ مری آرزو رہے

جب تک کہ تن میں جان رگوں میں لہو رہے
تیرا ہی ذکر اور تری ہی جستجو رہے"

اس سے یہ نتیجہ کس طرح اخذ کیا جا سکتا ہے کہ یہ اشعار بسمل ہی کے ہیں۔

۴۔ درج ذیل اشعار اس مخمس کے ہیں جسے بسمل نے اپنی پسندیدہ بارہ نظموں میں شامل کیا ہے۔ یہ نظمیں ان لفظوں کے ساتھ آتم کتھا میں چھپی ہیں:

"میری یہ خواہش ہو رہی ہے کہ میں ان کویتاؤں میں سے بھی چند کو یہاں پیش کردوں جو مجھے پسند ہیں اور جنھیں میں نے اس وقت زبانی یاد کیا تھا"۔

(آتم کتھا صفحہ ۱۱۸)

ایسی وضاحت کے بعد ہم ان نظموں کو کس طرح بسمل کی مان لیں؟ جبکہ ان میں سے سات پرتاپ[۱]، ماکھن لال[۲] چترویدی، خلیل[۳]، اصغر[۴]، اشفاق اللہ خاں[۵]، بہادر شاہ[۶] ظفر اور سکھانی[۷] کی ہیں۔ باقی پانچ نظمیں زیر تحقیق ہیں۔

آتم کتھا میں اس مخمس کے پندرہ بند ہیں جبکہ رضوی صاحب نے صرف تین بند بسمل سے منسوب کیے ہیں۔ مضمون میں پہلے دو بندوں کے پانچویں مصرعے نہیں ہیں ؎

دل فدا کرتے ہیں قربان جگر کرتے ہیں
پاس جو کچھ ہے وہ ماتا کی نذر کرتے ہیں
خانہ ویران کہاں دیکھیے گھر کرتے ہیں
خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں
جا کے آباد کریں گے کسی ویرانے کو

نوجوانو یہی موقع ہے اٹھو کھل کھیلو
خدمت قوم میں جو آئے بلا وہ جھیلو
دیس کے صدقے میں ماتا کو جوانی دیدو
پھر ملیں گی نہ یہ ماتا کی دعائیں لے لو
دیکھیں کون آتا ہے ارشاد بجا لانے کو

بات تو جب ہے کہ اس بات کی ضدیں ٹھانیں
دیس کے واسطے قربان کریں سب جانیں
لاکھ سمجھائے کوئی ایک نہ اس کی مانیں
کہتا ہے خون سے مت اپنا گریباں سانیں
ناصحا آگ لگے اس ترے سمجھانے کو

کاکوری کے دوسرے شہید اشفاق اللہ خاں کی شاعری کے بارے میں میری معلومات محدود ہیں اس لیے یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ تضمین انھیں کی ہے لیکن اتنا تو کہہ سکتا ہوں کہ پہلے بند کا دوسرا شعر واجد علی شاہ اختر کے شعر ؎

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

کی عوامی اور بگڑی ہوئی شکل ہے۔ اور پانچواں مصرع مولانا حسرت موہانی کا ہے۔ نیز تیسرے بند کا پانچواں مصرع بھی مولانا حسرت کا ہے جسے رضوی صاحب نے بھی نقل کیا ہے مضمون کے بقیہ چار اشعار زیر تحقیق ہیں۔

● خاطر حافظی
شاہ معروف۔ گورکھپور

میں ادھر نومبر ۷۷ء میں راجستھان گیا تھا۔ وہیں میں نے تحریک کا اکتوبر کا شمارہ دیکھا جس میں آپ نے "فصیل شب" پر تبصرہ اقبال مسعود صاحب سے کرایا ہے۔ اس تبصرہ کو دیکھ کر نہ صرف مجھے بلکہ میرے تمام دوستوں کو بے حد افسوس ہوا ہے۔ یہ تبصرہ قطعی معمولی، ادھورا اور جانبدارانہ لگتا ہے اس لیے کہ میری شاعری میں ہر جگہ sex سیکس کی بات کرنا بہت بودی اور غلط بات ہے، میں نے تو جہاں کہیں بھی سیکس کا ذکر کیا ہے یا تو بہت صالح انداز میں یا اگر sex کے بارے میں تذکرہ ہے سو وہ آج کے دور پر ایک طرح سے طنز ہے۔ جیسے میرا یہ شعر ہے ؎

وہ بدن کے خال و خط میں ڈھونڈتا ہے زندگی
"جنس" کے شعلوں میں گھر کر رہ گیا ہے آدمی

اس کے علاوہ مجھ پر فارمولے بازی کا الزام عائد کیا گیا ہے۔ جو کہ قطعی غلط ہے میں نے "جدیدیت" کے کوچے میں سمجھ بوجھ کر قدم رکھا ہے۔ "جدیدیت" کو اپنے اوپر اوڑھا نہیں ہے میں نے "جدیدیت" کو ہمیشہ ایک رجحان سمجھا ہے۔ ایک تحریک کبھی نہیں۔ میں نے "جدیدیت" کو تازگی یا "نئے پن" یا "نئے طرز اظہار" کے طور پر اپنایا ہے اور وہ بھی اس طرح کہ جس دور میں ہم جی رہے ہیں اس دور کی عکاسی یا دور کے ذریعہ سے ذات یا شخصیت پر جو اثر مرتب ہو رہا ہے اُسے کیسے بہتر طریقے پر یا بہتر اسلوب میں پیش کیا جائے۔

رفتید ولے نہ از دلِ ما

نئے سال کے پہلے دو مہینے اُردو دُنیا پر بہت سخت گزرے اور اُردو والوں کو یکے بعد دیگرے کئی صدمات سے دوچار ہونا پڑا۔ پہلی المناک خبر لندن سے ملی جہاں ۱۱ جنوری کی رات کو مشہور شاعر اور مزاح نگار ادیب ابنِ انشا دماغی فالج کے عارضے میں انتقال کر گئے۔ وہ ۲۰ جنوری سے بے ہوشی کے عالم میں تھے۔ ابنِ انشا جن کا اصل نام شیر محمد تھا، ۱۹۲۷ء میں جالندھر میں پیدا ہوئے تھے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ ریڈیو سے منسلک ہو گئے اور ملک کی تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے جہاں سرکاری ملازمت میں متعدد اہم عہدوں پر رہے اور دُنیا کے مختلف حصوں کا سفر کیا۔ ان کے لکھے ہوئے سفرنامے ان کے انھی تجرباتِ سفر کی کہانی سُناتے ہیں، شائستہ مزاح کی چاشنی نے ان سفرناموں کو بہت دلچسپ بنا دیا ہے۔ وہ کراچی کے بعض اخبارات میں مزاحیہ کالم بھی لکھتے رہے لیکن ان کی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہوا تھا۔ تقسیمِ ملک کے بعد کے مخصوص حالات میں جن شاعروں نے خارجیت سے داخلیت کی طرف مراجعت کی اور میر کے لہجے کو اپنایا ان میں ابنِ انشا کا نام سب سے نمایاں تھا۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ "چاند نگر" کے نام سے اور دوسرا "اس بستی کے اک کوچے میں" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۵۱ سال تھی۔ وہ گزشتہ ایک برس سے لندن کے پاکستانی سفارت خانے میں مدار المہام کے عہدے پر کام کر رہے تھے۔ پس ماندگان میں بیوہ کے علاوہ دو لڑکے ہیں۔ ان کا جسدِ خاکی طیارے سے کراچی لایا گیا اور وہیں ۱۳ جنوری کو ان کی تجہیز و تکفین عمل میں آئی۔

۱۸ جنوری کی صبح کو کراچی میں پروفیسر محمد حسن عسکری چل بسے۔ وہ اسلامیہ کالج کراچی میں انگریزی شعبے کے صدر تھے۔ گھر سے کالج جانے کے لیے روانہ ہوئے تھے کہ راستے میں دل کا دورہ پڑا اور طبی امداد سے پہلے ہی وہ انتقال کر گئے۔ عمر ۵۹ سال تھی۔

عسکری صاحب کی شخصیت مجموعۂ صفات تھی۔ اُردو کے علاوہ انگریزی اور فرانسیسی ادبیات پر بھی ان کی گہری نظر تھی اور ان دونوں غیر مُلکی زبانوں پر وہ مکمل عبور رکھتے تھے۔ انھوں نے ان دونوں زبانوں میں بہت سے مضامین لکھ کر مشرقی علوم کو مغرب میں متعارف کرانے کا فریضہ انجام دیا اور دُنیا کے کئی عظیم ادبی شاہکاروں کو اُردو میں منتقل کر کے اُردو والوں کو فکر و فن کے نئے زاویوں سے روشناس کرایا۔ وہ ایک اہم افسانہ نگار بھی تھے۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "جزیرے" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ ان کے تنقیدی مضامین کے دو مجموعے "انسان اور آدمی" اور "ستارہ اور بادبان" کے نام سے چھپے ہیں اور ان کی تنقیدی بصیرت سے ان کے بعد آنے والے سبھی ناقدین فیضیاب ہوئے ہیں۔ پچھلے چند برس سے مذہب کے ساتھ ان کا شغف بڑھ گیا تھا۔ اس زمانے میں پروفیسر کرار حسین کے تعاون سے انھوں نے مولانا اشرف علی تھانوی کے کچھ اہم رسائل کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ عسکری صاحب نے شادی نہیں کی تھی اور اپنا پورا وقت وہ تصنیفی اور تدریسی مشاغل ہی میں صرف کرتے تھے ـــــ دارالعلوم کراچی میں، مفتی محمد شفیع مرحوم کے مزار کے پہلو میں، جن کی تفسیرِ قرآنِ پاک کو وہ آج کل انگریزی میں منتقل کر رہے تھے، انھیں سپردِ خاک کیا گیا۔

۳۰ جنوری کی شب میں ساڑھے بارہ بجے اچانک حرکتِ قلب بند ہو جانے سے جامعہ نگر نئی دہلی میں شفیع الدین نیر اللہ کو پیارے ہوئے۔ نیر صاحب بچوں کے مشہور ادیب اور شاعر تھے۔ بچوں کے لیے انھوں نے سینکڑوں نظمیں کہانیاں اور ڈرامے لکھے۔ وہ بچوں کی نفسیات کو بہت اچھی طرح سمجھتے تھے اور اس زبان پر بھی انھیں بڑی قدرت حاصل تھی جو بچوں

Accession numbers
38509
27.12.79

کے دل میں گھر کر لے۔ حال ہی میں بچوں کے مشہور رسالے رہنمائے تعلیم نے ان کی خدمات کے اعتراف میں ایک خاص نمبر شائع کیا تھا جس کے مضامین پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے کس طرح اپنی پوری زندگی ایک نیک مقصد کے لیے وقف کر دی تھی یعنی اپنی تحریروں کے ذریعے نئی نسلوں کی ذہنی اور اخلاقی تربیت۔ ایک استاد کی حیثیت سے بھی وہ یہ فریضہ زندگی بھر انجام دیتے رہے۔ ان کی کتابوں کی تعداد کئی درجن ہے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۸۰ سال کے قریب تھی۔

۷ فروری کی دوپہر کو بزرگ شاعر اور حلقۂ زندہ دلانِ لاہور کی یادگار صوفی غلام مصطفےٰ تبسم نے لاہور میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ صوفی صاحب اگست ۱۸۹۹ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے تھے۔ ۱۹۲۰ء میں وہ لاہور چلے گئے جہاں انھوں نے اسلامیہ کالج سے فارسی میں ایم۔ اے کیا اور سنٹرل ٹریننگ کالج میں استاد مقرر ہوئے۔ پھر ایک طویل عرصے تک گورنمنٹ کالج میں اردو اور فارسی کے شعبے کے سربراہ رہے۔ ان دنوں وہ پاکستان آرٹس کونسل کے چیئرمین، اقبال اکاڈمی کے وائس چیئرمین اور لینگویج کمیٹی کے رکن تھے۔ تبسم صاحب کی مادری زبان پنجابی تھی اور وہ پنجابی ادب میں بھی دخل رکھتے تھے۔ انھوں نے غالبؔ اور اقبالؔ کے فارسی کلام کا پنجابی میں منظوم ترجمہ کیا ہے اور امیر خسرو کے فارسی کلام کا اردو میں۔ ان کے اپنے کلام کا مجموعہ "انجمن" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ انھوں نے بچوں کے لیے بھی بہت سی نظمیں لکھیں جو کتابی صورت میں "ٹوٹ بٹوٹ" اور "جھولنے" کے نام سے چھپیں اور بہت مقبول ہوئیں۔

۹ فروری کو بمبئی میں مدیر ماہنامہ "شاعر" جناب اعجاز صدیقی کا انتقال ہو گیا۔ وہ مشہور شاعر اور اپنے عہد کے معتبر استادِ سخن سیماب اکبر آبادی مرحوم کے چھوٹے لڑکے تھے اور خود ایک ممتاز شاعر، ادیب اور صحافی کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے تھے۔ "شاعر" کا اجرا ۱۹۳۰ء میں آگرے سے سیماب صاحب نے کیا تھا اور ۱۹۳۲ء سے اس کی ادارت کے فرائض اعجاز صاحب انجام دے رہے تھے۔ تقسیم کے بعد وہ اسے بمبئی لے آئے اور ناسازگار حالات میں اسے زندہ رکھنے کے لیے انھوں نے دن رات جو کڑی محنت کی، اس سے ان کی صحت خراب رہنے لگی۔ وہ پچھلے کئی برس سے مختلف امراض میں مبتلا تھے اور بہت کمزور ہو گئے تھے لیکن ان کے کام کرنے کے انداز اور رفتار میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ حال ہی میں انھوں نے "شاعر" کا ہمعصر ادب نمبر شائع کیا تھا جس کی اہمیت برسوں تک محسوس کی جاتی رہے گی۔ اعجاز صاحب اردو زبان و ادب کی ترقی کے سچے دل سے خواہاں تھے اور اپنے اداریوں میں وہ ہر طرح کے تعصبات اور مصلحتوں سے اوپر اٹھ کر اردو کو درپیش مسائل پر اظہار خیال کرتے رہے۔ شاعر کے دیگر مندرجات بھی ان کی بے تعصبی، کشادہ دلی اور صلاحیت شناسی کی گواہی دیتے تھے۔ ان کے صاحبزادوں میں ناظر نعمان صدیقی اور افتخار امام صدیقی تک ان کی ادبی میراث پہنچی ہے۔ ہمیں امید رکھنی چاہیے کہ وہ دونوں مل کر "شاعر" کو زندہ رکھیں گے اور اردو زبان و ادب کا ہر بہی خواہ اس سلسلے میں انھیں اپنا سرگرم تعاون پیش کرے گا۔ یہ مرحوم کی روح کو بہترین خراجِ عقیدت ہوگا۔

۱۲ فروری کو الہ آباد میں محمود احمد ہنر وفات پا گئے۔ وہ کئی سال تک "شاہکار" کے نام سے ایک ادبی ڈائجسٹ شائع کرتے رہے تھے۔ اس کے ذریعے پڑھنے والوں تک اچھا ادب پہنچانے کی انھوں نے سعیِ بلیغ کی۔ ہندی بھی وہ اچھی جانتے تھے۔ الہ آباد کے ایک مشہور ہندی رسالے کے لیے انھوں نے اردو کی سینکڑوں کہانیوں کا ترجمہ کیا اور ہندوستانی سوسائٹی الہ آباد کے ترجمان "نیا ہند" (اردو۔ ہندی) سے بھی وہ وابستہ رہے۔ وہ گاندھیائی فلسفے کے ماننے والوں میں تھے اور مہاتما گاندھی پر ان کی بعض تصانیف خاصی شہرت رکھتی ہیں۔

ہم دست بدعا ہیں کہ خدا مرحومین کی مغفرت فرمائے اور ان کے پس ماندگان کو صبر عطا کرے۔

تبصرے (بقیہ صفحہ ۳۶)

یا خالص طنز کا ذوق رکھنے والے حضرات کے لیے یہ کتاب بہت پرکشش ثابت ہوگی۔ اس میں خالص طنز ہو [illegible] [illegible] طنز کا فرق اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے۔ جاذب [illegible] [illegible] الفنس کا کتاب کی خوبیاں ہیں جن کے پیش نظر اس کی [illegible] معلوم ہوتی ہے۔ —— خالد محمود

بھارتی معیشت میں وسیع پیمانے پر مزید ترقی کے روشن امکانات

بھارتی معیشت میں بڑی تیزی سے توسیع ہوئی ہے۔ بھارت نے نہ صرف سکّے کے پھیلاؤ پر قابو پالیا ہے بلکہ اس کا رُخ ہی موڑ دیا ہے اور قیمتوں میں ٹھہراؤ آگیا ہے۔

× اناج کی ۱۱ کروڑ ۸۰ لاکھ ٹن کی پیداوار کا نیا ریکارڈ قائم ہوا ہے اور اس وقت ملک میں ایک کروڑ 80 لاکھ ٹن سے زیادہ اناج کا اسٹاک ہے۔

× مالی سال کے پہلے چھ مہینوں میں صنعتی شعبے میں بارہ فیصد کی شرح سے ترقی ہوئی جبکہ پچھلے سال کی اسی مدت میں یہ صرف تین فیصد تھی۔ 77-1976ء میں پچھلے سال کے مقابلے میں دس فیصد زیادہ صنعتی پیداوار متوقع

× اپریل سے ستمبر 1976ء تک کے عرصے میں 1975ء کی اسی مدت کے مقابلے میں بجلی کی پیداوار 16.4 فیصد بڑھی

× اپریل سے اکتوبر 1976ء تک کے عرصے میں بھارتی برآمدات میں 33.9 فیصد کا قابلِ قدر اضافہ ہوا ہے اور اسی مدت میں درآمدات میں 9 فیصد تک کمی ہوئی ہے۔

× بیرونی ادائیگیوں کی پوزیشن میں نمایاں بہتری ہوئی ہے۔ غیر ملکی سکے کا ریزرو حصول آزادی کے بعد پہلی بار 2500 کروڑ روپے سے بھی زیادہ ہوگیا ہے۔

× پبلک سیکٹر میں ترقی کی شرح تقریباً بارہ فیصد ہے۔

× روپے کی قوت خرید میں 17 سے 21 فیصد تک کا اضافہ ہوا ہے۔

یہ کامیابیاں اس بات کی مظہر ہیں کہ بھارت کی حکومت اور جنتا نے ترقی کے لیے اس وسیع اور سرگرم عمل ملک کے تمام تر وسائل کو بروئے کار لانے کا پختہ عزم کر رکھا ہے۔